دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کراچی
مئی
2013
نگران اعلیٰ
معراج رسول
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
www.paksociety.com

جلد 43 • شمارہ 05 • مئی 2013 • زرِ سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com
پبلشر و پرنٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

مدیر اعلیٰ

چینی نکتہ چینی

عزیزان من السلام علیکم...

الیکشن کی دھماچوکڑی اور موسم کی تبدیلی کے سنگ مئی کا شمارہ حاضر ہے... وقت قریب سے قریب تر آرہا ہے۔ اگلا شمارہ آنے سے کافی پہلے انتخابات ہوچکے ہوں گے... کچھ قوتیں اس مرحلے کو سبوتاژ کرنے کے لیے ایڑی چوٹی تو کیا، گولی بارود تک کا زور لگارہی ہیں... مسئلہ صرف یہ ہے کہ زورآوروں اور خوں خواروں کی ایک اقلیت کے سامنے بھاری اکثریت نے مکمل خاموشی اختیار کی ہوئی ہے... اس ملک میں کون ہے جو اسلام کا مخالف ہے۔ سب دل و جان سے چاہتے ہیں کہ یہاں اسلامی نظام نافذ ہو جس میں اقلیتوں تک کو مکمل مذہبی آزادی، بھرپور تحفظ کے ساتھ دستیاب ہو۔ اقلیتیں بھی یہی چاہتی ہیں کہ اسلامی نظام کی چھتری تلے انہیں مکمل تحفظ کی ضمانت حاصل ہو... اور اب تو فوج یعنی آرمی چیف نے دوٹوک الفاظ میں قوم کو بتادیا ہے کہ ملک میں اسلام کے سوا کسی اور نظام کی گنجائش نہیں ہے... لیکن ہماری اشرافیہ جو نسل در نسل اقتدار کے ایوانوں پر قابض چلی آرہی ہے، ان معاملات میں گونگی بہری بنی ہوئی ہے۔ انہیں بھونکتی ہوئی گاڑیوں کے جلو میں عوام کو ہراساں کرتے ہوئے سفر کرنے کا شوق ہے، عمر بھر کی مراعات اور پنشن کی فکر ہے... ان ذاتی منفعتوں کا معاملہ ہو تو اوپر سے نیچے تک، اقتدار اور اختلاف والوں تک، سب یک زبان ہوجاتے ہیں، لمحوں میں قانون سازی ہوجاتی ہے۔ عوام کی بہبود کے معاملے میں کوئی آواز اٹھتی ہے تو ہزار رکاوٹوں کو عذر بنالیا جاتا ہے... برسوں بحث چلتی ہے، کوئی نیا معاملہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور پرانے مسائل فائلوں کے انبار میں دفن کردیے جاتے ہیں... ان بازی گروں کو قوم نے 66 برس دے دیے۔ نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ بہت ہوتا ہے... عہد کرلیجیے کہ 11 مئی 2013ء کو ہمیں اس کاٹھ کباڑ سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا پانا ہے تاکہ پاکستان ان کا نہیں، ہمارا اپنا ملک بن سکے...

اپنے پاکستان کا خواب آنکھوں میں لیے اب چلتے ہیں آپ کی اپنی محفل میں... جہاں ہر قوم اور نسل کے لوگ اپنی دلداریاں دکھاتے ہیں۔

ڈسٹرکٹ بونیر سے ایم اے منیر کی خوش خبری "آج پھر ان سے بے ملاقات کا قصد، کچھ سر تختۂ گل طے ہوگا۔ کئی ماہ بعد آپ کی انجمن رنگ رنگ میں حاضر ہیں، غیر حاضری کی ایک خوب صورت وجہ یہ تھی کہ ہماری تعداد ایک سے تجاوز ہوگئی ہے اور ظاہر ہے ایسے وقت میں بے چارہ جاسوسی رقیب ٹھہرتا ہے۔ لہٰذا ہم نے بھی یہ نادر شاہی حکم سن کر جاسوسی کو ہاتھ لگانے سے گریز کیا۔ ہاں پڑھتے تھے لیکن چھپ کر۔ شمارہ 6 تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل بڑا جاذب نظر تھا۔ دیدہ زیب نظارے میں کھوئی ہوئی غزالی آنکھیں، جذبات کا بہاؤ، شنگرفی ہونٹوں سے بہنے کے لیے بے تاب۔ ایک الہڑ مٹیار قاتل حسن کے شعلے بکھیرتی ہوئی کسی بات پر انگشت بدنداں تھی۔ انعام کے حق دار فہد علی صاحب ٹھہرے۔ ان کا خط کافی عمدہ تھا، مبارک باد۔ بجا فرمایا ہے آپ نے فہد صاحب۔ ناکام محبت بڑی ظالم شے ہے۔ دوسروں کو اس کا ادراک نہیں ہوتا۔ تپش وہ جگہ محسوس کرتی ہے جہاں پر آگ جلتی ہو۔ (واہ جی) لاہور سے اشتیاق قریشی صاحب کے کیا کہنے۔ کیا معیار پایا ہے آپ نے۔ اللہ کرے ذوقِ نظر اور زیادہ۔ بھئی ہمایوں! آپ کے خط میں آج کل اعتراضات کچھ زیادہ ہورہے ہیں۔ یہ اوٹ پٹانگ اور بے سرے نکتے آپ کہاں سے ڈھونڈ لاتے ہیں؟ ماہا جی! آپ کی خودپسندی کے کیا کہنے، خود پر فخر کرنا سوچنے کی متقاضی ہے۔ اللہ پاک آپ کے "ان" پر رحم فرمائے۔ محترم خنیز صاحب! آپ کے منہ میں گھی شکر۔ میں آپ کا بڑا فین ہوں۔ آپ کی گہری باتیں بصد شوق پڑھتا ہوں۔ راحتی غارس! بھئی آپ کا نام تو عجیب ہے لیکن آپ بھی کسی عجوبے سے کم نہیں ہوں گی۔ ناصر حسین صاحب! دکھ کی بات ہے کہ آپ کو والد صاحب کا دیدار نصیب نہیں ہوا۔ اس سے پہلے صبا گل کے ساتھ بھی اس قسم کی ٹریجڈی پیش آئی تھی۔ اللہ آپ دونوں کو صبر دے اور آپ کے والد صاحبان کی مغفرت فرمائے، آمین۔ گرداب اس پرچے کی ایک منفرد کہانی ہے جس میں بیک وقت پانچ کہانیاں چل رہی ہیں لیکن اسماجی بعض سے انصاف نہیں کرپارہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کہانی جن موضوعات پر شروع ہوئی تھی، ان سے آج کل مکمل طور پر ہٹ چکی ہے۔ جیسا کہ آپ نے لکھا ہے کہ یہ کہانی جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتی ہے۔ ان چاروں میں صرف جرم سے انصاف کررہی ہیں۔ افسر شاہی بھی شہریار کے اے سی ہونے تک محدود تھی لہٰذا اس کا بھی گلا گھونٹ دیا ہے۔ پیار اور جاگیرداری تو برائے نام رہ گئی ہے۔ اور پلیز مکالموں میں تھوڑی تبدیلی لائیں۔ بور کردیتے ہیں۔ ابتدائی کہانی ہوس کار عمدہ تحریر تھی لیکن اینڈ کچھ خاص پسند نہ آیا۔ للکار لگتا ہے آخری سانسوں پر ہے پھر بھی اپنی رعنائیاں ہر طرف بکھیر رہی ہے۔ رنگوں میں دوسرا رنگ یوٹرن زبردست تھا۔ احمد اقبال ہر موضوع پر بھرپور لکھتے ہیں اور اب تو ان کی سلسلے وار شروع ہونے والی ہے، خوش آئند بات ہے۔ چھوٹی کہانیوں میں پراسرار محبوب اچھی کہانی تھی۔ مغربی ماحول کی آزادخیالی تباہ کردیتی ہے اور عزتیں سرِراہ نیلام ہوجاتی ہیں۔ موت کا ہرکارہ واقعی پیچیدہ مکالمہ بازی تھی۔"

بنوں سے عدنان یوسف کی شمولیت "اس دفعہ رسالہ معمول سے کچھ ہٹ کے دو اپریل کو مل گیا، یعنی وہ جان لیوا انتظار ہمیں نہیں کرنا پڑا جو کہ ہر ماہ ہم کرتے ہیں۔ (یہ اہتمام آپ کی خوشی کی خاطر کیا گیا ہے) سرورق دیکھ کر ہمیں اندازہ ہوا کہ دنیا سے ابھی حسن ختم نہیں ہوا ہے۔ (تو آپ کو یہ غلط فہمی کیونکر ہوئی تھی؟) بلکہ ذاکر انکل کے ہاتھ میں موجود ہے۔ اس دفعہ ٹائٹل گرل خوب صورت ترین ہوتی اگر... اس کا منہ بند ہوتا۔ لیکن خیر، لڑکیوں کے منہ کون بند کرواسکتا ہے۔ (ایسی کوشش بھی مت کیجیے گا) سرورق کا پوسٹ مارٹم کرنے کے بعد محفلِ یاراں میں پہنچنے سے پہلے نئی کہانی "جواری" کے بارے میں سن کر دل کی دھڑکن کی رفتار 160 کلومیٹر فی گھنٹا کے حساب سے ہوگئی۔ اس کا بہت شدت سے انتظار رہے گا۔ اس دفعہ نگراں وزیراعظم کی کرسی پر فہد علی صاحب موجود تھے، مبارکاں جی... عمیر شہزادا آپ کی بات صد فیصد درست ہے کہ اگر ہم پورا رسالہ ایک ساتھ پڑھ لیں تو پھر باقی مہینا کیا کریں گے۔ محسن کمال! ویلکم ٹو دی جاسوسی۔ عبدالوہاب صاحب! آپ کو بھی خوش آمدید۔ باقی تبصروں میں دلنشین بلوچ، تفسیر عباس، محمد اشفاق اور احتشام احسان کے تبصرے

شاندار تھے۔ کہانیوں میں ہمیشہ کی طرح ابتدا للکار سے کی جو کہ آخری سطر تک کامیاب رہی۔ عمران اور تابش آرا کوئے تک پہنچ گئے ہیں۔ طاہر جاوید مغل صاحب آپ کے قلم کی تعریف ہمارا یہ ناچیز قلم نہیں کرسکتا۔۔۔ اللہ تعالیٰ آپ کو لمبی عمر عطا فرمائے، آمین۔ سلیم فاروقی کی اصول پرست ایک بہترین کہانی تھی۔ کاشف زبیر کی ہوس کار اور تنویر ریاض صاحب کی پراسرار محبوب بھی زبردست کاوشیں تھیں۔ باقی رسالہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔‘‘ (میاں عدنان! آپ کی مذکر اور مؤنث کی جان کاری کافی کمزور ہے۔ خیر آپ کے تحریر کی۔۔۔ او سوری آپ کی تحریر کی ہم نے درستگی کردی ہے)۔

بنوں سے محمد ہمایوں سعید کی ناز آفرینی ’’جاسوسی حسب اعلان تین کو دستیاب ہوا تو خوش گوار حیرت ہوئی۔ فہد علی جنجوعہ صاحب کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے بھائی ضرور لائیں مگر خیال رہے کہ وہ ماہا صاحبہ کی ہم مزاج نہ ہو ورنہ آپ کو بھی ماہا کے ’’ان‘‘ کی طرح بیرونِ ملک فرار ہونا پڑے گا۔ قریشی صاحب! آپ کا تجزیہ تھوڑا سا ناقص ہے۔ آپ اگر سارا ریکارڈ دوبارہ توجہ سے دیکھ لیں تو آپ کو بھی دیگر تمام قارئین کی طرح اندازہ ہوجائے گا کہ میں تو صرف مجبوراً جواب دیتا ہوں ماہا ایمان کو۔ چھیڑ خانی تو وہ کرتی ہیں۔ عمیر شہزاد جی! چھوٹی سی تقریب تو ہماری طرف بھی ہونے والی ہے۔ آپ بتائیں دوست ہونے کے ناتے ٹینٹ، کراکری میں کتنا ڈسکاؤنٹ دے سکتے ہو؟ دلنشین صاحبہ! ادھار مانگ کر اور شکریہ ادا کر کے شرمندہ مت کریں، میں تو سب سے یہی کہتا ہوں کہ جو آپ کو نہ مل سکے تو سمجھو وہ میرے لیے اچھا نہیں تھا۔ ورنہ اللہ تو انسان سے ستر ماؤں جتنی محبت کرتا ہے پھر وہ کیسے اپنے پیارے بندے کی آرزو پوری نہیں کرے گا؟ بشیر بھٹی صاحب! آپ کا شہر مجھے بے پناہ عزیز ہے سو ریاضی کے قانون کے مطابق آپ بھی بہت عزیز ہوئے۔ (کیا بات ہے آپ کی دل لگی کی) عبادت کاظمی صاحب! صرف عبادت پر توجہ دیں۔ تصویروں اور تصویر العینوں پہ توجہ دیں گے تو پھر اپنے نام کی لاج نہیں رکھ پائیں گے۔ اعجاز برادر! اتنا تھوڑا مت مانگیے صرف فون سے کیا ہوگا۔ ہم تو آپ کو شرفِ دیدار بخشنے کا سوچ رہے ہیں۔ تنصیر برادر! یہ ہر بار آپ کا تبصرہ پڑھتے ہوئے شدید تھکن اور ملیریا بخار جیسی کیفیت سے دوچار کیوں ہوجاتے ہیں ہم؟ دیکھیے اچھا برا وقت سب پہ آتا ہے۔ مجھ سے سیکھیے، یکے بعد دیگرے اتنی تلف چوہیشنز کا مقابلہ کتنی بے جگری سے کیا اور اللہ کا شکر ہے کہ سرخرو ہے۔ راجی غارس آپ کا نام پڑھ کر ایسا کیوں لگنے لگتا ہے جیسے آپ کسی غار میں رہتی ہوں۔ گرداب میں شہریار اور سلو کی سرگرمیاں عروج پر رہیں۔ خصوصاً سلو کا کردار بہت مضبوط ہوتا جارہا ہے۔ چودھری کے نامۂ اعمال میں ایک اور بے گناہ انسان کا خون درج ہوگیا۔ جاوید علی بھی نہایت کامیابی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ راہِ نجات بھی ان ہزاروں کہانیوں کی طرح تھی جس میں کوئی مغربی جوڑا ایک دوسرے سے بیزار ایک ہی وقت میں ایک دوسرے کو اوپر پہنچانے کی فکر میں رہتا ہے اور بالآخر دونوں ہی کامیاب ہوجاتے ہیں۔ نہایت مختصر مگر جاندار کہانی موت کا ہرکارہ مزہ دے گئی۔ ویسے لنگڑے کی پلاننگ شاندار تھی مگر وہ بھول گیا کہ اس کا سامنا موت کے ہرکارے سے ہے۔ سلیم فاروقی کی کہانی اصول پرست اچھی لگی۔ شکر ہے اس بار ہیرو فوجی نہیں انجینئر تھا۔ احمد اقبال کی یوٹرن بے حد پسند آئی۔ ہمیں شروع سے ہی شک تھا کہ یہ ناصر کی کارستانی ہوگی۔ صدا کا یوٹرن بلاشبہ دونوں ماں بیٹے کے لیے سودمند ثابت ہوا۔ بابر نعیم کی بدگمان بھی مغربی بیمار ذہن کی عکاسی کرتی سبق آموز تحریر تھی۔ ابتدائی صفحات پر کاشف زبیر کی کہانی ہوس کار یادگار ترین کہانی ثابت ہوئی۔‘‘

کوٹ رادھا کشن سے کاشف علی میراں کی فرمائشیں ’’دو مہینے کی طویل غیر حاضری کے بعد اپنی محفل میں شامل ہو رہا ہوں۔ 3 اپریل کو جاسوسی ہمارے ہاتھ آیا تو مارے حیرت کے بے ہوش ہوتے ہوتے بچے کہ ہیں تین تاریخ کو جاسوسی ہمارے شہر میں بھی دستیاب ہوگیا۔ سیلیوٹ ٹو ٹیم جاسوسی۔ سب سے پہلے للکار کے صفحے پر جا کر دم لیا۔ یہ خوش فہمی تو مجھے نہیں ہے کہ میری تنقید کے نتیجے میں للکار میں کوئی بہتری آئی ہے۔ اب ہم نے مغل صاحب کا اشارہ سمجھ لیا ہے کہ یہ آرا کوئے للکار کے اختتام تک ہماری جان نہیں چھوڑے گا۔ میں کہتا ہوں ٹھیک ہے نہ چھوڑے جان مگر تحریر کی یکسانیت تو ختم ہوئی۔ سوہنی خان اور زویا! آپ لوگ کہاں غائب ہو؟ چیخنی نکتہ چینی میں خط بھی لکھا کرو، فیس بک پر تو بہت کمنٹس پاس کرتی ہو۔ ویسے انکل آپ جاسوسی کا آفیشل پیج ہی بنا دیں جہاں سارے قارئین اکٹھے ہوجائیں۔ راجن پور سے ماہ تاب گل، پیا کو پیاری ہوگئی ہیں اس لیے غیر حاضر تھیں۔ البتہ حافظ آباد والی آپا جی آئی ہوئی تھیں۔ اس دفعہ میں نے کہا جی ماہا آپا! آپ پھپھو بن گئی ہیں اور محفل میں موجود سارے مرد چاچے تائے ماموں بن گئے ہیں کیونکہ 12 مارچ 2013 کو اللہ پاک نے مجھے بہت پیارا سا بیٹا عطا فرمایا ہے۔ (ماشاء اللہ، بہت مبارک) شیخ محمد معیز کی صورت میں۔ لفظوں کے کھلاڑی کی واپسی بہت اچھی لگی۔ سرورق ڈاکر انکل کی جادوئی انگلیوں کا کمال ٹھہرا۔ ابتدائی صفحات یعنی رسالے کی جان اور کاشف زبیر یعنی رسالے کی پہچان، آن اور بان بھئی واہ کیا کہنے ہوس کار کے۔ یقیناً کاشف زبیر صاحب کو اللہ پاک نے لازوال تخلیقی صلاحیتوں سے نوازا ہے کہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں آخیر ہی کر دیتے ہیں۔ احمد اقبال المشہور مداری والے میرے موسٹ فیورٹ رائٹر ہیں اور جناب کی تحریریں مجھے ہمیشہ ہی مزہ دیتی ہیں۔ یوٹرن بھی ایک ایسی ہی تحریر ثابت ہوئی جس نے ہمیں احمد اقبال کا اور بھی گرویدہ کردیا۔ انکل جی نیکسٹ ٹائم بزدل یا جلیل کی کہانی بھی شامل کیجیے گا پلیز۔ اس کے بعد باری آئی دوسری سلسلے وار کہانی گرداب کی جو اتنے گہرے گرداب میں گھر چکی ہے کہ اب اس کا نکلنا ناممکن ہی نظر آتا ہے مگر قابلِ تحسین ہیں اسما قادری صاحبہ جو اتنے بہت سے کرداروں کو ساتھ لے کر چل رہی ہیں اور جب ہم کسی کردار کو بھولنے لگتے ہیں تو اسی ماہ فٹ سے وہ کردار ہمیں جھلک دکھلانے آجاتا ہے۔ (پھر بھی آپ ناخوش ہیں؟) مریم کے خان قاتل کی تلاش میں نکلیں جو کہ جاسوسی کے معیار کے عین مطابق ایک زبردست تحریر ثابت ہوئی۔ یمونہ عزیز کا خاندانی راز تو خونی راز ثابت ہوا جو کہ پسند آیا۔ مختار آزاد صاحب منزلِ انتقام میں ہمیں الجھا گئے تو بابر نعیم نے بدگمان کردیا۔ مگر سب سے زیادہ مزہ محمد عفان کے شکاری گھوڑے نے دیا، زبردست تحریر تھی۔ بری عادت ہمیشہ راہِ نجات سے دور لے جاتی ہے اور راستے میں ہی موت کا ہرکارہ آجاتا ہے اور یہ کیا۔۔۔ دس دس کے چھ نوٹ دے کر جو حاصل کیا تھا وہ رسالہ رات ختم ہونے سے بھی پہلے ختم ہوگیا۔ نانٹ فیئر انکل جی پلیز تھوڑے سے صفحات بڑھائیں تانوں رب دا واسطہ جے۔‘‘

مصطفیٰ آباد پیر بابا سے صبا گل کی گل کاریاں ’’پرچہ 7 تاریخ کو مل گیا۔ سرورق کی دوشیزہ کافی خوش شکل تھی۔ فہد علی صاحب کو اول آنے پر مبارک۔ بھائی میرے عورتیں خوشامدی نہیں ہوتیں۔ اب اللہ نے انہی کی وجہ سے کائنات میں رنگ بھرا ہے تو کیا کریں۔ ویسے صنفِ نازک کا قسطوں میں اپنی صفات گنوانا صنفِ مخالف کے دلوں پر بمباری کرتا ہے جبھی تو مرد حضرات کو گراں گزرتی ہیں۔ ہمایوں بھیا! بجا فرمایا آپ نے۔ آپ کی دعا پر ہم بھی آمین کہتے ہیں۔ ماہا جی! یہ تو پہلے سے معلوم تھا کہ تو شی چودھری آپ ہی تھیں لیکن کیا روشانے صنم نام بھی کبھی آپ سے منسوب تھا؟ ناصر حسین بھائی! دل چھوٹا نہ کریں آپ کے غم کو ہم اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ بس ہم دعا ہی کر سکتے ہیں۔ تنصیر عباس صاحب! آپ تو ہمارے بڑے ہیں میں ایڈوانس معذرت کرتی ہوں لیکن اگر ماہا ایمان ذہنی بیمار ہیں تو ان کے دماغی امراض کے جراثیم آپ جیسے لوگ ہی ہیں۔ آپ نکل جائیں وہ ٹھیک ہوجائیں گی۔ کوئٹہ سے ثمینہ حبیب کا سنجیدہ خط اچھا لگا۔ احمد اقبال کی جواری کی آمد یہ ظاہر کررہی ہے کہ للکار ہی تمام ہونے والی ہے۔ ایک مایوس کن خبر ہے۔ احمد اقبال بھی کسی سے کم نہیں لیکن للکار کی بات اور تھی۔ منحوس آرا کو نے ایک بار پھر منظرِ عام پر آگیا اور خیر سے اب ہمارے ہیرو صاحبان اس کے پیچھے لگے ہیں۔ شوہر پرستی میں ثروت دنیا کی سبھی عورتوں کو پیچھے چھوڑ گئی۔ بہت غصہ آرہا ہے کہ یوسف جیسے بے مروت شخص کی چھوٹی تاویلوں پر یہ یقین کررہی ہے۔ ابتدائی کہانی کاشف زبیر کی گل پاشی تھی، عمدہ کہانی تھی۔ گرداب پسند ہے لیکن اسلم اور ماہ بانو کا ساتھ روڑے اٹکا رہا ہے۔ اسما جی آپ سو فیصد غلط کررہی ہیں۔ بھئی ماہ بانو تو اس کہانی کی ہیروئن تھی اور شہریار ہیرو۔ ان کا ملنا تو ضروری تھا چاہے آخر ہی میں کیوں نہ لیکن آپ نے تو خیر سے ماہ بانو پر ایسا قفل لگا دیا کہ اب وہ مرتے دم تک شہریار کی نہیں ہوسکتی۔ آپ کی منطقیں سمجھ میں نہیں آرہیں۔ رنگوں میں دوسرا رنگ اچھا تھا۔ چھوٹی کہانیوں میں منزلِ انتقام اچھی تھی۔ موت کے ہرکارے نے تو سر ہی گھما دیا۔ کچھ سمجھ نہ آیا۔ بدگمان بھی ٹھیک ہی تھی۔ پراسرار محبوب میں معلوم ہوا کہ مغرب میں بوائے فرینڈ رکھنا اوڑھنے اور بچھونے کی طرح ضروری ہے۔ شکر ہے ہمارا معاشرہ اس لعنت سے پاک ہے۔ ایلزبتھ مع کتے اپنے بوائے فرینڈ سے ہاتھ دھو بیٹھی۔‘‘

کراچی سے محسن کمال کی مجال ’’اس بار ڈائجسٹ 2 تاریخ کی رات کو ملا، کراچی والے تو جانتے ہی ہوں گے کہ مغرب کے بعد سے ہی کراچی میں تیز بارش کا سلسلہ شروع تھا جس کی وجہ سے میں نے بھیگنے کی پروا کیے بغیر بک اسٹال پر دوڑ لگائی اور بالآخر پرچہ حاصل کر ہی لیا۔ سب سے پہلے مغل صاحب کی للکار پڑھی۔ کہانی پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم خود عمران اور تابش کے ساتھ ایکشن میں ہوں، مغل صاحب آپ میرے پسندیدہ قلم کار ہیں۔ للکار کے بعد نمبر آیا گرداب کا۔ گرداب میں اس بار شہریار اور سلو کو ایسے معاملات پیش آئے جس کے بارے میں یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ آسمان سے گرا اور کھجور میں اٹکا۔ کاشف زبیر کی ہوس کار اچھی لگی۔ واقعی دولت انسان سے اچھے برے کی تمیز بھلا دیتی ہے۔ یاروں کی محفل میں پہنچے تو اپنا خط دیکھ کر فخر محسوس ہوا کہ پہلی ہی کوشش کامیاب ہوگئی۔ شکریہ جی۔ باقی کہانی اور تبصرے ابھی زیرِ نظر ہیں۔ یعنی کے پڑھنے باقی ہیں۔‘‘

چشتیاں سے آصفہ صداقت کی ہدایت ’’کافی عرصے بعد ایک مکمل سرورق سامنے آیا۔ خوب صورت ترین دوشیزہ، ڈیشنگ پرسنالٹی ہیرو اور طمطراق ولن۔ واہ ڈاکر انکل لگتا ہے اس بار بڑے موڈ میں تھے۔ بیک گراؤنڈ کی کلر ٹنگ بڑی جاندار تھی۔ دلفریب مسکان ہونٹوں پر سجائے، کچھ بالوں کو چھوتی کچھ چہرے کو چھپاتی انگلیوں کا جاندار انداز اپنائے ہیرو صاحب نہ جانے دماغ میں چلتی ہوئی کونسی دھن پر سر دھن رہے تھے۔ دلکش نقش و نگار کی مالک حسینہ جس کی آنکھوں میں اک پوری دنیا بسی تھی ہاوہ کے انداز میں لب وا کیے تنصیر انکل کو دیکھ رہی تھی۔ ایں۔۔۔ یہ اپنے تنصیر انکل خنجر نما کیل ہاتھ میں تھامے گوڈے گوڈے سمندر میں بول میری مچھلی کتنا پانی کھیل، کیوں کھیل رہے تھے۔ چیخی نکتہ چینی میں چھلانگ لگائی اور پھسل گئے بھئی واہ اداریے میں انکل جی نے الیکشن کا رائتہ پھیلا جو رکھا تھا۔ خیر چکھنے کی حد تک پڑھا اور انکل سے نظر بچا کر محفل ہاؤ ہو میں داخل ہوگئے۔ لو خوش ہو جاؤ صنفِ کرختوں۔ پہلا نمبر لگ گیا جی۔ فہد علی برادر کو مبارک باد۔ تبصرہ اچھا تھا مگر محبت کے نام پر بھی کیوں۔ ہمایوں سعید جل ککڑے۔ تمہارے لیے بس اتنا کہ جلتے رہو اور خالی مونگ کھاتے رہو مگر بنتا تمہارا پھر بھی کچھ نہیں۔ انکل تنصیر بن جاؤ لفظوں کے جیتنے بڑے کھلاڑی۔ مگر آئی تھیں کبھی پہلی باری۔ (یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔۔۔ اب ہم نئے ساتھیوں کو موقع دیتے ہیں بہت عرصہ گزرا انہیں اس بیٹ سے کھیلتے ہوئے۔۔۔) میرا تعلق چاہے جس قوم سے بھی ہو کم از کم ملغوبے ہم نہیں کھاتے اور رہی بات نمکین کی تو نمکین بہت اگر آپ کو دستیاب نہیں تو بھجوانے دیتی ہوں، وہ بھی بالکل مفت۔ اور چکلالہ سے راجی غارس اختر کی پذیرائی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔ جلدی سے یہ بھی بتا دو کہ تمہارا نام کس سے متاثر ہو کر رکھا گیا ہے۔ بھئی بڑا ہی پراسرار سا اور مصری مصری لگتا ہے۔ ماہا ایمان کی بیتے تبسم اور دادا اشفاق صاحب کے علاوہ باقی بہن، بھائیوں کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ محفل کے بعد پہلی کہانی کاشف زبیر کی زبانی۔ مارے خوشی کے باچھیں کھل گئیں۔ کہانی کا مرکزی خیال چونکا گیا۔ پلان میکر کتنا ہی زبردست کیوں نہ ہو اسے یہ ہرگز نہیں بھولنا چاہیے کہ ایک پلان میکر اوپر بھی ہے جس کے پلان کے سامنے ہر پلان عاجز اور بے بس ہے۔ حرص، آسائش اور طمع کی چک دمک انسان کو کس طرح درندہ بنا دیتی ہے اور آج کل کراچی بھی ایسے ہی درندوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ للکار اور گرداب ترتیب وار پڑھیں۔ دونوں قسطیں کمال کی تھیں۔ اٹھا پٹخ، دے دھن دھنا دھن اور ٹھاہ ٹھاہ۔ بھئی مزہ آگیا۔ پیارے اور راج دلارے رائٹرز جب ایسی دھواں دار قسطیں لکھتی ہوں تو دو دو اکٹھی لکھا کرو۔ ایک پڑھ کر مزہ نہیں آتا۔ ایک سائڈ پر جیبی، سامنے بریانی کی پلیٹ، ہاتھ میں جاسوسی اور نظریں للکار کا طواف کررہی ہوں تو واہ کیا کہنے۔ دیکھا انکل میں بھی کتنی اچھی منظر نگاری کرلیتی ہوں اور یہ سب آپ کو ہنسانے کے لیے۔ کیونکہ ہنسنا آپ کی صحت کے لیے بہت مفید ٹانک ہے۔ (ماشاء اللہ ہم پہلے ہی ہنس مکھ ہیں) بابر نعیم کی بدگمان اچھی تحریر تھی۔ تنویر صاحب کی پراسرار محبوب۔ واہ کیا نام ہے۔ ہم نے سوچا شاید اس میں کوئی جن ہیرو شیرو ہوگا۔ کیونکہ ہمیں جنات بڑے اچھے لگتے ہیں مگر یہ کیا تھوڑی تشنگی رہی۔ بہرحال، کہانی مزہ دے گئی۔ باقی کہانیوں پر تبصرہ نہیں کرسکتے۔ بھئی کبھی کبھی تبصرہ نہیں بھی کرنا چاہیے۔ اور ہاں انکل جی! اب ہم دو تین ماہ ٹھہر کر محفل میں وارد ہوں گے اس لیے آپ سے خصوصی گزارش ہے کہ برائے مہربانی کبھی کبھی آنے والوں پر ایڈیٹنگ کی قینچی کم چلایا کریں۔‘‘

پشاور سے انجینئر عمیر شہزاد بنگش کی روداد ’’الیکشن کے قریب آتے ہی ایڈیٹر صاحب کو عوام الناس سے کیا ہوا وعدہ یاد آگیا اور جاسوسی کی تاریخ میں پہلی بار جاسوسی 3 تاریخ کو بک اسٹال پر امید کی کرن کی طرح نمودار ہوا۔ سرورق پر ساری توجہ وافر مقدار میں کیے گئے میک اپ والی حسینہ نے حاصل کی لیکن جب حسینہ سے نیچے نظر پڑی تو ہمیشہ کی طرح عادت سے مجبور ہمایوں سعید کو صنفِ نازک کے پاس دیکھا اور اس کے پیچھے اعجاز احمد اس کے عادات و اطوار پر فنس رہے تھے۔ تب ہم نے شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے دوستوں کی محفل میں جانے ہی میں عافیت سمجھی۔ (اچھے بچے ایسا ہی کرتے ہیں) اس دفعہ محفل میں صدارت کی بھاگ دوڑ فہد علی جنجوعہ کے حصے میں آئی۔ بھائی مبارکاں۔ فہد علی! آپ کی عورتوں کے بارے میں جو رائے ہے، ہم ان سے مکمل اتفاق کرتے ہیں۔ محمد اشفاق دادا جان کا شفقت آمیز تبصرہ پڑھا اور دل کو ایک خوش گوار ٹھنڈک کا احساس پہنچا۔ ہمایوں سعید کسی دن پشاور آکر C.N&W

آفس آ کر میرا نام پوچھا اور ہمیں خدمت کا موقع عنایت فرمائیں۔ دلنشین بلوچ نے ظرف کا مظاہرہ کرتے ہوئے سب کے ساتھ اچھے تعلقات قائم کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ بشیر احمد بھٹی نے دوستوں کے بجائے کہانیوں پر تبصرہ کرنے میں اپنی بقا جانی۔ ماہا ایمان کا وسیع و عریض تبصرہ پیناڈول گولی کھانے کے بعد ہی پڑھنا مناسب سمجھا۔ محسن کمال نے بارہ سال بعد بھی کنجوسی کا مظاہرہ کیا۔ ہمیشہ کی طرح ثاقب تبسم کا خوشگوار اور جامع تبصرہ پڑھ کر موڈ بہار بہار ہوگیا۔ اعجاز احمد راحیل اور محمد رفیق ڈوگر کی قلم پر گرفت مضبوط ہونے کی وجہ سے ان کا تبصرہ بھی داد کے قابل رہا۔ ناصر حسین کے غمگین حالات زندگی سن کر دل اداس ہوگیا۔ ہم سب یقیناً آپ کے لیے دعاگو ہیں اور رہی بات ہماری تو ہم نے لیڈیز فرسٹ کا اصول اپنایا ہے۔ راجی غارس، سلطانہ جیسی دلیر، بہادر اور محبت والی عورتیں بہت کم اور صرف قسمت والوں کو نصیب ہوتی ہیں لیکن افسوس کہ تابش نے اس کی قدر نہیں کی۔ سحرش افضل آپ نے غلط سمجھا کیونکہ دوستوں کے بیچ پیار بھری نوک جھوک تو ہوتی رہتی ہے اگر یہ نہ ہو تو دوستی کا مزہ ہی نہیں۔ انور یوسف زئی اس دفعہ کچھ بیزار نظر آئے اس لیے مختصر تبصرہ لکھا۔ اب کچھ بات کہانیوں کے موضوع پر۔ ابتدائی صفحات پر کاشف زبیر کو پایا جن کا نام ہی قارئین کے لیے کافی ہے۔ اس کے بعد مغل صاحب کی شاہکار کی طرف متوجہ ہوئے جو ختم ہوتا ہے تو دل بہت غمگین ہوجاتا ہے۔ باقی رسالہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔"

صفدرآباد سے احتشام احسان کی درخواست "ٹائٹل پر نظر پڑی تو یوں لگا تبصرہ کرکے ہی آگے بڑھنا چاہیے۔ اوپر میوزک کی لہریں، نیچے ہنستا ہوا آدمی، اور ایک طرف کسی حسینہ کا چہرہ۔ مگر یہ نہ سمجھ آئی کہ حیرت سے کھلا ہے حسینہ کا منہ یا کچھ چکھنے کے لیے۔ اس سے نیچے پانی اور پانی میں ایک آدمی اور آدمی کے ہاتھ میں... اس سے پہلے کہ وہ میرے پاس آتا، جلدی سے خدا حافظ کہہ کر اپنی محفل میں داخل ہوئے۔ صدارت کی کرسی پر فہد علی جنجوعہ صاحب براجمان تھے، مبارکاں۔ لاہور سے اشفاق دادا جان بچوں پر شفقتیں بکھیر رہے تھے۔ بہت کیوٹ خط تھا۔ پشاور سے عمیر شہزاد... نے نکتہ چینی کرکے ہی نکتہ چینی میں جگہ پائی۔ بنوں سے ہمایوں سعید پڑوسیوں کے حق میں بولتے نظر آئے جس سے لگا شاید ان کی بھی کوئی... ٹیکسلا سے دل آپی سب کا شکریہ ادا کررہی تھیں یا حال احوال پوچھ رہی تھیں۔ نہ ماہا ایمان کی طرح کوئی تیر پھینکا نہ کسی پر تنقید۔ بہاولپور سے بشیر احمد صاحب ہمیشہ کی طرح چپ چپ سے آئے، نہ کسی کا حال پوچھا نہ کچھ اور۔ ماہا ایمان، محفل کی جان۔ ماہا جی! کیسی ہیں آپ؟ مجھے بھی آپ جیسی لڑکی چاہیے مطلب جو کپڑے جوتے چھوڑ دے مگر ڈائجسٹ نہ چھوڑے۔ ساہیوال سے اعجاز احمد! آپ کا تبصرہ اچھا ہے مگر یہ ساتھ چپ چپ سے موصوف کون ہیں؟ تفسیر عباس کا جاندار تبصرہ جاندار ہی تھا۔ باقی نئے آنے والوں کو خوش آمدید۔ جنھوں نے کہانیوں پر تبصرہ کیا وہ بھی اچھا رہا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے للکار پڑھی۔ اس کی یہ قسط بھی ایکشن سے بھرپور تھی۔ اب اندازہ ہوا شاید یہ ختم ہونے والی ہے۔ کاشف زبیر اپنی ہوس کار لے کر ابتدائی صفحات پر موجود تھے۔ وہی دولت کا لالچ جو انسان کو اندھا بنا دیتا ہے۔ معاشرے کا افسوسناک پہلو۔ ظفریاب کی سازش ناکام ہوئی تو بے انتہا خوشی ہوئی۔ یوں جیسے بیچ میں سب کی زندگی بچ گئی۔ مہر کی کوشش قابلِ داد تھی۔ تنویر ریاض پراسرار محبوب کے ساتھ حاضر تھے۔ ایک نفسیاتی ذہن، ویسے عجیب سی تھی۔ سرورق کی پہلی کہانی جو کہ میرے پسندیدہ مصنف کی تھی حسبِ معمول اپنے رنگ میں نظر آئے اور آخر میں ہنسی خوشی والی بات۔ لیکن سلیم فاروقی صاحب امجد کا موبائل گم ہوگیا تھا پھر ضمانت کے بعد اچانک کہاں سے آگیا۔ (لو بھئی گھر کے باقی لوگوں کے پاس بھی موبائل فون تھا... جو استعمال ہوا) میں احتشام احسان اب اسی نام سے محفل میں تابی اور بالو کے نام سے شامل ہوں گا۔"

چودھری محمد مقصود احمد جٹ کی اوکاڑہ سے تصحیح "رسالے میں ایک جگہ یہ لکھا ہوا ہے اقبال مجھے نصیحت کرگئے کہ

تندیِ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے

میں صرف ریکارڈ کی درستی کے لیے لکھ رہا ہوں کہ یہ شعر شکر گڑھ ضلع نارووال کے مرحوم سید محمد صادق ایڈووکیٹ کا ہے۔ علامہ اقبال کا نہیں ہے۔ اس سے پہلے بھی راقم نے کئی جگہ درستی کروائی ہے۔ اس شعر کی خدوخال کچھ ایسے ہیں کہ لوگ علامہ اقبال کا ہی سمجھتے ہیں اور شاہ صاحب کو اس پر فخر رہا ہے۔ اجتماعی طور پر رسالہ اچھا بلکہ بہت اچھا تھا۔"

چکوال سے ایم سعید کے اقوال "پیارے جاسوسی نے چار اپریل کو دیدار کا شرف بخشا تو کچھ اطمینان کا احساس ہوا۔ سرورق پر نگاہ ڈالی تو ڈاکٹر انکل کو داد دیے بنا رہ نہ سکے۔ سرورق کی حسینہ اپنی خطرناک آنکھوں سے کسی کو قتل کرنے کے لیے تیار نظر آئی۔ سرورق پرانے انداز میں لیکن قابلِ ستائش تھا۔ فہد علی اپنے خوب صورت اور منفرد تبصرے کے ساتھ کرسی صدارت پر موجود تھے۔ او بھاجی مبارکاں۔ اس کے بعد دیگر دوستوں کے تبصرے پڑھے۔ ماہا ایمان، ہمایوں سعید اور تفسیر عباس کے تبصرے بھی شاندار تھے۔ کہانیوں کی ابتدا حسبِ معمول للکار سے کی۔ سچ تو یہ ہے کہ ہماری جاسوسی پڑھنے کی وجہ بھی یہی داستانِ محبت ہے۔ اس قسط میں بھی ہیرو بھائی اور رتالی کافی تیزی میں نظر آئے۔ ویسے اگلی قسط شاندار ہوگی۔ اس کے بعد گرداب پڑھی جہاں اسما قادری صاحبہ ہر کسی کو گرداب میں پھنسانے کے چکر میں ہیں۔ ایک کردار ختم نہیں ہوتا کہ دوسرا لے آتی ہیں۔ گرداب کافی بور اسٹوری ہے۔ میرے خیال میں اب اس کو ختم ہوجانا چاہیے۔ کاشف زبیر کی ہوس کار معاشرتی فریبیوں کی عکاسی کرتی ہوئی تحریر تھی۔ سرورق کی دونوں کہانیاں اپنے لحاظ سے اچھی ثابت ہوئیں اور بور نہیں کیا۔"

میانوالی سے احسان سحر کی خیال آرائی "ماہِ گرمی کا پہلا شمارہ 31 مارچ کو ٹھنڈے ٹائم یعنی شام کو موصول ہوگیا۔ ٹھنڈ ٹھنڈ اور رات ہونے سے پہلے ٹائٹل کو دیکھنا ضروری تھا ورنہ بے چینی کم نہ ہوتی۔ صنفِ نازک خوب صورت انداز میں لب کھولے میرے علاوہ کسی اور پہ حیرت کا اظہار فرما رہی تھیں۔ نیچے مولا جٹ ہاتھ میں کرنڈی پکڑے سمندر سے نکل کر آرہے تھے شاید مچھلی صاف کرنے کیونکہ حلیے سے ہی مچھیرا لگتا تھا۔ محفل بونگیاں میں شان سے تشریف لے آئے جو جانی پہچانی لگی۔ محترم اشفاق قریشی صاحب کی خوب صورت باتیں پڑھیں، بہت اچھا لگا جیسے صبح سویرے ننگے پاؤں گھاس پر چلنے سے جو ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے، ایسی ٹھنڈک دل میں محسوس ہوئی۔ ہمایوں سعید اس بار کچھ نصیحت اور کچھ سمجھاتے نظر آئے۔ اللہ انہیں خود بھی ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق دے، آمین۔ دلنشین بلوچ کا تحفہ اچھا لگا۔ باقی سب دوستوں کے تجزیے اچھے لگے ورنہ خط لمبا ہوجائے گا۔ اور ویسے بھی ہم بونگیاں مارنے کے بجائے کام کی باتیں کرتے ہیں... صرف... (وہ تو ہم پڑھ رہے ہیں) آغاز پہلی کہانی سے کیا۔ کاشف زبیر ہوس کار لے کر آئے۔ ظفریاب کی ہوس کاری آخر اپنے منطقی انجام کو پہنچی۔ افسوس اور غصے کا اظہار نہیں کروں گا بلکہ یہ سوچ رہا ہوں کہ آئے دن جو ایسے واقعات نظروں سے گزرتے ہیں، ان میں سچائی ہے بھی کہ نہیں، ان میں بھی کسی مالک کی سازش تو نہیں۔ پیسے کی ہوس اور طلب نے ہمیں کہیں کا نہ چھوڑا۔ راہ انجام، میں اس طرز کی کہانیاں نہیں پڑھتا میاں بیوی والیاں۔ پلیز ان کو جاسوسی سے دور ہی رکھا کریں، یہ اچھا تاثر نہیں دیتیں۔ (کیوں بھئی) قاتل کی تلاش، یہ ہوئی نا بات۔ ایسی کہانیاں پڑھ کر جاسوسی کی افادیت اور اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ تھرل اور خوف سے بھرپور کہانی نے اینڈ تک سحر میں جکڑے رکھا۔ موت کا ہرکارہ گزارے لائق رہی۔ منزلِ انتقام خوب صورت تحریر ثابت ہوئی اور کافی محنت کے بعد لیوائن نے اپنے باپ کا انتقام لے بھی لیا۔ کافی اینڈ پر واضح ہوئی جو کہ اچھا تاثر دے گئی۔ للکار، کیا کہیں اس اسٹوری پر الفاظ ہی نہیں ملتے کہ اچھی چیز بلکہ ناقابلِ فراموش چیز کو بھلائیں۔ کیسی زبردست اسٹوری ہے اگر یہ کہتا جاؤں تو غلط نہیں ہوگا کہ جاسوسی میں تو للکار کی وجہ سے ہی شروع کیا تھا اور آخر للکار ختم ہوئی تو زیادتی والی بات ہوگی۔ گرداب کے لیے اتنا ہی کہوں گا کہ اسٹوری عجیب انداز کا شکار ہے۔ خاص کر سلو اور عادل کے حوالے سے ایک مصیبت سے نکلے اور دوسری میں بلاوجہ پھنس گئے جن کا جواز ہی نہیں بنتا۔ کچھ سمجھ نہیں آرہی ہو کیا رہا ہے۔ ادھر چودھری کی من مانیاں ویسی کی ویسی جاری ہیں جیسے پہلے تھیں۔ لگتا ہے کہانی وہی پہلی قسط پر چل رہی ہے۔ پہلے والی دلچسپی نہیں رہی۔ بدگمان کو بھی نظر انداز کروں گا، یہ بھی ویسے ہی تھی۔ پراسرار محبوب کافی متاثر کن لگی۔ سلیم فاروقی کے انداز اور جارحیت کو ذہن میں رکھ کر اصول پرست کا مطالعہ شروع کیا تو دوسری اسٹوری کی طرح اچھا رسپانس ملا۔ خاص کر ہمارے ملک کی لائق اور تعریف کے قابل پولیس کی جس محکمے میں حاکم خان جیسے حرام خور موجود ہوں وہ محکمہ کبھی عوام کی نظروں میں بلند مقام حاصل نہیں کرسکے گا۔ دوسرا رنگ یوٹرن کافی متاثر کن تحریر ثابت ہوئی۔ کافی اچھا رنگ جمایا اقبال صاحب نے ویلڈن۔"

اسلام آباد سے انور یوسف زئی کی خوش امیدی "جاسوسی اس بار خلافِ توقع 3 تاریخ ہی کو مل گیا، خوشی ہوئی۔ سرورق اس بار بھی اچھا تھا۔ خطوط کی محفل میں کوٹلی کے جنجوعہ صاحب کرسیِ صدارت پر براجمان رہے، مبارک ہو۔ بنوں کے ہمایوں سعید صاحب کا شکریہ کہ خط آپ تک پہنچانے کا آسان نسخہ بتا دیا۔ اس بار نئے نام زیادہ نظر آئے اور راولپنڈی کے ابنِ مقبول صدیقی صاحب کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ چکلالہ راولپنڈی کے راحی غارس کے نام کی سمجھ نہیں آئی، کیا وہ وضاحت کریں گے؟ اس شمارے کی پہلی کہانی کاشف زبیر صاحب کی ہوس کار ہمارے معاشرے کی ایک المناک داستان ہے کہ ظفریاب نے کن سازشوں سے مہر کو اپنے جال میں پھنسایا مگر کامیاب نہ ہوا۔ قسط وار کہانی للکار کی یہ قسط بہت دلچسپ اور تیز رفتار رہی۔ لگتا ہے للکار اب اپنے انجام کو پہنچنے ہی والی ہے اور احمد اقبال صاحب کی جواری کا شدت سے انتظار ہے۔ دوسری قسط وار کہانی گرداب اچھی جارہی ہے۔ شہریار اور سلو ابھی تک ممبئی اور دلی کے درمیان ہی اٹکے ہوئے ہیں۔ البتہ جاوید علی کا مشن اس بار کافی کامیاب رہا۔ سرورق کی دونوں کہانیاں اصول پرست اور یوٹرن جاسوسی کے معیار کے عین مطابق تھیں۔ بدیسی کہانیوں میں مریم خان کی قاتل کی تلاش سب سے بہتر رہی۔ کئی ماہ سے منظر امام صاحب کی مزاحیہ کہانی اور جلیل، راجا اور شنو والی شائع نہیں ہورہی۔ کیا اگلے شمارے میں کوئی امید ہے؟" (یقیناً)

لاہور سے زویا اعجاز کی عرض داشت "میرا نام زویا ہے۔ دو عدد ناکام کوششوں کے بعد آپ کی خدمت میں پھر حاضر ہوں۔ امید ہے کہ اس بار ناکامیوں کی ہیٹ ٹرک نہیں ہوگی۔ جاسوسی اس بار حسبِ معمول تین تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل کو سرسری سا دیکھا اور محفل کی طرف قدم چل دیے۔ کہانیوں کی ابتدا للکار سے کی۔ کہانی نہایت فاسٹ ایکشن پر جی رہی۔ آرا کوئے کی مورتی جھلک دکھا کر چلی گئی۔ گرداب کی یہ قسط کافی بہتر رہی۔ سلو کا کردار نکھرتا جارہا ہے۔ کاشف زبیر کی ہوس کار نے رونگٹے کھڑے کردیے۔ یہ کہانی سانحہ بلدیہ ٹاؤن جیسے کئی واقعات کی یاد دلا گئی۔ دولت کی چمک انسان کو سگے خونی رشتوں سے دور کردیتی ہے۔ عوام اور مزدور طبقہ تو کسی شمار میں نہیں۔ سرورق کا دوسرا رنگ بہت پسند آیا۔ مختصر کہانیوں کا مطالعہ ابھی جاری ہے۔"

اسلام آباد سے سید شکیل حسین کاظمی کی خیال آرائی "آج کل کی جدید، ہنگامہ خیز اور مصروف زندگی میں کتاب اور قاری کا رشتہ کافی نازک موڑ پر آن پہنچا ہے۔ وقت نکال کے مطالعہ کرنا اور اس کے بعد اس پر تبصرہ کرنا کافی حوصلے اور محنت کا کام ہے۔ (یقیناً... اور ہم آپ تمام قارئین کی اس محنت اور محبت کی دل سے قدر کرتے ہیں) اس دفعہ جاسوسی دو تاریخ کو ہی دستیاب ہوگیا۔ سرورق کیسا بھی ہو، ڈاکٹر انکل داد کے مستحق ہیں کہ کتنے سالوں سے ایک ہی موضوع پر سیکڑوں کی تعداد میں بننے والے سرورق ہر دفعہ الگ ہی نظر آتے ہیں اور اگر معمولی مماثلت نظر آ بھی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ لہٰذا یہ سرورق بھی شاندار تھا ہمیشہ کی طرح۔ اپنی صدر رنگ بزم میں پہنچے تو الیکشن کا کافی شور سنائی دیا اور ہم ٹھہرے غیر سیاسی بندے اس لیے تبصروں کا رخ کیا۔ آغازِ محفل میں فہد علی جنجوعہ کا طویل اور بھرپور تبصرہ ملاحظہ کیا۔ کرسیِ صدارت کے لیے موزوں ٹھہرنے پر مبارک باد۔ لاہور سے محترم محمد اشفاق قریشی کی دادا پروری بہت ہی پسند آئی۔ خاص کر دعوت والی بات سے ان کی اداروں اور قارئین کے لیے چھلکتی محبت نظر آئی۔ عمیر شہزاد کی نئے کردار والی بات پڑھ کر تیوری تو چڑھی مگر گرداب میں اندو کا نیا کردار متعارف ہونے کے بعد میں ان کو حق بجانب سمجھتا ہوں۔ محمد ہمایوں سعید بے شک پڑوسن نام کی مخلوق دنیا کے ہر کونے میں پائی جاتی ہے۔ آپ کا مشورہ میرے اور عبدالمنان دونوں کے حق میں مفید ہے۔ مگر آپ کی غیر مطبوعہ کتاب "دل کے ارماں" میں آپ کے سنہری اقوال میں کہیں لکھا پڑھا تھا کہ چھپائی وہ چیز جاتی ہے جس میں کوئی خامی ہو اور فی الحال مجھے اپنی پڑوسن اور اس کے ذکر میں کوئی خامی نظر نہیں آرہی۔ دلنشین بلوچ جغرافیائی اعتبار سے آپ بھی میری منہ بولی پڑوسن لگتی ہیں کیونکہ ٹیکسلا اور اسلام آباد کا فاصلہ بتانے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ مارگلہ ہل پر کھڑے ہو کر اگر کوئی چھینک مارے تو ٹیکسلا کا آدھا حصہ زیرِ آب آسکتا ہے۔ آپ دعا کریں بس مجھے کبھی طوفان ہو جائے۔ ثاقب تبسم نگینہ اور اعجاز احمد راحیل کے سادہ انداز میں کیے گئے تبصرے پسند آئے۔ برادر محترم تفسیر عباس بابر اپنے منتخب اور بہترین الفاظ کے ساتھ رونقِ محفل ہوئے۔ تفسیر برادر بس مجھے یہ بتا دیں کہ آپ تک میری انتہائی ذاتی نوعیت کی معلومات کون شخص پہنچا رہا ہے۔ راحی غارس آپ کا سوال قابلِ غور ہے، میں شیکسپیئر سے پوچھ کے بتادوں گا کہ میرا اور اس کا کیا رشتہ ہے۔ جواب ملتے ہی آپ کو اطلاع دے دی جائے گی۔ محفل سے نکلنے کے بعد للکار کا رخ کیا۔ ڈاکٹر مہناز اور آرا کوئے کی بیک وقت رونمائی کافی حیرت انگیز تھی۔ موہن بجلی کو فلمی انداز میں متعارف کروایا گیا۔ عمران اور تابش کی محنت شاید رنگ لے ہی آئے۔ خیر سے مغل صاحب نے بھی شیکسپیئر کا ذکر خیر کردیا ہے۔ اب کوئی یہ نہ کہہ دے میں نے ان کو کاپی کیا ہے۔ ورنہ اگلی دفعہ کسی اور دانشور کو میدان میں اتارنا پڑے گا۔ گرداب کی

بات کریں تو شہریار صاحب دوسرے معاملات میں زیادہ الجھے نظر آتے ہیں، بجائے اس کے اپنے مشن پر توجہ دیں۔ اولین صفحات پر کاشف زبیر کی ہوس کار بہت عمدہ رہی۔ عورت کو جہاں تحفظ اور عزت کا احساس ملتا ہے وہاں وہ بہت سی دوسری اہم باتوں کو بھی نظر انداز کر دیتی ہے اور اعتماد کر لیتی ہے مہر کی طرح۔ ظفریاب کے اتنے طویل المیعاد منصوبے پر تھوڑا عجیب محسوس ہوا۔ سلیم فاروقی صاحب کی اصول پرست بہت سیدھی اور عام کہانیوں کی طرح تھی۔ ان کی زیادہ تر کہانیاں حال سے پیوستہ نظر آتی ہیں۔ احمد اقبال کی یوٹرن کافی مزہ دے گئی۔ کہانی تو کافی حد تک سمجھ آ گئی تھی درمیان میں ہی مگر اس کا اختتام بہت شاندار لگا۔ سلیم انور صاحب کی راہِ نجات شادی شدہ لوگوں کے لیے عبرت ناک اور سبق آموز کہانی ثابت ہوگی۔ مریم کے خان کی قاتل کی تلاش صحیح معنوں میں جاسوسی کے معیار کے عین مطابق تھی۔"

گھاروے سومی خان کی نا امیدی "اس بار جاسوسی بہت ہی جلد 3 اپریل کو مل گیا۔ ٹائٹل اچھا تھا۔ سب سے پہلے پاکستان ہمارے پیارے ملک کے لیے دعائیں۔ اے اللہ! ہمارے ملک سے لوڈشیڈنگ، بم دھماکے، دہشت گردی، پانی کی، گیس کی، کھانے کی قلت یہ سب پریشانیاں دور فرما، آمین۔ اب بات ہو جائے تبصروں کی تو سب دوستوں کی نوک جھوک بہت ہی اچھی لگتی ہے۔ اور ماہا ایمان آپ کا تبصرہ پسند آیا اور ناصر حسین ہرل گوجرانوالہ سے اللہ آپ کے والد کو جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے اور آپ کو صبر دے۔ پھر پہنچے اپنی فیورٹ کہانی مغل انکل کی للکار جو کہ بہت ہی اچھی اسٹوری ہے۔ مغل انکل ایک اچھے رائٹر ہیں۔ اللہ تعالیٰ مغل انکل کو اور جاسوسی ڈائجسٹ میں کام کرنے والوں کو صحت و تندرستی عطا فرمائے۔ کاشف زبیر کی ہوس کار جو کہ سب سے نمبر ون رہی۔ آج کا انسان دولت کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ باقی کہانیاں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔"

"منشی رانا حماد فرہاد قیدی سزائے موت سینٹرل جیل ساہیوال کا تبصروں پر تبصرہ "محفلِ یاراں میں اپنی آمد کے اوائل میں ہی محفل کے ہر دوست کو سیلیوٹ پیش کروں گا۔ پہلا خط شائع ہونے پر بے انتہا خوشی ہوئی۔ میں اسی پر اکتفا کر کے مطمئن ہو کر بیٹھ گیا مگر اپریل کے شمارے میں دوستوں کے محبت بھرے الفاظ نے پھر سے قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ محفلِ یاراں میں کوٹلی آزاد کشمیر سے فہد علی جنجوعہ کی جذبانیت انہیں کرسی صدارت تک لے گئی جس کی انہیں دل کی گہرائیوں سے مبارکباد۔ لاہور سے محمد اشفاق قریشی کی میٹھی میٹھی باتیں سیدھی دل میں لگیں۔ شاید اس لیے کہ مجھے میٹھا بہت پسند ہے۔ قریشی انکل ماہا ایمان کا بھی تو خاصہ ہے جو ان کی تحریروں کو ڈائری میں سمیٹ لینے پر مجبور کرتا ہے۔ انجینئر بخش صاحب آپ کے لیے ایک واقعہ پیش کروں گا۔ آپ سے مدینہ میں کچھ تاجر ملنے کے لیے آئے۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ واپس چلے گئے تو ایک صحابی نے حضور سے عرض کیا، یارسول اللہ! ان تاجروں میں جو ایک سفید پگڑی والا آدمی تھا، وہ مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ حضور نے ان صحابی سے پوچھا، کیا تم نے اسے یہ بات بتائی ہے؟ عرض کیا نہیں یارسول اللہ۔ حضور نے ان سے کہا، ابھی جاؤ اور اسے بتا کر آؤ تم اس کے بارے میں کیا سوچ رکھتے ہو۔ لہٰذا یہ بات لازم ٹھہری کہ ہم جس کے بارے میں جو سوچیں، اسے اس سے آگاہ کریں۔ اگر ماہا ایمان کے بارے میں میں نے کچھ کہا ہے تو یہ میرے دل کی آواز تھی جسے روکنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ جلنے والے کا منہ کالا... اس لیے نہیں کہوں گا کہ آپ کو ہمایوں سعید کے سپرد کرتا ہوں۔ ہمایوں سعید بھائی! آپ کے الفاظ کی مالا میں اپنے نام کا موتی دیکھ کر خوشی ہوئی۔ دلنشین صاحبہ! آپ کی تلقین پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔ ماہا ایمان کی تیزیوں میں اپنے لیے دعائیں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ بزرگوں کی دعائیں جلد قبول ہوتی ہیں۔ علی پور چٹھہ سے ثاقب نگینہ کا تبسم اچھا لگا۔ سینٹرل جیل گوجرانوالہ سے ناصر حسین ہرل کے والد صاحب کی وفات کا سن کر دلی دکھ ہوا۔ برادر آپ کے دکھ کو میں سمجھ سکتا ہوں۔ مجبوری کے ایام میں یہی دکھ انسان کی کمر توڑ دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے والد صاحب کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ کہانیوں پر تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں کیونکہ ابھی کوئی بھی کہانی نہیں پڑھ سکا۔ اس لیے معذرت رات پونے ایک کا وقت ہو چکا ہے۔ اب مغل انکل کے ساتھ دو گھنٹے گزار کر سو جاؤں گا۔ ادارے سمیت محفلِ یاراں کے ہر رکن کو جاندی واری والسلام۔"

فہد علی جنجوعہ، کوٹلی کی آزاد کشمیر سے مصروفیت "ماہِ اپریل کا شمارہ خلافِ توقع چار تاریخ کو ہی موصول ہو گیا۔ شمارہ ہاتھ میں آتے ہی ناقدانہ نظروں سے سرورق پر نظر دوڑائی اور جان بچا کے اڑان بھر کر سیدھے پہنچے اپنی موسٹ فیورٹ محفل چینی نکتہ چینی میں۔ اور یہاں ایک اور حیرت ہمارے لیے منتظر تھی۔ بھئی ہم صدارت کے حق دار جو ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس صورتِ حال نے ہمیں انگشت بدنداں کر دیا۔ اپنا نام کرسی صدارت پر جگمگاتا دیکھ کر ایک احساسِ تفاخر سا دل میں جاگزیں ہو گیا۔ بہرحال اپنے محبت نامے کو ترتیب دینے میں جو محنت میں نے کی تھی، اس کا پھل صدارت کی شکل میں مجھے مل گیا ہے۔ بے شک ایک ماہ کے لیے ہی سہی۔ کرسی کا نشہ کیا ہوتا ہے، اس بات کا احساس مجھے اب ہوا۔ انجینئر عمیر صاحب ٹائٹل کی حسینہ یقیناً آپ کو نہیں دیکھ رہی تھی۔ پتا نہیں آپ کس خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ ہمایوں سعید صاحب کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے میں ایک بات آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ ایف اے کے اسٹوڈنٹ ہوتے ہوئے اپنے نام کے ساتھ انجینئر کا دم چھلا کیوں لگائے ہوئے ہیں۔ علی پور چٹھہ سے ثاقب صاحب آپ کو بر تھ ڈے مبارک ہو۔ ایک بات پوچھنا تھی کہ آپ کا تخلص کون سا ہے؟ ناصر حسین صاحب کے والد کے بارے میں پڑھ کر دکھ ہوا۔ بہرحال ایک اٹل حقیقت ہے کہ ہر ذی روح کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ راحی فارس آپ موئنث ہیں یا مذکر؟ نام سے تو کچھ خاص سمجھ نہ آیا۔ انور یوسف زئی آپ صنفِ وجاہت کو صنفِ کرخت کیوں لکھتے ہو؟ بھئی آپ صنفِ وجاہت ہی ہونا؟ اس مرتبہ آغاز کاشف زبیر صاحب کی ہوس کار سے کیا جس نے ابتدا سے انتہا تک اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ مہر کی ہمت و استقلال کو داد دینی چاہیے جس نے آخر دم تک امید کا دامن نہ چھوڑا اور اپنی اور اپنے بیٹے کی جان بچالی۔ کہانی کا اینڈ پڑھ کر سانحہ بلدیہ ٹاؤن کراچی کے دلدوز مناظر آنکھوں میں گھوم گئے۔ للکار کی قسط حسبِ معمول بہترین تھی۔ گرداب میں کچھ تیزی آ گئی ہے جو اسما قادری کی ایک اچھی کاوش ہے۔ بات اگر رنگوں کی ہو تو حسبِ معمول سلیم فاروقی کا پہلا رنگ مار دھاڑ اور قتل و غارت سے بھرپور تھا۔ اگر دوسرے رنگ کی بات کی جائے جو میرے مطابق نمبر اول تھا۔ احمد اقبال اپنے روایتی انداز کے ساتھ موجود تھے۔ کہانی کا پلاٹ نہایت جاندار تھا۔ ناصر کا کردار قابلِ نفرت تھا۔ ویسے مجھے ابتدا ہی سے ناصر کی ذات پہ شک تھا۔ اگر اس ماہ کے مختصر فن پاروں کی بات ہو تو مریم کے خان کی قاتل کی تلاش مدتوں یاد رہنے والی تحریر تھی۔ اب شاید ایک دو ماہ تک محفل میں حاضر نہ ہو سکوں کیونکہ میرے گریجویشن کے پیپر ہونے والے ہیں جس کی وجہ سے آج کل بہت مصروفیت ہے۔" (اللہ آپ کو اچھے نمبروں سے کامیاب کرے، آمین)

بلیک زیرو فرام پاکیشیا گجرات کی تنقید در تنقید "طویل مدت بعد حاضری، مشینی زندگی اور زندگی کے گوناگوں مسائل میں آج کا انسان الجھ کر رہ گیا ہے۔ ملکی حالات اور مہنگائی و لوڈشیڈنگ نے زندگی کتنی کٹھن اور بے بس کر دی ہے، اس کا صحیح ادراک صرف اور صرف غریبوں کو ہو سکتا ہے۔ الیکشن کی آمد آمد ہے۔ مگر حقیقت مسلمہ یہ ہے کہ ان میں کوئی بھی سیاسی پارٹی اور سیاست دان ووٹ کے قابل نہیں۔ سرورق معصومیت اور جاسوسیت کا حسین امتزاج تھا۔ بڑی مدت اور چینی نکتہ چینی میں خط لکھنے کے لیے حاضری دی۔ صفحۂ اول پر پہلا جاسوسی تبصرہ فہد علی جنجوعہ کا تھا۔ دلی مبارک باد۔ مگر جاسوسیت پر عبور موصوف کو بہرحال نہیں تھا۔ کاوش اچھی تھی، بیسٹ آف لک۔ محمد اشفاق قریشی کی باتیں کسی بھی طور جاسوسی کے قریب قریب بھی نہ تھیں اور خط دوسرے نمبر پر (چہ خوب)۔ عمیر شہزاد بخش نے بھی صرف خواتین کے خطوط پر لب کشائی کی۔ باقی کے جاسوسی خطوط میں ماہا ایمان، انور یوسف زئی کے خطوط جاسوسی کے اعتبار سے پسند آئے۔ جاسوسی کہانیوں میں پہلی کہانی ہوس کار میں فرعونیت اور ہوس کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ حقیقت سے دور یہ کہانی اچھا خیالی پلاٹ تو ثابت ہو سکتی ہے مگر جاسوسی کی شان نہیں۔ دوسری کہانی سلیم انور کی راہِ نجات سسپنس میں ڈوبی ہوئی تھی۔ سنسنی خیز انداز لیے یہ تحریر پسند آئی۔ روبیلا کا کردار غیر معمولی تھا۔ تیسری کہانی موت کا ہرکارہ بھی خوب جاسوسی تحریر تھی۔ للکار اب گرداب کی نسبت زیادہ جاسوسی انداز میں آگے بڑھ رہی ہے۔ اس میں جاسوسی کے لوازمات کا عکس اب زیادہ ہے۔ سرورق کے رنگوں میں پراسرار محبوب خوب جاسوسی کہانی تھی اور یوٹرن میں مسٹر محمد علی فرام پاکستان کی سوچ ارادے اور لگن پر داد، ویل ڈن۔ اوور آل جاسوسی اب کی بار اچھا رہا۔"

نامعلوم مقام سے آر ایس احسان کی قرار داد "جاسوسی کی فیملی ٹھیک ہی ہوگی۔ جاسوسی سے میرا تعلق ساڑھے تین سال پرانا ہے مگر محفلِ یاراں میں پہلی بار حاضری دے رہی ہوں۔ اس امید پر کہ خوش آمدید کہا جائے گا، انشاء اللہ۔ (یقیناً خوش آمدید) پورے جاسوسی میں ہیرے لال بچے ہوتے ہیں۔ اسما قادری جی اور للکار کے طاہر جاوید مغل جی بادشاہ اور ملکہ کا تاج سر پر سجائے فخر سے ہمیشہ مسکراتے ملے۔ امید سلیم تو کبھی سلیم فاروقی سپاہ سالار کا کردار ادا کرتے تو کبھی کوئی اور۔ کاشف زبیر اچھے عہدے پر فائز ہیں اور ہمارے جاسوسی کے باقی سپاہی وکیل جج وغیرہ سب منظم طریقے سے اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ مجھ ناچیز کو بھی لکھنے کا شوق ہے۔ میری چھوٹی سی تحریر کو پڑھ کر ضرور بتایئے گا قابلِ اشاعت ہے یا..." (معذرت کے ساتھ آپ کی تحریر قابلِ اشاعت نہیں)

فتح پور لیہ سے محی الدین اشفاق کا انکشاف "اس مرتبہ جاسوسی 5 تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل حسینہ وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ کا عملی نمونہ پیش کر رہی تھی اور صنفِ وجاہت کے لیے فکر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ بہرحال حسینہ نے متاثر کیا۔ محفل میں اس مرتبہ فہد علی جنجوعہ کرسی صدارت پر بیٹھے تھے، مبارک باد۔ عمیر شہزاد بخش کی لڑکھڑاہٹ بے حد اچھی لگی۔ تھینکس بہرحال احوال دریافت کرتی اور مشورے دیتی دلنشین بلوچ کا ہلکا پھلکا تبصرہ پسند آیا۔ ماہا آپی! ڈرائیں نہیں، آئندہ احتیاط کروں گا نجی جی۔ ایک خوشی سب کے ساتھ شیئر کرنا چاہتا ہوں۔ میری سسٹر جو کہ معروف چلڈرن اسٹوری رائٹر ہیں، کو 10 اپریل بروز بدھ کو ملتان رضا ہال میں رائٹر ایوارڈ دیا گیا۔ نوائے وقت کے زیرِ اہتمام تقریب میں۔ (بہت بہت مبارک) ثاقب تبسم کا نگینہ "تبصرہ" جاندار تھا۔ عبدالوہاب صاحب کو محفل میں ویلکم کہتے ہیں۔ للکار میں عمران اور تابش آرا کوئے کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ رتنا گری میں بودھ مندر میں عمران اور تابش کا پہنچ جانا بہت سنسنی خیز تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ سب کچھ پڑھنے کے بجائے دیکھ رہے ہوں، تمام سین فلم کی طرح آنکھوں کے سامنے چل رہے تھے۔ مہناز کو بودھ مندر میں دیکھ کر حیرانی ہوئی۔ امید ہے اگلی قسط زیادہ سنسنی لیے ہوگی۔ اولین صفحات پر کاشف زبیر کی کہانی میں مہر جیسی غریب عورت کو ظفریاب نے جھوٹی محبت کا جھانسا دے کر اپنے جال میں پھنسا لیا مگر عین وقت پر ظفریاب کا منصوبہ مہر پر عیاں ہو گیا اور وہ ظفریاب کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی۔ یوٹرن جس میں رنگ بھرے احمد اقبال کے زبردست قلم نے اور وہ سرورق کی دوسری کہانی تھی۔"

حافظ آباد سے ماہا ایمان کی حاضری "امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ ماہنامہ سسپنس کا انتظار کرتے کرتے 2 تاریخ آ گئی جو کہ اس بار ریکارڈ لیٹ ہوا تبھی پاکر انکل سسپنس کے ساتھ جاسوسی بھی پکڑا گئے۔ (آپ کو ماکرے ضرور پوچھنا چاہیے کہ سسپنس اتنی دیر سے کیوں پہنچایا جبکہ سسپنس کو مارکیٹ میں آئے 15 روز سے زیادہ ہو چکے تھے) ٹائٹل پر تین قیامت ڈھاتی خوب صورت نینوں والی خوش جمال اداؤں والی پری چہرہ براجمان تھیں ترچھی نظروں سے دیکھ رہی ہے اور امپریس تو خیر اس نے ہونا ہی ہے اور پروانے حضرت اپنی خیالی محبوبہ کے خیالوں میں کھوئے مسکرا رہے ہیں اور نیچے والا تو لگا کہ جیسے خنجر لیے میری ہی طرف دوڑتا چلا آ رہا ہے۔ کوٹلی آزاد کشمیر سے آئے فہد علی جنجوعہ تبصرہ تو آپ کا قابلِ تعریف تھا لیکن آپ کی کوتاہ نظری پہ افسوس ہے کہ آپ محبت اور خلوص کو خوشامد گردانتے ہیں۔ لاہور سے محمد اشفاق قریشی انکل ڈیئر آپ کی رائے سر آنکھوں پر لیکن بتاتی چلوں خوش گفتاری کے ساتھ ساتھ خوش اخلاقی میں بھی میرا کوئی ثانی نہیں، ہاں کوئی میرے بارے میں غلط کہے تو جواب عرض کے طور پر دے لیما میری سرشت میں شامل ہے۔ آئندہ بھی حافظ آباد آنا ہو یا گزر ہو بتایئے گا۔ آپ کی میزبانی کر کے خوشی ہوگی۔ کوئی بنوں والے بھائی کو بھی دیکھو پچھلی بار داتے اچھے کمنٹس پڑھ کے ہوش و حواس تو نہیں کھو بیٹھے موصوف... دلنشین بلوچ کا سادہ اور دلکش تبصرہ اچھا لگا اور پلیز ذرا جلدی جلدی حاضری دیا کرو۔ کہانیوں میں اس بار کاشف زبیر صاحب کی حرص و ہوس کے جال میں پھنسنے خود کو طرم خان سمجھنے والے ہوس کار کی داستان پڑھی۔ مہر نے انجانے میں ایک گرداب میں قدم رکھ دیا لیکن پھر اپنی فطری ذہانت سے کام لیتے ہوئے اپنے شوہر کے منصوبے کو ناکام بنانے کے ساتھ ساتھ ڈیڑھ سو دیگر لوگوں کی جانوں کو بھی بحکمِ اللہ کی مدد سے بچایا۔ طویل تحریروں میں للکار میں مزید پیش رفت ہوئی اور عمران مع تابش نے شیروں کی کچھار میں نہ صرف قدم رکھا بلکہ انہیں نکیل بھی ڈال دی۔ دیکھتے ہیں ڈاکٹر مہناز کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ گرداب میں اس بار ہلکا سا ڈگر ماویا لو کا بھی ہوا۔ اس کا جوڑی دار مجھے پسند نہیں ہے۔ شہریار اور سلوا آسمان سے گر کے کھجور میں اٹکے اور اب دوبارہ سے دہلی کو عازمِ سفر ہوئے۔ سرورق کے رنگوں میں پہلا رنگ سلیم فاروقی کے مخصوص اسٹائل سے کچھ ہٹ کے تھا مگر ان کی چھاپ نمایاں تھی تحریر پر۔ امجد علی کی اصول پرستی اور خودداری کو میں تے بہت آئیڈلائز کیا۔ کہانی کے تانے بانے مہارت سے بنے گئے تھے۔ سرورق کی دوسری کہانی احمد اقبال کی یوٹرن تھی۔ کبھی کبھی گزرے وقت کو آواز دینا اچھا لگتا ہے لیکن گزرا وقت لوٹ آئے، یہ ممکن نہیں۔ محبت اور منزل کی تلاش میں بھٹکے کرداروں کی داستان عجب رنگ لیے ہوئے تھی۔"

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

حافظ شاہد عمران و ناصر حسین ہرل، سینٹرل جیل گوجرانوالہ۔ اسلم پرویز، حیدرآباد۔ نامعلوم۔ تفسیر عباس بابر، اوکاڑہ۔ عبدالمنان، چوچک اوکاڑہ۔ وسیم خان، کراچی۔ انجم فاروق ساحلی، لاہور۔ سید اکبر شاہ، مانسہرہ۔ طاہرہ گلزار، پشاور۔ مصدق محمود دانش، گجرات۔ عبدالوہاب، لاہور۔ ثمینہ حبیب، کوئٹہ۔ عبدالغفور خان، اٹک۔ کبیر عباسی عرف شہزادہ کوہسار، مری۔ عزا۔ ر تزئین، سرائے عالمگیر۔

واپسی کا سفر

احمد اقبال
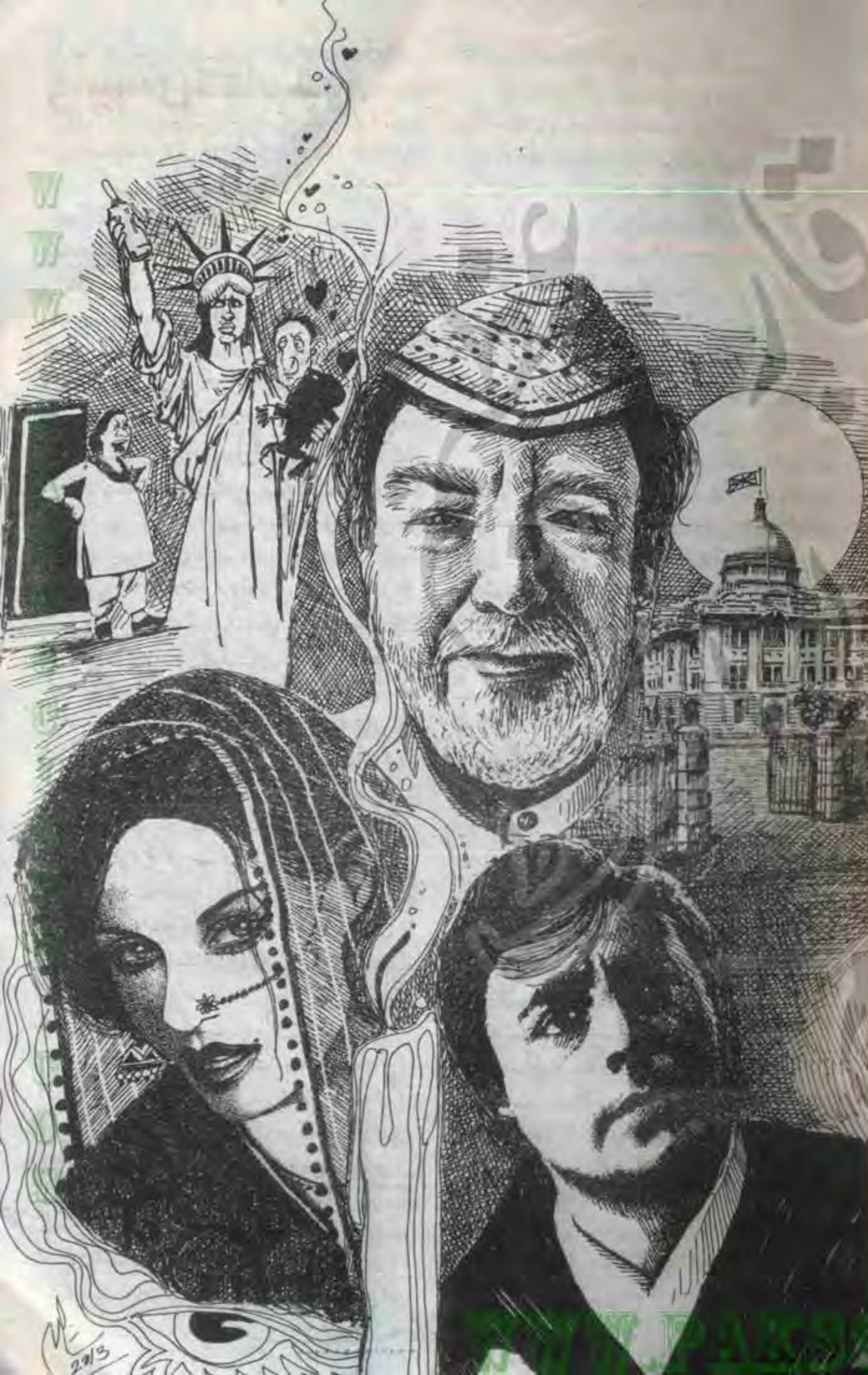
سفر جاری ہے اور گردِ سفر محمل سے آگے ہے
مسافت وہ ہے جس میں راستہ منزل سے آگے ہے
یہاں تک تو میں خود پہچانتا ہوں اپنے قاتل کو
مگر اک اور صف ہے جو صفِ قاتل سے آگے ہے

ہر شخص زیست میں زیست حاصل کرنے کا کھیل... کھیلنا چاہتا ہے... اس کھیل کے آغاز میں اندازہ نہیں ہوتا کہ فاتح کون ہو گا... ہر کھلاڑی... ہر بازی گر اپنی طرف سے بہترین چالیں چلتا ہے... مگر پھر بھی کسی ایک کی قسمت میں شہ مات لکھی ہوتی ہے... اس نے بھی نہایت ذہانت سے اپنے ارادوں کی پختگی سے بساطِ زندگی پر اپنی چال چلی تھی... اور اس کو یقین تھا کہ بازی اس کے ہاتھ رہے گی...

دورِ حاضر کے تقاضوں اور حالات کی عکاس تلخ و شیریں داستان رنگ بہ رنگ

قبلہ بڑے حکیم صاحب کا مطبِ خاص دو حصوں پر مشتمل تھا۔ کسی زمانے میں یہ ایک ہی دیوان خانہ تھا۔ بعد میں ضرورت کے تحت درمیان میں دیوار اٹھا کے اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ عملاً یہ تین حصے تھے۔ اندر بارہ فٹ لمبے اور چوڑے حصے میں حکیم صاحب ایک تخت پر آج بھی حکیم شاہی جیسی حمکنت کے ساتھ فروکش ہوتے تھے۔ آٹھ فٹ چھ فٹ کے دو فٹ اونچے تخت پر جو سرخ ایرانی قالین بچھا ہوا تھا، اس کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ سو سال پہلے جب ملکہ وکٹوریہ کا دلی دربار لگا تھا تو راجے مہاراجے اور نوابوں کے ساتھ ان کے درباروں سے وابستہ ممتاز شخصیات کو بھی طلب کیا گیا تھا۔ قبلہ بڑے حکیم صاحب کے پردادا بھی انہی میں شامل تھے۔ انہیں یہ ایرانی قالین انعام میں ملا تھا۔

دروغ برگردن راوی... یہ پردادا بس مردوں کو زندہ کرنے پر قادر نہیں تھے ورنہ سارے جہان کے حکیم، وید، ڈاکٹر جسے جواب دے دیتے تھے، قبرستان جانے کے بجائے ان سے رجوع کرتا تھا تو صحت یاب ہو کے عمرِ طبعی گزارتا تھا۔ ملکہ وکٹوریہ نے ان کو طلب کر کے اپنی کسی قدیم موروثی بیماری کا علاج دریافت کیا جو دنیا بھر کے ماہرین سمجھ نہ پائے تھے اور انہوں نے تشخیص کے بعد جو دوا دی، اس نے نہ صرف ملکہ کو شفا دی بلکہ انہوں نے سو سال سے زائد عمر

پائی۔ قالین انہیں وائسرائے نے ملکہ کی طرف سے بھیجا تھا۔
اب قالین کا رنگ گرد اور میل سے سیاہی مائل ہو رہا تھا اور اس کے گل بوٹے بھی غائب ہو چکے تھے چنانچہ قالین پر اب سفید چاندنی پھیلا دی جاتی تھی۔ ایک گاؤ تکیے کا سہارا لے کر (جس پر گوٹے والا بنارسی غلاف تھا) خود حکیم صاحب ایسے بیٹھتے تھے جیسے مغل شہنشاہ اپنے دربار میں۔ وہ آج بھی زربفت کی شیروانی، چوڑی دار پاجامہ اور کشتی نما ٹوپی استعمال کرتے تھے۔ اپنی عمر کے ساٹھ سے زیادہ سال گزارنے کے بعد ان کی داڑھی بالکل سفید اور ایک بالشت لمبی ہو گئی تھی۔ وہ ایک ہاتھ میں حقے کی نے تھامے رہتے تھے اور دوسرے سے مریض کی نبض تھامے اس کی بک بک سنتے رہتے تھے۔ پھر قلم اٹھا کے نسخہ لکھ دیتے تھے۔ اس پر دوا اور مشورے کی رقم بھی درج ہوتی تھی۔ یہ رقم وصول کر کے وہ قالین کا ایک کونا اٹھاتے تھے اور نیچے دبا کے پھر اس پر گاؤ تکیہ رکھ دیتے تھے۔ قبلہ بڑے حکیم صاحب کی آن بان اور شان اب ایک ڈراما تھی۔ ایک کاروباری ضرورت... ان کا یہ گیٹ اپ مریضوں کو متاثر کرتا تھا۔

باہر والے حصے میں اپنی باری کے منتظر مریض بیٹھتے تھے۔ ایک دیوار کے ساتھ لگی بینچوں کی قطار حضرات کے لیے وقف تھی۔ اس کے مقابل دوسری طرف "خواتین" لکھا ہوا تھا۔ لیکن اب فرق کوئی نہیں کرتا تھا۔ جس کا جہاں دل چاہتا تھا، چلا جاتا تھا۔ آنے والوں میں ویسے بھی خواتین کا تناسب بہت کم تھا۔ اسی حصے کے دوسرے کنارے پر ہارڈ بورڈ کے پارٹیشن کے پیچھے دواخانہ تھا جہاں "چھوٹے حکیم صاحب" نسخہ دیکھ کر سب کو دوا پکڑا دیتے تھے۔ حکیم صداقت حسین نے کاروباری پیش بندی کرتے ہوئے اپنے اکلوتے فرزند شرافت حسین کو خود حکمت پڑھائی اور سکھائی تھی اور مناسب وقت پر اسے خود ہی چھوٹے حکیم صاحب کے خطاب سے مشہور کر دیا تھا۔ اب ان کا جانشین اس جدی پشتی خاندانی کاروبار کو سنبھالنے کے لیے بالکل تیار تھا۔

یہ الگ بات ہے کہ خود شرافت اس کام کے علاوہ دنیا کا ہر کام کرنے کے لیے تیار تھا جس میں اب نہ عزت رہی تھی اور نہ دولت... جو شہرت تھی، وہ بھی بدنامی تھی۔ شہر بھر کی دیواروں پر لکھے ہوئے امراض کے نام پڑھ کے خواتین منہ پھیر لیتی تھیں اور مرد غور سے پڑھ کے آزمانے بھی چلے آتے تھے۔ شرافت کا مسئلہ یہ تھا کہ نہ وہ اور کچھ کر سکتا تھا اور نہ اسے کرنے کی اجازت تھی۔ اپنی تمام تر ناپسندیدگی اور بیزاری کا اظہار کرنے کے باوجود وہ اس کنوئیں کا مینڈک رہنے پر مجبور تھا جو اب خشک ہوتا جا رہا تھا اور بدبودار بھی...

اس وقت بھی میلی دیواروں، اکھڑے فرش اور بدرنگ بینچوں پر بلب کی زرد روشنی میں جو مریض بنے بیٹھے تھے، وہ سب مرد تھے اور ان میں زیادہ تعداد عمر رسیدہ افراد کی تھی اور وہ سب ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے کیونکہ ایک دوسرے کے خیال میں وہ سب پوشیدہ و پیچیدہ امراض کا شکار تھے۔ بیشتر لوگ شوقین مزاج تھے اور بہ آسانی لوٹے جا سکتے تھے۔ شرافت کا ایک دکھ یہ بھی تھا کہ وہ باپ کے اس کام میں پوری طرح شریک تھا مگر اس کی اپنی آمدنی نہ ہونے کے برابر تھی۔ کبھی وہ خود کچھ مار لیتا تھا تو کبھی ماں اسے دلوا دیتی تھی۔ باپ کے نزدیک ابھی اس کی ضروریات ہی کیا تھیں۔ پیسا بڑی محنت سے کمایا جاتا ہے۔

محنت... اس نے تلخی سے سوچا۔ ملک صاحب کے بعد جانے والا مریض اب بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا اور بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ اندر ملک صاحب بڑے خشوع و خضوع سے حال دل زار سنا رہے تھے جو ایک طرح سے ان کی گمشدہ جوانی کی ایف آئی آر تھی۔ ستر سال کی عمر میں انہیں فکر لاحق ہو گئی تھی کہ چوتھی شادی کا شرعی فریضہ پورا کیے بغیر ہی وہ اس عالم فانی سے کوچ کر گئے تو منکر نکیر کو کیا جواب دیں گے۔ بیس منٹ سے وہ اپنے فرسودہ و ناکارہ اعضائے رئیسہ کی کارکردگی کے بارے میں جو رپورٹ پیش کر رہے تھے، وہ وزارتِ بجلی کی کارکردگی پر سرکاری کمپنی کی رپورٹ سے زیادہ امید افزا نہیں ہو سکتی تھی۔

ملک صاحب اپنی لڑکھڑاتی ٹانگوں اور عصائے پیری کے ساتھ بے بال سر پر دستار سنبھالتے برآمد ہوئے تو شرافت نے ایسا ہی ایک اور نمونہ اندر ارسال کیا جو یوں ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا جیسے انتظار میں اس کی شبِ وصل گزری جا رہی ہو۔ ملک صاحب نے قبلہ بڑے حکیم صاحب کا لکھا ہوا نسخۂ شباب آور اس کی طرف بڑھایا اور بولے۔ "بھئی اپنے چھوٹے حکیم صاحب! ہم نے سنا ہے خیر سے تم بھی کم نہیں ہو... قبلہ بڑے حکیم صاحب کی جانشینی میں... ایک خاص کام ہے اگر کر سکو۔"

شرافت چونکا۔ "آپ بتائیے ملک صاحب۔"

ملک صاحب نے دزدیدہ نظر سے اندر کی طرف دیکھا۔ "بھئی وہ اپنا ایک جگری یار ہے۔"

"اس کا بھی جگر خراب ہے؟" شرافت نے پہلے سے پیک کیا ہوا "نئی جوانی گولڈن پیکیج" ان کے حوالے کیا۔

"جگر خراب ہے یا کچھ اور... یہ تو خود ہی دیکھو جا

کے... تمہارے والد صاحب تو کہیں آتے جاتے نہیں۔"

"گھر پر جا کے میں نے کبھی نہیں دیکھا۔" شرافت نے رکھائی سے کہا۔

"او یار منہ مانگی فیس ملے گی... بس رازداری کی شرط ہے۔" ملک صاحب نے اسے آنکھ ماری۔

شرافت کے دماغ میں ایک گھنٹی سی بجی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس کے اندر کی آواز نے کہا۔ "آپ فکر نہ کریں۔ کسی کو بھی کچھ معلوم نہیں ہوگا... لیکن قبلہ بڑے حکیم صاحب کو بھی معلوم نہ ہو... ورنہ وہ بہت ناراض ہوں گے۔ یہ ہماری خاندانی وضع داری کے خلاف ہے۔"

"ورتع کر اس فضول وضع داری کو... مال بنا پتر مال۔" انہوں نے بے تکلفی سے شرافت کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "یہ آپس کی بات ہے۔"

"میں کل جا سکتا ہوں... جمعہ ہے... مطب بند رہے گا۔" شرافت نے مسکرانے کی کوشش کی۔

ملک صاحب نے خضاب سے سیاہ مونچھوں پر مردانہ وار ہاتھ پھیرا۔ "بس تو راجا صاحب کو آج بتا دوں گا۔" انہوں نے کہا اور پھر باہر جاتے جاتے جیسے انہیں کچھ یاد آیا۔ "اپنے چھوٹے حکیم صاحب... ہم نے بڑی تعریف کی تھی تمہاری..."

"آپ فکر نہ کریں ملک صاحب... اللہ شافی ہے۔ میں پوری کوشش کروں گا۔"

ملک صاحب کا ڈرائیور جو باہر تاریکی میں ایک درخت کے پیچھے ان کی واپسی کا منتظر تھا، گاڑی سامنے لے آیا۔ ملک صاحب نے دوبارہ دہرایا۔ "بندہ چنگا ہے اور دل کا بھی کھلا ہے۔ خوش کر دے گا تمہیں۔" اور اپنی شاندار چمکتی دمکتی سیاہ کار میں بیٹھ گئے۔ قبلہ بڑے حکیم صاحب کے "قدیمی شاہی دواخانہ خاص" سے فیض یاب ہونے کے لیے مریض اسی طرح رات کی تاریکی میں منہ چھپائے آتے تھے اور ان کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ مایوس مریضوں کی آخری علاج گاہ واقع گھاس منڈی باغبانپورہ میں نہ دیکھے جائیں۔

حالات کی تصویر کسی حد تک شرافت کے سامنے آگئی تھی۔ اب مرحلہ اپنے والدِ ماجد کے سکھائے پڑھائے کاروباری اصولوں کو زیادہ ہوشیاری سے استعمال کرنے کا تھا۔ ملک صاحب نے اسے خفیہ آمدنی کی ایک نئی راہ سجھا دی تھی۔ اگلی صبح جب قبلہ بڑے حکیم صاحب فجر کی آوازِ اذان کے ساتھ ہی مسجد جانے کے لیے اٹھے تو انہوں نے شرافت کو بھی جگا دیا۔ شرافت نے بڑی معصومیت سے ایک عذر پیش کر دیا۔ "آپ چلیے... میں غسل کر کے آتا ہوں۔" اور حکیم صاحب نے اس عمر میں صبح دم غسل کی ضرورت کو سمجھتے ہوئے فقط سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

ان کے جاتے ہی شرافت نے باہر نکل کر دیکھا۔ دوسرے کمرے میں اس کی ماں قبلہ رو جانماز پر بیٹھی تھی اور دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ کچھ اونچا سنتی تھی چنانچہ شرافت نے صحن عبور کر کے اطمینان سے مطب کا دروازہ کھولا اور نئی جوانی گولڈن پیکیج نسخۂ خاص کو آج کل کی ضرورت کے مطابق ساتھ لے لیا۔ نسخۂ خاص میں "کشتۂ فولاد عنبری جواہر والا" اور "ایٹمی معجون کایا کلپ اصلی سلاجیت والی" شامل تھی۔ اس کے ساتھ روغنِ خاص "عروسی حکیم جالینوس والا" مفت دیا جاتا تھا۔

دوپہر سے پہلے اس نے بڑی معصومیت کے ساتھ والدہ ماجدہ سے عرض کی کہ آج وہ ان کی صحت اور درازیٔ عمر کی خصوصی دعا کے لیے نمازِ جمعہ بادشاہی مسجد میں باجماعت ادا کرے گا۔ قبلہ بڑے حکیم صاحب نے سعادت مندی کے اس مظاہرے پر بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ شرافت ان کا صحیح جانشین ثابت ہو رہا تھا۔ انہوں نے شرافت کو اس نیکی کا انعام بطورِ خاص سو روپے کا ایک نوٹ دے کر کیا۔ اس نے بیڈن روڈ پر از تسری حلوائی کی پنیروں والی لسی پینے کے بعد کچھ دیر آوارہ گردی میں گزارا... پھر لکشمی چوک سے بٹ اسپیشل کڑاہی کھا کے اپنے مریضِ خاص کے گھر کا رخ کیا... شرافت اس بچے کی طرح خوش تھا جس نے ماں کے خفیہ بینک سے پانچ دس روپے اڑا لیے ہوں مگر ماں کو پتا ہی نہ چلا ہو۔

ماڈل ٹاؤن میں "راجا کاٹیج" اپنے نام کے برعکس چار کنال پر محیط وسیع دو منزلہ عمارت تھی جس کے در و دیوار اور سبزہ و چمن مکینوں کی عدم توجہی کا شکوہ کرتے نظر آتے تھے۔ اوپر نیچے کی تمام کھڑکیوں کے پٹ بند تھے لیکن کہیں کہیں ٹوٹے ہوئے شیشوں سے خانہ ویرانی جھانک رہی تھی۔ اوپر کی منزل سے ایک شیشے سے نکل کر اڑنے والی چڑیا بتاتی تھی کہ اوپر کی منزل پر یہ خواب گاہ اب اس کی ہے۔ عمارت کے رنگ کو دھوپ اور بارش نے باری باری دھویا تھا اور اڑا دیا تھا۔ اب شاید نہ کسی کو فرصت تھی نہ ضرورت اور نہ استطاعت کہ اپنے قابلِ فخر اثاثے کی خوب صورتی پر توجہ دے۔ یہی حال عمارت کے گرد پھیلے ہوئے گھنے شاداب اور عمارت کو سایہ دار حصار میں رکھنے والے درختوں کا تھا...... لان پر پیاسی گھاس زرد اور خشک ہو رہی تھی۔ موسم کے پودے سوکھ گئے تھے۔ صرف گلاب تھے جو کہیں کہیں رنگ دکھلا رہے تھے۔

یوں لگتا تھا جیسے اس وسیع عمارت میں اب کوئی

نہیں رہتا۔ جب یہ بنی ہو گی تو ایک پورے خاندان کو اگلی نصف صدی تک پُرآسائش زندگی کے لیے قابلِ فخر رہائش کی ضامن ہو گی مگر مکین بہت پہلے ہی اپنی اپنی زندگی کی سمت کا خود تعین کر کے مکان کو تنہا چھوڑ گئے۔ شرافت نے دروازے پر لگی کال بیل کا بٹن دبایا۔ اسے کوئی صدائے بازگشت سنائی نہ دی۔ دوسری بار بٹن دبا کے اس نے کچھ وقت لیا۔ وہ آخری بار کوشش کر کے مایوس لوٹ جانے کی سوچ رہا تھا کہ برآمدے کے .... دروازے سے ایک عورت باہر آئی۔ قریب آنے پر شرافت نے اس کی عمر کا اندازہ چالیس سال کیا۔ وہ بھاری بدن کی گوری چٹی عورت تھی جس کا رنگ گہرے سرخ لباس میں اور چمک اٹھا تھا۔ اس کے ہونٹوں کی لالی بھی ماحول کی مجموعی افسردگی کے برعکس شوخ تھی۔

''یہ راجا گلریز خان کا گھر ہے؟'' شرافت نے عورت کی بے باک نظر کی تاب نہ لا کے نظر جھکالی۔

''باہر ان کا نام لکھا ہے تو اس کا کیا مطلب ہے... کیا کام ہے تمہیں ان سے... وہ دوپہر کے کھانے کے بعد آرام کر رہے ہیں اور اس وقت کسی سے نہیں ملتے۔'' عورت نے کچھ شوخی اور کچھ اکتاہٹ کے ساتھ گویا بات ختم کر دی۔

''مجھے انہوں نے ملک صاحب کے ذریعے بلوایا تھا... علاج کے لیے...''

عورت ہنس پڑی۔ ''ایسے کہو نا کہ تم چھوٹے حکیم صاحب ہو۔ صورت سے نہ تم حکیم نظر آتے ہو اور نہ چھوٹے۔''

وہ عورت کے پیچھے چل پڑا۔ اس کے خیال کے مطابق یہ عورت راجا صاحب کی بیوی ہی ہو سکتی تھی، نوکرانی نہیں۔ اس کے پیچھے وسیع لاؤنج اور ایک بیڈ روم سے گزر کے وہ پچھلے حصے میں پہنچا۔ گھر کے اندر بھی پرانے فرنیچر پر تاریکی اور ویرانی نے گرد کے ساتھ ڈیرا ڈال رکھا تھا۔ راجا صاحب پچھلے حصے کے برآمدے میں ایک .... کرسی پر نیم دراز تھے۔ وہ شرافت کے اندازے کے مطابق ساٹھ سال سے زیادہ عمر کا شخص تھا جو بیماری کے باعث ستر کا نظر آ رہا تھا۔ وہ دراز قد اور دبلا پتلا تھا اور دن میں بھی نائٹ سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے سفید بال عمر کے لحاظ سے کافی تھے اور سلیقے سے پیچھے کی طرف بنے ہوئے تھے۔ اس کے انداز و اطوار میں ایک پرانے بیوروکریٹ کی رعونت تھی... جب اس نے شرافت سے ہاتھ ملایا اور اسے بیٹھنے کو کہا تو یوں جیسے وہ اس کا ماتحت ہے۔

''ملک نے مجھ سے تمہارا ذکر کیا تھا لیکن تم تو کہیں سے بھی حکیم نہیں لگتے۔''

شرافت نے سادگی سے کہا۔ ''اس میں میرا کیا قصور ہے؟''

وہ مسکرایا۔ ''ہاں، شاید تمہیں بھی نہیں لگتا ہو گا کہ میں پہلے اسی علاقے کا کمشنر تھا۔''

''آپ بتائیے شکایت کیا ہے... اگر مناسب ہو تو اپنی بیگم صاحبہ...''

اس نے خفگی سے کہا۔ ''یہ میری بیوی نظر آتی ہے تمہیں؟ یہ میری ملازمہ ہے ریشم... میری پہلی بیوی میانی صاحب کے قبرستان میں لیٹی ہے اور دوسری امریکا میں کسی گورے کے ساتھ پڑی ہو گی اس وقت... خیر، پہلے بتاؤ تم چائے پیو گے یا کافی؟''

شرافت کو اس شخص کے جارحانہ مزاج پر غصہ آیا مگر وہ پی گیا۔ ''آپ چائے منگوا لیں۔''

ریشم نے ناگواری سے چھوٹے حکیم صاحب پر ایک شکایتی نظر ڈالی اور اندر چلی گئی۔ شاید وہ وہاں موجود رہنا چاہتی تھی اور شرافت محسوس کرتا تھا کہ راجا صاحب کے امراض پر کسی عورت کی موجودگی میں بات نہیں کی جا سکتی۔ ''میں مریض سے کسی کے سامنے بات نہیں کرتا راجا صاحب... اور شاید آپ کو اپنا مسئلہ بھی اکیلے میں بتانا چاہیے۔''

''تم کہتے ہو تو ریشم بھی نہیں آئے گی... اب وہی رہ گئی ہے یہاں... اور کوئی آنا تو کیا، فون پر بھی پوچھنا پسند نہیں کرتا کہ آج میں زندہ بھی ہوں... وہ سب امریکا، کینیڈا اور برطانیہ میں عیش کر رہے ہیں... اسی تعلیم کی بدولت جو میں نے انہیں دلائی... اسی پیسے سے جو میرا تھا۔''

شرافت کو ایک گھنٹے تک بہت کچھ سننا پڑا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ راجا صاحب کے مسئلے جسمانی ہی نہیں نفسیاتی بھی تھے۔ بیوی بچے اسے چھوڑ گئے تھے۔ وہ اس جگہ، شہر یا ملک سے جانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ یہاں وہ حاکم رہا تھا۔ وی آئی پی تھا اور مالک تھا۔ باہر جا کے اس کی دو کوڑی کی اوقات ہو جاتی۔ پہلے اس کا ایک بیٹا گیا... پھر دوسرا... بیٹوں کی شادی کے بعد بیوی نے مطالبہ کیا کہ اب انہیں بھی بیٹوں کے پاس باہر چلے جانا چاہیے... یہاں اکیلے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔ باہر جا کے وہ خوار ہونا نہیں چاہتا تھا۔ وہاں کسے فرصت تھی کہ اس کو توجہ دے۔ بیٹے بالآخر اسے اولڈ ہوم میں جمع کرا دیتے اور بھول جاتے۔ اس کی دوسری بیوی عمر میں نصف سے بھی کم تھی بلکہ ایک بیٹی سے چھوٹی تھی۔ اس کو گئے ہوئے بھی پانچ سال سے زائد ہو گئے تھے۔ بیٹیاں پہلے ہی باہر بیاہی گئی تھیں۔ اب عید بقرعید

کے سوا اسے کوئی فون بھی نہیں کرتا تھا۔ خود اس نے جب فون کیا تو اسے ریکارڈنگ مشین نے جواب دیا۔ اس کے پیغام ریکارڈ کرانے کے باوجود کسی نے بھی پلٹ کے اس سے رابطہ نہیں کیا تو اس نے بھی سب سے تعلق توڑ لیا۔

پانچ سال سے نوکر اس کی خدمت کر رہے تھے۔ ایک شوفر تھا جو فون کر کے پوچھ لیتا کہ اس کی ضرورت ہے یا نہیں۔ کبھی کبھار اسے بلانے کے وہ ہر ماہ پانچ ہزار ادا کرتا تھا۔ کسی زمانے میں وہ کمشنر صاحب کی سرکاری گاڑی چلاتا تھا۔ گھر کے کام کاج اور کھانے پکانے کے لیے اب یہ عورت ریشم تھی جس کے شوہر کا سعودی عرب میں سر قلم کر دیا گیا تھا۔ اس نے ایک سعودی کی سب سے چھوٹی بیوی کو اغوا کر کے اس کی آبروریزی کی تھی اور پھر قتل کر دیا تھا۔ تب سے یہ عورت راجا صاحب کی خدمت کر رہی تھی۔ راجا صاحب نے بتایا کہ ریشم دن رات ان کے ساتھ ہوتی ہے اور اس نے کبھی کسی خدمت سے انکار نہیں کیا۔ اب ان کا خیال ہے کہ ریشم سے تعلق کو ایک قانونی اور شرعی حیثیت دے دی جائے۔ یہ عورت اس کی ہر طرح سے حق دار ہے۔ دوسری طرف اس شادی کے بعد وہ سب حقِ وراثت سے محروم ہو جائیں گے جو باہر اس کی موت کی خبر سننے کے انتظار میں گِدھوں کی طرح بیٹھے ہیں۔ مرنے سے پہلے وہ سب کچھ قانونی طور پر ریشم کے حوالے کر دے گا۔

اس طویل تمہید کا حاصل یہ تھا کہ چھوٹے حکیم صاحب اس شادی کو حقیقی معنوں میں دونوں فریقوں کے لیے کس طرح خوشگوار بنا سکتے ہیں؟ اس کی گفتگو سنتے ہوئے شرافت نے طے کیا کہ اس نے بہتی گنگا میں ہاتھ نہ دھوئے تو بڑا ہی بے وقوف ہو گا۔ ریشم تو اس میں اشنان کرے گی، راجا صاحب کی کمشنری تو خوابِ فردا ہوئی۔ اب جو ہے ان کی دولت ہے جس پر سب کی نظر ہے۔ سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے۔ راجا صاحب بھی ایسے ہی جائیں گے مگر وہ خالی ہاتھ واپس کیوں جائے؟ اس نے بڑی ہوشیاری سے راجا صاحب کے من کی مراد پوری کرنے کا پورا نسخہ بنا لیا جس میں خود اپنی مرادیں پوری ہونے کا سامان بھی تھا۔

راجا صاحب اپنی تمام جمع پونجی حقیقی وارثوں کے سوا کسی اور کو دینے کے لیے کمربستہ تھے۔ ان کا اصل مقصد تو وارثوں کو سزا دینا تھا۔ شرافت نے انہیں یقین دلایا کہ چالیس دن میں اس کی حکمت کے جادو اثر نسخے ان کو واقعی نئی جوانی دے سکتے ہیں... لیکن نایاب چیز بہرحال انمول ہوتی ہے۔ کھوئی ہوئی جوانی آسانی سے واپس نہیں ملتی۔ اس کی قیمت بھی بہت بڑی ادا کرنی پڑتی ہے۔ حسبِ توقع راجا صاحب نے کہا کہ وہ علاج کرے... اسے منہ مانگا معاوضہ اور انعام ملے گا۔

شرافت ہر جمعے کو پرانا نسخہ ایک نئے نام سے لاتا رہا اور منہ مانگی قیمت وصول کرتا رہا۔ اسے چار ملاقاتوں میں اندازہ ہو گیا تھا کہ ریشم کے راجا صاحب سے ازدواجی مراسم تو پہلے سے قائم ہیں لیکن ایک تو خود راجا صاحب اپنی کارکردگی سے مطمئن نہیں اور سنجیدگی سے سوچ رہے ہیں کہ اس تعلق کو شرعی اور قانونی حیثیت دینے کے بعد ریشم انہیں ایک وارث بھی دے سکتی ہے۔ دنیا میں ناممکن کیا ہے۔

پہلے ہفتے کے لیے شرافت نے راجا صاحب کو وہی دوائیں دیں جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس کورس کی قیمت مطب میں مریض کی حالت اور حیثیت کے مطابق وصول کر لی جاتی تھی۔ پانچ سو روپے سے پانچ ہزار تک... راجا صاحب آخری کیٹیگری میں آتے تھے اور شرافت ان سے پانچ ہزار ہی وصول کرتا مگر اسے ایک خوش گوار حیرت ہوئی جب اس کے کچھ مانگنے سے پہلے ہی راجا صاحب نے اسے دس ہزار پیش کر دیے۔ راجا صاحب پر نفسیاتی اثر زیادہ ہوا۔ کچھ تو ملک صاحب نے اس کی تعریف میں مبالغہ آرائی کی تھی، کچھ بہرحال راجا صاحب کو احساس تھا کہ ''نئی جوانی'' کی منزل کی طرف انہوں نے پہلا قدم بڑھا دیا ہے۔

دوسرے ہفتے شرافت نے واقعی شرافت دکھائی اور بطورِ خاص راجا صاحب کے لیے خالص اجزا پر مشتمل آزمودہ دوائیں لے کر گیا۔ راجا صاحب نے کہا کہ وہ بہت بہتر محسوس کر رہے ہیں۔ اسے پُرتکلف چائے بھی پلائی اور آئندہ ہفتے کے لیے اس کو دوپہر کے کھانے کی دعوت دے دی۔ وہ پھر دس ہزار جیب میں ڈال کے نکلا تو باہر اس کی ملاقات ریشم سے ہوئی جو اسی کے انتظار میں تھی۔ اسے اندازہ ہوا کہ راجا صاحب کی تمام شکایات بے بنیاد نہیں ہیں۔ اولاد صرف اس لیے خفا تھی کہ راجا صاحب نے دوسری شادی کر لی تھی۔ یہ کوئی نہیں سمجھتا تھا کہ اس عمر میں شادی ان کی ضرورت تھی۔ پر ان میں سے کوئی باپ کو خدمت کے لیے رکھنے پر راضی تھا اور نہ ان کے لیے پاکستان آنے پر... وہ اکیلے تھے تو کسی کو ان کی پروا نہ تھی... تنہائی دور کرنے کے لیے انہوں نے شادی کر لی تو سب کی نظر میں مجرم ہو گئے۔

بدقسمتی سے وہ بھی عام مردانہ کمزوری کا شکار ہو گئے اور اپنی عمر کے مطابق رفیقِ زندگی کا انتخاب کرنے کے بجائے ایک جوان اور خوب صورت لڑکی کے جال میں پھنس گئے۔

پینتیس سال کی عمر میں وہ عورت تین شادیاں کرچکی تھی۔ ایک نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ ایک سے خود اس نے علیحدگی اختیار کرلی تھی اور ایک اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔ اس لیے راجا صاحب کو آسان شکار سمجھ کے ڈورے ڈالے۔ اس کا خیال تھا کہ ہر بوڑھے آدمی کی جوان بیوی کی طرح وہ انہیں انگلیوں پر نچائے گی اور مختارِ کل ہوگی۔ اس کی امیدوں پر پانی پھر گیا جب راجا صاحب نے مالیاتی کنٹرول پوری طرح اپنے ہاتھ میں رکھا اور بیوی کو بھی کنٹرول کرنا چاہا... پانچ سال بڑی مشکل سے گزرے۔ پھر وہ انہیں چھوڑ کے نکل گئی۔

ریشم کے دل میں کوئی لالچ نہیں تھا۔ وہ نیک نیتی سے راجا صاحب کی ہر خدمت بجالا رہی تھی اور اس گھر میں مطمئن تھی۔ جب راجا صاحب نے اس سے شادی کا ارادہ ظاہر کیا تو اس نے انکار نہیں کیا لیکن اس نے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ راجا صاحب سب کچھ اس کے نام کر دیں۔ اس نے انہیں یہی سمجھایا کہ وہ بچوں کو ان کا حق ضرور دیں۔ خواہ انہیں ضرورت ہو یا نہ ہو۔ وہ خود ہر حال میں راجا صاحب کا حقِ رفاقت ادا کرے گی۔ اب یہ خبر نہ جانے کیسے باہر ان کے بچوں تک پہنچ گئی اور ان کی ایک بیٹی نے ریشم کو فون کر کے نہ صرف گالیاں اور دھمکیاں دیں بلکہ یہ بھی کہا کہ بہت جلد وہ پاکستان پہنچ کر تمام معاملات خود سنبھالے گی۔

تیسرے ہفتے شرافت نے دوپہر کا کھانا راجا صاحب کے ساتھ کھایا۔ ان کی جسمانی اور ذہنی حالت بہت بہتر تھی۔ ریشم نے ایک خاتونِ خانہ کی طرح بہترین کھانا بنایا تھا اور خاطر مدارات میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ راجا صاحب نے اسے بتایا کہ اگلے جمعے وہ ریشم سے نکاح کرلیں گے۔ اس کے لیے ضروری انتظامات ہوگئے ہیں۔ وہ شوفر کو بلا کے ریشم کے لیے کپڑے اور زیورات وغیرہ کی خریداری کرلیں گے۔ انہوں نے شرافت سے مزید انتظامات کی بات کی اور اسے نکاح کی تقریب میں بھی مدعو کیا۔ انہوں نے اپنے کچھ پرانے ساتھیوں اور دو چار ہمسایوں کو بھی شرکت کی دعوت دینے کا ذکر کیا۔

پھر اچانک انہوں نے غیر متوقع بات کی۔ ”چھوٹے حکیم صاحب! بُرا نہ مانو تو ایک بات کہوں... یہ ٹھیک ہے کہ تمہارے علاج سے مجھے فائدہ ہوا ہے لیکن خود تمہیں کیا فائدہ نظر آتا ہے اس پیشے میں؟“

شرافت چونکا۔ ”جی... میرے والد نے خود مجھے طبابت کے اسرار و رموز بتائے ہیں۔“

”وہ سب مجھے معلوم ہے... جو تم کرتے ہو وہ سارا لاہور پڑھتا ہے... دیواروں پر اور پوسٹرز میں... اور ان اشتہاروں میں جو بسوں، ویگنوں میں ڈالے جاتے ہیں... اگر تمہیں معقول آمدنی ہو رہی ہے تب بھی... کیا یہ کوئی باعزت کام ہے؟“

شرافت کا رنگ لال ہو گیا۔ ”اور کوئی کام نہیں آتا مجھے۔“

”ذرا اپنی حالت دیکھو۔ آج کے نوجوان کے مقابلے میں تم کیا ہو؟ کیا مستقبل ہے تمہارا... میڈیکل سائنس کی پیش قدمی کے سامنے یہ دیسی طریقۂ علاج کتنی تیزی سے خود اپنی موت مر رہا ہے۔“ وہ پورے اعتماد سے بات کرتے رہے۔

شرافت نے موقع پاتے ہی دل کی بات کہہ دی۔ ”راجا صاحب! سچ بتاؤں تو میں خود بھی اس کام سے خوش نہیں ہوں۔ میں کچھ اور کرنا چاہتا ہوں لیکن یہاں میرے کرنے کو کیا ہے؟“

”یہاں نہیں ہے تو باہر چلے جاؤ۔ ہزاروں لاکھوں نوجوان جا چکے ہیں۔ وہاں ہر شخص ہر کام کرتا ہے لیکن نہ اس کی عزت کم ہوتی ہے اور نہ آمدنی۔“

”اگر میں کہوں کہ میں بھی باہر جانے کے لیے تیار ہوں... تو آپ میری مدد کریں گے؟“

انہوں نے شرافت کو غور سے دیکھا اور سوچ میں پڑ گئے۔ ”یعنی جو بولے وہی دروازہ کھولے۔“ انہوں نے کہا۔

”آپ کے تعلقات ہیں... بچے ہیں باہر...“

”دیکھو... اتنی عجلت میں فیصلہ مت کرو۔ میں نے صرف مشورہ دیا تھا۔ اپنے ابا سے بات کرو۔ سوچو سمجھو اور پھر بھی ارادہ نہ بدلے تو مجھے بتانا۔ میں تمہیں باہر بھجوا دوں گا۔“ انہوں نے وعدے کے انداز میں ہاتھ ملایا اور اسے دس ہزار دے دیے۔

شرافت نے وہ پورا ہفتہ سخت الجھن میں گزارا۔ وہ جانتا تھا کہ اس نے قبلہ بڑے حکیم صاحب سے دل کی بات کہی تو نتیجہ کیا نکلے گا۔ ایک تو اس کی چوری پکڑی جائے گی۔ وہ بادشاہی مسجد میں نماز کے بہانے کہیں اور جاتا رہا۔ دوائیں چوری کرتا رہا۔ فرار کے منصوبے بناتا رہا۔ والد صاحب دہاڑیں گے تو اماں دھاڑیں مار مار کر روئیں گی۔ ابھی حتمی کچھ بھی نہیں تھا۔ راجا صاحب کھرے اور بے باک آدمی تھے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ، ذہین اور عملی زندگی کا تجربہ رکھنے والے تھے۔ سب کچھ جاننے کے باوجود انہوں نے شرافت کو علاج کا موقع دیا تھا اور یقیناً انہیں فائدہ بھی ہوا تھا۔ ان کا مشورہ

عملی اور مخلصانہ تھا۔ وہ ضرور اسے باہر بھجوا دیتے۔

اگلے ہفتے شرافت نہا دھو کے اور لباس بدل کے نکاح کی تقریب میں شرکت کے لیے پہنچا تو دنیا بدل چکی تھی۔ نہ شاخ تھی، نہ چمن تھا، نہ آشیانہ تھا... کال بیل پر اوپر سے کسی عورت نے جھانک کے پوچھا۔ ”کون ہے؟“ اور پھر گیٹ پر آ گئی۔ وہ چالیس سال کی بھاری بھر کم اور چہرے کے سخت نقوش والی عورت تھی۔ وہ شرافت کو گھورتی رہی۔

شرافت نے کہا۔ ”میں راجا صاحب کا علاج کرتا ہوں۔“

”اب انہیں کسی علاج کی ضرورت نہیں رہی حکیم صاحب... چلیے چھٹی کیجیے۔“

”کیا مطلب؟ آج تو... انہوں نے بلایا تھا مجھے۔“

”میں بیٹی ہوں ان کی... مجھے پتا چلا تھا کہ یہاں میرے والد کے خلاف کسی قسم کی سازش کی جا رہی ہے لیکن مجھے پہنچنے میں صرف چوبیس گھنٹے کی تاخیر ہوگئی۔ ان کی اس فاحشہ ملازمہ ریشم نے انہیں قتل کر دیا تھا۔“

شرافت کے دماغ میں جیسے بم پھٹ گیا۔ ”قتل کر دیا تھا... ریشم نے... یہ کیسے ہو سکتا ہے... آج تو نکاح تھا ان کا۔“

”اب آپ تھانے جا کے اس سے نکاح کرنا چاہیں تو کرلیں۔ اس پر تین سو دو کی دفعہ کے تحت مقدمہ ہے جو میں نے درج کرایا تھا۔ خیریت چاہتے ہیں تو خاموشی سے لوٹ جائیں ورنہ آپ کا نام بھی دے دوں گی میں پولیس کو... کہ آپ بھی سازش میں شریک تھے۔“ اس نے گیٹ بند کر دیا۔

☆☆☆

آنے والے کئی جمعے شرافت نے بے مقصد آوارہ گردی کرتے گزار دیے۔ راجا صاحب کے قتل کی ساری تفصیلات اخباروں میں چھپی تھی۔ خود شرافت نے وہ اخبار نہیں دیکھے تھے۔ پہلے ہفتے میں تو اس کی راتوں کی نیند اڑ گئی تھی۔ گزرے ہوئے وقت کا ہر لمحہ گواہی دیتا تھا کہ راجا صاحب کو ریشم نے نہیں، خود ان کی امریکا سے آنے والی بیٹی نے قتل کیا ہوگا یا کرایا ہوگا۔ وہ امریکن نیشنل تھی اور دولت مند تھی۔ بڑی آسانی سے اس نے پھانسی کا پھندا صحیح وقت پر ریشم کے گلے میں فٹ کرا دیا۔ اگر اسے دیر ہو جاتی تو کروڑوں کی جائداد ہاتھ سے نکل جاتی۔ کسی شخص کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی عمر بھر کی کمائی اولاد سے چھین کر دو ٹکے کی نوکرانی کے حوالے کردے۔ پشتوں کی آبرو کو خود باپ نے پامال کیا... پھر بیٹی کیوں قصوروار... دن تو ابا کے پورے ہو ہی گئے تھے۔

شرافت نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا جس نے قتل کے اس کیس میں اسے ملوث ہونے سے بچا لیا۔ ابتدا میں اسے ڈر تھا کہ کہیں ریشم اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے اس کو گواہ نہ بنالے مگر اس غریب لاوارث عورت کی سننے والا کون تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، شرافت کا خوف بھی دور ہوتا گیا۔

آج وہ عقل کے مشورے کے خلاف دل کی بات مانتے ہوئے ”راجا کاٹیج“ کی طرف گیا تھا۔ وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ یہ صرف ایک جائداد تھی جسے قانون کے مطابق وارثوں میں تقسیم ہو جانا تھا... اپنے حصے کی رقم جو ہر ایک جائداد بیچنے والے کو... حاصل ہوتی، تمام وارث فارن ایکس چینج کی صورت میں امریکا منتقل کر دیں گے۔ راجا صاحب داستانِ ماضی بن کے تاریخ میں گم ہو جائیں گے۔ ان کے بچے انہیں یاد بھی کریں گے تو برائی کے ساتھ... اس خیال نے شرافت کو اتنا اداس کیا کہ وہ راجا صاحب کے ایک پڑوسی سے ملا جس نے بتایا کہ انہیں میانی صاحب میں کہاں سپردِ خاک کیا گیا تھا۔ وہ تلاش کرتا ہوا ان کی قبر تک پہنچ گیا اور ان کے لیے دعائے مغفرت مانگتے ہوئے افسردہ بھی ہوا۔ شاید وہ دنیا کا واحد لاتعلق آدمی تھا جو اس قبر پر آخری بار آیا۔

اب وہ یادگارِ پاکستان والے اقبال پارک کی ایک بینچ پر کسی اداس الو کی طرح بیٹھا تھا جب ایک اسی کی عمر کا نوجوان آیا اور شرافت کے ساتھ بیٹھ گیا۔ یہ شام کا وقت تھا اور پارک میں تفریح کے لیے آنے والوں سے زیادہ کرکٹ اور فٹ بال کھیلنے والے دھول اڑا رہے تھے۔ جھاڑیوں کی اوٹ میں نشئی پڑے تھے اور ان سے کچھ فاصلے پر ایک شخص اوندھا پڑا جسم کی مالش کرا رہا تھا۔

ایک خواجہ سرا مٹکتا اور تالی بجاتا ہوا ان کے قریب آیا۔ ”ہائے، کچھ ہمیں بھی تو دے جانی... میں صدقے جاؤں۔“

شرافت نے کہا۔ ”جاؤ معاف کرو۔“

وہ ہاتھ نچا کے بولا۔ ”ہائے کوئی زیادتی کرے گا میرے ساتھ... پھر معافی مانگنا.... چل دس کا پتا نکال۔“

شرافت نے چڑ کے کہا۔ ”کہہ دیا میرے پاس کچھ نہیں ہے... زہر کھانے کے پیسے بھی نہیں ہیں میرے پاس۔“

خواجہ سرا ڈھیٹ تھا۔ اس کے گال پر چٹکی لے کر بولا۔ ”ہائے ہائے، زہر کھائیں تیرے دشمن... تو چل میرے ساتھ... میں کماؤں گی اور تجھے لٹا کے کھلاؤں گی میرے سوہنے منڈے۔“

شرافت کے ساتھ بیٹھا ہوا نوجوان ہنس پڑا۔ ”یہ نہیں جاتا تو مجھے لے چل۔“

”ارے جا سوکھے کریلے... مردہ چوہے... تیرے جیسوں پر تو مہناز تھوکتی بھی نہیں۔“ وہ تالی بجاتا دور چلا گیا۔ ”مہناز ہے میرا نام... ہاں... اچھے اچھوں کو سالم نگل جاؤں۔“

شرافت کا چہرہ لال پڑ گیا۔ ”کس قدر بے ہودہ ہوتے ہیں یہ لوگ... بے شرمی اور بے غیرتی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے... لعنت ایسی کمائی پر۔“

نوجوان ہنسنے لگا۔ ”یار! اس کے ساتھ چلے جاتے تو مزے کرتے... ایک ٹکٹ میں دو مزے... کہانی تو یہاں سب کی ایسی ہی ہے... رزقِ حلال کیا تم کما رہے ہو؟“

شرافت کو یوں لگا جیسے مخاطب پہلے سے جانتا ہے کہ وہ کیا کرتا ہے۔ ”مجبوری کی اور بات ہے...“

وہ تلخی سے مسکرایا۔ ”یہ مجبوری کا عذر بھی خوب ہے۔ چور، ڈاکو بھی یہی کہتا ہے کہ حالات سے مجبور ہو کے اس نے یہ پیشہ اختیار کیا۔ طوائف بھی یہی کہتی ہے۔ اسی لاہور شہر میں میرا ایک جاننے والا ہے۔ اللہ نے اچھی صورت اور صحت دی ہے... اچھے کپڑے پہنتا ہے اور اچھے ہوٹلوں میں اٹھتا بیٹھتا ہے... کسی بیگم صاحبہ کی نظر میں کھب جاتا ہے... ہر جگہ ان کے ساتھ نظر آتا ہے۔ چار چھ مہینے ان سے خوب مال اینٹھتا ہے پھر اس کا دل بھر جائے تو وہ تعریفی سند کے ساتھ دوسری کے حوالے کر دیتی ہے ورنہ وہ خود کسی اور کو پھانس لیتا ہے اور یہ سب اس سے دگنی عمر کی خالائیں ہوتی ہیں جو بیوٹی پارلرز اور سلمنگ سینٹرز میں اپنی عمر سے کم نظر آنے اور جسم کو جوان رکھنے کے لیے سخت محنت کرتی ہیں۔ لیکن سوشل سرکل میں اس کا تعارف کراتی ہیں تو کہتی ہیں... وی آر جسٹ فرینڈز۔“ اس نے بڑی ادا سے منہ اور لہجہ بنا کے کہا۔

شرافت کے لیے یہ سب بہت عجیب تھا۔ ”ان کی فیملی نہیں ہوتی؟ شوہر کچھ نہیں کہتے؟“

”تم کیا کسی گاؤں سے آئے ہو؟ یار! شوہر ان سے زیادہ عیش کرتے ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک ماڈل ٹائپ سیکریٹری اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ بزنس ٹرپ پر جاتے ہیں تو کسی سوشل سیکریٹری کو لے جاتے ہیں... تمہیں دیکھ کر مجھے اپنا دوست اس لیے یاد آیا کہ اس کے مقابلے میں تم زیادہ ہینڈسم ہیرو ہو... تم چاہو تو...“

شرافت نے خفگی سے کہا۔ ”تم خود کیوں نہیں کرتے یہ کام؟“

وہ ہنسنے لگا۔ ”دیکھا نہیں... مجھے تو اس خواجہ سرا نے بھی مسترد کر دیا تھا۔“

شرافت کو وہ آدمی دلچسپ لگا۔ ”تم کرتے کیا ہو؟“

”میں کچھ بھی نہیں کرتا اور سب کچھ کرتا ہوں۔ جہاں بھی نوکری ملنے کی امید ہو اپنے سرٹیفکیٹ اور ڈگریاں اٹھا کے پہنچ جاتا ہوں۔ کوئی پرائمری اسکول میں ٹیچر یا کلرک تک نہیں رکھتا۔ کرنے کو کام بہت ہیں مگر ہم جیسے مڈل کلاسیے کا مسئلہ بن جاتا ہے یہی حقِ حلال کی کمائی... شرافت...“

شرافت چونکا۔ ”میرا نام تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“

وہ ہنس پڑا۔ ”تمہاری صورت پر لکھا ہوا ہے۔ اب شرافت کا مطلب سمجھا جاتا ہے بزدلی... کمزوری... ماں باپ بھی کمال کرتے ہیں... میرا نام رکھا جمیل... ذرا میری چماروں جیسی صورت دیکھو... وہ تالی بجانے والا یا والی مہناز... کیا کہا تھا اس نے، سوکھا کریلا... مردہ چوہا۔“

”والدین کبھی اولاد کا برا نہیں چاہتے۔“

وہ تلخی سے ہنسا۔ ”مگر پھر بھی برا ہو جاتا ہے... میرا باپ ایک مولوی تھا... وہ رزقِ حلال، ایمان کی سلامتی اور خوفِ آخرت وغیرہ پر مجھے بھی دن رات لیکچر دیتا تھا۔“

”لیکن وہ خود اس پر عمل نہیں کرتا تھا؟“

”ہاں... تلقین اور نصیحت اور صراطِ مستقیم... یہ سب دوسروں کے لیے تھا مگر یار وہ بھی کیا کرتا... وہ خود اپنے حالات کا اسیر تھا... اس کی دونوں بیویوں نے جیسے بچے جننے کا مقابلہ شروع کر دیا تھا... سال بھر پہلے میں گھر سے بھاگ آیا تھا۔ اس وقت میرے تیرھویں چودھویں بھائی بہن دنیا میں آنے والے تھے۔ میرا اس قطار میں ساتواں نمبر تھا۔ سب سے بڑا عمرے کے بہانے گھر سے نکلا۔ بعد میں پتا چلا کہ جدہ میں اس کا سر قلم کر دیا گیا۔ وہ ہیروئن لے گیا تھا اور پکڑا گیا تھا۔ اس کے بعد والے دو شہید ہوئے۔ ابا نے انہیں جہاد پر بھیج دیا تھا۔ ایک خودکش حملے میں مارا گیا۔ ایک لاپتا ہو گیا۔ میں ذرا مختلف تھا۔ میں نے پڑھنے کی ضد کی اور جیسے تیسے بی اے کر لیا۔ کچھ لوگوں کی مدد سے کچھ ٹیوشن وغیرہ پڑھائے... پھر مجھے بھاگنا پڑا کیونکہ ابا نے مجھے جہاد فی سبیل اللہ کی فرضیت اور شہادت کی فضیلت پر خطبے دینے شروع کر دیے تھے۔ تم خود سوچو یار! ابھی سے میں جنت میں جا کے بھی کیا کروں گا۔ پہلے یہ دنیا تو دیکھ لوں اچھی طرح۔“

شرافت کو ہنسی آ گئی۔ ”تم بڑی دلچسپ باتیں کرتے ہو۔“

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”چلو کہیں بیٹھ کے چائے پیتے ہیں۔ تم نے مجھے نہیں بتایا کہ تم کیا کرتے ہو؟“

وہ شاہی قلعے کے باہر سوکھی گھاس پر پاؤں پھیلا کے بیٹھے رہے۔ اب شرافت کو اس سے باتیں کر کے سکون مل رہا تھا۔ اس نے راجا صاحب کے بارے میں بہت کچھ بتا دیا۔ جمیل بڑی دلچسپی سے سنتا رہا اور سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا رہا۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”چلو تمہیں پرستان کے نظارے دکھاؤں۔“

ان کے درمیان اب دوستی کا رشتہ استوار ہو رہا تھا۔ شرافت خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑا۔ باتیں کرتے کرتے وہ پرانی انارکلی پہنچ گئے تھے۔ جمیل ایک چھوٹی سی دکان کے سامنے رک گیا جس پر پی سی او کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ اندر پرانی میز کرسی ڈالے ان سے دگنی عمر کا گھنی داڑھی والا صوفی بیٹھا تھا۔ وہ موبائل فون کے کارڈ بھی بیچتا تھا اور ایزی لوڈ بھی کرتا تھا۔ صوفی نے جمیل کے سلام کا جواب بڑی نرمی سے دیا۔ پھر وہ اس کے سامنے دیوار کے ساتھ لگے ہوئے پرانے صوفے پر بیٹھ گئے۔ صوفی نے شرافت کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”یہ اپنا یار ہے۔ نام بھی شرافت ہے اور ہے بھی میری طرح شریف۔“ جمیل خوش مزاجی سے بولا۔ ”ہے کوئی ویکنسی؟“

صوفی نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ”پندرہ منٹ میں ہو جائے گی۔“

”اچھا تب تک چائے ہی منگوا لو۔“ جمیل نے آنکھ ماری۔ ”ایک نمبر۔“

صوفی نے اپنے پیچھے ایک کھڑکی کا پٹ سرکایا۔ ”اوئے دو چائے دے ادھر ایک نمبر۔“

شرافت نے آہستہ سے پوچھا۔ ”ایک نمبر چائے کیا ہوتی ہے؟“

جمیل نے اسے تسلی دی۔ ”ابھی پتا چل جائے گا۔ اسے پی کے پرستان کے بلیک اینڈ وائٹ نظارے بھی رنگین لگتے ہیں۔“

چائے بہت گاڑھی، گرم اور پُرلطف تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس میں چہار مغز ڈال کے پکائے گئے ہوں۔ چائے ختم ہونے تک دکان کے اندر کا دروازہ کھلا جس پر ”پرائیویٹ“ لکھا ہوا تھا۔ شرافت کا خیال تھا کہ وہ صوفی کے گھر میں کھلتا ہو گا۔ دو برقع پوش لڑکیاں سیدھی ان کے سامنے سے گزر گئیں۔ شرافت نے صرف گورے گدرائے ہوئے ہاتھوں کی جھلک دیکھی اور پیچھے رہ جانے والی ایک خوشبو کو محسوس کیا۔

صوفی نے اشارہ کیا۔ ”دونوں کا الگ...“

جمیل نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اس نے تو کبھی انگلی سے نہیں چھوا... نہ کمپیوٹر کو نہ لڑکی کو۔“ اور جیب سے کچھ پرانے نوٹ نکال کے صوفی کے سامنے ڈال دیے۔ ”چائے کے بھی ہو گئے۔“

دروازے کے پیچھے کچھ بھی نہیں تھا۔ بالکل سامنے دوسرا دروازہ تھا جس سے اندر کا کچھ حصہ نظر آتا تھا یہ باتھ روم تھا... دائیں ہاتھ پر سیڑھیاں تھیں جو گھوم کر اوپر جا رہی تھیں۔ اوپر والا دروازہ کھلتے ہی شرافت کے سامنے اٹھارہ بیس فٹ لمبا اور بارہ چودہ فٹ چوڑا ہال سا آ گیا۔ درمیان کی تین فٹ چوڑی راہداری کے دونوں طرف لکڑی اور شیشے کے پارٹیشن والے کیبن تھے۔ تین ایک طرف اور تین دوسری طرف... پارٹیشن کی اونچائی آٹھ فٹ کے قریب تھی لیکن دھندلے شیشوں میں سے کیبن کے اندر کا منظر دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ہر کیبن کی سامنے والی دیوار پر بریکٹ فین تھا اور ایک لائٹ... دبی دبی سرگوشی یا ہنسی کی آواز سے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ ہر کیبن میں لوگ موجود ہیں۔ بیک وقت مردانہ اور زنانہ آوازیں سن کر شرافت کو گھبراہٹ ہونے لگی تھی کہ پرستان کے نظارے دیکھنے کے چکر میں وہ کہاں آ گیا۔ اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ عین اردو بازار اور تھانہ... انارکلی کے مقابل ایسی جگہ بھی ہو سکتی ہے۔

لیکن دروازہ کھلتے ہی اس کی ساری پریشانی دور ہو گئی۔ یہ کوئی قحبہ خانہ نہیں انٹرنیٹ کیفے تھا۔ میز پر رکھے اکیس انچ کے ایل سی ڈی مانیٹر پر رنگین غبارے سے تیر رہے تھے۔ میز کے سامنے دو کرسیاں تھیں۔ بالکل سامنے والی کرسی پر جمیل بیٹھ گیا۔ اس کے ”ماؤس“ کو ہاتھ لگاتے ہی غبارے غائب ہو گئے۔ شرافت کو کچھ مایوسی ہو رہی تھی۔ وہ پرستان کے نظاروں کا مطلب کچھ اور سمجھا تھا۔

”یار! میں ذرا اپنی ای میل دیکھ لوں پہلے۔“ جمیل نے کہا اور اسکرین پر متحرک ننھے سے تیر کے ساتھ بہت کچھ بدلنے لگا۔ شرافت اچھی طرح جانتا تھا کہ کمپیوٹر کیا ہوتا ہے اور اس کا استعمال کتنا عام ہے۔ ڈیسک ٹاپ سے لیپ ٹاپ اور موبائل فون تک سب میں انٹرنیٹ کنکشن تھا۔ ساری دنیا اور اس کا سارا علم سمٹ کر کمپیوٹر کی جادوئی دنیا میں سما گیا تھا۔ خود شرافت نے کبھی کمپیوٹر استعمال نہیں کیا تھا۔ اسے کبھی اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی حالانکہ جو موبائل فون اس کے پاس تھا، اس میں بھی بہت کچھ تھا لیکن اسے نہ بلیو ٹوتھ کا مطلب معلوم تھا اور نہ ایم ایم ایس یا مینیو پر نظر آنے والی علامات کا... وہ اب اس قابل ہو گیا تھا کہ نیا نمبر سیو کر سکے۔ مس کالیں دیکھ لے یا ایس ایم ایس کا استعمال کر سکے۔ اس

نے تو آج تک کیمرا، ریڈیو اور ایم پی تھری پلیئر استعمال نہیں کیا تھا۔

شرافت کچھ بیزاری کے ساتھ دیکھ رہا تھا کہ جمیل کتنے انہماک سے مانیٹر کے پیغامات پڑھ رہا ہے اور اس پر نمودار ہونے والی تصاویر کو پورے سائز پر پھیلا رہا ہے۔ اس میں زیادہ تر لڑکیاں تھیں مگر کچھ دوسرے لوگ بھی تھے۔

''یہ سب میرے فیس بک کے فرینڈز ہیں۔'' جمیل نے مانیٹر سے نظر ہٹائے بغیر کہا۔ ''ساری دنیا میں۔''

''اس دوستی کا فائدہ؟''

''تبادلۂ خیالات... گپ شپ... فرصت کا وقت چیٹنگ میں اچھا گزر جاتا ہے... تمہاری فیس بک ہے؟''

شرافت نے انکار میں سر ہلا دیا۔ ''مجھے کوئی دلچسپی بھی نہیں۔''

''دلچسپی خودبخود پیدا ہو جائے گی جب نیٹ پر جاؤ گے۔ اب دیکھو اس وقت آٹھ لڑکیاں ہیں جن کو میں نے محبت کے جال میں پھانس رکھا ہے... یہ دیکھو انڈیا کی ہے... بمبئی میں رہتی ہے... شیلا ملہوترا... اچھی ہے نا؟ کبھی کبھی فلموں میں ایکسٹرا کا رول مل جاتا ہے۔ ایک اسٹوڈیو میں ساؤتھ انڈین فوڈ سپلائی کرتی ہے... کہتی ہے کہ تم آجاؤ تو ہم مل کے ساؤتھ انڈین ریسٹورنٹ چلا سکتے ہیں۔ زیادہ نہیں بس پانچ لاکھ روپے لیتے آنا۔'' وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔ ''اُلّو کی پٹھی... بے وقوف سمجھتی ہے مجھے... بے وقوف خود بن رہی ہے... یہ دیکھو لندن میں ہے... اس نے اپنی کچھ پرائیویٹ تصویریں بھی ارسال کی ہیں... خاص میرے لیے۔'' وہ پھر ہنسا۔ ''یہ دیکھو۔''

شرافت کا رنگ لال ہو گیا۔ جمیل اسے جو تصویریں مانیٹر پر بڑی کر کے دکھا رہا تھا، سب غسل کے دوران اتاری گئی تھیں۔ شاور کے نیچے، باتھ ٹب میں۔ باتھ سے پہلے... باتھ کے بعد... لڑکی بلاشبہ جوان اور خوب صورت تھی اور اس کا جسم ایک شعلہ تھا جس نے شرافت کے جذبات میں آگ لگا دی۔

جمیل آگے بڑھ گیا۔ ''یہ ملائیشیا میں ہے۔ ملائیشیا جانا آسان ہے۔ ویزا فیس بھی کم ہے اور ویزا بھی آسانی سے مل جاتا ہے۔ مگر ٹکٹ کے پیسے تو میرے پاس ہیں نہ یہ دیتی ہے... ادھار بھی نہیں...''

شرافت نے کہا۔ ''تم نے تو یہاں بیٹھے بیٹھے دنیا کی سیر کرادی۔''

جمیل مسکرایا۔ ''ہم اور تم حالات کا رونا روتے رہتے ہیں۔ حالات کو جانے بغیر... وہ وقت گزر گئے جب کوئی اپنے گاؤں سے نوکری کے لیے بھی شہر جانے کا نہیں سوچتا تھا۔ کیا تم یقین کرو گے کہ آج بھی پاکستان میں کیا، اس شہر لاہور میں تمہیں ایسے لوگ مل جائیں گے جنہوں نے کبھی ٹرین پر سفر نہیں کیا۔ وہ کراچی نہیں گئے۔ ان کے لیے لندن، نیویارک، پیرس کسی دوسری جادو نگری کے شہروں کے نام ہیں۔''

''انہی میں تم مجھے شمار کر سکتے ہو۔'' شرافت نے خفت سے اعتراف کیا۔

''پہلے ملک پرستان جانے کے لیے اڑن کھٹولا یا الٰہ دین کا جن ضروری تھا جو شہزادے کو اڑا لے جائے۔ آج ویسے تو ہوائی جہاز بھی ہیں مگر پرستان کے نظارے میرے تمہارے جیسے بھکو آدمی کی دسترس میں ہیں۔ اس کمپیوٹر کو بھی چھوڑو... سب تمہارے موبائل فون میں ہے... تم دنیا دیکھ سکتے ہو... ہر جگہ کے بارے میں جان سکتے ہو... ہر شخص سے بات کر سکتے ہو... ہر بات معلوم کر سکتے ہو... حالات اپنے آس پاس نہیں... ساری دنیا کے دیکھو۔''

شرافت نے بے وقوفوں کی طرح پوچھا۔ ''کیا یہی پرستان کی سیر تھی؟''

جمیل نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ ''یہ تو میری فیس بک ہے۔ پرستان کی سیر بھی کر لیتے ہیں۔ جلدی کیا ہے؟ اس کے کون سے سنیما کی طرح شو ٹائم ہیں۔'' جمیل نہ جانے کہاں کی سائٹ تلاش کر رہا تھا۔ بالآخر اس نے ایک سائٹ کھولی تو شرافت پر چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اس کی ساری شرافت کسی نامعلوم اندھے کنوئیں کی گہرائی میں غرق ہو گئی۔ اسے آدھ گھنٹا گزرنے کا اندازہ ہی نہیں ہوا۔ اس نے جو نظارے دیکھے تھے، وہ اس کے لیے ناقابلِ تصور تھے۔ اس کی عقل و ہوش سب گم ہو چکے تھے۔ جب ایک گھنٹا پورا ہونے کے بعد کمپیوٹر آف ہوا تو شرافت کو یوں لگا جیسے بلندیٔ افلاک سے وہ پتھریلی زمین پر آ گرا ہے۔

جمیل اس کی طرف دیکھ کے مسکرا دیا۔ ''کیوں... مزہ آیا؟ کیسی آزاد دنیا ہے یہ... جو چاہو سو دیکھو... جس سے چاہو ملو... جو چاہو کہو... آؤ چلیں... ایک گھنٹا ہی لیا تھا ہم نے۔''

خواہش کے باوجود شرافت اپنی زبان سے نہ کہہ سکا کہ وہ ایک گھنٹا اور بک کرا لے تو کرایہ وہ دینے کو تیار ہے۔ نیٹ کیفے میں بہت رش تھا۔ لڑکے، لڑکیاں اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ چھ بائی چھ فٹ کے ایک کیبن میں بند ہو کے انہیں یوں لگتا تھا جیسے وہ دنیا کے سارے سماجی، اخلاقی اور خاندانی بندھنوں سے آزاد ہو کے خلا میں پرواز کر گئے ہیں۔ جہاں ان کے چاروں طرف ایک نئی انوکھی جگمگ کرتی خوب صورت کائنات کے سارے رنگ نظر نواز ہیں۔ سنسنی خیز ہیں اور پُرلطف ہیں۔ اتنے کم پیسوں میں پرستان کی سیر نے اس کے حواس مختل کر دیے تھے۔

باہر آ کے جمیل نے کہا۔ ''تم نے صوفی کو دیکھا، کیسی بگ نیٹ کیفے چلا رہا ہے؟''

''اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتا... ان لڑکے، لڑکیوں کے والدین...''

جمیل ہنس پڑا۔ ''نیٹ کیفے میں کون سی بات غیر قانونی ہے۔ جو اپنا کمپیوٹر افورڈ نہیں کر سکتے، یہاں آ جاتے ہیں۔ اور آتے ہیں سب ہم جیسے طالب علم... پڑھنے کے لیے... اعتراض کیسا... نیٹ تو اب موبائل فون میں بھی ہے... یہاں ذرا پرائیویسی ہوتی ہے۔ ایک بار کوئی گیا تھا سامنے تھانہ انارکلی میں شکایت لے کر... صوفی تو ان کا کلائنٹ ہے، انہی کے زیرِ سایہ سارے نیک کام کرتا ہے... پولیس نے دو تین اخبار والوں کے سامنے کارروائی کی... وہ ہر کیبن میں گئے... سب جگہ لڑکے لڑکیاں مانیٹر پر انجینئرنگ اور میڈیکل کی کتابیں کھولے بیٹھے تھے۔ یہ تو رابطے کا بھی بڑا اچھا مرکز ہے...'' وہ پھر قہقہہ مار کے ہنسا۔

''آج تو تمہارے ساتھ بڑا اچھا وقت گزر گیا۔'' شرافت نے کہا۔

''اب تمہیں گھر جانے کی جلدی ہو گی ورنہ ابا ماریں گے...'' جمیل پُرتمسخرانہ انداز میں بولا۔

شرافت نے خفت سے کہا۔ ''اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ چلو کہیں بیٹھ کے چائے پی لیں۔''

''یار! میں آج تک سمجھا نہیں کہ گھر کسے کہتے ہیں۔ باپ کا گھر اپنا نہیں ہوتا۔ باپ جب چاہے نکال باہر کرتا ہے۔ اپنے گھر کا مالک، سربراہ وہ سب کچھ ہوتا ہے... ایک مکمل ڈکٹیٹر جو بے چون و چرا اطاعت مانگتا ہے۔ باپ نہ ہو تو باقی سب حصے دار ہوتے ہیں۔ بیوی اپنا گھر مانگتی ہے، کرائے کا ہو تو مالک مکان جب چاہے نکال باہر کرتا ہے... نوکری میں گھر آج یہاں کل وہاں... تو پیارے آج کی رات جہاں بسیرا اپنی تقدیر کا ڈیرا۔''

''آخر کہیں تو رہتے ہو گے تم؟''

''آج کل ایک کمرا ملا ہوا ہے۔ بسنت روڈ کے ایک گھر کی چھت پر۔ نیچے ایک بیوہ اپنی تین بیٹیوں کے ساتھ رہتی ہے۔ دس بارہ سال پہلے استانی تھی۔ شوہر دبئی میں تھا اور

پیسے بھیجتا رہتا تھا یا عید بقرعید آ کے اپنی کھیتی میں بیج ڈال جاتا تھا۔ عقل کا بھی اندھا اور نظر کا بھی ورنہ سوچتا کہ کیا عورت کے لیے پیسا ہو سکتا ہے شوہر کا بدل... اور دیکھتا کہ کسی بیٹی کی صورت اس سے نہیں ملتی تو کیا یہ صرف اتفاق ہے؟ خیر، اس کو وہاں کسی شیخ کی کولڈ اسٹوریج میں پڑی ہوئی بیوی مل گئی کام چلانے کے لیے... مگر کچھ ایسی گڑبڑ ہو گئی کہ قاضی نے اسے جیل میں زندگی گزارنے کے لیے بھیج دیا۔ وہاں اپنی عدالتوں جیسے چکر تو ہوتے نہیں۔ ضمانت اور اپیل کے بعد اپیل... اس کی کہانی تو گویا ختم ہوئی... سنا ہے مر گیا۔ نہیں مرا تو مر جائے گا۔ ابا کے پاس آئی تھی فتوے کے لیے... کہ میں اب کیا کروں... شوہر ہے بھی اور نہیں بھی... زندہ ہے مگر دوسری دنیا میں... نہ بیوی ہوں نہ بیوہ... ابا نے سعودی عرب میں میرے بڑے بھائی سے کہا۔ اس نے دبئی میں کوئی وسیلہ تلاش کیا اور بالآخر ایک دن عورت کو شوہر کی طرف سے تحریری طلاق نامہ وصول ہو گیا۔ خود عورت نے ہی تصدیق کی کہ تحریر اس کے سابق شوہر کی ہے... واللہ اعلم بالصواب... وہ بہرحال آزاد ہو گئی اور اس نے پہلی فرصت میں ایک نیا شوہر بنا لیا۔ وہ ٹرک ڈرائیور تھا اور نشہ کرتا تھا۔ ایک رات ٹرک سمیت کسی ندی سے گزرنے لگا حالانکہ گزرنے کے لیے پل موجود تھا، پیچھے یہ مکان چھوڑ گیا۔ میں جب گھر چھوڑ کے آیا تو ایک دن اس نے مجھے پہچان لیا کہ تم تو مولانا غلام صدیق کے بیٹے ہو... یہاں کیا کر رہے ہو... میں نے ایک جھوٹی دردناک کہانی سنا دی کہ نوکری نہیں... رہنے کی جگہ نہیں... کبھی کسی پل کے نیچے چرسیوں کے ساتھ پڑ کے سو جاتا ہوں... کبھی لوکو شیڈ میں... اس نے کہا کہ تمہارے والد مرحوم نے میری بہت مدد کی تھی۔ میرے ساتھ چلو... نوکری بھی مل جائے گی۔ ابھی رہنے کے لیے ایک کمرا ہے میرے پاس... چھت پر اسٹور بنا رکھا ہے... تمہارے لیے کافی ہو گا۔ اب یاروں کی عیش ہے۔ ایک انجمن مفادِ باہمی کا صدر بنا ہوا ہوں۔ عورت نے سب کو بتایا ہے کہ میں اس کا بھانجا ہوں... گھر میں ایک مرد کے ہونے سے اسے بڑا سہارا ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ میں ایم اے پاس ہوں... کوئی نوکری ضرور ملے گی... ایک لڑکی تو چھوٹی ہے دو کو میری خاطر داری پر لگا رکھا ہے کہ کوئی تو مجھے پسند آئے گی... اور پسند کیا یار... ان دونوں میں مجھے پھانسنے کا مقابلہ ہے... ایک سے بڑھ کر دوسری خاطر کرتی ہے۔'' وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔

شرافت کو اس پر رشک آیا۔ ''بڑی آزادی اور عیاشی کی زندگی گزار رہے ہو... لڑکیاں کیسی ہیں؟''

اس نے انگلی اٹھا کے اوپر دیکھا۔ ”سب اوپر والے کا کرم ہے... جوانی میں تو چڑیل بھی حسین لگتی ہے... وہ تو ہیں خوب صورت۔“

”کسی روز مجھے بھی دکھاؤ تو سہی۔“ شرافت کے دل میں گدگدی ہو رہی تھی۔

”کسی وقت کیا... ابھی چلو اور دیکھ لو... بلکہ اپنی طرف سے اجازت ہے... ایک لے لو... ٹاس کر لیں گے۔“ جمیل ہنسا۔

شرافت نے خودمختاری کی جانب ایک اور قدم بڑھایا۔ اس نے موبائل فون پر قبلہ بڑے حکیم صاحب سے بات کی۔ ”ابا! یہاں میرے ایک دوست اسپتال میں داخل ہیں۔ ان کا بھائی مل گیا تھا شاہی مسجد میں۔ اس نے بتایا کہ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے... آج کی رات بھاری ہے... میں اب کل ہی آؤں گا... یا پھر... تدفین کے بعد... اگر اللہ کو یہی منظور ہوا۔“

ہر پرانے ہو جانے والے باپ کی طرح بڑے حکیم صاحب کو بھی یقین تھا کہ ان کا جانشین بیٹا انتہائی نیک اور سعادت مند ہے اور آج کے بگڑے ہوئے نوجوانوں سے بالکل مختلف... انہوں نے کہا کہ مطب کا کوئی مسئلہ نہیں... شرافت کے سر سے بوجھ اتر گیا۔ اب وہ آزادی کی پہلی رات بے فکری سے گزار سکتا تھا۔ آج تک اس نے صرف مریض دیکھے تھے۔ دوست کیا ہوتا ہے... اس کا احساس جمیل نے چند گھنٹے کی رفاقت میں پیدا کر دیا... وہ بے فکر ہو کے گھومتے رہے۔

”شرافت صاحب! کچھ اپنے بارے میں بھی بتایئے... ہم نے تو کچھ بھی نہیں چھپایا۔“ جمیل بولا۔

”کیا خیال ہے پہلے کھانا کھا لیں... گوال منڈی کی فوڈ اسٹریٹ رونق والی جگہ ہے۔“ شرافت نے مستی میں کہا۔

قبلہ بڑے حکیم صاحب سے جھوٹ بول کر کسی ندامت کے بجائے شرافت کو ایک شرارت آمیز خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ اسکول سے بھاگنے والے اس بچے کی طرح جسے یہ ڈر بالکل نہ ہو کہ اس کی چوری پکڑی جائے گی۔ اب سے کچھ دیر میں ابا حضور اپنی شیروانی پہن کر ٹوپی سر پر جمائیں گے اور چھڑی لے کر مطب کی جانب چل دیں گے۔ ان کی رہائش گاہ اور مطب کے درمیان ایک صحن ہی حائل تھا۔ آج وہ مریضوں کو بھی خود دیکھیں گے اور ان کے لیے دوا بھی خود ہی نکالیں گے۔ معلوم نہیں وہ چھوٹے حکیم صاحب کی غیر حاضری پر کیا بیان دیں گے۔

جمیل نے اسے غور سے دیکھا۔ ”کیا سوچ رہے ہو؟“

شرافت چونکا۔ ”کچھ نہیں... دراصل... آج میں نے پہلی بار ابا حضور سے جھوٹ بولا ہے۔“

جمیل ہنس پڑا۔ ”یہ بھی تو جھوٹ ہے۔ کیا تم ہمیشہ سے اتنے بڑے تھے... یا بچے تھے تب بھی سچے تھے؟“

شرافت جھینپا۔ ”میرا مطلب تھا... مجھے یاد نہیں لیکن ایسا کیوں لگ رہا ہے جیسے میں آج ہی بڑا ہوا ہوں۔“

”ایک ایسا دن ہر بچے کی زندگی میں آتا ہے جب وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ بچہ نہیں رہا... کچھ تمہاری طرح دیر سے بڑے ہوتے ہیں... کچھ میری طرح بہت کم عمری میں... لیکن یہ تو قدرت کا نظام ہے... کچھ بچے چلنا یا بولنا بھی دیر سے شروع کرتے ہیں۔“

جمیل کا ٹھکانا فوڈ اسٹریٹ کے ساتھ ہی تھا۔ کھانے کے بعد وہ ایک تنگ و تاریک زینے سے اوپر چڑھ گئے۔ کسی عورت نے دروازہ کھولا۔ پیچھے سے آنے والی روشنی میں اس کا وجود پورے دروازے کی چوڑائی کے برابر لگتا تھا۔ وہ کمر پر ایک ہاتھ رکھے جمیل کے پیچھے کھڑے اجنبی کو دیکھ رہی تھی۔

”خالہ! یہ میرا دوست ہے۔ آج رات میرے ساتھ رہے گا... فکر کی کوئی بات نہیں... کھانا ہم کھا کے آئے ہیں... یہ صبح چلا جائے گا۔“

عورت پیچھے ہٹ گئی۔ ”میں کیوں فکر کرنے لگی اگر تمہارا دوست ہے۔“

گھوم کے زینے سے اوپر جاتے ہوئے شرافت ... نے ان دو لڑکیوں پر بھی نظر ڈالی جو ماں سے کچھ پیچھے کھڑی تھیں اور جن میں سے ایک کو وہ بطور محبوبہ منتخب کر سکتا تھا۔ شرافت صرف اتنا دیکھ سکا کہ ایک نے زرد کپڑے پہن رکھے تھے اور دوسری نے نیلے... دونوں ایک ہی عمر، قد اور جسامت کی لگتی تھیں۔ ان کی ماں پیچھے پیچھے اوپر آ گئی۔

”مہمان کو سلاؤ گے کہاں؟“ وہ مسکرا کے بولی اور ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور شرافت کو گھورنے لگی۔

کمرے میں صرف ایک چارپائی تھی۔ وہ دونوں اس پر بیٹھ گئے۔ شرافت کو دو جوان لڑکیوں کی ماں کے اطوار کچھ غیر شریفانہ لگے۔ اس کی عمر چالیس برس تو ہو گی یا شاید کچھ کم مگر اپنے لباس اور میک اپ سے وہ دس برس کم کی نظر آنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ اس کے جسم پر منڈھے ہوئے لباس سے اس نے دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی تھی مگر دریا جیسے سیلاب کا ریلا بن کر کوزے سے ابل رہا تھا۔ وہ قبول صورت تھی اور تراشے ہوئے بالوں کے ہالے میں اس کا میک اپ سے دمکتا چہرہ، لپ اسٹک سے دہکتے ہونٹ

اور سرمے کی دھار والی آنکھیں اسے خوب صورتی سے زیادہ بے باکی کا اشتہار لگتے تھے۔ جمیل نے بتایا تھا کہ وہ استانی ہے لیکن شرافت ایسے نروس ہو رہا تھا جیسے وہ شاہی محلے کے کوٹھے پر آ گیا ہو۔

”کیا نام ہے تمہارے دوست کا؟“ اس عورت نے شرافت کی گھبراہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔

”شرافت۔“ جمیل بولا۔

وہ ہنس پڑی۔ ”ہے بھی اسمِ بامسمیٰ... مجسم شرافت... کرتے کیا ہیں آپ شرافت صاحب... کہاں رہتے ہیں؟“

شرافت نے سنبھل کے کہا۔ ”میں حکیم ہوں۔ میرے والد صداقت حسین لاہور کے مانے ہوئے طبیب ہیں۔ ان کا مطب ہے باغبان پورے میں شالیمار باغ کے قریب۔ میں والد کا معاون ہوں۔“

کچھ دیر خاموشی رہی۔ خود جمیل کے لیے خالہ کے سوال کا جواب دینا مشکل ہوتا۔ شرافت نے ابھی تک اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ خالہ کی حیرانی میں کچھ بے یقینی جیسی کیفیت تھی مگر وہ سر ہلا کے اٹھ گئی۔ ”چلو تم لوگ آرام کرو... چائے پینی ہے تو بتا دو۔“

”خالہ! نیکی اور پوچھ پوچھ۔“ جمیل نے بے تکلفی سے جواب دیا اور پھر شرافت سے مخاطب ہوا۔ ”یار! تم واقعی حکیم ہو... یقین نہیں آتا۔ مجھے تو اپنی طرح بے کار آدمی لگتے تھے۔ یار! ایسا کرتے ہیں باہر ڈیرا جماتے ہیں۔ باہر مچھر تو ہوں گے مگر اندر گرمی ہے اور باہر چاندنی بھی ہے۔“

اس نے چارپائی باہر نکالی اور کسی مستعد میزبان کی طرح دوسرا بستر لینے نیچے گیا۔ فرش پر بستر بچھا کے وہ چلا گیا اور چائے لے آیا۔ ”اب بتاؤ یہ حکمت کا کیا ڈراما ہے؟“

”یہ ہمارا خاندانی پیشہ ہے، جدی پشتی... میرے پردادا کے پردادا کئی سو سال پہلے مہاراجا رنجیت سنگھ کے شاہی حکیم تھے۔ یہ گھر جس میں اب ہم رہتے ہیں اور میرے ابا کا مطب ہے، ایک حویلی کا حصہ تھا۔ یہ باغبانپورہ مغل پورہ اس وقت کہاں ہوں گے جو... آج ہیں۔ شالیمار باغ کے سامنے انگوری باغ تھا اور اس حویلی کے اردگرد بھی باغات تھے۔ یہاں باغوں کے نگراں اور مالی رہتے ہوں گے۔ یہ جگہ باغ بان پورہ کہلائی... یہ سب مغلوں کے شوق تھے۔“

”تم اس حویلی میں رہتے ہو؟“

”ہاں، پنجاب انگریز کی عملداری میں آیا تو بہت سی جاگیریں ضبط ہو گئیں۔ میرے دادا حکیم امانت علی پر کسی بدخواہ نے الزام عائد کیا کہ وہ انگریز فوج سے لڑائی میں زخمی ہونے والے باغیوں کا مفت علاج کرتے تھے۔“

”کیا یہ صرف الزام تھا؟“

”نہیں، وہ سب کا علاج کرتے تھے۔ ہندو، سکھ، عیسائی... گورے کالے سے انہیں سروکار نہ تھا... پلاٹون کمانڈر ایک کینہ پرور انگریز میجر رابرٹ تھا۔ اس نے چھاپا مارا تو حویلی کے ایک حصے میں سات زخمی پڑے تھے۔ ان میں چھ دیسی سپاہی تھے مگر ایک گورا بھی تھا۔ میجر رابرٹ نے اپنی رپورٹ میں اس گورے کا ذکر نہیں کیا۔ حکیم صاحب کی جائداد ضبط ہو گئی اور شاید انہیں پھانسی ہو جاتی مگر وہ زخمی گورا سامنے آ گیا اور اس نے بتایا کہ جب میجر رابرٹ آیا تو وہ بھی حکیم صاحب کے زیرِ علاج تھا۔ بس اس پر ان کی جان بچ گئی مگر حویلی پر خود میجر رابرٹ قابض ہو چکا تھا۔ اس کا بیرونی حصہ حکیم صاحب کو رہائش کے لیے دے دیا گیا جو مہمان خانہ تھا۔ اب وہ جگہ مین روڈ پر ہے اور مطب اسی میں چل رہا ہے۔ ہم پچھلے حصے میں رہتے ہیں۔ میرے والد کی عمر اب ساٹھ سال ہے۔ دادا نے سو سال سے زیادہ عمر پائی تھی اور وہ لاہوری حکیم کے نام سے مشہور تھے۔“

”اب تم اس شفا پیشہ خاندان کے اکلوتے چشم و چراغ ہو؟“ جمیل نے شرافت کی خاندانی تاریخ سن کے کہا۔

”ہاں یار! صدیوں پرانی تاریخ کا تو مجھے علم نہیں... لیکن پردادا کے زمانے سے ایسا ہو رہا ہے۔ سب کا وارث ایک ہی لڑکا چلا آ رہا ہے۔ پتا نہیں یہ خوش قسمتی ہے یا بدبختی۔“

”یار! بُرا نہ ماننا میرے سوال کا... چار شادیاں کرنا تو ہر مومن اپنا شرعی فریضہ نہ سہی... حق ضرور سمجھتا ہے... کیونکہ وہ خود ہی اس دعوے کی صداقت کا علمبردار ہوتا ہے کہ وہ سب کے درمیان انصاف کر سکتا ہے۔ لیکن کوئی چاہے تو حاضر اسٹاک میں سے ہر سال ایک کو نکال کے دوسری کو لے آئے... پرانے وقتوں میں لوگ شرعی حد کو پار کرنا بھی گناہ نہیں سمجھتے تھے۔“

”میں تمہارا مطلب سمجھ گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ آبا و اجداد کا طریقہ کیا تھا۔ ان کی کتنی شرعی بیویاں ہوتی تھیں اور کنیزوں کے معاملے میں وہ کتنے فراخ دل تھے۔ ابا کا اور ان کے ابا کا مجھے پتا ہے۔ انہوں نے ایک وقت میں ایک بیوی رکھی۔“

”ذرا وضاحت فرمایئے... کیا اس کا مطلب ہے شادی بھی ایک کی؟“

شرافت نے جھینپ کے کہا۔ ”نہیں، میرے دادا نے

کے بعد دیگرے چار شادیاں کیں۔ اب ابا نے صرف دو... مالی حالات اس کا سبب تھے۔ پورا اصطبل نہیں رکھ سکتے تھے جس میں بیویوں کے علاوہ کنیزیں بھی ہوں۔ انہوں نے رضائے الٰہی کو نوشتۂ تقدیر جان کے قبول کرلیا تھا کہ ان کی خواہش یا کوشش سے کچھ ہونے والا نہیں ہے۔ اولاد ایک ہی ہوگی۔ میں دوسری بیوی سے ہوں۔ پہلی ابھی دس سال پہلے تک ساتھ تھی... گھر ہر وقت میدانِ جنگ بنا رہتا تھا۔ معاملہ صرف زبانی حد تک نہیں رہتا تھا۔ گالیاں، کوسنے تو وہ اٹھتے بیٹھتے دیتی تھیں اور کالا علم، جادو ٹونا وغیرہ بھی کراتی تھیں... مگر کئی بار ان کی فری اسٹائل مار پیٹ ہوجاتی تھی جس میں وہ ایک دوسرے کے بال نوچتی تھیں، کپڑے پھاڑ دیتی تھیں اور زخمی ہوجاتی تھیں۔"

"اور تمہارے ابا؟ وہ ایک ریفری بنے سیٹی بجاتے رہتے تھے؟"

"وہ غیر جانب دار اور الگ رہتے تھے یا کہتے تھے کہ چھریاں اٹھالو اور ختم کرو ایک دوسرے کو تاکہ میری جان چھوٹے... جب میں بڑا ہوگیا تو کوشش کرتا تھا کہ انہیں چھڑا دوں... لیکن سچی بات ہے... قصوروار عموماً میری ماں ہی ہوتی تھی۔ اس کا مزاج تیز تھا۔ حکیم صاحب سے شادی سے پہلے اس نے شرط رکھی تھی کہ پہلی کو طلاق دو گے مگر ایسا نہ ہوا... جب میں پیدا ہوا تو اس نے ایک بار پھر کوشش کی کہ اس بے مقصد بانجھ عورت کو نکال باہر کرے مگر حکیم صاحب نہ مانے۔ دراصل وہ ان کی کزن تھی جس سے وہ بچپن سے محبت کرتے تھے۔ ان حالات میں گھر میرے لیے کوئی پرکشش جگہ نہیں تھی۔ ماں غصے میں مجھے بھی رگید ڈالتی تھی کہ باپ کی طرح تو بھی میرا دشمن ہے۔ اس کا حامی ہے۔"

"اس کی موت کیسے ہوئی... تمہاری سوتیلی ماں کی؟"

"تم شک کررہے ہو کہ ماں نے اسے قتل کردیا ہوگا؟"

"یہ ناممکن تو نہیں... ایک حکیم کے مطب میں قاتل قسم کی زہریلی جڑی بوٹیاں بھی تو رہتی ہوں گی۔"

شرافت ہنسنے لگا۔ "اب دس سال پہلے کیا ہوا تھا، میں کیا بتاؤں... میری عمر اس وقت پندرہ سال تھی۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ وہ بیمار ہوئی تھی۔ اسے بخار ہوا تھا۔ تین دن میں وہ مرگئی۔ ابا کو شبہ بھی ہوگا تو وہ اس کا اظہار کیسے کرتے۔ مرنے والی تو گئی۔ دوسری جوان کے بچے کی ماں ہے... اس کو جیل کیسے بھجوادیں... پھر خود اس کے خلاف ثبوت شہادت فراہم کریں۔ انہوں نے صبر کیا۔"

"بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔" جمیل نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اب تم شاہی حکیموں کے خاندان کی گدی پر بیٹھے ہو... تمہارے بعد تمہارا بیٹا... وہ بھی اکلوتا ہی ہوگا کیونکہ یہ نوشتۂ تقدیر ہے۔"

"تم مذاق اڑا سکتے ہو۔ میں تمہاری طرح ہمت نہیں رکھتا کہ گھر سے نکل جاؤں۔ مجھے یہ کام پسند نہیں بلکہ نفرت ہے اس پیشے سے لیکن میں بہت کمزور اور مجبور ہوں۔ اس کی وجہ ظاہر ہے تم اکلوتے نہیں تھے چنانچہ تمہاری گھر میں وہ قدر نہیں تھی جو میری ہے۔"

"یہ بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ میرا باپ تو یہ سمجھتا تھا کہ اولاد کا کیا ہے... گھر کی کھیتی، ہر سال کاشت کی جاسکتی ہے اور وہ ہر سال راہِ حق میں ایک بیٹا قربان کرسکتا ہے۔ شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن... علامہ اقبالؒ کا یہ شعر وہ بڑی گھن گرج کے ساتھ پڑھتا تھا۔ ایک بار میں نے کہہ دیا کہ ابا کیا آپ مومن نہیں ہو... اس نے جوتا کھینچ کے مارا اور میرے پیچھے دوڑا تو میری ماں نے ٹانگ اڑادی۔ وہ وہیں فرش پر بیٹھی دال چن رہی تھی۔ میرے باپ کے دو دانت شہید ہوئے۔ میری ماں کا جرم ثابت نہ ہوسکا۔ اس نے کہا کہ تم خود اندھوں کی طرح دوڑے تھے۔ میں تو وہیں بیٹھی تھی بہت دیر سے۔"

"میرا معاملہ اس کے بالکل الٹ تھا۔ میں ایک تھا اور یہ گویا نوشتۂ تقدیر تھا۔ دوسرے کی آس بھی نہ تھی۔ میری جان میں ماں سے زیادہ باپ کی جان اٹکی رہتی تھی۔ اسے فکر تھی کہ اس کے بعد خاندان کے نام کو اور طبابت کے پیشے کو چلانے والا کوئی نہیں۔ مجھے چھینک بھی آجاتی تو ماں صدقے میں کالا بکرا قربان کردیتی تھی۔ میرے لیے دم درود اور تعویذ گنڈے سب چلتے تھے۔ دس تعویذ ایک لاکٹ کے ہیروں کی طرح میرے گلے کا ہار بنے رہتے تھے۔ ہر جمعرات کی رات مجھے گھوڑے شاہ کے مزار پر لے جاکے مجھے سوتیلی ماں کے شر سے محفوظ رکھنے کے لیے نذر دی جاتی تھی۔ تم نے گھوڑے شاہ کا مزار دیکھا ہے؟"

جمیل نے سر ہلایا۔ "دیکھا ہے، باغبان پورے کے بازار والی سڑک پر آگے ہے۔"

"لوگ اس پر منت کے گھوڑے چڑھاتے ہیں۔ عام لوگ مٹی کے کھلونوں جیسے... جو استطاعت رکھتے ہیں وہ چاندی سونے کے بھی لاتے ہیں۔ مزار کے اندر باہر اوپر نیچے ہر کھڑکی، ہر منڈیر پر ہزاروں مٹی کے گھوڑے پڑے ہیں۔ علامتی قسم کے... جیسے ٹھلو گھوڑے بیچنے والی عورتیں لے کر پھرتی ہیں۔"

"جب میں نے دیکھا تو مجھے یہ سب بڑا عجیب لگا... وہ گھوڑے نہیں... انسانوں کی ناآسودہ خواہشات کا روپ ہیں... ایسی دعائیں ہیں جو حاجت مند صرف ہاتھ اٹھا کے بھی مانگ سکتے تھے... ہر جگہ... ہر وقت...

"شاید میں اسکول بھی نہ جاتا... ابا خود مجھے گھر پر اردو، فارسی، عربی پڑھاتے۔ انگریزی کے لیے کوئی ماسٹر آجاتا لیکن میں نے ضد کی۔ دراصل میں بھی دوسرے بچوں جیسا بننا چاہتا تھا۔ ان کے ساتھ کھیلنا میری حسرت تھی۔ ان جیسی شرارتیں کرنا... ان کو دوست بنانا، ان کے گھر آنا جانا... یہ سب فطری خواہشات تھیں مگر ماں باپ تو مجھے ایک لمحے کے لیے نظر سے اوجھل کرنے کا خطرہ مول لیتے ہوئے ڈرتے تھے۔ بالآخر میری ضد کامیاب ہوئی اور مجھے قریب ترین اسکول میں داخل کرادیا گیا جو مشکل سے سو قدم کے فاصلے پر تھا۔ یہ گورنمنٹ اسکول تھا اور کافی بڑا۔ اس میں سیکڑوں بچے پڑھتے تھے اور اس کا گراؤنڈ بھی بہت وسیع تھا۔ مجھے تیسری جماعت میں داخل کردیا گیا تھا۔ کیا تم یقین کروگے کہ آٹھ سال تک ہر روز مجھے میری ماں اسکول لے کر جاتی تھی اور چھٹی ہونے تک وہیں بیٹھی رہتی تھی۔ میں نے بہت جلد بچوں سے دوستی کرلی۔ میں ماں کے چیخنے چلانے کی پروا کیے بغیر ان کے ساتھ گراؤنڈ میں فٹ بال کھیلتا تھا۔ مٹی دھول میرے پسینے میں شامل ہوکے کیچڑ بن جاتا تھا۔ میں گرتا تھا تو میرے گھٹنے اور کہنیاں چھل جاتے تھے۔ مجھے کسی کی کک سے فٹ بال لگتی تھی تو میری ناک سے خون بہنے لگتا تھا۔ مت پوچھو کہ میری ماں کا کیا حال ہوتا تھا۔ وہ روتی تھی، چیختی چلاتی تھی اور لڑکے مجھ پر ہنستے تھے کیونکہ اور کسی کی ماں گراؤنڈ کے باہر بیٹھ کے رونا دھونا نہیں مچاتی تھی۔ میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود ماں نے اپنا رویہ نہیں بدلا۔ وہ اسکول سے گھر لے جاکے مجھے خوب دھوتی تھی۔ میرے زخم صاف کرکے دوا لگاتی تھی اور مجھے صاف ستھرے کپڑے پہنا کے یہ چاہتی تھی کہ اب میں شرافت سے بیٹھا رہوں۔ اس کا بس چلتا تو وہ مجھے شیشے کے شوکیس میں رکھ دیتی۔ خود ابا کم تشویش میں مبتلا نہیں ہوتے تھے۔ وہ مجھے سمجھاتے بھی تھے اور ڈانٹ ڈپٹ بھی کرتے تھے مگر مارتے نہیں تھے۔ سخت پابندی کے باوجود میں اسکول میں دوسرے بچوں کی لائی ہوئی چیزیں کھالیتا تھا جو میرے ماں باپ کے نزدیک الابلا ہوتی تھیں۔ گندی اور خطرناک چیزیں تھیں مگر وہ ایک بچے کی فطری خواہشات پر کیسے پابندی لگاتے... میں موقع پاتے ہی گھر سے نکل جاتا اور گلی محلے کے بچوں کے ساتھ کھیلنے لگتا۔

"قصۂ مختصر... دس بارہ سال تک میں نے من مانی کی... اس کے بعد میری زندگی میں دو تبدیلیاں آئیں۔ ایک تو سوتیلی ماں کے نہ رہنے سے گھر کے اندر امن و امان کی فضا قائم ہوگئی۔ دوسرے میٹرک کا امتحان پاس کرلینے کے بعد میں اسکول سے فارغ ہوگیا۔ میرے ساتھی کالج گئے مگر مجھے گھر پر روک لیا گیا کیونکہ کوئی کالج میرے گھر کے قریب نہ تھا۔ میری ضد اور ہنگامہ آرائی پر میرے لیے ایک ٹیوٹر رکھا گیا اور مجھے پرائیویٹ ایف اے بی اے کرنے کی اجازت مل گئی۔ اس کے ساتھ ہی ابا نے مجھے اپنے ساتھ مطب میں بٹھا کے حکمت کے اسرار و رموز سمجھانے شروع کیے اور میں ایک طرح سے ان کا معاون یا اپرنٹس بن گیا۔ یوں تو اسکول میں بھی میرے بہت سے نام تھے۔ اوئے حکیم دے پتر... چھوٹے حکیم... کشتۂ فولاد... لبوب کبیر... معجون فلاسفہ... جس کا جو دل چاہتا میرا نام رکھ دیتا۔ ایک بار تو فارسی کے استاد نے مجھے خمیرہ ابریشم حکیم ارشد والا کہہ کے کلاس میں مذاق اڑایا تھا۔ ماں باپ دونوں کی خواہش یہی تھی مگر میں ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ حکیم بن کے باپ دادا کا نام روشن کروں۔ مجھے اس پیشے سے نفرت تھی۔"

"تم کیا بننا چاہتے تھے؟" جمیل بولا۔

"اپنے ہم جماعتوں کی باتیں سن سن کر میں بھی ڈاکٹر، انجینئر بننے کی سوچتا تھا لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ میں سائنس پڑھوں اور ایف ایس سی اعلیٰ نمبروں سے پاس کروں۔"

"اور ماں باپ نے تمہیں یہ نہیں کرنے دیا؟"

شرافت نے سوچ کے کہا۔ "کمزوری خود میں نے دکھائی۔ ورنہ ضد پر آجاتا تو وہ بھی مجبور ہوجاتے۔ دراصل حد سے زیادہ لاڈ پیار، دیکھ بھال اور توجہ نے مجھے بگاڑ دیا تھا۔ میں کسی کا دوست نہیں بن سکا کیونکہ میں حد درجہ خودغرض اور خود پرست تھا۔ ہر جگہ، ہر شخص سے ساری توجہ مانگتا تھا۔ خود کو سب سے اہم... اپنی بات کو آخری... اپنی رائے کو حتمی سمجھتا تھا۔ کوئی میری نہ مانے تو میری لڑائی ہوجاتی تھی۔ میرا مذاق اڑائے یا میری تحقیر کرے تو میں رونے لگتا تھا۔ حد یہ ہے کہ فرسٹ آنا بھی میں اپنا حق سمجھتا تھا۔ یہ چاہتا تھا کہ ہر ماسٹر سب سے زیادہ نمبر مجھے دے۔ کلاس میں سب سے زیادہ توجہ مجھے حاصل ہو۔ میں کسی کے ساتھ کوئی چیز شیئر نہیں کرسکتا تھا اور انتہا درجے کی خودغرضی میری فطرت میں کمینگی پیدا کررہی تھی۔ میں گھر میں سب کچھ تھا اور باہر کچھ نہیں۔ گھر میں ہیرو تو باہر زیرو... میں خود ہی اس دنیا سے کٹ گیا جو تمام توجہ اور اہمیت مجھے نہیں دیتی تھی۔ پھر میں بزدل اور

ڈرپوک بن گیا۔ پھر مجھ میں مردوں والی کوئی بات ہی نہ تھی۔ کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ویسا نہ ہو جائے۔ ماں باپ کی فکروں نے یہی ڈر میرے اندر بھی پیدا کر دیا۔ بہادری... مہم جوئی... جوانی کی سرکشی... خطرات پسندی اور ایڈونچر کی خواہش... دنیا کو زورِ بازو سے فتح کر لینے کا جذبہ... یہ سب مجھ میں مفقود تھا۔"

"اور لڑکیوں کے معاملے میں...؟"

"اگر میں کالج یونیورسٹی جاتا... باہر نکلتا... آوارہ گردی کرتا اور دوستوں کی محفل میں اٹھتا بیٹھتا تو سب کرتا شاید... سائیکل پر، تانگے میں اسکول کالج جانے والی لڑکیوں کا تعاقب... چھٹی کے وقت اشارے بازی... چھیڑ چھاڑ اور تاک جھانک... مگر یہ نہ ہوا... گھر میں بھی ہر وقت مجھ پر نظر رکھی جاتی تھی۔ گلی محلہ تھا نہیں۔ پاس پڑوس میں بھی کوئی لڑکی دستیاب نہ تھی۔ اگر ہوتی تو شاید اس سے بھی میں توقع رکھتا کہ ساری محبت اور توجہ مجھے دے... میں عاشق نہیں معشوق بن کے رہوں... وہ میرے ناز اٹھائے... بدقسمتی سے ایسا ہو گیا۔"

"یعنی ایسی بے وقوف لڑکی مل گئی تمہیں؟" جمیل ہنس پڑا۔ "خود عاشق ہو گئی تم پر...؟"

"مجھے ایک خالہ زاد فراہم کر دی گئی کہ لو اس سے دل لگاؤ۔ اس کو اپنا سمجھو کیونکہ اسی کے ساتھ تمہیں ساری عمر رہنا ہوگا۔ اس کی میری منگنی کر دی گئی۔ اس وقت میری عمر پندرہ سال تھی اور اس کی نو سال۔ جب وہ چودہ کی ہوئی تو میں بیس کا تھا۔ اس کے دل میں تو جوانی کے جذبات کا سوتا پھوٹا تو اس نے سیراب کرنے کے لیے میری ذات کا رخ کیا۔ وہ خود ہی میرے قریب آنے لگی، بننے سنورنے لگی۔ مجھے اپنے لباس اور فیشن کے نظارے دکھانے لگی اور مجھ سے پوچھنے لگی کہ میں کیسی لگ رہی ہوں... وہ اچھی خوب صورت لڑکی تھی اور جوانی کے آثار عیاں ہوئے تو مجھے بھی اچھی لگنے لگی۔ ساری بات یہ تھی کہ وہ دسترس میں تھی۔"

"یہ پاکیزہ محبت کتنا عرصہ چلی؟"

"اب تک چل رہی ہے یار... نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔"

"فارسی نہیں آتی مجھے حکیم صاحب..."

شرافت نے کہا۔ "ہندی میں کہتے ہیں... تمہیں اور نہیں ہمیں ٹھور نہیں... اب وہ انیس کی ہے۔"

"اور اب بھی تم سے محبت کرتی ہے؟ اسے کوئی اور نہیں ملا اس لیے؟"

"ہاں، وہ دسویں میں فیل ہو گئی تھی۔ دوبارہ امتحان نہیں دیا۔ ماں نے گھر کے کام کاج میں لگا دیا۔"

"تمہیں ملنے جلنے کی پوری آزادی ہے؟"

"کسی حد تک۔ دونوں کا ایک دوسرے کے گھر میں آنا جانا ہے۔" شرافت نے کہا۔

"دیکھو یار... سچ سچ بتانا... تم نے کبھی اس آزادی سے فائدہ اٹھا کے... حد سے گزرنے کی کوشش کی؟"

شرافت کے چہرے پر سرخی آ گئی۔ "میں نے؟... نہیں... اس نے؟ ہاں... جو میں چاہتا تھا کہ پہل اس کی طرف سے ہو... پھر... جو ملا میں نے اپنا حق سمجھ کے وصول کیا۔"

"اور کچھ ہوا نہیں... میرا مطلب ہے کہ کسی کو پتا نہیں چلا؟"

"پتا کیسے نہ چلتا... مگر ہاں ہوا کچھ نہیں... اس لیے نہیں ہونے دیا کہ میری حکمت اس کے کام آ گئی... دراصل میرے اور اس کے ماں باپ مجھے انسان نہیں... فرشتہ سمجھتے ہیں... بھولا بھالا معصوم اور بے ضرر... ایک بچہ جس کا جسم بڑا ہو گیا ہے۔"

"یار! ماں باپ اتنے بے وقوف بھی ہو سکتے ہیں؟" جمیل نے حیرانی کا اظہار کیا۔

"آج پہلی بار میں جھوٹ بول کے گھر سے باہر رہا ہوں۔ تم پہلے شخص ہو جس سے میں نے کھل کے بات کی ہے۔ اعتماد کے ساتھ اور میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا ہوں اور بہت پُراعتماد... ایک مرد... تم میرے پہلے دوست ہو۔"

جمیل نے اس سے ہاتھ ملایا۔ "تم مجھ پر بھروسا کر سکتے ہو لیکن اب ہمیں سو جانا چاہیے۔"

شرافت نے اپنے ابا سے ایسا جھوٹ بولا تھا کہ اس نے اگلا پورا دن بھی اپنے دوست جمیل کے ساتھ گھومتے پھرتے گزار لیا۔ صبح وہ سو کر اٹھے تو خالہ کی لڑکیاں اسکول اور کالج جا چکی تھیں۔ خالہ نے انہیں ناشتے کے لیے نیچے ہی بلا لیا۔

"لگتا ہے خالہ کو تم پسند آ گئے ہو۔ ہمیں تو بس ایک پیالی چائے مل جاتی ہے۔" جمیل نے کہا۔

"تمہارا مہمان ہوں آخر۔" شرافت نے کہا۔

"دوپہر اور رات کے کھانے کا کیا کرتے ہو؟"

"اب تم سے کیا پردہ... صبح ہی نکل جاتا ہوں کام کی تلاش میں... سارا دن سڑکوں پر مارا مارا پھرتا ہوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ لائبریری جا کے میں اخبارات دیکھتا ہوں اور جہاں مناسب سمجھتا ہوں، درخواست بھی بھیج دیتا ہوں۔

اپنے سی وی کی سو کاپیاں ہیں... ختم ہونے سے پہلے مزید سو بنوا لیتا ہوں... رات کو عموماً کھانا مل جاتا ہے۔"

"لیکن ایسے کب تک چلے گا؟"

"ابھی مہینا ہوا ہے۔ دو ٹیوشن پڑھا کے مجھے چھ ہزار ملنے لگے ہیں۔ یہ کام مجھے نوکری سے بہتر لگتا ہے۔ دو گھنٹے ایک جگہ لگاتا ہوں، دو دوسری جگہ... ماں باپ بھی خوش ہیں اور بچے بھی... ایسی دو چار ٹیوشنز اور مل جائیں تو اپنی گڈ ول بن جائے گی۔ تین کے بجائے چار ملیں گے تو مجھے بہت... ہر جگہ عزت ملتی ہے۔ پروفیسر صاحب کہا جاتا ہے۔ اسکول کی نوکری میں خواری کے سوا کیا ہے۔"

"تو کیا ساری عمر ٹیوشنوں پر گزارہ کرو گے؟"

"شرافت صاحب! عزائم میرے بہت بلند اور ارادے بہت نیک ہیں۔ قبل از وقت دعوے کرنے کا کیا فائدہ... ایک دن تم خود دیکھو گے، میرے پاس چھ ہاتھ لمبی چم چم کرتی گاڑی ہوگی جسے شوفر چلائے گا۔ میری کوٹھی ہوگی ڈیفنس یا گلبرگ میں۔ اور وہ سب ہوگا جس کے خواب سب کی طرح میں بھی دیکھتا ہوں۔ خواب دیکھنے پر کوئی پابندی نہیں۔ اور خواب نہ ہوں تو تعبیر کیسی... یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں اس ملک میں ہی نہ رہوں... اور یہ بھی کہ کسی خواب کے پیچھے دوڑتے دوڑتے خود خواب بن جاؤں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب کچھ نہیں... ان سب سے ثواب کچھ ملنے والا نہیں... تعلیم، لیاقت، ذہانت یا محنت... ایمان داری اور فرض شناسی... وہ وقت گزر گئے جب کامیابی ان اوصاف سے مشروط سمجھی جاتی تھی۔ اب تو چانس کا گیم ہے، مقابلہ ہے جس میں فیئر یا فاؤل کچھ نہیں۔ جوا ہے جس میں آر یا پار... تخت یا تختہ... میں وقت اور موقع کے انتظار میں ہوں اور مجھے پورا یقین ہے کہ چیلنج بہت جلد سامنے آئے گا۔ یہ ٹیوشن وغیرہ تو بس وقت گزاری ہے... اور تم دیکھنا یہ کوئی دس سالہ منصوبہ یا شیخ چلی کے انڈوں والا خواب نہیں... تھوڑے دن کی بات ہے شرافت صاحب۔" اس نے چٹکی بجا کے کہا۔

☆☆☆

قبلہ بڑے حکیم صاحب کو ابھی تک پوری طرح اندازہ نہ تھا کہ شرافت اب پہلے والا شرافت نہیں رہا۔ جمیل کی باتوں نے شرافت کو بہت زیادہ مرعوب اور متاثر کر دیا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ خود کسی نالی میں رینگنے والا کیڑا ہے اور جمیل بہت اوپر آسمانوں کی بے کراں وسعت میں پرواز کرنے والا آزاد پرندہ... اس کے دل میں بھی اب حکمت کے صدیوں پرانے نسخوں کی بیمار بدبودار پرانی دنیا سے نکل کر باہر کی نئی، روشن اور خوب صورت دنیا میں کامیابی کی نئی راہیں تلاش کرنے کی آرزو جنم لے رہی تھی۔ اس کا دل اب واپس اس دنیا میں جانے کو نہیں چاہتا تھا جو ایک مطب اور اس کے پیچھے مختصر سے صحن اور دو قدیم دیواروں والے تاریک اور فرسودہ کمروں پر مشتمل تھی۔ صرف دیواریں ہی نہیں، ان کمروں کی ہر چیز قدیم اور تاریخی تھی۔ ان میں رہنے والے... رہنے والوں کی سوچ... ان کا طرزِ زندگی... ان کے معمولات... ان کے زیرِ استعمال اشیا ... اکیسویں صدی میں اٹھارویں صدی کے جیتے جاگتے نمونے تھے جن کی جگہ میوزیم تھی۔

جمیل کے ساتھ گزارے ہوئے ایک دن نے شرافت کی زندگی کا رخ ایک سو اسی ڈگری پر ماضی سے مستقبل کی طرف موڑ دیا تھا۔ جمیل کے ساتھ وہ پرانی انارکلی کے ایک انٹرنیٹ کیفے میں گیا اور کمپیوٹر استعمال کیا۔ جمیل نے اسے گوگل، یاہو اور یوٹیوب تک رسائی کا طریقہ بتایا اور شرافت کو لگا جیسے نالی کے کیڑے نے اپنی پرواز شروع کر دی ہے۔ نیٹ کی دنیا کی وسعت اور گہرائی اسے پاگل کرنے کے لیے کافی تھی۔ وہ اس بچے کی طرح حیران اور خوش ہوتا رہا جو کسی دور افتادہ اور پسماندہ گاؤں سے ڈزنی لینڈ پہنچ جاتا ہے... وہ اس کھیل میں ایسا مگن ہوا کہ سب کچھ بھول گیا۔ یہ بھی کہ اس نے اپنے والد سے شام تک واپسی کا کہا تھا۔ بیمار دوست کی وفات کی صورت میں اس کی تدفین کے بعد... اگر اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ لوٹ کے گھر ہی نہ جاتا۔ مگر اسے معلوم تھا کہ اس کے اکلوتے ماں باپ کا تشویش سے کیا حال ہوگا۔ تاہم اس نے اپنے جھوٹ کو اور آگے بڑھا دیا۔ اس نے فون کر کے کہا کہ اسپتال والوں نے ابھی ابھی اس کے دوست کی لاش ان کے حوالے کی ہے اور اب اس کی تدفین بعد نمازِ عشا ہوگی چنانچہ وہ دیر سے گھر واپس آئے گا... قبلہ بڑے حکیم صاحب کو ایک اور دن اپنے معاون چھوٹے حکیم صاحب کے بغیر گزارنا ہوگا۔

اس دن جمیل نے اپنے دوست کو فیس بک سے متعارف کرایا۔ اس کا اکاؤنٹ کھولا اور اسے اپنے دوستوں میں شامل کیا۔ بالواسطہ طور پر جمیل کے فیس بک فرینڈ اس کے بھی دوست بن گئے... شرافت جادو نگری میں گم ہو گیا۔ کنوئیں کا مینڈک روشنی کی رفتار سے لندن، پیرس اور نیویارک کے سفر پر نکل گیا۔ اب وہ پرانا شرافت نہیں رہا

تھا... اس کی زندگی ایک انقلاب سے دوچار ہو رہی تھی... اس دن کے بعد جب بھی شرافت نے اپنے کمرے میں قدیم سنگھار میز کے دھندلے آئینے میں خود کو دیکھا تو اسے شرم آئی... وہ ایک کارٹون لگتا تھا۔ اس کے تیل لگے بال سر سے چپکے ہوئے تھے۔ یہ قبلہ بڑے حکیم صاحب کے صدری (خاندانی) نسخے والا تیل تھا جس میں ان کے کہنے کے مطابق بتیس اقسام کے روغن اور جڑی بوٹیوں کے اجزا شامل تھے۔ ریٹھا، آملہ یا سیکا کائی تو معروف گھریلو نام تھے مگر اس میں ناگرموتھا اور کنوار گندل جیسے متعدد اجزا تھے۔ ماں یہ تیل بچپن سے اس کے سر میں لگا رہی تھی۔ یہی تیل استعمال کرنے والے قبلہ بڑے حکیم صاحب کی ٹوپی کے نیچے ان کے سر کا درمیانی حصہ بنجر اور چکنا ہو کے چمکنے لگا تھا اور خود ماں کے کھچڑی بال کم اور چھوٹے ہو کے چوہیا کی دم ہو گئے تھے۔ معلوم نہیں ان پرانے قدر دانوں کے سر پر کیا بیتی جو بڑی مستقل مزاجی سے یہ حکیمی تیل بنوا کے لے جاتے تھے۔

ہر رات سوتے وقت ماں اس کی آنکھوں میں بڑے پیار سے سرمہ کحل الجواہر کی ایک ایک سلائی پھیرتی تھی۔ ہر صبح نہار منہ اسے رات کو بھگوئے جانے والے سات بادام کھا کے ان کا پانی پینا پڑتا تھا۔ دن کے مختلف اوقات میں جگر کے افعال، حرارت عزیزی اور نظام ہضم کی درستی کے لیے کوئی خمیرہ معجون وغیرہ دیا جاتا تھا۔ اس کے بلغمی مزاج کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے موسمی پھل یا سبزی ان کی گرم یا سرد تاثیر دیکھ کر دیے جاتے تھے۔ ٹافیاں، ببل گم یا گنڈا گولا جیسی مضرِ صحت اشیا تو اس پر حرام اور ممنوع تھیں۔

اب اسے شدت سے احساس ہونے لگا تھا کہ اس کی حیثیت اپنے ہی گھر میں بیٹے کی نہیں کسی اسپتال میں داخل مریض جیسی تھی جو صبح سے رات تک پرہیز اور علاج سے زندہ ہو... آج تک اس نے برگر نہیں کھایا تھا۔ پیزا نہیں دیکھا تھا۔ ضرر رساں زہر ملا کالا پانی جو کوک کے نام سے بچے بوڑھے دن رات پی رہے تھے، اس نے چوری چھپے دو چار بار پی لیا تھا تو احساسِ جرم کا شکار ہو گیا تھا اور ایک بار تو گلا خراب ہو جانے پر اعتراف جرم بھی کرنا پڑا تھا حالانکہ یہ کولڈ ڈرنک صبح شام گرمی سردی ہر تقریب، ہر ریستوران پر گھر میں چائے سے زیادہ پی جا رہی تھی۔ اس نے ہمیشہ گول گلے والا سفید کرتہ شلوار پہنا تھا اور باٹا کا کھٹ کھٹ کرنے والا لیدر سول جوتا جبکہ اس کے ہم عمر نوجوان رنگین ٹی شرٹس اور جینز کے ساتھ جوگرز استعمال کر رہے تھے۔ اس نے کبھی سائیکل بھی نہیں چلائی تھی اور وہ سائیلنسر نکالی ہوئی یا اسپورٹس ماڈل موٹر سائیکل پر ون وھیلنگ کے کرتب دکھا رہے تھے۔ اسے تو گھر سے باہر تفریح کے لیے جانے کی ضرورت محسوس ہو تو جھوٹ بولے بغیر قبلہ حکیم صاحب سے اجازت نہیں ملتی تھی۔

اس نے طے کر لیا تھا کہ اب وہ اپنی زندگی کو اپنی مرضی سے جیے گا۔ ان لاکھوں کروڑوں نوجوانوں کی طرح جو وقت کو ہر طرح سے انجوائے کر رہے تھے۔ وہ بھی اتنا خود مختار ہو گا کہ جو چاہے پہنے، جہاں چاہے جائے، جس سے چاہے ملے۔ اس کا کھانا پینا، سونا جاگنا سب اپنی مرضی کے مطابق ہو گا کیونکہ اب وہ بچہ نہیں ہے۔

خود مختاری کا یہ باغیانہ جذبہ جو عام لڑکوں میں عموماً بلوغت کی عمر کے بعد سترہ اٹھارہ سال سے بھی پہلے بیدار ہو جاتا ہے، شرافت میں بہت دیر سے جاگا تھا کیونکہ اس کا جسم ہی نہیں ذہن بھی سو سال پیچھے کی دنیا کا اسیر تھا۔ اعلانِ آزادی کا پہلا مرحلہ یہ ہو گا کہ وہ قبلہ بڑے حکیم صاحب کے معاون چھوٹے حکیم صاحب کی پوسٹ سے مستعفی ہو جائے گا۔ صاف بتا دے گا کہ وہ حکمت کے خاندانی پیشے کو چھوڑ رہا ہے۔ باقی کام اس کے بعد... یہ اعلانِ جنگ اتنا آسان نہ تھا۔ نتائج کا سوچ کے اس کی ٹانگیں کانپنے لگتی تھیں۔ دل ڈوبنے لگتا تھا اور حوصلہ جواب دے جاتا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ ردعمل کیا ہو گا۔ قبلہ حکیم صاحب کا گرجنا برسنا اپنی جگہ... ماں کے آنسوؤں کی برسات الگ... اسے کسی نے بہکا دیا ہے۔ کسی کی نظر لگ گئی ہے... اس پر کسی حاسد بدخواہ نے سفلی عمل کرا دیا ہے... وہ پاگل ہو گیا ہے... اسے یہ سب سننے کو ملے گا۔

اصل مسئلہ اس وقت پیدا ہو گا جب پوچھا جائے گا کہ آخر وہ کیا کرنا چاہتا ہے اور کیوں... وہ ماں باپ کے بڑھاپے کی لاٹھی نہیں بن سکتا تو پھر جہاں چاہے جائے... اس گھر میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں... وہ کہاں جائے گا... کیا کرے گا؟ اس معاملے کا دوسرا پہلو شرافت کے نزدیک اتنا اہم نہیں تھا کیونکہ اس کی صرف جذباتی اہمیت تھی۔ کبھی کبھی اسے خیال ضرور آتا تھا کہ اس کے ماں باپ کیا کہیں گے یا کیا کریں گے۔ بدقسمتی سے ان کے پاس بڑھاپے کی دوسری لاٹھی بھی نہیں تھی۔ جمیل نے اسے سمجھایا تھا کہ عملی فیصلے اکثر سخت ہوتے ہیں اور بہت زیادہ استقامت کا تقاضا کرتے ہیں۔ خود فیصلہ کرنے والے میں ہر قسم کی سختی جھیلنے کا حوصلہ ہونا ضروری ہے۔ اسے دوسروں کے بارے میں اتنا متفکر نہیں ہونا چاہیے کہ ان کا ردعمل کیا ہو گا... یا ان پر کیا بیتے گی۔ ہر شخص، جو زندہ ہے، زندہ رہنے کے لیے ہر قسم

کا صدمہ برداشت کر لیتا ہے۔ ماں باپ اپنے جوان بیٹے کی حادثے میں مسخ شدہ لاش دیکھتے ہیں۔ جس رات اسے پھانسی دی جاتی ہے، وہ باہر اس کی لاش لینے بیٹھے رہتے ہیں۔ اسے قبر میں اتارتے ہیں مگر خود نہ خودکشی کرتے ہیں، نہ ہارٹ فیل ہونے سے مرتے ہیں۔

جمیل نے خود اپنی مثال دی تھی۔ اس کا باپ اللہ کی راہ میں اپنی سب سے پیاری چیز قربان کرنے پر ایمان رکھتا تھا مگر اس نے اپنی زندگی قربان نہیں کی۔ کوئی بیوی تک قربان نہیں کی۔ اولاد کو جوان کرتا تھا اور جنگ کی بھٹی میں جھونکنے کا جواز کسی نہ کسی صورت میں تلاش کر لیتا تھا۔ کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ بچے تو پیدا ہو رہے ہیں اور وہ پیدا کرتا رہے گا۔ اصل آزمائش انہیں قربان کرنے کی ہوتی ہے۔ بیٹا نہ ہوا کالا بکرا ہو گیا کہ امریکی آقاؤں کے صدقے میں قربان کر دو۔

بے شک شرافت کے ماں باپ اور دنیا کے اکثر ماں باپ ایسے نہیں تھے۔ ان کے جذبات اپنی جگہ... خود شرافت ان کو اس عمر میں کسی آزمائش کے عذاب میں ڈالنے سے ڈرتا تھا۔ گھر سے بے گھر ہونے کا انتہائی قدم اٹھانے سے پہلے اس نے پھر جمیل سے رجوع کیا کہ وہ کوئی درمیانی راستہ نکالے کیونکہ وہ خود میں اتنی طاقت نہیں پاتا۔ وہ بھی جمعے کا دن تھا۔ جمیل اسے گھر پر نہیں ملا۔ خالہ کی تینوں بیٹیاں بھی غیر موجود تھیں۔ خالہ کو اس وقت کسی کے مخل ہونے کا اندیشہ نہیں تھا۔ اس نے زینے کا اوپر والا دروازہ بند کر کے کنڈی بھی لگائی مگر پرانے تقسیم سے پہلے کسی ہندو کے بنائے ہوئے مکان کی ہر چیز پرانی اور خستہ حال تھی۔ چٹخنی کے اوپر والے حصے کا ایک پیچ نکلا اور دوسرا دباؤ کو اکیلا برداشت نہ کر سکا۔ کنڈی نیچے گر گئی اور شرافت اندر داخل ہو گیا۔ اس نے آواز دی۔ ”خالہ!“ اور دوسرے لمحے ایک کمرے کے کھلے دروازے تک پہنچ گیا جہاں سے خالہ کے ہنسنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

اچانک اس نے وہ منظر دیکھا جو پہلے جمیل نے اسے مانیٹر اسکرین پر تصویر کی صورت میں دکھایا تھا۔ اس منظر یا پرستان کے نظارے کو اصل زندگی میں سامنے دیکھ کر شرافت پر جیسے بجلی گر گئی۔ وہ جہاں تھا، وہیں بت بنا کھڑا رہ گیا۔ اتنی مہلت ضرور ملی تھی کہ چاہتا تو پلٹ کر فرار ہو جاتا۔ ننگ دھڑنگ کالا جن یقیناً اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ تعاقب کر کے اسے پکڑتا مگر وہ بڑا پھرتیلا ثابت ہوا اور ایک جست میں اس نے شرافت کو ایسے دبوچ لیا جیسے خونخوار شیر کسی خوف سے مفلوج ہرن کو دبوچتا ہے۔

”کون ہے تو...؟“ اس نے بیک وقت شرافت کی ماں بہن ایک کرتے ہوئے غرا کے پوچھا۔ ”اندر کیسے آیا؟“

شرافت گڑگڑایا۔ ”مم... مجھے معلوم نہیں تھا... دروازہ کھلا تھا۔“ وہ اس جن کے بوجھ تلے کراہا اور ہکلایا۔

”جانو... ایسے لونڈے بھی پال رکھے ہیں تو نے۔“ اس نے خون آشام نظروں سے خالہ کو گھورا۔

خالہ نے اتنی دیر میں خود کو سنبھال لیا تھا۔ ”بکواس مت کر شیدے... یہ اوپر والے کرائے دار شاہد کا دوست ہے۔ غلطی تیری ہے۔ تو نے اوپر آ کے کنڈی کیوں نہیں لگائی تھی؟“

”لگائی تھی کنڈی۔“ شیدے نے شرافت کا گلا دبا کے کہا۔ ”بول... مار ڈالوں اسے؟“

خالہ نے شیدے کے بوجھ کو کھینچ کر ہٹایا۔ ”پاگل ہوا ہے... یہ مر گیا تو تیرے ساتھ مجھے بھی پھانسی ہو گی۔“

”یہ بتا دے گا سارے زمانے کو...“ شیدا الگ ہو گیا۔

”نہیں بتائے گا... یہ قبلہ بڑے حکیم صاحب کا بیٹا ہے... خود بھی نیم حکیم ہے... اس میں اتنی ہمت نہیں ہے۔“

”وہ... جس کے اشتہاروں سے دیواریں کالی ہیں؟“ شیدا بولا۔ ”قبلہ بڑے حکیم صاحب...“

شرافت کھڑا ہو گیا۔ ”میں... میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ خدا رسول کی قسم...“ اس کی آواز ہی نہیں، ٹانگیں بھی کانپ رہی تھیں۔

شرافت نے اپنا راستہ صاف دیکھا اور ایک دم اس میں ہمت آ گئی۔ وہ پلٹ کر دیکھے بغیر بھاگا اور یوں سیڑھیاں اتر گیا جیسے اس کے پیچھے پاگل کتا لگا ہوا ہو... آگے پیچھے دیکھے بغیر اس نے سڑک کراس کی اور بھاگتا گیا... ایبٹ روڈ سے آگے ایوانِ اقبال پہنچ کے وہ سانس لینے کے لیے رکا اور سڑک کے کنارے ایک ٹھیلے والی کی بینچ پر بیٹھ گیا۔ دو گلاس پانی پینے کے بعد اس نے چائے پی تو اس کے حواس بحال ہوئے۔ اس نے اپنے موبائل فون سے جمیل کو کال کی۔ وہ ٹیوشن پڑھا رہا تھا اور دو گھنٹے سے پہلے نہیں آ سکتا تھا۔ اس نے شرافت کو وقت گزارنے کے لیے صوفی نیٹ کیفے جا کے پرستان کے نظارے دیکھنے کا مشورہ دیا۔

شرافت نے کہا۔ ”یار! جو نظارہ میں دیکھ کر آیا ہوں، اس کے بعد تو مجھے ہر طرف موت کا فرشتہ نظر آ رہا ہے۔“

”اتنا مت گھبرا کشتے کی اولاد... اللہ نے آنکھیں دی ہیں تو اچھا برا سب دیکھنا پڑتا ہے۔“ جمیل نے فون بند کر دیا۔

صوفی نیٹ کیفے میں دوسری چائے پی کے شرافت نے

اپنا فیس بک اکاؤنٹ کھولا۔ اسے بڑی خوشگوار حیرانی ہوئی جب اسے اپنی میل میں بہت سے پیغام ملے۔ دنیا بھر کے دو درجن سے زیادہ افراد اس کے ”دوست“ بننا چاہتے تھے۔ ان میں نصف سے زیادہ تعداد لڑکیوں کی تھی۔ اکثر اس کے بارے میں مزید جاننا چاہتے تھے۔ جمیل نے فیس بک پر لگانے کے لیے اس کی تصویر ایک فوٹوگرافر کے اسٹوڈیو سے بنوائی تھی۔ تصویر کے لیے اسے شرٹ جمیل نے دی تھی۔ ٹائی اور کوٹ خود فوٹوگرافر نے فراہم کیا تھا۔ اصل مسئلہ اس کے بالوں کا تھا لیکن شرافت کو بڑی حیرانی ہوئی جب کمپیوٹر میں اس کی تصویر ڈال کے جمیل نے ایک کھیل شروع کیا۔ اس نے شرافت کے چہرے پر ہر قسم کے ہیئر اسٹائل لگا کے دکھائے اور پھر خود ہی فیصلہ صادر کردیا کہ اس کی صورت پر کون سا سب سے زیادہ میچ کرتا ہے۔

”یار! میرے بال ایسے کہاں ہیں؟“ شرافت نے کہا تھا۔

”نہیں ہیں برخوردار تو ہو جائیں گے۔ کسی اچھے سیلون میں کوئی بھی کلچر بنادے گا۔“

”کلچر کیا ہوتا ہے؟“

جمیل ہنسا۔ ”بے چارہ شیکسپیئر کہہ گیا تھا کہ نام میں کیا رکھا ہے۔ بے شک اس کا مطلب کچھ اور تھا مگر دنیا میں یہی ہو رہا ہے۔ جو پہلے نائی تھا وہ حجام ہوا پھر گیسو تراش باربر... ہیئر ڈریسر... ہیئر اسٹائلسٹ... وہی اب کلچر ہے... نائی کی دکان مینز سیلون ہوگئی ہے... اچھا یہ مونچھیں دیکھو... کیسی جچ رہی ہیں۔“

شرافت نے کہا تھا۔ ”اصل مونچھیں کیا بُری ہیں؟“

”بُری کون کہہ رہا ہے۔ عرش کی یہ بلندیاں فرش کی پستیوں سے ہیں۔ اچھا، لگا کے دیکھو گے تو اندازہ ہوگا۔“ وہ ہنسا۔

”یہ اسٹائل بھی وہی بنائے گا... کلچر۔“

جمیل نے اس کی مونچھیں بھی بدل دیں۔ ”اب دیکھو خود کو... کتنے اسمارٹ اور ہینڈسم لگ رہے ہو۔ تم نے میری تصویر دیکھی ہے فیس بک پر۔ لڑکیوں کا ری ایکشن لے کر میں نے اسے بہت بدلا۔ اپنے بالوں کا رنگ براؤن کیا۔ مونچھیں ہٹا دیں جو پہلے تھیں۔ میرے چہرے کے اس انداز کو کچھ نے پسند کیا۔ اب یہ تمہاری نظر نہیں دیکھ سکتی۔ جیل لگا کے جو ویٹ لک آتی ہے وہ انہیں بڑی سنسنی خیز لگتی ہے۔ لوگ تو آنکھوں کا رنگ، ناک کان، ہونٹ سب بدل کے تصویر بگاڑتے ہیں مگر اسے میں دھوکا دہی سمجھتا ہوں۔ تم تو خیر ہینڈسم ہو... یاد ہے نا مہناز جس نے کہا تھا کہ میرے ساتھ چل...“ وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔

شرافت کا چہرہ پھر لال ہوگیا۔ ”تصویر کے مطابق چہرہ بنوانے میں تو کافی خرچ ہوگا۔“

”اس کی کوئی جلدی نہیں... لیکن دیکھو... کیا ہیرو نظر آرہے ہو فیس بک میں۔“

”میرا پیشہ بھی تم نے ڈاکٹر لکھ دیا ہے۔“

”اس میں غلط کیا ہے؟ حکیم، وید، سنیاسی باوا، نقش اور تعویذ یا پانی دم کر کے دینے والوں یا ہومیو پیتھ سب علاج کرتے ہیں تو ڈاکٹر ہی ہوئے نا... یہاں ایک ایم بی بی ایس ہے تو دس بغیر ڈگری والے... یا ادھر اُدھر کے جعلی سند یافتہ... اتائی، ڈسپنسر، کمپاؤنڈر... تم تو باقاعدہ خاندانی حکیم ہو، تجربہ رکھنے والے۔ چلو اب مشاغل بتاؤ۔“

”میرے کون سے مشاغل ہیں۔“

”اچھا میں لکھ دیتا ہوں۔ نمبر ون... کرکٹ... پھر ٹینس... اسٹیفی گراف کے بعد آج کل ثانیہ مرزا...“

”کرکٹ، ٹینس میں دیکھتا بھی نہیں کیونکہ گھر میں ٹی وی نہیں ہے۔“

”کیونکہ خلافِ شرع اور مخربِ اخلاق چیز ہے... قبلہ بڑے حکیم صاحب کے نزدیک۔“ وہ طنز سے بولا۔ ”کالج میں تم نے کرکٹ کھیلی... ٹیم کے ریگولر اوپنر تھے اور اسپنر بھی... پاپ میوزک تمہارا کریز ہے۔ وائٹل سائن اور جنون کے سید علی ظفر کو بہت پسند کرتے ہو۔ بالی وڈ میں ہمیشہ ریشمیا... ویسٹرن میں مائیکل جیکسن مرحوم کے بعد میڈونا... اسٹار ہے ٹارس... اسٹون... ایمرلڈ...“

”یار یہ کیا بکواس ہے۔ میں نے یہ نام ہی نہیں سنے۔“

جمیل ہنسا۔ ”اتنا جھوٹ مت بولو۔ ابھی سنے ہیں میری زبان سے یا نہیں۔ فوٹوگرافی... بیچ ہائیکنگ.... سوئمنگ... یار! کوئی ثبوت نہیں مانگ رہا ہے تم سے کہ نیاگرا فال میں کود کے دکھاؤ... یا آئی پی ایل میں تم کیوں نظر نہیں آتے... ایسا چلتا ہے دوست... دنیا کو امپریس کرنا پڑتا ہے باتوں سے... اچھی لگنے والی باتوں سے...“

کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا شرافت سوچ رہا تھا کہ جو کچھ دوسرے اسے اپنے بارے میں بتا رہے ہیں، کیا وہ بھی محض باتیں ہیں... جس نے خود کو پروفیسر لکھا ہے، کیا وہ ہاتھ دیکھنے والا نجومی ہوگا... سب کے مشاغل اس کی طرح فرضی ہوں گے... چہرے نقلی ہوں گے... ان میں کون لڑکا ہے، کون

لڑکی... کون بوڑھا ہے، کون جوان... پھر بھی کچھ تو ہے کہ لوگ کہتے ہیں...

اس نے اپنے کمنٹ ڈالنا شروع کیے۔ اب اس کا دماغ چل پڑا تھا... وہ سوچ سمجھ کے جواب دے رہا تھا۔

شرافت کو وقت کے گزرنے کا احساس اس وقت ہوا جب جمیل نے پیچھے آکے اس کے کندھے پر زور سے ہاتھ مارا۔ ’’تو ہو رہے ہیں پرستان کے نظارے... چل رہی ہے گپ شپ۔‘‘

شرافت اچھل پڑا۔ ’’بس یار... وقت گزار رہا تھا... اپنی فیس بک پر ای میل دیکھی۔‘‘

جمیل نے ماؤس سے کلک کیا۔ ’’ہم دیکھ لیں تو کوئی حرج تو نہیں؟ اپن تو بن چکے ہیں لنگوٹیے یار... ایک دوسرے کی لنگوٹی اتارنے والے۔‘‘

سہ پہر ہو رہی تھی جب وہ کھانے کے لیے نیچے اترے اور پرانی انار کلی کے ایک ہوٹل میں بیٹھ گئے۔ یہ لاہور کی دوسری فوڈ اسٹریٹ بن گئی تھی مگر اس وقت یہاں روٹی سالن والے روایتی قسم کے چند ہوٹل ہی کھلے ہوئے تھے۔

شرافت نے شکایت کی۔ ’’یار! تم نے میری پوری بات نہیں سنی... فون بند کر دیا۔‘‘

’’اوئے شکا۔ سی ٹٹو... میں اس وقت ٹیوشن پڑھا رہا تھا۔ اب بتا دے کیا چڑیا گھر کا شیر بس میں تیرے ساتھ آکے بیٹھ گیا تھا؟‘‘

’’تُو نے کہا تھا کہ تیری وہ منہ بولی خالہ استانی ہے۔‘‘ شرافت خفگی سے بولا۔

’’جو اس نے مجھے بتایا تھا، میں نے تجھے بتا دیا۔‘‘

’’یار وہ تو فاحشہ ہے۔‘‘

’’ہو گی... مجھے کیا۔‘‘ جمیل نے اس کی بات شروع ہونے سے پہلے ہی ختم کر دی۔ ’’میں اپنے کام سے کام رکھتا ہوں۔ یہ نہیں دیکھتا پھرتا مسٹر شرافت کہ کون کیا ہے... سب کی اپنی اپنی مجبوری ہے۔‘‘

شرافت جھلا گیا۔ ’’یار! میری بات سن لے پہلے... میں تو پھنس گیا تھا بڑی مصیبت میں...‘‘

جمیل نے دال سبزی کا آرڈر دے کر کہا۔ ’’چل بتائے بغیر چین نہیں آرہا تو بتا۔‘‘

شرافت نے اسے جو دیکھا تھا سب بتا کے پوچھا۔ ’’یہ شیدا کون ہے؟‘‘

جمیل سوچ میں پڑ گیا۔ ’’غالباً یہ وہی ہو گا جو اس علاقے کے رکن اسمبلی بٹ صاحب کا ڈرائیور ہے بلکہ ان کے بھائی کا... وہ بھی بٹ ہے اور اس علاقے کا بڑا بدمعاش ہے۔ بھائی کی وجہ سے اس کی بدمعاشی چلتی ہے اور اس کی بدمعاشی کی وجہ سے بھائی کی۔ اس علاقے کے سارے چھوٹے موٹے بدمعاش اس سے دبتے ہیں اور اسی کی وجہ سے شریف اور کمزور آدمی کو دبا کے رکھتے ہیں۔ اس نے ذمے داری لے رکھی ہے کہ رات کو گوال منڈی کی فوڈ اسٹریٹ میں کوئی مسئلہ نہ ہو۔ فیملیز آتی ہیں۔ تو نے دیکھا ہو گا باہر کی طرف بورڈ لگا ہوا ہے۔ نیکر یا شارٹ پہن کے آنا منع ہے۔ ایک دو بار اوپر والی برگر کلاس کے لڑکے آگئے تھے نیکریں پہن کے... بٹ نے سب کے سامنے دھکے دے کر نکلوا دیا۔ پہلے کوئی سگریٹ کی ڈبی سڑک پر پھینک دے تو شیدے کے بندے روک لیتے تھے، بڑی شرافت سے کہ جناب عالی اٹھا لو... اکڑفوں دکھائے کوئی تو گردن میں ہاتھ ڈال کے اٹھواتے تھے۔‘‘

شرافت کا رنگ اڑ گیا۔ ’’اس کا مطلب ہے... خطرناک بندہ ہے۔‘‘

’’ایویں خطرناک نہیں ہے۔ کوئی خطرہ ہو تو خطرناک بھی ہے۔‘‘

’’تجھے اتنا معلوم ہے اس کے بارے میں... یہ بھی پتا تھا کہ وہ تیری خالہ کے پاس آتا ہے؟‘‘

’’ہاں اور بھی لوگ آتے ہیں جن کو وہ کہتی ہے کہ رشتے دار ہیں۔‘‘

’’یار! تجھے وہاں رہ کے کبھی شک نہیں ہوا کہ وہ شریف عورت نہیں ہے؟‘‘

جمیل ہنسنے لگا۔ ’’میں ایک نواز شریف کو جانتا ہوں یا شہباز شریف کو... اور کون شریف ہے مجھے نہیں معلوم... نام تیرا بھی شرافت ہے۔‘‘

شرافت نے سوچ کے کہا۔ ’’کیا اس کی لڑکیاں بھی؟‘‘

’’یار! مجھے کیا پتا... میں صبح نکلتا ہوں تو رات کو گھستا ہوں... جو کھانے کو ملے کھا کے سو جاتا ہوں۔ دن بھر کا مجھے کیا پتا کہ کون کیا کرتا ہے۔ ویسے میں نے کچھ نہیں دیکھا جو تو نے آج دیکھ لیا۔ مجھ سے بات کرتی ہیں... میں بھی دل لگی کرتا ہوں وقت گزاری کے لیے۔‘‘

’’مجھے ان کی ماں پہلے دن ہی شریف عورت نہیں لگی تھی۔‘‘

’’پھر وہی بے وقوفی کی بات... کیا پتا دیکھنے میں لوگوں کو میں کیسا لگتا ہوں... تو کیسا لگتا ہے... آنکھ پر شک کی عینک چڑھی ہو تو ہر عورت ایسی لگے گی۔ یار حلیہ سب کا

ایسا ہی ہوتا ہے۔ کیبل پر اسٹار پلس نے سب کو ایک جیسا بنا دیا ہے۔ خود ہمارے ڈرامے ویسے ہی ہو گئے ہیں... میک اپ اور فیشن سب کرتی ہیں اور بیٹے... لہور لہور ہے... پنڈ دادن خان نہیں۔ پہلے بھی فیشن یہیں سے شروع ہوتے تھے... آج بھی نئی ریسیاں شہر لاہور دیاں... چائے پیے گا؟‘‘

شرافت نے اقرار میں سر ہلایا۔ ’’یار! ایک بات بتا۔ خالہ نے یہ کیوں کہا تھا شیدے سے کہ... شاہد کا دوست ہے... کرائے دار کا... تیرا نام تو جمیل ہے۔‘‘

جمیل ہنسنے لگا۔ ’’یہ تیرے کانوں نے سنا ہو گا۔ تیری جگہ میں فرش پر پڑا ہوتا اور وہ ننگا بھوت میرے اوپر سوار میرا گلا دبوچے بیٹھا ہوتا تو مجھے بھی انڈے کی جگہ مرغی سنائی دیتا... اچھا چلوں... دوسری ٹیوشن کا وقت ہو گیا ہے۔‘‘

شرافت نے مایوسی سے کہا۔ ’’میں نے سوچا تھا رات بھر تیرے پاس رہوں گا۔ تجھ سے کچھ ضروری باتیں کرنی تھیں۔‘‘

’’تو آجا لکشمی چوک میں بٹ سوئٹس کے سامنے... چھ بجے۔‘‘

’’یار! اب مجھے ڈر لگتا ہے... یہ نہ ہو خالہ تیرا بوریا بستر بھی گول کر دے۔‘‘

جمیل ہنس پڑا۔ ’’اوئے ڈرمت کا کا... خالہ کو مجھ پر بھروسا ہے۔ اور تیرے لیے بھی میں ان کو سمجھا دوں گا... اگر انہوں نے کچھ کہا۔ لیکن چھوٹے حکیم صاحب... آج اپنے قبلہ بڑے حکیم صاحب کو کیا گولی دی؟‘‘

شرافت نے خفت سے مسکرا کے کہا۔ ’’یار ارے ایک شادی کارڈ لے گیا تھا۔ اس میں تیرا نام لکھ دیا اور ایک ہال کا۔ آج کی تاریخ تھی۔ کہہ دیا تھا کہ دیر ہو گی رخصتی میں تو پھر صبح آؤں گا۔‘‘

’’ایسے کتنے بہانے کرے گا میرے لال؟‘‘ جمیل ہنسا۔

’’میرے لیے مسئلہ یہ ہے کہ مجھے چھٹی مل سکتی ہے جمعے کو... تیری ٹیوشن کی چھٹی ہوتی ہے اتوار کو... دواخانہ تو جب سے قائم ہوا ہے جمعے کے ناغے پر چل رہا ہے۔‘‘

’’فکر مت کر... میں کر لوں گا کوئی انتظام... ٹیوشن جمعے کو نہ پڑھاؤں۔‘‘ وہ باہر نکل گیا۔ شرافت اس کے جانے کے بعد بھی سوچتا رہا کہ آج رات اس کا جمیل کے ساتھ جانا مناسب رہے گا یا نہیں۔

اس ہوٹل سے خاصے محفوظ فاصلے پر آکے جمیل نے جیب سے موبائل فون پر ایک نمبر ملایا۔ ’’یار شیدے... میں شاہد بول رہا ہوں... کیا ہو گیا تھا آج... اس حکیم دے پتر کی تو خوف سے... رہی تھی۔‘‘ جو اس نے کہا، اس کا مطلب تھا کہ حالت غیر تھی۔

’’تو بھی کیسے کیسے نمونے پکڑ لیتا ہے فیکے۔‘‘ شیدا ہنس پڑا۔

’’ایسا مت کہہ... لاکھوں کی اسامی ہے لاکھوں کی... وہ اب میرے ساتھ جاتے ہوئے ڈر رہا ہے۔‘‘

’’ادھر لے جا اسے... گڑھی شاہو... چابی کا تجھے پتا ہے... اچھا بٹ صاحب آگئے ہیں۔‘‘ اس نے فون بند کر دیا۔

☆☆☆

جمیل کو اس نے اپنا استاد تسلیم کر لیا تھا۔ اس کے ساتھ رہنے سے آہستہ آہستہ شرافت کا دماغ بھی کام کرنے لگا تھا جو برسوں سے کسی غیر استعمال شدہ مشین کی طرح ناکارہ اور بے مصرف پڑا زنگ کھا رہا تھا۔ جمیل کے مشوروں نے اس مشین میں تیل کا کام کیا تھا۔ اپنی زندگی کی کمان اپنے ہاتھ میں لینے کا قطعی فیصلہ کرنے کے بعد اسے وہ سارے راستے سوجھ رہے تھے جن سے خرابی کم سے کم ہو... اسے معلوم تھا کہ مخالفت کا کیسا طوفان اٹھے گا اور غیظ و غضب کا آتش فشاں پھٹے گا تو لاوا کتنی تباہی پھیلائے گا۔ کوئی ہنگامہ نہ ہو اور قبلہ بڑے حکیم صاحب ہنسی خوشی اجازت مرحمت فرما دیں کہ برخوردار نورِ چشم... زندگی تمہاری ہے، جیسے چاہو گزارو... ہمیں تمہاری خوشی مقصود ہے۔ یہ اتنا ہی ناممکن تھا جتنا کسی کے نیچے دستی بم کا دھماکا کر دیا جائے اور وہ خندہ پیشانی سے مسکراتا رہے۔

ہاں، ایک حکمتِ عملی کے ذریعے شاک کو کم کیا جا سکتا تھا۔ ایک اشتہار کے مطابق... زور کا جھٹکا دھیرے سے لگے... پھر دوسرا جھٹکا... پھر تیسرا یہاں تک کہ وہ چوتھے کے لیے تیار ہو جائیں اور پھر شاک پروف بن جائیں۔ سانپ مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے... اگر یہ ممکن نہیں تو پھر لاٹھی بعد میں ٹوٹے جب اس کی ضرورت نہ رہے... یہ حکمتِ عملی شرافت نے بنائی تھی۔

جمیل کا دوسرا سنہری اصول یہ تھا کہ تلوار سے حملہ کرو مگر ڈھال ضرور استعمال کرو... ڈھال آخر ہوتی کس لیے ہے... شرافت نے امیر النسا کو ڈھال بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسے شیشے میں اتارنے کے لیے کسی خاص تردد کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ پوری طرح شرافت کے قبضے میں تھی جیسے چراغ کے قبضے میں جن۔ چراغ وہ منگنی کی انگوٹھی تھی جو شرافت نے بھی شرافت سے پہن رکھی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ امیر النسا نے اس کے نکاح میں آنے سے پہلے ہی ذہنی طور پر اس کو اپنا مجازی خدا تسلیم کر لیا ہے۔ اس سے محبت کو اپنا فرضِ

منصبی اور دم آخر تک وفاداری کو اپنا ایمان اور جانثاری، فرمانبرداری، خدمت گزاری وغیرہ کو اپنا نوشتۂ تقدیر... ڈولی اٹھنے کے بعد جنازہ اٹھوانے کے لیے ہروقت تیار۔

اس کی یہ خالہ زاد بُری لڑکی نہیں تھی۔ صورت شکل میں تو لاکھوں سے بہتر تھی اور اتنی زیادہ بے وقوف بھی نہیں تھی مگر شرافت کی طرح وہ بھی اپنی عقل خود استعمال نہیں کرتی تھی۔ اس نے بھی اپنی زندگی کی کمان فی الحال ماں باپ کے ہاتھوں میں دے رکھی تھی اور اس وقت کے انتظار میں تھی جب گھوڑے پر بیٹھ کے آنے والا شرافت اس کی لگام اپنے ہاتھوں میں لے لے۔ بس اس کے بعد زندگی کی وہی ڈگر جس پر اس کی ماں اور ماں کی ماں چلتی آئی تھیں۔ صدیوں سے چل رہی تھیں۔ جھاڑو برتن، کھانا پکانا اور حسب ضرورت بچے پیدا کرتے رہنا... میاں کو راضی رکھنا اور وہ سوکن پر سوکن لاتا رہے تو اسے بھی نوشتۂ تقدیر سمجھ کے قبول کرتے رہنا... وہ بہشتی زیور ماڈل کا جیتا جاگتا نمونہ تھی۔ مگر اب اس کا ذہن بدل کے اسے اکیسویں صدی کی فیوچر وائف بنانے کی ضرورت تھی۔ تب ہی وہ شرافت کی ڈھال بنتی۔

اس نے امیر النسا سے اپنے ہی گھر پر بات کی۔ ”سنو... میں تم سے اکیلے میں ملنا چاہتا ہوں۔“

اس نے سادگی سے کہا۔ ”اس وقت ہمارے علاوہ کون ہے یہاں... کہیے کیا بات ہے؟“

شرافت نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہاں نہیں... باہر...“

اس کا رنگ کچھ لال ہوا۔ ”باہر کہاں... ایسی کیا بات ہے جو یہاں نہیں ہو سکتی؟“

”جب ہوگی تو بتاؤں گا... اگر میں کہوں کہ کل شام چار پانچ بجے باغ جناح میں آجاؤ۔“

وہ گھبرا گئی۔ ”باغ جناح... بہت مشکل ہے۔“

”کوئی مشکل نہیں... کیا آج تک تم کبھی اکیلی باہر نہیں گئیں... پہلے بھی اسکول اکیلی جاتی تھیں۔“

”پہلے کی بات اور تھی۔“

”دیکھو... تم چاہو تو دس بہانے کر کے گھر سے نکل سکتی ہو... سہیلی کے گھر جانے کی بات کرو گی تو کون روکے گا تمہیں... کون شک کرے گا تم پر... ہاں، خود تم ملنا نہ چاہو تو میں زبردستی نہیں کر سکتا۔“ وہ خفگی کے انداز میں بولا۔

خود امیر النسا کے دل میں ایک خاص قسم کی ملاقات کے تصور سے گدگدی ہو رہی تھی۔ شرافت کا رومانٹک مطالبہ اس کے لیے اچنبھے کی بات تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اسے کوئی بھی روکے گا نہیں اور بفرضِ محال کسی کو پتا چل بھی گیا تو قیامت نہیں آئے گی۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ گھر کے بڑے سر جوڑ کے بیٹھ جائیں گے کہ اب جلد از جلد ان دونوں کو شادی کے بندھن میں باندھ دو... اس سے پہلے کہ دونوں کی جذباتی بے قراری کوئی گل کھلائے... فہوالمراد یہ امیر النسا بھی چاہتی تھی۔

اس نے شرافت کی خفگی کو وجہ بنا لیا۔ ”اچھا... اچھا... میں آجاؤں گی... تھوڑی دیر کے لیے۔“

اگلے دن شرافت نے اپنے دوست کی مدد سے اپنا گیٹ اپ بدلا۔ ایک دن پہلے جمیل نے کسی ماہر چابی بنانے والے کو بھیجا تھا جس نے قبلہ بڑے حکیم صاحب کے مطب میں نصب آہنی تجوری میں باری باری لگنے والی دونوں چابیاں بنا دی تھیں۔ یہ پرانے وقتوں کی تجوری تھی جو خاندانی نوادرات میں شامل تھی۔ چابیوں کے بعد اندر سے کھولنے کے لیے عدد ملانے پڑتے تھے جو سات سو چھیاسی کے اعداد تھے اور کبھی تبدیل نہیں ہوئے تھے۔ قفل ساز نے تجوری دیکھ کر پانچ سو وصول کر لیے تھے۔ اس کے جانے کے بعد شرافت نے اندر کا خفیہ خانہ کھولا اور تہ در تہ رکھے ہوئے سو پانچ سو اور ہزار کے نوٹوں کے درمیان سے دس ہزار کے مساوی رقم نکال لی۔ قبلہ بڑے حکیم صاحب کو اس نے دیکھا تھا۔ وہ ہر روز نوٹ اندر رکھنے جاتے تھے۔ حساب کتاب انہوں نے کبھی نہیں رکھا تھا اور نہ انہیں اندازہ تھا کہ تجوری کے اندر کتنی رقم دفن ہے۔ شرافت کا اندازہ تھا کہ یہ لاکھوں میں ہوگی۔ وہ ہر ہفتے پانچ ہزار تو بہ آسانی نکال سکتا تھا۔ اسے اپنے ہی گھر میں چوری کرتے ہوئے افسوس ضرور ہوا لیکن قصوروار قبلہ حکیم صاحب تھے جو اس عمر میں بھی مال جوڑتے جا رہے تھے اور اتنے کنجوس تھے کہ ان سب کا رہن سہن غریبانہ تھا۔ بیوی اللہ میاں کی گائے صابر و شاکر عورت تھی۔ اسے کبھی اصل آمدنی کا اندازہ ہی نہ ہوا اور اس نے زیادہ کی خواہش بھی نہیں کی لیکن ان کا معاون اور جانشین روزِ اول سے سب دیکھ رہا تھا۔ اب وقت آ گیا تھا کہ وہ معاملات کو اپنے لیے موافق بنائے۔

اس دن شرافت نے اپنی زندگی کو بدلنے کے لیے پہلا قدم اٹھاتے ہوئے اپنا گیٹ اپ بدلا۔ جمیل اس کا رازدار اور مشیر تھا۔ اس نے بڑے خلوص سے اپنے دوست کی پوری مدد کی۔ اس نے اپنا ہیئر اسٹائل ہی نہیں، لباس بھی جدید فیشن کے مطابق بنا لیا۔ وہ شام کو ٹی شرٹ، جینز اور جاگر پہنے اور سن گلاسز لگائے چڑیا گھر کے دروازے پر آنے جانے والی

عورتوں، مردوں اور بچوں کو دیکھ رہا تھا کہ ایک رکشے سے سیاہ برقع میں ملبوس امیر النسا اتری... شرافت نے اسے فوراً پہچان لیا تھا مگر وہ کرایہ ادا کرنے کے بعد متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتی رہی۔ شرافت نے آہستہ سے کہا۔ ”امیر...“ تو وہ چونک کے پلٹی اور پتھر کے بت کی طرح منجمد ہو گئی۔ شرافت اس کے بالکل سامنے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔

شرافت نے چٹکی بجائی۔ ”ہیلو... ہوش میں آجاؤ امیر النسا۔“

وہ ہکلائی۔ ”یہ... یہ آپ ہی ہیں... مجھے یقین نہیں آتا... کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں میں؟“

”باقی باتیں بھی کریں گے اندر جا کے... پہلے اپنے ایمان سے بتاؤ... کیسا لگ رہا ہوں میں؟“

”بالکل... بالکل فلمی ہیرو... بالکل سلمان خان۔“ امیر النسا نے خوشی سے لرزتی آواز میں کہا۔ ”آپ کو میری نظر نہ لگ جائے۔“

”اچھا لگا تمہیں... خدا کا شکر ہے... میں تو سوچ رہا تھا کہ تم خفا نہ ہو جاؤ اس بہروپ پر...“

وہ ٹکٹ لے کر اندر چلے گئے۔ چڑیا گھر کا وسیع گھنا باغ خلوت کے بے شمار گوشے فراہم کرتا تھا چنانچہ یہاں میاں بیوی اور بچوں کے علاوہ ان جیسے بھی آجاتے تھے جو صرف ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے تھے اور دیکھنے والے انہیں۔ مگر کوئی کسی کی تفریح میں خلل انداز نہیں ہوتا تھا۔ شرافت نے امیر کو ایک گوشۂ عافیت میں بینچ پر بٹھا دیا۔ امیر النسا نے خود ہی منہ دوسری طرف رکھتے ہوئے نقاب الٹا دی۔ شرافت نے دیکھا کہ اس ملاقات کے لیے امیر النسا خصوصی اہتمام کے ساتھ آئی ہے۔ اس کا لباس ہی نہیں، میک اپ بھی غیر معمولی تھا۔ شرافت نے پلک جھپکائے بغیر اسے نظر جما کے دیکھنا شروع کیا تو اس کے چہرے پر حیا سے زیادہ خوشی کی چمک آ گئی۔

”ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں... لوگ کیا کہیں گے؟“

شرافت نے ڈائیلاگ بولا۔ ”لوگ وہی کہیں گے جو میرے جذبات ہیں... اس وقت باغِ جناح میں کیا، یہاں سے انارکلی تک تم جیسی حسین لڑکی نہیں ہوگی۔ ایک درخواست مانو گی میری؟“

”کیسی باتیں کرتے ہیں آپ... آپ حکم دیں...“

”اچھا تو میرا حکم یہ ہے کہ اپنا برقع اتار دو۔“

امیر النسا گھبرا گئی۔ ”برقع اتار دوں... بے پردہ ہو جاؤں سب کے سامنے؟“

”دیکھو... صورت سب کو نظر آرہی ہے۔ اپنے آس پاس دیکھو... ہم جیسے کتنے ہیں... تم جیسی پردہ دار تو دو چار ہی ہوں گی۔ باقی سب ایسے ہی پھر رہی ہیں... کسے پروا ہے... میں تمہارے لیے آئس کریم اور چاٹ لے کر آتا ہوں۔ اس وقت تک تم برقع اتار دو گی... رائٹ؟“

وہ دس منٹ بعد لوٹا تو امیر النسا کو دیکھ کے دم بخود رہ گیا۔ اس نے اعتراف کیا کہ اب تک گھر کی مرغی دال برابر والا معاملہ تھا۔ امیر النسا کسی سے کم نہ تھی مگر اپنے دقیانوسی حلیے، گھریلو کپڑوں اور میک اپ کے بغیر وہ عام سی لڑکی نظر آتی تھی جو کسی کو بھی متوجہ نہ کرتی۔ مگر آج اس ملاقات کے اہتمام نے اس کے حسن کو گہنائے ہوئے چاند سے ماہِ کامل بنا دیا تھا۔ امیر النسا اس خواب ناک ملاقات کے تجربے پر ہنوز بے یقینی میں مبتلا تھی۔ ایسا وہ کب نہیں چاہتی تھی۔ کون لڑکی نہ چاہے گی مگر ایسا ہو جانا فقط آرزو کی بات نہ تھی۔ وہ لڑکا جو چھوٹے حکیم صاحب کے روپ میں اس کے سامنے منگیتر کی حیثیت رکھتا تھا، اچانک ایک رومانٹک ہیرو بن کے سامنے آیا تھا پھر وہ خود کو کسی ہیروئن سے کم کیسے نہ سمجھتی... آج ناممکن اچانک ممکن ہو گیا تھا۔ اب آگے کیا ہوگا؟ زندگی درحقیقت ایسی نہ تھی۔ کیا وہ ایسی ہو جائے گی؟ یا جیسی تھی ویسی ہی رہے گی؟

دھک دھک رقص کرتے دل کو قابو کرتی... خوشی کے آنسوؤں کو چھلکنے سے روکتی اور سحر زدہ بیٹھی امیر النسا کا سارا خوف دور ہو چکا تھا۔ وہ کسی کو نہیں دیکھ رہی تھی۔ کسی کے بارے میں نہیں سوچ رہی تھی۔ صرف شرافت کی آواز سن رہی تھی جو آج جیسے جادو سے اس کا پرانا غیر اہم منگیتر نہیں رہا تھا۔ وہ ہیرو بن گیا تھا۔ اس کے خوابوں کا شہزادہ بن گیا تھا۔

شرافت نے کہا۔ ”دیکھو امیر... جو اس وقت تم دیکھ رہی ہو... محسوس کر رہی ہو... یہ تمہیں خواب جیسا لگ رہا ہوگا۔ بے شک یہ خواب ہے مگر ہمارے آنے والے وقت کا... یہ سب راتوں رات جادو کی چھڑی گھمانے سے نہیں ہوا... اس کا خیال بہت پہلے میرے دل میں ایک خواہش بن کے آیا تھا۔ میں سوچتا رہا تھا کہ آخر ایسے میں کب تک زندگی گزاروں گا۔ ایک صدیوں پرانے معمول کے دائرے میں... جس میں مجھ سے پہلے قبلہ بڑے حکیم صاحب جی چکے... ان سے پہلے میرے دادا اور ان کے دادا اپنی عمریں گزار چکے... یہ اکیسویں صدی ہے امیر... اور ہم اپنے گھروں میں ابھی تک پچھلی صدی کے قیدی ہیں... ہمارا رہن سہن... لباس... سوچ... سب کتنی فرسودہ

ہے... تم سمجھ رہی ہو میری بات؟"

امیر النسا نے سر ہلایا اور بے اختیار اپنا ہاتھ شرافت کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ "مجھے فخر ہے آپ پر... آپ نے یہ سوچا۔"

شرافت خوش ہوا۔ "یہ بات کہہ کے تم نے میرا حوصلہ دوچند کر دیا۔ اگر تم اس تبدیلی... بلکہ انقلاب کی مخالفت کرتیں تو اکیلا میں کچھ نہ کر پاتا۔ میری آدھی طاقت تم ہو۔ اب میں اور تم مل کے ایک نئی دنیا آباد کریں گے۔"

"میں آپ کے ساتھ ہوں... مگر یہ آپ کیسے کریں گے آخر؟"

"میں بتاتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے، مجھے مخالفت کا سامنا ہوگا۔ سب سے پہلے تو میں تمہیں بتا دوں... میں یہ خاندانی پیشے کا بھرم اپنے گلے سے اتار کے پھینکوں گا۔ چھوٹے حکیم صاحب کا خطاب مجھے گالی کی طرح لگتا ہے... میں یہ سب نہیں کر سکتا امیر... جو میرے آباؤ اجداد کرتے آئے اور اپنے وقت میں انہوں نے نام بھی کمایا، پیسا بھی کما لیا... مگر اب کیا ہے اس پیشے میں... حکیم رہے کہاں... شہر میں ایک سے بڑا دوسرا اسپتال قائم ہو رہا ہے... باہر کی ڈگریوں والے ڈاکٹرز سارے مریض کھینچ رہے ہیں... ان کے پاس علم بھی ہے... تشخیص کے جدید ترین سائنسی آلات بھی اور نئی نئی دوائیں بھی۔ قبلہ بڑے حکیم صاحب جیسے ہر شہر میں کیا کر رہے ہیں... صرف فراڈ... بے ایمانی۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو... سب حکیم..."

"چلو سب نہ سہی... ان کی اکثریت جن میں قبلہ بڑے حکیم صاحب بھی شامل ہیں، کون لوگ آتے ہیں ان کے پاس... وہی جو شہر کی دیواروں پر لکھے ہوئے اشتہار پڑھتے ہیں۔ شرم آتی ہے مجھے ان کا ذکر کرتے ہوئے بھی... ان کے امراض اور ان کی دوائیں... میں کیا بتاؤں... سب ہوس کے مارے عیاش اور بوڑھے لوگ ہوتے ہیں... اور ہم ان کو بے وقوف بنا کے لوٹتے ہیں... یہ ساری معجون، سفوف، خمیرے اور طلا... سونے چاندی کے کشتے... ان کی یہ حقیقت بتاؤں تو تم کہو گی شاید میں جھوٹ بول رہا ہوں... لیکن تمہیں شریکِ راز کرنا ضروری ہے کیونکہ تم میری شریکِ حیات ہو... یہ جو ملتان کا حلوہ کہلاتا ہے... مختلف ناموں سے ملتا ہے... اس کا ذائقہ دوا جیسا کرنے کے لیے ہم کسی میں ملاتے ہیں سونف تو کسی میں سیاہ زیرہ یا دارچینی کا سفوف... ان کے الگ الگ نام رکھ دیے ہیں... خمیرہ ابریشم حکیم ارشد والا..."

"اللہ شرافت! میں کیسے یقین کر لوں..." امیر النسا نے پہلی بار اپنے منگیتر کا نام لے کر گویا روایت سے بغاوت کی۔

شرافت نے کہا۔ "میں سچ بتا رہا ہوں۔ ایسی بوگس دواؤں کے ہم عیاش رئیسوں اور بڈھوں سے سیکڑوں روپے وصول کرتے ہیں... حکمت کی دواؤں سے تم کچھ واقف ہو... ایک ہوتی ہے "لعوق سپستان"۔ میں نے خود برنی کی ایک ڈلی میں تھوڑا سا کالا نمک ڈالا اور پانی سے پیسٹ سا بنا لیا... کسی میں لونگ الائچی کا سفوف ملا دیا... ایسا ہی حال شربتوں کا ہے... بازار کے عام شربت بھی ضروری نہیں... پانی میں گڑ چینی گھولی، رنگ ڈالا اور ذائقہ تھوڑا سا بگاڑ دیا... اِدھر اُدھر کی سیکڑوں چیزیں ملانے سے شربتِ فولاد بن گیا۔"

"لیکن... وہ خود دوائیں کوٹنے چھاننے والے ہیں۔"

"وہ تیل بناتے ہیں... تم نے اشتہار نہیں دیکھے... خاندانِ مغلیہ کے شاہی حکیم کا نسخۂ خاص... خریدار دیکھ بھی سکتے ہیں کہ کتنی محنت سے بنایا جاتا ہے۔ دو سو بھی لاگت نہیں آتی مگر ہم وصول کرتے ہیں دو ہزار... اور شوقین دیتے ہیں... یہ نفسیاتی حربہ ہے... اگر محنت دو سو رکھیں تو اعتقاد نہیں ہوگا کہ آج کل دو سو کی کیا اوقات ہے... دو ہزار میں خریدنے والا متاثر ہوتا ہے کہ کچھ تو خاص ہوگا۔ جو چالیس سے پہلے گنجے ہونے لگتے ہیں، وہ بڑے فکرمند ہوتے ہیں کہ اب جوان ہیرو کیسے لگیں گے... پیسا بھی ہوتا ہے ان کے پاس... یہ نہیں سوچتے کہ گرتے بالوں کا علاج ہوتا تو ہمارے ارب پتی سیاست داں جن کے باہر اثاثے ہیں... گنجے کیوں ہوتے... بال کیوں لگواتے... امریکا میں بڑے بڑے گورے میڈیکل سائنس کی ایجاد سے فائدہ اٹھاتے... مگر بال لگائے جا رہے ہیں... مصنوعی طریقے سے... ہیئر ٹرانسپلانٹ..."

"سچ کہہ رہے ہو تم... سنا ہے شاہ رخ اور امیتابھ بچن بھی ایسا ہی کرتے ہیں؟"

"امیر... ایک فلم کا معاوضہ کروڑوں میں ملتا ہو تو آدمی کیا نہیں کر سکتا... ایک ماہر کور کھ سکتا ہے جو روز ان کے بال گنے اور دو کم ہوں تو وہیں دو لگا دے... چار کم ہوں تو چار... کسی کو فرق کا کبھی پتا نہیں چلے گا... ایسا ہی چکر قد بڑھانے والی دواؤں کا ہے... اللہ دین کے چراغ کا جن بھی ہڈی کو لمبا نہیں کر سکتا... نہ ٹانگ کی نہ کمر کی... مگر دراز قد سب نظر آنا چاہتے ہیں... ان کو لوٹنا آسان ہے... گورا رنگ کرنے کے لیے لڑکیاں سب کچھ دے سکتی ہیں۔ جو اولادِ نرینہ کا خواہش مند ہو یا بے اولاد ہو... وہ ہر علاج پر اپنا

سب کچھ لٹا سکتا ہے... ہم یہی کر رہے ہیں... جاننے والے جانتے ہیں مگر ہم پکڑ میں نہیں آتے کیونکہ یہاں کوئی کنٹرول نہیں... نہ دوا کے اجزا کو چیک کیا جا سکتا ہے، نہ حکیم کے دعوے کو... نہ کوئی عدالت میں جاتا ہے، نہ ثابت کر سکتا ہے۔ ایسے قوانین ہی نہیں ہیں... نہ بنانے کی کوئی بات کرتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ لوٹنے والے لوٹ رہے ہیں... لٹنے والے لٹا رہے ہیں اپنی خوشی سے۔" وہ بات کرتے کرتے ذرا دیر کے لیے رکا۔ "لیکن امیر! میں تو جانتا ہوں... یہ بھی سمجھتا ہوں کہ ہم مجرم اور گناہ گار ہیں... یہ حرام کی کمائی ہے... ہماری عزت کچھ نہیں۔"

امیر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "تم نے بہت اچھا فیصلہ کیا یہ پیشہ چھوڑنے کا... مگر اس کے بعد تم کیا کرو گے؟"

"وہ سب میں طے کر چکا ہوں۔ انشاء اللہ سب اچھا ہوگا۔ کچھ وقت ضرور لگے گا مگر ایک دن تم دیکھو گی، ہمارا گھر گلبرگ میں ہوگا۔ ہمارے پاس ایک نہیں دو کاریں ہوں گی۔ بڑی میں لے جاؤں گا۔ چھوٹی میں تم بچوں کو لاؤ گی لے جاؤ گی... شاپنگ کرو گی۔"

امیر النسا کی آنکھوں کے سامنے ایک فلم سی چلنے لگی۔ اس کے مختلف سین ان تمام حسین خوابوں کی عکاسی کرتے تھے جو ہر لڑکی... کوئی بھی غریب لڑکی... سوتے جاگتے دیکھ سکتی ہے... جب وہ آج پر محیط زندگی کے تلخ شب و روز سے کچھ دیر کے لیے ہی فرار حاصل کرنے کا سوچے... مختلف خوب صورت گھر، کوٹھیاں اور محل... ان کے لان اور باغ... ان میں کھڑی ہوئی گاڑیاں... ان کے سجے سجائے کمروں کی رنگین دیواروں پر آویزاں تصاویر... اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے ڈیکوریشن پیس اور لیمپ... ایئر کنڈیشنڈ بیڈ روم جن کے دبیز قالین اور ریشمی پردے ہم رنگ ہوں... اور وہ... وہ خود... ہر لباس میں تصویرِ رعنائی... پیکرِ لطافت و دلکشی، رنگین ریشمی ملبوس میں ایک پیکرِ حسن... ہر ریسٹورنٹ اور شاپنگ مال میں مرکزِ نگاہ... اور اس کے بچے... دولڑکے اور ایک اس جیسی لڑکی...

یہ خواب اس وقت ٹوٹا جب شرافت نے کہا۔ "میرا ساتھ دو گی امیر...؟"

وہ چونکی۔ "میں... میں تمہارے ساتھ ہوں... ہر قدم پر... ہر آزمائش میں..."

"صرف زبانی کہنے سے کام نہیں چلے گا... تمہیں کچھ کرنا ہوگا۔"

"کیا کرنا ہوگا... بتاؤ... آزما کے دیکھو۔" اب رات ہونے لگی تھی۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "چلو... باقی بات باہر کریں گے... یہاں کا وقت ختم ہو گیا... تم ڈر تو نہیں رہی ہو؟"

وہ برقع پہننے لگی۔ "تم ساتھ ہو تو مجھے کسی کا ڈر نہیں۔"

"تو پھر برقع رہنے دو... ایسے ہی چلو میرے ساتھ۔"

"سڑک پر کوئی دیکھ لے گا شرافت..." امیر النسا نے عادتاً کہا۔

"دیکھنے دو... سمجھو تمہاری آزمائش شروع ہو گئی... ابھی کیا کہا تھا تم نے یاد ہے؟"

وہ شرافت کے ساتھ چلنے لگی۔ وہ باغِ جناح سے نکل کے چیرنگ کراس کی جانب فٹ پاتھ پر چلنے لگے۔ ان کے اردگرد سیکڑوں تیز روشنیوں والی کاروں کا سیلِ رواں دونوں سمت میں بہہ رہا تھا اور ان میں مرد، عورتیں اور بچے تھے... جیسے ایک دن وہ بھی ہوں گے۔

"خالہ پریشان ہوں گی... تم انہیں کیا بتا کے آئی تھیں؟"

"یہی کہ ایک سہیلی کے گھر جا رہی ہوں... نام نہیں بتایا تھا۔" وہ فٹ پاتھ پر شرافت کے ساتھ شانہ بشانہ چلتی رہی۔

"آج تم ڈیٹ پر ہو... چھوٹے حکیم صاحب یا تمہارے پیدائشی منگیتر نے نہیں... تمہارے بوائے فرینڈ نے تمہیں ڈنر پر انوائٹ کیا ہے... تمہیں آج ہی پروپوز کرنے کے لیے... تم سے شادی کی درخواست کرنے کے لیے۔"

وہ کھلکھلا کے ہنس پڑی۔ "ایسی باتیں کرنا تم نے کہاں سے سیکھ لیا؟"

"وقت سب سکھا دیتا ہے سویٹ ہارٹ... دیکھو کیا کہا تھا میں نے؟ انارکلی تک آج تمہارے حسن کا راج ہے... کوئی ہے تم سے زیادہ حسین؟ ہر نظر تمہیں دیکھ رہی ہے۔"

امیر النسا کو شراب کا سا نشہ ہونے لگا۔ واقعی ایسا تھا۔ مردوں کی نظر اسے مسلسل خراجِ تحسین پیش کر رہی تھی حالانکہ لڑکیاں ان کے ساتھ بھی تھیں۔ اس نے خوابوں کی تعبیر کے پہلے زینے پر قدم رکھ دیا تھا۔ وہ بے برقع ایک ماڈرن لڑکی بن کے مال پر کتنے اعتماد کے ساتھ جا رہی تھی۔ ان کے گھر میں کم از کم ٹی وی تھا لیکن فلموں پر پابندی تھی۔ ایسے مناظر اب ڈراموں میں نظر آتے تھے۔ ایک شام نے اسے بدل دیا تھا۔

آج کی شام کے لیے جمیل نے اپنے دوست کو ایک ایک جملے کی تیاری اس طرح کرائی تھی جیسے کوئی کامیاب

ہدایت کار اپنی فلم کے کرداروں کو پوری سچویشن کی ریہرسل کراتا ہے۔ اس کے لباس کا انتخاب بھی جمیل نے ہی کیا تھا اور امیر النسا کے کردار کو ذہن میں رکھتے ہوئے پیش گوئی کی تھی کہ وہ لڑکی اس جذباتی انقلاب سے یوں اس کے ٹرانس میں آجائے گی کہ وہ جیسے چاہے اس سے عامل معمول والا کھیل کر سکتا ہے۔ وہ جو بھی کہے گا امیر النسا کرے گی...

پلان کے مطابق شرافت اسے کھانا کھلانے ایک روف ٹاپ ریسٹورنٹ میں لے گیا۔ وہ چودھویں شب تھی۔ اوپر چاندنی کا غبار پھیلا تو نیچے ہر ٹیبل پر کینڈل روشن ہوگئی اور ایک گوشے میں ایستادہ بینڈ نے مدھم سروں میں موسیقی چھیڑ دی۔ امیر النسا دنیا کو اور خود کو بھول کے شرافت کی آنکھوں میں ڈوب چکی تھی اور اتنی بے خود تھی کہ وہ اسے اپنے ساتھ ہوٹل کے کسی کمرے میں لے جاتا تو وہ کامل سپردگی کے ساتھ اس خواب ناک شب کی سحر کر دیتی اور اسے نہ دنیا کا خیال آتا، نہ گھر کا اور اپنی عفت و ناموس کے اس گوہرِ نایاب کا جو مڈل کلاس کی ہر لڑکی کے لیے حفاظت طلب واحد اثاثہ ہوتا ہے۔

صحیح وقت پر شرافت نے کہا۔ ”امیر النسا... کیا تم میں اتنی ہمت ہے کہ مجھ سے شادی کرنے سے انکار کر سکو؟“

امیر النسا کو یوں لگا جیسے اس کے کانوں نے غلط سنا۔ ”کیا کہا آپ نے؟“

شرافت نے اپنا سوال دہرایا۔ ”سمجھو یہ تمہاری آزمائش کا پہلا مرحلہ ہے... مگر غلط مت سمجھو... تمہیں مناسب وقت پر اپنی ماں سے یہی کہنا ہے جو میں نے تم سے کہا۔ لگی لپٹی رکھے بغیر۔“

”میں سمجھی نہیں۔“ امیر النسا کا دل ڈوبنے لگا۔

”تمہیں کہنا ہوگا کہ میں اس جاہل فراڈیے حکیم کے ساتھ وہ زندگی گزارنے کے لیے تیار نہیں جو اس کی ماں نے قبلہ بڑے حکیم صاحب کے ساتھ کاٹی... کسی قید بامشقت کی طرح۔“

”یہ... یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“

شرافت بولتا رہا۔ ”جو میں نے تمہیں بتایا... سب بول دینا... وہ باپ، بیٹا دھوکے باز ہیں... ان کی کوئی عزت نہیں... شہر کی دیواروں پر بیٹا خود اپنے باپ کی پبلسٹی کرتا ہے اور ایسے اشتہار لکھتا ہے جو پڑھ کے شریف آدمی شرم سے پانی پانی ہو جائے... ان کا گھر دیکھو... ایک کباڑ خانہ ہے۔ ہر چیز سو سال پرانی ہے... دیواروں پر رنگ و روغن نہیں... پلاستر جھڑ رہا ہے۔ کنجوس اتنے کہ دھیلا خرچ نہیں کرتے... دقیانوسی اتنے کہ گھر میں ٹی وی نہیں... پرانی طرز کے کرتے شلوار میں کارٹون نظر آتا ہے وہ جس کا نام شرافت ہے... نکاح سے بہتر ہے کہ میں خودکشی کر لوں... ایک ہی بار مر جاؤں۔“

امیر النسا سخت شاک کی کیفیت میں بیٹھی تھی۔ ”خدا کے لیے مجھے بتاؤ تو سہی کہ تم چاہتے کیا ہو؟“

”تمہارے انکار کے بعد یہ بات پہنچے گی میرے گھر تک... اور میں وہ کہہ سکوں گا جو آج تک نہیں کہا... میرے پاس ایک جواز ہوگا... میں صاف کہہ دوں گا کہ امیر النسا میری زندگی ہے۔ اس کے لیے میں سب چھوڑ سکتا ہوں... یہ خاندانی پیشہ کیا یہ گھر بھی... وہ بالکل ٹھیک کہتی ہے... میں اب یہ کام ہرگز نہیں کروں گا خواہ آپ مجھے عاق کر دیں یا گھر سے نکال دیں۔“

چکرائی ہوئی امیر النسا نے کہا۔ ”وہ پوچھیں گے کہ تم یہ کام نہیں کرو گے تو کیا کرو گے؟“

وہ ہنسا۔ ”ان کے سامنے تو میں بولوں گا ڈائیلاگ... کہ میں محنت مزدوری کر لوں گا۔ مجھے یہ دھوکے فراڈ اور بے عزتی کی کمائی منظور نہیں... امیر النسا کو میں خوش رکھ سکتا ہوں۔“

”اور اس کے بعد... تم نے کیا سوچا ہے... کیا کرو گے؟“

”میں بزنس کروں گا۔“ شرافت نے پُر وثوق لہجے میں کہا۔ ”ایک دوست نے مجھے اپنے کاروبار میں شریک کر لیا ہے۔ یہ امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس ہے۔ ہم زیادہ تر دبئی، ملائیشیا اور ہانگ کانگ کے درمیان تجارتی سامان لائیں گے لے جائیں گے۔“

”اس کا کیا تجربہ ہے تمہارے پاس؟“

”تجربہ کام کرنے سے آتا ہے۔ میرے دوست نے کہا ہے کہ ہر بزنس ٹرپ میں پچاس فیصد کا منافع یقینی ہے۔ یعنی چار لاکھ کا مال ہو تو اس پر دو لاکھ منافع... ایک اس کا ایک میرا... مہینے میں دو ٹرپ تو میرے دو لاکھ...“

”لیکن یہ چار لاکھ کہاں سے لاؤ گے تم...؟“

”سب سوچ لیا ہے میں نے... سب معلوم ہے مجھے کہ قبلہ بڑے حکیم صاحب کے پاس کتنا مال ہے... ان کی تجوری میں لاکھوں پڑے سڑ رہے ہیں... وہ کس دن کام آئیں گے آخر... ہمارے خاندان میں سب لمبی عمر پاتے ہیں۔ وہ مزید تیس سال جی گئے تو میں ہو جاؤں گا ساٹھ کا... پھر ان کاغذ کے ٹکڑوں کا کیا کروں گا... مزار بنواؤں گا اپنا... اور قبلہ بڑے حکیم صاحب کا...“

”کیسی باتیں کرتے ہو شرافت؟“

”میری باتیں گستاخانہ ہیں یا منحوس... مگر سچ تو سچ

ہوتا ہے۔ دو لاکھ نکال کے دینا تو کوئی بات ہی نہیں... قبلہ بڑے حکیم صاحب کی میں اکلوتی اولاد ہوں... وہ مجھے کیسے گنوا سکتے ہیں۔ تم کہہ سکتی ہو کہ یہ بلیک میلنگ ہے مگر میں بھی تو خاندانی پیشے کے نام پر بلیک میل ہی ہوا ہوں اور آگے جا کے مجھے ذلت و خواری کے سوا کیا ملے گا... کہتے ہیں میرے پردادا بڑے نامور حکیم تھے۔ بیسیوں میں شمار ہوتے تھے۔ دادا نے بھی عزت سے زندگی گزاری... ابا کو نہ عزت ملی نہ دولت... پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں... بچپن سے میں نے تنگ دستی کے سوا دیکھا کیا ہے... یہ خاندانی پیشہ میری اعلیٰ تعلیم کی راہ میں حائل ہو گیا۔ اس سے زیادہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔ اب میں اور تم مل کے ایک نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔ یہ سمجھو کہ میری آدھی طاقت تم ہو امیر النسا... تمہارے بغیر جینے کا تصور بھی محال ہے میرے لیے... یہ صرف کہنے کی بات نہیں... میں واقعی تم سے دیوانگی کی حد تک محبت کرتا ہوں... اور اسی لیے میں نے تمہیں شریکِ راز کیا... تمہیں سب سے پہلے بتایا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔“

امیر النسا کا سارا تذبذب جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ ”اگر تم کہتے ہو... تو میں یہ سب کروں گی... تمہارے سوا میں نے بھی آج تک کسی کے بارے میں نہیں سوچا... خواب بھی دیکھے ہیں تو تمہارے...“

”بس تو پھر ہاتھ ملاؤ۔“ شرافت نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”ہم شادی کب کریں گے شرافت؟“ امیر النسا نے جھجکتے ہوئے پوچھ لیا۔

”کرنے کو آج ہی کر لیں... مگر کامیابی کی جدوجہد تھوڑا سا ضبط اور قربانی مانگتی ہے... تم مجھے صرف دو سال دو... ایک اور پلان بھی ہے میرے ذہن میں... تم دیکھو گی کہ دو سال میں اس پر کیسے عمل ہوگا... یہ جو ہمارا خاندانی گھر ہے... لمبائی کے رخ دس مرلے پر پھیلا ہوا ہے... پانچ مرلے میں ہم رہتے ہیں اور مطب ہے... باقی پانچ میں دواخانہ، اسٹور اور کام کی جگہ ہے... یہ مین روڈ پر کمرشل سائٹ ہے... اس کی قیمت کا اندازہ نہیں کر سکتیں تم... ہم تو خاندانی جاگیر سمجھ کے رہتے چلے جا رہے ہیں۔ ہم اسے کسی بلڈر کے ہاتھ بیچ دیں تو اتنی رقم مل سکتی ہے کہ بہ آسانی اتنا ہی بڑا گھر نئی آبادی میں لے سکتے ہیں... جوہر ٹاؤن... فیصل ٹاؤن... تم نے تو نام بھی نہیں سنے ہوں گے ان کے... لیکن میں جلدی نہیں کرنا چاہتا... دو سال میں دس بیس لاکھ اپنا کما لوں تو پھر اسے بھی ٹھکانے لگا کے ایک بار ہی سیدھے گلبرگ جائیں گے... میں اور تم... شادی کے لیے ہم یہ ہوٹل بھی بک کرا سکتے ہیں۔“

خوشی، شرم اور حیرانی سے مغلوب امیر النسا ہنسی۔ ”ہائے اللہ... کہیں ہوٹل میں بھی شادی ہوتی ہے۔“

”پاگل ہو تم بھی... کہو تو تمہیں دکھاؤں... ان کا ایک برائیڈل سویٹ ہے... اردو میں حجلۂ عروسی سمجھ لو... ایک ہنی مون پیکیج ہوتا ہے کہ آپ یہاں شادی کریں... دو چار دن رہیں اور عیش کریں... ہاں ہنی مون کے لیے تمہارا ارادہ کہیں باہر جانے کا ہے تو اور بات ہے... ہم لندن، نیویارک، پیرس بھی جا سکتے ہیں... کیا خیال ہے اب چلیں؟“

”ہاں چلو... گھر پر مجھے ایک طوفان کا اکیلے سامنا بھی کرنا ہے۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

باہر آ کے امیر النسا پھر اپنے پرانے برقع میں روپوش ہو گئی... بادل ناخواستہ... اسے یوں لگا جیسے وہ پنجرے میں قید مینا تھی جس کو کسی دستِ غیب نے کچھ دیر کے لیے کھلے آسمان میں پرواز کی اجازت اور طاقت عطا کر دی تھی مگر لوٹ کے تو اسے پھر اسی قفس کی تنہائی میں جانا ہے۔ شاید اب اس کے لیے آنکھوں میں بس جانے والے خوابوں کے ساتھ اپنے پرانے گھر میں زندگی زیادہ دشوار ہوگی... حالانکہ اسی گھر میں بیس سال گزارنے کے بعد وہ کسی امید کے بغیر جینے کی عادی ہو چکی تھی۔ اب آنے والے دنوں میں اپنے خوابوں کی تعبیر کے انتظار کا ہر لمحہ کتنا صبر آزما ہو جائے گا۔

شرافت نے ایک رکشا لیا اور امیر النسا کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ”فکر مت کرو... میں تمہیں ایسی جگہ اتار کے واپس چلا جاؤں گا جہاں کوئی بھی تمہیں میرے ساتھ نہ دیکھے۔ ویسے بھی تم برقع میں ہو اور آج تمہاری نظر دھوکا کھا گئی تھی تو شرافت کو کوئی اور کیسے پہچانے گا۔“

جمیل کے بہت اطمینان دلانے کے باوجود کہ وہ بات ایک حادثہ سمجھ کے بھلا دی گئی ہے، شرافت نے دوبارہ خالہ کے ڈیرے پر جانے کی ہمت نہیں کی۔ گڑھی شاہو میں جمیل کا دوسرا ٹھکانا پرانے کراؤن سنیما کے پیچھے ایک بیٹھک تھی۔ پیچھے والے گھر کے بارے میں جمیل نے بتایا کہ میرپور (آزاد کشمیر) کے کسی آٹو مکینک کا تھا جو اپنی فیملی بھی یو کے لے گیا ہے اور مکان برائے فروخت ہے۔ اس کی چابی جمیل کے کسی جاننے والے پراپرٹی ڈیلر کے پاس تھی۔ وہ اس کے بچوں کو پڑھاتا تھا۔ شرافت کے اطمینان کے لیے جمیل کی یہ وضاحت کافی تھی۔

آج اسے جمیل کو امیر النسا کی رپورٹ دینے کے بعد اپنا فیوچر پلان ڈسکس کرنا تھا۔ معاملات تیزی سے ایک سمت میں بڑھ رہے تھے اور ان کا سیٹل ہونا ضروری تھا۔ وہ رکشا والے کو ادائیگی کر کے گلی میں چند قدم دور چلا گیا تھا کہ اس نے بیٹھک کا دروازہ کھلتا دیکھا۔ روشنی باہر آئی اور اس کے ساتھ ہی بیٹھک سے نکلنے والے کا چہرہ نظر آیا۔ پھر دروازہ بند ہو گیا اور وہ شخص شرافت کی طرف دیکھے بغیر اس کے پاس سے گزرا تو شرافت نے اسے پہچان لیا... یہ وہی تجوری کی چابی بنانے والا تھا... شرافت حیران ہوا کہ وہ اس وقت جمیل سے کیوں ملنے آیا تھا۔

جمیل نے کہا۔ ”آؤ شہزادے... بڑی دیر لگا دی اپنی چھمک چھلو کے ساتھ۔“

شرافت نے کہا۔ ”یار! یہ قفل ساز وہی تھا نا؟ یہ کیوں ملنے آیا تھا تجھ سے؟“

جمیل ہنسنے لگا۔ ”کیوں؟ مجھ سے ملنے صرف چھوٹے حکیم صاحب آسکتے ہیں؟“

شرافت نے اس کی بند مٹھی کو دیکھا۔ ”تیرا جاننے والا ہے؟“

”اب جاننے والا نہ ہوتا تو میں ایسے خفیہ اور خطرناک مشن پر تیرے پاس بھیجتا؟“

☆☆☆

شرافت نے اس کی مسکراتی ہوئی جیتی جاگتی تصویر کو دیکھا جو کسی فوٹوگرافر نے بڑی مہارت سے کھینچی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ ابھی وہ پلک جھپکے گی اور اس کے گلاب کی پنکھڑی جیسے لب وا ہو جائیں گے۔ ”تم نے اپنا نام انجلینا جولی کیوں لکھا ہے؟“

”تم نے اپنا نام شرافت حسین کیوں لکھا ہے؟“

”اس لیے کہ یہی میرا اصل نام ہے۔“ شرافت نے کہا۔

”میں نے تو تصدیق کیے بغیر مان لیا تھا... اور کیا نام سے فرق پڑتا ہے؟“

”نہیں، دراصل تمہاری صورت کے نقوش کچھ ایشیائی ہیں۔“

”کالے بال اور آنکھیں یہاں عام ہیں... میرا کمپلیکشن تمہیں کنفیوز کرتا ہے تو میں کیا کروں؟“

”فیس بک پر تمہارے بہت دوست ہوں گے؟“

”اگر میں کہوں کہ کوئی نہیں... تو کیا تم یقین کر لو گے؟ مگر حقیقت یہی ہے... بہت جلد سب کی حقیقت کھل جاتی ہے اور اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ بھروسے کے قابل نہیں... بہت کھوکھلے اور غیر دلچسپ ہیں... تم اپنے دوستوں کے بارے میں بتاؤ۔“

”سمجھ لو ایسا ہی میرے ساتھ ہوا... ہر تجربہ غیر دلچسپ اور ناکام رہا۔“

”کیا اسے تم اپنی ناکامی نہیں مانتے؟ آخر وہ کون لوگ تھے؟“

”جو بھی تھے اُن کے ساتھ میں نہیں چل سکا... یا وہ میرے ساتھ۔“

”ان میں لڑکیاں بھی ہوں گی؟“

”ہاں لیکن تم جیسی ایک بھی نہیں تھی۔ مجھے کوئی اچھی نہیں لگی۔“ شرافت نے لکھا۔

”اچھائی کا تمہارے نزدیک کیا معیار تھا... خصوصاً ایک لڑکی میں...“

شرافت کو سوچنا پڑا۔ ”اگر تم میری صاف گوئی کا بُرا نہ مانو... ان میں کوئی تم جیسی خوب صورت نہیں تھی... شاید تمہارے مقابلے میں ان کو بدصورت قرار دیا جا سکتا ہے۔“

”کیا تم نہیں سمجھتے کہ حسن دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے؟“

”اچھا، تو بتا دو کیسا لگتا ہوں تمہیں؟“

”یقیناً فیس بک پر اب تک ہر لڑکی نے یہی کہا ہوگا کہ تم مردانہ وجاہت کا نمونہ ہو... ہیرو لگتے ہو پھر میری رائے مختلف کیسے ہو سکتی ہے۔“

شرافت کا دل جھوم اٹھا۔ ”کیا تمہارے ساتھ بھی ایسا نہیں ہے؟ حسن کے عالمی معیار پر تم حسین ہو... بے انتہا حسین۔“

”کہنے والے بہت کچھ کہتے ہیں... کوئی مشورہ دیتا ہے کہ میں ماڈلنگ کروں، تو سب کو پیچھے چھوڑ سکتی ہوں... ایسے بھی ہیں جو یقین دلاتے ہیں کہ میں مقابلۂ حسن میں شرکت کروں تو مس یونیورس بن سکتی ہوں مگر میں یقین نہیں کرتی۔“

”ساری دنیا غلط تو نہیں ہو سکتی۔“

”مجھے نہیں معلوم... لیکن جو صرف صورت پر فریفتہ ہو جائیں، ان کو میں دوست نہیں سمجھ سکتی۔“

”مگر وہ قصوروار بھی نہیں... ان کے جذبات مختلف نہیں ہو سکتے۔“

اس نے جواب دیا۔ ”مرد اور عورت کے لیے ایک دوسرے کی کشش محض ایک حیوانی جذبہ ہے... جبکہ مجھے خلوص چاہیے، ہمدردی اور شرافت چاہیے... میں ایک دوست کی تلاش میں ہوں۔“

”کیا واقعی تمہارا کوئی دوست نہیں؟“

”اس میں یقین نہ کرنے والی کون سی بات ہے... اور غلط بیانی سے مجھے کیا ملے گا؟“

شرافت نے فوراً وضاحت کی۔ ”میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔ دراصل جس سوسائٹی میں تم رہتی ہو، وہاں تو بوائے فرینڈز بچپن سے بن جاتے ہیں اور بنتے رہتے ہیں۔“

اس نے کچھ دیر میں جواب دیا۔ ”میں شاید اپنے دل کی بات تمہیں سمجھا نہیں سکتی... بوائے فرینڈ میرے لیے فرینڈ نہیں... وہ بھی حسبِ ضرورت اپنی گرل فرینڈز بدلتے رہتے ہیں۔ جذباتی طور پر میں خود کو تنہا محسوس کرتی ہوں۔ کوئی بھی میری توقعات پر پورا نہیں اترتا... پتا نہیں میں کیا چاہتی ہوں۔“

”مجھے بھی آزما کے دیکھو...“

”میں یہ سب تمہیں کسی امید پر ہی بتا رہی ہوں۔ پتا نہیں کیوں میری چھٹی حس مجھے یہ خوش خبری دیتی ہے کہ تم مجھے مایوس نہیں کرو گے۔“

”کیا تم یقین کرو گی کہ خود میں اتنی بڑی دنیا میں خود کو تنہا محسوس کرتا ہوں۔ کیا پتا ایک دوسرے سے یہ تعارف ہم دونوں کے لیے مبارک ثابت ہو۔ ہم دونوں کی تلاش بالآخر ختم ہو جائے۔“

”فیس بک تعارف کا اچھا ذریعہ ہے لیکن اس میں دھوکا بہت ہے۔ اکثر لوگ اپنے بارے میں جھوٹ بولتے ہیں۔ میں ہی بے وقوف ہوں کہ جو ہے صاف بتا دیتی ہوں۔“

”چلو اعتماد کے اس نئے رشتے کا آغاز میں کرتا ہوں۔ میں بتا دیتا ہوں کہ میں جیسا تصویر میں نظر آ رہا ہوں... درحقیقت ایسا نہیں ہوں۔ ایک دوست نے اصل صورت کو بہت بدل دیا ہے۔ پھر بھی تم مجھے پہچان سکتی ہو۔“

”میں بھی اعتراف کرتی ہوں کہ انجلینا جولی میرا اصل نام نہیں ہے۔ تم نے اسے دیکھا تو ہوگا فلموں میں؟“

شرافت نے سوچ کے لکھا۔ ”ہاں... وہ تم سے زیادہ حسین تو نہیں... پھر یہ نام اختیار کرنے کی وجہ؟“

”ایک تو میں اس سے بہت زیادہ متاثر تھی پھر اس کی اور میری صورت میں بہت زیادہ مشابہت ہے۔ پہلے میں سمجھتی تھی کہ فائدہ اٹھانے کے لیے سب جھوٹ بولتے ہیں۔ مجھے بے وقوف بناتے ہیں لیکن ہر شخص نے کہا تو میں نے مان لیا... کیا تم شادی شدہ ہو؟“

شرافت کا اگلا سوال کچھ اور ہوتا لیکن دوسری طرف سے انتہائی غیر متوقع سوال آ گیا۔ ”ابھی تک مجھے وہ لڑکی نہیں ملی جو میرے لیے اس حد تک ناگزیر ہوتی... کہ میں اسے زندگی بھر کے لیے اپنانے پر مجبور ہو جاتا۔“

”پاکستان میں تو بیٹے کے جوان اور برسرِ روزگار ہوتے ہی ماں باپ زبردستی اس کی شادی کر دیتے ہیں... جو پہلے سے طے ہوتی ہے کسی کزن کے ساتھ...“

”آف کورس یہ ہوتا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ میرے ساتھ نہیں ہوا... تمہارا کیا تجربہ ہے؟“

”وہی جو تمہارا تھا... میں بھی تلاش کے سفر میں سرگرداں ہوں... امید ہر ایک سے وابستہ کر لیتی ہوں پھر مایوسی کے سوا کچھ نہیں ملتا... مگر میں مایوس نہیں ہوں۔“

”بڑی حیرانی کی بات ہے... وہاں تو روز شادی اور طلاق ہوتی ہے۔ لڑکیاں بچپن میں ہی باغی اور خودمختار ہو کے تجربات شروع کر دیتی ہیں۔ تمہاری عمر تو چوبیس سال ہے۔“

”معلوم نہیں تم کتنا یقین کرو گے۔ مجھے پروپوز کرنے والوں کی کبھی کمی نہیں رہی۔ لیکن میں نے عجلت میں اور جذبات کی رو میں بہہ کر فیصلہ نہیں کیا۔ میں نے سوچنے سمجھنے کے لیے وقت لیا تو مجھے ایک بھی اس قابل نہ لگا جس کے ساتھ میں اپنی ساری زندگی گزار لیتی۔ جو مخلص ہو... ظاہر و باطن ایک رکھتا ہو... شادی کو میری طرح لمبے سفر کی ذمے داری سمجھتا ہو... جیسے کہ ہم سے شادی کے وقت کہا ضرور جاتا ہے... ہم ہر حال میں ایک دوسرے کا ساتھ نبھائیں گے... جب تک موت ہمیں جدا نہ کر دے۔ عملاً تو شادی مذاق بن کے رہ گئی ہے۔“

”حیرت ہے کہ تم مغرب کی پروردہ لڑکی ایک روایتی مشرقی عورت کی طرح سوچتی ہو۔“

اس بار جواب اتنے طویل وقفے کے بعد آیا کہ شرافت فکرمند ہو گیا۔ اس نے کوئی ایسی بُرا لگنے والی بات تو نہیں کی تھی۔ پھر گفتگو کا سلسلہ منقطع کیوں ہو گیا؟ لنک ٹوٹ گیا یا سسٹم میں خرابی آ گئی؟ مگر اسی وقت جواب آ گیا۔ ”ڈاکٹر... اب تم نے پوچھا ہے تو میں بتا دیتی ہوں... تمہارا شک صحیح تھا۔ میں واقعی ایشیائی ہوں۔“

”گویا یہ تمہارا اصلی نام نہیں ہے؟“

”نہیں، میرا نام صوفیہ ہے۔ میری ماں انڈین تھی۔ باپ کا تعلق پاکستان سے تھا۔ میں برطانیہ میں پیدا ہوئی اور امریکا آ گئی۔“

”تمہارے نام سے پتا نہیں چلتا کہ تم مسلمان ہو یا کرسچین۔“

”کیا اس سے تمہیں فرق پڑتا ہے؟“

”نہیں، یہ بات نہیں۔“ شرافت نے جلدی سے کہا۔ ”دوستی اور محبت میں ملک، قوم یا مذہب کی دیوار کو حائل نہیں ہونا چاہیے... کیا خیال ہے؟“

شرافت نے کہا۔ ”میں تمہارا ہم خیال ہوں... تم کرتی کیا ہو؟“

”وہی جو تم کرتے ہو۔“

”یعنی تم بھی ڈاکٹر ہو؟“ شرافت سوچ میں پڑ گیا۔

”نہیں، میرا لیول تم سے کم ہے۔ میں نرس ہوں۔ دکھی انسانیت کی خدمت میں بھی کرتی ہوں۔“

”کون سے اسپتال میں ملازمت کرتی ہو؟“

”کسی اسپتال میں نہیں، میرا مطلب ہے ملازمت... کیونکہ میرا اپنا نرسنگ ہوم ہے۔ آج میں اپنی وال پر جو تصویریں پوسٹ کروں گی، ان سے تمہیں میری پرائیویٹ لائف کے بارے میں بہت سے سوالوں کا جواب مل جائے گا۔“

”مجھے اپنے ماں باپ کے بارے میں بتاؤ؟“

”میری ماں دس سال پہلے الگ ہو کے ایک انڈین ڈاکٹر کے ساتھ چلی گئی تھی۔ اس کا کلکتہ میں بہت بڑا اسپتال ہے لیکن میں نے آج تک جا کے نہیں دیکھا۔ اس کی تصویریں دیکھی ہیں۔ ماں سے میرا کوئی رابطہ نہیں... میرا باپ بہت محنتی اور وفادار تھا۔ وہ الیکٹریکل انجینئر تھا اور اتنا زیادہ دولت مند نہیں تھا۔ بے وفائی میری ماں نے کی۔ میرے بالغ ہونے تک باپ نے دوسری شادی نہیں کی۔ پھر میں نے اس کا گھر چھوڑ دیا تاکہ وہ دوسری شادی کر سکے۔ اس نے مجھے نرسنگ کے شعبے میں تعلیم دلوائی تھی اور یہ نرسنگ ہوم بھی قائم کر کے دیا۔ اب اس سے بھی میرا کوئی رابطہ نہیں۔ وہ کینیا چلا گیا ہے۔“

”یعنی تم اکیلی رہتی ہو... بالکل اکیلی؟“

”اس میں اتنا حیران ہونے والی کون سی بات ہے؟ آدمی پیدائش سے پہلے بھی اکیلا ہوتا ہے اور موت کے بعد بھی۔ زندگی تو بہت مختصر ہے۔“

شرافت نے کہا۔ ”تم اپنا وقت کیسے گزارتی ہو؟“

”میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہوتا۔ نرسنگ ہوم میں بہت کام ہے۔ اس کے لیے دن رات کی قید نہیں۔ تسکین اور خوشی کے علاوہ اس کام میں مجھے اچھی آمدنی ہے۔ اس کام کو میں بڑھانا چاہتی ہوں تاکہ کل میری زندگی آج کے مقابلے میں زیادہ باعزت اور پُرآسائش ہو۔ آج کے مقابلے میں میرے پاس زیادہ بڑا گھر ہو۔ اس سے اچھی کار ہو لیکن افسوس کہ میرا ساتھ دینے والا کوئی مخلص آدمی نہیں جس پر میں بھروسا کر سکوں۔“

شرافت کا دماغ دوبارہ اس راستے پر چل پڑا تھا جو اپنی موت سے پہلے راجا صاحب نے اسے دکھایا تھا اور وہ زندہ رہتے تو شاید اسے ”سنہری مواقع کی سرزمین“ امریکا پہنچا بھی دیتے۔ اب میں ہوں اور ماتم یک شہرِ آرزو... ریشم ابھی تھانوں میں ”زیرِ تفتیش“ ہے۔ اس کے بعد جیل کی ”مشقت“ کرے گی۔ وہ خود...

”ڈاکٹر شرافت! کیا تم لائن پر ہو؟“ سوال آیا۔

”ہاں، میں سوچ رہا تھا۔ کیا بتاؤں کیا سوچ رہا تھا۔ تم نہ جانے کیا مطلب نکالو گی میری بات کا۔ ابھی سے میں اپنے بارے میں کوئی دعوے کروں تو کیسے ثابت کروں کہ اس میں صداقت کے سوا کچھ نہیں؟“

”مجھے تمہارا لہجہ ہی تمہاری صداقت کا گواہ محسوس ہوتا ہے۔ کہو تمہارے دل میں کیا ہے؟“

”مجھے خیال آیا تھا کہ میں اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کر سکتا ہوں... مگر کیسے کروں؟“

”اٹ از سو سمپل ریئلی... مگر پہلے تمہارا یہاں آنا لازمی ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم مختلف ہو اور شاید ایک جیسا ظاہر و باطن رکھتے ہو۔ جو محسوس کرتے ہو اسے سچ کر سکتے ہو... اچھا اب میں چلتی ہوں... اتنا وقت میں نے کسی کے ساتھ چیٹ کرنے میں پہلے صرف نہیں کیا... لیکن میں نے واقعی انجوائے کیا... بائے... ہاں اس پر سنجیدگی سے عمل کرنے کا سوچنا... جو تم نے کہا تھا... شام کو وال پر میری فوٹوز دیکھنا جو صرف تمہارے لیے ہوں گی۔“

وہ اس وقت تک اپنی فیس بک کھولے مانیٹر کو گھورتا رہا جب تک صوفی نے خود آ کے اس کو یاد نہیں دلایا کہ اس کا ایک گھنٹا تو کب کا پورا ہو چکا ہے۔

شرافت نے جیب سے پانچ سو کا ایک نوٹ نکال کے اسے تھما دیا۔ ”کیا پہلے والا نوٹ ختم ہو گیا صوفی صاحب؟ کچھ حساب بھی رکھتے ہو کہ نہیں؟“

مرحوم راجا صاحب کی فیاضی کے طفیل شرافت اب پھکو نہیں رہا تھا۔ وہ باپ کے خزانے میں بھی نقب لگاتا تھا جس کا ابھی تک قبلہ بڑے حکیم صاحب کو پتا نہیں چلا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ آنے والے وقت میں اس کی زندگی بدل جائے گی۔ انقلاب خود اپنا راستہ ہموار کر رہا تھا۔ جمیل نے اسے جو پلان دیا تھا، مکمل تھا۔ وقت آ گیا تھا کہ خاندانی تاریخ کی جرنیلی سڑک چھوڑ کے وہ تابناک اور خواب ناک مستقبل کی

شاہراہ پر گامزن ہو جائے۔ پُرامن ہو وہ انقلاب کیسا... جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو... یہ بھی اپنے شاعرِ مشرق نے فرمایا تھا اور یہ بھی کہ شاہین بن الو کی دم ... ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں۔

وہ جمیل کے انتظار کا وقت کاٹنے کے لیے پرستان کی سیر میں مگن ہو گیا۔ آج وہ جمیل کو بہت کچھ بتانا چاہتا تھا جو بہت سنسنی خیز تھا۔ اسے اندازہ ہی نہ ہوا کہ چھاپا کب پڑا۔ اِدھر اُدھر کے ہر کیبن سے سارے مجرم رنگے ہاتھوں پکڑے گئے تھے۔ ایک پولیس مین نے پیچھے سے اس کی گردن دبوچ لی اور کوئی سوال کیے بغیر اسے مارنا شروع کر دیا۔

وہ بدحواس ہو کے اٹھا۔ ”آخر... بات کیا ہے صوفی... صوفی...“ وہ چلانے لگا۔

پولیس مین نے اسے کھینچ کے کیبن سے باہر کر دیا۔ ”بات بھی پتا چل جائے گی... اور تیری ماں کا یار صوفی بھی وہیں ملے گا تھانے میں۔“ شرافت پر تھپڑوں، مکوں اور گالیوں کی بوچھاڑ ہو گئی۔ وہ خود مار پیٹ سے بھاگنے والا آدمی تھا اور اس کے مقابلے پر وہ تھے جو سفاکی اور بربریت کے مظاہرے کا بہت تجربہ رکھتے تھے۔ پولیس وین تک جاتے جاتے شرافت کا ایک ہونٹ پھٹ گیا اور اس کی ناک سے خون بہنے لگا۔ تھانے کی نفری نے اسے لاش کی طرح اٹھا کے گاڑی میں پھینکا۔ یہاں دوسرے نو گرفتار لڑکے اس سے زیادہ شور کر رہے تھے اور دھمکیاں دے رہے تھے۔ پولیس نے دو لڑکیوں کو موبائل میں آگے بٹھا دیا تھا۔ انہیں مارا پیٹا تو نہیں گیا تھا مگر ڈرایا دھمکایا بہت گیا تھا۔ گالیاں ان کے حصے میں بھی وہی آئی تھیں۔ وہ رو رہی تھیں، کانپ رہی تھیں اور ہاتھ جوڑ رہی تھیں۔

جب موبائل روانہ ہوئی تو اس کے گرد تماش بینوں کا مجمع تھا جو اس تمام کارروائی پر خوش تھا۔ اچھا ہوا فحاشی کے اڈے پر چھاپا پڑا۔ صوفی بڑی بدمعاشی دکھاتا تھا۔ سارے لوفر بدکردار اکٹھے ہو جاتے تھے۔ کچھ لوگ اسے پولیس کا ڈراما قرار دے رہے تھے کہ سب پبلک کو دکھانے کے لیے ہے۔ یہ سارے بڑے گھروں کی بگڑی ہوئی اولادیں ہیں۔ ماں باپ پیسے دیں گے اور انہیں چھڑا کے لے جائیں گے۔ تھانے میں فون آنے لگیں گے کہ یہ کس کو پکڑ لائے ہو پاگل کے بچے... صوفی سیٹ کر لے گا کل تک دیکھنا۔

شرافت نے کچھ دیر بعد خود کو ایک بھیڑ کے ساتھ حوالات کی سلاخوں کے پیچھے پایا۔ پولیس نے بند کرنے سے پہلے سب کے موبائل فون، پرس اور گھڑیاں رکھوالی تھیں۔ وہ اب ایک ساتھ شور کر رہے تھے کہ ان کو فون کرنے دیا جائے۔ ان میں سے کچھ ڈرے ہوئے تھے۔ کچھ واقعی بے خوف تھے اور کچھ اپنے آپ کو بے خوف ظاہر کر رہے تھے۔ پولیس والوں کو بتا رہے تھے کہ انہیں گرفتار کر کے وہ سب مشکل میں پڑ جائیں گے۔ انہوں نے کوئی غیر قانونی کام نہیں کیا اور ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں۔

پولیس اسٹیشن میں کوئی ان کی نہیں سن رہا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ یہ لڑکے پہلی بار تھانے آئے ہیں۔ انہیں پتا ہی نہیں کہ تھانے میں کیا ہو سکتا ہے اور کیا نہیں۔ وہ معمول کے مطابق اپنے کام کر رہے تھے۔ حوالات میں پہلے سے بند مجرموں کی حالت خراب تھی۔ ان میں سے ایک دیوار کے ساتھ یوں آنکھیں بند کیے لیٹا تھا جیسے مر چکا ہو۔ اس کے جسم پر مار اور تشدد سے نیل پڑے ہوئے تھے اور سوجن تھی۔ وہ کبھی کبھی بڑی دردناک آواز میں کراہتا تھا۔ حوالات کے تیرہ فٹ بارہ فٹ کمرے میں گھٹن تھی اور پیشاب کی بو تھی۔ وہ سب وہیں ایک کونے کے سوراخ کو اس مقصد کے لیے استعمال کرتے تھے اور وہیں ایک کھلا مٹکا رکھا تھا اور ایک مٹی کا پیالہ جو پانی پینے کے کام آتا تھا۔ آدھا گھنٹا سلاخوں کے باہر کھڑے سنتری سے گالیاں کھانے کے بعد وہ سب مایوس ہو کے دیوار کے ساتھ ساتھ فرش پر بیٹھ گئے۔

کسی نے بھی قیدیوں سے کھانے پینے کی بات تک کرنا گوارا نہ کیا۔ انہیں جو کھانے کو ملا وہ صرف گالیاں تھیں۔ رات تک وہ سب پریشان اور خوف زدہ ہو گئے تھے اور سب کو گھر والوں کا خیال پریشان کرنے لگا تھا۔ شرافت کی پریشانی دہری تھی۔ اسے معلوم تھا کہ آج ہی امیر النسا نے اس کی ہدایات کے مطابق یہ اعلان کیا ہوگا کہ وہ چھوٹے حکیم صاحب سے شادی نہیں کرے گی۔ اس سنسنی خیز اعلان کے بعد شرافت کا غائب ہو جانا طے شدہ پروگرام میں شامل نہیں تھا۔ معلوم نہیں اس کے پریشان حال ماں باپ اس کا کیا مطلب نکالیں گے۔ سمجھنے کو وہ سمجھ سکتے تھے کہ دل شکستہ شرافت نے مسترد کیے جانے پر خودکشی نہ کر لی ہو۔ ایسا فرض کر لیا گیا تھا کہ وہ امیر النسا کو مجنوں اور فرہاد کی طرح چاہتا ہے اور پھر جب ان پر حقیقت آشکار ہو گی؟

رات کے وقت ایک سنتری کاغذ اور بال پوائنٹ لے کر آیا۔ ”اس پر اپنے اپنے نام اور گھر کے فون نمبر لکھ دو۔ خبردار جو اور کچھ لکھا۔“

اپنی باری آنے پر شرافت نے بھی قبلہ بڑے حکیم صاحب کا نمبر لکھ دیا۔ اپنے قابلِ فخر سپوت کے پرستان کی

سیر کرتے ہوئے پکڑے جانے پر ان کے دل پر کیا گزر رہی گی، اس کا وہ صرف اندازہ کر سکتا تھا۔ ایک ڈیڑھ گھنٹا اور گزر گیا۔ پھر تھانے دار نے ان میں سے ایک کو طلب کیا۔ وہ لوٹ کے نہیں آیا۔ اس کے بعد جانے والے دو لڑکے بھی نکل گئے مگر پھر جو تین لڑکے لے جائے گئے اُن کے اذیت سے چیخنے کی دل خراش آوازیں سن کے باقی کے رنگ زرد پڑ گئے۔ جب ان تینوں کو لایا گیا تو وہ اپنے پیروں پر کھڑے رہنے کے قابل نہیں تھے۔ ان کے حلق سے نکلنے والی کراہوں سے لگتا تھا کہ وہ شاید مرنے والے ہیں اور جب انہیں حوالات میں پھینکا گیا تو وہ مُردوں کی طرح بے سدھ پڑے رہے۔ شرافت کی حالت بھی غیر تھی مگر دو کا پیشاب خطا ہو گیا تھا اور دو آنسوؤں سے روتے ہوئے خدا رسول کے واسطے دے کر رحم کی بھیک مانگ رہے تھے۔

یہ لاوارث قسم کے لڑکے تھے جن کو دوسروں کے لیے نمونہ عبرت بنایا گیا تھا تا کہ ان کے دلوں پر پولیس کی دہشت بیٹھ جائے۔ اس کے بعد طلب کیے جانے والے بھی یوں گئے جیسے انہیں پھانسی دینے لے جایا جا رہا ہو۔ یہ سلسلہ رات بھر چلتا رہا۔ جانے والوں کے گھر والے آتے تھے اور ہاتھ جوڑ کے منہ مانگی رقم ادا کر دیتے تھے۔ ان کا پہلا مقصد اپنے لاڈلے کو جسمانی تشدد کے عذاب سے بچانا ہوتا تھا۔ دوسرا خود کو بدنامی سے بچانا۔ ایک ایک کر کے گرفتار ہونے والے اپنی رہائی خریدتے گئے۔ حوالات خالی ہوتی گئی۔ اس میں صرف وہ رہ گئے جو پہلے سے بیٹھے اور زیرِ تفتیش تھے۔ شرافت آدھی رات کے بعد ان پر کیے جانے والے تشدد کو سنتا رہا۔ وہ بُری طرح چیخ رہے تھے۔ فریاد کر رہے تھے۔ ایک حوالاتی نے شرافت کا خون مزید خشک کیا۔ وہ بتاتا رہا کہ ڈرائنگ روم میں تفتیش کیسے کی جاتی ہے۔ مرچوں کا استعمال کیسے ہوتا ہے۔ چیرا کیسے لگایا جاتا ہے۔ چھترول کیسے ہوتی ہے۔ جسم کے کس نازک حصے کو بجلی کے جھٹکے کیسے دیے جاتے ہیں۔ ناخن کیسے کھینچے جاتے ہیں۔

بالآخر دہشت سے نیم جاں شرافت کی باری آگئی۔ اس وقت صبح کے ساڑھے تین بجے تھے لیکن اسے نہ بھوک کا احساس تھا نہ پیاس کا۔ اس کی ٹانگیں تھانے دار کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے کمزوری سے کانپ رہی تھیں۔ حسب توقع شرافت کا استقبال اس کی شلوار اتار کے اور فرش پر لٹا کے تھوڑی سی چھترول سے کیا گیا۔ اسے اندازہ نہ تھا کہ ساتھ والے کمرے میں قبلہ بڑے حکیم صاحب اور اس کی ماں ہر آواز سن رہے ہیں۔ وہ ذبح کیے جانے والے بکرے کی طرح چلاتا رہا مگر کام کرنے والے اپنا کام کرتے رہے۔

جب اسے کھڑا کیا گیا تو وہ اپنی ہی غلاظت میں لتھڑا ہوا تھا۔ ایک سفاک صورت تھانے والے نے مونچھوں پر ہاتھ پھیر کے کہا۔ ”کیوں بھئی چھوٹے حکیم صاحب... ہمارا طریقۂ علاج کیسا لگا... ریشم کو جانتے ہو؟“

یہ سوال اتنا غیر متوقع تھا کہ پہلے وہ سمجھ ہی نہیں سکا۔ اس پر لرزہ طاری تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔ ایسے ذلت آمیز تشدد کی اذیت اپنی جگہ تھی۔ اس کے سامنے ننگا کھڑا رہنے کا عذاب اپنی جگہ... کمر پر پڑنے والے بید کی ضرب سے وہ بلبلایا۔ ”سنا نہیں... میں نے کیا پوچھا تھا؟“ تھانے دار نے اپنا سوال دہرایا۔

”جی... جی... جانتا ہوں۔“ شرافت چلایا۔ ”اس کی راجا صاحب سے شادی ہونے والی تھی۔“

”تو بھی شریک تھا اس قتل کی سازش میں؟“

”قسم خدا کی تھانے دار صاحب... میں تو ان کا علاج کرنے جاتا تھا۔“ شرافت روتے روتے بولا۔

”راجا کی ایک بیٹی نے کہا تھا کہ چھوٹا حکیم بھی ریشم سے ملا ہوا تھا۔ کون سی زہریلی جڑی بوٹی لا کے دی تھی اسے باپ کے دواخانے سے؟“

”کوئی نہیں تھانے دار صاحب... خدا کی قسم...“

تھانے دار نے ایک ماتحت کو دیکھا۔ ”کل اس کا باپ بتائے گا۔“

شرافت کا اس خیال سے خون خشک ہو گیا کہ اس قتل کے جھوٹے الزام کی تفتیش قبلہ بڑے حکیم صاحب سے بھی ہو گی... اسی طرح جیسے خود شرافت سے کی گئی تھی۔ وہ ہاتھ جوڑنے لگا۔ ”خدا کے لیے... رسول کے لیے... وہ ضعیف ہیں... انہیں کچھ پتا نہیں... آپ خود ریشم سے پوچھ لیں... وہ سب جانتی ہے میرے بارے میں۔“

تھانے دار کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر بولا۔ ”اسے ملوا دو ریشم سے۔“

اسی وقت دوسری طرف کچھ شور سنائی دیا۔ شرافت کو یوں لگا جیسے ابھی ابھی اس نے قبلہ بڑے حکیم صاحب کی آواز سنی ہے۔ دو ہاتھوں نے اسے دروازے کی طرف دھکیلا۔ شرافت نے اپنی شلوار اٹھالی۔ اسے شلوار پہننے کی اجازت دے دی گئی۔

”یہ کیا شور شرابا ہے؟“ تھانے دار نے کسی سے سوال کیا۔

”وہ جی... ادھر ایک بڑھی بیٹھی تھی۔ اس کو کچھ ہو

گیا تھا۔ اسپتال لے جا رہے ہیں۔'' کسی نے کہا۔

لرزتے کانپتے غلیظ حالت والے شرافت کو ایک پولیس مین دھکیلتا ہوا تھانے کے عقبی حصے میں لے گیا۔ اس نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور شرافت کو اندر دھکا دے دیا۔ یہ ایک چھوٹا سا اسٹور ٹائپ کمرا تھا جس میں کوئی فرش پر چادر اوڑھے پڑا تھا۔ آہٹ پر اس نے سر سے چادر ہٹائی تو شرافت نے اپنے سامنے ریشم کو دیکھا۔

وہ ایک دم اٹھ کے بیٹھ گئی۔ ''چھوٹے حکیم صاحب؟''

شرافت اس کے پاس بیٹھ کے رونے لگا۔ ''یہ لوگ کہتے ہیں کہ راجا صاحب کو تم نے جو زہر دیا تھا... وہ میں نے لاکر دیا تھا۔''

ریشم بڑی محبت سے اس کے آنسو پونچھتی رہی۔ ''یہ سب اس حرامزادی کا کیا دھرا ہے... وہ امریکا سے اسی لیے آئی تھی۔ اس کی اپنے باپ سے بہت تلخ کلامی ہوئی۔ وہ کہتی تھی کہ میں تمہیں یہ شادی نہیں کرنے دوں گی۔ رات کو کسی وقت اس نے باپ کو گلا گھونٹ کے مار ڈالا اور پولیس کو بلا لیا... پولیس نے مجھے پکڑ لیا۔ تمہارا نام بھی اسی نے لیا ہوگا۔''

''تم جانتی ہو قتل میں نے نہیں کیا۔ یہ کیوں مجھے ملوث کرنا چاہتے ہیں... وہ کہتے ہیں کہ میرا نام تم نے لیا تھا۔''

''وہ جھوٹ بولتے ہیں مگر ان کا ہر جھوٹ سچ ہے۔'' ریشم کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ''انہوں نے مجھ سے اعتراف کرالیا ہے۔''

شرافت دکھی ہو گیا۔ ''ریشم... کیا انہوں نے تمہارے ساتھ بھی... بُرا سلوک کیا ہے؟''

''بُرا سلوک!'' وہ تلخی سے بولی۔ ''دیکھو گے کہ میرے ساتھ انہوں نے کیا سلوک کیا ہے؟ دیکھ سکو گے... کوئی اور پوچھتا تو میں اپنے سارے کپڑے اتار دیتی اور کہتی کہ لو دیکھو... مجھے کوئی شرم نہ آتی... جب میں ایک عورت تھی تو شرم کا مطلب سمجھتی تھی... اور تم اچھے آدمی ہو... مجھے نہیں معلوم کہ یہاں کب تک رہنا ہے۔ اس کے بعد کہاں جانا ہے اور کیا کیا جھیلنا ہے... لیکن تم جتنی جلدی ہو یہاں سے نکل جاؤ... اس شہر سے ہی نہیں، اس ملک سے بھی نکل جاؤ۔ راجا صاحب کہتے تھے کہ باہر کی پولیس کسی مجرم کو ایک تھپڑ بھی مار دے تو اسے خلافِ قانون سمجھا جاتا ہے۔ قانون سب کے لیے برابر ہوتا ہے اور سب کی عزتِ نفس محفوظ ہے۔ ایسے ہی کسی ملک چلے جاؤ۔'' وہ بات کرتے کرتے منہ چھپا کے زار و قطار رونے لگی۔

شرافت باہر نکل آیا۔ کچھ دیر کے لیے وہ اپنے ساتھ ہونے والے ظلم و زیادتی کو بھول گیا۔ اس کے دل میں نفرت اور غصے کا الاؤ سا بھڑکا اور اس کے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ اسے کہیں سے ایک کلاشنکوف مل جائے تو وہ یہاں موجود ایک ایک شخص کو لاش بنا کے نکل جائے۔ باہر موجود سنتری اسے پھر تھانے دار کے کمرے میں لے گیا۔ وہاں تھانے دار کے بجائے انٹرنیٹ کیفے کے صوفی کو ایک کرسی پر موجود پا کے وہ بھونچکا رہ گیا۔

شرافت اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ''یہ سب تمہاری کارستانی تھی؟''

صوفی نے غصے میں سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل دیا۔ ''بکواس مت کرو۔ تمہاری وجہ سے میرا اتنا نقصان ہوا۔ آج تک میری جگہ پر چھاپا نہیں پڑا تھا۔ میری بے عزتی ہوئی۔ نقصان ہوا وہ الگ۔''

شرافت نے بگڑ کے کہا۔ ''تم پولیس کو بھتا دیتے تھے، بدکاری کا اڈا چلانے کے لیے... مگر تم جانتے ہو کہ میں وہاں اس کام کے لیے نہیں آتا تھا۔''

''مجھے سب معلوم ہے کون کس کام کے لیے آتا ہے... اور تم کتنے شریف ہو شرافت حسین... پولیس تمہاری وجہ سے وہاں آئی۔''

''میری وجہ سے؟'' شرافت بگڑ گیا۔ ''تم الٹا مجھے قصوروار ٹھہراتے ہو... خود معصوم بنتے ہو۔''

''میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔'' صوفی چلّا کے بولا۔

''قتل میں نے بھی کسی کو نہیں کیا۔'' شرافت نے اتنی ہی اونچی آواز میں کہا۔

''تم پر الزام تو ہے اور پولیس صرف تمہیں پکڑنے آئی تھی۔ باقی سب خوامخواہ پکڑے گئے۔ کسی نے پولیس کو مخبری کی تھی کہ تم وہاں ہو... وہ تمہارے گھر نہیں گئے... سیدھے میرے اڈے پر آگئے... کون... تھا وہ؟'' صوفی نے ایک گالی دی۔

''مجھے کیا معلوم... یہ پولیس کا جھوٹ بھی ہو سکتا ہے۔''

''اس نے پولیس کو سب بتایا کہ تم راجا صاحب کا علاج کرتے تھے۔ ان کے نکاح میں شریک ہونے بھی گئے تھے اور وہیں تمہیں ان کی بیٹی ملی تھی۔ سوچو کون ہو سکتا ہے وہ... ایسا کون ہے تمہارا دوست نما دشمن... وہی شاید جسے تم جمیل کہتے ہو۔''

شرافت دم بخود بیٹھا رہا۔ ''یہ... ریشم نے نہیں بتایا... الزام تو اس پر ہے۔''

''الزام تم پر بھی آجائے گا اگر تم نے اپنی جان نہ چھڑائی۔ ریشم سے کسی کو کچھ ملنے کی امید نہیں ہے۔ بالآخر وہ بھی چھوٹ جائے گی۔ اپنے باپ سے کہو تین لاکھ ادا کر کے تمہیں لے جائے... سب نے اپنی اپنی آزادی کی قیمت ادا کی ہے۔''

''مگر تین لاکھ...''

صوفی اٹھ کھڑا ہوا۔ ''قبلہ بڑے حکیم صاحب کو پیسے بہت پیارے ہیں مگر بیٹے سے زیادہ نہیں... وہ دے گا... ابھی تو وہ اسپتال گیا ہے... لیکن آجائے گا تھوڑی دیر میں۔''

''ابا اسپتال گئے ہیں، کیوں؟''

صوفی جاتے جاتے رک گیا۔ ''تمہاری ماں کی طبیعت خراب ہو گئی تھی... شاید دل کا دورہ پڑا تھا۔ اسے اسپتال لے گیا ہے۔''

☆☆☆

مطب ایک ہفتے سے مقفل پڑا تھا۔ پرانے مریض یا نئے ضرورت مند آتے تھے اور مایوس لوٹ جاتے تھے۔ اردگرد کے لوگ بھی نہیں جانتے تھے کہ مطب کیوں بند ہے اور قبلہ بڑے حکیم صاحب یا چھوٹے حکیم صاحب کہاں غائب ہو گئے ہیں۔ انہی میں ملک صاحب بھی تھے۔ ان کے ڈرائیور نے ایک دن کھوج لگا کے یہ معلومات حاصل کر لی تھیں کہ تین چار دن پہلے تو باپ بیٹا یہیں تھے۔ قبلہ بڑے حکیم صاحب کی بیوی فوت ہو گئی تھی۔ اسے دل کا دورہ پڑا تھا۔ حکیم صاحب اسے کسی اسپتال لے گئے تھے لیکن وہ جانبر نہ ہو سکی۔ اس کے سوئم کے بعد سے یہاں تالا پڑا ہوا ہے۔

شاہی خاندانی حکیموں کے اس قدیم مطبِ خاص سے بہت دور شہر لاہور کے دوسرے کنارے پر (جہاں ایک زمانے میں چار نمبر کی ڈبل ڈیکر بس کا آخری اسٹاپ تھا) ذہنی امراض کے اسپتال میں شرافت سر جھکائے ملاقاتیوں کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ ملاقات کی اجازت دینے والا ڈاکٹر ابھی راؤنڈ پر تھا۔ مریض کی آج کی رپورٹ دیکھنے کے بعد ہی وہ اجازت دے سکتا تھا۔ ڈاکٹر اندر آ کے اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ایک ماتحت نے اس کے سامنے آٹھ دس فائلیں رکھ دیں۔

''کس سے ملنا ہے تمہیں؟'' ڈاکٹر نے سگریٹ جلا کے بینچ پر بیٹھے شرافت سے پوچھا۔

''میرے والد ہیں یہاں... صداقت حسین۔''

ڈاکٹر نے سر ہلایا۔ ''اچھا اچھا... وہ قبلہ بڑے حکیم صاحب... ابھی وہ نارمل ہیں... جاؤ مل لو۔''

شرافت اندر چلا گیا۔ بہت سے مریض ایک اجڑے ہوئے باغ میں اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ یہ ایسے مریض تھے جو کبھی کبھار دورے کی حالت میں بھی خطرناک نہیں ہوتے تھے۔ وہ پاگلوں جیسی باتیں اور حرکتیں ضرور کرتے تھے چنانچہ پاگل تھے... شرافت نے اپنے باپ کو ایک دیوار کے ساتھ فرشِ خاک پر دونوں گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے خلا میں نظریں جمائے دیکھا۔ وہ ان کے پاس جا کے بیٹھ گیا۔ قبلہ بڑے حکیم صاحب کے کپڑے میلے تھے۔ ان کے سر پر ٹوپی نہیں تھی چنانچہ درمیان سے بالکل صاف سر پر بھی گرد اور میل نظر آ رہا تھا۔ ان کی داڑھی کسی پرندے کے گھونسلے جیسی ہو رہی تھی۔ کمزور وہ پہلے سے تھے۔ اب ایک ڈھانچا نظر آ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں پر عینک بھی نہیں تھی اور وہ گہرے حلقوں میں ڈوب گئی تھیں۔ شرافت کو دیکھ کر بھی ان کے چہرے پر ویرانی رہی۔

شرافت نے آنسو روک کر نرمی سے پوچھا۔ ''طبیعت کیسی ہے ابا جی؟ کچھ کھائیں گے آپ تو لاؤں؟''

قبلہ بڑے حکیم صاحب نے اس کے سوال کے جواب میں کہا۔ ''کیا تجھے معلوم ہے... تجوری توڑی نہیں گئی تھی... دو چابیاں لگتی تھیں اس کے قفل میں... اس کے بعد اندر کے قفل کے عدد ملانے ضروری تھے۔ یہ کام تُو نے نہیں کیا تو پھر کس نے کیا شرافت؟''

''مجھے کیا معلوم ابا جی۔''

وہ فکرمند ہو کے بولے۔ ''ہاں کسے معلوم ہوگا۔ چابیاں تو ہمارے پاس تھیں۔ پھر تجوری کو چابیاں لگا کے کس نے کھول لیا تھا اور اسے اعداد کا کیسے پتا چلا... کیا یہ حیرانی کی بات نہیں ہے؟''

''اب اس کا ذکر چھوڑیں...'' شرافت نے اس قفل ساز کو یاد کیا جو جمیل عرف شاہد کے گھر سے نکلا تھا۔

''لو... جب تک یہ معما حل نہیں ہوتا... ہم اس کے بارے میں سوچنا بھی چھوڑ دیں... پتا ہے... جب ہمیں ضرورت پڑی تو اس میں تین لاکھ تو کیا تین روپے بھی نہیں تھے... تجوری بالکل خالی تھی اور بند بھی تھی... کیا یہ کام جنات کر سکتے ہیں؟''

اس جن کا نام شاہد تھا مگر اسے وہ جمیل سمجھتا تھا۔ شرافت نے دکھ سے سوچا۔ چابی اس کی مٹھی میں تھی۔ شرافت کو یاد تھا۔ ''اس میں کتنی رقم تھی ابا جی...''

''یہ ہم کیوں بتائیں کہ اس میں دس لاکھ سے زیادہ تھے... تمہاری تو کوئی بات نہیں... مگر اور کسی نے سن لیا تو...؟'' وہ رازدارانہ لہجے میں اِدھر اُدھر دیکھ کے بولے۔

"آپ کو تین لاکھ روپے کی ضرورت کیوں پڑی تھی؟"

وہ سوچ کے بولے۔ "کسی نے مانگے تھے ہم سے... کوئی ضرورت مند تھا... کچھ یاد نہیں۔"

شرافت کا دل خون کے آنسو رونے لگا۔ "اماں کو کیا ہوا تھا؟"

وہ ہنسے۔ "انہیں تو کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ بس ایسے ہی وہ کبھی کبھی ہم سے روٹھ جاتی تھیں۔ میکے چلی جاتی تھیں۔ پھر ہم انہیں منا کے لے آتے تھے۔ لے آئیں گے کسی روز جا کے۔"

"تجوری میں تین روپے بھی نہیں تھے۔ پھر تین لاکھ کا بندوبست آپ نے کہاں سے کیا تھا؟"

"چھوٹے! اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ ایک ہمارے پرانے کرم فرما ہیں شیخ عبدالرشید صاحب... انہوں نے کہا کہ قبلہ بڑے حکیم صاحب... اتنی چھوٹی رقم کے لیے آپ کیوں متفکر ہوتے ہیں... ہمیں خدمت کا موقع دیں۔"

"اور اس کے بدلے میں آپ سے کیا مانگا تھا؟"

"انہوں نے کہا کہ بس ایک رسید پر دستخط کر دیں... ہم نے کر دیے۔"

"آپ نے اس خاندانی جگہ اور مطب کی فروخت کی دستاویزات پر دستخط کر دیے تھے ابا جی... آپ کو معلوم ہے اس جگہ کی ایک کمرشل ویلیو تھی۔ اس کی قیمت تیس لاکھ سے اوپر تھی۔"

قبلہ بڑے حکیم صاحب ہنسنے لگے۔ "میاں گھاس کھا گئے ہو... پرانی چیزوں کی بھی کوئی اتنی قیمت دیتا ہے۔ اور شیخ عبدالرشید صاحب نے ہم سے کہا کہ آپ کو یہاں رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ ان کے اصرار پر ہم اس محل میں آگئے... تم دیکھ رہے ہو نا... یہ شالیمار باغ جتنا باغ... اور یہ خادم اور کنیزیں۔" انہوں نے چاروں طرف دیکھا اور پھر بہ آوازِ بلند کہا۔ "ارے کوئی ہے؟ ہمارا حقہ تازہ کر کے لاؤ۔"

شرافت کو ان کے پاس مزید ٹھہرنا لاحاصل لگا۔ انہوں نے دیوانگی میں اپنا ایک جہاں سب سے الگ بسا لیا تھا... ہوش اور شعور کی دنیا سے انہوں نے اپنی مرضی کے مطابق کچھ لے لیا تھا تو بہت کچھ چھوڑ دیا تھا۔ ہر یاد جو باعثِ آزار تھی، حافظے سے محو کر دی تھی اور جو یاد رہا، اس کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیا تھا۔ مثلاً انہیں شرافت یاد تھا۔ یہ انہوں نے بھول جانا بہتر سمجھا کہ وہ اس سے تھانے میں کیوں ملے تھے... بیوی کی موت ان کے حافظے سے غائب ہو گئی تھی مگر وہ وقت یاد تھا جب بیوی روٹھ کے میکے چلی جاتی تھی۔ یہ سب ایسا تھا جیسے زندگی کے ورق کی تحریر کو انہوں نے جہاں سے چاہا مٹا دیا کیونکہ وہ تلخ حقیقت تھی اور جو چاہا چھوڑ دیا کیونکہ وہ کوئی حسین یاد تھی۔ ڈاکٹر نے اس کے لیے کوئی طبی اصطلاح استعمال کی تھی اور شرافت کو بتایا تھا کہ اپنی بقیہ زندگی وہ صرف دل خوش رکھ کے گزاریں گے۔ جو بہرحال مختصر تھی۔ ان کی شفایابی ممکن نہ تھی کیونکہ وہ خود ایسا نہیں چاہتے تھے۔

آج جمعرات تھی۔ وہ شام کو قبرستان گیا۔ ماں کی قبر پر پھول ڈال کے اور اگربتیاں سلگا کے فاتحہ پڑھنے کے بعد وہ دکھ سے زیادہ احساسِ جرم کا بار لیے لوٹ آیا۔ پھر وہ اسپتال گیا جہاں نفسیاتی مریضوں کے وارڈ میں ریشم کے جسمانی دکھوں کا علاج کیا جا رہا تھا۔ ایک ڈاکٹر نے اسے بتایا تھا کہ بدترین جسمانی اور جنسی تشدد کے زخم تو مندمل ہو جائیں گے لیکن ریشم شاید واپس ایک نارمل زندگی کی طرف لوٹ کے نہ جا سکے۔ یہ ہو سکتا تھا اگر اسے ایک محفوظ، آرام دہ اور باعزت زندگی میسر ہو۔ لیکن یہ سب ریشم کے نصیب میں کہاں تھا۔ اس کا تو دنیا میں کوئی بھی نہیں رہا تھا، دشمنوں کے سوا۔ راجا صاحب کو عالمِ فانی سے حیاتِ جاودانی کی جانب روانہ کر دیا گیا تھا۔ ان کے وارثوں نے حقِ وراثت کا کیس فائل کیا تھا اور اپنی دنیا میں لوٹ گئے تھے۔ وہ ریشم یا چھوٹے حکیم صاحب سب کو بھول چکے تھے۔ انہیں صرف یہ یاد تھا کہ قانونی معاملات سے نمٹنے کے بعد باہر ان کے اکاؤنٹ میں کتنی رقم منتقل ہو گی۔

ملک صاحب میں اتنی مروت تھی کہ انہوں نے اپنی کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر میں رہائش کے لیے شرافت کو جگہ فراہم کر دی تھی۔ ان کے کہنے پر شرافت نے ملک صاحب کے دوست راجا صاحب کا رازداری سے علاج کیا تھا اور پھر اس جرم کی سزا ابھی بھگتی تھی۔ شرافت کو طلب کرنے پر چائے کھانا سب مل جاتا تھا۔ دن میں وہ شہر کی سڑکوں پر سرگرداں گزرتے لوگوں کو دیکھتا رہتا تھا کہ کہیں اسے اپنا دوست جمیل نظر آجائے جو درحقیقت شاہد تھا۔ ظاہر ہے اس نے جو بھی اپنے بارے میں بتایا تھا، محض جھوٹ تھا۔ عقل سے پیدل اور دنیاوی سمجھ بوجھ سے عاری چھوٹے حکیم صاحب نے دوستی کے چکر میں اسے اپنا ہر بھید دے دیا تھا اور شرافت نے اعتماد کے دھوکے میں اس کی ہر بات پر آمنّا وصدقنا کہا تھا۔

وہ ذرا بھی سمجھ بوجھ کا مظاہرہ کرتا تو آج کم سے کم ایک گھر اس کا ہوتا جہاں اسے عزت بھی ملتی اور محبت بھی۔ اس کے کہنے پر شرافت نے امیر النسا کو ایک ایسے کام پر آمادہ کیا جو وہ ہرگز کرنا نہیں چاہتی تھی۔ ایک تو وہ پرانے وقتوں کی لڑکی

تھی جو شرافت کو مجازی خدا کا درجہ دیتی تھی اور اس کی کسی بات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کی قائل ہی نہ تھی۔ پھر شرافت نے اس کی آنکھوں پر پڑے محبت کے پردے پر دوسرا پردہ مستقبل کے فلمی خوابوں کا ڈال دیا تھا۔ اس نے نتائج کی پروا کیے بغیر وہ سب کہہ دیا جو شرافت نے کہا تھا۔

امیر النسا کا یہ اعلان کہ وہ ہرگز اس فراڈ جاہل اور احمق چھوٹے حکیم صاحب سے شادی نہیں کرے گی، بے وقوفی میں آنکھیں بند کر کے پھینکا گیا دستی بم کا دھماکا ثابت ہوا۔ پہلے اس کے ماں باپ کو یقین نہ آیا اور جب مجبوراً انہوں نے اس کا ذکر انتہائی رنج اور دکھ کے ساتھ قبلہ بڑے حکیم صاحب کے گھر میں کیا تو رشتوں کی عمارت صرف ایک ملبا رہ گئی۔ شرافت کی ماں نے خوبصورت جوان ہونہار، لاکھوں میں ایک بیٹے کی ماں بن کر اپنی بہن کو اور ان کی آوارہ، بدچلن اور بے حیا بیٹی کو ایسی کھری کھری سنائیں کہ منگنی تو کیا آپس کا تعلق بھی ختم ہو گیا اور وہ بہنیں نہیں ایک دوسرے کی دشمن بن گئیں۔

اس وقت جمیل نے اپنے دوست سے کہا تھا کہ... "دیکھا ہمارا نسخہ چھوٹے حکیم صاحب! آپ کو امیر النسا سے شفا ہو گئی... جیسے یہ عرق النسا جیسی کوئی بیماری تھی۔" تو درحقیقت اس نے ان دونوں کی زندگی میں زہر گھول دیا تھا۔ دکھ اٹھانا اور پچھتانا امیر النسا کی تقدیر ہو گیا تھا۔ اس نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری تھی۔ وہ کیسے بتاتی کہ اس نے یہ شرافت کے کہنے پر اس کی محبت میں کیا تھا اور کون اس پر یقین کرتا؟ نہ وہ شرافت سے پوچھ سکتی تھی کہ آخر تم نے زہر کا یہ پیالہ مجھے کیوں دیا تھا۔ اپنی زندگی میں تو تم زہر گھول ہی چکے تھے۔

بالآخر شرافت ایک دن بسنت روڈ کے اس گھر کی سیڑھیاں چڑھ گیا جہاں سے اس کی خانہ خرابی کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ دروازہ خود اس عورت نے کھولا جسے جمیل نے خالہ کہہ کے متعارف کرایا تھا۔ حسبِ توقع وہ اسے اجنبی اور زہریلی نظر سے گھور کے بولی۔ "کیا بات ہے... کس سے ملنا ہے؟"

"دیکھیے... مجھے جمیل کے بارے میں پوچھنا تھا۔ جس کا اصل نام شاہد ہے۔"

"میں نہ کسی جمیل کو جانتی ہوں اور نہ شاہد کو۔" وہ دروازہ بند کرنے لگی۔

شرافت نے اپنا پاؤں بیچ میں اڑا دیا۔ "دیکھو، اس دغاباز انسان نے مجھے اور میرے گھر کو تباہ کر دیا ہے۔"

وہ برہمی سے بولی۔ "یہ کیا بدمعاشی ہے؟ جب کہہ دیا کہ میں اسے نہیں جانتی۔"

شرافت نے عاجزی سے کہا۔ "یہ جھوٹ نہیں چلے گا۔ تم اچھی طرح جانتی ہو اسے۔"

وہ تڑخ کے بولی۔ "پیر ہٹاؤ ورنہ میں شور مچا کے محلے والوں کو بلاتی ہوں۔"

"ضرور شور مچاؤ... میں بھی محلے والوں کو بتا دوں گا کہ تمہاری اصلیت کیا ہے... تم اور تمہاری بیٹیاں..."

اچانک اس عورت نے دروازہ کھول کے شرافت کو دھکا دیا۔ شرافت اس حملے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر پیچھے سیڑھیاں تھیں۔ وہ پیچھے کی طرف گرا اور لڑھکتا ہوا آخری زینے تک گیا۔ چوٹیں اس کے جسم کے ہر حصے پر لگی تھیں مگر سر کی چوٹ نے اسے بے سدھ کر دیا۔ وہ فٹ پاتھ پر کتنی دیر پڑا رہا۔ اسے کوئی اندازہ نہ تھا۔ ہوش آنے پر اس نے اپنے گرد لوگوں کو دیکھا جو اس سے پوچھ رہے تھے کہ وہ کون ہے... اوپر سے خالہ کے چلّانے کی آواز آ رہی تھی۔ "یہ بدمعاش زبردستی گھر میں گھسنا چاہتا تھا۔"

شرافت نے بڑی مشکل سے اپنی جان چھڑائی کہ وہ ایک شخص کو تلاش کر رہا تھا جس نے اسے یہی پتا دیا تھا۔ اس کی عاجزی سے زیادہ ملک صاحب کے حوالے نے شرافت کو بچا لیا ورنہ کچھ لوگ اسے پولیس کے حوالے کرنا ہی چاہتے تھے۔ ان لوگوں نے شرافت کے ساتھ غیر شریفانہ رویّہ کافی سمجھا کیونکہ پولیس کے چکر میں وہ خود بھی پڑنا نہیں چاہتے تھے۔ شاید وہ جانتے ہوں گے کہ الزام عائد کرنے والی عورت بھی اتنی شریف اور سچی نہیں۔ انہوں نے گالیاں اور دھمکیاں دے کر شرافت کو چلتا کر دیا۔

اگلے کئی دن شرافت نے لاہور کا ہر وہ نیٹ کیفے دیکھا جہاں سے اس کو جمیل یا شاہد کا کوئی سراغ ملنے کی توقع تھی لیکن مایوسی کے سوا اسے کچھ حاصل نہ ہوا۔ اس کا تفتیشی انداز شکوک پیدا کرتا تھا اور لوگ لاعلمی کا اظہار کرنا بہتر سمجھتے تھے۔ اس نے فیس بک پر چند لڑکیوں سے بھی رابطہ کیا جن کے بارے میں شاہد نے دعوے کیے تھے کہ وہ سب اس پر مرتی ہیں اور اسے بلاتی ہیں کہ وہ پاکستان چھوڑ کے برطانیہ، امریکا آجائے۔ ان میں سے کوئی بھی نہ شاہد سے واقف تھی اور نہ جمیل سے۔ معلوم نہیں وہ اسے کس نام سے جانتی تھیں۔ خود شرافت نے کبھی غور نہیں کیا تھا کہ جمیل نے جو فیس بک اکاؤنٹ کھولا ہے، اس پر نام کیا ہے اور تصویر کس کی ہے۔ پاس ورڈ جاننے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ کئی چہرے رکھتا ہو اور اسی مناسبت سے فیس بک اکاؤنٹ ہو۔

یونہی ایک دن اس نے اپنا فیس بک اکاؤنٹ کھولا تو

اس میں صوفیہ کی طرف سے موصول ہونے والی ای میل میں شکایات کے طومار تھے اور اس کی ارسال کردہ درجنوں تصاویر تھیں۔ کچھ تصاویر اس کے نرسنگ ہوم اور اس کے گھر کی تھیں۔ چند میں وہ نرسنگ ہوم کی یونیفارم پہنے کام کررہی تھی۔ چند میں گھر کے پوز تھے... کچن میں... بیڈ روم میں... ایک کسی ساحل پر سوئمنگ کاسٹیوم میں تھی... دو میں اس نے شلوار قمیص بھی پہن رکھا تھا... شرافت کو ان تصاویر نے مسحور کردیا... اس کے شباب سے زیادہ اس کی ادائے حسن کی معصومیت اور مشرقی انداز شرافت کو بھا گئے... اس کا گھر امریکی معیار سے عام تھا، پاکستان کے حساب سے پُرتعیش طور پر آراستہ... اس کی کار بھی وہ تھی جو یہاں صرف امراء کے پاس نظر آتی تھی۔

ای میل میں اس نے شکوہ کیا تھا کہ آج چار دن ہو گئے۔ آج آٹھواں دن ہے۔ آج دوسرا ہفتہ ختم ہورہا ہے۔ آخر وہ کہاں ہے کہ نہ نظر آتا ہے اور نہ جواب دیتا ہے... بقول شاعر... یہ ادائے بے نیازی تجھے بے وفا مبارک... مگر ایسی بے رخی کیا کہ سلام تک نہ پہنچے۔ اس نے بتایا تھا کہ اب وہ اکثر اس کے بارے میں بھی سوچتی ہے۔ وہ شرافت سے اتنی متاثر ہوگئی ہے کہ اسے محبت ہوجانے کا ڈر ہے۔ اس کے خلوص اور دوستی کی حدیں محبت کو چھونے لگی ہیں جو اسے پہلے کسی سے نہیں ہوئی تھی۔ وہ اس کی بے رخی سے پریشان ہے اور اکثر یہ سوچتی ہے کہ کسی طرح شرافت اس کے پاس امریکا پہنچ جائے تو کتنا اچھا ہو، وغیرہ وغیرہ۔

ذلت و پریشانی... دکھ اور عذاب کے ایک طویل وقفے کے بعد صوفیہ کی باتیں اسے یوں لگیں جیسے کوئی جلے ہوئے پر برف سے ٹکور کرے۔ جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم۔ اس نے دل کے درد کو مٹانے والے سکون سے حوصلہ پایا اور صوفیہ کو جواب میں غیر حاضری کا سبب اپنی مصروفیت کو بتایا لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ پریشانی کے اس دور میں بھی کسی لمحہ وہ اس کے خیال سے غافل نہیں رہا۔ شرافت میں ہمت نہ تھی کہ حقیقت بتا سکتا۔ اس نے درجواب آں غزل... اپنی بے چینی اور بے قراری کا بیان بڑھ چڑھ کر کیا جس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی... اور یہ محبت ہی تو ہے... دل کے خوش رکھنے کا یہ کھیل اسے اچھا لگا۔ نہ سہی وصل تو حسرت ہی سہی۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے صوفیہ کو اپنا موبائل فون نمبر بھی دے دیا کہ وہ مناسب سمجھے تو نیٹ کی دنیا سے نکل کر براہِ راست رابطہ کرلے۔

اسی روز آدھی رات کے بعد شرافت کے فون کی گھنٹی بجی تو اسکرین پر اسے عجیب سا نمبر نظر آیا۔ اس کے ہیلو کہنے پر دوسری طرف سے کوئی لڑکی دبے دبے الفاظ میں بولی۔ ”ڈاکٹر شرافت!“

وہ ایک دم اٹھ بیٹھا۔ ”صوفیہ... مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ تم ہو؟“

وہ ہنسی۔ ”پھر کیسے یقین آئے گا... کیا میں خود فون میں سے نکل آؤں؟ کیا کررہے تھے؟“

”سچ بتاؤں... تمہارے تصور میں کھویا ہوا تھا۔“

”تصویر دیکھ لی۔ اب تصور کیسا... مجھے تو بڑی مایوسی ہوئی کہ تم نے کوئی تبصرہ ہی نہیں کیا۔ نہ اچھا نہ بُرا۔“

”شاید مجھے ہوش نہیں رہا۔ تمہیں دیکھا تو سب بھول گیا۔ بس ایک خلش رہی کہ ہمارے درمیان بہت فاصلہ ہے۔“

”فاصلے خود بخود سمٹ جاتے ہیں اگر ارادہ اٹل ہو۔“

”وصالِ یار فقط آرزو کی بات نہیں۔“ شرافت نے کہا اور صوفیہ کے لیے اپنی لیاقت کے مطابق اس کا ترجمہ بھی کیا۔

”شاعری سے مجھے دلچسپی نہیں مگر اردو میں سمجھ لیتی ہوں۔ لکھ نہیں سکتی۔ پڑھنا بھی نہیں آتا۔“

”میری انگلش اتنی اچھی نہیں... تم نے محسوس کیا ہوگا۔“

”زبان کبھی دو افراد کے درمیان مسئلہ نہیں بنتی اگر وہ دل کی زبان سمجھتے ہوں۔ تم مجھے اردو کا ماہر بنا سکتے ہو اور میں تمہیں انگریزی کا... فرصت کے اوقات میں تم کیا کرتے ہو؟“

شرافت کو یاد ہی نہ آیا کہ جمیل نے اس کے کیا مشاغل لکھے تھے۔ ”اب تو بس ایک ہی کام ہے تمہارے بارے میں سوچنا... تصور میں تم سے باتیں کرنا... اور خوابوں میں تمہیں دیکھنا۔“

”تمہاری باتوں سے تو لگتا ہے کہ بڑے تجربہ کار کھلاڑی ہو۔ لڑکیاں ایسی ہی باتیں سننا چاہتی ہیں مگر میں ایسی لڑکی نہیں ہوں۔“

”اپنے مشاغل میں نے فیس بک میں لکھے تھے لیکن حقیقت اب وہی ہے جو میں نے بیان کی۔ تم نہ یقین کرو۔“

”اگر ایسے ہی جذبات ہیں تمہارے تو پھر مجھے بتاؤ کہ خیالوں کی دنیا میں کب تک رہو گے؟ کوئی عملی قدم کب اٹھاؤ گے میرے پاس آنے کے لیے... تصور کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے؟“

”سویٹ ہارٹ! کاش یہ اتنا آسان ہوتا... جتنا محبت کرنا۔“

”ٹھیک کہا تم نے... محبت کرنا تو شاید سب سے

آسان کام ہوگیا ہے مگر محبت کرکے نبھانا... وفا کی آزمائش میں پورا اترنا واقعی بہت مشکل ہے۔ دیکھو، تم میں ہمت نہیں ہے تو اس تعلق کو یہیں ختم کردینا چاہیے۔“

”خدا کے لیے ایسا مت کہو۔“

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ اس روگ کو پالنے سے فائدہ جب اس کا علاج ہی نہیں تمہارے پاس۔“

”میں نے مشکل کہا تھا، ناممکن نہیں... دراصل تمہیں اندازہ ہی نہیں یہاں کے مسائل کا۔ پہلے صرف ایک ملک تھا جہاں کوئی پاکستانی نہیں جاسکتا تھا... اسرائیل... اب حالات نے امریکا جانا بھی اتنا ہی مشکل بنادیا ہے۔ اگر آپ کو وسائل کا مسئلہ نہ ہو، آپ اپنا ذاتی ہوائی جہاز رکھتے ہوں... اسے خود اڑا کے لے جاسکتے ہیں پھر بھی ایک آسمان کی بلندی رکھنے والا پہاڑ بیچ میں حائل رہتا ہے جسے ویزا کہتے ہیں۔ صرف ایک مہر جو یہاں امریکی سفارت خانے کا ایک معمولی افسر لگاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں وہ اتنا بااختیار ہے کہ اس کی ”نہ“ کو امریکی صدر بھی ہاں میں نہیں بدل سکتا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں کوشش نہیں کروں گا۔“

”تمہاری بات سے مجھے مایوسی ہورہی ہے۔ اگر تمہیں ویزا نہ ملا... پھر؟“

”پھر بھی میں آؤں گا۔ آسان راستہ نہ ملے تو مشکل راستہ بہرحال ہے۔ پُرخطر اور غیر قانونی لیکن آج ارادہ کرلیا ہے تو اب کوئی میرا راستہ روک نہیں سکتا۔ کسی دن میں اچانک پہنچ کے تمہیں حیران کردوں گا۔“

”ایسا مت کہو۔ ابھی سے ہی انتظار کے عذاب میں رہنا نہیں چاہتی۔ میری تو راتوں کی نیند اڑ جائے گی۔“

”وہ تو میری پہلے سے اڑی ہوئی ہے۔“

”وعدہ کرو تم بتا کے آؤ گے۔ اس میں کتنا وقت لگے گا؟“

”یہ میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ چند ہفتے یا چند مہینے۔ یہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا تمہارے لیے ایک شہر سے دوسرے شہر جانا۔“

”میں سمجھ گئی۔ تمہیں اپنے معاملات سمیٹنے ہوں گے مثلاً پراپرٹی کا ڈسپوزل... یہ بتاؤ اپنے پروفیشن کا تم کیا کرو گے؟ یہاں بھی وہی کام کرو گے تو اس کے لیے تمہیں نئے سرے سے لائسنس حاصل کرنا ضروری ہوگا۔“

”سچ پوچھو تو میں اس کام سے اتنا بیزار ہوگیا ہوں کہ اب کچھ اور کرنا چاہتا ہوں۔“ شرافت نے کہا۔

”اوہ مائی گاڈ... یہ تو تم نے میرے دل کی بات کہی۔ کاش میرے لیے بھی یہ ممکن ہوتا کہ میں اس اعصاب شکن کام کو چھوڑ سکوں جس میں دن رات دکھ بیماری اور موت کے عذاب کو بھگتنا پڑتا ہے۔ تڑپتے، کراہتے بیمار اور زخمی... بچے، بوڑھے، جوان... بہتا ہوا خون کبھی شریانوں سے فرش پر تو کبھی بوتل سے شریانوں میں۔“

شکایت

بیوی نے شوہر سے شکایتاً کہا۔ ”دیکھیے! میں نے کس قدر پرانے کپڑے پہنے ہوئے ہیں اگر کوئی مہمان آجائے تو یقیناً یہی سمجھے گا کہ میں اس گھر کی باورچن ہوں۔“

شوہر نے مسکرا کر کہا۔ ”نہیں پیاری جب مہمان تمہارے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھائے گا تو فوراً اپنے خیال کو تبدیل کرلے گا۔“

(عاصمہ ہدایت، ملتان، ممتاز آباد)

فرمانبرداری

باپ حیرانی سے: ”عرفان تم مرغا کیوں بنے ہوئے ہو بیٹا؟“

”ابا جان! آپ ہی نے تو کہا تھا جو کام اسکول میں کرایا جائے اسے دہرایا کرو۔“ عرفان نے معصومیت سے جواب دیا۔

(مریم اسد، ڈیرہ اسمٰعیل خان)

بچے اس عہد کے

بچہ اپنی ٹیچر سے۔ ”مس میں آپ کو کیسا لگتا ہوں؟“

ٹیچر: ”سو سویٹ۔“

بچہ اپنے فرینڈ سے۔ ”میں نے کہا تھا نا مس مرتی ہے میرے پر۔“

تجربہ

صاحب آج کل بے روزگاری اتنی ہے کہ سو ویکنسیوں کے لیے دس ہزار سے اوپر درخواستیں ہوتی ہیں۔ ایسے ہی ایک دل جلے امیدوار کا انٹرویو ملاحظہ ہو۔

منیجر: ”تمہارا تجربہ۔“

امیدوار: ”جی پانچ سال۔“

منیجر: ”خوب، پہلے کہاں کام کرتے تھے؟“

اُمیدوار: ”کسی بھی جگہ نہیں۔“

منیجر: ”تو پھر پانچ سال کا تجربہ کس چیز کا؟“

اُمیدوار: ”درخواستیں اور انٹرویو دینے کا۔“

(طیب شاہین، کٹھیالہ شیخاں)

”اگر تمہیں موقع ملے تو تم کیا کرنا چاہو گی؟“

”پہلے تم نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا... تم کیا کرو گے؟“

شرافت سوچ میں پڑ گیا۔ ”میں... میرا خیال ہے میں چاہوں گا کہ شہر چھوڑ کے کسی پُرسکون سرسبز و شاداب علاقے میں ایک چھوٹا سا کاٹیج بنالوں... اردگرد پھلوں کے اور پھولوں کے باغات ہوں... پس منظر میں پہاڑ ہو جس کے دامن میں کوئی چھوٹی سی ندی...“

”خدا کے لیے بس کرو۔ یہ تو تم میرا خواب بتا رہے ہو۔ سنو شرافت! بالکل ایسا ہی میں سوچتی ہوں۔ ہم مل کے ٹیکساس یا فلوریڈا میں چھوٹا سا فارم ہاؤس بنا سکتے ہیں۔ وہاں ہم پھل یا سبزیاں کاشت کر سکتے ہیں۔ ڈیری فارمنگ کر سکتے ہیں۔ بھیڑیں یا مرغیاں پال سکتے ہیں۔ کام کرنے والے مل جاتے ہیں۔ ہمیں اتنی آمدنی ہو سکتی ہے کہ ہم پُرآسائش زندگی بسر کریں جو پُرسکون بھی ہو اور قدرت کے بہت نزدیک بھی۔ میں اپنا یہ گھر اور نرسنگ ہوم بیچ دوں تو مجھے اچھی خاصی رقم مل سکتی ہے کیونکہ یہ شہر کی پراپرٹی ہے۔ اس کی کاروباری ساکھ بھی اچھی ہے اور لوکیشن بھی۔ تم آنے کی سوچو، میں جانے کا سوچتی ہوں... تمہارے ساتھ اپنے سپنوں کی دنیا میں۔“ لائن اچانک کٹ گئی۔

اس نے کچھ دیر انتظار کیا کہ صوفیہ خود ہی پھر اس کا نمبر ملالے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ شرافت کے لیے کال بیک کرنا ممکن نہیں تھا۔ اسکرین پر صوفیہ کا نمبر آتا تو اس کے موبائل میں محفوظ ہو جاتا مگر یہ بوگس نمبر تھا۔ اس نے اخبار میں پڑھا تھا کہ بہت سے لوگ اپنے پرائیویٹ ایکسچینج چلاتے تھے اور بیرونِ ملک کالیں کرا کے ٹیلی فون کے محکمے کو لاکھوں کا نقصان پہنچاتے تھے۔ یہ ساری رقم ان کی جیب میں جاتی تھی۔ شاید امریکا میں بھی ماہر جعلساز پاکستانیوں نے ایسا ہی کوئی طریقہ ایجاد کر لیا تھا۔ وہ صوفیہ کی آواز کے جادو میں کھویا رہا۔ خوب صورت جذبوں اور خوابوں کی خوشی اور سکون دینے والی باتیں کر کے اس کے دکھوں کی ساری اذیت مٹ گئی تھی۔ یہ گپ شپ بالکل ہیروئن کے نشے جیسی تھی۔ بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے... یہ خود فریبی ہی سہی علاجِ غم بھی تو یہی تھا۔ اسے صوفیہ کا فارم ہاؤس والا آئیڈیا پسند آیا تھا۔ وہ اس پر مزید بات کرنا چاہتا تھا۔

لیکن کال پھر نہ آئی۔ وہ ساری رات ملک صاحب کی کوٹھی کے آخری حصے میں بنے ہوئے سرونٹ کوارٹر کی کوٹھری میں اندھیرا کیے سونے کی کوشش میں جاگتا رہا۔ یہ سرونٹ کوارٹر نہ جانے کب سے خالی پڑا تھا۔ اس میں ایک پرانے متروک بیڈ... پلاسٹک کی ایک سال خوردہ کرسی اور ایک ٹوٹی ہوئی تین ٹانگوں والی میز کے سوا کچھ نہیں تھا جس کو چوتھی طرف دیوار میں ٹیک لگا کے سپورٹ دی گئی تھی۔ بلب اس میں شرافت نے خود لا کے لگایا تھا۔ اس کے چند کپڑے بیڈ کے نیچے ٹین کے صندوق میں رہتے تھے۔ پھر اس کی ڈریسنگ ٹیبل تھی جس پر وہ اپنا سیفٹی ریزر... چھوٹا سا آئینہ، تیل اور کنگھا رکھتا تھا۔ اس لیے نہیں کہ ان کے کہنے پر شرافت گھر جا کے راجا صاحب کو نئی جوانی دینے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ (ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے)... یا کسی تعلق کی بنیاد پر نہیں۔ ملک صاحب نے اس کوٹھری میں چھوٹے حکیم صاحب کو جگہ دی تھی تو اس کی وجہ خود اپنی آسانی تھی۔ وہ ہر روز اس سے بلا معاوضہ مشورہ کر سکتے تھے... احسان اپنی جگہ... اب پیاسے کو کنوئیں کے پاس جانے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ کنواں خود پیاسے کے پاس آ گیا تھا۔

ملک صاحب کو اپنے دوست راجا صاحب کی موت اور اس کے بعد کے تمام حالات کا علم تھا لیکن وہ صرف ”نئی جوانی پیکیج“ میں دلچسپی رکھتے تھے۔ نہ انہوں نے کبھی شرافت سے ہمدردی کی اور نہ اس معاملے میں کسی قسم کی مدد۔ کبھی شرافت نے ذکر کیا تو انہوں نے واضح بے رخی سے کہا کہ وہ قانونی معاملات میں کچھ نہیں کر سکتے۔ جمیل کی دھوکے بازی سے شرافت کو قتل میں ملوث کرانے، چوری اور ڈکیتی سے لے کر قبلہ بڑے حکیم صاحب کی ساری جائداد ہتھیانے تک تمام معاملات قانونی ہی تو تھے۔ یہی غنیمت تھا کہ اسے سر چھپانے کا ایک ٹھکانا ملا ہوا تھا۔ آگے جو کچھ کرنا تھا، شرافت کو خود ہی کرنا تھا۔ زبردستی راجا صاحب کے قتل میں اسے گرفتار کرانے... تھانے میں اس کی ذلت و رسوائی، اس کی ماں کی موت اور باپ کی دیوانگی... سب اسی ایک شخص نے کیا تھا جسے وہ اپنا دوست سمجھتا تھا۔ اس ایک غلطی نے شرافت کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔

وہ یہاں اس کوٹھری میں پڑا امریکا میں صوفیہ کے ساتھ فارم ہاؤس بنانے کی باتیں کرتا تھا۔ ایک رسّی بھی نہ تھی جس سے وہ خود کو پھانسی لگا لے۔ وہ چاند پر کمند ڈالنے کی سوچتا تھا۔ اصولاً تو اسے بھی باپ کے ساتھ پاگل خانے میں بند ہونا چاہیے تھا لیکن حالات کی طرح دماغ پر بھی اس کا قابو نہیں رہا تھا۔ معمول کے مطابق چوکیدار نے صبح اسے چائے پراٹھا لا کے دیا جسے کھا کے وہ اپنی بے مقصد تلاش کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ اسے جمیل کی تلاش تھی لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ جمیل مل گیا تو وہ اس سے کیا کہے گا۔ پوچھے گا کہ آخر اس نے شرافت کے ساتھ دوستی کی آڑ میں دشمنی کیوں کی؟ وہ تو شرافت کو پہچاننے سے ہی انکار کر دے گا۔ کیا بگاڑ لے گا وہ اس کا؟

یونہی چلتے چلتے شرافت کو شیدے پہلوان کا خیال آ گیا۔ ان کی خاندانی رہائش گاہ اور مطب کی جگہ کا سودا اسی نے تین لاکھ میں کیا تھا۔ جمیل یا شاہد اسے جانتا تھا اور وہ شاہد کہ وہ اس علاقے کا دادا تھا۔ ایک خطرناک بدمعاش سمجھا جاتا تھا۔ اس سے سب ڈرتے تھے۔ کیا ہوگا اگر وہ اس کے سامنے جا کے روئے پیٹے، گڑگڑائے اور اس کے قدموں میں کتے کی طرح لوٹنے لگے؟ وہ اسے دیکھتے ہی گولی تو نہیں مار دے گا۔ زیادہ سے زیادہ اسے گالیاں اور دھکے دے کر بھگا دے گا۔ پھر بھی... کیا ایک فیصد امکان اس بات کا نہیں ہے کہ اسے رحم آ جائے؟ وہ چھوٹے حکیم صاحب کے لیے کچھ کر دے۔ ظلم اور ناانصافی کے خلاف قانون کے آسرے پر لڑنا خود کو تباہی کے غار کی جگہ بربادی کے اندھے کنوئیں میں دھکیلنا ہوگا۔ نہ کوئی اسے حق دلوا سکتا ہے اور نہ غاصبوں کو سزا۔ کسی کو سزا دلوا کے اب اسے کیا ملے گا... لیکن شیدے پہلوان کو ترس آ جائے تو وہ بہت کچھ کر سکتا ہے۔ آبائی جاگیر تو واپس ملنے کی توقع رکھنا دیوانگی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اسے کچھ رقم اور مل جائے۔ شیدا پہلوان کسی جگہ چھوٹے حکیم صاحب کو مطب کر دے اور اسے کوئی جگہ دلوا دے۔

اس خیال نے شرافت کو اس حد تک قائل کیا کہ وہ لکشمی چوک سے بیڈن روڈ تک شیدے پہلوان کو پوچھتا گیا۔ دکاندار اسے پُرتمسخر نظروں سے دیکھتے تھے۔ یا تو ٹال دیتے تھے کہ ہم نہیں جانتے یا لاعلمی کا اظہار کر کے جان چھڑاتے تھے۔ ہمیں کیا معلوم اس وقت وہ کہاں ملے گا؟ بالآخر وہ بیڈن روڈ پر امرتسری حلوائی کی کسی کی دکان پر پہنچا۔ لسی پینے کے بعد اس نے چوکی پر اہرامِ مصر کی طرح رکھے ہوئے لسی بنانے والے پہلوان سے بھی سوال کیا تو اس کا مدھانی کو خودکار مشین کی طرح رڑکنے والا ہاتھ رک گیا۔ ”تو کیوں پوچھ رہا ہے شیدے استاد کو... کیا کام ہے؟“ اس نے شرافت کو نظر جما کے دیکھا۔

”کام انہی کا ہے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی اگر مجھے ان کے پاس پہنچا دو۔“ شرافت نے عاجزی سے کہا۔

پہلوان نے ایک موبائل فون پر کوئی نمبر ملایا اور بولا۔ ”کوئی نوجوان ہے... اپنا نام شرافت حسین بتاتا ہے، ملنا چاہتا ہے۔“ پھر فون رکھ کے ادھر لسی رڑکنے میں مصروف ہو گیا۔ ”بیٹھ جا ادھر... منڈا آئے گا اس کے ساتھ چلے جانا۔“

اسے صرف دس منٹ انتظار کرنا پڑا پھر ایک نوجوان آیا اور اسے موٹر سائیکل پر بٹھا کے لے گیا۔ پرانے لاہور کی تنگ گلیوں میں آتے جاتے لوگوں کی پروا کیے بغیر موٹر سائیکل کو ایک ہی رفتار سے دوڑانے کا مظاہرہ شرافت کے نزدیک ایک کارنامہ تھا۔ موٹر سائیکل نے کسی کو چھوا بھی نہیں مگر دیوار سے لگ جانے والوں کی گالیاں اس نوجوان کے لیے باعثِ مسرت ثابت ہو رہی تھیں۔ تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب... یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے... عقاب ہارن دے کر ایک دروازے سے بھی گزر گیا اور صحن میں جا رکا۔

چند منٹ بعد وہ شیدے استاد کے سامنے تھا۔ وہ فرش کے قالین پر گاؤ تکیے سے لگا بیٹھا تھا اور ایک لڑکا اس کے ہاتھ پیر دبا رہا تھا۔ استاد تین من گوشت کا تھل تھل کرتا ڈھیر تھا اور اس کے چہرے پر ایک قدرتی بچوں جیسی معصومیت تھی جو مصنوعی لگتی تھی۔ اس نے شرافت پر ایک نظر ڈالی اور بولا۔ ”ہاں بھئی... کیوں ملنا چاہتا تھا تو مجھ سے... بیٹھ ادھر۔“

شرافت نے کہا۔ ”استاد! میں شرافت ہوں۔ چھوٹے حکیم صاحب کے نام سے مشہور ہوں۔“

”ہاں پتا ہے تیری شہرت کا... اپنی مشہوری کے اشتہار خود لکھتا پھرتا ہے دیواروں پر... کام بتا کام...؟“

”استاد! ایک تو مجھے جمیل کا پتا چاہیے... شاہد کا... مجھے اس سے ملنا ہے۔“

”وہ تو اب حشر کے میدان میں ہی ملے گا تجھے... اس کا قتل ہو گیا۔“

شرافت کو دکھ تو نہیں ہوا مگر شاک لگا۔ ”قتل ہو گیا؟ کیسے... میرا مطلب ہے کب؟“

”وہ نیٹ کیفے والا صوفی نہیں تھا جہاں وہ تجھے ملا تھا... اسی سے کوئی جھگڑا ہوا تھا۔“

شرافت کچھ دیر چپ رہا۔ ”استاد! میرے ساتھ بڑا ظلم ہوا... پولیس نے مجھے قتل کے جھوٹے الزام میں پکڑا... میرے باپ سے تین لاکھ رشوت مانگی۔ گھر میں ڈاکا مار کے وہ... شاہد سب لے جا چکا تھا... مجھے چھڑانے کے لیے وہ جگہ بیچنی پڑی جو ہمارا گھر تھا اور مطب تھا۔“

استاد یوں سنتا رہا جیسے کچھ نہیں سنا۔ اس نے پاؤں دبانے والے لڑکے کو ایک ہاتھ مارا۔ ”حرام خوری مت کر...“ پھر اس نے گالی دے کر شرافت کی طرف دیکھا۔ ”تو بولتا رہ۔“

”استاد! میری ماں مر گئی... باپ پاگل خانے میں

ہے... میرے پاس رہنے کو جگہ نہیں۔"

"اوئے حکیم شرافت! اس میں میرا کیا قصور ہے... میرے پاس کیوں آیا ہے تُو... میں نے تو مدد کی تھی تیرے باپ کی... فقافت تین لاکھ اپنی ضمانت پر دلوائے تھے ورنہ قبلہ بڑے حکیم صاحب کو کون جانتا تھا... اس نے تو صرف کاغذ پر دستخط کیے تھے۔"

"استاد! تم جانتے ہو وہ جگہ تین لاکھ کی نہیں تیس لاکھ کی تھی۔"

استاد نے برہمی سے کہا۔ "اوئے تیس لاکھ نہیں، تیس کروڑ کی تھی۔ تو تین لاکھ دے اور کاغذ لے جا۔ تیرے باپ نے گروی رکھی تھی ایک مہینے کے لیے... اب تو ایک مہینے سے اوپر ہو گیا مگر چل تیرے لیے رعایت۔"

"استاد! میں تین لاکھ کہاں سے لاؤں گا؟ میرے پاس تو رہنے کی جگہ نہیں... مطب بھی کھولوں تو کہاں۔ آپ کچھ تو انصاف سے کام لو۔ آدھے پیسے تو دو مجھے تاکہ میں کچھ کر سکوں... یہ کام کرنے کا میرا پہلے بھی ارادہ نہیں تھا جو میرا باپ کرتا تھا۔ میں تو یہ شہر ہی نہیں ملک چھوڑ کے جانا چاہتا ہوں۔ یہاں اب ہماری کوئی عزت نہیں۔"

"کہاں جانا چاہتا ہے تُو... اور وہاں جا کے کیا کرے گا؟"

شرافت کے منہ سے نکل گیا۔ "میں نے امریکا جانے کا سوچا ہے استاد! کسی ایجنٹ کے ذریعے... اس میں آٹھ دس لاکھ لگتے ہیں۔"

استاد اسے دیکھتا رہا۔ "چل ٹھیک ہے، اب پیسوں کی بات چھوڑ... میں تجھے امریکا بھجوا دیتا ہوں... تیرا ٹکا خرچ نہیں ہوگا۔"

"وہ کیسے استاد؟"

شیدا پہلوان یا استاد گرم ہو گیا۔ "اوئے تو زیادہ جرح مت کر... آئی سمجھ... میرا دل نرم ہے روئی جیسا تو پتھر بھی ہے... تیری فریاد سے رحم آ گیا تھا اس لیے ایک کام کرا دوں گا تیرا... زیادہ بولے گا تو چھتر مار کے باہر نکلوا دوں گا۔ جا کے عدالت میں کیس کر دینا کہ میری تیس لاکھ کی پراپرٹی لے لی ہے تین لاکھ میں۔"

اس کے ہاتھ پیر دبانے والے لڑکے نے پیچھے سے منہ پر انگلی رکھ کے شرافت کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ بنتا کام بگڑتا دیکھ کے شرافت نے بھی مصلحت سے کام لیا۔ "غلطی ہو گئی استاد... آپ مجھے امریکا بھجوا دو... بڑی مہربانی ہوگی آپ کی۔"

استاد نرم پڑ گیا۔ "اچھا کل شام کو آ جانا ادھر ہی... جہاں سے وہ لڑکا تجھے موٹر سائیکل پر لایا تھا۔ اب جا اور خبردار جو یہ بات کسی اور کو بتائی۔"

شرافت چپ چاپ دروازہ کھول کے باہر آ گیا۔ صحن میں اب کوئی موٹر سائیکل نہیں تھی۔ وہ باہر والا دروازہ کھول کے گلی میں نکلا اور اسی طرف چلنے لگا جس طرف سے موٹر سائیکل آئی تھی۔ وہ ان گلیوں سے ناواقف تھا مگر چلتے چلتے آدھ گھنٹے میں بھاٹی گیٹ پہنچ گیا۔ وہ مایوس بھی تھا اور پُرامید بھی۔ وہ نہیں ہوا تھا جو اس نے سوچا تھا۔ وہ ہو رہا تھا جو اس کے خیال میں نہیں ہو سکتا تھا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کے دل میں انتقام کی آگ کے شعلے سرد پڑتے جا رہے تھے۔ جمیل یا شاہد کے قتل کی خبر سن کر اس نے محسوس کیا کہ اب اس کے کرنے کو کچھ نہیں رہا۔ ماں وہاں جا چکی تھی جہاں سے واپس نہیں آ سکتی تھی۔ باپ شاید پلیٹ فارم پر وہیں لے جانے والی گاڑی کا انتظار کر رہا تھا... اور خاندانی پیشہ... جاگیر اور عزت سب بعوض تین لاکھ روپے نقد نیلام ہو چکے تھے۔ دیواروں پر لکھے ہوئے قبلہ بڑے حکیم صاحب کے نام والے اشتہارات بھی وقت کے ساتھ خود بخود غائب ہو جائیں گے... رہے نام اللہ کا۔

موقع پاتے ہی اس نے صوفیہ کو بتایا۔ "میں نے تمہارے پاس امریکا آنے کا پروگرام فائنل کر لیا ہے۔"

"کاش تم میری خوشی اور حیرانی کی چیخ سن سکتے۔"

"تم نے پھر فون کیوں نہیں کیا... اور اس رات بھی کال کٹ گئی تھی؟"

"اس میں میرا کیا قصور ہے ڈارلنگ! تمہارے ملک کا مواصلاتی نظام ہی ایسا ہوگا۔ میں تو بار بار کوشش کرتی رہی تھی لیکن جواب یہ ملتا تھا کہ آپ کا مطلوبہ نمبر کسی اور لائن پر مصروف ہے۔"

"میرا فون ایک سیکنڈ کے لیے بزی نہیں ہوا تھا۔ میں تمہاری کال کے انتظار میں رات بھر جاگتا رہا۔ اگر میرے پاس تمہارا نمبر ہوتا تو میں ہر رات تم سے باتیں کرتے گزار دیتا۔ نہ خود سوتا نہ تمہیں سونے دیتا۔"

"پھر تو اچھا ہی ہوا کہ تمہارے پاس میرا نمبر نہیں ہے۔ رات بھر جاگ کے اگلے دن کام خاک ہوتا۔ میں خود سوتی رہتی۔"

"مجھے ایک بہت سنسنی خیز اطلاع دینی تھی تمہیں... میں آ رہا ہوں۔"

"میں نے پھر چیخ ماری ہے۔ تم سچ کہہ رہے ہو؟ مجھے

یقین نہیں آتا ہنی... خدا کے لیے جلدی بتاؤ کب آ رہے ہو؟"

"بہت جلد... تم نے ٹھیک کہا تھا جہاں چاہ ہے، وہاں راہ ہے... ایک راستہ نکل آیا۔"

"اف، میری بے چینی کا تمہیں کوئی اندازہ نہیں۔ اندازاً کتنے دن لگیں گے... تین دن... چار دن... ایک ہفتہ۔"

"مجھے ہنسی آ رہی ہے... لیکن میں بھی کم بے قرار نہیں ہوں اس وقت کے لیے جب میں تمہیں اپنی باہنوں میں لے سکوں گا۔"

"اور میں تمہیں کس کروں گی... اور ہم ساری رات آنکھوں میں گزاریں گے۔"

"شادی کریں گے۔"

"اور ہمارے بچے ہوں گے۔"

"اس خوش خبری کے انعام میں آج میں تمہیں اپنی ایک خصوصی پرائیویٹ فوٹو دوں گی... جو صرف تمہارے لیے ہوگی۔"

"اسے میں اپنے بیڈ روم میں نظر کے سامنے رکھوں گا۔ پورٹریٹ سائز پر انلارج اور فریم کرا کے۔"

"تم بڑے... شریر ہو..."

اچانک بجلی چلی گئی۔ مانیٹر تاریک ہو گیا۔ اس نے پھر صوفیہ کا نمبر نہیں لیا تھا۔ وہ باہر نکلا تو اس نے نیٹ کیفے کے مالک کو چند لوگوں سے جھگڑتا دیکھا۔ "جب ہر مہینے تمہیں وقت پر پیسے مل جاتے ہیں تو لائن کیوں کاٹی؟"

"باؤ جی سمجھا کرو... کبھی کبھی افسروں کے حکم پر کارروائی ڈالنا پڑتی ہے۔ وہ بھی مجبور ہیں۔ یہ ماں کے خصم میڈیا والے تاک میں رہتے ہیں... ٹی وی پر رپورٹ چلا دی ہے۔"

☆☆☆

گڑگڑاہٹ کی آواز کے ساتھ ہی جیسے زلزلہ بھی تھم گیا۔ فرش پر بیٹھے ایک درجن سے زائد انسانوں نے... جو ہیومن کارگو تھے... سکون کا سانس لیا... جھٹکوں سے ان کے بدن کا جوڑ جوڑ ہل گیا تھا۔ گھپ اندھیرے میں وہ ایک دوسرے کی صورت نہیں دیکھ سکتے تھے تو انہیں کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ اب وہ کہاں ہیں... باہر دن ہے یا رات ہے... سامان لے جانے والے اس کنٹینر کے سامنے والے حصے میں مضبوطی سے بند بھاری کارٹن تھے جن کو ہلایا بھی نہیں جا سکتا تھا مگر چار قطاروں میں ایک قطار ایسی تھی جس میں صرف باہر کی طرف والا کارٹن دوسروں کی طرح بھرا ہوا تھا اور ویسا ہی نظر بھی آتا تھا۔ تاہم اس کا وزن بہت کم تھا۔ بیچ میں پھنسا ہوا ہونے کی وجہ سے اس کو دائیں بائیں ہلانا ممکن نہیں تھا۔ اس کے پیچھے والے سارے کارٹن خالی تھے۔ وہ سب جو آخری حصے میں دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھے تھے، کنٹینر کے رکتے ہی پچھلی طرف سے کارٹن میں داخل ہو جاتے تھے اور سرنگ میں چلنے والوں کی طرح چاروں ہاتھوں پیروں پر چلتے آخر تک چلے جاتے تھے۔ سانس روکے... خاموش اور خوف زدہ...

خاموشی سے انہوں نے باہر کی سمت والے کارٹن کو ہلانے والوں کی آوازیں سنیں پھر کارٹن کو اتارا گیا لیکن ابھی وہ باہر نکلنے کے لیے آزاد نہیں تھے۔ جن خالی کارٹنوں کی سرنگ سے گزر کے وہ یہاں تک پہنچے تھے، ابھی اس کا راستہ کھولا جانا باقی تھا۔ کسی نے ہتھوڑی اور پلاس کی مدد سے تختے کو ہٹایا تو انہوں نے باہر کی آزاد دنیا کو دیکھا۔ یہ سارا انتظام انہیں کسٹم حکام کی نظر سے بچائے رکھنے کے لیے تھا۔ یا کم سے کم انہیں ایسا بتایا جاتا تھا ورنہ کسٹم حکام ان کے باپ تھے اور جانتے تھے کہ سامنے والا کارٹن اصل مال سے بھرا ہوا ہے۔ اسے ہٹانے سے جو کارٹن بند نظر آتا ہے وہ درحقیقت خالی ہے اور اس کے پیچھے کے سب کارٹن مل کر ایک سرنگ بناتے ہیں جس کے آخر میں دولت کمانے کے آرزومند دولت لٹا کے اس وقت کے انتظار کی گھڑیاں کاٹ رہے ہیں جب خوش بختی کا دروازہ وا ہوگا اور وہ اپنے خوابوں کی سرزمین لینڈ آف گولڈن OPPORTUNITIES پر قدم رکھیں گے۔ سب جانتے ہوئے بھی انجان بنے رہنے والے بھی اپنا حصہ وصول کرتے تھے۔ یہ سفر مرحلہ وار طے ہوتا تھا۔

شرافت نے اندھیری رات میں قدم رکھا۔ اس کے پیچھے یکے بعد دیگرے دس افراد ریت پر کودے۔ وہاں ایک شخص لالٹین لیے کھڑا تھا۔ ٹرک ڈرائیور استاد نے کہا۔ "ہم ایران پہنچ گئے ہیں۔ اس شخص کے ساتھ جاؤ۔ یہ تمہیں آگے لے جائے گا۔ فی امان اللہ۔" وہ ٹرک پر چڑھا۔ کارٹن دوبارہ چڑھانے کے بعد پیچھے والا حصہ پھر بند کر دیا گیا تھا۔ ٹرک روانہ ہو کے رات کی تاریکی میں گم ہو گیا۔ وہ لالٹین والے شخص کے پیچھے چلتے گئے۔ اپنی صورت کے نقوش سے وہ بھی بلوچی مکرانی لگتا تھا لیکن ان کی زبان نہیں سمجھتا تھا جو سندھی، پنجابی، پٹھان اور بنگالی سب تھے۔ انگریزی کے اسے صرف دو لفظ آتے تھے... شٹ اپ... یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ صرف فارسی بول سکتا ہے۔

شرافت کے لیے سفر ایک طویل عذاب تھا۔ ایک بھیانک عذاب در عذاب کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ۔ اس نے

نقد رقم کوئی ادا نہیں کی تھی۔ یہ حسنِ انتظام شیدے استاد کی فیاضی اور طبعی رحم دلی کا نتیجہ تھا۔ شرافت حساب لگاتا تھا تو اس سفر کی قیمت باقی سب کے مقابلے میں اتنی زیادہ بنتی تھی کہ سکہ رائج الوقت میں نہیں بتائی جا سکتی تھی۔ دیگر ہم سفروں میں سے کسی نے چھ لاکھ دیے تھے تو کسی نے سات... ایک آٹھ لاکھ کا مسافر بھی تھا۔ کسی نے ماں کا زیور بیچا تھا تو کسی نے باپ کی زمین... ایک اپنا گھر بیچ کے آیا تھا تو ایک ایسا بھی تھا جس نے اپنی بیوی بیچ دی تھی۔ وہ بڑی بے غیرتی سے کہتا تھا کہ یار بیوی کا کیا ہے اور مل جائے گی۔ جس نے مجھے بھجوایا اسے ایک ہی عورت پسند تھی... میری بیوی... تو میں نے کہا کہ چل پھر سودا کرلے... تیری بھی دلی مراد پوری ہو، ہماری بھی۔

شرافت بتاتا کہ اس نے تیس لاکھ مالیت کی خاندانی جائداد گنوائی، ماں باپ گنوائے، بچپن سے اس کی محبت میں پاگل اپسرا گنوائی۔ وہ خاندانی حکیم تھا... چھوٹے حکیم صاحب... قبلہ بڑے حکیم صاحب کا وارث اور گدی نشین... تو سب ہنس ہنس کر دہرے ہو جاتے۔ یہ دیوانے جو اس اذیت و ذلت میں بھی ہنسنے کا حوصلہ رکھتے تھے اسے دیوانہ کہتے۔ سوال کرتے کہ پاگل دے پتر... چھوٹے حکیم صاحب! تو نے تو مجنوں کو پیچھے چھوڑ دیا جو صحرا صحرا بھٹکتا تھا اور لیلیٰ لیلیٰ پکارتا تھا۔ فرہاد کا ریکارڈ توڑ دیا جو پہاڑ سے دودھ کی نہر نکالنے کا جنون رکھتا تھا۔ اوئے ایسی محبت کرنے والی تھی وہ تیری چھمک چھلو... تو اس سے کہنا تھا نا کہ شادی کر کے تجھے بلالے... شادیاں فون پر ہو جاتی ہیں... اور جائز ہیں... ورنہ ویزا لگوا دیتی... ٹکٹ بھیج دیتی اور تیری جگہ میں ہوتا تو خود کیوں جاتا... اسے بلاتا... تیرے پاس تو ٹکسال تھی... جعلی دوائیں... ہربل میڈیسن... قد بڑھاؤ... بال اگاؤ... اولادِ نرینہ پیدا کرو... رنگ گورا کرو... راتوں رات وزن گھٹاؤ مس ورلڈ بن جاؤ... سب کی دوائیں بنا کے بیچتا... اشتہار بازی کی کھلی اجازت ہے۔

شرافت کے لیے اس عذاب کی نہ حد تھی نہ حساب تھا۔ وقت اور تاریخ یاد رکھنے کا کوئی فائدہ بھی نہ تھا۔ ان کو منزلِ مراد تک پہنچانے کے دعوے دار جو چاہتے، کہتے تھے اور کرتے تھے۔ انہیں کھانے یا پینے کو کچھ ملے نہ ملے... اپنے پنجرے سے نکلنا یقیناً ہو نہ ہو... رات سو کے کٹے یا رو کے... کوئی بیمار ہونا چاہے تو اس کی مرضی اور مر جائے تو خدا کی مرضی... آگے کیا ہوگا، کیا نہیں ہوگا... آگے والوں کی مرضی... شرافت ہر روز ایک ہی بات پر خدا کا شکر بجا لاتا تھا کہ ابھی وہ زندہ ہے اور ہوش میں ہے۔ راہ میں ایک ہم سفر کو پہلے الٹیاں ہوئیں پھر دست لگ گئے۔ ناقابلِ برداشت بدبو سے باقی سب کا دم گھٹنے لگا۔ جب وہ مر گیا اور اس کی پُرعفونت لاش کو باہر پھینکا گیا تو باقی سب نے فوراً اپنی اپنی بنیان سے جگہ کو پونچھ کر صاف کیا اور بنیان باہر پھینک دی۔ شرافت جانتا تھا کہ یہ فوڈ پوائزننگ تھی۔ اس کا شکار دوسرے بھی ہو سکتے تھے کیونکہ کھانا تو وہی سب کے پیٹ میں تھا۔ جب ایسا نہیں ہوا تو اس نے خدا کا شکر ادا کرنا ضروری سمجھا۔

شرافت کے ہم سفر اسے عجیب و غریب دل دہلا دینے والی کہانیاں سناتے تھے جو سرزمینِ مراد کا سفر اختیار کرنے والوں کے عبرتناک انجام کی سنی ہوئی روایات پر مبنی ہوتی تھیں۔ ان کو سن کر شرافت کے سر سے صوفیہ کے عشق کا بھوت بھی اتر کے بھاگ جاتا تھا۔ سب کے ساتھ وہ بھی باجماعت پچھتانے لگتا تھا کہ اس نے خودکشی کا یہ مشکل اور عبرتناک راستہ کیوں چنا۔ اوروں کی بات اور جائیں۔ وہ تو اچھا بھلا حکیم تھا... پھر کہیں دکان ڈال لیتا تو بے وقوف آہی جاتے... بے وقوف بنانے کا ہنر تو اسے آہی گیا تھا۔ لعنت اس عشق پر اور عاشقی پر... اس کی جگہ مجنوں یا فرہاد ہوتے تو وہ بھی کہتے کہ بھاڑ میں گئی لیلیٰ اور جہنم میں جائے شیریں... دشت نوردی تو سیر سپاٹا تھی، اب کسی پہاڑ پر ملک پلانٹ لگانا بزنس۔

ایک مہینا... ان کے لیے ایک سال یا ایک صدی کے عذاب پر محیط تھا۔ انہوں نے ایک تیل لے جانے والے جہاز میں ڈانگریاں پہن کے دن رات مشقت بھی کی۔ وہ انجن روم میں سوتے تھے۔ انجن چلنے کے شور سے وہ بہرے ہو گئے تھے اور جو کچھ انہیں کھانے کو دیا جاتا تھا، اس میں بھی انہیں تیل کی بو محسوس ہوتی تھی۔ مزید دو اس سفر اور مشقت کی تاب نہ لاتے ہوئے بیمار ہوئے اور ان کی جان اس عذاب سے چھوٹ گئی۔ ان کے لواحقین فی الحال ان کی طرف سے کسی خبر کے یا ڈالروں کے موصول ہونے کا انتظار کرتے رہیں... بالآخر ایک دن وہ مایوس ہو جائیں گے یا خود عالمِ بالا میں ان کے پاس پہنچ جائیں گے۔ سب کے لیے ایک ہی دعائے مغفرت۔

وہ سفر کا آخری مرحلہ تھا جب بحری جہاز سے اتار کے انہیں ایک کشتی میں سوار کرا دیا گیا۔ وہ چپو سے چلائی جانے والی کشتی میں اپنے سامنے کسی ساحل کو دیکھ رہے تھے۔ بحری جہاز آہستہ آہستہ دور ہوتا گیا۔ کشتی کو آگے بڑھانے والا ایک نحیف و نزار ملاح تھا جس کے لیے آٹھ افراد کے وزن سمیت کشتی کو ایک چپو سے ساحل تک پہنچانا بظاہر ناممکن لگتا تھا۔ وہ پھر بھی مشقت کر رہا تھا اور مسکرا مسکرا کر کسی اجنبی زبان میں سب سے کچھ کہتا جا رہا تھا۔ اچانک چپو اس کے ہاتھ سے گر

گیا۔ وہ صرف لکڑی کا بنا ہوا چپو ہوتا تو تیرتا ہوا پھر پکڑ لیا جاتا مگر اس کے ڈنڈے پر لوہے کی چادر تھی اور نچلا حصہ بھی بیلچے کی طرح دھات کا بنا ہوا تھا۔ وہ فوراً ڈوب گیا۔ ملاح نے کھڑے ہو کر قمیص اتاری پھر پتلون... اور ہاتھ ہلا ہلا کے کچھ کہتا ہوا ننگ دھڑنگ چپو نکالنے کے لیے پانی میں کود گیا۔ ہنسنے والوں نے اسے غوطہ مار کے بجلی کی طرح غائب ہوتے دیکھا۔ پھر وہ غائب ہی رہا۔ مسافروں کے ہونٹوں سے ہنسی غائب ہو گئی۔ ان کی تشویش بھی بالآخر مایوسی اور غصے میں ڈھل گئی۔ وہ سب اسے گالیاں دینے لگے جو پانی کے نیچے ہی نیچے چلتا ہوا نہ جانے کس سمت میں نکل گیا تھا۔ ممکن ہے سانس لینے کے لیے وہ چند سیکنڈ سر نکال کے سطح آب پر بھی آیا ہو مگر وہ کسی کو نظر نہیں آیا۔

اب کشتی ساحل سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر تھی مگر پھر بھی ساحل اتنا ہی دور لگتا تھا جتنا اپنے پاکستان سے... چپو کے بغیر آگے بڑھنے کی وہی سوچ سکتے تھے جن کو تیرنا آتا تھا اور اب وقت آ گیا تھا کہ کوئی کسی اور کے بارے میں نہ سوچے۔ شرافت نے چار افراد کو پانی میں چھلانگ لگا کے ساحل کی طرف تیرتے دیکھا۔ چار افراد ان کی اندھی تقلید کرتے ہوئے پانی میں کود گئے تھے۔ ان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پر خطرے کا احساس غالب آ گیا تھا۔ یہاں ساحلی محافظ کسی بھی وقت انہیں شوٹ کر سکتے تھے۔ موت نے انہیں پناہ دے دی۔

شرافت کی عقل نے اس کا ساتھ دیا۔ باقی رہ جانے والے دو افراد نہ جانے کس ملک کے تھے۔ پاکستان کی نمائندگی کا اعزاز اب صرف چھوٹے حکیم صاحب کو حاصل تھا۔ اتفاق سے اس کی نظر نے کشتی کے ایک کنارے کو دیکھا جس کا اوپر والا تختہ ایک جگہ سے الگ ہو رہا تھا۔ اس نے زور لگا کے کھینچا تو چھ فٹ لمبا اور چھ انچ چوڑا فائبر گلاس کا ٹکڑا اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ اس نے اپنے باقی ماندہ دو ساتھیوں کو اشارے کی زبان میں سمجھایا کہ اسے چپو بنا کے وہ ساحل تک پہنچنے کی جدوجہد کر سکتے ہیں۔ یہ ایسی بات نہ تھی کہ کسی کی سمجھ میں نہ آتی۔ وہ بھوک، پیاس اور تھکن کے باوجود باری باری چپو چلاتے رہے۔ کشتی ایک ایک انچ آگے بڑھتی ہوئی رات کو نہ جانے کس وقت کم گہرے پانی میں پھنس کے رک گئی۔ وہ کود کے پانی میں اترے اور دوڑتے ہوئے خشکی پر جا گرے۔

بالآخر وہ منزلِ مراد پر پہنچ گئے تھے۔ یہ شرافت کو صبح معلوم ہوا کہ اس منزل تک پہنچنے والا وہ واحد شخص تھا۔ اس کے ساتھ کنارے پر اترنے والے دونوں افراد کو رات کے وقت کسی سانپ نے یا زہریلے جانور نے ڈس لیا تھا۔ ان کے نیلے پڑ جانے والے بدن دھوپ میں اکڑے پڑے تھے۔

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے میری بے کسی کی لاج

شرافت نے اٹھ کر چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ کہیں بھی آبادی کے آثار دکھائی نہ دیے۔ اس کی تھکن تو کسی حد تک دور ہو گئی تھی لیکن اب اس پر بھوک سے نقاہت غالب آ رہی تھی۔ اس نے اپنے آخری ہم سفروں پر نگاہ ڈالی۔ وہ پاکستان، بھارت یا کسی ہمسایہ ملک کے نہیں لگتے تھے۔ ان کے جسم پر رنگین ٹی شرٹس اور جینز تھیں اور پاؤں میں جوگرز۔ اپنے لباس پر نگاہ ڈال کے شرافت نے مرنے والوں کی روح سے اس غیر اخلاقی حرکت پر معافی مانگی اور پھر ان میں سے ایک کے کپڑے اتار کے پہن لیے۔ اس ٹی شرٹ کے پیچھے انگریزی حروف میں کوئی غیر ملکی زبان لکھی ہوئی تھی اور ایک خاصی قابلِ اعتراض ڈانسر خاتون کا پوز چھپا ہوا تھا۔ شرافت کے خیال میں وہ دونوں کیوبا کے ہسپانوی تھے۔

کسی وجہ کے بغیر شرافت نے دوسرے شخص کے کپڑوں کی تلاشی لی۔ اس سفر نے شرافت کی ساری شرافت چھین لی تھی اور اسے انسان سے اپنی بقا کی جنگ لڑنے والا حیوان بنا دیا تھا۔ اسے دوسرے شخص کی جینز ایک جگہ سے کچھ ابھری ہوئی اور سخت لگی۔ اس نے ایک جیبی چاقو کی مدد سے سلائی ادھیڑی تو اندر سے باریک پلاسٹک میں محفوظ امریکی ڈالرز برآمد ہوئے۔ ظاہر ہے یہ اس نے چھپا کے کسی ایمرجنسی کے لیے رکھے تھے۔ مرنے والے سے زیادہ اب شرافت کو ان کی ضرورت تھی کیونکہ وہ زندہ تھا اور زندہ رہنا چاہتا تھا۔ اس خفیہ خزانے کی دریافت نے شرافت کو دوسری پتلون کا جائزہ لینے پر مجبور کیا جو وہ خود پہنے ہوئے تھا۔ اس کی ایک ہپ پاکٹ میں بھی ڈالرز اسی طرح سے رکھے تھے۔ شاید وہی ایک ناتجربہ کار یا بے عقل مسافر تھا جس نے اجنبی دیس کی مسافرت میں اپنے لیے کوئی زادِ راہ نہیں لیا تھا۔

گنے بغیر اس نے سارے خزانے کو محفوظ کیا اور اپنے سامنے غیر آباد نظر آتے والے ساحلی جنگل میں گھس گیا۔ اس سفر کے تجربے نے اسے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ غیر قانونی طور پر امریکا میں داخل ہونے سے پہلے ان کو یہاں لانے والوں نے سب خطرات اور نقصانات سے باخبر کر دیا تھا۔ شرافت کو کسی نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ راستے میں دوسروں کی باتیں سن سن کر وہ جان گیا تھا کہ یہاں اس کی آزادی اور زندگی کو کس قسم کے خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔ اس کی خوش نصیبی تھی کہ سرحدی محافظوں کی نظر سے محفوظ رہا جو بعض اوقات دیکھتے

ہی سوال جواب کیے بغیر بھی گولی مار دیتے تھے۔ آبادیوں سے بچتا ہوا وہ رات کے وقت سفر کرتا رہا اور دوسرے دن ایک ایسے قصبے میں پہنچ گیا جہاں اسے سکھ نظر آئے۔ وہ اپنے حلیے سے نمایاں تھے۔ انڈین، پاکستانی اور جنوب مشرقی ایشیا کے دیگر باشندے ایک جیسے لگتے تھے۔ ان کے سانولے رنگ جیسے میکسیکو، اسپین اور کیوبا کے لوگ بھی تھے۔ افریقی بھی اور دیگر ایشیائی بھی۔

شرافت نے ایک سکھ ٹیکسی ڈرائیور کو روک کے اپنا مسئلہ بیان کیا۔ اگر وہ دردمند دل رکھنے والا نہ ہوتا تو اسی وقت شرافت کو پولیس کے حوالے کر دیتا۔ اس نے نہ صرف شرافت کی مدد کی بلکہ اسے قانون کی نظر سے محفوظ رہنے کے کارآمد گر بھی بتائے۔ اسی کے فون سے شرافت نے صوفیہ سے رابطہ کیا۔ اس نے کہا۔ ''صوفیہ! میں پہنچ گیا ہوں۔''

اس نے ایک ہذیانی چیخ بلند کی۔ ''او مائی گاڈ! کیا تم دروازے کے باہر موجود ہو؟''

''ابھی تو نہیں... لیکن آج کسی وقت ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم ساتھ ہوں۔''

''اوکے، ارے میں تو فرطِ جذبات سے بات بھی نہیں کر پا رہی۔ میرا دل کس زور سے دھڑک رہا ہے۔ بس اب میں تمہارا انتظار اور تمہارے استقبال کی تیاری شروع کرتی ہوں۔''

شرافت نے سردار جی کا شکریہ ادا کیا جو اسے بڑی عجیب قابلِ رحم نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ''دیکھ یارا آیاں دی لہور تو آئے سی... اپنے ماں پیو... پر اپن پہنچ لئے ولایت تیری طرح... سب پیچھے رہ گیا... میں تجھے تیری محبوبہ سے ملوانے تو نہیں لے جا سکتا... تیرے حق میں دعا کر سکتا ہوں کہ سوہنا رب تجھے تقدیر کے چکروں سے بچائے۔''

شاید اس سکھ نے کسی مصلحت کے تحت اسے خطرات سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ اب وہ خطرات کی دلدل میں کود چکا تھا تو جو نصیب میں ہوگا، خود ہی بھگت لے گا۔ کسی دھوکے فراڈ کے امکان سے اسے باخبر کرنے کا کیا فائدہ جو اپنا سب کچھ دھوکے بازوں کے ہاتھوں گنوا کے دربدر ہونے یہاں تک آ گیا ہو۔ شرافت اور کچھ دیر دل کو خوش کر لے کہ وہ منزلِ مراد تک پہنچ گیا ہے۔

اگلے دن دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے ایک چھوٹے سے قصبے میں قدم رکھا اور اس دروازے پر دستک دی جس کے دوسری طرف اس کے خوابوں کی تعبیر تھی۔ وہ صوفیہ کے حسن کی تجلی کے پہلے نظارے کے لیے بے تاب تھا مگر دروازہ ایک سیاہ فام موٹی عورت نے کھولا۔ ''یس... کیا چاہیے تمہیں؟''

''میرا نام شرافت حسین ہے اور میں پاکستان سے آیا ہوں... صوفیہ کو بتا دو۔''

موٹی سیاہ فام عورت مسکرائی تو اس کے سفید دانت چمکنے لگے۔ ''اندر آ جاؤ... وہ تمہارا انتظار کر رہی ہے۔''

شرافت اس کے پیچھے چلتا ہوا راہداری کے آخر میں ایک زینے سے اترا۔ اس زینے کا اختتام دوسرے دروازے پر ہوا۔ سیاہ فام عورت نے دستک دے کے کہا۔ ''تمہارا پاکستانی محبوب آ گیا ہے صوفیہ۔''

دروازہ کھلا اور شرافت کے اندر جاتے ہی پھر بند ہو گیا۔ اس نے اپنے سامنے ایک لمبی تڑنگی سنہری رنگ کے بالوں والی سفید عورت کو دیکھا جو کمر پر ہاتھ رکھے اسے بڑے معنی خیز انداز میں دیکھ رہی تھی۔ اس کی عمر چالیس سے اوپر تھی۔ شرافت رک گیا۔ ''صوفیہ... صوفیہ کہاں ہے؟'' اس نے خالی کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھا۔

''میں ہی صوفیہ ہوں... ڈاکٹر شرافت۔'' اس نے زہرخند سے کہا۔ ''کیا تمہیں مایوسی ہوئی؟''

کمرے کی عقبی دیوار کا ایک دروازہ کھلا اور دو لمبے چوڑے سیاہ فام دیوزاد نمودار ہوئے۔ ''آؤ ہم تمہیں تمہاری محبوبہ سے ملوائیں... کم آن۔'' انہوں نے ہکا بکا کھڑے ہوئے شرافت کو گھسیٹ لیا۔

اگلے روز اسے ایک بند ٹرک میں بہت دور کسی فارم پر شفٹ کر دیا گیا جہاں اس جیسے بہت سے غیر قانونی طور پر امریکا میں داخل ہونے والوں کو ایک بیگار کیمپ جیسی جگہ پر رکھا گیا تھا۔ اس بیگار کے بدلے جو ان سے لی جاتی تھی، انہیں اچھا رہنے اور کھانے کی سہولت حاصل تھی۔ فارم ہاؤس کی مالک عورت ان سب کو معمولی اجرت بھی دیتی تھی جو ان سب کے اکاؤنٹ میں جمع ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا وعدہ تھا کہ جس دن ان کے پاس اتنی رقم ہو جائے گی کہ وہ لوٹ کر اپنے گھر جانے کا کرایہ ادا کر سکیں، اس دن وہ انہیں واپس بھجوا دے گی اور تب تک انہیں جیل سے دور رکھے گی، ان کی حفاظت کرے گی... انہیں ہر قسم کی سہولت فراہم کرے گی۔ وہ فارغ وقت میں ٹی وی دیکھیں، گیم کھیلیں، باتیں کریں۔ چاہیں تو اپنی جمع پونجی میں سے خرچ کر کے پینے پلانے کے لیے کچھ منگوائیں اور دل چاہے تو کوئی عورت۔ آخر وہ یہ سب حاصل کرنے تو امریکا آئے تھے۔

کھوٹا سکہ

تنویر ریاض

زندگی میں ٹھہراؤ ہی کامیابی کی راہ ہے... مگر کچھ بے کل اور سیماب فطرت اس ٹھہراؤ و سکون کو موت تصور کرتے ہیں... ہلچل اور تھرل کے لیے وہ کچھ بھی... کہیں بھی کرنے کو تیار رہتے ہیں... جرم... اور محبت کے ملاپ سے جنم لینے والی ایک سنسنی خیز کہانی... کامیاب منصوبہ بندی کے باوجود ان سے ایک چوک ہو گئی...

ایک بیکار کھوٹے سکے کا کمال جو وقت پر کام آ گیا تھا

پیرونی نے جھک کر دونوں لاشوں کو دیکھا اور مضحکہ خیز انداز میں بولا۔ ''کیا تمہارا واسطہ روزانہ ان لوگوں سے پڑتا ہے؟''

''ہاں، یہ مردہ خانہ ہے اور یہاں لاشیں آتی رہتی ہیں۔ اس کے لیے وقت کی کوئی قید نہیں ہے۔'' سیلوڈی کوپا نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

پولیس آفیسر پیرونی کی عمر پچاس کے لگ بھگ ہوگی۔ وہ ایک لمبا چوڑا بدصورت شخص تھا۔ اس کے چہرے پر جا بجا

زخموں کے نشانات تھے اور بعض اوقات خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش میں ایسی باتیں کر جاتا کہ اس پر احمق ہونے کا شبہ ہونے لگتا۔ اس نے تیوری چڑھاتے ہوئے دونوں لاشوں کو دیکھا۔ ان میں ایک کھچڑی بالوں والا شخص تھا جس کی عمر لگ بھگ بیرونی کے برابر ہی ہوگی۔ اس کے جسم پر سیاہ رنگ کا سوٹ تھا جبکہ دوسرا بائیس سالہ دراز قد نوجوان تھا۔ اس کے چہرے پر جگہ جگہ چوٹوں کے نشان تھے اور وہ خاصا زخمی تھا۔ لگتا تھا جیسے موت سے قبل اس پر تشدد کیا گیا ہو۔ وہ گہرے سانولے رنگ کا تھا اور اس نے معمولی سی قمیص پتلون پہن رکھی تھی۔

بیرونی نے ایک بار پھر غور سے دونوں لاشوں کو دیکھا اور بولا۔ ”میرا مطلب ہے کہ تم نے ان کے پیروں کی طرف نہیں دیکھا۔“

ڈی کوپا کو اس کی دخل اندازی پسند نہیں آئی۔ اس نے بڑبڑاتے ہوئے اپنا کلپ بورڈ میز پر رکھا اور ماتھے سے پسینا پونچھنے لگا پھر اچانک ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ الماری کی طرف گیا اور دستانوں کا نیا جوڑا نکال کر پرانے دستانوں کی جگہ ہاتھوں پر چڑھانے لگا۔ وہ جولائی کی ایک گرم صبح تھی۔ نو بج چکے تھے۔ دن کا آغاز معمول کے مطابق ہوا تھا لیکن کچھ چیزیں مختلف نظر آرہی تھیں۔ مثلاً فارنسک ڈپارٹمنٹ کی سربراہ ٹیریسا لوپوکسی کانفرنس میں شرکت کرنے وینس گئی ہوئی تھی اور اس کی غیر موجودگی میں ڈی کوپا ہی لیبارٹری کی نگرانی کر رہا تھا جبکہ پولیس انسپکٹر لیو فالکونو بھی چھٹی پر تھا اور اس کے نائب نک کوستا کو ائرپورٹ پر کسی اہم کام کے سلسلے میں جانا پڑ گیا۔ لہٰذا بیرونی کو ہی ابتدائی تفتیش کے لیے مردہ خانے آنا پڑا۔ پیتھالوجسٹ ڈی کوپا اس کی غیر متاثر کن شخصیت سے بالکل بھی مرعوب نہ ہوا لیکن وہ اسے برداشت کرنے پر مجبور تھا۔ اس نے برہم ہوتے ہوئے کہا۔

”مجھے جزئیات میں الجھا کر پریشان مت کرو۔“

”میرے خیال میں جزئیات پر غور کرنا بہت ضروری ہے۔“ بیرونی نے جواب دیا۔ ”بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتیں بھی کارآمد ثابت ہوتی ہیں۔“ اس نے لڑکے کے خون آلود معمولی لباس پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”ان لاشوں کی شناخت ہو چکی ہے؟“

ڈی کوپا نے اپنے کلپ بورڈ پر نظر دوڑائی اور عمر رسیدہ شخص کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”جارج اسپیلون۔ عمر اکیاون سال۔ ممتاز ماہر نفسیات پیریولی میں واقع عالی شان ولا میں رہائش پذیر۔ اس کی لاش آج صبح دریا کے کنارے سے ملی۔ ممکنہ طور پر یہ خودکشی کا کیس لگتا ہے۔ اس کی بیوی کا کہنا ہے کہ وہ کچھ عرصے سے افسردہ نظر آرہا تھا۔“

”کیا ماہر نفسیات بھی خودکشی کر سکتا ہے؟“ بیرونی نے برجستہ کہا۔ ”اس کے لیے افسردگی دور کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ بستر پر لیٹ کر اپنے آپ سے باتیں کرے۔“

ڈی کوپا نے اسے گھور کر دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں۔

”اس کی لاش کہاں سے ملی؟“ بیرونی نے پوچھا۔

”ٹائبر آئی لینڈ کے ساحل پر۔“

”اس جگہ خودکشی کرنا ممکن نہیں، وہاں ہر وقت لوگ موجود ہوتے ہیں۔ میں نے گزشتہ تیس سالوں میں وہاں کسی خودکشی کے بارے میں نہیں سنا۔“

”ممکن ہے کہ اس نے کسی اور جگہ سے چھلانگ لگائی ہو اور اس کی لاش دریا کے بہاؤ کے ساتھ جزیرے کے ساحل پر پہنچ گئی ہو۔“ ڈی کوپا نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

”اس کی موت کب واقع ہوئی؟“ بیرونی نے پوچھا۔

”لاش تو خشک ہو گئی ہے۔“

”مجھے نہیں معلوم۔ میں بھی تمہارے ساتھ ہی یہاں پہنچا ہوں۔“ ڈی کوپا نے بیزاری سے کہا۔

بیرونی نے دوسری لاش پر نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔ ”اور یہ؟“

ڈی کوپا نے ایک بار پھر کاغذ پر نظر دوڑائی اور بولا۔ ”آئیون ڈنکو۔ عمر بائیس سال۔ چھوٹے درجے کا بدمعاش۔ کچھ عرصہ پہلے اپنے خاندان کے ساتھ رومانیہ سے ہجرت کر کے آیا تھا۔“

”چھوٹے درجے کا بدمعاش۔“ بیرونی نے زیرلب دہرایا۔ ”اس کے بارے میں اور کیا معلوم ہوا؟“

”وہ کیامینیو کے قریب واقع ایک کیمپ میں دوسرے خانہ بدوشوں کے ساتھ رہتا تھا۔ ہمیں یہ معلومات اس کے فنگر پرنٹ سے حاصل ہوئیں۔“

”ہاں۔“ بیرونی مسکراتے ہوئے بولا۔ ”ہم نے ان تمام مردوں، عورتوں اور بچوں کے فنگر پرنٹ لے رکھے ہیں جبکہ ان کا جرم اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ رومانیہ سے آئے ہیں۔“

”میں سیاست پر بات کرنا نہیں چاہتا۔“ ڈی کوپا نے ایک بار پھر بیزاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”معصوم اور بے گناہ لوگوں کے فنگر پرنٹ لینا اور ان کی تصویریں اتارنا۔۔۔ اسے تم سیاست کہتے ہو؟“

”کیا تمہارے پاس اور کوئی کام نہیں ہے؟“ ڈی کوپا نے جل کر کہا۔

”اس کا نام میں پہلے سے جانتا ہوں۔“ بیرونی نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”میں تم سے پہلے یہاں پہنچ گیا تھا۔ اس کا ریکارڈ دیکھنے سے معلوم ہوا ہے کہ یہ کبھی جیل نہیں گیا۔ البتہ دو مرتبہ اس پر جرمانہ ضرور ہوا کیونکہ اس نے بس میں سوار سیاحوں کے بیگ چرائے تھے۔ اسے ایک مرتبہ رومانیہ واپس بھیج دیا گیا، جن دنوں ان لوگوں کو یہاں سے بے دخل کیا جا رہا تھا۔ لیکن یہ دوبارہ آگیا۔ اس کے بعد وہ اس کا سراغ نہ لگا سکے۔“

بیرونی نے لاش کے خون آلود زخمی چہرے کو غور سے دیکھا اور بولا۔ ”اس کی موت کیسے اور کہاں واقع ہوئی؟“

ڈی کوپا نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”بیرونی! تم برسوں سے یہاں کام کر رہے ہو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جب کسی شخص کو مارا جائے تو اس کے چہرے کی کیا حالت ہو جاتی ہے۔ اس کی موت کب واقع ہوئی، اس بارے میں، میں کچھ نہیں بتا سکتا کیونکہ میری کرسٹل بال کی بیٹری ختم ہو چکی ہے۔“

”لگتا ہے کہ کسی طاقتور شخص نے اس کے چہرے پر گھونسے مارے ہیں۔“ پھر اس نے اسپیلون کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”دوسرے شخص کے سر پر بھی چوٹ کا نشان نظر آرہا ہے۔“

”یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔“ ڈی کوپا بولا۔ ”ممکن ہے کہ دریا میں کودتے وقت اس کا سر کسی بڑے پتھر سے ٹکرایا ہو۔ اس بارے میں تو پوسٹ مارٹم کے بعد ہی معلوم ہو سکے گا۔“

بیرونی نے جھک کر لاش کا معائنہ کیا اور بولا۔ ”اگر پتھر سے سر ٹکرایا ہوتا تو یہاں رگڑ کا نشان ہوتا۔ زیادہ گہری ضرب کی صورت میں سر پھٹ بھی سکتا تھا۔ اس کے سر پر سوجن ہے لیکن خون نظر نہیں آرہا۔“

”یوں لگتا ہے جیسے کسی نے پوری قوت سے ضرب لگائی ہو۔“ ڈی کوپا نے کہا۔

”یہ تو مجھے کچھ اور ہی کہانی لگ رہی ہے۔“

ڈی کوپا نے اپنے دونوں بازو سینے پر باندھ لیے اور بیزاری سے بولا۔ ”میں تمہیں کچھ بتانے کا پابند نہیں ہوں کیونکہ میری معلومات کے مطابق تمہارا اس کیس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ انسپکٹر ویری، اس بوڑھے کی بیوہ سے ملنے گیا ہے اور اس نے اپنا ایک ایجنٹ خانہ بدوشوں کے کیمپ میں بھیجا تھا لیکن کسی نے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ اگر ہمارے پاس فنگر پرنٹس اور تصویریں نہ ہوتیں تو اس کی شناخت بھی نہ ہو پاتی۔ ایجنٹ کا کہنا ہے کہ لڑکے کے باپ نے بھی کوئی تعاون نہیں کیا۔ لگتا ہے کہ یہ قتل آپس کی دشمنی کا نتیجہ ہے اور وہ لوگ ایک دو دن بعد خاموشی سے اس کی تدفین کر دیں گے۔“

”تم بھول رہے ہو کہ ہمارے درمیان ایک اصول طے شدہ ہے اور وہ یہ کہ تم پولیس کا کام نہیں کرو گے اور ہم تمہاری لاشوں کی چیر پھاڑ کے دوران۔۔۔۔ مداخلت نہیں کریں گے۔“

ڈی کوپا کو غصہ آگیا، وہ بولا۔ ”پھر تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ کیا تمہارے پاس کوئی اور کام نہیں ہے؟“

”آدمی کے پاس ہر وقت کوئی نہ کوئی کام ہوتا ہے جیسے میں اس وقت کچھ تلاش کر رہا ہوں۔“

”مجھے پریشان کرنے کے بجائے تم کہیں اور جا کر یہ کام کیوں نہیں کرتے؟“

”میں چاہتا ہوں کہ تم کام شروع کرنے سے پہلے ان کے موزے دیکھ لو۔“ بیرونی نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”ان میں کیا خاص بات ہے؟“ ڈی کوپا نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

بیرونی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور ٹرے میں رکھی قینچی اٹھا کر دونوں لاشوں کی پتلون کے پائنچوں کو سامنے سے کاٹ دیا۔ اب وہ دونوں ان لاشوں پر گھٹنے تک چڑھے ہوئے موزے دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کی دائیں ٹانگ پر ہلکے نیلے رنگ کا موزہ تھا اور اس پر کوئی نشان نہیں بنا ہوا تھا اور دوسرا سلیٹی رنگ کا تھا اور اس پر کسی کمپنی کا ٹریڈ مارک بنا ہوا تھا۔ نیلے موزوں کا کپڑا لڑکے کی جیکٹ اور پتلون کی طرح سستا اور باریک تھا جبکہ سلیٹی رنگ کے موزے نئے، مہنگے اور اونی تھے۔

”میں نے کبھی کسی لڑکے کو اس طرح کے موزے پہنے نہیں دیکھا۔“ بیرونی بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

”اس سے بھی زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ دونوں آدمیوں کی لاشیں ایک ہی صبح شہر کے مختلف مقامات سے ملیں اور انہوں نے ایک جیسے موزے پہن رکھے تھے۔“

”تم اس بارے میں کبھی نہیں جان سکو گے۔“ ڈی کوپا اسے طیش دلاتے ہوئے بولا۔

یبرونی نے جیب سے اپنا موبائل نکالا اور چاروں تانگوں کی تصویریں کھینچ لیں پھر وہ آگے بڑھا اور اس نے مضبوطی کے ساتھ اسیلون کے موزے کا اگلا حصہ پکڑتے ہوئے کہا۔ ''میں انہیں لیے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔''

پیتھالوجسٹ نے اسے شکایتی نظروں سے دیکھا اور ٹرے میں سے چھوٹی چمٹی اٹھا کر چاروں موزوں کو باری باری اتار کر الگ الگ پلاسٹک کے لفافوں میں رکھ لیا۔ پھر وہ دونوں غور سے ان موزوں کو دیکھنے لگے۔ سلیٹی موزوں پر میلان کی کسی کمپنی کا نشان بنا ہوا تھا اور وہ کافی قیمتی معلوم ہو رہے تھے جبکہ نیلے موزوں پر کسی کمپنی کا نام یا نشان نہیں تھا اور وہ سڑک پر لگے کسی اسٹال سے خریدے گئے معلوم ہو رہے تھے۔

''اگر یہ ایک ہی جیسے ہیں تو میں ان کا کپڑا چیک کر کے معلوم کر سکتا ہوں۔'' ڈی کونیا نے کہا۔ ''اس کے لیے مجھے دوپہر تک کا وقت چاہیے ہوگا۔''

''شکریہ۔'' یبرونی نے کہا اور اس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''یہ ٹھیک رہے گا۔''

☆☆☆

انسپکٹر ویری پچھلے مہینے ہی یہاں آیا تھا۔ اس میں وہ تمام خصوصیات تھیں جو تیزی سے ترقی کرنے کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ اس کے پاس معروف یونیورسٹیوں کی دو ڈگریاں تھیں پھر اس نے کچھ عرصے ایک بزنس اسکول میں بھی گزارا تھا۔ انسدادِ دہشت گردی، منظم جرائم اور مالی بے قاعدگیوں سے متعلق خصوصی کورس کر رکھے تھے۔ اس کی عمر تیس سال ہوگی۔ وہ میلان کا رہنے والا تھا اور وہیں کے لہجے میں بات کرتا تھا۔ اس کے جوتے ہمیشہ آئینے کی طرح چمک رہے ہوتے اور بالوں میں بھی سلیقے سے کنگھی کی ہوئی ہوتی تھی۔ قسمت سے اسے بیوی بھی ذہین، خوب صورت اور پڑھی لکھی ملی تھی۔ وہ مقامی ٹی وی کمپنی میں پروڈیوسر کے طور پر کام کر رہی تھی۔ ان سب باتوں کی وجہ سے وہ عام پولیس افسروں کے مقابلے میں بہت زیادہ اہمیت اختیار کر گیا تھا۔

اس روز بھی اس نے گہرے نیلے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ یبرونی کی شاید ہی اس سے پہلے کبھی ملاقات ہوئی ہو۔ اس نے مسکراتے ہوئے اپنا تعارف کروایا اور پوچھا کہ وہ اس کی کیا مدد کر سکتا ہے۔ ویری نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ وہ اپنے ساتھ میلان سے قابلِ اعتماد پولیس افسر لے کر آیا تھا اور ان کے ہوتے ہوئے کسی مقامی افسر کو اہمیت نہیں دیتا تھا۔

''تمہارے پاس اپنے یونٹ میں کوئی کام نہیں ہے؟'' اس نے یبرونی سے پوچھا۔

''بالکل ہے۔'' یبرونی نے خوش اخلاقی سے جواب دیا۔ ''لیکن بعض اوقات مقامی افسروں کی معلومات باہر سے آنے والے نئے افسران کے لیے مفید ثابت ہوتی ہیں۔''

ویری نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ اپنے فون کی اسکرین پر نظریں جمائے ہوئے تھا جس پر ایک خوب صورت ماڈل جلوے بکھیر رہی تھی۔

''میں موزوں کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔'' یبرونی بولا۔

انسپکٹر نے موبائل کا بٹن دبایا، اب وہ کوئی ای میل پڑھ رہا تھا۔ اس کے انہماک کو دیکھ کر یبرونی نے اندازہ لگایا کہ وہ ہر پیغام کو پڑھتا ہے، خواہ اس میں کچھ بھی لکھا ہو۔

ویری نے کمرے میں موجود دو آدمیوں کو کچھ احکامات دیے۔ وہ مقامی لوگ تھے اور یبرونی ان دونوں کو جانتا تھا۔ ان میں سے ایک نے سر ہلایا جبکہ دوسرا یبرونی کو گھورنے لگا۔

''میں موزوں کے بارے میں کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔'' یبرونی نے اپنا جملہ دہرا دیا۔ ''اگر تم اوپر مردہ خانے میں چلو تو میں وہ موزے دکھا سکتا ہوں۔ میری وضاحت سے بہتر ہے کہ تم خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔''

''میں یہ بات پسند نہیں کرتا کہ پولیس افسران فارنسک ڈپارٹمنٹ کے کام میں مداخلت کریں۔'' ویری نے فون پر سے نظریں ہٹائے بغیر تمکنت سے کہا۔

یبرونی اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ''یہ مداخلت نہیں بلکہ تعلق ہے جناب...''

''میں جانتا ہوں کہ ایک زمانے میں یہ عام رواج تھا جب پولیس آفیسر پوسٹ مارٹم کے دوران موجود رہا کرتے تھے لیکن میرے خیال میں یہ وقت کا زیاں ہے۔ جب فارنسک والوں کے پاس کوئی مفید بات ہوگی تو وہ ہمیں بتا دیں گے۔ اس دوران...''

اس نے اپنی بات یہیں ختم کر دی اور اپنے آدمیوں کو مختلف احکامات دینے لگا۔ وہ ان سے مختلف معلومات لے رہا تھا لیکن اس کی ساری توجہ اسیلون پر تھی۔ خانہ بدوش لڑکے کے بارے میں اس نے کوئی بات نہیں کی۔

''تم نہیں سمجھتے کہ اسیلون نے خودکشی کی تھی؟'' یبرونی نے پوچھا۔

''میں نہیں جانتا۔'' ویری نے تلخ لہجے میں جواب

دیا۔ ''اس بارے میں کوئی پیش بینی نہیں کی جا سکتی۔ اس کی بیوہ کا کہنا ہے کہ وہ کچھ عرصے سے پریشان نظر آ رہا تھا اور اکثر اوقات کئی دنوں کے لیے گھر سے غائب ہو جاتا تھا۔ میرے پاس اس کی بات پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اسیلون ایک معزز شخص تھا اور معاشرے میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ کئی اداروں کا بورڈ ممبر تھا اور سیاسی حلقوں میں بھی اس کی ایک شناخت تھی۔ ہم اس کی موت کی تحقیقات کر کے جلد ہی رپورٹ سامنے لے آئیں گے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ وہ ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔''

یبرونی سوچ رہا تھا کہ ویری کی باتوں میں کتنا تضاد ہے تاہم اس نے بحث کرنے کے بجائے اپنی بات ایک بار پھر دہرائی۔ ''میں بے حد ممنون ہوں گا اگر تم دو منٹ کے لیے اوپر چل کر وہ موزے دیکھ لو۔''

''کیا میرے کہنے کا تم پر کوئی اثر نہیں ہوا؟'' ویری تند لہجے میں بولا۔

''اس کے باوجود میں اپنی بات پر قائم ہوں۔''

ویری اسے نظر انداز کر کے دوسری جانب مڑ گیا اور فون پر کسی سے باتیں کرنے لگا۔

''اس لڑکے کے بارے میں کیا کہتے ہو؟'' یبرونی نے اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے بلند آواز سے کہا تاکہ انسپکٹر کی توجہ حاصل کر سکے۔

''جب اس کا باپ ہی یہاں آنے اور لاش کی شناخت کرنے پر آمادہ نہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ ہمیں اس وقت تک انتظار کرنا ہوگا جب تک وہ لوگ آپس میں صلاح مشورہ کر کے کوئی فیصلہ نہیں کر لیتے۔ بصورتِ دیگر ہم لاش کو لاوارث قرار دے کر اس کی تدفین کر دیں گے۔''

''تم معمولی درجے کے سپاہیوں کو وہاں بھیج کر ان سے کچھ معلوم نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے کسی سینئر اور تجربہ کار افسر کی خدمات حاصل کرنا ہوں گی۔''

ویری کی بھویں تن گئیں اور وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ''تم سمجھتے ہو کہ یہ کام بہتر طور پر کر سکتے ہو؟''

''ہاں بشرطیکہ تم مجھے وہاں بھیجنا چاہو۔''

''تم میرے لیے کام نہیں کرتے۔'' ویری نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ویسے بھی میں نوجوان افسروں کو ترجیح دیتا ہوں۔ یہ میرا مسئلہ ہے، تمہارا نہیں۔''

یہ کہہ کر وہ مڑا اور دوبارہ اپنے آدمیوں سے باتیں کرنے لگا۔ وہ ٹیلی فون کالز، ڈیٹا بیس، ویڈیو اور خفیہ معلومات کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ یبرونی کو بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ یہ لوگ ان کیسوں کی تفتیش کے سلسلے میں عمارت سے باہر قدم نہیں نکالیں گے بلکہ سارا دن فون سننے اور کمپیوٹر کے کی بورڈ پر انگلیاں چلانے میں گزار دیں گے اور پوسٹ مارٹم رپورٹ آنے کے بعد اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں گے۔ البتہ اگر یہ خودکشی کے بجائے قتل کے کیس ہوئے تو شاید دکھاوے کے لیے تھوڑی بہت بھاگ دوڑ کر لی جائے۔

وہ نڈھال قدموں سے اپنے کمرے میں آ گیا جہاں اس کے سوا کوئی نہ تھا۔ کرسیاں خالی اور ٹیلی فون خاموش تھا۔ اس نے کمپیوٹر آن کیا اور خالی اسکرین کو دیکھنے لگا۔ اس کے لیے یہ سب چیزیں نمائشی تھیں اور کام کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے اسے ان کی ضرورت برائے نام ہی پڑتی تھی۔ برسوں پہلے وہ بھی ویری کی طرح انسپکٹر ہوا کرتا تھا۔ اسی جیسا مغرور اور خود پسند بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ محکمے میں اس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی اور وہ جو کیس ہاتھ میں لیتا، اسے منطقی انجام تک پہنچا کر چھوڑتا۔ پھر اس کی زندگی ایک حادثے سے دوچار ہوئی جس کے نتیجے میں وہ اپنی ملازمت، فیملی اور دوستوں سے محروم ہو گیا۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ اسے پولیس میں دوبارہ ایک کم درجے کی ملازمت مل گئی اور اب وہ ایک ایجنٹ کے طور پر کام کر رہا تھا۔ پھر قسمت نے اس پر ایک اور مہربانی کی اور مردہ خانے کی انچارج ٹیریسا لوپو اس کی محبت کا دم بھرنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی اسے کوستا اور فالکونو جیسے دوستوں کی رفاقت بھی میسر آ گئی۔

وہ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو قائل کر سکا کہ اسے خود ہی ان معاملات کی چھان بین کرنی چاہیے۔ وہ جانتا تھا کہ فارنسک ٹیم مخصوص لگے بندھے انداز میں پوسٹ مارٹم کرتی ہے اور بیشتر اوقات جزئیات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس کی چھٹی حس بار بار کہہ رہی تھی کہ حقیقت وہ نہیں جو نظر آ رہی ہے یا پوسٹ مارٹم رپورٹ میں بیان کی جائے گی۔ اس کا ثبوت اس کی جیب میں تھا۔ وہ بڑی صفائی سے ویری کے ایک ساتھی کی میز پر سے وہ نوٹ پیڈ اٹھا لایا تھا جس پر مرنے والوں کے بارے میں ابتدائی معلومات درج تھیں۔ توقع کے مطابق آئیون ڈنکو کے بارے میں صرف ایک جملہ لکھا ہوا تھا جبکہ تین صفحات اسیلون اور اس کی بیوی ایوا کے تذکرے سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ پیریولی کے پوش علاقے میں رہتے تھے۔ یبرونی نے وہیں سے کام شروع کرنے کا فیصلہ کیا لیکن اس سے پہلے وہ کمپیوٹر سے کچھ باتوں کی تصدیق کرنا چاہ رہا تھا۔

☆☆☆

اس شاندار مکان کے در و دیوار سے شان و شوکت کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس تین منزلہ عمارت کی بیرونی دیواروں پر نارنجی رنگ کے پتھر لگے ہوئے تھے جبکہ کھڑکیوں کے چاروں اطراف رنگین ٹائلز لگائے گئے تھے۔ بیرونی گیٹ سے لے کر مکان تک جانے والے راستے کے دونوں اطراف درختوں کی قطار تھی اور پورچ میں دو قیمتی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ اس نے وہاں کھڑے ہو کر اسپورٹس کار کی کھڑکی کے شیشے سے جھانک کر دیکھا۔ پسنجر سیٹ پر کچھ میگزین پڑے ہوئے تھے۔ ان میں کچھ عورتوں کے فیشن سے متعلق تھے جبکہ ایک مردوں کی صحت کے بارے میں تھا اور اس کے ٹائٹل پر ایک باڈی بلڈر ٹائپ شخص کو ایکسر سائز مشین پر مشقیں کرتا دکھایا گیا تھا جبکہ دوسری کار کی سیٹ یا ڈیش بورڈ پر کچھ نہیں رکھا ہوا تھا۔ اس کی ظاہری حالت سے لگ رہا تھا کہ اسے کافی عرصے سے استعمال نہیں کیا گیا ہے۔

اس نے آگے بڑھ کر دروازے پر لگی گھنٹی بجائی تو ایک خادمہ سفید یونیفارم میں باہر آئی۔ وہ غیر ملکی لگ رہی تھی اور اس کا تعلق غالباً فلپائن سے تھا۔ اس کے سینے پر بائیں جانب ماریا لکھا ہوا تھا۔ بیرونی نے اپنا شناختی کارڈ اسے دکھاتے ہوئے کہا۔ ”میں جانتا ہوں کہ پولیس والے پہلے بھی یہاں آئے تھے لیکن مجھے اس سلسلے میں مادام اسپلون سے مزید کچھ سوالات کرنا ہیں۔“

”وہ یہاں نہیں ہیں۔“ خادمہ نے زمین پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔

”وہ کہاں مل سکتی ہیں؟“

”جم میں۔“ اس عورت نے جواب دیا تو بیرونی سوچ میں پڑ گیا۔ یہ کیسی عورت تھی جس کے شوہر کی لاش مردہ خانے میں پڑی ہوئی ہے اور وہ خود جم چلی گئی۔ خادمہ نے شاید چہرے کے تاثرات سے بیرونی کی سوچ کا اندازہ لگا لیا۔ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”مادام وہاں کام کرتی ہیں۔ یہ جم دونوں میاں بیوی کی مشترکہ ملکیت ہے۔ وہ لوگوں کو اسی بارے میں مطلع کرنے گئی ہیں۔“

”میں ایک چھوٹے سے کام کے سلسلے میں آیا تھا۔“ بیرونی سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”مجھے صرف ان کے بیڈ روم میں جا کر کپڑوں کا معائنہ کرنا ہے۔ اگر یہ کام نہ ہوا تو باس مجھے چھٹی نہیں دے گا۔“

خادمہ نے دروازہ کھول دیا اور وہ اس کے پیچھے پیچھے اندر چلا آیا۔ گھر کی اندرونی آرائش بہت خوب صورت تھی۔ دیواروں پر قیمتی تصاویر آویزاں تھیں اور راہداریوں میں جگہ جگہ مجسمے نصب تھے۔

”ان کا بیڈ روم کہاں ہے؟“ بیرونی نے پوچھا۔

”وہ دونوں علیحدہ علیحدہ کمروں میں سوتے تھے۔“ خادمہ نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کہا۔

پہلے وہ جس بیڈ روم میں داخل ہوئے، وہ بہت بڑا تھا اور اس کا سائز کسی بھی عام اپارٹمنٹ سے کم نہیں ہوگا۔ اس سے متصل ایک لاؤنج اور دو باتھ روم تھے۔ اس نے الماری کا دروازہ کھول کر دیکھا۔ وہاں قطار در قطار قیمتی ملبوسات لٹکے ہوئے تھے۔ شوہر کا کمرا مکان کے عقبی حصے میں واقع تھا جس کی ترتیب اور سجاوٹ پر برسوں سے توجہ نہیں دی گئی تھی۔

”مسٹر اسپلون کب سے اس کمرے میں رہ رہے تھے؟“

خادمہ نے ایک نگاہ بستر پر ڈالی جس پر کوئی شکن نہیں تھی۔ وہ نظریں جھکاتے ہوئے بولی۔ ”تقریباً دو ماہ قبل وہ اس کمرے میں شفٹ ہو گئے تھے۔“

بیرونی نے الماری کا دروازہ کھولا جہاں کئی قیمتی سوٹ، قمیصیں، پتلونیں، انڈر ویئر اور موزے وغیرہ موجود تھے۔ وہ سب اونی یا سوتی ملبوسات تھے اور ان میں کوئی بھی کم قیمت نہیں تھا۔

”لگتا ہے کہ مسٹر اسپلون لباس کے معاملے میں خاصا اہتمام کرتے تھے۔“ بیرونی نے کہا۔

”ہاں وہ معزز شخص تھے اور ان باتوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔“ خادمہ نے افسردہ لہجے میں جواب دیا۔

”تم ان کی اداسی کی وجہ جانتی ہو؟“

اس نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔ ”میں ایک خادمہ ہوں جناب۔ بہتر ہوگا کہ آپ یہ سوالات مالکن سے کریں۔“

بیرونی نے اس سے جم کا پتا لیا جو مرکزی شہر میں کیمپوڈی فیوری کے عقب میں واقع تھا۔ اسے وہاں تک پہنچنے میں پچیس منٹ لگ گئے۔ استقبالیہ پر ایک نوجوان لڑکی بالوں میں پونی ٹیل باندھے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ بیرونی نے اس پر ظاہر کیا جیسے وہ جم میں داخلہ لینے آیا ہے۔ لڑکی نے اسے ایک کتابچہ پکڑا دیا اور وہ سامنے والے صوفے پر بیٹھ کر اپنا پسینا خشک کرنے لگا۔ اس نے ایک نظر کتابچے پر ڈالی اور بولا۔ ”تمہاری فیس دیکھ کر تو میرے ہوش اڑ گئے۔“

لڑکی ایک ادا سے مسکراتے ہوئے بولی۔ ”ہم تعارفی فیس کے طور پر کافی رعایت دیتے ہیں بشرطیکہ تم داخلہ لینے میں سنجیدہ ہو۔“

”میں ہر کام سنجیدگی سے کرتا ہوں۔ ویسے یہاں کتنے لوگ کام کرتے ہیں؟“

”مجھ سمیت پندرہ اور ہم سب اپنے کام میں بہت ماہر ہیں۔“

”مجھے یقین ہے۔“ اس نے اپنا شناختی کارڈ دکھاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اس وقت میں مادام اسپلون سے ملنے آیا ہوں۔“

لڑکی نے انٹرکام پر کسی سے بات کی اور ایک کمرے کی جانب اشارہ کر دیا۔ وہاں ایوا اپنے دس آدمیوں کے ساتھ موجود تھی۔ ان میں سے ہر ایک لمبا تڑنگا اور مضبوط جسامت کا حامل تھا اور ان میں سے کسی کی بھی عمر تیس سے زیادہ نہیں تھی۔ ان سب کی ٹی شرٹس پر نام کڑھے ہوئے تھے۔ ان میں زیادہ تر غیر ملکی تھے۔ ایوا نے انہیں باہر جانے کا اشارہ کیا اور بیرونی کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”تم اطالوی معلوم نہیں ہوتے؟“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

”کچھ نہیں، بس میں یونہی جاننا چاہ رہی تھی۔“

وہ کسی طرح بھی پینتیس سال سے زیادہ کی معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ وہ پُرکشش جسم، سنہری بالوں کی حامل خوب صورت عورت تھی۔ بیرونی نے رسالوں میں ایسی عورتوں کی تصویریں دیکھی تھیں۔ عام زندگی میں کبھی ان سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اس کے چہرے سے بالکل نہیں لگ رہا تھا کہ وہ کچھ دیر پہلے روتی رہی ہے۔

بیرونی نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اس کی میز کے پیچھے دیوار گیر الماری میں بہت سی کتابیں اور میگزین ترتیب سے رکھے ہوئے تھے جبکہ میز پر دونوں میاں بیوی کی شادی کی فریم شدہ تصویر بھی ہوئی تھی۔ اس تصویر پر نظر ڈالنے سے اسے اندازہ ہو گیا کہ ان کی شادی کو چار پانچ سال سے زیادہ کا عرصہ نہیں گزرا۔

”میں تمہارے گھر گیا تھا۔ کچھ معلومات درکار تھیں۔ میرا خیال تھا کہ تم گھر پر مل جاؤ گی۔“

”یہ بھی جارج کا کاروبار ہے۔ ہم دونوں کی پہلی ملاقات اسی جگہ پر ہوئی تھی۔ اسی لیے تھوڑی دیر کے لیے یہاں چلی آئی تا کہ ان لوگوں کے ساتھ مل کر اپنا غم بانٹ سکوں۔“

”تم دونوں نے مل کر یہ کاروبار شروع کیا تھا؟“

”نہیں، یہ اس کی طرف سے شادی کا تحفہ تھا۔ وہ بہت ہی مہربان شخص تھا اور یہاں سبھی لوگ اسے بے حد چاہتے تھے۔ اسی لیے میں خود ان لوگوں کو بتانے چلی آئی کیونکہ وہ پچھلے کچھ دنوں سے افسردہ رہنے لگا تھا۔“

اس دوران بیرونی کی آنکھیں مسلسل اس کی شادی کی تصویر پر جمی رہیں۔

”تم کیا پوچھنا چاہ رہے ہو؟“ ایوا نے پوچھا۔

”کیا تمہارا شوہر بہت زیادہ نفاست پسند تھا؟“

ایوا پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔ ”میں کچھ سمجھی نہیں۔“

”میرا مطلب ہے کہ وہ اپنے لباس کے بارے میں بہت احتیاط رکھتا تھا۔ مثلاً یہ کہ اس نے کیسے کپڑے پہن رکھے ہیں اور وہ صاف ستھرے ہیں یا نہیں وغیرہ وغیرہ؟“

”ہاں بہت زیادہ۔“ وہ بولی۔

”تمہارا بہت بہت شکریہ۔“ بیرونی اٹھتے ہوئے بولا۔

”تم صرف یہی معلوم کرنے کے لیے یہاں آئے تھے؟“ وہ عورت حیران ہوتے ہوئے کہنے لگی۔

”میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لینا چاہتا۔ کیا تم کچھ دیر یہاں رکو گی؟ ممکن ہے کہ میرے باس کو مزید کچھ معلوم کرنے کی ضرورت پیش آ جائے۔“

”مجھے اپنے ایک دوست کے ساتھ لنچ پر جانا ہے۔ زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ ویسے یہاں دوسرے لوگ موجود ہیں۔ تم ان سے تدفین کے بارے میں بات کر سکتے ہو۔“

وہ سوچنے لگا کہ یہ کیسی عورت ہے۔ اس کے شوہر کی لاش مردہ خانے میں پڑی ہے اور یہ دوستوں کے ساتھ لنچ کرتی پھر رہی ہے۔

ایوا نے اسے اپنا بزنس کارڈ پکڑا دیا جس پر جم کے ساتھ اس کا ذاتی نمبر بھی موجود تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”ضرورت پڑنے پر تم ان نمبروں پر رابطہ کر سکتے ہو۔“

واپس آتے ہوئے وہ باکسنگ رنگ کے پاس رک گیا جہاں دو جسیم لڑکے مکا بازی کی مشق کر رہے تھے۔ بیرونی آگے بڑھ کر ایک شیشے کے دروازے کے سامنے رک گیا۔ یہاں اسٹیم باتھ لیا جاتا تھا۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔ اندر سے گرم ہوا کا جھونکا آیا۔ پورے کمرے میں بھاپ بھری ہوئی تھی۔ اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

”کیا تم بھی اسٹیم باتھ لینا چاہتے ہو؟“ کسی نے اس سے پوچھا۔

”کیا اندر پہلے سے کوئی موجود نہیں ہے؟“ بیرونی نے

سوال کیا۔
"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" وہ شخص قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ "لیکن میرا خیال ہے کہ اندر کوئی نہیں ہے۔ جمعرات کو یہاں کم لوگ ہی آتے ہیں۔"
"میرا خیال ہے کہ اسیلون بھی یہاں اکیلے ہی آتا ہو گا۔"
"ہاں۔۔۔۔۔۔" وہ شخص کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ دیکھنے میں وہ مشرقی یورپ کے کسی ملک کا باشندہ معلوم ہو رہا تھا۔ ممکن ہے کہ روسی ہو۔ "تم اپنے کپڑے اتارو اور اندر آجاؤ۔"
"شاید میں اگلے ہفتے آؤں۔" بیرونی نے ٹالتے ہوئے کہا اور عمارت سے باہر آگیا۔ دوپہر ہوگئی تھی اور اسے بھوک لگنے لگی تھی۔ اس نے سڑک کے کنارے ایک اسٹال سے برگر لے کر کھایا۔ اب اس کی گاڑی کا رخ رومانیہ کیمپ کی جانب تھا۔
اسے وہ جگہ تلاش کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ ہزاروں پناہ گزین سڑک سے ایک دو کلومیٹر کے فاصلے پر اپنی عارضی کالونیاں تعمیر کر لیتے ہیں جو عام طور پر پرانی لکڑیوں اور زنگ آلود لوہے کی چادروں اور پائپوں سے بنی ہوتی ہیں۔ ان گھروں میں سردی اور گرمی سے بچاؤ کا کوئی انتظام نہیں ہوتا۔ کئی سالوں سے اطالوی حکومت انہیں رومانیہ اور ہنگری کی سرحدوں کے پار دھکیلنے کی کوشش کر رہی ہے لیکن یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی سیلابی ریلے کو جھاڑو سے روکنے کی کوشش کی جائے۔
بیرونی کی کار جونہی کیمپ کے گیٹ پر پہنچی تو اسے بہت سے بچوں نے گھیر لیا جو ہاتھ پھیلائے اس سے بھیک مانگ رہے تھے، پھر ایک لمبا تڑنگا شخص اس بھیڑ کو چیرتا ہوا بیرونی کی جانب بڑھا۔ وہ غالباً کیمپ کا محافظ تھا۔ بیرونی نے اسے اپنا شناختی کارڈ دکھایا اور کہا کہ وہ آئیون ڈنکو کے باپ سے ملنا چاہتا ہے۔
"وہ یہاں نہیں ہے۔" اس شخص نے چھوٹتے ہی جواب دیا۔
بیرونی نے گہری سانس لے کر چاروں طرف دیکھا۔ کئی گھروں سے لوگ باہر نکل آئے تھے اور اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ ماضی میں کئی بار ان لوگوں سے نمٹ چکا تھا جو اتنا آسان نہ تھا۔ وہ لوگ الگ تھلگ زندگی بسر کرنے کے عادی تھے اور اپنے معاملات کے حل کے لیے پولیس سے مدد نہیں لیتے تھے۔

"اگر آئیون کی شناخت نہ ہوئی یا اس کا کوئی وارث سامنے نہیں آیا تو ہم خود ہی اس کی آخری رسومات ادا کر دیں گے۔ اگر تم لوگ یہی چاہتے ہو تو ٹھیک ہے لیکن یہ بات ذہن میں رکھو کہ یہ کام کسی فلاحی تنظیم کے سپرد کر دیا جائے گا اور اس کی آخری رسومات کیتھولک رسم و رواج کے مطابق ادا ہوں گی۔ اگر تم میں سے کوئی آنا چاہے۔۔۔"
داڑھی والا شخص خاموش کھڑا رہا۔
"اگر آئیون کا باپ اس وقت مجھ سے چند منٹ کے لیے بات کر لے تو میں تمہارے رسم و رواج کے مطابق آئیون کی تدفین کے لیے کہہ سکتا ہوں۔"
اپنی بات ختم کرنے کے بعد اس نے چند منٹ انتظار کیا پھر اسے کیمپ کے آخری سرے پر واقع ایک کوٹھڑی میں لے جایا گیا جہاں ایک چھوٹی سی پلاسٹک کی میز کے ساتھ ایک بوڑھا بیٹھا ہوا تھا اور اس کے پاس سے سستے تمباکو کی بو آرہی تھی۔
"تم کیا چاہتے ہو؟" آئیون کے باپ نے پوچھا۔
"یہی کہ تمہارے بیٹے کو کس نے قتل کیا؟"
"کیوں؟"
بیرونی نے کندھے اچکائے اور بولا۔ "کیونکہ یہ میرا کام ہے۔ کیا تم یہ جاننا نہیں چاہتے۔۔۔ کیا تمہیں انصاف نہیں چاہیے؟"
بوڑھے کی آنکھوں میں ایک عجیب طرح کی چمک نمودار ہوئی۔ اس نے بیرونی سے کہا۔ "میرے بیٹے کے قاتل کو تلاش کرو۔ انصاف میں خود کروں گا۔ وہ بہت اچھا لڑکا تھا۔"
بیرونی ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولا۔ "وہ جیبیں کاٹتا تھا۔ چھوٹا ہی سہی لیکن چور تو تھا۔"
"یہ بہت پرانی بات ہے۔" بوڑھا چلّایا۔ "اب وہ یہ سب کچھ چھوڑ چکا تھا۔"
"اب وہ مر چکا ہے اور میں اس کی موت کی وجہ جاننا چاہتا ہوں۔"
بوڑھا لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا پھر بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "یہاں سب ہم لوگوں سے نفرت کرتے ہیں۔"
"جب اسے جلاوطن کر دیا گیا تھا تو وہ واپس کیوں آیا؟"
"کیونکہ وہاں بھی سب ہم سے نفرت کرتے ہیں۔ کم از کم یہاں پر کام اور پیسا تو ہے۔"
"کیسا کام؟" بیرونی نے طنز سے کہا۔ "بس میں سوار

سیاحوں کا سامان اور پارک میں عورتوں کے پرس چرانا؟"
"نہیں۔"
"پھر وہ کیا کرتا تھا؟"
"واپس آنے کے بعد اس نے ڈرائیوری شروع کر دی۔ لوگ کہیں آنے جانے کے لیے اسے ہی بلاتے تھے کیونکہ وہ دوسروں کے مقابلے میں کم پیسے لیتا تھا۔ اس کے پاس اپنی کار تھی۔"
یہ ایک دلچسپ انکشاف تھا۔ بیرونی نے پوچھا۔ "وہ کار کہاں ہے؟"
"کچھ معلوم نہیں۔۔۔ وہ کل ایک سواری کو لے کر گیا تھا۔ پھر ایک باوردی پولیس والے نے مجھے اس کی موت کی اطلاع دی۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتا۔"
"اب میں تم سے ایک عجیب سوال پوچھوں گا۔ یہ بتاؤ کہ وہ کس قسم کے موزے پہنتا تھا؟"
بوڑھا اسے گھورتے ہوئے بولا۔ "یہ کس قسم کا مذاق ہے؟"
"میں مذاق نہیں کر رہا بلکہ اس سوال کا تمہارے بیٹے کے قتل سے گہرا تعلق ہے۔ وہ کس سائز کے موزے پہنتا تھا۔۔۔ لمبے، چھوٹے یا درمیانے؟"
آئیون کے باپ نے اپنی پتلون کا پائنچہ اوپر اٹھایا۔ اس نے بھی گھٹنوں تک موزے چڑھائے ہوئے تھے اور بولا۔
"وہ بھی اسی طرح کے موزے پہنا کرتا تھا۔ ہم آپس میں بدل بدل کر موزے بلکہ قمیصیں بھی پہنا کرتے تھے۔"
"ٹھیک ہے۔" بیرونی سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "مجھے کوئی ایسا طریقہ بتاؤ جس کے ذریعے میں تم سے رابطے میں رہوں۔"
اس بوڑھے نے اپنی جیب سے ایک کارڈ نکال کر اسے پکڑا دیا۔ اس پر لکھا ہوا تھا۔ "ڈیلکس کیا مینیو، لیموزین سروس۔" اور اس پر دو موبائل نمبروں کے علاوہ ایک تصویر بھی چھپی ہوئی تھی جس میں ایک لڑکا مرسیڈیز کار کے پاس کھڑا مسکرا رہا تھا۔
"اس میں پہلا فون نمبر آئیون کا اور دوسرا میرا ہے۔" بوڑھے نے کہا۔ بیرونی نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنی کار کی جانب چل دیا۔
شہر میں داخل ہونے کے بعد اس نے اپنی کار کیمپوڈی فیوری کے باہر پارک کی اور اپنے دفتر کا نمبر ملایا۔ اس وقت پرنزویلی ڈیوٹی پر موجود تھا۔ وہ گزشتہ تیس برسوں سے اسے جانتا تھا۔ بیرونی نے کہا۔ "اگر میں تم سے کہوں کہ بیس منٹ کے اندر پانچ جوان کیمپوڈی فیوری کے قریب ایک پتے پر بھیج دو تو کیا تم اس کی وجہ جاننے کی کوشش کرو گے؟ کیونکہ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔"
کچھ دیر خاموشی چھائی رہی پھر دوسری جانب سے جواب آیا۔ "ہمارے آدمی ہر وقت اس علاقے میں موجود رہتے ہیں لیکن پھر بھی مجھے انہیں بتانا ہوگا کہ انہیں کس مقصد کے تحت وہاں بھیجا جا رہا ہے۔"
بیرونی نے اسے تمام صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے بعد ایوا کا نمبر بھی دے دیا اور کہا۔ "اس وقت مسٹر ویری کسی دوسرے کام میں مصروف ہیں۔ بہتر ہوگا کہ فی الحال انہیں کچھ نہ بتایا جائے۔"
"جانتا ہوں۔" پرنزویلی نے کہا۔ "اگر وہ مصروف ہو تو کسی قسم کی دخل اندازی پسند نہیں کرتا۔"
رابطہ ختم کرنے کے بعد بیرونی نے ان نوٹس پر ایک نگاہ ڈالی جو اس نے صبح کمپیوٹر کی مدد سے بنائے تھے۔ اس میں تمام تفصیلات درج تھیں۔ جم کے راستے میں ایک اسٹیشنری کی دکان تھی۔ بیرونی نے وہاں سے کچھ ضروری اشیا خریدیں اور جم کی طرف روانہ ہوگیا۔ چار بجے کے قریب وہ استقبالیہ کاؤنٹر پر پہنچا اور لڑکی سے بولا۔
"میں پھر آگیا۔"
"مادام ایوا ابھی تک لنچ سے واپس نہیں آئیں۔"
لڑکی چیونگم چباتے ہوئے بولی۔ بیرونی نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی اور جم کا جائزہ لینے لگا۔ اس وقت وہاں ایک موٹا شخص موجود تھا جو بائیسکل چلاتے چلاتے پسینے میں شرابور ہو چکا تھا اور اس کے حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکل رہی تھیں۔ باکسنگ رنگ کے گرد بھاری جسامت والے باکسرز موجود تھے۔ ان میں سے دو نے باکسنگ کا لباس پہن رکھا تھا اور رنگ میں اترنے کی تیاری کر رہے تھے۔ بیرونی نے دونوں ہاتھوں سے تالی بجائی تو سب کی نگاہیں اس کی جانب اٹھ گئیں۔ اس نے اپنا پولیس کارڈ فضا میں لہرایا اور رعب دار آواز میں انہیں ایوا کے دفتر میں جمع ہونے کا حکم دیا۔
جب وہ سب اس کمرے میں پہنچ گئے تو وہ ان سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "یہ ایک معمول کی سادہ سی کارروائی ہے۔ میں چاہتا ہوں۔۔۔"
یہ کہہ کر اس نے کھانسنا شروع کر دیا اور کافی دیر تک کھانستا رہا۔ کمرے میں موجود تمام افراد پریشانی کے عالم

میں اسے دیکھنے لگے۔

"سوری۔" وہ رومال سے پسینا پونچھتے ہوئے بولا پھر اس نے ایک گہرے سلیٹی رنگ کا کاغذ نکالا جو اس نے اسٹیشنری کی دکان سے خریدا تھا پھر نیلے پین سے اس پر جلی حروف میں ایک لفظ لکھ دیا۔

"کیا تم میں سے کوئی کبھی اس جگہ گیا ہے؟"

پھر اس نے وہ کاغذ سب کو دکھایا۔ ان میں سے آٹھ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ البتہ ان میں سے ایک جس کی قمیص پر ولادمیر کڑھا ہوا تھا، بولا۔ "کئی سال پہلے روس گیا تھا۔"

"یقیناً تمہیں وہاں بہت مزہ آیا ہوگا۔"

ان میں صرف ایک شخص ایسا تھا جس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ان سب میں لمبا چوڑا تھا۔ اس کی ناک چپٹی اور آنکھیں نیم وا تھیں۔ اس کا سینہ پسینے اور تیل سے بھیگا ہوا تھا۔ اس کی سرخ سائن کی قمیص پر اس کا نام کڑھا ہوا تھا۔ بیرونی نے اس کی جانب دیکھا اور بولا۔ "سوان۔"

"تم اپنا سوال دوبارہ دہراؤ؟"

بیرونی نے وہ کاغذ اس کے سامنے کر دیا۔ اس نے گھبرا کر اسے دیکھا پھر اس کی نظریں اِدھر اُدھر بھٹکنے لگیں۔

"باقی لوگ چلے جائیں۔" بیرونی نے حکم صادر کیا۔ اس دوران اس کی نظریں ایک لمحے کے لیے بھی اس شخص پر سے نہیں ہٹیں۔ جب باقی لوگ چلے گئے تو بیرونی نے کہا۔ "تم سوئیڈش ہو؟"

"نہیں، فن لینڈ کا رہنے والا ہوں۔"

"ایوا بھی وہیں سے آئی ہے۔ کیا یہ اتفاق نہیں ہے؟"

اس شخص نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بیرونی نے اس پر ایک نظر ڈالی اور بولا۔ "میری بیٹی چار سال کی تھی کہ اس کی آنکھوں میں تکلیف شروع ہوگئی۔ وہ کلر بلائنڈ ہوگئی تھی۔ اس میں رنگوں کی پہچان نہیں رہتی۔ لیکن بروقت علاج سے وہ ٹھیک ہوگئی۔ اس دوران میری ڈاکٹروں اور نرسوں سے جو گفتگو ہوئی، اس وجہ سے میں اس بارے میں بہت کچھ جان گیا۔"

یہ کہہ کر اس نے جیب سے نوٹ پیڈ نکالا جو اس نے صبح ویری کے آدمی کی میز پر سے اٹھایا تھا اور بولا۔ "بہت سے لوگ رنگوں میں تمیز نہیں کر سکتے اور انہیں بعض اوقات سیاہ اور نیلے کا فرق بھی نظر نہیں آتا۔"

"تم یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہو؟"

"اس لیے کہ میں تمہارے ہی بارے میں بات کر رہا ہوں۔ اب یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ یہ سب کچھ کس طرح پیش آیا ہوگا۔ ایوا کچھ عرصے سے تمہاری دیوانی ہو رہی تھی۔ وہ اپنا بیشتر وقت تمہارے ساتھ گزارتی اور یہی کہا کرتی کہ کاش وہ اور تم مل کر جم چلاتے اور اس کی آمدنی سے جارج کا کوئی تعلق نہ ہوتا۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ جارج اسے کبھی طلاق نہیں دے گا۔ ادھر اس کے شوہر کو بھی تم دونوں کے تعلق کی کچھ سن گن مل گئی تھی اور وہ خاصا پریشان رہنے لگا تھا۔ اسی وجہ سے اس نے اپنا کمرا بھی علیحدہ کر لیا تھا اور دونوں میاں بیوی الگ الگ کمروں میں سو رہے تھے۔"

بیرونی کی زبان سے یہ کڑوا سچ سننے کے بعد سوان کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے لیکن بیرونی نے اپنی بات جاری رکھی۔ "تم دونوں نے جارج کو راستے سے ہٹانے کا منصوبہ بنایا۔ اب تمہیں صرف یہ انتظار کرنا تھا کہ وہ کب اسٹیم باتھ لینے جم آتا ہے۔ تمہیں ہاتھوں پر دستانے چڑھا کر اس کے سر اور چہرے پر بھاری ضرب لگانا تھی پھر تمہیں اس کی لاش کو دریا میں بہا دینا تھا۔ ایوا سب لوگوں سے یہی کہتی کہ وہ کچھ عرصے سے مایوس اور افسردہ رہنے لگا تھا چنانچہ اس نے دریا میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی۔ پولیس والے اس کے بیان پر یقین کر لیتے اور تمہارا منصوبہ کامیاب ہو جاتا۔"

سوان نے اپنا پسینا صاف کیا اور نظریں نیچی کر کے فرش کی جانب دیکھنے لگا۔

"میرا اندازہ ہے کہ ایوا کے خیال میں بھاپ گھر اس مقصد کے لیے انتہائی مناسب تھا۔ پورے کمرے میں پھیلی ہوئی بھاپ کی وجہ سے کسی کو کچھ نظر نہیں آتا اور تمام ثبوت مثلاً پسینا اور خون وغیرہ پانی کے ساتھ بہہ جاتے۔ جس رات جارج اسپیلون نے اسٹیم باتھ کا پروگرام بنایا تو چھوٹی گاڑی ایوا لے گئی تھی اور بڑی گاڑی میں بیٹھ کر وہ روم کی تنگ سڑکوں پر سفر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ اس کی خادمہ نے آئیون کو فون کر کے بلایا۔ وہ آئیون کو پسند کرتا تھا اور کئی مرتبہ اس کی کار میں پہلے بھی سفر کر چکا تھا۔ آئیون بھی اس کی نظر بچا کر اندر چلا گیا اور جب تم ہاتھوں پر دستانے چڑھا کر جارج اسپیلون کے سر پر ضرب لگا رہے تھے تو وہ وہیں بھاپ کی دھند میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا اور جب تمہاری نظر اس پر گئی تو تم نے اسے بھی ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا اور اس نے سوان کے دستانے کھول دیے۔ اس کی انگلیوں کے جوڑ پر کٹ کے نشان نظر آ رہے تھے۔ پھر اس نے غور سے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ دائیں گال کی ہڈی کے پاس خراش نظر آ رہی تھی۔ وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "ادھیڑ عمر جارج کو زیر کرنا تم جیسے بدمعاش کے لیے کوئی مشکل نہ تھا لیکن آئیون نے ضرور کوئی

مزاحمت کی ہوگی لیکن وہ تمہارے مقابلے میں کم عمر تھا۔ اس لیے تم اسے بھی مغلوب کرنے میں کامیاب ہوگئے۔"

"یہ سب بکواس ہے۔" سوان بڑبڑایا۔

"یہ حقیقت ہے۔" بیرونی نے کہا۔ "اب تمہیں ان لاشوں کو ٹھکانے لگانا تھا۔ دونوں برہنہ حالت میں تھیں۔ تمہارے لیے ان کو لباس پہنانا بھی ایک مشکل مرحلہ ثابت ہوا ہوگا۔ ایوا اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی۔ تمہیں ہی انہیں وہاں سے نکالنا تھا۔"

اس نے لمحہ بھر کے لیے توقف کیا پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "تم نے آئیون کی جیب سے اس کی کار کی چابیاں نکال لیں۔ دونوں لاشوں کو کار میں ڈالا۔ جارج کی لاش کو دریا کے سپرد کیا اور آئیون کی لاش کو نائٹ کلب کے عقب میں کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیا تاکہ دیکھنے والے یہی سمجھیں کہ وہ جھگڑے کے دوران مارا گیا۔"

"بکواس۔" سوان نے ایک بار پھر کہا۔

"یہاں تمہاری آنکھوں کی تکلیف کی وجہ سے مسئلہ ہو گیا۔ تمہیں ان دونوں لاشوں کو کپڑے پہنانے تھے۔ گرمی بہت زیادہ تھی اور تم خوف زدہ تھے۔ تمہیں اکیلے ہی یہ کام کرنا پڑ رہا تھا۔ ان دونوں نے مختلف رنگوں کے موزے پہن رکھے تھے لیکن تمہیں یہ نظر نہیں آیا اور تم نے ان کی ایک ٹانگ میں نیلا اور دوسری ٹانگ میں سلیٹی موزہ چڑھا دیا۔"

اس نے اپنی جیب سے فون نکالا اور سوان کو وہ تصویر دکھائی جو اس نے صبح کھینچی تھی اور جس میں دونوں لاشوں کی ٹانگوں پر مختلف رنگوں کے موزے تھے۔

یہ کہہ کر اس نے فون جیب میں رکھ لیا اور بولا۔ "اب تمہیں جیل جانے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ تم پر دہرے قتل کا الزام ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ اب تم سب کچھ سچ سچ بتا دو۔ تم ہر ایک کو بتا دو کہ ایوا نے تمہیں کس طرح اس کام کے لیے تیار کیا۔ ورنہ ہم خود معلوم کر لیں گے۔ کیا تم اپنے آپ کو پہلا شخص سمجھتے ہو جس پر ایوا مہربان ہوئی؟ ہم دوسرے لوگوں سے بھی بات کریں گے لیکن اگر اس وقت تم نے ہماری مدد کی تو سزائے موت سے بچ سکتے ہو۔"

سوان نے اسے زور کا دھکا دیا اور سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔ بیرونی نے بھی اس کا تعاقب کیا۔ جب وہ سیڑھیوں سے نیچے اترا تو اس نے دیکھا کہ سوان گرفتار ہو چکا ہے۔ اس کے بلائے ہوئے آدمیوں نے مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے حراست میں لے لیا تھا۔ بیرونی نے ویری کا نمبر ملایا اور بولا۔ "اچھی خبر یہ ہے کہ جارج اور آئیون کی موت کا معما حل ہوگیا ہے۔ اب تم بھی اپنے بلیک بیری کی جان بخش دو اور کمرے سے باہر نکل کر ٹہل لگاؤ۔"

پرنزویلی وہاں سات آدمیوں کے ساتھ موجود تھا۔ بیرونی نے جیب سے نکٹس کا پیکٹ نکالا اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "میں نے پانچ آدمیوں کے لیے کہا تھا اور تمہارے آنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔"

"یہ جگہ میرے گھر کے راستے میں ہے۔ شفٹ ختم کر کے جا رہا تھا، یہاں اس خیال سے رک گیا کہ شاید میری ضرورت پیش آ جائے۔"

ابھی اس کا جملہ ختم ہی ہوا تھا کہ ایوا اسپیلون دو لیڈی کانسٹیبل کے ہمراہ آتی دکھائی دی۔

"یہ اس کی بیوی ہے؟" پرنزویلی نے قیاس آرائی کی۔

"یہ شمال سے آئی ہوئی ملکہ ہے۔" بیرونی نے طنزاً کہا۔

چند لمحوں بعد ہی ایک سیلون کار پولیس وین کے عقب میں آ کر رک گئی۔ اس میں سے انسپکٹر ویری اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ برآمد ہوا۔ بیرونی نے اس افسر کی طرف دیکھا جو سوان کو پکڑے کھڑا تھا۔ اس نے اسے اشارہ کیا کہ وہ سوان کو ذرا فاصلے پر لے جائے لیکن ایوا کو دیکھتے ہی سوان نے ٹوٹی پھوٹی اطالوی زبان میں چلّانا شروع کر دیا۔ "یہ اسی کا منصوبہ تھا۔"

بیرونی اس کے قریب آ کر انسپکٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "یہ بات تم اسے بتاؤ۔"

اتنی دیر میں ایوا بھی اس کے قریب آ چکی تھی۔ اس نے سوان کی بات سن لی اور چلّاتے ہوئے بولی۔ "شٹ اپ۔"

پھر اس نے بیرونی کی طرف دیکھا اور اسے گالیاں دینا شروع کر دیں۔ وہ جس زبان میں بول رہی تھی، اس کا ایک لفظ بھی بیرونی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اس نے اپنا فون نکالا اور اس کی گفتگو ریکارڈ کرنا شروع کر دی۔ جب وہ خاموش ہوگئی تو اس نے ریکارڈنگ بٹن آف کر دیا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا پولیس وین کی طرف آیا۔ اس نے وہاں کھڑے ہوئے پولیس افسروں سے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ ان دونوں کو علیحدہ علیحدہ کوٹھڑیوں میں رکھا جائے۔ ان کے درمیان کوئی رابطہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ مجھے ایک ترجمان بھی چاہیے..."

انسپکٹر ویری اچانک سامنے آ گیا اور مداخلت کرتے ہوئے بولا۔ "تمہیں احکامات صادر کرنے کا کوئی حق نہیں۔ انسپکٹر میں ہوں۔"

بیرونی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا۔ "بالکل۔" پھر وہ دوسرے لوگوں سے مخاطب ہوتے ہوئے

بولا۔ ''انسپکٹر چاہتا ہے کہ ان دونوں زیرِ حراست ملزمان کو الگ الگ رکھا جائے۔ ایک ترجمان کا بندوبست کیا جائے۔ فارنسک والوں کو بلا کر اس جگہ کو سیل کر دیا جائے۔ یہاں سے کچھ نہ کچھ شواہد ضرور مل سکتے ہیں۔ اس جم کا بینک اکاؤنٹ اور سارا ریکارڈ بھی چیک کیا جائے۔'' پھر اس نے جیب سے آئیون کا کارڈ نکالا اور بولا۔ ''اس کے پاس پرانی مرسیڈیز کار بھی جسے وہ غیر قانونی طور پر ٹیکسی کے طور پر استعمال کیا کرتا تھا۔ اسپیلون بھی اس کے گاہکوں میں شامل تھا اور اس رات خادمہ نے جم جانے کے لیے آئیون کو فون کر کے بلایا تھا۔ اب ہمیں اس کار کو تلاش کرنا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ ہمیں نائٹ کلب کے آس پاس ہی مل جائے گی۔''

پھر اس نے ویری کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''کچھ اور پوچھنا ہے؟''

اس نے کوئی جواب نہ دیا تو بیرونی نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ میری شفٹ ختم ہونے والی ہے اور ویسے بھی میں نے ابھی تک لنچ نہیں کیا ہے۔''

''میرے ساتھ آؤ۔'' ویری اس کا بازو پکڑتے ہوئے بولا۔

وہ اسے ایک طرف لے گیا اور بولا۔ ''مجھے ساری تفصیل بتاؤ۔''

بیرونی نے اسے مختصراً دن بھر کی کارروائی سے آگاہ کیا اور بولا۔ ''ان کے موزے دیکھ کر مجھے شک گزرا اور میں نے ان خطوط پر سوچنا شروع کر دیا۔ پھر جارج کی خادمہ اور آئیون کے باپ سے مل کر مجھے یقین ہو گیا کہ ان دونوں میں کوئی نہ کوئی تعلق ضرور تھا اور اسی نکتے کو ذہن میں رکھ کر میں جم گیا اور وہاں ساری بات صاف ہو گئی۔ تم بہت دیر سے آئے لیکن ان لوگوں کے اعترافی بیانات حاصل کرنے کے بعد تمہیں چالان بنانے میں آسانی رہے گی۔ یہ تمہارا کیس ہے اور تمہیں ہی اس کا کریڈٹ ملنا چاہیے۔ تم سب پر یہی ظاہر کرو گے کہ تم ہی نے مجھے آئیون کے باپ کے پاس بھیجا تھا۔''

اس نے ویری کو نوٹ پیڈ، فون اور پولیس کار کی چابیاں دیتے ہوئے کہا۔ ''میں نے یہ نوٹ بک تمہارے آدمی کی میز سے اٹھائی تھی۔ کسی ترجمان کی مدد سے تم اس فون میں ہونے والی گفتگو سن سکتے ہو۔ اب مجھے اجازت دو لیکن میری ایک بات یاد رکھنا کہ بلیک بیری، کمپیوٹر اور پوسٹ مارٹم رپورٹ پر انحصار کرنے سے زیادہ بہتر ہے کہ جزئیات پر توجہ دی جائے۔ اسی کیس میں دیکھ لو۔ اگر میری نظر موزوں پر نہ جاتی تو تم ابھی تک اندھیروں میں بھٹک رہے ہوتے اور کوئی نہ جان پاتا کہ ایوا اور سوان نے بے چارے اسپیلون کو راستے سے ہٹانے کے لیے کیا منصوبہ بنایا تھا لیکن میرے ذہن میں شروع سے ہی یہ بات کھٹک رہی تھی کہ ایک سائیکاٹرسٹ اور معمولی حیثیت رکھنے والے لڑکے کے موزے ایک جیسے کیونکر ہو سکتے ہیں اور یہی تجسس اس عقدے کو حل کرنے کا سبب بنا۔''

ویری نے پُرجوش انداز میں اس کا کندھا تھپتھپایا اور بولا۔ ''میں تمہاری یہ نصیحت ہمیشہ یاد رکھوں گا لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آرہی۔''

''وہ کیا؟''

''تم سوان تک کیسے پہنچے؟ وہاں اور بھی باکسر ہیں پھر تم نے اس پر ہی کیوں شک کیا؟''

''اس کی ابتدا خادمہ کے بیان سے ہوئی۔ جب اس نے بتایا کہ جارج اور ایوا تقریباً دو ماہ سے الگ الگ کمروں میں سو رہے تھے اور ایوا نے مشہور کر رکھا تھا کہ جارج افسردہ اور اداس رہنے لگا ہے... میں نے اس پر غور کیا تو مجھے بظاہر اس افسردگی اور اداسی کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ خاصا خوش حال اور معزز شخص تھا پھر اس کے کام کی نوعیت ایسی تھی جس میں کسی قسم کے ذہنی دباؤ کا کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ افسردہ اور اداس ہونے کی صورت میں کوئی شخص بیوی سے دوری اختیار نہیں کرتا۔ پھر ایوا کی غیر موجودگی سے بھی میرا ماتھا ٹھنکا۔ اس عورت کے شوہر کی لاش مردہ خانے میں پڑی ہوئی تھی اور وہ اپنے معمول کے مطابق جم چلی گئی۔ جب میں وہاں پہنچا تو اس نے بتایا کہ وہ اپنے کسی دوست کے ساتھ لنچ پر جا رہی ہے۔ اسی وقت مجھے یقین ہو گیا کہ ایوا اور سوان کے درمیان کوئی تعلق ہے۔ جارج کو اس کا پتا چل گیا تھا اور اس کی افسردگی کی یہی وجہ تھی۔ پھر جب میں نے تمام لوگوں کو ایوا کے دفتر میں جمع کیا تو سوان کی باڈی لینگویج نے میرے شک کو یقین میں بدل دیا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ سوان، فن لینڈ کا رہنے والا ہے۔ ایوا کا تعلق بھی وہیں سے ہے اور گرفتاری کے بعد ایوا نے جو بکواس کی، وہ بھی اسی زبان میں ہے۔ جب تم اس کا ترجمہ سنو گے تو سب کچھ واضح ہو جائے گا۔''

ویری بڑے ادب و احترام سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس پر اس حقیقت کا ادراک ہوا کہ کبھی کسی چھوٹے آدمی کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیے۔ بعض اوقات کھوٹا سکہ بھی کام آجاتا ہے۔

حساب بے باق

کاشف زبیر

مسکراہٹیں اور قہقہے اب زندگی سے دور ہوتے جارہے ہیں... مگر آپ کے پسندیدہ کردار جلیل میاں کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ اپنی حرکات و سکنات سے آپ کے لبوں پر تبسم بکھیرتے رہیں... اس دفعہ بھی وہ اپنے آپ کو ریاضی کے اعداد و شمار میں الجھا بیٹھے ہیں... دوستوں اور دشمنوں کے دوست کی نئی چال بازیاں...

حساب دوستاں میں خساروں کے سودے کا دلچسپ احوال

مجھے دیکھ کر مرزا کی وہی حالت ہوئی تھی جو کسی بے فکرے ڈاکو کی کامیاب ڈاکے کے بعد کسی فرض شناس پولیس والے کو دیکھ کر ہوتی ہے یا استاد جانی عرف جانی چڑیا کی افریقا کا آدم خور ببر شیر دیکھ کر ہو سکتی تھی۔ مرزا نے نہایت کامیاب واردات کے بعد یقیناً خود کو شاباشی دی ہوگی کہ وہ کس طرح بیک وقت راجا جیسے گدھے اور جمی جیسے موٹی عقل والے کو چونا لگا کر تو دو گیارہ ہونے میں کامیاب رہا۔ لیکن وہ مجھے بھول گیا تھا اور بدقسمتی سے غلط موقع پر میرے سامنے آگیا تھا۔

"جلیل تُو؟" مرزا نے یوں کہا جیسے اس نے میری جگہ ملک الموت کو دیکھ لیا ہو۔

"کیوں کیا ہوا میرے یار؟" میں نے مرزا کا بازو دبوچ کر کہا کیونکہ اس کا کچھ پتا نہیں تھا، وہ مجھے دیکھ کر ریس لگا دیتا تو میں اس کے پیچھے دوڑ بھی نہیں سکتا تھا۔ خلیل کی ناخلف بلی کو لات مارنے کی کوشش میں میرا پاؤں دیوار سے جا لگا تھا اور میں نے ایک پاؤں پر ناچتے ہوئے بلی کو وہ گالیاں دی تھیں جو میں نے کبھی راجا کو بھی نہیں دی تھیں۔ بلی نے دودھ کی بھری دیگچی میں منہ ڈال دیا تھا۔ اماں نے مجھے دوبارہ دودھ لانے کا حکم دیا تھا۔ میں نے ناچنا ترک کر کے بھنا کر کہا۔ "میں کیوں لاؤں، خلیل سے کہو جس کی چہیتی نے یہ کام کیا ہے۔"

"خلیل کام سے آیا ہے اور تُو ہڈ حرام گھر پر پڑا رہتا ہے۔" اماں نے مزید عزت افزائی کا آغاز کیا تھا کہ میں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ لنگڑاتا ہوا دودھ لینے چلا جاؤں۔ دو دن میں تکلیف تو خاصی کم ہو گئی تھی لیکن ابھی میں کسی ہنگامی موقع پر ریس لگانے کے قابل نہیں تھا۔ یہ تو مرزا کی شامت آئی تھی کہ وہ خود میرے سامنے آ گیا تھا۔ ہم دونوں ایک ہی گلی سے گزر رہے تھے اور درحقیقت اس گلی سے ایک ہی آدمی کے گزرنے کی گنجائش تھی۔ جمی جیسا آدمی تو یہاں سے گزر ہی نہیں سکتا تھا۔ دو آدمی بھی یہاں سے آپس میں پسلیاں بھڑائے بغیر نہیں گزر سکتے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس گلی کے فراخ دل مکین نے اتنی گلی بھی کیوں چھوڑی تھی۔ وہ اسے بھی اپنے گھر میں شامل کر سکتے تھے اور آمد و رفت کے لیے چھت یا بجلی کا پٹر بھی استعمال کیا جا سکتا تھا۔ مرزا نے منمنا کر کہا۔

"جلیل! میرا بازو چھوڑ۔"

"کیوں چھوڑ دوں؟ تجھے شاید پتا نہیں ہے راجا اور اس کی طرح کچھ اور لوگ کتنی شد و مد سے تجھے تلاش کر رہے ہیں۔"

"لیکن تیرا تو اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" اس نے منمنانا جاری رکھا۔

"تعلق کیوں نہیں ہے؟ تُو نے راجا کو بلا معاوضہ استعمال کیا اور راجا میرا یار ہے۔ اگرچہ اپنی حرکتوں کی وجہ سے ذلیل و خوار ہے۔"

میری اس بے وقت کی شاعری کی داد مرزا نے نہایت نامعقول انداز میں اور بالکل غیر مناسب جگہ دی۔ اس نے اچانک ہی اپنے منحنی سے جسم کی ساری طاقت جمع کی اور مجھے ناف تلے گھٹنا رسید کیا۔ اس ضرب کلیم نے مجھے سرِ شام ہی تارے دکھا دیے تھے۔ اس مختصر سی گلی میں صرف قیام کی گنجائش تھی۔ اس لیے جب میں نے بے اختیار رکوع والا پوز اختیار کیا تو میرا سر سامنے دیوار پر جا کر سجدہ ریز ہوا اور میں نے دل سے اپنے معبودِ حقیقی کو پکارا۔ مجھے مشغول کر کے مرزا بدبخت نے وہاں سے فرار کی کوشش کی۔ لیکن اس روز مرزا کی کم بختی اسے اس گلی میں گھیر لائی تھی کیونکہ وہ جس طرف بھاگا تھا، اس طرف سے راجا یوں نمودار ہوا جیسے فلم میں ایک ولن سے نجات پا کر فرار ہونے والی ہیروئن کے سامنے دوسرا ولن نمودار ہوتا ہے۔ مرزا کو دیکھتے ہی راجا نے وہ کام شروع کر دیا جو زمانہ قدیم میں نہایت معزز پیشہ شمار ہوتا تھا یعنی کسی کا شجرۂ نسب تیار کرنا۔ کسی اچانک نواب بن جانے والے شاہی سوار کو عام طور سے ایسے افراد کی ضرورت ہوا کرتی تھی اور وہ گراں قدر معاوضے پر حادثاتی نواب کو خاندانی اور جدی پشتی نواب بنا دیا کرتے تھے۔ لیکن راجا نے اس معزز پیشے کا نہایت غلط استعمال کرتے ہوئے بلا معاوضہ ہی مرزا کے آبا و اجداد میں ایسی ترامیم تجویز کیں کہ آئین کا حلیہ بگاڑنے والے سیاست دان سن لیں تو راجا کو اگلی آئین بگاڑو کمیٹی میں شامل کر لیں۔

مرزا اگرچہ سچ مچ مغل بچہ تھا لیکن چنگیز خان کا گرم خون اس تک آتے آتے کولڈ ہو چکا تھا۔ اس لیے اس نے راجا کی تجویز کی ہوئی ترامیم پر توجہ دینے کے بجائے فرار کے لیے دوسری راہ تلاش کرنے کی کوشش کی۔ مرزا کی بدقسمتی کہ گلی میں صرف دو سمتیں تھیں۔ یہ یقیناً سٹی گورنمنٹ کی غلطی تھی جس نے مرزا جیسے لوگوں کی آسانی کے لیے تین سمتوں والی گلی نہیں بنائی۔ مرزا کو محصور پا کر راجا کسی پاگل کتے کی طرح اس کی طرف لپکا اور اس سے چمٹ گیا۔ اس دوران میں اس نے ترامیم کا کام جاری رکھا تھا۔ یہ وقتِ ضرورت راجا بیک وقت منہ اور ہاتھ پیروں سے کام لینے کا ماہر ہے۔ میں نے سیدھے ہو کر پہلے دائیں بائیں دیکھا کہ کسی نے یہ سین دیکھا تو نہیں لیکن سین دیکھنے والی عین میرے اوپر تھی۔ اس کی ہنسی نے راز فاش کر دیا۔ وہ اپنی کھڑکی سے جھانک رہی تھی۔ میں نے کھسیا کر مرزا پر دست درازی کا فیصلہ کیا۔ یہ سارا اس کا کمینہ پن تھا۔ میں نے تاک کر اس کی ناک پر مکا مارا۔ لیکن جس جگہ مکا جا کر لگا وہ بعد میں راجا کی آنکھ ثابت ہوئی تھی۔ اس پر اس نے بعض ترامیم کا رخ میری طرف موڑ دیا اور چنگھاڑ کر بولا۔ "ابے، یہ میں ہوں۔"

"معاف کرنا یار... تو نے بلا وجہ اپنا منہ آگے کر دیا۔" میں نے معذرت کی اور ایک بار پھر مرزا کو ہی مکا رسید کیا مگر راجا نے ایک بار پھر حماقت کی اور مرزا سمیت گھوم گیا۔ نتیجے میں جو مکا مرزا کے منہ پر پڑنا چاہیے تھا، وہ راجا کی گدی پر لگا۔ اس کی قینچی کی طرح چلتی زبان رک گئی اور وہ مرزا سمیت اوندھے منہ جا گرا۔ میں نے راجا کو چھوڑا اور اس کے نیچے سے مرزا کو نکالا۔ مرزا کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اب اس کی شامت آنے والی ہے۔ اس نے بلبلا کر کہا۔ "جلیل! مجھے مت مار۔"

"کیوں، کیا تیرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔"

عقب سے راجا نے اسے رائٹ پنچ کرنے کی کوشش کی۔ مرزا بھانپ گیا۔ اس نے بروقت غوطہ لگایا اور راجا کا رائٹ پنچ رونگ پرسن کو لگا۔ مجھے ایک بار پھر عصر کے وقت وہ تارے بھی نظر آ گئے جو پہلی بار نظروں سے بچ گئے تھے۔ مرزا نے میری ٹانگوں کے نیچے سے نکلنے کی کوشش کی۔ راجا نے بروقت اس کی ٹانگیں پکڑ کر اسے کھینچا اور اس بدبخت نے میری ٹانگیں پکڑ لیں۔ مجھے پہلے ہی چکر آ رہے تھے اور جب دھڑام سے گلی کے پختہ فرش پر گرا تو وہ تمام اجرام فلکی نظر آ گئے جو ہبل دوربین سے بھی نظر نہیں آتے ہیں۔ میرے حواس درست ہونے تک بہت کچھ ہو چکا تھا۔ اس کی تفصیل راجا نے مجھے کیفے ڈی پھونس میں کڑک چائے پیتے ہوئے گوش گزار کی۔ وہی مجھے سہارا دے کر کیفے تک لایا تھا اور میرے چکروں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میری طرف سے فتو کو آرڈر بھی کر دیا تھا۔ اس کے بعد اس نے گرم چائے میں میری انگلی ڈبوئی تو میں بلبلا کر ہوش میں آ گیا۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" میں نے خفگی سے پوچھا اور پھر بوکھلا کر چاروں طرف دیکھا۔ "یہ کیا... میں نے کوئی خواب دیکھا تھا یا اب دیکھ رہا ہوں؟"

"تو نے نہ پہلے خواب دیکھا تھا اور نہ اب دیکھ رہا ہے۔" راجا نے کہا اور نہایت پھرتی سے چائے پینا شروع کر دی۔

"وہ کمینہ کہاں گیا اور یہ فتو کا کیفے ڈی پھونس کہاں سے آ گیا؟"

"وہ خبیث بھاگ گیا۔" راجا نے نہایت افسوس سے چائے پینا جاری رکھا۔ "میں نے اس کی ٹانگ پکڑ کر کھینچی تو اس نے دولتی جھاڑ دی۔" راجا نے اپنا سامنے کا دانت ملاحظے کے لیے پیش کیا جو ہل گیا تھا۔ "میں بھی وہیں لیٹ گیا۔ وہ تو اللہ بھلا کرے اوپر رہنے والی حسینہ کا۔ اس نے ترس کھا کر مجھ پر پانی کی بالٹی الٹ دی اور مجھے بروقت ہوش آ گیا۔ اسی وقت وہاں سے ایک بھینس کا گزر ہو رہا تھا اور اسے شاید موشن لگے ہوئے تھے۔ خیر میں نے تجھ سمیت دوڑ لگائی تو وہاں سے نکل ہی آیا۔"

"مرزا کہاں گیا؟"

"پتا نہیں، جب میں غسل کر کے اٹھا تو وہ غائب تھا۔"

"اتنی مشکل سے نظر آیا تھا۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ "وہ مل جائے تو اچھا خاصا مال نکل آئے۔"

راجا نے نفی میں سر ہلایا۔ "مرزا کے پاس سے کچھ نکل آنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا بیل سے دودھ حاصل کرنا۔"

"آدمی اگر عزم کر لے تو کوئی چیز ناممکن نہیں ہے۔"

"ہاں اگر آدمی کرے تو۔" راجا نے تائید کی۔ "اور تیری اماں کا ارشاد ہے کہ تو وہ چیز بن گیا ہے جسے سو سال بھی نلکی میں رکھو تو ٹیڑھی ہی رہے گی۔"

"یعنی تیری دم۔" میں نے خفگی سے کہا۔ "لگتا ہے اب تجھے مرزا سے کوئی دلچسپی نہیں رہی ہے۔"

"نہیں، دلچسپی تو ہے اگر وہ اسی طرح کہیں سرِ راہ مل جائے۔ ویسے میں نے اس سے جھگڑا کر کے غلطی کی تھی۔ اگر مجھے کوئی نقصان ہو جاتا تو بہت بڑا چانس میرے ہاتھ سے نکل جاتا۔"

میرے خیال میں راجا میں کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہی تھی جس کا نقصان ہو سکتا۔ اس کے تمام ظاہری و باطنی اعضا مختلف مواقع پر تباہی کی زد میں آ چکے تھے۔ اس کی تباہی کے اسباب میں پہلے نمبر پر اس کا باپ تھا اور دوسرے نمبر پر نادر شاہ کی دخترِ بداختر عارفہ تھی۔ مگر میں نے پھر بھی اس سے متوقع نقصان کا پوچھ لیا۔ "کیسا چانس ہاتھ سے نکل جاتا؟ اگر تو جیل جانے کی بات کر رہا ہے تو یہ چانس تو ہر وقت تیرے آس پاس موجود رہتا ہے۔"

"مجھے ایک ڈرامے میں ہیرو کا چانس مل رہا ہے۔"

راجا یہ کہتا کہ بل گیٹس نے اسے اپنی فرزندی میں لے لیا ہے تب بھی مجھے اتنی زیادہ مقدار میں حیرت نہ ہوتی کیونکہ محبت اندھی ہوتی ہے لیکن کسی ڈرامے کا پروڈیوسر بہرحال اندھا نہیں ہوتا ہے۔ حیرت کے اس دورے سے جانبر ہو کر میں نے راجا سے یہی سوال کیا۔ "کیا پروڈیوسر اندھا ہے؟"

"نہیں، وہ تو دونوں آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔"

"کیا اس نے تجھے دیکھے بغیر سائن کر لیا ہے؟"

"نہیں، دیکھا ہے اور میں کیا کوئی چیک ہوں جو وہ سائن کرے گا۔" راجا نے خفا لہجے میں کہا۔

"کیا ڈراما تامل ناڈو یا سری لنکا کے پس منظر میں بن

رہا ہے؟"

"نہیں یار! یہیں اندرونِ سندھ میں بن رہا ہے۔ سندھی زبان کا ڈراما ہے۔"

زبان بے شک کوئی بھی ہو،جب ہماری ٹی وی انڈسٹری کو ایک سے بڑھ کر ایک ہیرو کی خدمات حاصل تھیں تو اس پروڈیوسر نے راجا کو کیوں چنا تھا۔ مجھے فوراً ہی دال میں کچھ کچھ کالا محسوس ہونے لگا۔ راجا میں احمق بننے کی عظیم صلاحیتیں موجود ہیں اور وہ وقفے وقفے سے ان کا مظاہرہ بھی کرتا رہتا ہے۔ مرزا کا کیس چند دن پرانا تھا۔ میں نے انٹرویو جاری رکھا۔ "کیا تو اس سے پہلے کبھی ملا ہے؟"

"نہیں، اس نے مجھے آئی آئی چندریگر روڈ کو کراس کرتے ہوئے دریافت کیا۔"

"یعنی وہ تیرے صحیح سلامت سڑک پار کرنے کے واقعے سے متاثر ہوا... کیا ڈراما سرکس کے موضوع پر ہے؟"

راجا کا صبر جواب دے گیا اور اس نے نا قابلِ بیان الفاظ میں ایک نا قابلِ بیان موضوع بتایا جس پر ہمارے ہاں تا قیامت ڈراما نہیں بن سکتا۔ ہاں یورپ امریکا میں یہ عام سا موضوع ہے۔ میں نے ہنس کر کہا۔ "ہاں اگر اس موضوع پر ڈراما بن رہا ہے تو تجھے بہت تجربہ ہے۔ ایسا کر ہیروئن کے لیے عارفہ کا نام دے دے تم دونوں کو اداکاری بھی نہیں کرنا پڑے گی۔"

راجا میری شان میں مزید گستاخی کرنے جا رہا تھا کہ میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "راجا! کم سے کم مجھے بے وقوف مت بنا اور سچ سچ بتا کیا چکر ہے؟"

اس نے قسم کھا کر یقین دلانے کی کوشش کی۔ "تیرے سرِ خبیث کی قسم... جلیل! میں سچ کہہ رہا ہوں۔ وہ کسی ٹی وی میں پروڈیوسر بھی ہے اور اس نے مجھے اپنا کارڈ دے کر اگلے روز دفتر بلوایا تھا۔"

"پھر تو دفتر گیا؟"

"میں تو سر کے بل گیا تھا۔" راجا نے دانت نکالے۔

"اگرچہ مجھے سخت شبہ تھا کہ وہ اس وقت نشے میں تھا اور بعد میں مجھے پہچاننے سے انکار کر دے گا۔ لیکن اس نے پُرتپاک انداز میں میرا خیر مقدم کیا تو میں بوکھلا گیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اسے یاد دلایا کہ کل اس نے سرِ راہ مجھے ایک ڈرامے میں ہیرو کی آفر کی تھی۔"

"وہ اپنی پیش کش پر قائم رہا؟" میں نے شک سے پوچھا۔

"ہاں بلکہ اس نے تو مجھے کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر معاہدہ بھی سائن کرا لیا۔"

"اس نے تجھے کچھ پیشگی معاوضہ دیا؟"

"نہیں... میں اس وقت اتنا بوکھلایا ہوا تھا کہ میں نے اس بات پر غور ہی نہیں کیا۔ اس نے مجھے ایک کپ چائے پلائی اور ایک اسکرپٹ تھما کر رخصت کر دیا۔"

"اسکرپٹ میں کیا ہے؟"

"یہ ایک لڑکے کا ڈراما ہے جو کسی وڈیرے کی اولاد ہے اور وہ شہر میں رہا ہے۔ اب وہ گاؤں جاتا ہے۔"

"راجا! تجھے اداکاری کی الف ب نہیں آتی تو کیسے ڈرامے میں کام کرے گا؟"

"جیسے دوسرے کرتے ہیں۔" راجا نے دانت نکالے۔ "ان کو کون سی الف ب آتی ہے۔"

"دوسرے یہ ہالی ووڈ نہیں ہے جہاں کسی اسٹار کو راہ چلتے دریافت کر لیا جائے بلکہ اب تو ایسا وہاں بھی نہیں ہوتا ہے۔"

"تجھے معلوم ہے، ہمارے ہاں ہر ایجاد دیر سے آتی ہے۔ وہاں رواج ختم ہوا ہے تو ہمارے ہاں شروع ہوا۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

"راجا! تو پھر بے وقوف بن رہا ہے۔"

"اور تو پھر جل رہا ہے۔"

"بکواس نہ کر... اگر میں نہ ہوتا تو تُو اس وقت حوالات میں ہوا اور لات کھا رہا ہوتا۔ نادر شاہ موقع سے فائدہ اٹھا کر تجھے کسی قابل نہ چھوڑتا۔ عارفہ کے قابل بھی نہیں۔"

"یار جلیل! میں اکثر دھوکا ہی کھاتا ہوں۔" خلافِ توقع اس نے ہنس کر کہا۔ "تو جانتا ہے، فلم انڈسٹری میں جانا میرا پیدائشی خواب ہے۔"

میں نے اس کی تائید کی۔ "جیسے بعض لوگ پیدائشی ایب نارمل ہوتے ہیں۔"

"مجھے بھی ایسا ہی سمجھ لے۔ اب فلم انڈسٹری تو رہی نہیں ہے۔ سلور اسکرین نہ سہی، مجھے گولڈن اسکرین پر آنے کا موقع مل جائے۔" راجا کے لہجے میں ایسی حسرت تھی کہ مجھے اس کی مزید حوصلہ شکنی کی ہمت نہیں ہوئی۔ اس کے بجائے میں نے اس سے کہا۔

"کیا تو مرزا کے خلاف مہم میں میرا ساتھ نہیں دے گا؟"

"فی الحال نہیں۔" اس نے صاف انکار کر دیا۔ "ابھی تو میں اپنے باپ کے قاتل کے خلاف بھی کچھ نہ کروں۔"

"وہ تو تو ویسے بھی نہیں کرے گا۔" میں نے جل کر کہا۔ "بلکہ تُو اس کا شکریہ ادا کرے گا کہ اس نے تجھے یتیم کر دیا۔"

راجا نے تائید کی۔ "ہاں، ایسے باپ سے تو انسان بے باپ کا بھلا۔"

"دیکھ، مرزا کم سے کم چھ سات لاکھ روپے کا مال لے کر بھاگا ہے اور اس نے تجھے قربانی کا بکرا بنایا تھا جیسے لوگ اپنی جان پر کالا بکرا وارتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی سلوک مرزا نے تیرے ساتھ کیا ہے۔ اگر ہم نے اسے قابو کر لیا تو اس سے کم سے کم آدھا تو نکلوا سکتے ہیں۔"

"چھ لاکھ کا آدھا۔" راجا نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "چوری کا مال ہے، آدھی قیمت پر بکے گا اور اس کے تین لاکھ سے زیادہ نہیں مل سکتے۔ مرزا سے اس کا آدھا نکلوانا بھی ممکن نہیں ہے۔ وہ جان دے دے گا لیکن مال نہیں دے گا۔ فرض کر تو اس سے رو پیٹ کر ایک ڈیڑھ لاکھ روپے نکلوا لیتا ہے تو اس میں سے مجھے کیا ملے گا؟ شاید دس بیس ہزار اور وہ بھی تو حاتم طائی کی قبر پر لات مار کر دے گا۔"

راجا کی اس سچ بیانی پر میں کھسیا گیا۔ "خیر، ایسا بھی نہیں ہے۔"

"اب تیرے بیس ہزار کے لیے میں تیرے ساتھ خوار بھی ہوں۔ چوری کے مال کے چکر میں جیل جانے کا بھی امکان ہوتا ہے اور میں اس ڈرامے سے بھی ہاتھ دھو لوں جو میرا مقدر بدل سکتا ہے۔"

"تو ڈرامے کی بات کر رہا ہے۔" میں نے اس بار مروت کو بالائے طاق رکھ کر کہا۔ "تو ہالی ووڈ کی فلم میں کام کر لے، تب بھی تیرا مقدر تیری صورت کی طرح روسیاہ ہی رہے گا۔"

راجا مسکراتے ہوئے کیفے ڈی پھونس سے واک آؤٹ کر گیا اور حسبِ معمول بل میرے متھے مار گیا۔ بل ادا کر کے میں لوٹ کے گھر آ گیا۔ آج شنو کا موڈ آف تھا کیونکہ اس نے گزشتہ روز اپنے حسن سے زیادہ قاتل بریانی بنائی تھی۔ اس میں مرچوں کا تناسب چاولوں سے کچھ ہی کم تھا اور اسے کھا کر میری ناک اور آنکھ سے پانی بہہ نکلا تھا۔ ابھی اس قاتل بریانی سے جانبر بھی نہیں ہوا تھا کہ شنو نے تعریف سننے کے لیے مجھے چھت پر آنے کا سگنل دیا۔ میں آتش فشاں بنا اوپر پہنچا تو وہ مسکرا رہی تھی۔ "بریانی کیسی لگی؟" اس نے بریانی جیسی قاتل ادا سے پوچھا۔

"اک آگ سی پیٹ میں لگی ہے۔" میں نے بھنا کر کہا۔ "کیا تم نے مرچیں ہول سیل میں لی ہیں؟"

شنو رونے والی ہو گئی۔ "میں نے اتنی محنت سے بنائی تھی۔"

"ہاں، سب سے زیادہ محنت تم نے مرچیں ڈالنے میں کی تھی۔" مرچوں کی کاٹ کی وجہ سے میری زبان کے بریک بھی فیل ہو گئے تھے اور نتیجہ ایک زوردار جھگڑے اور شنو کے واک آؤٹ کی صورت میں نکلا۔ سامنے والے جاسوس بڑے میاں نے اپنی چھت سے جھانک کر کہا۔

"مستقبل کی ریہرسل ہو رہی ہے پیارے۔"

میں نے خوں خوار نظروں سے بڑے میاں کو دیکھا اور نیچے روانہ ہو گیا۔ اب مجھے فکر تھی کہ شنو کو کس طرح مناؤں لیکن جیسے ہی گھر میں داخل ہوا، خلیل مجھے پکڑ کر گلی میں لے گیا اور تقریباً میرے کان میں گھس کر بولا۔ "جلیل! کیوں مجھے مروانا چاہتا ہے؟"

"نہیں، میں نے تو تیری شادی کے سلسلے میں کوئی بات یا کوشش نہیں کی؟" میں نے جلدی سے تردید کی۔

"میں شادی کی نہیں، نازو کی بات کر رہا ہوں۔ اسے میرا موبائل نمبر کیوں دیا ہے؟ شام سے اس کے دس ایس ایم ایس اور دو بار کال آ چکی ہے۔ میں ہر بار کاٹ دیتا ہوں۔ اگر اماں کو پتا چل گیا تو؟"

"تو کیا، کچھ بھی نہیں... یہ بتا کہ نازو نے کیا پیغام دیا ہے؟"

"یہی کہ تم اس سے رابطہ کر لو اور اسے بتا دینا کہ اب میرے نمبر پر کال یا ایس ایم ایس نہ کرے۔"

میں نے خلیل سے نمبر لیا اور ایک پی سی او سے نازو کو کال کی۔ نازو کے بارے میں قارئین جانتے ہیں۔ وہ ان دنوں میری پارٹنر ہوا کرتی تھی جب میں ہیرا پھیری نہیں کرتا تھا بلکہ سیدھا فراڈ کرتا تھا اور نازو میرا ساتھ دیتی تھی۔ نمبر نازو کا تھا۔ میری آواز سنتے ہی وہ چہکی۔ "جلیل! تو کہاں غائب ہے؟"

"مجھے کہاں غائب ہونا ہے؟ میرا پتا ساری دنیا کو معلوم ہے۔" میں نے اسے یاد دلایا۔ "غائب وہ ہوتا ہے جس کا کوئی پتا ٹھکانا نہ ہو۔"

نازو کھسیائے بغیر بولی۔ "اچھا چھوڑ، یہ بتا کہ مل سکتا ہے؟"

"کیوں نہیں... مگر تم کچھ مال پانی کی خوشبو سنگھاؤ تو سر کے بل آ سکتا ہوں۔"

"مال پانی کا چکر ہے۔" اس نے جواب دیا۔

''کہاں آنا ہے؟''

نازو نے شاہراہِ فیصل کے ساتھ ایک نئے آباد ہونے والے اپارٹمنٹ کا پتا بتایا۔ ''یہاں آجاؤ لیکن دن میں آنا۔ یہاں میری ریپوٹیشن بہت اچھی ہے۔''

''تمہاری بھی کوئی ریپوٹیشن تھی؟'' میں نے ہنس کر کہا اور فون بند کر دیا۔ بہت دن ہو گئے تھے کچھ ہاتھ پاؤں... چلائے جو جیب میں تھا، وہ خاتمے کے قریب تھا اور جو شنو کے پاس جمع ہو گیا تھا اس کے نکلنے کی امید نہیں تھی۔ اب ایسا لگ رہا تھا کہ قدرت مجھ پر مہربان تھی لیکن نازو کے فلیٹ تک جاتے جاتے یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ پہلے تو بس سے اترتے ہی ایک نامعقول قسم کے کتے نے مجھ سے خوامخواہ کا بیر پال لیا۔ یعنی دو ڈھائی سو افراد کو چھوڑ کر بس مجھ پر بھونکنے اور میرے آس پاس منڈلانے لگا۔ وہ پاگل نہیں تھا، یعنی اس میں پاگل کتے والی کوئی علامت نہیں تھی مگر آج کل کیا کہا جاسکتا ہے۔ کتا بنا علامات کے بھی پاگل ہوسکتا ہے۔

دو پیروں اور چار پیروں پر چلنے والی تمام مخلوقات میں مجھے سب سے زیادہ خوف کتے سے آتا ہے۔ ایک بار جمی کو کتے نے کاٹ لیا تھا اور اسے انجکشن لگوانے کے لیے میں لے کر جاتا تھا۔ انجکشن لگنے کے دوران جمی اتنا واویلا کرتا تھا جتنا اس نے کتے کے کاٹتے وقت بھی نہیں کیا تھا اور اس کی حالت دیکھ کر میری روح فنا ہو جاتی تھی۔ اس کے بعد میں کتوں سے ذرا خصوصی اجتناب کرنے لگا تھا اور کہیں کسی گلی میں مجھے تین چار کتے ذرا موڈ میں نظر آتے تو میں راستہ بدل لیا کرتا تھا۔ ذرا دیر سے منزل پر پہنچنا کتے کے کاٹنے کی صورت میں اسپتال پہنچنے سے بہتر ہی ہوتا ہے۔ میں اس کتے کو دھتکارتے ہوئے فلیٹوں کی طرف جانے لگا۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر میں نے ایک پتھر اٹھا لیا تھا۔ اس کے بعد کتا خود مجھ سے مناسب فاصلے پر ہو گیا۔ لیکن اس نے بھونکنا اور غرانا نہیں چھوڑا۔

اس لیے میں اس کی طرف سے محتاط تھا اور عملاً الٹے قدموں چل رہا تھا۔ اس لیے پہلے ایک گاڑی کے نیچے آتے آتے بچا اور پھر ایک کھلے مین ہول میں صرف اس لیے نہیں اتر سکا کہ اس پر پہلے سے اللہ کے کسی نیک بندے نے ٹائر رکھ دیا تھا کہ کوئی کھلے مین ہول میں نہ اترے۔ ابھی میں اسے دعائیں دے رہا تھا کہ ایک فقیر پر چڑھ گیا اور اس نے بھی کتے کی طرح میرا پیچھا لے لیا۔ وہ تقریباً کتے کے انداز میں غراتے اور بھونکتے ہوئے خوف ناک الفاظ میں مجھے بددعائیں اور دھمکیاں دے رہا تھا۔ فلیٹ چند قدم کے فاصلے پر تھا اور میں بھاگا تو کتا میرے پیچھے لپکا۔ پتا نہیں کتوں کو ریس لگانے کا مرض کیوں ہے۔ غلطی فقیر کی تھی، وہ کتے کی راہ میں حائل ہوا اور کتے نے دخل در معقولات پر خفا ہو کر فقیر کی ٹانگ پکڑ لی۔ میں نے فقیر کے واویلے پر مڑ کر دیکھا اور قہقہہ مار کر سیڑھیاں چڑھ گیا۔ نازو کا فلیٹ چوتھی منزل پر تھا اور جب میں اوپر پہنچا تو میری سانس پھولی ہوئی تھی۔ نازو نے دروازہ کھول کر افسوس کیا۔ ''جلیل! ابھی تو تیری شادی بھی نہیں ہوئی ہے اور چار منزلیں چڑھ کر تو بوڑھوں کی طرح ہانپنے لگا ہے۔''

''صرف چار منزل نہیں چڑھا ہوں۔'' میں نے بھنا کر کہا۔ ''بس اسٹاپ سے تمہارا پروٹوکول آفیسر یہاں تک چھوڑنے آیا تھا۔''

میں نے کتے اور فقیر کے بارے میں بتایا تو نازو ہنس ہنس کر بے حال ہو گئی۔ وہ ویسی ہی اسمارٹ اور تر و تازہ سی تھی۔ میں نے حسد سے کہا۔ ''کیا کرتی ہو تم جو اتنی سی ہو۔ ایک شنو ہے بجٹ خسارے کی طرح روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔''

''وہ پھیلنے والی چیز ہے۔'' نازو نے بے پروائی سے کہا۔ ''جتنی دیر کرو گے، اتنی بڑی بیوی ملے گی اور مستقبل میں تو وہ صحیح معنوں میں بیگم ہو جائے گی۔''

''خدا نہ کرے۔'' میں نے دہل کر کہا۔ ''نازو! تیرے منہ میں خاک۔''

اس نے شانے اچکائے۔ ''نہ مانو، اپنی صحت پر کیا اثر پڑتا ہے۔''

''اس صحت کے بارے میں تو پوچھ رہا ہوں۔'' میں نے جینز اور چست ٹی شرٹ میں عیاں اس کی جسامت پر غور کیا۔

''بدتمیز۔'' اس نے جلدی سے دوپٹا لے لیا جو ظاہر ہے اس لباس کا حصہ نہیں تھا۔ ''ویسے میں کھاتی کم ہوں اور سوتی کم ہوں۔ پانی زیادہ پیتی ہوں اور جسم زیادہ استعمال کرتی ہوں۔''

''اس کا گواہ تو میں بھی ہوں۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''جب تم کہیں جسم استعمال کرتی تھیں، ہمارا کام آسان ہو جاتا تھا۔''

نازو سرخ ہو گئی۔ ''جلیل! تم سخت واہیات آدمی ہو۔''

''سر تسلیم خم ہے... بائی دی وے تم نے مال پانی کا ذکر کر کے مجھے یہاں بلایا ہے۔''

نازو کا فلیٹ دو بیڈ روم اور ایک لاؤنج پر مشتمل تھا۔ وہ اکیلی تھی اس لیے اس نے دوسرے بیڈ روم کو ڈرائنگ روم بنا

لیا تھا اور اسے بہت اچھی طرح سجایا ہوا تھا۔ میں نے حیرت سے اس کا جائزہ لیا۔ ''نازو! یہ تم نے سجایا ہے؟''

میں اچھی طرح جانتا تھا، نازو پھوہڑ نمبر ون تھی اور اس سے کسی گھریلو کام کی توقع محال تھی۔ وہ بھی جانتی تھی اس لیے ہنس کر بولی۔ ''نہیں، یہ تو میرے باس کا فلیٹ ہے۔ اس نے فرنش کروا رکھا ہے۔ صفائی کرنے والی آتی ہے۔''

''جبھی فلیٹ اتنا صاف ستھرا نظر آرہا ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ ہم کام کی بات کر لیں۔'' نازو بولی اور فریج سے دو عدد ٹن نکال لائی۔ اس نے ایک مجھے تھما دیا۔ میں نے غور سے دیکھا۔

''یہ بیئر ہے نا؟''

''ہاں۔'' وہ بے پروائی سے بولی۔ ''اس میں صرف پانچ فیصد الکوحل ہوتی ہے۔''

''پانچ فیصد ایمان تو گیا نا۔'' میں نے ٹن میز پر رکھ دیا۔ ''اور اس کی میرے پاس پہلے ہی سخت کمی ہے۔''

نازو نے برا سا منہ بنایا اور اس بار مجھے کولڈ ڈرنک لا دی۔ ''نازو! کیا قسمت ہے تمہاری ہر بار ایسا جان نثار باس مل جاتا ہے۔''

نازو نے مزید برا منہ بنایا۔ ''صرف جان ہی نہیں وارتے ہیں بلکہ اس کا صلہ لینے کی فکر میں بھی رہتے ہیں۔ ان سے بچنا ہی اصل کام ہے۔''

''خیر تم کام کی بات کرو۔''

''میرا باس ایک ڈسٹری بیوشن کمپنی چلاتا ہے اور اس کے پاس کئی بڑی کمپنیوں کی کراچی کے لیے سول ڈسٹری بیوشن ہے۔'' نازو نے کمپنیوں کے نام بتائے تو میں نے کہا۔

''تب تو وہ سخت کنجوس ہے۔ تمہیں کم سے کم کلفٹن میں فلیٹ لے کر دینا چاہیے تھا۔''

''وہ دے رہا تھا، میں نے خود نہیں لیا۔ اس کی اپنی رہائش بھی کلفٹن میں ہے اور وہ بار بار میرے پاس آدھمکتا۔ یہاں آنے میں اسے وقت لگتا ہے اور شام کو اس علاقے میں ٹریفک جام ہو جاتا ہے۔ دس بجے میں موبائل آف کر دیتی ہوں اور فلیٹ کی روشنیاں بجھا کر سو جاتی ہوں۔''

''نازو! کام کی بات کرو۔''

''کام کی بات یہ ہے کہ میرا تنخواہ میں گزارہ نہیں ہوتا ہے اور میں نے ہاتھ مارنے کا سوچا ہے۔''

''یہ تو خیر کوئی نئی بات نہیں ہے۔''

نازو نے میرا تبصرہ نظر انداز کیا اور بات جاری رکھی۔ ''میں نے باس سے کہا ہے کہ میرے بھائی نے ایک بڑا اسٹور کھولا ہے لیکن مالی حالات ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے اسے مال ادھار پر چاہیے۔''

مجھے مرزا کا خیال آیا۔ اس نے بھی یہی چکر چلایا تھا۔ ''کیا تمہارا باس مان گیا؟''

نازو فاتحانہ انداز میں مسکرائی۔ ''میں کہوں اور کوئی انکار کرے یہ کیسے ممکن ہے۔'' اس کے لہجے میں غرور آگیا۔ وہ سچ کہہ رہی تھی۔ اس کے حسن و ادا سے کوئی کافر ہی انکار کر سکتا تھا۔ نہ جانے میں اتنے عرصے اس کے ساتھ رہ کر اور دن رات ایک ساتھ رہ کر بھی کیسے اس کے جادو سے بچا رہا تھا۔ میں نے نازو کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں کہ وہ کوئی عورت ہے اور وہ بھی خوف ناک حد تک حسین عورت۔

''اگر وہ مان گیا ہے تو پھر کیا مسئلہ ہے؟''

نازو کا منہ لٹک گیا۔ ''مسئلہ ہے نا... اب میں ایک بھائی کہاں سے لاؤں... امی ابو نے بھی اتنی زحمت نہیں کی۔''

میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ ''تم چاہتی ہو کہ میں تمہارا بھائی بن جاؤں؟''

''ہاں۔'' وہ کھل اٹھی۔ ''اس میں ایسا کوئی اخلاقی مسئلہ بھی نہیں ہے کیونکہ ہمارے درمیان کبھی ایسا کوئی تعلق نہیں رہا ہے کہ تمہیں میرا بھائی بننے میں دشواری پیش آئے۔''

''اس کے باوجود تمہارا بھائی بننا خاصے دل گردے کا کام ہے۔''

''اس کے بارے میں کسی کو کیا پتا ہوگا؟'' نازو نے مجھے قائل کرنے کی کوشش کی۔

''تمہارے باس کو تو پتا ہوگا۔ وہ میرے بارے میں کیا سوچے گا کہ کتنا بے غیرت بھائی ہے۔''

''وہ کچھ نہیں سوچے گا۔'' نازو تنک کر بولی۔ ''اور تمہیں عزت اور غیرت کا اتنا ہی احساس ہے تو اس قسم کے کام نہ کرتے۔ میں نے یہ سب تم سے ہی سیکھا ہے۔ پھر یہ سوچو کہ ہمیں اپنا کام نکالنا ہے۔ تم کون سا سچ مچ میرے بھائی بن جاؤ گے۔ یہ تو بس ڈراما ہے۔''

مجھے ڈرامے پر راجا یاد آگیا اور میں نے نازو کو بتایا کہ راجا کو کسی ڈرامے میں کام مل رہا ہے۔ اس نے بیزاری سے کہا۔ ''راجا کو جہنم میں جھونکو اور یہ بتاؤ کہ تم نے کیا سوچا؟''

''سوچنا کیا ہے، میں راضی ہوں لیکن پہلے تم بتاؤ کہ مجھے کیا ملے گا؟''

"قفتی ففتی۔"

"بی بی! یہ چکر کسی اور کو دینا... مجھے صاف لفظوں میں بتاؤ مجھے کیا ملے گا؟ اور وہ مجھے پیشگی چاہیے۔ اس کے بعد تم جتنا مال چاہے کھینچتی رہو، میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟" اس نے اعتراض کیا۔ "اور میں کمائے بغیر تمہیں حصہ کیسے دے دوں؟"

اس پر ہم دونوں میں ایک گرم گرم بحث چھڑ گئی جس میں کئی مراحل ایسے آئے کہ ہم اصل بات بھول کر ایک دوسرے کا خون کرنے کے بارے میں غور کرنے لگے لیکن عمل کسی نے اس لیے نہیں کیا کہ کوئی جیل جانے کو تیار نہیں تھا۔ بالآخر ایک فارمولا طے ہو گیا۔ ناز و نے مجھے پچاس ہزار دینے کی حامی بھر لی اور اس کے بعد حاصل ہونے والے مال میں میرا حصہ تیس فیصد ہوتا۔ میں نے اس سے پیشگی کا مطالبہ کیا۔ ناز و بولی۔ "اتنی جلدی کی ضرورت نہیں ہے۔ تم پچاس ہزار لے کر غائب ہو جاؤ تو میں تمہارے گھر بھی نہیں جا سکتی۔ تمہاری اماں مجھے دیکھتے ہی شروع ہو جائیں گی۔"

"اماں کا یہ فائدہ تو ہے۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔ "اچھا پچاس نہ سہی آدھے ہی دے دو... میں ایسے ہی تو تمہارا بھائی نہیں بن جاؤں گا۔ اس میں بھی کچھ خرچہ ہوگا۔"

بادل نا خواستہ ناز و نے مجھے پندرہ ہزار روپے دیے۔ "فی الحال تو اتنے ہی ہیں۔"

"او کے لیکن یاد رکھنا فائنل راؤنڈ سے پہلے مجھے باقی کی رقم مل جانی چاہیے۔" میں نے اسے خبردار کیا۔ "کیونکہ اس کے بعد تم عام طور سے نو دو گیارہ ہو جاتی ہو۔"

"فکر مت کرو، اس بار مال تمہارے پاس ہی آئے گا اور تم ہی اسے ٹھکانے لگاؤ گے اس لیے میرا نو دو گیارہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"دیکھو، یہ ایسا مال ہے جو میں دکانوں پر جا کر سپلائی نہیں کر سکتا ہوں۔ وہ لیتے بھی نہیں ہیں۔ ان کے آدمی طے شدہ ہوتے ہیں اور وہ ان سے ہی مال لیتے ہیں۔ یہ مال چور بازار میں جائے گا اور وہاں اس کے آدھے ریٹ ملیں گے۔"

"مجھے یہ سب مت بتاؤ۔" ناز و نے بیزاری سے کہا۔ "میں اسی میدان کی کھلاڑی ہوں۔ لیکن تم کسی سے بات کر کے رکھو اور یہ بھی کہہ دینا کہ کیش تیار رکھے۔"

"تم اس کی فکر مت کرو، کیش تیار ملے گا لیکن مال بھی پکا ہو۔"

"مال پکا ہوگا، اب خود ڈسٹری بیوٹر کیا جعلی مال تیار کرائے گا؟"

"باس سے کب ملاقات کرانی ہے؟"

"ایک دو دن میں کال کروں گی اور خدا کے لیے کوئی موبائل لے لو۔ تم سے بات کرنا مسئلۂ کشمیر بن جاتا ہے۔"

"اسی لیے تو نہیں لیتا ہوں۔" میں نے دانت نکالے۔ "اور خلیل کے موبائل پر کال یا ایس ایم ایس مت کرنا، وہ بہت بھنا رہا تھا۔"

ناز و کا موڈ آف ہو گیا۔ "میں اسے کھا نہیں جاؤں گی۔"

"میں خود تمہیں کال کر لوں گا۔" میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "ویسے اندازاً کتنے کا مال ہوگا؟... مجھے اگلی پارٹی کو بتانا تو ہوگا۔"

ناز و ہچکچائی۔ "کم سے کم بیس لاکھ کا۔"

"ہاں کم سے کم اتنے کا تو ہونا چاہیے ورنہ آدمی کے چکر بازی کرنے کا کیا فائدہ؟" میں نے سر ہلایا اور اس کے فلیٹ سے رخصت ہو گیا۔ نیچے آتے ہوئے میں اس خبیث کتے کو بالکل بھول گیا تھا۔ وہ میری تاک میں بیٹھا تھا اور جیسے ہی میں باہر نکلا، اس نے بھونک کر میرا استقبال کیا۔ میں نے بے ساختہ دوڑ لگائی اور اس دوران میں اپنے پاؤں کی تکلیف بھی بالکل بھول گیا۔ کتے کے ساتھ کئی سو میٹر کی رکاوٹوں والی دوڑ میں کامیابی مجھے ملی اور اس کا انعام بھی مل گیا۔ معجزانہ طور پر ایک بس جس میں جگہ بھی تھی، روانگی کے لیے رفتار پکڑ رہی تھی کہ میں اس میں سوار ہو گیا اور کتا بھونکتا ہی رہ گیا۔ میں نے دروازے سے اسے ٹاٹا کیا اور اندر گھس گیا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میں لیڈیز والے حصے میں چڑھ گیا ہوں۔ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ اپنے مقدر میں ہر جگہ عورتیں ہی لکھی تھیں یا راجا، جمی اور مرزا جیسے منحوس مرد تھے۔

☆☆☆

سیٹھ چھوٹا بھائی بڑا حسب معمول کرسی پر اکڑوں بیٹھا تھا اور اس کے منہ میں پان گھوٹنے کا عمل مسلسل جاری تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا اور کر بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ اس وقت میں جلیل کے بجائے نستعلیق قسم کے استاد کے حلیے میں تھا۔ سیاہ شیروانی، نیچے چوڑی دار پاجامہ، سر پر قراقلی ٹوپی تھی اور میں ان سب میں قید تھا۔ گرمی کی شدت سے پسینے چھوٹ رہے تھے اور مجھے اپنی چاندی کی کمانی والی گول شیشے کی عینک بار بار صاف کرنا پڑتی تھی۔ ویسے بھی یہ قریب کی نظر کی عینک تھی اور اسے اتار کر ہی مجھے کچھ صاف نظر آتا تھا۔

"کیا ہے، کاہے کو آیا ہے۔" سیٹھ چھوٹا بھائی نے بے

مروتی سے کہا۔ طوطا چشمی میں وہ اپنی مثال آپ ہی تھا بلکہ اسے طوطے سے بھی تشبیہ نہیں دی جا سکتی تھی کیونکہ بے وفا سے بے وفا طوطا بھی اپنی مادہ کو پہچانتا ہے۔ چھوٹا بھائی کے بارے میں سنا تھا کہ کئی بار اپنی بیوی کی صورت بھی بھول جاتا تھا۔ اسے دنیا میں کسی انسان سے محبت ہے تو وہ قائداعظم ہیں کیونکہ نوٹوں پر ان کی تصویر ہی چھپتی ہے۔ میں اس کے سامنے بیٹھا اور پسینے سے آنکھوں پر ڈھلک آنے والی ٹوپی سیدھی کی۔

"فدوی ایک عرض لے کر حاضر ہوا ہے۔"

"کون... کیا لے کر حاجر ہوا ہے۔" اس نے نہ سمجھنے والے انداز میں کہا۔ "یہ فدوی تیرے ساتھ آیا ہے۔"

"نہیں سیٹھ صاحب، بندہ خود فدوی ہے۔"

"تو ایسے بول نا تیرا نام فدوی ہے۔"

"نام تو احتشام الدین کاشغرستانی ہے لیکن آپ چاہیں تو فدوی بھی کہہ سکتے ہیں۔"

اتنا لمبا نام سن کر چھوٹا بھائی فدوی پر راضی ہو گیا۔ "ٹھیک ہے، اب بولو کاہے کو آئے ہو؟"

"ایک کام ہے۔" میں نے ذرا قریب ہو کر کہا۔

"چندے کی بات مت کرنا، ابھی میں بھی ٹائٹ ہے۔ بالکل کچھ نہیں دے سکتا۔"

"سرکار چندے کی بات کون کر رہا ہے، میں تو کاروبار لایا ہوں۔"

"کاروبار یعنی بجنس۔" چھوٹا بھائی کے چہرے پر رونق آ گئی تھی۔ "کیسا بجنس؟"

"میرے پاس مارکیٹ کا کچھ مال ہے۔"

"کیسا مال؟"

"جنرل اسٹور کا مال سیٹھ صاحب... آپ جانتے ہیں کہ آج کل اس کام میں کتنا نفع ہے، راتوں رات قیمت بڑھتی ہے۔ اسٹاک ایک مہینے میں تیس چالیس فیصد بڑھ جاتا ہے۔"

"میرے کو مارکیٹ مت بتا۔" اس نے چالاکی سے کہا۔ "یہ بتا مال کیا ہے اور کتنے کا ہے؟"

اگرچہ چھوٹا بھائی کے بارے میں لوگ جانتے تھے کہ وہ اسٹاک ایکسچینج میں سٹہ کھلانے سے لے کر گھوڑوں کی ریس تک درجنوں غیر قانونی کاموں میں دسترس رکھتا تھا لیکن یہ بات کم لوگ جانتے تھے کہ وہ چوری کا مال بھی خریدتا ہے۔ میں نے اسے مال کے بارے میں بتایا۔ "کم سے کم بیس لاکھ کا ہے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں ایسے نہیں لیتا... ایک ایک چیز چیک کر کے لیتا ہوں... بابا، آج کل مارکیٹ میں دو نمبر بہت ہو گیا ہے۔"

"پکا کمپنی اور ڈسٹری بیوٹر کا مال ہے۔"

"میں نے بتا دیا نا۔" اس نے رکھائی سے کہا۔ "میں ایک ایک چیز چیک کر کے لے گا۔"

"آپ کیسے چیک کریں گے؟ ایک ایک کارٹن کھول کر یا ڈبے کو بھی کھول کر؟" میں نے چڑ کر کہا۔

"یہ دیکھنا اپنا کام ہے۔ اگر تو راجی ہے تو بات کر۔"

"سیٹھ صاحب... اس طرح کام نہیں ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک کارٹن سے ایک پیس چیک کر لیا جاتا ہے۔"

"تو فکر مت کر۔"

"فکر کیسے نہ کریں سرکار... اس میں بہت وقت لگ جائے گا اور یہ وقت کا کام نہیں ہے۔"

"تو اس کی بھی فکر مت کر، میرے پاس آدمی ہیں نا۔" اس نے ایک اور پان منہ میں ڈالا۔ "وہ اپنا کام جانتا ہے۔"

"ٹھیک سیٹھ صاحب! میں اگلی پارٹی سے معلوم کر کے بتاتا ہوں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

چھوٹا بھائی چونکا۔ "اگلا پارٹی... تیرا مال نہیں ہے؟"

"میں تو درمیان کا آدمی ہوں سیٹھ صاحب۔"

اس نے مشکوک نظروں سے مجھے دیکھا۔ "میں نے پہلے تیرے کو کبھی اس بازار میں نہیں دیکھا۔"

"اس لیے کہ میرا اس بازار سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" میں نے کہا اور چھوٹا بھائی کے دفتر سے نکل گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت کائیاں ہو رہا تھا اور اس سے یہ ڈیل مشکل سے ہو سکے گی کیونکہ چوری کا مال کوئی پورا چیک نہیں کراتا ہے۔ اس میں وقت بہت لگتا ہے اور ایک بار مال سامنے آ جائے تو سمجھ لیں کہ خطرہ آس پاس ہی منڈلاتا ہے اس لیے مجھے یقین تھا کہ ناز و یہ سن کر انکار کر دے گی اور اس نے ایسا ہی کیا۔

"یہ ممکن نہیں ہے۔ اس سے کہو زیادہ سے زیادہ ایک کارٹن سے ایک پیس چیک کر لے۔"

"میں نے بھی یہی کہا تھا لیکن وہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "اور فی الحال اس کے سوا میری نظر میں کوئی ایسا آدمی نہیں ہے جو اتنی مالیت کا مال خرید سکے۔"

ناز و پریشان ہو گئی۔ "دیکھ جلیل! یہ مسئلہ حل کر کیونکہ

کوئی خریدار نہ ہوا تو مال بلاوجہ گلے پڑ جائے گا۔''
وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ یہ گناہ بے لذت والی بات ہو جاتی کیونکہ ہم خود سے اس سامان کو نہیں بیچ سکتے تھے۔ یہ کام وہی کر سکتا تھا جو دولت اور طاقت رکھتا تھا۔ وہ آرام سے اس سامان کو چار مہینے بعد بھی بیچ سکتا تھا۔ ہمارے پاس تو اسے رکھنے کی جگہ بھی نہیں تھی۔ نازو سوچ رہی تھی۔ ''ایسا کر تو سیٹھ چھوٹا بھائی سے بات کر... اسے کہہ کہ پارٹی مال چیک کرانے کے لیے تیار ہے لیکن اس صورت میں اسے دس فیصد اوپر دینا ہوگا۔''
''وہ ایک فیصد بھی اوپر نہیں دے گا۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ایک فیصد بھی بڑی رقم ہے۔ وہ روپے روپے پر جان دینے والا شخص ہے۔ پیسا میں نے یوں نہیں کہا کہ اب پیسے کا رواج ہی نہیں ہے۔''
''میں بھی جانتی ہوں اس... کو۔'' نازو نے روانی میں چھوٹا بھائی کو ایک مردانہ گالی دی۔ ''لیکن ممکن ہے زیادہ کا سن کر وہ پورا مال چیک کرنے سے دست بردار ہو جائے۔''
''وہ نہیں ہوگا، میں اسے جانتا ہوں۔ اصل میں لاٹ بڑی ہے اور وہ جانتا ہے کہ اتنی مالیت کی چیز مارکیٹ میں اس کے سوا کوئی نہیں لے گا۔ اس لیے وہ ڈٹ جائے گا۔ ویسے مال چیک کرانے میں کیا حرج ہے؟''
''اس میں بہت وقت لگ جائے گا۔''
''تو لگ جائے۔ ہماری کون سی ٹرین چھوٹ رہی ہے۔ چند گھنٹے کی تاخیر سے سہی، ہم رقم لے کر اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو سکتے ہیں۔'' میں نے نازو کو قائل کرنے کی کوشش کی۔
''نہیں، ایسا ممکن نہیں ہے۔ اس سے کہو کہ اگر وہ دو گھنٹے کے اندر مال چیک کر کے رقم دے سکتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ تم کسی اور کو تلاش کرو۔''
''کوئی اور کیا دکان کھول کر بیٹھا ہے۔'' میں نے بھنا کر کہا۔
''تو تمہیں پچاس ہزار اور تیس فیصد کس بات کا دے رہی ہوں۔'' نازو بھی غرا کر بولی۔ ''مفت کی کھانے کے بجائے کچھ محنت کر کے کھاؤ۔''
''محنت کر کے کھانے کی عادت ہوتی تو تم جیسوں کے ساتھ کیوں ہوتا۔'' میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔
میں نازو کے ساتھ خاصی مغز ماری کے بعد بھی اسے قائل نہیں کر سکا کہ وہ سیٹھ چھوٹا بھائی کو سارا مال چیک کرنے کی اجازت دے دے۔ جھک مار کر میں چھوٹا بھائی کے پاس روانہ ہوا جو کسی کڑک مرغی کی طرح اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے پاس جانے کے لیے مجھے ایک بار پھر استاد والا حلیہ اپنانا پڑا۔ مجھے شرمندگی تو ہوئی کہ میں اس معزز حلیے کا نہایت غیر معززانہ استعمال کر رہا تھا لیکن کام تو نکلوانا تھا۔ چھوٹا بھائی نے مجھے گھورا۔
''تیرا پارٹی کیا بولتا؟''
''سیٹھ، وہ صرف دو گھنٹے کا ٹائم دے رہا ہے۔'' میں نے ٹوپی تلے آنے والا پسینا صاف کیا۔
چھوٹا بھائی نے سر دائیں بائیں ہلانا شروع کر دیا۔ ''دو گھنٹا کچھ بھی نہیں ہے۔ اتنا مال چیک کرنے میں تو پورا دن گزر جائے گا۔''
''چھوٹا بھائی! آپ خود سوچیں، یہ کوئی عام کام ہے جو پورا دن گزر جائے۔ اگلی پارٹی اتنا انتظار نہیں کر سکتی۔ یہ تو اس ہاتھ لے اور اس ہاتھ دے والا معاملہ ہے سرکار۔''
چھوٹا بھائی کا سر بدستور نفی میں ہلتا رہا۔ ''بابا! کھا بیس لاکھ کا معاملہ ہے۔ ایک چیز بھی چیک کیے بغیر نہیں لے گا۔ بعد میں گڑبڑ نکلا تو تیرے کو یا پارٹی کو کدھر تلاش کریں گا۔''
میں کچھ دیر چھوٹا بھائی سے مغز ماری کرتا رہا لیکن اس کی نہ، ہاں میں نہیں بدلی۔ میں مایوس ہو کر اٹھ رہا تھا کہ اچانک ہی مرزا اندر آیا۔ میں ایک لمحے کو بھونچکا رہ گیا اور پھر اس کی گردن دبوچنے والا تھا کہ مجھے خیال آیا کہ میں جلیل نہیں بلکہ احتشام الدین کاشغرستانی ہوں۔ مرزا نے مجھ پر توجہ نہیں دی اور چھوٹا بھائی سے زبردستی ہاتھ ملایا۔ ''کیا ہے... کائے کو آیا ہے؟'' چھوٹا بھائی نے دوسرے ہاتھ سے مجھے رخصت کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
''بہت اہم معاملہ ہے چھوٹا بھائی۔'' مرزا نے میری طرف توجہ دیتے ہوئے کہا تو میں نے جلدی سے رخ پھیر لیا۔ مرزا کی آنکھوں میں کسی نہایت مردار خور قسم کے گدھ کے لینس فٹ تھے اور وہ آدمی کو یوں پہچان جاتا تھا جیسے ماں دس بچوں میں اپنے لختِ جگر کو پہچان لیتی ہے۔ میں عجلت میں کمرے سے نکلا اور چھوٹا بھائی کے کلرک کم اکاؤنٹنٹ کے کمرے میں دروازے کے قریب رک گیا۔ اتفاق سے وہ لنچ کے لیے گیا ہوا تھا اور کمرا خالی تھا اس لیے مجھے وہاں رک کر مرزا اور چھوٹا بھائی کے درمیان ہونے والی گفتگو سننے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اس گفتگو کی بنیاد پر میرے ذہن میں ایک شاندار منصوبہ آ گیا۔ لیکن جب یہ منصوبہ میں نے نازو کے سامنے رکھا تو وہ اچھل پڑی۔

''تمہارا دماغ درست ہے جو مرزا کو اس معاملے میں شامل کر رہے ہو۔ وہ سب کھا پی کر ایسا غائب ہوگا کہ پھر اس کا سراغ بھی نہیں ملے گا۔''
''نہیں غائب ہوگا۔''
نازو نے سر پیٹ لیا۔ ''جلیل! تم مال اس کے حوالے کرنے کو کہہ رہے ہو؟''
''ہاں کیونکہ وہ مال چھوٹا بھائی کو بیچتا ہے اور چھوٹا بھائی اس کی وجہ سے جلد پے منٹ کر دے گا۔''
''مرزا کیا اس کا باپ لگا ہے جو وہ اس پر اعتبار کر کے ادائیگی کر دے گا؟'' نازو نے اعتراض کیا۔
''مرزا ایک طرح سے اس کا آدمی ہے۔ وہ اس پر اعتبار کرتا ہے۔''
''چلو ٹھیک ہے، وہ مرزا پر اعتبار کرتا ہے لیکن مرزا ہمارے لیے کیوں کام کرے گا؟''
''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔''
نازو نے نفی میں سر ہلایا۔ ''معاملہ بیس لاکھ کا ہے۔ میں اسے اپنے باپ پر بھی نہیں چھوڑ سکتی۔''
''اپنے باپ کے بارے میں تمہارے ذاتی خیالات جو بھی ہوں لیکن میں جلیل الزماں ہوں۔'' میں نے رکھائی سے کہا۔
''جانتی ہوں۔ تب ہی تو کہہ رہی ہوں۔''
''اس صورت میں بہتر ہے، تم خود کوئی کاٹھ کا الو تلاش کر لو۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔
نازو نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے بجائے وہ بولی۔ ''میں نے تمہیں جو پندرہ ہزار روپے دیے تھے ان کا کیا ہوگا؟''
''وہ ختم ہو گئے۔ میں نے جتنی بھاگ دوڑ کی ہے اس کا معاوضہ اس سے زیادہ ہی بنتا ہے۔ اگر تم کامیاب رہیں تو میں باقی لینے آ جاؤں گا۔'' میں نے جاتے ہوئے کہا تو نازو نے عقب سے دھڑام سے دروازہ بند کر دیا۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے میں نے خود سے کہا۔
''نازو بی بی! تم کیا سمجھ رہی ہو، گیم تو اب شروع ہوا ہے۔''
بدقسمتی سے ایک بار پھر میں اس منحوس کتے کو فراموش کر بیٹھا جو نہ جانے کیوں میرا دشمن بنا ہوا تھا۔ جیسے ہی میں عمارت سے باہر آیا، وہ میرے استقبال کے لیے موجود تھا لیکن اس بار میں نے بھاگنے کے بجائے اس سے وہی سلوک کیا جو کتوں کے ساتھ کرنا چاہیے اور تاک کر ایک لات اس کے جبڑے پر رسید کی۔ مجھے سب سے زیادہ خطرہ اس کے جبڑے سے ہی تھا۔ لات کھا کر اس کی آتش مزاجی میں خاصا افاقہ ہوا اور وہ فریاد بھری چیاؤں چیاؤں کرتا ایک طرف بھاگا اور میں بس اسٹاپ کی طرف روانہ ہو گیا۔
جب میں فتو کے کیفے ڈی پھونس پہنچا تو وہاں راجا اکیلا بیٹھا مسکرا رہا تھا اور یقیناً مستقبل کے سہانے خواب دیکھ رہا تھا۔ میں نے چپکے سے اس کے سامنے رکھے چائے کے کپ میں پانی ڈال دیا اور پھر اس کے سامنے بیٹھا تب بھی وہ سہانے خوابوں میں ہی کھویا رہا۔ مجبوراً مجھے اسے ہلانا پڑا۔ اب یہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ راجا بالکل حواسوں سے بیگانہ بیٹھا تھا اس لیے زمین سے اٹھ کر اس نے کپڑے جھاڑے اور مجھے نہایت غلط نظروں سے دیکھا۔ ''خبیث الزماں... تو ہمیشہ غلط وقت پر کیوں آتا ہے؟''
''کیوں، کیا تیرا ہیروئن کے ساتھ کھیتوں میں دوگانا چل رہا تھا؟''
''یہ فلم نہیں ہے جاہل۔'' اس نے کپ اٹھا کر منہ سے لگایا اور پھر اسے غور سے دیکھا۔ ''یہ فتو کمینہ کڑک کے نام پر پانی پلا رہا ہے۔''
''آج کل ڈراموں میں فلموں سے زیادہ میوزک ہو گیا ہے۔''
راجا کسی قدر قائل ہوا۔ ''ہاں، یہ تو ہے۔ ابھی شوٹنگ بھی نہیں ہوئی اور ڈرامے کا ٹائٹل سونگ تیار ہو رہا ہے۔''
''تو کب جا رہا ہے؟''
''شاید اگلے مہینے۔'' راجا نے بتایا۔ ''کاسٹ ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے۔''
''تب تو میرے ساتھ کچھ ضروری کام نمٹا سکتا ہے۔''
''میں پہلے ہی منع کر چکا ہوں۔'' راجا نے ہری جھنڈی دکھا دی
''دیکھ راجا! میرے ساتھ کمینہ پن نہ کر... اگر تو شرافت سے نہ مانا تو میرے پاس اور بھی طریقے ہیں۔''
''کیا کرے گا تو...؟'' راجا مسکرایا۔
''ابھی عارفہ کو پتا نہیں ہے اور جب میں اسے بتاؤں گا تو اس کے بغیر ڈرامے میں کسی اور کے ہیرو کا کردار ادا کر رہا ہے تو سوچ لے وہ کیا کرے گی۔''
راجا نے سچ مچ عارفہ سے چھپایا تھا اس لیے میری دھمکی سن کر اس کے ہاتھوں کے سارے طوطے مینا اڑ گئے۔ اس نے بلبلا کر کہا۔
''جلیل تو دوست نہیں، دوست کی پشت میں اتر جانے

والا خنجر ہے۔“

”اچھا، اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟“ میں نے طنز کیا۔

کچھ دیر کی بک بک کے بعد راجا مطلب کی بات پر آیا۔ ”کام کیا ہے اور اس میں مجھے کیا ملے گا؟“

”کام بہت آسان ہے۔ تجھے چھوٹا بھائی کے دفتر کی نگرانی کرنی ہے اور جیسے ہی وہاں کوئی حسین سی لڑکی یا عورت آئے، مجھے آگاہ کرنا ہے۔“

راجا نے غور کیا۔ ”یہ تو سارے دن کا کام ہے؟“

”نہیں، سارے دن کا نہیں صرف چھ گھنٹے کا ہے۔ یعنی دوپہر بارہ بجے سے لے کر شام چھ بجے تک۔“

”میں اس گرمی میں سارا دن چھوٹا بھائی کے دفتر کے سامنے بیٹھا رہوں گا؟“ راجا نے اعتراض کیا۔

”اگر تُو چاہے تو اس کے دفتر کے سامنے ایرانی ہوٹل میں بھی بیٹھ سکتا ہے اور تجھ سے سارا دن کوئی نہیں پوچھے گا کہ تو کیا کر رہا ہے۔“

راجا ایک نمبر کا حرام خور تھا۔ کسی کام کا ہوتا تو اپنے باپ کے بزنس کو نہ آگے بڑھا رہا ہوتا۔ اس لیے کام ذرا مشکل ہو، یہ سن کر اس کی جان نکل جاتی تھی۔ اس نے کہا۔ ”مجھے معاوضہ دینے کے بجائے تو خود کیوں نہیں نگرانی کر لیتا؟“

”میں ایک اور کام کروں گا۔ مجھے مرزا کی نگرانی کرنی ہے۔“

راجا اچھل پڑا۔ ”مرزا... وہ... کہاں ہے؟“ راجا نے اس کا تعلق کئی ناپاک اور حرام جانوروں سے جوڑنے کے بعد پوچھا۔

”فی الحال تو یہیں ہے۔“

”میں اسے قتل کر دوں گا۔“ راجا نے جوش سے کہا۔

”تبھی تجھے لڑکی والا کام سونپا ہے۔ اس میں قتل و قتل کا خطرہ نہیں ہے۔“

راجا نے کسی قدر اشتیاق سے پوچھا۔ ”لڑکی کون ہے اور کیسی ہے؟“

”تو جانتا ہے۔ چندے آفتاب اور چندے ماہتاب ہے لیکن تُو اس سے سخت خار کھاتا ہے۔“

”شنو ہے؟“ اس نے اندازہ لگایا۔

”نہیں، شنو کا ان سب معاملات سے کیا تعلق؟ وہ خالص گھریلو لڑکی ہے۔“ میں نے خفا ہو کر کہا۔

”جو بڑے بڑوں کو سیدھا کر سکتی ہے۔“ راجا نے معنی خیز انداز میں مجھے دیکھا۔ ”پھر کون ہے؟“

”نازو۔“ میں نے جواب دیا۔ حسبِ توقع راجا نے برا سا منہ بنایا۔

”میں اس کی نگرانی نہیں کر سکتا۔“

”بکواس نہ کر، وہ تجھے کھا نہیں جائے گی۔ اور ویسے بھی تجھے چھپ کر نگرانی کرنی ہے۔“

راجا مجبوراً مان گیا۔ ”ٹھیک ہے لیکن تُو نے بتایا نہیں کہ مجھے کیا ملے گا؟“

”پہلے مجھے تو کچھ مل جائے لیکن بیٹا، اس بار معاملہ لاکھوں کا ہے اس لیے کوئی حرام خوری نہیں چلے گی۔ پوری ہوشیاری سے کام کرنا۔ کوئی گڑبڑ ہوئی نا تیری وجہ سے تو تیرے ساتھ بھی اچھا نہیں ہوگا۔“ میں نے اسے خبردار کیا۔

راجا نے دانت نکوسے۔ ”اچھا اچھا، میرا باپ نہ بن... اور جلدی سے سو کا نوٹ نکال... حساب کتاب بعد میں کرتے رہنا۔“

راجا نامی یہ مشین نوٹوں کا تیل دیے بغیر حرکت میں نہیں آتی اس لیے مجھے اسے سو کا نوٹ دینا ہی پڑا۔ یہی بہت تھا کہ وہ میرا کام کرنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

☆☆☆

مرزا کا نیا ٹھکانا ایک پتلی سی عمارت کے چوتھے مالے پر تھا۔ یہ عمارت عملاً ہوا میں کھڑی تھی کیونکہ اس کے نیچے سوائے دس فٹ کی دکانوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ آگے پانچ فٹ کا چھجا نکال کر اس پر سات منزلہ عمارت کو اس طرح تعمیر کیا گیا تھا کہ اسکائی اسکریپر بنانے والے ماہرین دیکھ لیں تو ان کی عقل بھی چکرا جائے۔ میں علاقے کا نام نہیں لوں گا لیکن جو وہاں رہتے ہیں، وہ اس عمارت سے بہ خوبی واقف ہیں۔ اس میں چھوٹے چھوٹے بے شمار فلیٹس تھے جو ایک کمرے... باتھ روم اور کچن پر مشتمل تھے۔ عمارت دو نمبری لوگوں کا مسکن تھی۔ ان میں خواتین بھی شامل تھیں اور خواتین کا پیشہ ظاہر ہے۔ میں نے مرزا کا تعاقب کر کے اس عمارت کا پتا چلایا۔ پھر سامنے ہوٹل والے کے چھوٹے کو دس کا نوٹ دے کر مرزا کے فلیٹ کا پتا معلوم کیا۔ چھوٹا اتنا بھی چھوٹا نہیں تھا اور اسے سب معلوم تھا کہ کس فلیٹ میں کیا ہوتا ہے اور کس کا کیا دھندا ہے۔ میں نے مرزا کا اصل نام بتایا جو یہاں کسی کو نہیں معلوم تھا۔ لیکن جب میں نے حلیہ اور حرکتیں بتائیں تو چھوٹے نے کہا۔

”ایسے بول نا... چالو مرزا کی بات کر رہا ہے۔“

مرزا یہاں چالو مرزا کے نام سے مشہور تھا۔ یہ اس کی

عادت تھی یا نفسیاتی مجبوری کہ وہ جہاں جاتا اور کوئی نام اختیار کرتا تو اس میں مرزا کی پیوند کاری ضرور کرتا تھا۔ ایک بار اس نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ”اپنے پاس قابلِ عزت یہی چیز تو رہ گئی ہے۔“

”بیٹا تو آبا و اجداد کی بے عزتی کا باعث بن رہا ہے۔ مغلوں کی روحیں ان کی قبروں میں تڑپ رہی ہوں گی اور چنگیز خان زندہ ہوتا تو صرف تیری خاطر صحرائے گوبی سے گھوڑے دوڑاتا یہاں آ جاتا۔“

”میری خاطر کیوں؟“

”تاکہ تیرا سر وغیرہ شانوں سے جدا کر سکے۔“

میں صبح سویرے یعنی بارہ بجے والی عمارت کے سامنے موجود تھا۔ مرزا بدبخت ایک بجے نمودار ہوا اور اس نے سیدھا سامنے والے ہوٹل کا رخ کیا۔ وہاں سے ناشتا نما لنچ کر کے وہ روانہ ہو گیا اور میں اس کے جاتے ہی عمارت کی طرف لپکا۔ لیکن اوپر پہنچ کر میں چکرا گیا۔ چھوٹے نے کہا تھا، بائیں سے بارہ نمبر ہے اور سیڑھیاں کیونکہ پیچھے جا رہی تھیں اس لیے میری سمجھ میں نہیں آیا کہ فرنٹ سے بائیں طرف یا بیک سے بائیں طرف۔ جب سمجھ میں نہیں آیا تو میں نے دروازوں کا معائنہ کیا اور بائیں طرف سے بارھواں دروازہ مقفل پایا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تھا کہ برابر والا دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک قیامت نے جھانکا۔ وہ قیامت خیز حد تک مختصر لباس میں تھی اور شاید سو کر اٹھی تھی۔ اس نے منہ دھونے سے پہلے باہر جھانک لینا مناسب سمجھا، شاید کوئی صبح صبح آ گیا ہو۔ اس نے آنکھیں گھما کر مجھے دیکھا اور بولی۔ ”رانگ نمبر کیوں ملاتا ہے، ادھر آ نا۔“

الفاظ سے زیادہ مجھے اس کے لہجے پر پسینا آ گیا اور میں بوکھلا کر بولا۔ ”مجھے چالو مرزا سے ملنا ہے۔“

”وہ تو گیا... کمینے نے دروازہ اتنی زور سے بند کیا کہ میری آنکھ کھل گئی۔ رات والے کو بھگتاتے بھگتاتے صبح ہو گئی تھی۔“ اس نے ایک توبہ شکن انگڑائی کے ساتھ کہا۔ ”ادھر آ جا نا... مرزا تو آئے گا دو تین گھنٹے بعد... وقت اچھا گزر جائے گا۔“

میں نے دل میں لاحول پڑھی اور دل کڑا کر کے انکار کر دیا۔ ”معاف کرو مجھے... میں اس ٹائپ کا آدمی نہیں ہوں۔“

”مطلب یہ کہ آدمی نہیں ہو ورنہ تو مرد ایک ہی ٹائپ کے ہوتے ہیں۔“ وہ طنزیہ انداز میں ہنسی۔

”ہاں جیسا کہ تمہارا باپ تھا۔“ میں نے بھنا کر کہا اور واک آؤٹ کرنے کے انداز میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔ عقب سے دروازہ بند کرنے سے پہلے اس نے بہت اشتعال انگیز باتیں کی تھیں۔ لیکن میں چلتا رہا اور جیسے ہی اس نے دروازہ بند کیا۔ میں پھرتی سے اور دبے قدموں پلٹ آیا۔ یہی موقع تھا جب ساری عمارت سو رہی تھی۔ میں نے جیب سے ایک خاص چابی نکالی اور ایک منٹ کے اندر تالا کھول کر اندر پہنچ گیا۔ کمرے میں صرف ایک قالین تھا اور اس پر ایک گدا پڑا تھا۔ ایک طرف ایک خستہ حال سی الماری تھی لیکن کام کی چیز مجھے گدے اور قالین تلے سے ملی۔ دس منٹ میں اسے لے کر میں باہر نکلا اور جیسے ہی دروازہ بند کیا برابر والی نے پھر باہر جھانکا اور مجھے موجود پا کر معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ شکر ہے اس نے مجھے اندر سے برآمد ہوتے نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی اسے میری پشت پر موجود بیگ نظر آیا تھا۔

”کیا ہے بابو۔“ وہ بولی۔ ”نہیں کوئی اور شوق تو نہیں رکھتے ہو جو اس کے دروازے سے لگے بیٹھے ہو۔ ویسے میرے پاس اس کا بھی انتظام ہے۔“

”لاحول ولاقوۃ۔“ اس بار میں نے منہ سے کہا۔ ”تم نہایت واہیات عورت ہو۔“

”واہیات کو چھوڑو، یہ بتاؤ عورت کیسی ہوں؟“ اس نے ایک بار پھر خود کو ملاحظے کے لیے پیش کیا اور مجھے وہاں سے روانہ ہونے کا بہانہ مل گیا۔ اس نے پیچھے سے پکارا۔ ”مرزا آیا تو اسے بتاؤں گی، اس کا عاشق آیا تھا۔“

میں نے دل ہی دل میں اسے بے نقط سناتے ہوئے سیڑھیوں کا رخ کیا اور وہاں سے نکل آیا۔ جب مرزا گھر آتا تو اپنا سر ضرور پیٹ لیتا۔ میں اس کے لیے ایک پیغام بھی چھوڑ کر آیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ مرزا پیغام پاتے ہی فتو کے کیفے میں جا کر بیٹھ جائے گا جو رازدارانہ قسم کی باتوں کے لیے موزوں ترین جگہ تھی اور جہاں اکثر اوقات آدمی کو اپنے کہے الفاظ سنائی نہیں دیتے تھے۔ لیکن میں نے ذرا آرام سے جانے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ اس دوران میں مرزا میری بات ماننے کے لیے تیار ہو جائے۔

☆☆☆

”یہ نہیں ہو سکتا۔“ مرزا نے میرا مطالبہ سنتے ہی مسترد کر دیا۔

”تب اپنی جمع پونجی بھی بھول جا۔“ میں نے آرام سے کہا۔ یہ سنتے ہی مرزا کے چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہوئے جیسے اس نے قبض کشا معجون کھا لیا ہو اور اس کے پیٹ میں سویا ہوا آتش فشاں انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا ہو۔

''وہ میری ساری عمر کی کمائی ہے۔''

''دیکھ مرزا... تو سیدھی سی بات نہیں سمجھ رہا ہے۔ اگر تجھے اپنی کمائی واپس چاہیے تو میرا کام کرنا ہی ہوگا ورنہ میں سونے کی ان پلیٹوں کو سمندر برد کردوں گا۔''

''بکواس... تو ان کو کھا جائے گا۔'' مرزا نے اچھل کر کہا۔

میں نے ترحم آمیز نظروں سے اسے دیکھا۔ ''مرزا... تو اس وقت اپنی رہی سہی عقل سے بھی محروم ہوگیا ہے۔ اگر مجھے ان پلیٹوں کو کھانا ہوتا تو تیرے لیے پیغام چھوڑ کر کیوں آتا؟ اور دوسرے ان کو تو میں اب بھی کھا سکتا ہوں۔ کسی مائی کے لال، کالے اور پیلے میں مجال نہیں ہے کہ مجھ سے کچھ نکلوائے لیکن میں یہ دھندے چھوڑ چکا ہوں۔''

''جو تو مجھ سے کروانا چاہتا ہے وہ نیکی کا کام ہے نا؟'' اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''یہ میرا، چھوٹا بھائی اور نازو کا معاملہ ہے۔ میری ایک ڈیل تھی جس میں نازو نے مجھے ڈبل کراس کیا اور اب میں اس سے بدلہ لے رہا ہوں۔''

''بدلہ تو لے رہا ہے اور مارا میں جاؤں گا۔'' اس نے فریادی لہجے میں کہا۔ ''بعد میں چھوٹا بھائی مجھے کہاں چھوڑے گا اور وہ نازو کون سی کم ہے۔''

''تجھے کچھ نہیں ہوگا۔''

مرزا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تو نہیں جانتا چھوٹا بھائی ایسے ہی یہاں بیٹھا لاکھوں کروڑوں کا بزنس نہیں کر رہا ہے۔ اسے استادوں کی ضمانت حاصل ہے۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' میں نے کہا۔

''تب تو مجھے مروانا چاہتا ہے۔'' مرزا پھر بلبلایا۔ ''تو ایک تیر سے دو شکار کر رہا ہے۔ میں مرجاؤں گا تو تیرا بدلہ پورا ہوجائے گا اور سونا بھی تیرا ہوجائے گا۔''

''تجھے کچھ نہیں ہوگا۔ اگر تو میرے کہنے پر عمل کرے تو۔''

مرزا نے گہری سانس لی اور بولا۔ ''دیکھ تو چاہتا ہے کہ میں نازو اور چھوٹا بھائی کی ڈیل کرادوں؟''

''بالکل۔''

''اور تو یہ بھی چاہتا ہے کہ جب پے منٹ کا وقت آئے تو کل رقم میں سے تیس فیصد نکال لوں؟''

''بالکل میں یہی چاہتا ہوں۔''

''تو نازو یا چھوٹا بھائی عقل سے پیدل ہیں جن کو اس کا پتا نہیں چلے گا؟'' اس نے سر پیٹ کر کہا۔

''نہیں پتا چلے گا، یہ میرا پلان ہے بیٹا۔ تیرے یار راجا جیسے کسی للو پنجو کا نہیں ہے۔'' میں نے دانت نکالے۔

''پلان کیا ہے؟'' مرزا نے فوراً سوال کیا۔

''یہ میں تجھے اس وقت بتاؤں گا جب تو راضی ہو جائے گا۔''

مرزا کی صورت رو دینے والی ہو رہی تھی۔ ''تو میرے پاس اور راستہ ہی کون سا بچا ہے؟''

میں خوش ہوگیا۔ ''یعنی تو راضی ہے؟''

''ظاہر ہے۔'' مرزا رقت آمیز لہجے میں بولا۔ ''جلیل یار! تو میری سونے کی پلیٹیں واپس کردے گا نا؟''

''اگرچہ تو اس قابل تو نہیں ہے لیکن میں نے کہا نا کہ میں ان دھندوں سے تائب ہو چکا ہوں۔ اس لیے واپس کر دوں گا۔''

''ایسے نہیں، شنو کی قسم کھا کر کہہ۔''

''اپنے معاملات میں میں شنو کی قسم نہیں کھا سکتا۔ اگر تو نے یقین کرنا ہے تو ایسے ہی کرلے ورنہ تیری مرضی جو چاہے کر۔''

میں جانتا تھا کہ مرزا کچھ اور کر بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کی شہ رگ میرے انگوٹھے تلے تھی اور اس وقت میں اس سے جو کہتا، اس کا باپ بھی مانتا۔ اسے یہ بات بھی ماننا پڑی۔ میں نے جس دن راجا کو چھوٹا بھائی کے دفتر کی نگرانی پر لگایا تھا اس سے اگلے ہی دن نازو نے وہاں قدم رنجہ فرمایا اور راجا نے فوراً مجھے اطلاع دی۔ میں نے نازو کا واپسی میں تعاقب کیا۔ وہ صورت سے مایوس لگ رہی تھی۔ یعنی چھوٹا بھائی نے اسے بھی وہی جواب دیا تھا۔ اب میرا کام شروع ہوگیا۔ میں نے پہلے مرزا کی جمع پونجی غائب کی۔ مجھے معلوم تھا اس کے پاس جو ہوتا ہے، وہ اپنے پاس ہی رکھتا ہے۔ اب سونے کی یہ پلیٹیں جن کا وزن کم سے کم بھی ایک کلوگرام تھا، میرے قبضے میں تھیں۔ ''دیکھ مرزا! تجھے پہلے نازو سے رابطہ کرنا ہوگا۔''

''نازو...'' مرزا بدکا۔ ''وہ مجھے دیکھتے ہی قتل کرنے کی کوشش کرے گی۔''

''احمق، تجھے دو بدو نہیں جانا ہے، اس سے موبائل پر رابطہ کرنا ہے۔''

''میرے پاس اس کا نمبر نہیں ہے۔''

''مرزا احمق، جب تجھے ساری معلومات میں دے رہا ہوں تو اس کا نمبر بھی دوں گا۔''

''پھر مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''تو نازو اور چھوٹا بھائی کے درمیان سودا کرائے گا۔

تیرا کام چھوٹا بھائی کو جلد ادائیگی پر آمادہ کرنا ہے۔''

''یہ بہت مشکل کام ہے۔ میں بھینس کو ریس میں حصہ لینے کے لیے تیار کر سکتا ہوں لیکن چھوٹا بھائی...''

''مرزا! یہ کام تو تجھے کرنا ہے ورنہ میں وہ پلیٹیں سمندر میں پھینک کر خود ہاتھ جھاڑ کر چلا جاؤں گا۔''

''تو ایسا نہیں کرے گا۔'' مرزا نے رو دینے والے لہجے میں کہا۔

''تب تو ویسا کرے گا جیسا میں کہہ رہا ہوں۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔

''میں ایسا ہی کروں گا۔'' مرزا یوں بولا جیسے دھاڑیں مار کر رونا چاہ رہا ہو۔ میں دل ہی دل میں مسکرایا۔

''مرزا... تو نے راجا کو استعمال کرتے وقت سوچا تھا کہ تجھ پر بھی ایسا وقت آسکتا ہے؟'' میں نے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔ ''اس بات پر خدا کا شکر ادا کر کہ میں نے تجھے معاف کردیا۔''

''تو نے معاف کیا ہے، راجا نے تو معاف نہیں کیا۔'' مرزا نے ناک سڑکتے ہوئے کہا۔ ''وہ تو جہاں مجھے دیکھے گا، پاگل کتے کی طرح چمٹ جائے گا۔''

''اور وہ اس میں حق بہ جانب ہوگا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''لیکن تو فکر نہ کر... اگر میرا کام تسلی بخش طریقے سے کر دیا تو میں راجا سے بھی تیری جان چھڑوا دوں گا اور اس کے بعد تو بے فکری سے رہ سکتا ہے۔''

مرزا اتنی آسانی سے مان جانے والوں میں سے نہیں تھا۔ اس پر تو مار پیٹ کا اثر بھی نہیں ہوتا تھا اور میں خود ہاتھا پائی سے گریز کرتا ہوں۔ جب کام لینے کے لیے دماغ ہے تو بلاوجہ ہاتھ پیروں کو حرکت دینے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر مرزا کی جان میرے قبضے میں نہ ہوتی تو وہ کبھی اتنی شرافت سے راضی نہ ہوتا لیکن مجھے اب بھی اطمینان نہیں تھا۔ مرزا ایک نمبر کا کمینہ تھا اور اس کے سر میں شیطان کا دماغ فٹ تھا جو ترکیبیں سوچنے کا ماہر تھا۔ مرزا روانہ ہوا تو راجا آن ٹپکا۔ میں نے اسے دیکھ کر منہ بنایا۔ ''اب تو نے کیا میری جاسوسی شروع کردی ہے؟''

راجا نے دانت نکالے۔ ''وہ بھی بلا معاوضہ... یہ کمینہ کیا کہہ رہا تھا؟''

''میں اسے ایک کام پر راضی کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔'' راجا نے مشکوک نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''جلیل! مجھے لگ رہا ہے کہ تو مجھ سے کچھ چھپا رہا ہے اور یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔''

''تیری جان کی قسم، میں تجھ سے کچھ نہیں چھپا رہا... اور

اگر چھپا رہا ہوں تو صرف وہ جس سے تیرا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"میرا حصہ کب ملے گا؟"

"جب مجھے کچھ ملے گا۔" میں نے کہا اور کینفے ڈی پھونس سے روانہ ہو گیا۔ راجا وہیں غور و فکر کرتا رہ گیا اور جب بل اس کے سر پڑتا تو اس وقت کا سوچ کر ہی میرا دل باغ باغ ہونے لگا۔

☆☆☆

میں بے تابی سے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ اماں نے غور سے مجھے دیکھا۔ "جلیل! کیا بات ہے، کیا شنو سے ملنے کا وقت طے ہے؟"

میں کھسیا گیا۔ "نہیں اماں... تم بس ایک ہی بات سوچ سکتی ہو۔"

اماں نے مشکوک انداز میں دیکھا۔ "پھر کیا بات ہے میرے بچے؟ تو گھر میں سوائے چارپائی توڑنے کے اور کچھ نہیں کرتا ہے۔"

ہاں، یہ تو واقعی ٹھیک تھا۔ میں فوراً بیٹھ گیا۔ انتظار تو بیٹھ کر بھی کیا جا سکتا تھا۔ مجھے مرزا کے فون کا انتظار تھا اور میں نے خلیل سے اس کا موبائل ادھار لے لیا تھا۔ شام ہو رہی تھی اور مجھے چھت پر بھی جانا تھا لیکن شنو کے سامنے کال یا ایس ایم ایس آ جاتا تو وہ بلاخیز حسینہ میرے سر ہو جاتی اور جب تک سب کچھ جان نہیں لیتی، میری جان بخشی نہ کرتی۔ اور اسے پتا چل جاتا کہ میرے پاس کچھ رقم آنے والی ہے تو وہ پیشگی اسے اپنے شادی اکاؤنٹ میں جمع کرا لیتی۔ ورنہ میں اوپر ہی چلا جاتا، کچھ وقت اچھا کٹ جاتا۔

چھ بجے مرزا کی کال آئی۔ "کام ہو گیا ہے... مال آج رات آٹھ بجے چھوٹا بھائی کے گودام پر آئے گا اور دس بجے وہ پے منٹ کر دے گا۔"

"گڈ... کتنی پے منٹ کرے گا؟"

"دس لاکھ۔" مرزا نے کہا۔ "مجھے نازو کو پہنچانی ہے۔"

"اس نے تجھ پر اعتماد کر لیا؟"

مرزا ہنسا۔ "یار! میں تجھ سے کوئی کم ہوں... بس شکل سے مار کھاتا ہوں۔"

"ہاں ورنہ عقل میں تو تو ٹارزن سے بھی سوا ہے۔"

"واقعی؟" وہ خوش ہوا۔

"ہاں اور اب غور سے سن۔ میں وہاں آ رہا ہوں۔ میرے پاس ایک پیکٹ ہوگا جس میں ہزار کے نوٹوں والی تین گڈیاں ہوں گی۔ یعنی تین لاکھ روپے ہوں گے اور تو نے یہ تین گڈیاں اس رقم میں رکھنی ہیں جو چھوٹا بھائی دے گا اور اس میں سے تین گڈیاں مجھے لا دینی ہیں۔"

"تو رقم لے کر کہاں آئے گا؟"

"گودام کی پچھلی طرف جو گلی ہے، وہاں آؤں گا۔ ٹھیک آٹھ بجے۔ تو اصل رقم لائے گا اور یہ لے جائے گا۔"

"میری پلیٹیں؟"

"وہ تجھے کل صبح مل جائیں گی، اگر تو نے کوئی کمینہ پن نہ کیا تو؟"

"کل کیوں..." مرزا چلانے لگا لیکن میں نے لائن کاٹ دی اور فوری طور پر روانہ ہو گیا۔ میں نے خلیل کی بائک بھی ادھار لے لی تھی۔ اس پر خلیل نے بھنا کر کہا۔ "کچھ اپنے اوپر بھی خرچ کر لیا کرو۔ اس نہ ہونے والی بھابھی کو بھرتے رہو گے۔"

"اس بار لے لوں گا۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "اور تیری ہونے والی بھابھی کو اس کی ہوا بھی نہیں لگے گی۔"

"ایک معاملے میں تو وہ ابھی سے بیوی بن گئی ہے۔" خلیل نے بادل ناخواستہ مجھے چابی دی۔ "جہاں تیرے پاس نوٹ آنے لگتے ہیں، اسے خود بہ خود اطلاع ہو جاتی ہے۔"

میں نازو کے فلیٹ کی عمارت کے سامنے پہنچا تو وہ نکل رہی تھی۔ اس نے ایک ٹیکسی لی اور روانہ ہو گئی۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ ٹیکسی کی وجہ سے مجھے بہت محتاط ہونا پڑ رہا تھا کیونکہ سڑک پر اس جیسی درجنوں ییلو کیبس تھیں اور ذرا سی غلطی سے وہ میری نظروں سے اوجھل ہو سکتی تھی۔ اگرچہ مجھے معلوم تھا کہ اس نے کہاں پہنچنا ہے لیکن میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ مال کہاں سے لیتی ہے۔ آدھ گھنٹے بعد وہ صدر کے پرانے علاقے میں ایک بڑے گیٹ والی دکان کے سامنے پہنچی اور اس نے وہاں موجود ایک ڈرائیور نما حلیے والے شخص کو چابی دے کر اس کا تالا کھلوایا۔ اندر ایک درمیانہ ٹرک موجود تھا۔ ڈرائیور نے اسے باہر نکالا اور ٹیکسی کے پیچھے چل پڑا۔ دس منٹ بعد ایک ویران میدان میں نازو نے ٹرک مرزا کے حوالے کیا اور جیسے ہی وہ ٹرک لے کر روانہ ہوا، نازو بھی ٹیکسی میں اس کے پیچھے لگ گئی اور ٹیکسی کے پیچھے میں تھا۔ بیس منٹ بعد یہ قافلہ چھوٹا بھائی کے گودام کے سامنے تھا اور میں اسے چھوڑ کر عقبی گلی میں آ گیا۔ آٹھ بجنے میں دس منٹ تھے لیکن کام شروع ہو جانا تھا اور اب مجھے مرزا کا انتظار تھا۔ وہ آدھ گھنٹے بعد آیا اور سخت بدحواس تھا۔

"جلیل، تو مجھے مروائے گا۔ ان لوگوں کو کیسے چکر دے کر آیا ہوں، یہ مجھے ہی پتا ہے۔" اس نے مجھے لفافہ دیا جس میں تین لاکھ روپے تھے۔ میں نے اسے دوسرا لفافہ دیا۔

"فکر مت کر، تجھے کچھ نہیں ہوگا۔"

"کیسے نہیں ہوگا؟" اس نے رو دینے والے لہجے میں کہا۔ "جب نازو کو یہ دو نمبر نوٹ ملیں گے تو وہ کس کو پکڑے گی؟"

"تم مکر جانا کہ نوٹ چھوٹا بھائی نے دیے ہیں۔"

"اور جب چھوٹا بھائی پوچھے تو کیا کہوں؟"

"یہی کہ نازو چکر دے رہی ہے۔ اور تم فکر مت کرو، نازو کبھی چھوٹا بھائی سے بات نہیں کرے گی کیونکہ وہ خود اس سے چھپتی پھر رہی ہے۔"

مرزا کو فوراً تجسس لاحق ہو گیا۔ "کس چکر میں؟"

"وہ چکر کچھ اور ہے۔" میں نے اسے ٹالا۔ "اس لفافے میں اصل مال ہے نا؟"

"ایک دم کھرا۔" مرزا بولا اور اندر کی طرف لپکا۔ میں نے لفافہ اپنے اپر میں ڈالا اور عجلت میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔ کچھ دیر بعد میں اپنے گھر پر تھا اور میں نے کمرے میں جا کر دروازہ بند کرتے ہی بے تابی سے لفافہ کھولا۔ اس میں ہزار ہزار کے نوٹوں والی تین گڈیاں تھیں۔ میرا خوشی سے برا حال ہو گیا۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی لاکھوں کمائے تھے لیکن ان کی خوشی کچھ اور تھی۔ سب سے زیادہ خوشی مجھے نازو کو چونا لگانے کی ہو رہی تھی۔ اس نے میرے ساتھ ہاتھ کیا تھا۔

اصل میں نازو نے مجھے صرف اس لیے ملایا تھا کہ اپنے باس کو میری شکل دکھا دے۔ اس کے بعد اسے میری ضرورت نہیں رہی تھی اور اس نے بہانے سے مجھ سے جان چھڑا لی۔ پندرہ ہزار دے کر وہ پہلے ہی اپنے طور پر میرا حساب بے باق کر چکی تھی۔ میں نے گڈیوں کو چوما اور دل میں کہا۔ "نازو! تمہارا حساب تو اب بے باق ہوا ہے۔"

نوٹ سارے اصلی تھے ورنہ مجھے چھوٹا بھائی سے خدشہ تھا کہ وہ مال کے بدلے جعلی نوٹ نہ تھما دے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اس رقم کی میں شنو کو ہوا بھی لگنے نہیں دوں گا۔ میں پہلے ایک عدد بائک لوں گا اور اس کے بعد ایک عدد موبائل کیونکہ خلیل نے مجھے وارننگ دے دی تھی کہ اب وہ مجھے نہ موبائل دے گا اور نہ بائک۔ اس وقت بھی وہ کہیں باہر تھا ورنہ اسے اپنا موبائل یاد آ جاتا۔ دو گھنٹے بعد نازو کی کال آئی۔ جیسے ہی میں نے کال ریسیو کی، دوسری طرف سے گالیوں کی بوچھاڑ آئی۔ میں لطف اندوز ہوتا رہا لیکن جب نازو اور ہونے لگی تو میں نے اسے روک دیا۔ "بس بہت ہو گیا... کیا تم نے کبھی اپنی حرکتوں پر غور کیا ہے؟ ہمیشہ مجھے استعمال کیا اور جب مطلب نکل گیا تو خود بھی نکل گئیں۔ میں نے جب تمہارا ساتھ دیا، تم نے دھوکا ہی کیا۔"

"میں نے کب دھوکا دیا؟" وہ غرائی۔ "اور تین لاکھ کا دھوکا۔"

اب میں نے اسے بتانا شروع کیا کہ اس نے کب کب مجھے دھوکا دیا تھا اور کسی بھی دھوکے پر آج تک شرمندہ نہیں ہوئی تھی۔ وہ کچھ مزاحمت کرتی رہی لیکن پھر ایسا لگا جیسے شرمندہ ہو گئی ہو۔ میں نے آخر میں کہا۔ "نازو! تیرے ساتھ ایک پرانا تعلق تھا اور میں اس کا سوچ کر ہمیشہ خاموش ہو جاتا تھا لیکن تو نے شاید سمجھ لیا کہ جلیل احمق ہو گیا ہے۔"

"یہ بات نہیں ہے۔" شیرنی کی طرح دھاڑنے والی اب کوئل کی طرح منمنا رہی تھی۔ "لیکن تین لاکھ... جلیل تو نے ایک ہی بار میں سارا حساب بے باق کر دیا ہے۔"

"یہ میرا حصہ تھا کیونکہ تو نے مجھ سے جو کام لینا تھا، وہ لے لیا اور جو معاوضہ طے ہوا تھا، وہ نہیں دیا۔"

"کون سا کام؟" اس نے انجان بننے کی کوشش کی۔

"تمہارے باس کو صورت دکھانے کا کام... اور ابھی میں اسے حقیقت بتا دوں تو اس کا ردِعمل کیا ہوگا؟"

"ارے نہیں۔" وہ بوکھلا کر بولی۔ "چل ٹھیک ہے، تین لاکھ تیرے۔"

"حالانکہ ابھی حساب پورا نہیں ہوا۔"

وہ بھنا گئی۔ "اب بھی حساب باقی ہے؟"

"ہاں تو نے پچاس نقد دینے کی بات کی تھی اور پندرہ دیے تھے۔ ابھی پینتیس ہزار باقی ہیں۔ وہ کب دے رہی ہو؟"

"ان کو بھول جاؤ۔" اس نے صاف جواب دیا۔ "اور اب فلیٹ کی طرف مت آنا، میں وہاں نہیں ملوں گی۔"

"مجھے معلوم ہے، تم کسی نئی اسامی کی تلاش میں نکل گئی ہو گی۔" میں ہنسا۔ "میری شرافت دیکھو، اپنا تیس فیصد ہی لیا۔ چاہتا تو یہ پینتیس ہزار بھی نکلوا لیتا۔"

نازو نے جھنجلا کر فون بند کر دیا۔ میں مسکرایا۔ ابھی مجھے راجا اور مرزا سے بھی نمٹنا تھا لیکن یہ کل کی بات تھی۔ ابھی میرا کسی سے ملنے کا موڈ نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن میری قسمت میں آرام نہیں تھا۔ میں بستر پر دراز ہو کر سہانے سپنوں میں کھونے جا رہا تھا کہ باہر سے کتے کے رونے کی آواز آئی۔ یہ راجا منحوس تھا۔ باہر سے اماں نے آواز دی۔ "جلیل! جا کر اس کمینے کو چپ کرا، ورنہ اس کے حلق میں جوتی اتار دوں گی۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لی اور باہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

ان عاشق پروانوں کا ماجرائے خاص جو للکار سننے اور للکارنے کے دھنی تھے

للکار

طاہر جاوید مغل

قسط 40
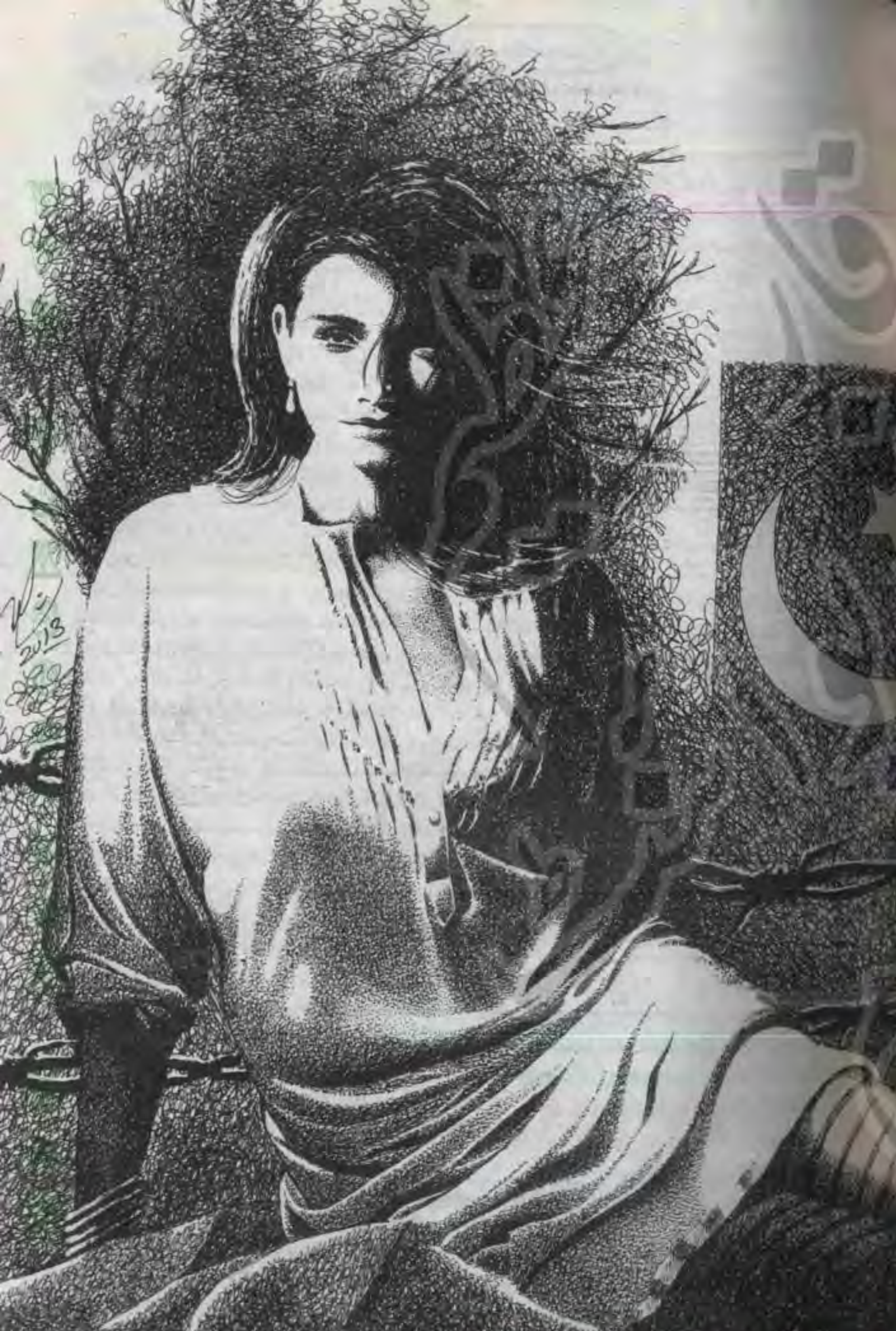
زمانۂ قدیم سے عاشق وہ غبارِ خاک ہے جو یہاں سے وہاں اڑتا پھرتا ہے۔ خود داری اور انا کو بالائے طاق رکھ کر کوئے یار کے طواف میں محو رہتا ہے... مگر آج عشق کی اقدار میں تبدیلی... وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا ہے... جس نے عشق کا منظر نامہ بدل ڈالا ہے... کرداروں میں بھی تبدیلی آچکی ہے... سرپھرے عاشق نے اب ایسے شخص کا روپ دھارا جو اپنے جذبے اور شعور سے کام لے کر محبت اور محبت کے ساتھ ساتھ دیگر فرائض و منصب کو بھی پیش نظر رکھتا ہے... ایسے ہی عاشقوں کے گرد گھومتی داستانِ محبت جہاں ایک عاشق عشق پیشہ ہے... عشق میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی اور قدر ہے... جبکہ دوسرے عاشق کا مطمح نظر مختلف ہے۔ زندگی اور دنیا کی وسعت نے اس کے قلب و نظر... عقل و شعور اور جذبِ عشق میں کشادگی کو بھر دیا ہے... کائنات کا ہر مسئلہ اس کے پیشِ نظر... ایک للکار ہے۔

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ایک شرمیلا اور کم گو نوجوان تھا۔ ثروت میری محبت اور منگیتر تھی۔ سیٹھ سراج کے اوباش بیٹے واجد عرف واجی نے ثروت کو اغوا کرلیا۔ ثروت کے ماتھے پر ایک ایسا داغ لگ گیا جس نے نہ صرف اس کے والدین کی جان لی بلکہ اسے اور اس کے گھر والوں کو ملک چھوڑنے پر بھی مجبور کر دیا۔ پھر میری ملاقات عمران دانش سے ہوئی۔ میرا اور ثروت کا بدلہ چکانے کے لیے عمران ہاتھ دھو کر سیٹھ سراج کے پیچھے پڑ گیا... جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ سیٹھ سراج لالہ کوٹھیوں میں رہنے والی ... میڈم صفورا کے لیے کام کرتا ہے۔ عمران کے ہاتھوں نادیہ کی موت کے بعد میڈم کے ہرکارے ہمارے پیچھے لگ گئے۔ اسی دوران میں ماں کی اندوہناک موت نے میرے ہوش وحواس چھین لیے۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک اجنبی جگہ پایا۔ یہاں ایک راجپوت لڑکی سلطانہ نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ وہ میری بیوی ہے اور ہمارا ایک بچہ بھی ہے اور میں پاکستان میں نہیں بلکہ انڈیا میں ہوں اور دو برسوں کے بعد ہوش میں آیا ہوں۔ میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور اپنے ساتھیوں سے جاملا۔ ہم نے جارج کی سوتیلی بہن ماریا کو اغوا کرلیا۔ ہم جوڈو کراٹے کے نامور چیمپئن جگی کو اپنے ساتھ لے آئے۔ ہمارے ایک ساتھی کی غداری کی وجہ سے ماریا ہمارے ہاتھ سے نکل گئی۔ جگی کی حالت خراب تھی۔ جگی نے دم توڑ دیا۔ میں، سلطانہ اور آفتاب ایک گاؤں کے شفاخانے میں گھس گئے۔ انہوں نے وہاں موجود مریضوں اور اسٹاف کو یرغمال بنالیا اور اپنی باتیں منوانے کے لیے آفتاب نے ایک ایک کر کے یرغمالیوں کو مارنا شروع کر دیا۔ پھر مقابلہ ہوا اور ماریا ماری گئی۔ آفتاب اور سلطانہ کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ہمیں زرگاں کی جیل میں پہنچا دیا گیا۔ ہم وہاں سے فرار ہو کر پرانے قلعے میں آ گئے۔ پھر چھوٹے سرکار کی طرف سے ہمیں کمک مل گئی اور ہم لڑائی جیت گئے۔ ہم لوگ چھوٹے سرکار کے تعاون سے زرگاں سے نکلے اور الٰہ آباد پہنچ گئے پھر ہمیں ریان ولیم کی جانب سے ایک کام کی آفر ہوئی۔ ہمیں سہراب جلالی نامی ایک رسیدہ شخص کے پاس کسی خاص شے کے موجود ہونے کا پتا لگانا تھا۔ میں اور عمران باورچی کے روپ میں سہراب جلالی کے ہاں پہنچ گئے۔ اس کی دیکھ بھال کے لیے دو خوب صورت ڈاکٹرز بھی موجود تھیں۔ ڈاکٹر مہناز نے جلالی سے خفیہ نکاح کرلیا تھا۔ مجھے کچھ لوگوں نے قید کرلیا۔ جلالی کا سیکریٹری ندیم جاوا گروپ سے ملا ہوا تھا۔ پھر میں نے جاوا کو دیکھا۔ میں وہاں سے بھاگ نکلا اور عمران تک پہنچ گیا۔ راجا کو ہوٹل میں چھوڑ کر میں اور عمران فارم ہاؤس آئے۔ ایک رات پتا چلا کہ مہناز فارم ہاؤس سے کسی کے ساتھ فرار ہو گئی ہے۔ جلالی صاحب موت کے قریب تھے۔ انہیں اسپتال پہنچایا گیا۔ ہم مہناز کی والدہ کو لے کر ڈیفنس والی کوٹھی پر آ گئے۔ اسی دوران میں ہمیں مہناز کے حوالے سے تھوڑا سا سراغ ملا۔ ایک دن جیلانی کے ذریعے ہمیں پتا چلا کہ یوسف ایک بنگلے میں کسی ڈی ہیروئن کے ساتھ رات گزار رہا ہے۔ وہاں سے واپسی میں اس کا جھگڑا ہو گیا۔ مجھے مدد کے لیے پہنچنا پڑا تاہم اس دوران میں یوسف زخمی ہو چکا تھا۔ اسے اسپتال پہنچایا گیا۔ پھر یوسف اسپتال سے غائب ہو گیا...... یوسف کی تلاش میں، میں اور ثروت پاکستانی بارڈر پار کر گئے۔ ہمیں چودھری کے کارندوں نے گھیر لیا تاہم میری جنونیت کے آگے وہ سب پسپا ہو گئے۔ ہم وہاں سے بھاگ کر ایک ٹیلے پر پہنچ گئے اور یہاں سے جگت سنگھ نامی ایک سکھ کی مدد سے نکل کر اس کے گھر پہنچ گئے۔ ہم پاکستانی بارڈر پار کر گئے تھے اور اس وقت انڈین علاقے میں تھے۔ جگت سنگھ کی مدد سے ہم نے یوسف کا سراغ لگایا جو ایک سکھ سردار کی حویلی میں قید تھا۔ میں اور ثروت ملازم بن کر سکھ سردار اوتار سنگھ کی حویلی میں پہنچ گئے۔ میں یوسف کو وہاں سے نکالنا چاہتا تھا۔ میں نے جگت سنگھ کی مدد لی۔ جس رات یوسف کو خطرناک سفر پر لے جایا جانا تھا، اوتار سنگھ کے مخالفین نے حویلی پر ہلا بول دیا جس کی وجہ سے ہم وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ یوسف نے ثروت کو میرے خلاف بھڑکا دیا تھا۔ وہ دونوں مجھ سے اکھڑے اکھڑے تھے۔ ایک موقع پر وہ دونوں مجھے چھوڑ کر نکل گئے۔ تاہم پھر میں ہی ان کی مدد کو پہنچا۔ ہم بھاگ کر ایک گاؤں میں پہنچ گئے۔ جگت بھی ہمارے ساتھ تھا۔ پھر مخبری پر وہاں جاوا پہنچ گیا۔ جگت کی منہ بولی بیوی اور بھائی کو بندر مارے گئے۔ ثروت بھاگ نکلی تھی تاہم اسے بھی پکڑ لیا گیا۔ پھر جاوا نے مجھے الگ کمرے میں بات کرنے کے لیے بلایا اور کہا کہ وہ مجھے اور عمران کو بخش دے گا۔ ہمیں ایک گیم میں حصہ لینا تھا جس میں ریوالور اپنی کنپٹی پر رکھ کر گولی چلانی تھی اور اس کے پانچ خانوں میں گولیاں ہوتیں جبکہ ایک خانہ خالی ہوتا۔ تاہم اس حوالے سے عمران اور جاوا میں معاملات طے پا گئے۔ عمران یہ کھیل کھیلنے پر راضی ہو گیا۔ ادھر یوسف کو وہاں سے بھگا دیا گیا اور وہ پاکستان پہنچ گیا۔ ہمیں دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا۔ یہ ایک کوٹھی تھی۔ میں اور ثروت ایک ساتھ تھے۔ پھر عمران نے خطرناک سرکس میں حصہ لیا مگر ریوالور والا کھیل نہیں کھیلا۔ عمران کی جاوا سے ڈیل ہو گئی تھی اور اس نے جاوا کو آراکوئے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ یوں مجھے اور عمران کو وہاں سے رہا کیا گیا۔ تاہم ثروت ضمانت کے طور پر وہیں رہتی۔ ہم ممبئی پہنچ گئے اور وہاں ایشوریا کی ہم شکل لڑکی کو دیکھ کر اس کا پیچھا کیا اور گولڈن بلڈنگ پہنچ گئے۔ وہاں سیٹھ سراج اور واجی کو دیکھ کر میرا خون کھولنے لگا۔ واجی اور سیٹھ سراج اپنے انجام کو پہنچے۔ ہم نے گولڈن بلڈنگ کو بم سے اڑا دیا۔ وہاں جگت سنگھ بھی قید تھا۔ ہم نے اسے بھی رہا کرایا اور ایشوریا کی ہم شکل اور دو اور لڑکیوں کو اپنے ساتھ لے آئے۔ ابرار صدیقی بھی وہیں مل گیا تھا۔ ہم نے ابرار صدیقی سے آراکوئے سے متعلق معلومات لینے کی کوشش کی تاہم وہ بہت ڈرا ہوا تھا۔ ہم موہن کمار نامی ایک چور کے ساتھ دواری مندر میں گھس گئے۔ وہاں مہناز قید تھی۔ آراکوئے بھی وہیں تھا۔ مہناز کی بلی دی جانی تھی۔ ہم ایکشن میں آنے کے لیے تیار تھے کہ وہاں دو گروپوں میں گھمسان کا رن پڑ گیا۔ گولیاں چلنے لگیں۔ مہناز کو کسی وقت بھی گولی لگ سکتی تھی۔ وہ اسٹریچر نما تختے سے بندھی ہوئی تھی۔ ہم نے اسے اٹھایا اور نکلنے لگے۔ اچانک ہم پر برسٹ چلایا گیا۔ ہم تختے سمیت گر گئے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

گولیاں ہمارے سروں پر سے سنسناتی ہوئی گزر گئی تھیں۔ ہم نے ایک بار پھر مہناز والا اسٹریچر نما تختہ اٹھایا اور گول ستونوں والے برآمدے کی طرف بڑھے۔ ہر طرف شعلے چمک رہے تھے اور فائرنگ کی گونج دار آوازیں تھیں۔ بائیں طرف سے برآمد ہونے والے ایک تنومند بھکشو نے عمران پر تلوار کا وار کرنا چاہا۔ میں نے اس کے سینے پر رائفل کا

پورا برسٹ مارا اور عمران تک پہنچنے سے پہلے ہی ڈھیر کر دیا۔

ہم گول ستونوں والے برآمدے میں پہنچے۔ جگت سنگھ اپنی مقررہ جگہ پر موجود نہیں تھا۔ ''کہاں دفع ہو گیا؟'' عمران نے بلند آواز سے کہا۔

ہم نے چاروں طرف دیکھا۔ وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ عمران نے اسٹریچر نما تختے کو ایک تاریک گوشے میں رکھا اور بولا۔ ''میں اسے دیکھ کر آتا ہوں۔''

میں اسے روکتا ہی رہ گیا لیکن وہ کسی کی کب سنتا تھا۔ وہ اس کمرے کی طرف لپک گیا جہاں زخمی گرو وستھا ایک الماری کے خانے میں بند تھا اور جگت کو اس کا پہرا دینا تھا۔

عمران کی واپسی دو منٹ کے اندر ہی ہو گئی۔ ''ملا؟'' میں نے چلا کر پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے بھی چلا کر جواب دیا... اور اسٹریچر نما تختہ اٹھا لیا۔ ہم آگے پیچھے دوڑتے ہوئے ایک دھواں دھواں راہداری میں گھس گئے۔ عمران آگے تھا، میں پیچھے اور ہمارے درمیان تختے پر بندھی ہوئی ڈاکٹر مہناز تھی۔ کبھی کبھی ہمیں فائر کرنے کے لیے اپنا ایک ہاتھ تختے سے الگ بھی کرنا پڑ رہا تھا۔ ہمارا رخ پگوڈا یعنی اس بودھ مندر کے بیرونی دروازے کی طرف تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ عمران صرف جگت سنگھ کو دیکھنے گرو وستھا کے کمرے کی طرف نہیں گیا تھا، اس کا کچھ اور مقصد بھی تھا۔ لیکن کیا؟ اس کے بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

مندر کے وسیع احاطے میں بھی گھمسان کا رن پڑا ہوا تھا۔ دونوں فرقوں کے بھکشو آمنے سامنے تھے۔ تلواروں اور کلہاڑیوں کا آزادانہ استعمال ہو رہا تھا۔ آراکوئے کی ملکیت کا جھگڑا اس عبادت گاہ کو خوں رنگ کر رہا تھا۔ ہمیں ایک لوڈر نما گاڑی نظر آ گئی۔ اس پر ''سیوا دواری مندر'' لکھا ہوا تھا۔ یعنی یہ مندر میں خدمت انجام دینے والی گاڑی تھی۔ گاڑی اسٹارٹ تھی۔ اس کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں اور انجن ریس میں تھا۔ اس کے بھکشو ڈرائیور کے سر میں گولی لگی تھی اور وہ مر چکا تھا۔ مرتے وقت ڈرائیور کا پاؤں چونکہ ایکسلریٹر پر تھا، اس لیے انجن نے زبردست شور مچایا ہوا تھا۔

عمران نے فائر مار کر لوڈر کے عقبی دروازے کا لاک توڑا۔ ہم نے پھرتی سے مہناز والا تختہ لوڈر میں پہنچا دیا۔ میں نے لوڈر کا اگلا دروازہ کھول کر مردہ ڈرائیور کو نیچے پھینکا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ عمران بائیں طرف والا دروازہ کھول کر میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ یہ سارا عمل بہ مشکل ایک منٹ کے اندر مکمل ہو گیا۔ میں نے لوڈر کو گیئر میں ڈال کر آگے بڑھایا تو گیروا کپڑوں والے دو جنونی بھکشو سامنے آ گئے۔ درحقیقت ان کی موت ہی انہیں لوڈر کے سامنے لائی تھی۔ عمران بڑے خطرناک موڈ میں تھا۔ اس نے رائفل کا طویل برسٹ مارا اور دونوں کو ڈھیر کر دیا۔ ان میں سے ایک کی لاش لوڈر کے نیچے آئی۔ لوڈر اسے کچلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ یہ دواری مندر بڑے سخت حفاظتی حصار کے اندر تھا مگر اس وقت سارے حصار ٹوٹے ہوئے تھے۔ ہر طرف افراتفری تھی۔

لوڈر کو تیزی سے آتے دیکھ کر کچھ افراد نے آہنی گیٹ بند کرنے کی کوشش کی۔ مجھے ایک یا دو سیکنڈ کی تاخیر ہو جاتی تو گیٹ بند ہو جاتا اور شاید یہ لوڈر اسے توڑ نہ سکتا۔ مگر گیٹ بند نہیں ہوا اور لوڈر اسے دھکیلتا ہوا باہر آ گیا۔ گولیوں کی ایک بوچھاڑ آئی اور دو عقبی کھڑکیوں کے شیشے چکنا چور ہو گئے۔ مجھے لگا جیسے ڈاکٹر مہناز کو گولی لگ گئی ہے لیکن اس کی آواز نہیں آئی۔ آواز آ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ کچھ نظر نہیں آیا۔ وہ عقبی حصے میں بے حرکت لیٹی تھی۔

''کدھر جانا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جدھر منہ ہے۔ بس بھگاتے چلے جاؤ۔'' عمران نے کہا۔

اور میں واقعی بھگاتا چلا گیا۔ یہ آدھی رات کے بعد کا وقت تھا۔ سڑک کے دونوں طرف تھوڑی بہت آبادی تھی۔ پام کے پیڑوں کے درمیان کہیں کہیں دو تین منزلہ گھر بھی نظر آ رہے تھے لیکن انسان کوئی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ٹریفک بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ عقب میں سڑک پر مدھم روشنیاں تو نظر آ رہی تھیں لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ کسی عام گاڑی کی روشنی ہے یا کوئی ہمارا تعاقب کر رہا ہے۔

میں نے کہا۔ ''مہناز کو دیکھو یار! کہیں وہ زخمی نہ ہو گئی ہو؟''

''ابھی بھگاتے جاؤ۔ آگے کوئی مناسب جگہ نظر آتی ہے تو روکتے ہیں۔'' عمران نے جواب دیا۔

قریباً چھ سات میل تک ہم سمندر کے ساتھ ساتھ اسی طرح لوڈر بھگاتے گئے۔ پھر سڑک سے ذرا ہٹ کر درختوں کا ایک بڑا جھنڈ نظر آیا۔ موسلا دھار بارش میں کھجور، پام اور تاڑ وغیرہ کے بہت سے درخت سر جھکائے کھڑے تھے۔ عمران نے کہا۔ ''اس کے اندر گھسا دو۔''

میں نے یہی کیا۔ گاڑی کو سڑک سے اتارا اور جھنڈ میں گھستا چلا گیا۔ انجن بند کر کے میں نے ہیڈ لائٹس آف کر

دیں۔ عمران نے اپنی پشت پر لٹکے بیگ میں سے بڑے سائز کی ٹارچ نکال لی۔ ہم گھوم کر لوڈر کے عقب میں آئے۔ ٹارچ کی روشنی مہناز پر ڈالی۔ وہ بے سدھ پڑی تھی۔ یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ وہ زندہ ہے۔ شیشے کی کرچیاں لگنے سے اس کا بازو معمولی زخمی ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر بھی نیل نظر آرہے تھے۔ یقیناً یہ چوٹیں اسے تب لگی تھیں، جب مندر میں بھگدڑ مچنے کے بعد اس کا یہ اسٹریچر نما تختہ سیڑھیوں کے قریب الٹ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ اب تک ہمیں بڑی اچھی طرح پہچان چکی تھی۔ میں نے اس کے منہ میں سے سوتی کپڑا نکالا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے اور عمران نے اسے بمشکل چپ کرایا۔ یہ دکھ سکھ بیان کرنے کا وقت نہیں تھا۔ میری خاکی پتلون خون میں لتھڑی ہوئی تھی۔ یہ دراصل اس بدقسمت ڈرائیور کا خون تھا جو لوڈر کی ڈرائیونگ سیٹ پر کسی اندھی گولی کا شکار ہوا تھا۔

عمران نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”سب سے پہلے ہمیں اس لوڈر سے جان چھڑانا ہوگی۔“

”لیکن کیسے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں کوشش کرتا ہوں۔“ عمران بولا اور اپنا سیل فون نکال لیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ شیکھر نامی شخص سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ وہی مقامی شخص تھا جو رتنا گری میں رہائش رکھتا تھا اور عمران نے ممبئی کے ہوٹل سے بھی اس سے رابطہ کیا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اس مشن میں شریک نہ ہونے کے باوجود ہمارے آس پاس موجود رہا ہے۔

فقط دس منٹ کے اندر شیکھر ایک ایمبولینس گاڑی میں آن موجود ہوا۔ عمران نے ٹارچ کے روشن دائرے سے اس کی راہنمائی کی اور وہ ایمبولینس کو سیدھا درختوں کے جھنڈ میں لے آیا۔ بارش مسلسل ہو رہی تھی۔ میں اور عمران بھاگ کر ایمبولینس میں سوار ہو گئے۔ شیکھر نامی اس نوجوان کی عمر پچیس چھبیس سال ہوگی۔ اس کے ساتھ اس کی عمر اور حلیے والا ایک اور نوجوان بھی تھا۔ اس کا نام پورب معلوم ہوا۔ وہ شکل اور لباس سے نچلی ذات کا ہندو نظر آتا تھا۔

”جی سر! کیا پروگرام ہے؟“ شیکھر نے عمران سے پوچھا۔

”یہاں سے نکلنا ہے فوراً۔ فیول وغیرہ ہے نا گاڑی میں؟“

”بالکل جی، ٹینکی فل ہے۔ لیکن آپ کے باقی دونوں ساتھی نظر نہیں آرہے؟“

”ایک بھاگ گیا ہے، ایک گم ہو گیا ہے۔“ عمران نے کہا۔ بھاگنے والے سے اس کی مراد موہن بجلی اور گم ہونے والے سے جگت سنگھ تھی۔

”لوڈر کے اندر کون لیٹا ہے جی؟“ پورب کمار نے پوچھا۔

”وہی ڈاکٹر ہے... اب تم لوگوں نے فوراً ایک کام کرنا ہے، اس بھگوڑے موہن بجلی کو پکڑنا ہے۔“ عمران نے کہا اور جیب سے ایک موبائل فون نما چیز نکال کر پورب کو تھما دی۔ یہ دراصل سگنل وصول کرنے والی ایک الیکٹرانک ڈیوائس تھی۔

عمران نے ڈیوائس کو آن کیا۔ اسکرین پر ایک روڈ میپ سا ابھرا اور سبز رنگ کا ایک نکتہ اسپارک کرنے لگا۔ پورب کمار نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ عمران بولا۔ ”موہن کے پاس چھوٹی نال کی روسی رائفل ہے۔ ٹرانسمیٹر اسی کے اندر ”انسٹال“ ہے۔ وہ رائفل ہاتھ سے کھونا پسند نہیں کرے گا۔ امید ہے تم ایک دو گھنٹوں میں ہی اسے ڈھونڈ لو گے۔“

پورب کمار نے اثبات میں سر ہلایا... اور ایمبولینس سے اتر کر درختوں کی تاریکی میں گم ہو گیا۔ اب مجھ پر یہ واضح ہوا کہ عمران نے موہن کو پستول کے بجائے رائفل کیوں دی تھی۔

عمران نے شیکھر سے کہا۔ ”مجھے دواری مندر کے اندر کی رپورٹ بھی چاہیے ہوگی اور اگر جگت سنگھ کے بارے میں کچھ پتا چل سکے تو اور اچھی بات ہے۔“

”میں ابھی انتظام کرتا ہوں جی۔“ شیکھر نے کہا اور موبائل فون پر کسی کا نمبر پریس کرنے میں مصروف ہو گیا۔

میں اور عمران ایمبولینس سے نکلے اور لوڈر کی طرف بڑھے۔ اب ہمیں مہناز کو تختے سے علیحدہ کرنا تھا اور ایمبولینس میں پہنچانا تھا۔ میں نے کہا۔ ”عمران! تم بالکل جلیبی کی طرح گول گول ہو۔ مجھے تم نے یہی بتایا تھا کہ اس کارروائی میں ہمارے ساتھ صرف جگت سنگھ اور موہن ہی شریک ہو رہے ہیں۔ لیکن اب پتا چل رہا ہے کہ تمہارے کچھ اور موکل بھی آس پاس موجود ہیں۔“

”یار! یہ کارروائی میں شریک تھوڑے ہی تھے۔ یہ تو میرے بلاوے پر آگئے ہیں۔ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ یہ مقامی دوست ہیں۔ میں ان کے کام آتا ہوں، یہ میرے کام آتے ہیں۔“

”یہ بھی بتا دو کہ تم کہاں کہاں، کب کب اور کس کس کے کام آتے ہو؟“

”ایسی باتیں نہیں پوچھتے۔ دادا جی فرمایا کرتے تھے: نیکی کر کنوئیں میں ڈال۔“

میں خاموش ہو گیا۔ ہم نے ڈاکٹر مہناز کی مضبوط بندشیں کھولیں۔ بے چاری کی کلائیوں اور پنڈلیوں پر سن کی رسی نے گہرے نشان ڈال دیے تھے۔ وہ سر گھٹنوں میں دے کر سسکنے لگی۔ ”میں کہاں ہوں تابش؟ کہیں وہ لوگ پھر تو نہیں آجائیں گے۔ پلیز مجھے یہاں سے جلدی لے چلو۔“ اس نے اپنا لرزاں ہاتھ میری کلائی پر رکھ دیا۔

”اب کچھ نہیں ہوگا مہناز۔ ہم یہاں ہیں تمہارے پاس۔“ میں نے اسے تسلی دی۔

”یہ بڑے خطرناک لوگ ہیں۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔ یہ بھکشو نہیں ہیں۔ یہ تو جانور، درندے ہیں۔ درندوں سے بھی بڑے... انہوں نے... انہوں نے جلالی صاحب کو تو کچھ نہیں کہا؟ پلیز مجھے سچ بتائیں۔ جلالی صاحب تو ٹھیک ہیں نا؟“

”بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ کہیں گی تو ان سے بات بھی کرا دیں گے۔“

”کب...؟ پلیز... میں ان سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ بہت زیادہ شرمندہ ہوں۔ میں وہ نہیں کر سکی جو وہ چاہتے تھے۔ میں نے بہت کوشش کی لیکن اس امانت کی حفاظت نہیں کر سکی۔“ وہ سسکتی چلی گئی۔

امانت سے اس کی مراد یقیناً آرا کوئے ہی تھی۔ آج وہ سارے خیال بالکل غلط ثابت ہو گئے تھے جو جلالی فارم سے ڈاکٹر مہناز کے غائب ہونے کے بعد لوگوں کے ذہن میں آئے تھے۔ بابے طفیل جیسے گھریلو ملازموں اور دیگر لوگوں نے بڑے یقین سے کہا تھا کہ ڈاکٹر نے جلالی صاحب کو دھوکا دیا ہے اور اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گی۔ اسے اور اس کے ساتھی ڈاکٹر رسام کو مورتی سمیت غائب ہو جانے کا ذمے دار ٹھہرایا گیا تھا۔

میں نے کہا۔ ”مہناز... آپ کے ساتھ ڈاکٹر رسام بھی تو تھا؟“

وہ ہچکیوں سے رو دی۔ ”انہوں نے اسے مار دیا۔ بڑی تکلیف دے کر مارا۔ اس کے سارے جسم کو لوہے سے داغ داغ کر سیاہ کر دیا۔“

ہم نے غلط موضوع چھیڑ دیا تھا۔ فی الوقت ضرورت اس امر کی تھی کہ جلد از جلد یہاں سے نکلا جائے۔ ہم نے ڈاکٹر مہناز کو سہارا دے کر اٹھایا۔ اس پر ایک پولیتھین ڈالا اور اسے بارش میں چلا کر ایمبولینس کے اندر لے آئے۔ ہمارے کہنے پر اس نے جوڑا کھول دیا۔ رجنی گندھا کے

پھول اتار کر پھینک دیے اور پیشانی پر سے ایک تلک نما نشانی مٹا دی۔ عمران نے اسے ایمبولینس کے اسٹریچر پر لٹا دیا اور ایک سفید چادر ٹھوڑی تک اس کے اوپر کھینچ دی۔ اپنے چہرے کی چوٹوں اور نیلوں کی وجہ سے وہ کوئی زخمی مریضہ ہی نظر آتی تھی۔ ہماری پشت پر موجود تھیلوں میں فالتو جوڑے موجود تھے۔ ہم نے لوڈر میں جا کر لباس تبدیل کر لیا۔ مجھے بھی خون آلود پتلون سے نجات مل گئی۔ شیکھر کے پاس اپنے اور گاڑی کے مکمل کاغذات موجود تھے۔ ہمیں امید تھی کہ ہمیں طویل سفر میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی۔

ہماری امید درست ثابت ہوئی۔ یہ رات کا پچھلا پہر تھا۔ ہائی وے سنسان تھی۔ تیز بارش نے اس سنسانی کو مزید بڑھایا تھا۔ ہمیں دن چڑھے تک کہیں بھی روکا نہیں گیا۔ ڈرائیونگ شیکھر کر رہا تھا۔ وہ خاصی رفتار سے جا رہا تھا۔ جب ہم کسی آبادی یا قصبے کے اندر سے گزرتے تو وہ ایمبولینس کا ہوٹر بھی آن کر دیتا۔ اگر ہمیں کسی ناکے وغیرہ پر روکا جاتا تو ہمیں یہی بتانا تھا کہ ہم روڈ ایکسیڈنٹ میں گھائل ہونے والی اپنی ایک عزیزہ کو رتنا گری کے اسپتال سے ڈسچارج کرا کے ممبئی کے بڑے اسپتال میں لے جا رہے ہیں۔ بہرحال، اس طرح کی کوئی صورتِ حال پیدا نہیں ہوئی۔ راستے میں ہم نے کئی بار جگت سنگھ کے موبائل فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا نمبر بند جا رہا تھا۔ اس کے بارے میں ہماری تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔ کبھی ہلکی اور کبھی تیز بارش میں سفر کرتے ہوئے ہم صبح نو بجے کے لگ بھگ ایک بار پھر ممبئی پہنچ گئے۔ بارش میں بھیگا ہوا ممبئی قدرے خاموش نظر آرہا تھا۔ ویسے بھی یہ چھٹی کا دن تھا۔ ہم سیدھے نصیر احمد کے گھر پہنچے۔ ایمبولینس کو گیراج میں کھڑا کرنے کے بعد ہم نے ڈاکٹر مہناز کو نکال کر آرام دہ کمرے میں پہنچا دیا۔ ایشوریا رائے سمیت تینوں لڑکیاں یہیں موجود تھیں۔ وہ ہمیں واپس دیکھ کر خوش ہوئیں... اور ڈاکٹر مہناز کو دیکھ کر حیران۔

جیلانی اور نصیر سوالیہ نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ یقیناً جاننا چاہتے تھے کہ ہمیں آرا کوئے کے حوالے سے کامیابی ہوئی ہے یا نہیں؟ ان کے سوال کا جواب نفی میں تھا۔ ہماری خاموشی سے انہوں نے بھانپ لیا کہ جواب کیا ہے۔

اسی دوران میں عمران کے سیل فون کی بیل ہونے لگی۔ دوسری طرف وہی پورب کمار تھا جس کے ذمے عمران اور شیکھر نے موہن بجلی کو ”ٹریس“ کرنے کا کام لگایا تھا۔

پورب کی آواز موبائل کے اسپیکر پر ابھری۔ ”جی

جناب! اچھی سماچار ہے۔ ہم نے موہن کو دھر لیا ہے۔ پہلے تو اس کے سگنل ہی ناہیں مل رہے تھے پھر اس کے سگنل ملنے شروع ہوئے لیکن وہ کسی جگہ ٹک ہی ناہیں رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے اسٹیشن کے قریب سے پکڑا ہے اسے۔"

"کوئی نقصان تو نہیں ہوا؟" عمران نے پوچھا۔

"ناہیں جی، اپن کا ایک بندہ معمولی گھائل ہوا ہے۔ بازو پر گولی لگی ہے۔ اب آپ بتائیں اس کا کیا کرنا ہے۔ اپن نے اسے ایک اسٹیشن وین میں ڈالا ہوا ہے اور وین تھانے کے قریب کھڑی ہے۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔ اسے تھانے میں ہی جمع کرانا ہے لیکن کسی عام افسر کو نہیں دینا۔ اس خبیث کے لیے اسپیشل پروٹوکول ہوگا۔ کوئی بڑا افسر اسے وصول کرے گا۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں تمہیں دوبارہ کال کرتا ہوں۔"

"سر! یہ بڑی بک بک کر رہا ہے۔ کہہ رہا ہے اسے وچن دیا گیا تھا۔ مندر میں سے جو مال لوٹا گیا ہے، اس میں سے اسے حصہ ملنا چاہیے۔"

عمران بولا۔ "اس سے کہو، حصے کی جگہ تمہاری تشریف پر چار پانچ لاتیں مار کر تمہیں کسی چکی میں بند کر دینا چاہیے۔ تم نے بھاگنے کی کوشش کی ہے۔"

"سر! وہ کہہ رہا ہے... میں بھاگ نا ہیں ہوں۔ خود کو بھکشوؤں سے چھپا رہا تھا۔"

"اس کمزور دلیل کی پاداش میں اس کی مزید چھترول ہونی چاہیے۔ بہرحال، اس سے کہو کہ اس سے شروع میں جو وعدہ کیا گیا تھا، وہ ضرور پورا ہوگا۔ اس کی قید میں زیادہ نہیں تو تین چار سال کی رعایت ضرور ہوگی۔"

اس کے فوراً بعد عمران نے جیلانی کو ساتھ لیا اور نیلی اسٹیٹ کار میں بیٹھ کر چلا گیا۔ مجھے پتا تھا کہ وہ ڈیڑھ دو میل آگے جا کر گاڑی رکوالے گا اور جاوا سے رابطہ کرے گا۔ ہم اس مکان سے جاوا کو کال نہیں کرتے تھے کہ کہیں لوکیشن ٹریس نہ ہو۔

عمران کی واپسی آدھ گھنٹے کے اندر ہو گئی۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا۔ "جاوا سے تو رابطہ نہیں ہوا لیکن چو پڑا سے بات ہو گئی ہے۔ میں نے اسے بتا دیا ہے کہ موہن رتنا گری میں ہے اور وہ اسے وصول کرنے کا انتظام کرے۔"

"جاوا خود کدھر ہے؟" میں نے پوچھا۔

"چو پڑا نے بتایا نہیں۔ بس گول مول بات کی ہے۔"

"آرا کوئے کے بارے میں بھی نہیں پوچھا؟"

"چو پڑا نے تو نہیں پوچھا۔"

میں نے گہری سانس لے کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی۔ "عمران! ہم پھر وہیں کھڑے ہیں جہاں کل رات سے پہلے تھے... بلکہ شاید اس سے بھی کچھ پیچھے چلے گئے ہیں۔"

"جگر! وقتی طور پر مایوسی تو ہوئی ہے لیکن مجھے پوری امید ہے کہ اگلے ایک دو دن میں پھر کوئی سراغ مل جائے گا۔ مورتی اپنی جگہ سے ہل چکی ہے اور اسے تلاش کرنے والے ہر طرف موجود ہیں۔"

"ان تلاش کرنے والوں میں تمہارے بندے... میرا مطلب ہے تمہارے مؤکل بھی شامل ہیں؟" میں نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یار! اتنے زیادہ مؤکل نہیں ہیں میرے... کوئی بابا جنوں والا نہیں ہوں میں۔ بس تمہاری طرح کے دو چار خیر خواہ دوست ہیں۔ ان میں سے کچھ تو تمہارے سامنے ہی ہیں۔"

"تم بہت کچھ چھپاتے ہو عمران..."

میری بات ادھوری رہ گئی۔ نصیر احمد کے فون کی بیل ہونے لگی۔ یہ جگت سنگھ تھا۔ ہمارے درمیان یہ بات کل ہی طے ہو گئی تھی کہ اگر ہم نے آپس میں رابطہ کرنا ہوگا تو نصیر احمد کے ذریعے کریں گے۔

اسکرین پر جگت سنگھ کا نمبر دیکھ کر ہم بُری طرح چونکے۔ میں نے ہی فون ریسیو کیا۔ "ہیلو بادشاہ زادے! کہاں ہو؟" جگت نے مجھ سے پوچھا۔ وہ ہانپا ہوا سا تھا۔

"تم بتاؤ، تم کہاں ہو؟ گدھے کے سینگوں کی طرح غائب ہوئے ہو۔"

"ایویں ہی غائب نہیں ہوا بادشاہ زادے۔ بڑی زبردست سماچار ہے آپ سب کے لیے۔"

اس سے پہلے کہ جگت سنگھ کچھ اور بتاتا، رابطہ منقطع ہو گیا۔ یہ کمزور سگنلز کی وجہ سے ہوا تھا۔ ہم نصیر کے فون سے بار بار جگت سنگھ کو کال ملانے کی کوشش کرتے رہے لیکن ناکامی ہوئی۔ امید تھی کہ جگت سنگھ خود ہی دوبارہ کال کرے گا۔

اب پتا نہیں کہ اس کے پاس کیا زبردست خبر تھی۔ ہمارے لیے تو اس وقت اہم ترین خبر آرا کوئے کے حوالے سے ہی ہو سکتی تھی۔

جاوا نے ثروت کی رہائی اور محفوظ واپسی کے بدلے صرف ایک ہی شرط رکھی تھی اور وہ تھی آرا کوئے کی حوالگی۔ یقینی بات تھی کہ وہ اس شرط کے سوا کوئی بھی بات سننے کو تیار نہیں ہوگا۔ ڈاکٹر مہناز والے سراغ کے ذریعے ہم آرا کوئے

کے بالکل قریب پہنچ گئے تھے لیکن پھر اچانک وہ سب کچھ ہو گیا جس نے آرا کوئے کو بڑے ڈرامائی انداز میں اوجھل کر دیا تھا۔ اب ہم پھر مکمل اندھیرے میں کھڑے تھے۔

اسی دوران میں جگت سنگھ کی کال پھر آ گئی۔ میں نے ہی کال ریسیو کی۔ جگت نے گفتگو کا سلسلہ وہیں سے شروع کیا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ وہ بولا۔ "آپ کو پتا ہے، میں اس ویلے کہاں ہوں؟"

"میں کیسے اندازہ لگا سکتا ہوں؟"

"میں اس ویلے ممبئی میں ہوں۔ آپ کہاں ہیں؟"

"ہم بھی ممبئی میں ہیں۔"

"یہ تو پھر بڑی چنگی بات ہو گئی۔ آپ کے لیے زبردست سماچار یہ ہے کہ آپاں (ہم) جس مورتی کے پیچھے رتنا گری گئے تھے، وہ اس ویلے میرے بالکل پاس ہے۔ بس یوں سمجھو بادشاہ زادے کہ پندرہ وی فٹ کی دوری ہے۔"

میں سناٹے میں رہ گیا۔ عمران کی آنکھوں میں بھی چمک نمودار ہو گئی۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو... کہیں مذاق تو نہیں کر رہے؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"مذاق کا تو یہ موقع ہی نہیں ہے بادشاہ زادے! میں نے جان خطرے میں ڈالی ہے اور بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچا ہوں۔ مندر میں جب ہاہا کار مچی اور لوگوں نے دوڑنا شروع کیا تو میں گرو کے کمرے میں تھا، الماری کے پاس۔ مجھے چار بھکشو نظر آئے۔ وہ مورتی لے کر دوڑے جا رہے تھے۔ میں نے گرو پر لعنت بھیجی اور ان کا پیچھا کیا۔ وہ سامنے والے برآمدے کی طرف آ گئے۔ برآمدے میں ان میں سے ایک کو گولی لگ گئی اور وہ گر پڑا، باقی تینوں احاطے میں آئے اور ایک ٹرک میں وڑ گئے۔ ان کے وڑتے ہی ٹرک فوراً چل پڑا۔ میں ٹرک کے پیچھے لٹک گیا۔ ٹرک میں کھمبی کی ٹوکریاں لدی ہوئی تھیں۔ کھمبی کا پتا ہے نا آپ کو، ترکاری کی طرح ہوتی ہے۔ یہ بودھ شوق سے کھاندے ہیں۔ میں کھمبی کی ٹوکروں میں وڑ کر بیٹھ گیا۔" جگت نے ایک لحہ توقف کیا اور بولا۔

"بادشاہ زادے! میرا خیال ہے کہ یہ گل کافی لمبی ہو جائے گی۔ اس ویلے تو لوڑ اس گل کی ہے کہ آپ فوراً یہاں پہنچ جائیں۔"

"میں بھی یہی کہنے لگا تھا۔" میں نے کہا۔ "اب بتاؤ کہ تم ہو کہاں؟"

"یہاں کا مشہور علاقہ کا جو پاڑا ہے۔ وہاں سے ہرے کرشنا کی طرف جاتے ہوئے بڑے چوک پر پہنچیں تو دائیں طرف سفید رنگ کا ایک ہوٹل ہے۔ اسے بودھ ہوٹل کہتے ہیں۔ تین منزلہ بلڈنگ ہے۔ کھمبی والا ٹرک اس ویلے ہوٹل کی پارکنگ وچ ہے۔ خود تینوں بھکشو پہلی منزل کے کمرے وچ ہیں۔ مورتی بھی ان کے پاس ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ لوگ بڑی چھیتی یہاں سے نکلنے والے ہیں۔ ہوسکدا ہے کہ انہوں نے یہاں سے ہوائی اڈے کی طرف ہی جانا ہو۔"

"ان تینوں کے علاوہ کوئی اور بندہ بھی ہے کمرے میں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں... ایک بندہ ہور ہے۔ دراصل ایک کار بھی ٹرک کے نال نال ہی رتنا گری سے یہاں پہنچی ہے۔ اس کار میں بھی تین چار بندے سوار تھے۔ یہ کار بھی اس ویلے پارکنگ میں کھڑی ہے۔"

"اسلحہ وغیرہ کیا ہے ان لوگوں کے پاس؟"

"آپاں کو تو کوئی اسلحہ شسلحہ نظر نہیں آیا سجن جی... میری سمجھ کے مطابق یہ بھکشوؤں کا وہ دوسرا ٹولہ ہے جو مارا ماری کو بڑا وڈا پاپ سمجھتا ہے۔ مندر کے اندر بھی ان لوگوں نے کوئی گولی شولی نہیں چلائی۔ باقی دل کا حال تو واہگرو ہی جانتا ہے۔"

"ٹھیک ہے جگت سنگھ! تم چوکس رہو۔ ہم جلد سے جلد پہنچ رہے ہیں۔"

"میں ہوٹل کے کاؤنٹر کے پاس ہی صوفے پر بکل مار کر بیٹھا ہوا ہوں۔"

"رائفل پاس ہی ہے نا؟"

"اوآہو یار! رائفل اور کرپان کے بغیر خالصہ بھلا کس کام کا؟"

میں نے سلسلہ منقطع کیا۔ عمران نے نصیر سے بودھ ہوٹل اور کا جو پاڑا وغیرہ کا حدود اربعہ پوچھا۔ ہم نے اپنا اسلحہ چیک کیا۔ ڈاکٹر مہناز بھی سب کچھ سن چکی تھی۔ وہ روہانسی ہو رہی تھی۔ اس نے بھی وہی کچھ کہا جو دو دن پہلے اسی کمرے میں ابرار صدیقی نے کہا تھا...

وہ عمران اور مجھ سے مشترکہ طور پر مخاطب ہو کر بولی۔ "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ دونوں اس بُرے چکر سے نکل جائیں؟ یہ بڑے خطرناک لوگ ہیں۔ بالکل جنونی... اور کٹر۔ یہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔"

عمران نے کہا۔ "ڈاکٹر! آپ ہمارے لیے پریشان نہ ہوں۔ بس اپنا دھیان رکھیں۔ ہم ان لوگوں سے نمٹ لیں

گے۔ ویسے بھی یہ وہ خونی ٹولہ نہیں ہے۔ یہ دوسرے لوگ ہیں۔“

ڈاکٹر مہناز شاید اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن ہمارے پاس وقت نہیں تھا۔ اسے تسلی دیتے ہوئے ہم باہر نکلے اور نصیر احمد کے ساتھ دوڑتے ہوئے نیلی گاڑی میں آبیٹھے۔ اب دن کے قریباً گیارہ بج چکے تھے، تاہم تعطیل کے سبب سڑکوں پر زیادہ رش نہیں تھا۔ نصیر احمد اچھا ڈرائیور تھا۔ وہ بیس پچیس منٹ میں ہمیں کاجوباڈا کے علاقے میں لے آیا۔ دور ہی سے ہمیں تین منزلہ ہوٹل کی سفید اور گیروا عمارت نظر آگئی لیکن اس کے ساتھ ہی کسی گڑبڑ کا احساس بھی ہوا۔ پولیس کی دو موبائلز اپنے ہوٹر بجاتی ہوئی بڑی تیزی کے ساتھ ہمارے پاس سے گزریں۔ ان کا رخ بودھ ہوٹل کی طرف ہی تھا۔ ہمیں کچھ ایسی گاڑیاں نظر آئیں جو یوٹرن لے کر واپس آرہی تھیں۔ ایسی ہی ایک گاڑی کے سوار نے بتایا۔ ”آگے گڑبڑ ہے۔ گولی چل رہی ہے۔ دوسرے رستے سے جائیں۔“

ہمارے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ ہمیں اسی رخ پر آگے بڑھنا تھا۔ ہم پولیس موبائلز کے پیچھے ہی پیچھے ہوٹل کی طرف بڑھے۔ ہوٹل میں ایک بڑا ہنگامہ ہوچکا تھا۔ پارکنگ کے سامنے مین دروازے کے آس پاس بہت سے شیشے بکھرے ہوئے تھے۔ ایک ہلمین کار تیزی سے موڑ کاٹنے کی کوشش میں ایک دیوار کے اندر گھسی ہوئی تھی۔ اس کا بونٹ مڑ تڑ چکا تھا۔ کھڑکیاں چکنا چور تھیں اور گاڑی کی ایک سائڈ مکمل طور پر تباہ ہوچکی تھی۔ اس گاڑی کو جیسے کسی دھماکے سے تباہ کیا گیا تھا۔ گاڑی کے پنجر میں دو لاشیں ابھی تک پھنسی ہوئی تھیں۔

نصیر کو ہوٹل کے مین گیٹ کے قریب ہی اپنی پہچان والا ایک شخص نظر آگیا۔ یہاں اور بھی بہت سے تماشائی ہراساں چہروں کے ساتھ کھڑے تھے۔

”یہ کیا ہوا ہے عبداللہ؟“ نصیر نے پوچھا۔

”بہت زیادہ گولی چلی ہے نصیر بھائی! کئی بندے مر گئے ہیں۔ زخمی بھی ہوئے ہیں۔ یہ سامنے والی کار پر دستی بم مارا ہے کسی نے۔“

”کون لوگ تھے؟“ نصیر نے پوچھا۔

”کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ یہ بودھوں کا ہوٹل ہے۔ اندر ایک پگوڈا بھی ہے۔ یہاں کبھی ایسا ہنگامہ نہیں ہوا۔“

ہم نے ایک بار پھر دھیان سے تباہ شدہ کار کو دیکھا۔ اس کے اندر موجود لاشیں ممبئی کے سکہ بند بدمعاشوں کی لگتی تھیں۔ سانولے رنگ، شرابی چہرے، دھاری دار شرٹیں۔ جگت سنگھ اردگرد کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ ایک دم میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ کہیں اس کار کو تباہ کرنے والا دستی بم جگت سنگھ نے تو نہیں پھینکا تھا؟ اس کے پاس دستی بم موجود تھے اور وہ انہیں استعمال کرنے کے لیے بے قرار بھی بہت تھا۔ لیکن اس سے بھی اہم سوال یہ تھا کہ یہاں ہوا کیا ہے؟ کیا مارے جانے والے وہی بھکشو ہیں جن کے پاس مورتی تھی... اور مارنے والے کون تھے؟

اچانک نصیر کے سیل فون کی بیل ہوئی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ اس کا رنگ بدل گیا۔ فون بند کرکے نصیر نے کہا۔ ”آجائیں عمران صاحب! یہ جگت کی کال تھی۔ ہمیں یہاں سے واپس جانا ہے۔“

یہ سوال جواب کا وقت نہیں تھا۔ ہم نصیر کے ساتھ واپس نیلی کار میں جابیٹھے۔ کار تیزی سے روانہ ہوئی۔ ”کہاں ہے جگت؟“ میں نے نصیر سے پوچھا۔

”یہاں آس پاس ہی ہے جی۔“ نصیر نے کہا۔ وہ اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا۔

کچھ آگے جاکر ایک بڑے ڈپارٹمنٹل اسٹور کے سامنے اس نے کار روک دی۔ ایک طرف سے چادر کی بکل میں لپٹا ہوا ایک شخص برآمد ہوا اور کار میں آبیٹھا۔ ”ست سری اکال جی۔“ اس نے لرزاں آواز میں کہا۔ یہ جگت سنگھ ہی تھا۔

”یہ کیا ہوا ہے جگت؟“ میں نے کار کے روانہ ہوتے ہی پوچھا۔

”رتنا گری والے تینوں بھکشو مارے گئے ہیں۔ مورتی نکل گئی ہے۔ اسے وہ کتا جاوا نکال کرلے گیا ہے۔“ جگت نے پورے وثوق سے کہا۔

”جاوا؟ کیا تم نے دیکھا ہے اسے؟“ عمران حیرت سے بولا۔

”نہیں، جاوا کو تو نہیں دیکھا... پر اس کے ایک کمینے کارندے کو ضرور پہچان لیا ہے۔ وہی جسے آپ پریم چوپڑا کہتے ہیں۔ وہ کتے دا پتر... چوڑی تنک والا۔“

”پر یہ سب ہوا کیسے؟“ میں نے پوچھا۔

”بادشاہ زادے! تمہیں کال کرنے کے بعد میں نے چائے کا آدھا کوپ ہی پیا تھا کہ ایک دم پانچ چھ لڑکے فرانے بھرتے اندر وڑ آئے۔ وہ سیدھے اس کمرے میں تھے جہاں تینوں بھکشو اپنے ساتھی کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ایک دم ہی کڑاکے کی فائرنگ شروع ہوگئی۔ مجھے لگتا ہے کہ بس پانچ چھ سیکنڈ کے اندر جاوا کے لڑکوں نے تینوں بھکشو مار دیے۔ ان کا

چوتھا ساتھی سخت زخمی ہے۔ ان تینوں چاروں نے بڑے آرام سے خود کو مروایا ہے۔ میں بھاگتا ہوا کمرے تک پہنچا تو وہ بھکشوؤں کو مارنے اور مورتی چھیننے کے بعد کھڑکی توڑ کر باہر نکل رہے تھے۔ میں نے ان پر گولی چلائی... پر وہ نکل گئے۔ اس ویلے مجھے ان میں وہ پریم چوپڑا بھی نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں... فلالین کے گلابی کپڑے میں لپٹی ہوئی مورتی تھی۔ میں ان کے پیچھے دوڑا۔ ابھی کھڑکی سے کودا ہی تھا کہ مجھ پر گولیاں چلیں۔ یہ پارکنگ کی طرف سے آئی تھیں۔ میں سڑک پر لیٹ گیا... اور ایک چھوٹی گڈی کے پیچھے چلا گیا۔ مجھ پر یہ گولیاں ایک لال کار سے چلائی گئی تھیں...“

”وہی لال ہلمین جو مین گیٹ کے پاس دیوار میں لگی ہے؟“ نصیر نے پوچھا۔

”ہاں وہی... میں نے بھی اس پر گولیاں چلائیں۔ دو تین منٹ فائرنگ ہوئی پھر کار نے وہاں سے نکلنے کی کوشش کی۔ یہ جاوا کے بندے تھے۔ میرے من میں ان کے لیے درودھ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے ان پر کالا انار پھینک دیا... مرگئے کتے دے پلے...“

جگت سنگھ کی سانس تیزی سے چل رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں غضب کی چنگاریاں تھیں۔

میں اور عمران سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ سب کچھ گڑبڑ ہورہا تھا۔ ساری پلاننگ، ساری سوچ بچار دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ اب اگر جگت سنگھ کے بیان کے مطابق آراکوئے واقعی جاوا کے پاس پہنچ چکی تھی تو پھر ہم تو اس کے لیے بے مصرف ہوگئے تھے۔ آراکوئے کا کھوج لگانے والے اور اسے دواری مندر سے ہلانے والے ہم ہی تھے لیکن یہاں ستم یہ ہوا تھا کہ دواری مندر سے ملنے کے بعد وہ خود ہی جاوا گروپ کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ عین ممکن تھا کہ اس بودھ ہوٹل میں جاوا کے مخبر ہوں۔ انہوں نے تینوں خوف زدہ بھکشوؤں کو اور ان کے تھیلیوں والے ٹرک کو دیکھا ہو اور چونک گئے ہوں۔ اس کے بعد انہیں آراکوئے کی موجودگی کا پتا بھی چل گیا ہو۔

ہم پندرہ بیس منٹ کے اندر واپس نصیر کے مکان پر پہنچ گئے۔ جو ہوا تھا، بہت برا ہوا تھا۔ پچھلے اڑتالیس گھنٹوں میں ہم دوسری بار آراکوئے کے بالکل قریب پہنچنے کے بعد اسے حاصل نہیں کرسکے تھے۔ جگت سنگھ بھی بہت پریشان تھا۔ وہ ثروت کو بڑے پیار سے ”چھوٹی“ کہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ جاوا جیسے کنگ ڈان سے ”چھوٹی“ کی بحفاظت واپسی کے لیے آراکوئے کا حصول ہمارے لیے کتنا ضروری تھا۔

بودھ ہوٹل سے واپسی کے وقت نصیر احمد اپنے ایک ساتھی کو موقع واردات پر چھوڑ آیا تھا تاکہ وہاں کی صورت حال کا تفصیلی پتا چل سکے۔ دس پندرہ منٹ بعد ہی اس بندے کی کال نصیر کے فون پر آگئی۔ اس کا نام توفیق احمد تھا۔

توفیق نے اطلاع دیتے ہوئے کہا۔ ”نصیر بھائی! زخمی ہونے والا چوتھا بھکشو بھی قریبی اسپتال میں دم توڑ گیا ہے۔ اب اس واقعے میں مرنے والوں کی کل تعداد چھ ہوگئی ہے۔ چار پانچ بندے زخمی بھی ہیں۔ یہاں بڑی ہلچل مچی ہوئی ہے۔ کئی بڑی بڑی گاڑیاں موقع پر پہنچی ہیں۔ کئی سرکاری افسر اور عہدے دار بھی ہیں۔ کہا جارہا ہے کہ نہتے بھکشوؤں کو بیدردی سے قتل کرنے والے لوگ یہاں سے کوئی بہت قیمتی چیز چھین کرلے گئے ہیں۔“

”مثلاً کیا؟“

”اس حوالے سے کوئی بات سامنے نہیں آرہی۔ ہاں، کچھ لوگ یہ ضرور کہہ رہے ہیں کہ کل رات رتنا گری کی طرف ایک پرانے بودھ مندر میں بھی زوردار ہنگامہ ہوا ہے اور کچھ لوگوں کی ہتھیا ہوئی ہے۔“

عمران نے نصیر کے فون پر بات کرتے ہوئے کہا۔ ”توفیق احمد! اس حملے کے لیے کسی پر شک کا اظہار بھی کیا جارہا ہے؟“

”بالکل کیا جارہا ہے جی۔“ توفیق احمد نے جواب دیا۔ ”دبے لفظوں میں جاوا گروپ کی بات کی جارہی ہے۔ موقع پر موجود ایک دو لوگوں نے جاوا کے بندوں کو پہچانا ہے۔ لیکن گواہی کے طور پر پولیس کے سامنے آنے کو کوئی تیار نہیں اور یقینی بات ہے کہ کوئی آئے گا بھی نہیں۔“

”جوابی فائرنگ اور دستی بم کے دھماکے کے بارے میں کیا کہا جارہا ہے؟“ عمران نے پوچھا۔

”یہ بھکشو نہیں تھا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ کوئی سردار تھا جس نے اپنا چہرہ نیلی پگڑی کے پلو میں چھپا رکھا تھا اور چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ وہ کچھ ہی دیر پہلے ہوٹل میں دیکھا گیا تھا۔ پولیس اسے بھی ڈھونڈنے کی کوشش کررہی ہے۔ کچھ لوگوں کو شک ہے کہ شاید یہ بندہ ابھی ہوٹل میں ہی چھپا ہوا ہے۔“

توفیق سے بات چیت ختم ہوئی تو میں اور عمران علیحدہ کمرے میں چلے گئے۔ ”یہ تو سب کچھ چوپٹ ہوگیا عمران! اس سے تو اچھا تھا کہ یہ منحوس آراکوئے گمشدہ ہی رہتا۔“

”جاوا کو کچھ نہ کچھ کریڈٹ تو ہمیں دینا ہی پڑے گا۔

ہم مورتی تک پہنچ گئے تھے اور مسلسل اس کے پیچھے تھے۔ اگر ہم دس منٹ پہلے پہنچ جاتے تو مورتی ہمارے پاس ہوتی۔"

"کیا خیال ہے... ہم کہیں گے اور وہ ہماری بات مان لے گا؟ ثروت کو حوالے کر دے گا؟" عمران خاموش رہا۔ میں نے کہا۔ "جاوا جتنا بڑا شیطان ہے، وہ میں جانتا ہوں اور تم مجھ سے بھی زیادہ جانتے ہو۔ اگر واقعی آراکوئے اس کے پاس پہنچ چکا ہے تو اب وہ اپنی من مانی کے لیے آزاد ہے۔ وہ... ثروت کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہے عمران... ثروت کے ذریعے وہ ہمیں بڑی سے بڑی مجبوری کے نیچے دبا سکتا ہے۔"

"ایسا نہیں ہوگا... تم فکر نہ کرو۔" عمران نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔

اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ کہتا، وہ بولا۔ "آؤ میرے ساتھ۔"

ہم ایک بار پھر کلرڈ شیشوں والی نیلی اسٹیٹ کار میں بیٹھے اور روانہ ہو گئے۔

"کہاں جانا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کہیں بھی نہیں۔ بس گھر سے تھوڑی دور جا کر جاوا سے فون پر رابطہ کرنا ہے۔"

نصیر کے گھر سے دو ڈھائی کلومیٹر آگے آ کر عمران نے ایک جگہ کار روک لی۔ یہ دو بجے کا وقت تھا۔ عمران نے جاوا کے ذاتی فون پر رابطہ کیا... لیکن وہاں سے کوئی جواب نہیں ملا۔ بیل مسلسل ہو رہی تھی۔ مایوس ہو کر عمران نے ان نمبروں کو ٹرائی کیا جو جاوا نے ہمیں لاجسٹک سہولتوں کے لیے دیے تھے۔ ایک موبائل پر کال ریسیو ہو گئی۔ "کون ہے؟" کھردرے لہجے میں پوچھا گیا۔

عمران نے اپنا تعارف کرایا اور کہا۔ "میں جاوا صاحب یا چوپڑا سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

چند لمحے کے لیے دوسری طرف مائک پر ہاتھ رکھ دیا گیا۔ بولنے والا شاید کسی سے ہدایات طلب کر رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد اس کی آواز اسپیکر پر ابھری۔ "بھیا صاحب (جاوا) اس وقت شہر سے باہر ہیں... چوپڑا صاحب بھی رابطے میں نہیں ہیں۔ بعد میں فون کر لو۔"

"لیکن..." عمران کی بات پوری نہیں ہوئی اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

عمران نے دوبارہ کال ملائی... تینوں نمبروں پر سات آٹھ دفعہ کوشش کی مگر کہیں رابطہ نہیں ہوا۔

وہی ہو رہا تھا جس کا بدترین اندیشہ ہمارے ذہنوں میں موجود تھا۔ جاوا جیسے لوگ کسی کے دوست ہوتے ہیں اور نہ ان میں اخلاق مروت نام کی کوئی شے ہوتی ہے۔ ان کے ہر فیصلے اور اصول کے پیچھے زبردست قسم کے ذاتی اور گروہی مقاصد ہوتے ہیں۔ ثروت کو اپنے آہنی شکنجے میں جکڑ کر جاوا نے ایک زبردست پوائنٹ اسکور کر لیا تھا۔ اب ثروت کو بحفاظت چھڑانے کے لیے ہمیں بھی ایک زبردست پوائنٹ اسکور کرنے کی ضرورت تھی اور وہ پوائنٹ یہ تھا کہ ہم آراکوئے ڈھونڈ کر اسے جاوا کے حوالے کر دیتے۔ یہاں بدقسمتی یہ ہوئی تھی کہ آراکوئے ایک غیر معمولی اتفاق کے تحت خود بخود جاوا کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اب جاوا کے ساتھ ہمارا "ایک ہاتھ دو، ایک ہاتھ لو" والا معاملہ ختم ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اب اس کی طرف سے زبردست قسم کی سرد مہری سامنے آ رہی تھی۔

میری آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔ میں نے کہا۔ "عمران! میں جانتا ہوں، یہ بہت بڑا ڈان ہے اور شاید یہ بھی سچ ہے کہ ہم یہاں ممبئی میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے... لیکن اگر اس نے ثروت کے معاملے میں کوئی حرامزدگی دکھائی تو میں اس کے گلے لگ کر مر جاؤں گا۔ مجھے ثروت واپس چاہیے۔ بس... آج رات سے پہلے پہلے۔" جذبات کی شدت سے میرا سارا وجود لرزنے لگا۔

عمران نے بڑے اطمینان سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ "میرے جگر پارے! میں ہوں نا یہاں... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ ثروت کو چھوڑے گا... ضرور چھوڑے گا۔"

"پر کیسے؟"

"گھبراؤ نہ۔ سب کچھ تمہارے سامنے ہوگا۔"

ہم وہیں موجود رہے۔ عمران بار بار سیل فون کے ذریعے جاوا یا چوپڑا سے رابطے کی کوشش کرتا رہا۔ بات چیت دور کی بات تھی، کسی ذمے دار بندے سے رابطہ ہی نہیں ہو پا رہا تھا۔ اب یہ بات بالکل واضح تھی کہ وہ لوگ جان بوجھ کر خاموشی اختیار کر رہے ہیں اور ان کی نیت میں فتور آ چکا ہے۔

دو دن پہلے نصیر احمد نے مجھے بتایا تھا... جاوا کے کئی میں بے شمار ہاتھ ہیں اور شاید بہت سے سر بھی۔ اسے بے شمار ہاتھوں اور بہت سے سروں والی ایک ایسی بلا کہا جا سکتا ہے جس نے شہر کے بیشتر حصے کو جکڑ رکھا ہے۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔

ایک سنگین ترین اتفاق کے تحت میں اور عمران اس

"بلا" کے روبرو آ گئے تھے اور میری وہ عزیز ترین ہستی داؤ پر لگ گئی تھی جس کے لیے میں ایک بار نہیں، کئی بار اپنی جان لٹا سکتا تھا۔ ثروت اپنی تمام تر دلکشی اور محبوبیت سمیت میرے تصور میں آ گئی۔ بے شک اس نے میرے بغیر زندہ رہنا سیکھ لیا تھا۔ بے شک وہ اپنے ازدواجی رشتے کے خاردار حصار کو توڑنے کی ہمت نہیں رکھتی تھی... لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں اسے زندہ سلامت اور خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے اپنی جان پر ہر بڑی سے بڑی مصیبت جھیل سکتا تھا۔ محبت میں شرطیں نہیں ہوتیں۔ یہ نفع نقصان نہیں دیکھتی۔ یہ بس ہوتی ہے... یا نہیں ہوتی۔

جاوا سے رابطہ کرنے میں ناکام ہونے کے بعد ہم نے میڈم صفورا اور ثروت سے بات کرنے کی کوشش کی۔ میڈم صفورا کا فون بند تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میڈم صفورا سے فون کی سہولت واپس لے لی گئی ہے۔

عمران نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔ "چلو آؤ... عالی جناب جاوا صاحب سے بنفسِ نفیس ملتے ہیں۔"

"کہاں؟"

"کسی بھی اچھی سی جگہ پر یار! یہاں ممبئی میں درجنوں "ٹوا سپاٹ" ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ جو ہمارا فون سننا بھی گوارا نہیں کر رہا، وہ ہمارے بلانے پر کسی جگہ چلا آئے گا۔"

"آئے گا جگر... سر کے بل آئے گا۔" عمران کی آنکھوں میں تپش تھی۔

یہ اس کا وہی روپ تھا جو اسے اس کے کھلنڈرے روپ سے بالکل جدا کرتا تھا۔ نہ جانے کیوں جب سے ہم دواری مندر سے نکلے تھے، مجھے کیوں لگ رہا تھا کہ عمران مجھ سے کچھ چھپا رہا ہے۔ ہنگامے کے دوران میں جب ہمیں جگت سنگھ مقررہ جگہ پر نہیں ملا تھا تو عمران نے کہا تھا کہ وہ ابھی اسے دیکھ کر آتا ہے۔ واپسی میں اس نے تھوڑی سی تاخیر کر دی تھی۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہوا تھا؟

اس سے پہلے کہ میں کوئی سوال جواب کرتا، عمران نے موبائل فون پر کچھ لکھنا شروع کر دیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس نے جاوا اور اس کے اہلکاروں کے نمبرز پر کوئی ایس ایم ایس کیا ہے۔

"کیا کر رہے ہو؟"

"جاوا کو بلا رہا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ ابھی پانچ دس منٹ کے اندر جاوا یا چوپڑا کا فون آ جائے گا۔"

"کوئی منتر شنتر پڑھا ہے؟"

"منتر ہی سمجھو۔ بس دعا کرو یہ منتر سیدھا پڑ جائے۔"

"تم ہر وقت سسپنس میں کیوں رکھتے ہو؟"

"ہم میڈیا والوں کا کام ہی یہی ہے جگر! یورپ میں تو میڈیا والے پیدائشی طور پر سسپنس اور تھرل کے رسیا ہوتے ہیں۔ پہلا شکار اپنی والدہ کو ہی بناتے ہیں۔ اس بے چاری کو پتا ہی نہیں چلتا کہ نومولود کو کب پیدا ہونا ہے۔ وہ تین تین بار اسپتال کے چکر لگاتی ہے۔ ڈاکٹروں کے اندازے بھی دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ ایک بار سسپنس کا یہ سلسلہ شروع ہوتا ہے تو زندگی بھر رکنے کا نام نہیں لیتا۔ ازدواجی حیثیت سسپنس... بیوی اور شوہر کی وفاداری سسپنس، سلسلۂ نسب سسپنس، یہاں تک کہ موت بھی سسپنس... اسپتالوں میں نالیاں لگا لگا کر مہینوں تک مُردے کو زندہ رکھتے ہیں۔ ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے..."

وہ اپنی زبان کو مسلسل حرکت دیتا چلا گیا۔ میں بُری طرح چونکا جب میں نے دیکھا کہ عمران کے سیل فون پر کال موصول ہوئی۔ اسکرین پر ممبئی کے خطرناک ترین شخص کا نمبر چمک رہا تھا۔ یہ جاوا کا نمبر تھا۔ عمران کا کہا سچ ثابت ہوا تھا۔

"ہیلو، کون؟ کیا عمران ہیرو بول رہا ہے؟"

"ہاں، میں ہی ہوں۔" عمران نے جواب دیا۔

"ابھی تمہارا ایک میسیج ملا ہے لیکن مجھے اس کی کوئی سمجھ نہیں آئی۔ یہ کیا ہے؟"

"جاوا صاحب! سمجھ آپ کو آ گئی ہے۔ اسی لیے آپ نے فون بھی کیا ہے۔ ورنہ آپ تو ہماری کال کا جواب ہی نہیں دے رہے تھے۔"

"تم... کیا کہنا چاہ رہے ہو۔ میں تو تمہاری کال کا انتظار کر رہا تھا... کہ تم آراکوئے کے بارے میں کوئی اچھی سماچار سناؤ گے۔"

"اچھی سماچار آپ جناب کو سنا تو دی ہے میں نے... وہ آپ کے پاس پہنچ گئی ہے۔ ابھی کوئی دو گھنٹے پہلے آپ کے منحوس گرگوں نے بودھ ہوٹل میں چار بھکشو مارے ہیں اور آراکوئے کو اڑا کر آپ کی خدمت میں پہنچا دیا ہے۔ لیکن میں ایک بات آپ کو بتا دوں اور وہ آپ اپنی سمجھ دانی میں بڑی اچھی طرح بٹھا لیں۔ بات وہ نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ بات وہی ہے جو میں آپ کو سمجھا رہا ہوں۔ آپ کے پاس کافی کاریگر بندے ہوں گے۔ خود آپ کا کھوپڑا بھی کافی بڑا ہے۔ آپ اچھی طرح تصدیق کر لیں... یا کسی کاریگر سے کروا لیں۔ اس کے بعد مجھے فون کریں۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔"

"یہ تم کس لہجے میں بات کر رہے ہو... کچھ میں نہیں آرہا کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ اور... تم اس سے ہو کس جگہ؟"

"اس چکر میں نہ پڑیں جاوا جی۔ آپ مجھ تک نہیں پہنچ سکتے۔ فی الحال ہمارا رابطہ بس فون کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے اور فون کی لوکیشن ڈھونڈنا بھی بالکل بیکار ہوگا۔ میں اگلی کال کا انتظار کر رہا ہوں... گڈ بائے۔"

عمران نے رابطہ منقطع کر دیا۔

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے پتا نہیں کیا پلٹی ماری تھی کہ جاوا جو ہمیں یکسر نظر انداز کر رہا تھا، چند منٹ کے اندر اندر فون کرنے پر مجبور ہو گیا تھا اور لگتا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر میں وہ پھر کال کرے گا۔

عمران نے فوراً گاڑی اسٹارٹ کی اور روانہ ہو گیا۔

"اب کہاں جانا ہے؟" میں نے کہا۔

"فی الحال تو کہیں نہیں جانا۔ بس اپنی جگہ ہی تبدیل کرنی ہے۔" اس نے کہا۔ اس نے جبڑے بھینچ رکھے تھے اور اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر گہری سنجیدگی تیر رہی تھی۔ بے حد گہری اور سرد۔

ہم نے ساؤتھ ممبئی کا ایک طویل چکر کاٹا اور قریباً پانچ چھ کلومیٹر دور ایک بلند و بالا سنیما کی وسیع پارکنگ میں گاڑی کھڑی کر دی۔ اس دوران میں ہم نے اپنے تعاقب کا بھی خاص خیال رکھا تھا۔ "ناریل پانی پیو گے؟" عمران نے پوچھا۔

"یار! مجھے بھی کچھ بتاؤ۔ یہ ہو کیا رہا ہے؟" میں نے اس کی آفر نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"وہی جو جاوا جیسے بندے کے ساتھ ہونا چاہیے۔" اس نے نشست کو اسٹریچ کیا اور ٹیک لگا کر سگریٹ سلگا لی۔

"تمہارا خیال ہے، وہ دوبارہ فون کرے گا؟"

"اس کا باپ بھی کرے گا اور سو بار بھی کرنا پڑے تو کرے گا۔"

"لیکن کیوں؟ تم نے کوئی دھمکی دی ہے اسے؟"

"ممبئی کے اس خونی سانڈ کو دھمکی کون دے سکتا ہے۔ بس ایک حقیقت بتائی ہے اسے۔"

"حقیقت کیا ہے؟"

"ضرور پوچھنی ہے؟" اس نے نیم باز آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

"اگر بتانے میں تمہارا کوئی بڑا نقصان ہو جائے گا تو نہ بتاؤ۔" میں نے چڑ کر کہا۔

"ناراض ہو گئے ہو۔" وہ ہولے سے مسکرایا پھر سگریٹ کا دھواں میرے منہ پر چھوڑ کر بولا۔ "انڈیا کی اس فلم نگری کے اندر بڑی فلمی سی صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے۔ اس آرا کوئے نے سب کو گھما کر رکھ دیا ہے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"کل رات دواری کے مندر میں بڑی ٹینشن تھی۔ تمہیں پتا ہی ہے، وہاں دو گروپ تھے۔ ایک وہ لوگ تھے جو ڈاکٹر مہناز کی جان لے کر "حفاظت کی رسم" ادا کرنا چاہتے تھے... دوسرا گروپ اصل بھکشوؤں کا تھا۔ وہ دھرم کے نام پر اس خون ریزی کو سخت گناہ سمجھ رہے تھے اور چاہتے تھے کہ آرا کوئے کی "حفاظت کی رسم" کسی کی جان لیے بغیر ادا کی جائے۔ جنونی گروپ جانتا تھا کہ رسم کے وقت کوئی بھی غیر متوقع صورتِ حال پیش آ جائے گی۔ انہیں کچھ پکی اطلاعات بھی مل چکی تھیں۔ انہوں نے اس کا توڑ کیا..."

"کیسا توڑ؟"

"تم خود سوچو۔ انہوں نے کیا کیا ہوگا؟ آرا کوئے ان کے لیے بہت قیمتی ہے۔"

"پہیلیاں نہ بجھواؤ عمران۔" اس کی باتوں سے میں زچ ہو چکا تھا۔

عمران نے ایک گہرا کش لیا اور نتھنوں سے دھواں چھوڑ کر بولا۔ "کل رات رسم کے وقت چبوترے پر اصل مورتی نہیں تھی۔"

میں سناٹے میں رہ گیا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو؟"

"ہاں جگر! وہ اصل کی ہو بہو نقل تھی۔"

"اس کا مطلب ہے کہ بھکشو جو مورتی لے کر بھاگے اور جو کچھ دیر پہلے جاوا کے پاس پہنچی ہے، وہ اصل نہیں ہے۔" عمران نے بڑے یقین کے ساتھ نفی میں سر ہلایا۔ میں نے پوچھا۔ "تو اصل کہاں ہے؟"

"اصل آرا کوئے مہا پجاری کے پاس تھی اور مہا پجاری ان بیس گروؤں میں سے ہی کوئی ایک تھا۔"

"تمہیں اس کا پتا ہے؟"

"تم سب کچھ آج ہی پوچھنے کا ارادہ رکھتے ہو... کیا کل کا دن نہیں چڑھے گا؟"

"میرا خیال ہے کہ آج کا دن بہت زیادہ اہم ہے۔" میں نے عمران کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ پھر مسکرایا اور نیا سگریٹ سلگا کر بولا۔ "جگر پیارے! یہ بڑا زبردست اتفاق ہے کہ کل رات ہم نے جس گرو وستھا کے کان کاٹے، اصل میں وہی مہا پجاری یعنی بڑا گرو تھا۔ مجھے اس بات کا پتا اس وقت چلا جب وستھا نے

ہمارے مجبور کرنے پر تحریر لکھی اور پھر اس پر اپنی گول مہر لگائی۔ اس نے یہ مہر اپنی دیوہیکل الماری کی دراز سے نکالی تھی۔ اس دراز میں ایک اور مہر پڑی ہوئی تھی۔ میری نظر اس مہر پر پڑ گئی۔ یہ مہاپجاری کی مہر تھی۔''

میں سوچنے لگا۔ اگر عمران کے بیان کے مطابق مہاپجاری گرودستھا ہی تھا تو پھر یقینی بات تھی کہ اصل مورتی بھی گرودستھا کے پاس ہی ہوگی۔ مجھے پھر یاد آیا کہ ہنگامے کے وقت جب ہم دواری مندر سے نکل رہے تھے تو عمران مجھے اور مہناز کو چھوڑ کر کچھ دیر کے لیے گرودستھا کے کمرے کی طرف لپک گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ جگت سنگھ کو دیکھنے جارہا ہے۔ کہیں وہ مورتی کے لیے تو نہیں گیا تھا؟ میری چھٹی حس نے گواہی دی کہ بات ایسی ہی تھی...... وہ آراکوئے کے لیے گیا تھا۔

میں نے عمران کی آنکھوں میں دیکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''عمران! اصل آراکوئے تمہارے پاس ہے نا؟''

مجھے حیرت ہوئی جب عمران نے فوراً اقرار کرلیا۔ شاید وہ مزید وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بولا۔ ''تابی! تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ آج کا دن بڑا اہم ہے ہمارے لیے... اور جاوا کے لیے بھی۔ آراکوئے ہمارے پاس ہے اور ثروت جاوا کے پاس۔ آراکوئے کے ساتھ ثروت کا تبادلہ ہوگا اور یہ سب کچھ ہمیں بہت ہوشیاری سے کرنا ہوگا۔ جاوا جیسا زہریلا سانپ کسی بھی وقت ڈنک مار سکتا ہے۔''

''کہاں ہے آراکوئے؟'' میں نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

''اس پشتی بیگ میں جس میں، میں اسے دواری مندر سے لے کر آیا ہوں۔'' عمران نے انکشاف کیا۔

عمران کا پشتی بیگ اس وقت نصیر احمد کے گھر پڑا تھا۔ عمران نے اسے تالے میں رکھا تھا۔ مجھ سمیت کسی نے بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ اس عام سے ریگ زین کے تھیلے میں وہ نادر ''پیس آف آرٹ'' موجود ہے جس نے ایک خلقت کو دیوانہ کر رکھا ہے۔ جس کی تلاش میں کروڑوں روپے خرچ ہوئے ہیں... بہترین دماغ استعمال ہوئے ہیں اور قتل و غارت سمیت ہر طرح کی قانون شکنی کی گئی ہے۔ وہ دو فٹ لمبا دھات کا قدیم مجسمہ اس وقت نصیر احمد کے گھر میں موجود تھا۔

گھڑی کی سوئیاں اب سہ پہر چار بجے کا وقت بتا رہی تھیں۔ میں نے عمران کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا جاوا کو پتا چل جائے گا کہ اس کے پاس نقلی آراکوئے ہے؟''

''کیوں نہیں چلے گا... وہ ممبئی کے تین چار کھوچل ترین بدمعاشوں میں سے ایک ہے۔ ایسے لوگوں کے پاس ہر صورتِ حال سے نمٹنے والے ''کاریگر'' بندے موجود ہوتے ہیں۔ تم دیکھنا، دس پندرہ منٹ کے اندر اس کا فون آئے گا۔''

میں نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا کہ رسم کے موقع پر نقلی آراکوئے رکھا جائے گا اور اصلی کہاں ہے؟ اس کا پتا کیسے چلا تمہیں؟''

''جس بھکشو کو ہم نے بالکل شروع میں آبدوز سرنگ سے نکلتے ہی پکڑا تھا، وہ گرودستھا کا خاص الخاص آدمی نکلا۔ وہ پتھر کے کلیجے والا ہے۔ اس نے ہمیں کچھ بتا کر نہیں دینا تھا لیکن جب میں نے اسے چکما دیا کہ مہاپجاری کے بارے میں ہم سب کچھ جان چکے ہیں اور مہاپجاری یعنی گرودستھا نے ہمیں ازخود بہت سی باتیں بتا دی ہیں تو وہ چکر میں آگیا۔ ویسے بھی اندرونی چوٹوں کی وجہ سے اس کی حالت بہت پتلی تھی۔ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی ہمیں بہت سی باتیں بتا دیں۔''

عمران نے مجھے اس بارے میں تفصیل بتائی۔ اندازہ ہوا کہ وہ اس بارے میں کافی حد تک سچ بیانی کر رہا ہے۔ عمران کا پندرہ منٹ والا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ آٹھ دس منٹ بعد ہی اس کے فون کی بیل ہوگئی۔ یہ جاوا ہی تھا۔ اس کی گمبھیر آواز فون کے ننھے منے اسپیکر پر ابھری...

''میں جاوا بول رہا ہوں۔''

''آپ کے علاوہ اور کون بول سکتا ہے اس وقت۔'' عمران نے اطمینان سے جواب دیا۔

وہ بولا۔ ''مجھے ابھی ابھی جانکاری ملی ہے کہ میرے بندے کسی بودھ ہوٹل سے ایک مجسمہ لے کر آئے ہیں۔ وہ اسے آراکوئے سمجھ رہے ہیں لیکن وہ نقلی ہے۔ تم نے جو اطلاع دی، وہ درست تھی۔''

عمران نے اطمینان سے کہا۔ ''آپ بہت بڑے لعنتی ہو جاوا۔ آپ کو ابھی ابھی جانکاری نہیں ملی۔ اصلی نقلی کی بات تو اب معلوم ہوئی ہے لیکن باقی آپ کو سب کچھ بہت پہلے سے معلوم تھا اور بودھ ہوٹل میں بھی سب کچھ آپ کے حکم سے ہی ہوا۔ نقلی آراکوئے کو بغل میں دبا کر آپ پہاڑ پر چڑھ گئے تھے۔ میری کالیں سن کر بھی نہیں سن رہے تھے۔''

''تم منہ سنبھال کر بات کرو ہیرو۔ مجھ سے اس طرح بات کرنے والے موت کی بھیک مانگا کرتے ہیں۔ پورا ممبئی جانتا ہے ایسے بدقسمت بھکاریوں کو۔''

''آپ جناب نے اپنی عزت کو اپنے ہاتھوں سے

غارت کیا ہے۔ آپ پرلے درجے کے کمینے ہیں جاوا صاحب! آپ نے سوچا کہ آراکوئے اب آپ کے ہاتھ آگیا ہے۔ لہٰذا آپ نے ہمارے منہ پر تھوکنا بھی گوارا نہیں کیا۔ آپ نے اپنے کمینے لونڈوں کو بھی ہدایت فرمادی کہ کوئی ہم سے رابطہ کرے اور نہ ہماری کال اٹھائی جائے۔ پیشہ کرنے والیوں کی بھی ایک زبان ہوتی ہے۔ مجھے تو آپ اس سے بھی گئے گزرے لگے ہو۔''

''بکواس نہیں۔'' جاوا اتنے زور سے چلایا کہ لگا، فون کے اسپیکر میں سے باہر نکل پڑے گا۔ اس نے عمران پر غلیظ گالیوں اور بدترین دھمکیوں کی بوچھاڑ کردی۔ آخر میں وہ دہاڑا۔ ''میں دیکھ لیتا ہوں تجھے۔ کتے! میں دیکھ لیتا ہوں۔ تیرے لیے آج قیامت نہ لے آؤں تو سمجھ لینا جاوا اپنے باپ کا نہیں تھا... نہیں تھا باپ کا۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے فون بند کردیا۔

اس شخص کے غصے سے ممبئی پناہ مانگتا تھا۔ اس کی دھمکی کو فرشتۂ اجل کی دھمکی سمجھا جاتا تھا۔ یہ دھمکی پتھر کو پگھلاتی تھی اور لوہے کو پانی کرتی تھی۔ شوبز کے بڑے بڑے جن اور سلور اسکرین کی کسی کو خاطر میں نہ لانے والی پریاں... جاوا کے ایک بلاوے پر سر کے بل دوڑے چلے آتے تھے۔ وہ غضب کا دیوتا تھا۔ عمران نے جان بوجھ کر اس کے غضب کو زبردست اچھال دیا تھا اور ایسا کرنے کے باوجود عمران کے چہرے پر اطمینان کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سجا کر بولا۔

''پریشانی کی بات نہیں جگر! یہ ابھی ٹھنڈا ہوجائے گا۔ موٹی سوئی والا ٹیکا لگا ہے نا اس لیے ''اوئی اوئی'' کر رہا ہے۔''

میں حیرت سے عمران کی صورت دیکھ رہا تھا۔

بمشکل آٹھ دس منٹ بعد پھر فون آگیا۔ جاوا کا نمبر ہی تھا لیکن جاوا خود نہیں بول رہا تھا۔ اسپیکر پر جاوا کے قریبی ساتھی پریم چوپڑا کی منحوس آواز ابھری۔ اس بندے کی شکل تو مشہور فلمی ولن سے ملتی ہی تھی، اس نے اپنی آواز کو بھی مشہور ولن کی آواز کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہوئی تھی۔ پریم چوپڑا نے نہایت گمبھیر لہجے میں عمران کو بتایا کہ عمران نے اپنی غیر محتاط گفتگو سے جاوا صاحب کو سخت برہم کردیا ہے اور ایسا کر کے اس نے اپنی مشکلات میں جو اضافہ کیا ہے، وہ بیان سے باہر ہے۔

عمران نے کہا۔ ''بس کیا یہی خوش خبری سنانے کے لیے تم نے فون کیا ہے؟''

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی تب چوپڑا بھاری آواز میں بولا۔ ''اس معاملے کا حل اگر لڑائی نکالو گے تو اتنا خون خرابا ہوگا کہ تم نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا۔ بہتر یہی ہے کہ آمنے سامنے بیٹھ کر بات کرلو۔''

''اب بیٹھ کر نہیں، کھڑے ہو کر بات ہوگی اور درمیان میں کافی ساری رائفلیں بھی ہوں گی۔ تمہارے مالک نے اپنا ظرف دکھا دیا ہے۔ اب دوسری بار اس کم ظرف سے دھوکا نہیں کھائیں گے۔ اور اگر اس کی طرف سے کوشش ہوئی تو واقعی بڑا خون خرابا ہوگا... انڈیا کی بڑی سے بڑی ایکشن فلم بھی اس خون خرابے کے سامنے مکی ماؤس کا کارٹون نظر آئے گی۔''

''کس طرح کی گارنٹی چاہتے ہو؟'' چوپڑا نے پوچھا۔

''اب کوئی گارنٹی نہیں چلے گی۔ صرف کھلا میدان ہوگا اور اسلحے کی گارنٹی ہوگی۔ لیکن یہ تمہارا ملک ہے... تمہارا شہر ہے... ہمیں یہاں سے حفاظت کے ساتھ واپس نکلنے کے لیے ایک گارنٹی ضرور چاہیے ہوگی۔''

''کیا مطلب؟''

''ایک یرغمالی... لیکن تم کرائے کے ٹٹو ہو۔ میں تم سے تفصیلی بات کر کے اپنا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ اپنے ''باپ'' سے کہو، اگر وہ کوئی ڈیل چاہتا ہے تو خود بات کرے۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔''

عمران نے فون بند کردیا۔

وہ جاوا اور چوپڑا سے جس طرح کا رویہ روا رکھے ہوئے تھا، وہ مجھے اندر سے لرزا رہا تھا۔ مجھے ہر گھڑی یہی دھڑکا تھا کہ کہیں جاوا مشتعل ہو کر ثروت کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔ کوئی ایسی بات ہوجاتی تو میرے زندہ رہنے کا ہر جواز ختم ہوجاتا لیکن عمران بالکل اطمینان سے تھا۔ اسے یقین تھا کہ ثروت کو کچھ نہیں ہوگا۔ جاوا اس کا بال بھی بیکا نہیں کرے گا۔ وہ مجھے بھی پورے اعتماد سے یہ تسلی دے رہا تھا کہ ثروت، جاوا کے پاس بالکل محفوظ ہے۔

میں نے کہا۔ ''تم کسی یرغمالی کی بات کر رہے تھے۔ یہ کیا چکر ہے؟''

''بس ہے ایک چکر۔ وقت آنے پر بتا دوں گا۔'' اس نے کہا اور کسی کا بھیجا ہوا ایس ایم ایس پڑھنے میں مصروف ہوگیا۔

میری جان پر بنی ہوئی تھی۔ جاوا کے فون کے انتظار میں گزرنے والا ہر پل ایک صدی کی طرح تھا۔ ابھی تک ہمیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ثروت اور صفورا ہیں کہاں؟ ہم

نے انہیں فرید کوٹ میں چھوڑا تھا اور اب ہم ممبئی میں تھے۔ آٹھ دس منٹ مزید گزر گئے تو میں نے عمران سے کہا۔ ”یار! کہیں بات بگڑ نہ جائے۔ تم خود فون کرلو۔“

”وہی کتا کرے گا... یہ اعصاب کی لڑائی ہے۔ دل مضبوط رکھو۔“ ابھی عمران کا فقرہ مکمل ہوا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ جاوا کی کال تھی۔ عمران نے کال ریسیو کی اور بات کرتا ہوا گاڑی سے باہر نکل گیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھے اعصابی تناؤ سے بچانا چاہتا ہے۔ میری بے چینی اس پر بھی اثر انداز ہوتی تھی اور وہ اطمینان سے بات نہیں کرسکتا تھا۔

جاوا اور عمران کے درمیان قریباً بیس منٹ تک دھواں دھار گفتگو ہوئی۔ گفتگو کی سنگینی عمران کے چہرے سے ظاہر تھی۔ وہ پارکنگ کے ایک خالی گوشے میں املی کے درخت سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ آخر مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ کچھ باتیں طے ہوگئی ہیں۔ کچھ دیر بعد عمران فون بند کر کے گاڑی کی طرف بڑھا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور آنکھوں میں جارحانہ چمک تھی۔

”کیا ہوا؟“ میں نے دل کڑا کر کے پوچھا۔

عمران نے رسٹ واچ دیکھی۔ ”رات گیارہ بجے۔“

”کیا، رات گیارہ بجے؟“

”ثروت اور آرا کوے کا ایکسچینج ہوگا۔ ثروت اور صفورا یہاں ممبئی میں پہنچ چکی ہیں۔ اب یہ ایک ہاتھ دو، ایک ہاتھ لو والا معاملہ ہے۔ ہرادیوی ساحل کے پاس کوئی کالی جھاڑ جگہ ہے۔ جاوا اپنے بندوں کے ساتھ آئے گا۔ ہم بھی اپنے بندوں کے ساتھ جائیں گے۔“

”کتنے بندے ہوں گے؟“

”چار چار گاڑیاں ہوں گی۔ سمجھو بیس بائیس بندے ہمارے... بیس بائیس ان کے۔“

”اور اگر کچھ ہوگیا تو؟ جو ایسے موقعوں پر ہو جاتا ہے۔“

”یار تابی! اس طرح کیوں سوچ رہا ہے؟ تُو بزدل تو نہیں ہے۔ میں چنگی طرح جانتا ہوں، پھر یہ سب باتیں؟“

”یار! مجھے اس نے بزدل بنا دیا ہے۔ وہ بیچ میں نہ ہوتی تو میں تم سے دو قدم آگے نظر آتا۔ تم نے مجھے موت کے آگے بھاگنے کے بجائے موت کے پیچھے بھاگنا سکھا دیا ہے اور موت سے ڈرنا بھی کیا۔ مر تو شاید میں اسی دن جاتا... جب پانچ سال پہلے مجھے سیٹھ سراج نے خوار کیا تھا اور میں نے خودکشی کرنا چاہی تھی۔ اب یہ ساری زندگی تو بونس کی طرح ہی لگتی ہے عمران۔ مجھے صرف ثروت کا خیال آتا ہے۔ میں چاہتا ہوں... وہ... کسی بھی طرح حفاظت سے واپس پاکستان پہنچ جائے۔ اپنی بہن کے پاس، اپنے شوہر کے پاس... وہ زندہ رہے... اور خوش رہے۔“

”وہ زندہ رہے گی... خوش رہے گی... اور رہے گی بھی تمہارے ساتھ۔ تم اس طرح کی باتیں کرتے ہو تو میرا دل چاہتا ہے تمہارا تھوبڑا توڑ دوں یا کوئی وزنی شے مار کر اپنا سر دو ٹکڑے کرلوں... خدا کے لیے... یار خدا کے لیے... وہ کمزور عورت ہے۔ دنیا سے ٹکرانے کی ہمت نہیں رکھتی۔ یہ ہمت اسے تم نے ہی دینی ہے، تمہاری محبت نے ہی دینی ہے۔ جتنی ہمت دکھاؤ گے، اتنا صلہ پاؤ گے۔ وہ کیا کہہ گئے ہیں مولانا سرسید۔ عمل سے زندگی بنتی ہے، جنت بھی جہنم بھی...“

اس نے حسبِ عادت جان بوجھ کر اقبال کے شعر کو سرسید سے جوڑ دیا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا تو اس نے جھپٹ کر میرا منہ ہاتھ سے بند کر دیا۔ ”بس اب چپ ہو جاؤ۔ خدا کے لیے... تمہیں پیر احمد تھانوی صاحب کا واسطہ۔ نہیں تو میں ریوالور کا کھیل شروع کر دوں گا۔ سارے خانوں میں گولی رکھ کر خود پر ٹریگر دبا دوں گا۔ ہنڈرڈ پرسنٹ ڈیتھ۔“

اسی دوران میں اس کے فون کی بیل ہونے لگی۔ ایک بار پھر گہری سنجیدگی نے اس کا چہرہ ڈھانپ لیا۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف رتنا گری والا شیکھر تھا۔ لیکن اب وہ ممبئی سے بول رہا تھا۔ ”ہمارے لیے کیا آرڈر ہے جناب؟“ اس نے پوچھا۔

”آرڈر بہت تگڑا ہے۔ اپنے بندوں کو تیار کر دو۔ پورب وغیرہ کو بھی خبر کرو۔ رات گیارہ بجے جاوا کے ساتھ ڈیل فائنل ہو رہی ہے۔ ”ہرادیوی“ بیچ پر کالی جھاڑ نامی جگہ کا طے ہوا ہے۔ ہمیں بھی پاور سے جانا ہوگا۔ پچیس کے قریب بندے ہونے چاہئیں۔ دس میرے پاس ہیں۔ چودہ پندرہ تم نے کرنے ہیں لیکن ایک بھی کچا بندہ نہیں ہونا چاہیے میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

”آپ فکر ہی نہ کریں جناب! پورے پکے بندے ہیں، چنے ہوئے شوٹرز۔ آپ تقریباً سب کو جانتے ہیں۔ ایک انچ پیچھے ہٹنے والے نا ہیں... بلکہ اگر آپ چاہیں تو زیادہ بھی ہوسکتے ہیں۔“

”نہیں، زیادہ نہیں۔ بس چوبیس پچیس کافی ہیں۔ گاڑیاں اور اسلحہ بھی بالکل فٹ ہونا چاہیے۔ کسی ہیلپ کی ضرورت ہو تو نصیر سے رابطہ کرو۔“

”دو گھنٹے کے اندر سب تیار ہوگا جی۔ اگر آپ کہیں تو کچھ بندوں کو اسٹینڈ بائی بھی رکھ لوں۔“

”ضرورت تو نہیں پڑے گی قربان علی۔ لیکن اگر چاہتے ہو تو رکھ لو۔“

عمران نے فون بند کر دیا۔ میں نے کہا۔ ”یہ آواز تو شیکھر کی تھی اور تم اسے قربان علی کہہ رہے تھے؟“

”قربان علی کہہ رہا تھا؟“ وہ حیرت سے بولا۔ ”شاید پریشانی میں پتا ہی نہیں چلا۔“

”عمران! تم سیدھی بات کیوں نہیں کرتے؟ یہ بھی تمہارا ہرکارہ ہے اور شیکھر کے روپ میں کوئی قربان علی ہے۔“

”ہرکارہ کا لفظ تم غلط استعمال کر رہے ہو۔ تم اسے دوست کہہ سکتے ہو۔“

”نہیں عمران! تم بہت کچھ چھپاتے ہو مجھ سے... دوسری طرف اپنا سب سے قریبی دوست بھی کہتے ہو۔ قریبی دوستیاں اس طرح پردے رکھنے سے آگے نہیں چلتیں۔ کبھی کبھی میں اپنے آپ کو تمہارے لیے بالکل غیر سمجھنے لگتا ہوں۔ تم بتاتے کیوں نہیں ہو کہ یہ کون لوگ ہیں جو تمہارے لیے کام کرتے ہیں؟ یہ خاص طور پر انڈیا میں تمہارے اردگرد موجود ہیں۔ سلطان چنا اور عدیم جیسے بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ تم وہ نہیں ہو جو اوپر سے نظر آتے ہو۔“

عمران نے ایک گہری سانس لی اور ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔ ”کیا سننا چاہتے ہو مجھ سے؟“

”یہی کہ یہ سب تمہارے دوست نہیں ہیں اور نہ ہی تعلق دار ہیں۔ یہ کون لوگ ہیں؟ کس ناتے سے تمہارے حکم مانتے ہیں اور سردھڑ کی بازی بھی لگاتے ہیں؟“

”تمہارا اپنا کیا اندازہ ہے؟“ عمران نے آنکھیں بند کیے کیے پوچھا۔

میں نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ گہرے پانیوں کی طرح خاموش تھا۔ میں نے کہا۔ ”کیا یہ کوئی آرگنائزیشن ہے؟“

عمران نے اپنی نیم سرخ آنکھیں کھولیں اور مجھے دیکھ کر بولا۔ ”تم تو سو فیصد درست نتیجے پر پہنچے ہو۔“ مجھے امید نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی تسلیم کرلے گا۔

”کس طرح کی آرگنائزیشن؟ سرکاری یا پرائیویٹ؟“ میں نے پوچھا۔

”پرائیویٹ۔“

”کیا کام کرتی ہے؟“

”وہی جو اب کر رہی ہے۔ وہی جو دو سال پہلے بھانڈیل میں کیا تھا۔“

”کیا مطلب؟“

”دوسرے ملکوں، خاص طور سے انڈیا میں پھنسے ہوئے بے گناہ پاکستانیوں کو حبس بے جا اور قید و بند سے نجات دلانا۔ قانونی طریقے سے یا پھر کسی بھی طریقے سے۔“

عمران بے حد سنجیدہ تھا۔ میں اس کا یہ موڈ پہچانتا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ اس وقت وہ جو کہہ رہا ہے، درست کہہ رہا ہے۔ میں بہت پیچھے تک سوچنے لگا۔ عمران مجھے آج بتا رہا تھا لیکن نہ جانے کیوں بہت پہلے سے مجھے لگتا تھا کہ عمران کسی خاص نظم کے ساتھ کام کرتا ہے اور کچھ خاص لوگوں کے ساتھ اس کی ورکنگ ریلیشن شپ موجود ہے۔ چند ماہ پہلے بھانڈیل سے نکلنے کے بعد جب ہم الٰہ آباد پہنچے تھے تو وہاں بھی کچھ مقامی لوگوں سے عمران کا واسطہ پڑ گیا تھا۔ دیگر لوگوں کے علاوہ یہ پتا بھی چلا تھا کہ عمران اپنی سرکس کمپنی کے ساتھ انڈیا آیا تھا جہاں وہ ایک بڑے جھگڑے میں ملوث ہوگیا تھا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ عمران اپنے سرکس والے کام کو بھی خاص مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔ میرے اور عمران کے درمیان اس موضوع پر چند منٹ گفتگو ہوئی۔

میں نے ایک طویل سانس لی اور کہا۔ ”اس کا مطلب ہے عمران، جب تم مجھے ڈھونڈتے ہوئے بھانڈیل اسٹیٹ پہنچے تو وہ بھی صرف میری دوستی کے لیے نہیں تھا بلکہ تمہارے کام کا ایک حصہ تھا۔ تمہیں میرے علاوہ میڈم صفورا اور ابرار وغیرہ کو بھی ڈھونڈنا تھا اور آج تم سویٹی عرف ایشوریا اور دوسری لڑکیوں کو واپس پاکستان لے جانے کے لیے میرے ساتھ ہو۔“

اس کے ہونٹوں پر بے ساختہ ایک موہوم مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ مجھے نیم باز آنکھوں سے دیکھ کر بولا۔ ”جگر! جب کام کے ساتھ محبت بھی شامل ہو جائے تو ہر چوٹی سر ہو جاتی ہے۔ بھانڈیل اسٹیٹ میں تمہاری محبت پہلے تھی، کام اس کے بعد تھا۔“

”اور اب؟“

”اب بھی تمہاری محبت اور دوستی پہلے ہے، کام بعد میں۔ اگر تمہارے اور ثروت کے ساتھ ساتھ میں سویٹی، فاخرہ، مہناز وغیرہ کو بھی پاکستان واپس لے جانے میں کامیاب ہوگیا تو یہ میرے لیے بونس ہوگا۔“

”جیلانی، اقبال، امتیاز اور صفورا وغیرہ بھی سب جانتے ہیں؟“

”صرف جیلانی، اقبال اور امتیاز... ہم بہت عرصے

سے اکٹھے کام کررہے ہیں۔ ان تینوں کے علاوہ اور کوئی نہیں۔"

"یہ آرگنائزیشن یا جو کچھ بھی یہ ہے، تم چلاتے ہو؟"

"نہیں یار! میں تو بس اس کا ایک حصہ ہوں۔ یہ ایک بڑا ادارہ ہے۔"

"کون چلا رہا ہے؟"

"سمجھو اوپر والا ہی چلا رہا ہے۔ تم سمجھ ہی گئے ہوگے، یہ کتنا خطرناک کام ہے۔"

"تم بات پھر گول کررہے ہو۔"

"تم سے کچھ بھی چھپانا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔"

"لیکن تم چھپا رہے ہو عمران۔ اب تو کسی وقت مجھے یہ بھی شبہ ہونے لگتا ہے کہ تم نے مجھے اپنی جوانی اور لڑکپن کی جو روداد سنا رکھی ہے، شاید اس میں بھی کچھ ہیر پھیر ہو۔"

"نہیں تابش۔" عمران نے بڑی متانت سے کہا۔ "وہ سب کچھ سچ ہے۔ تمہارے سر کی قسم۔" اس نے میرے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "اس روداد میں کچھ بھی جھوٹ نہیں۔ ہاں صرف... صرف ایک بات ایسی ہے جس کی میں نے تم سے پوری وضاحت نہیں کی۔ اس کا تعلق والدہ سے ہے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"بھانڈیل اسٹیٹ سے آنے کے بعد تم نے کئی بار مجھ سے پوچھا ہے کہ میں والدہ کو ڈھونڈ رہا ہوں یا نہیں۔ میں نے کہا ہے، ہاں میں کوشش کررہا ہوں۔ لیکن سچ یہ ہے تابی کہ میں نے والدہ کو ڈھونڈنا ترک کردیا ہے۔ قریباً تین سال پہلے ہی مجھے یقین ہوگیا تھا کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ پھر بھی اس بات کو اپنی زبان سے کہنے کی ہمت مجھے کبھی نہیں ہوئی۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ کیا تمہیں کچھ پتا چلا تھا؟"

اس نے آنکھیں بند کیے کیے اثبات میں سر ہلایا۔ "انڈیا سے رہا ہوکر آنے والے ایک پاکستانی کاشت کار کی زبانی مجھے پتا چلا تھا کہ اس نے میری والدہ کو چندی گڑھ کی زنانہ جیل میں دیکھا تھا۔ والدہ نے اسے میرا ایڈریس دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ کسی طرح مجھ تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ اس شریف بندے نے اپنا وعدہ نبھایا اور کسی نہ کسی طرح مجھے ڈھونڈ لیا۔ اس کی زبانی پتا چلا کہ بیمار والدہ کو میری تلاش نے نیم دیوانہ کردیا تھا۔ پتا نہیں وہ کہاں کہاں ماری ماری پھرا کرتی تھیں۔ کسی ایسی ہی کیفیت میں وہ سرحدی علاقے کی طرف چلی گئیں اور وہاں بی ایس ایف والوں نے انہیں پکڑ لیا۔ اس کے بعد وہی کچھ ہوا جو ایسے بدنصیب لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ مہینوں اور سالوں تک بغیر کسی مقدمے کے جیلوں میں سڑتے رہتے ہیں۔ کاشت کار عباس علی نے انہیں چندی گڑھ جیل میں دیکھا تھا اور اسے پتا چلا تھا کہ انہیں چند ہفتوں بعد امرتسر جیل منتقل کیا جارہا ہے۔ ان دنوں تک سرکس میں میری اچھی جگہ بن چکی تھی۔ مالک جان محمد صاحب نے میرا ویزا لگوایا اور میں انڈیا پہنچ گیا۔ میں نے امرتسر اور چندی گڑھ وغیرہ میں ایک مہینا زبردست جنجل خرابی جھیلی لیکن والدہ کا کوئی سراغ نہ ملا۔ جیل والوں کے پاس بھی کوئی ریکارڈ نہ تھا۔ قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں کا رویہ سخت حوصلہ شکنی کا تھا۔ ان لوگوں کے نزدیک سرحد پار سے آنے والا ہر شخص وہشت گرد یا خطرناک جاسوس ٹھہرتا ہے۔

"اگلے ایک برس میں، میں نے قریباً چھ دفعہ انڈیا کا سفر کیا۔ جگہ جگہ کی خاک چھانی۔ مجھے انڈیا کی سیکیورٹی ایجنسیوں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کا اصل چہرہ دیکھنے کو ملا۔ مجھے اس اندرونی نفرت اور عداوت کا اندازہ ہوا جو یہ لوگ مصیبت زدہ غیر ملکیوں اور خصوصاً پاکستانیوں سے رکھتے ہیں۔ اپنی والدہ کا سراغ لگاتے لگاتے میں راجستھان میں بیکانیر کی ایک دور دراز جیل میں پہنچا۔ لیکن میرے وہاں پہنچنے سے چار پانچ دن پہلے ہی وہاں ایک بڑا سانحہ رونما ہو چکا تھا۔ جیل کے زنانہ حصے میں ایک بڑی آگ لگی تھی جس میں چالیس پچاس قیدی عورتیں اور زنانہ عملے کی بہت سی ارکان جل کر خاکستر ہوگئی تھیں۔"

عمران کی آنکھوں میں، میں نے پہلی بار نمی دیکھی۔ اس نے سیٹ سے ٹیک لگا کر آنکھیں موندیں تو دو بوندیں اس کے ابھرے ہوئے رخساروں پر لڑھک گئیں۔

"میری ماں مر چکی ہے تابی! لیکن وہ اَن گنت لوگ ابھی زندہ ہیں جو بدقسمتی سے بھارتی جیلوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ غلطی سے سرحد پار کر جانے والے چرواہے، ماہی گیر، سیاحت کے لیے جانے والے اور غائب ہوجانے والے بے گناہ... اور اس قسم کے اور بہت سے لوگ۔ چند سال پہلے ہی میں نے تہیہ کرلیا تھا کہ میں ایسے لوگوں کے لیے کام کروں گا۔ ان کا کھوج لگاؤں گا، ان کے پیاروں تک پہنچانے کی کوشش کروں گا۔ والدہ کی تلاش کے دوران میں کچھ لوگوں کے لیے میرے اندر بڑی نفرت نے جنم لیا تھا۔ اس کا نتیجہ انڈین سرکار کے تین چار اہلکاروں کی موت کی صورت میں نکلا۔ انڈین پولیس میرے پیچھے پڑ گئی۔ اسی دوران میں مجھے ایک پرائیویٹ تنظیم کا پتا چلا۔ اسے ایک سابق پاکستانی فوجی افسر چلا رہا تھا۔ اس تنظیم کے مقاصد وہی تھے جو میرے دل و

دماغ میں بھی جگہ بنا چکے تھے۔ میں اس میں شامل ہوگیا۔ اب میں اس کا ایک حصہ ہوں۔ میں امید کرتا ہوں کہ تم اس بارے میں مجھ سے مزید سوالات نہیں کروگے۔ پلیز! میری مجبوری سمجھنا۔ میں نے کچھ چیزوں کا حلف اٹھایا ہوا ہے۔"

میں حیران تھا۔ عمران کی زندگی کا یہ پہلو اب تک میری نظر سے بالکل اوجھل رہا تھا۔ اس بات کا علم تو مجھے بھانڈیل اسٹیٹ سے نکلتے ہی ہوگیا تھا کہ عمران کا انڈیا میں آنا جانا ہے اور یہاں اس کے دوست اور دشمن موجود ہیں۔ سجاد موہل جیسے خوں خوار پولیس آفیسر نے ہمیں گرفتار کیا تھا اور پھر مجھے پتا چلا تھا کہ اس گرفتاری کی وجہ منوج نامی ایک آوارہ شخص ہے جو کچھ عرصہ پہلے عمران کی فائرنگ سے شدید زخمی اور پھر ہلاک ہوگیا تھا۔ اس طرح کے کئی معاملات عمران کے ساتھ نتھی تھے۔

اس سے پہلے کہ سینما کی پارکنگ میں ہماری گفتگو مزید آگے بڑھتی، ایک طرف سے ایک سانولا سا بندہ نمودار ہوا۔ اس نے گاڑی کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک پرچی عمران کی گود میں پھینک دی۔ انگلش میں ایک دو جملے لکھے تھے۔ عمران نے پرچی پر نظر دوڑائی اور سگریٹ بجھا کر گاڑی اسٹارٹ کردی۔

"کیا بات ہے؟"

"خطرہ ہے، ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔" اس نے کہا۔

وہ تیزی سے گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا مین روڈ پر آیا۔ گاہے بگاہے اس کی نگاہیں عقب نما آئینے میں بھی اٹھ رہی تھیں۔ بہرطور خیریت گزری۔ ہم دس پندرہ منٹ کے اندر نسیم احمد کے گھر تک پہنچ گئے۔ راستے میں عمران نے کوئی بات کی اور نہ میں نے کچھ پوچھا۔ پتا نہیں وہ ایک دم سے کچھ غیر سا لگنے لگا تھا۔

یوں تو میری اور عمران کی پہلی ملاقات کو پانچ سال سے زائد کا عرصہ گزر چکا تھا لیکن حقیقت میں ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ بہت زیادہ وقت نہیں گزارا تھا۔ مجھے تقریباً چار سال بھانڈیل اسٹیٹ میں کاٹنا پڑے تھے۔ بھانڈیل میں کچھ عرصہ عمران بھی میرے ساتھ رہا تھا لیکن وہاں اس کا یہ پراسرار روپ میرے سامنے نہیں آسکا تھا۔ اب ہم جب سے انڈیا آئے تھے، میں اس کے حوالے سے مسلسل الجھن کا شکار تھا۔ وہ کئی رفاہی کام کرتا تھا لیکن آج مجھے اس کے خاص الخاص رفاہی کام کا پتا چلا تھا۔

رات ہونے میں ابھی دیر تھی۔ میں بے دم سا ہوکر بستر پر لیٹ گیا۔ دماغ گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ پچھلے چھتیس گھنٹے میں واقعات بڑی تیزی سے رونما ہوئے تھے۔ ہم، موہن بجلی کی مدد سے دواری مندر میں آرا کوئے تک پہنچے۔ ہم نے اسے کھویا۔ ہم مہناز کو بچا کر ممبئی لائے۔ پھر ہمیں پتا چلا کہ آرا کوئے جاوا گروپ کے پاس پہنچ چکا ہے اور اب تازہ ترین و حیرت انگیز انکشاف یہ تھا کہ آرا کوئے عمران کے پاس ہے اور ہم آج رات گیارہ بجے ثروت اور صفورا سے آرا کوئے کا تبادلہ کررہے ہیں۔

اس حوالے سے عمران کسی ضامن یعنی یرغمالی کا ذکر بھی کررہا تھا اور اسے یقین تھا کہ جاوا جیسا ڈان اس کی بات مانے گا اور ثروت، صفورا کے علاوہ یہ ضامن بھی اس کے حوالے کرنے پر آمادہ ہوجائے گا۔ مجھے صاف پتا چل رہا تھا کہ یہاں کوئی کھچڑی سی پک رہی ہے۔ لیکن کیا؟ میں ابھی پوری طرح آگاہ نہیں تھا۔

میں آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔ عمران نے اپنی والدہ کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، وہ ذہن کو کچوکے لگا رہا تھا۔ ان سے بس غائبانہ تعارف تھا لیکن یوں لگتا تھا جیسے کوئی اپنا بچھڑ گیا ہے۔ کبھی دوبارہ نہ ملنے کے لیے... پھر ڈاکٹر مہناز کے ساتھی ڈاکٹر رسام کا خیال ذہن میں آیا۔ وہ اس مورتی کے سفر میں بے موت مارا گیا تھا... عمران کمرے سے جا چکا تھا۔ شاید اس نے سوچا تھا کہ میں تھوڑی دیر کے لیے سو گیا ہوں لیکن میں جاگ رہا تھا اور میری ساری حسیات بھی بیدار تھیں۔ کچھ دیر بعد مجھے چھت پر قدموں کی مدھم چاپ سنائی دی۔ اس چاپ کے انداز نے گواہی دی کہ یہ عمران ہے۔ وہ چھت پر کیا کرنے گیا تھا؟ میں تجسس سے مجبور ہوکر اٹھا اور چپل پہن کر سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ کامن روم میں ڈاکٹر مہناز خود ہی اپنے زخموں کی مرہم پٹی میں مصروف تھی۔ سویٹی عرف ایشوریا اس کی مدد کررہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ میں ڈاکٹر مہناز کے قریب رکا تو وہ پھر وہی سوال کرے گی کہ جلالی صاحب سے اس کا رابطہ کب ممکن ہوسکے گا۔ میں مہناز سے پہلو بچاتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھا اور بہ آہستگی اوپر چھت پر پہنچ گیا۔ شام کے سائے گہرے ہو چکے تھے۔ ممبئی میں ہزاروں لاکھوں قمقمے روشن ہو گئے تھے۔ یہ وسیع و عریض سلسلہ مغرب میں سمندر تک پھیلا ہوا تھا۔ سمندر کے تاریک سینے پر بھی اَن گنت روشن نکتے ٹمٹما رہے تھے۔ ایک طویل برآمدے سے گزر کر میں دو روشن کمروں کے قریب پہنچ گیا۔ مجھے پتا تھا کہ عمران کی حسیات بڑی تیز ہیں۔ میں نے چپل اتار دی اور ننگے پاؤں بے آواز چلتا ہوا کمروں کی عقبی سمت میں چلا گیا۔ یہاں جنریٹر کے لیے تیل کا ایک ڈرم رکھا تھا۔ فی

الوقت یہ ڈرم خالی تھا۔ میں نے اسے بے آواز طریقے سے گھما کر دیوار کے پاس رکھ دیا۔ اس ڈرم پر کھڑے ہو کر میں ایک روزن سے کمرے کے اندر جھانکنے میں کامیاب ہو گیا۔ اندر ٹیوب لائٹ کی دودھیا روشنی تھی۔ میں حیران رہ گیا۔ جیلانی آنسوؤں سے بھیگے چہرے کے ساتھ عمران کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی مدھم آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''نہیں جناب! میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ آپ ایسا نہ کریں۔ ہم آپ کی توقع سے بڑھ کر کام کریں گے۔ کوئی بندہ ایک انچ پیچھے نہیں ہٹے گا۔ جانیں دے دیں گے۔ وہی کریں گے جو آپ نے کرنا ہے لیکن آپ سامنے نہ آئیں۔ معاملہ بہت بگڑ چکا ہے۔ وہ لوگ موقع ڈھونڈ رہے ہیں۔''

''نہیں شیخ! کوئی اور معاملہ ہوتا تو میں سوچ لیتا۔ لیکن یہاں تابی کا اور اس کی عزیزہ کا معاملہ ہے۔ وہ دونوں میری ذمے داری ہیں۔ میں یہ ذمے داری کسی اور پر نہیں ڈال سکتا۔ جو کچھ بھی ہے، یہاں مجھے ہی جانا ہوگا۔ جہاں اتنی بار رسک لیا ہے، ایک بار اور سہی۔''

''آپ پہلے بھی اس طرح کی بات کر چکے ہیں جناب! آپ نے یہاں آتے ہوئے کہا تھا کہ چار پانچ دن سے زیادہ نہیں رکیں گے انڈیا میں۔ اب دیکھیں، تین ہفتے ہو چکے ہیں۔ اتنا بڑا واقعہ ہو گیا وہاں ہمارے بعد۔ اب آپ خود کو جان بوجھ کر خطرے میں ڈالتے جا رہے ہیں۔''

''میں نے کہا ہے نا، یہ آخری رسک ہمیں لینا ہی ہوگا۔ اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ہم کامیاب ہوں گے۔''

''وہ بہت کمینہ ہے عمران صاحب! اب تو ثبوت مل چکا ہے کہ وہ سب کچھ جان چکا ہے۔ وہ کسی بھی وقت اطلاع دے سکتا ہے۔ پولیس، بی ایس ایف، فوج، سب بھوکے جانوروں کی طرح آپ کی طرف لپک آئیں گے۔ وہ بس اتنا کرے گا کہ...''

''وہ کچھ نہیں کرے گا۔'' عمران نے ٹھوس لہجے میں جیلانی کی بات کاٹی۔ ''میری بات یاد رکھنا، جب تک آراکوئے ہمارے پاس ہے وہ کسی کو اطلاع دینے کی حماقت نہیں کرے گا۔ وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتا کہ آراکوئے کے اور دعوے دار پیدا ہو جائیں۔ وہ کوئی بھی حرکت تب کرے گا، جب آراکوئے اس کے ہاتھ آ چکا ہوگا لیکن آراکوئے تب اس کے ہاتھ آئے گا جب یرغمالی ہمارے پاس پہنچ جائے گا۔ اور تم جانتے ہو اس یرغمالی کے ہوتے ہوئے جاوا کو اپنی زبان پر تالا لگانا پڑے گا۔ یہ تالا اس وقت کھلے گا جب یرغمالی اسے واپس ملے گا اور ہم پاکستان میں ہوں گے۔''

''وہ کیسے اسے یرغمالی کے طور پر ہمارے حوالے کرے گا؟ یہ اس کے لیے بڑا مشکل کام ہوگا عمران صاحب۔''

''ہم نے بھی تو مشکل کام کیے ہیں۔ ثروت اور عطیہ کو اس کے پاس بطور ضمانت نہیں رکھا؟ اسے بھی کرنا پڑے گا۔ آراکوئے والا کھیل اتنا بڑا ہے کہ اسے یہ داؤ لگانا ہی پڑے گا۔ ہمارے درمیان فون پر بڑی لمبی بحث ہوئی ہے۔ آخر اسے آمادہ ہونا پڑا ہے۔ ایسا گولڈن چانس اسے پوری زندگی میں پھر نہیں مل سکتا۔ اس نے سب کچھ ناپ تول لیا ہے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن...''

''لیکن کچھ نہیں شیخ! یہ بات طے ہے کہ مجھے خود وہاں جانا ہے۔ تم بس تیاری کرو۔ تم دیکھنا، ہم جاوا کو اس کی ساری عیاریوں سمیت جکڑ کر رکھ دیں گے۔ مدتوں تک زخم چاٹے گا۔ ہم ایک بار ثروت کو اس کے چنگل سے نکال لیں پھر ہمارے حساب برابر کر دیں گے۔''

اب وہ لوگ باہر نکلنے والے تھے۔ میں جلدی سے ڈرم پر سے اترا اور دبے پاؤں چلتا ہوا واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ میرے اندر کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ میں نے آج پہلی بار جیلانی جیسے مضبوط شخص کو آنسو بہاتے دیکھا تھا۔ یقیناً یہ کوئی نہایت سیریس معاملہ تھا۔ میری توقع سے کہیں زیادہ گمبھیر۔ وہ پتا نہیں کس حوالے سے بات کر رہے تھے۔ وہ کیا خاص بات تھی جس کا پتا ڈان کو چل چکا تھا اور اب اس کے توڑ کے لیے عمران اس سے کوئی خاص ضامن یعنی یرغمالی مانگ رہا تھا؟ اور وہ مانگ ہی نہیں رہا تھا، ڈان جاوا دینے کے لیے تیار بھی ہو گیا تھا۔ اس سے آراکوئے کی بے پناہ قدر و قیمت کا اندازہ بھی ہوتا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ یہ بین الاقوامی سطح پر لاکھوں نہیں، کروڑوں ڈالرز کی ''چیز'' ہے۔

میں پہلے کی طرح بستر پر خاموش لیٹا رہا اور آنکھیں بند کر لیں۔ عمران کمرے میں آیا۔ کچھ دیر مجھے دیکھا پھر باہر چلا گیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ نصیر کے ساتھ نیلی کار پر کہیں گیا ہے۔ یہ میرے لیے اچھا موقع تھا۔ مجھے پتا تھا کہ اوپر چھت والے کمرے کی ایک ''ڈپلی کیٹ'' چابی بھی موجود ہے۔ یہ چابی نصیر احمد کے کمرے میں تھی اور نصیر بھی عمران کے ساتھ گیا تھا۔ میں نصیر کے کمرے میں پہنچا۔ دو تین منٹ کی کوشش سے میں نے مطلوبہ چابی ایک دراز میں سے ڈھونڈ لی۔ اس چابی کے ساتھ میں سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ راستے میں جیلانی ملا۔ اس سے ایک دو باتیں ہوئیں۔ اس نے بتایا کہ عمران

ذرا سپر مارکیٹ تک گیا ہے۔ جیلانی بظاہر نارمل نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا مگر آنکھوں کی سرخی کچھ اور بتا رہی تھی۔ جیلانی نے ایک فون سننا شروع کیا تو میں سیڑھیاں چڑھ کر چھت والے کمرے کی طرف آ گیا۔ اس کمرے میں نصیر کا کمپیوٹر پڑا رہتا تھا اور لینڈ لائن فون بھی یہیں تھا۔ میں نے عمران کو دو تین بار اس کمرے میں گھسے ہوئے پایا تھا۔ منگل کی رات بھی وہ کافی دیر اس کمرے میں رہا تھا۔

میں نے تالا کھولا اور کمرے میں پہنچا لیکن لائٹ آن نہیں کی۔ میرے پاس ایک پنسل ٹارچ موجود تھی۔ میں نے کھڑکیوں کے پردے اچھی طرح برابر کیے اور کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ نیٹ آن تھا۔ میں نے سی پی یو آن کیا۔ مانیٹر پر تفصیلات ظاہر ہونے لگیں۔ تھوڑی سی کوشش سے میں نصیر کے ای میل باکس میں پہنچ گیا۔ پاس ورڈ مجھے پہلے سے معلوم تھا۔ یہاں ایک ای میل نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ یہ دو روز پہلے آئی تھی۔ میں دم بخود دیکھتا رہ گیا۔

اس ای میل میں عمران اور جیلانی کو بتایا گیا تھا کہ اقبال کی لاش مل گئی ہے۔ اسے بُری طرح تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ درندگی کی انتہا کر دی گئی ہے۔ لاش کے سینے پر پرچہ رکھا ہوا ملا ہے۔ اس پر لکھا ہے۔ ”نادر ٹی کے دوستوں کی طرف سے بڑی عید کا تحفہ۔“ اندازہ ہو رہا ہے کہ ان لوگوں نے اقبال کو خاص قسم کے نشہ آور انجکشن دیے ہیں اور ان انجکشنوں کے زیرِ اثر اس سے بہت کچھ معلوم کر لیا ہے۔ عین ممکن ہے بلکہ یقینی بات ہے کہ اب انڈیا میں آپ لوگوں کی شناخت راز نہیں رہی۔ صاف پتا چلتا ہے کہ یہ جاوا گروپ کی کارروائی ہے۔ انہوں نے اس طرح نادر ٹی ٹی کے قتل، لالہ زار ہوٹل اور انڈسٹریل ایریا والی کارروائی کا بدلہ لیا ہے۔ ہم وقتی طور پر روپوش ہیں۔ آپ کی ہدایات کا انتظار ہے۔

میں یہ ای میل پڑھ کر سکتے میں رہ گیا۔ عمران نے مجھے مکمل اندھیرے میں رکھا ہوا تھا۔ اقبال کی موت والا سنگین ترین واقعہ رونما ہو چکا تھا اور اس نے مجھے بھنک تک نہیں پڑنے دی تھی۔ حوادث کو جھیلنے اور مسائل کا سامنا کرنے کا اس کا اپنا ایک انداز تھا۔ وہ صدمات کو اپنے تک محدود رکھنے میں فخر محسوس کرتا تھا لیکن یہ تو کوئی بات نہیں تھی کہ وہ اتنی سنگین اطلاعات بھی مجھ سے چھپا کر رکھتا۔ میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ اقبال کا چہرہ نگاہوں میں گھومنے لگا۔ ہم سب ایک خاندان کی طرح ہو گئے تھے۔ ایک دوسرے کی کمی کو بُری طرح محسوس کرتے تھے۔ اقبال ہمارے ساتھ انڈیا نہیں آ سکا تھا لیکن اس کا خیال تو ساتھ ساتھ ہی چلتا تھا۔ اور اب مجھے پتا چل رہا تھا کہ وہ لاہور کے کسی قبرستان میں منوں مٹی کے نیچے سو رہا ہے۔ غالباً یہی وہ اہم واقعہ تھا جس کا ذکر جیلانی نے عمران کے ساتھ گفتگو میں بڑے درد سے کیا تھا۔

تب ایک اور ای میل نے میری نگاہوں کو پکڑ لیا۔ یہ ای میل چار پانچ روز پہلے کی تھی اور اقبال نے خود کی تھی۔ اس میں اقبال نے سلطان چنا کی پراسرار سرگرمیوں کی بات کرنے کے بعد ثروت کی چھوٹی بہن نصرت کا تذکرہ کیا تھا۔ یہ ایک طویل ای میل تھی۔ اس کے اندراجات سے مجھ پر انکشاف ہوا کہ لاہور میں نصرت کی حالت بہت زیادہ خراب ہو چکی ہے۔ اسے پھر سے آسٹریا منتقل کرنے کی تیاری کی جا رہی ہے۔ ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ اب جگر کی پیوندکاری کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ اور یہ پیوندکاری دو چار ہفتوں کے اندر ہو جانی چاہیے ورنہ نصرت کی زندگی ختم ہو سکتی ہے۔

میں سناٹے میں رہ گیا۔ عمران کو یہ سب کچھ معلوم تھا اور وہ خود ہی ان معاملوں کو ہینڈل کر رہا تھا۔ ایک دوسری ای میل کے اندراجات سے پتا چلا کہ عمران نے آسٹریا میں کسی ایسے ادارے سے رابطہ کیا ہے جو ضرورت مند لوگوں کے لیے گردوں اور جگر وغیرہ کے عطیات فراہم کرتا ہے۔ عمران کا ایک سرجن دوست بھی اس میں کردار ادا کر رہا تھا۔ لگتا تھا کہ عمران ایک دو ہفتوں میں اس ادارے کے لیے ایک بڑے ڈونیشن کا انتظام بھی کرنے والا ہے۔

نصرت کی تشویش ناک حالت کا جان کر میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ مجھے عمران پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ اس بندے نے جیسے ہر مصیبت اپنے سر پر لینے کا ٹھیکا لے رکھا تھا۔ بعض اوقات مشورے کی حد تک بھی کسی کو شریک نہیں کرتا تھا۔ یقینی بات تھی کہ کبھی کبھی اس بے جا رازداری کی وجہ سے نقصان بھی ہوتا ہوگا۔ میرا دل چاہا کہ وہ میرے سامنے ہو اور میں اس کا گریبان پکڑ لوں۔ اسے جھنجوڑوں اور اس رویے کی وجہ پوچھوں۔

میں زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتا تھا۔ میں نے نیٹ بند کیا اور اپنی آمد کی نشانیاں ختم کر کے کمرے سے نکل آیا۔ تاہم اس سے پہلے میں نے چند درازوں کی تلاشی بھی لی۔ ایک دو کاغذات میں مجھے کسی میجر صاحب کا تذکرہ بھی ملا۔ شاید یہ وہی سابق فوجی آفیسر تھا جس کا ذکر عمران نے کیا تھا۔ ایک جگہ حمزہ احسان کے نام کی ایک رسید بھی ملی۔ یہ حمزہ صاحب وہی پولیس آفیسر تھے جو پاکستان میں گاہے بگاہے عمران کی مدد کرتے رہتے تھے۔

میں نیچے آیا۔ اب رات نے اپنے تاریک پر پھیلا لیے تھے۔ قریباً ساڑھے آٹھ کا وقت تھا۔ عمران تاحال واپس نہیں آیا تھا۔ جیلانی اور نصیر مختلف تیاریوں میں مصروف تھے۔ ان تیاریوں کو ابرار صدیقی نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ وہ بستر پر لیٹا تھا۔ اس کے چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر اپنے پاس بلایا اور خوف زدہ لہجے میں بولا۔ ”یہ سب کیا ہو رہا ہے تابش! مجھے لگتا ہے کہ تم لوگ ایک اور خطرناک کھیل کھیلنے جا رہے ہو۔ میں تمہاری منت کرتا ہوں۔ ایسا مت کرو... یہ منحوس مورتی ہے۔ سب کو برباد کر کے رکھ دے گی۔“

میں نے کہا۔ ”لیکن ابرار صاحب! لوگ تو کہتے ہیں اس سے بڑی برکت والی چیز ہی اور کوئی نہیں۔ یہ اپنی حفاظت خود کرتی ہے اور ان لوگوں کو بھی ہر بلا سے محفوظ کر دیتی ہے جن کے پاس ہوتی ہے۔“

”سب کچھ اس کے الٹ ہے۔“ ابرار کراہا۔ ”یہ اپنی حفاظت نہیں کرتی اور ان لوگوں کو بھی برباد کر رہی ہے جو اس کے آس پاس ہیں۔ کم از کم ہمارے لیے تو یہ ایسی ہی ثابت ہوتی رہی ہے اور ہو رہی ہے۔“

میرے فون کی بیل ہوئی۔ یہ عمران تھا۔ ”کہاں ہو؟“ میں نے اپنے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے پوچھا۔

”بس یار! تھوڑی سی ریہرسل کرنا تھی، رات گیارہ بجے کے لیے۔ بس آدھ پون گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں تمہارے پاس۔“

”جلدی آؤ، کچھ باتیں کرنی ہیں مجھے بھی۔“ میں نے گمبھیر آواز میں کہا۔

گھڑی کی سوئیاں حرکت میں تھیں۔ نو بج چکے تھے۔ اب صرف دو گھنٹے باقی تھے۔ اس شہرِ خوں رنگ کے ایک ساحل پر چند نہایت خطرناک لوگوں میں ملاقات ہونے والی تھی۔ قربان علی عرف شیکھر نے عمران کو بتایا تھا کہ وہ انڈیا کے چنے ہوئے شوٹرز کو لے کر آ رہا ہے...

دوسری طرف جاوا گروپ کے پاس بھی یقیناً خوں خوار ترین قسم کے قاتل موجود تھے۔ قریباً پچاس عدد خطرناک ترین لوگوں کے سائے میں ایک ڈیل فائنل ہونا تھی۔ اسی دوران میں پورچ کے سامنے دو ڈبل کیبن گاڑیاں رکیں۔ ان میں سے کچھ لوگ اترے۔ یہ سب کے سب مسلح تھے اور ان کے چہرے ہی بتا رہے تھے کہ وہ زبردست قسم کے فائٹر اور اسلحہ شناس بندے ہیں۔ ان میں چھریرے بدن کا ایک دراز قد نوجوان سب سے نمایاں تھا۔

جیلانی نے کہا۔ ”قربان علی آ گیا ہے۔“ فضا میں سنسنی سی پھیلتی محسوس ہوئی۔ فیصلہ کن گھڑیاں قریب آ رہی تھیں۔

گاڑیوں سے اترنے والوں میں بس ایک بندہ قدرے مختلف نظر آیا۔ یہ شکل سے مار دھاڑ کرنے والا شخص نہیں لگتا تھا۔ اس جواں سال شخص نے ماتھے پر سفید قشقہ کھینچا ہوا تھا۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی رکھی ہوئی تھی اور ہندو پجاریوں کی طرح سادہ سا دھوتی کرتہ پہن رکھا تھا۔ وہ خاموش طبع تھا اور اس سارے ماحول کو جیسے ڈری ہوئی سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ”یہ کون ہے؟“ میں نے جیلانی سے پوچھا۔

”ماسٹر جواہر۔ ڈھائی تین سال پہلے تک یہ جاوا کا ملازم تھا۔ ملازم بھی کیا تھا، بس اس کی کوٹھی میں اس کے بھتیجے کو ٹیوشن پڑھانے جاتا تھا۔ وہیں سے بے چارے کی بدقسمتی کا آغاز ہوا۔“

”کیا ہوا؟“

”دردناک قصہ ہے۔ جواہر کی بیوی سریتا خاصی خوب صورت تھی۔ دو سالہ بچی کی ماں بھی تھی۔ کسی ٹی وی چینل پر انگریزی کی خبریں بھی پڑھتی تھی۔ بری قسمت کہ کہیں جاوا کی نظر اس پر پڑ گئی۔ وہ اس پر فریفتہ ہو گیا۔ جاوا جیسا بندہ کسی کو حاصل کرنا چاہے اور نہ کر سکے، یہ تو ممکن ہی نہیں ہے۔ اس نے پہلے پیار محبت اور حیلے سے کوشش کی پھر زبردستی سریتا کو اپنے گھر میں ڈال لیا۔ ساتھ میں بچی بھی رکھ لی۔ کچھ کہتے ہیں کہ جاوا نے سریتا سے شادی کی ہوئی ہے، کچھ کے خیال میں ویسے ہی رکھا ہوا ہے لیکن ایک بات طے ہے کہ وہ اب بھی اس پر فدا ہے۔“

”اور یہ جواہر؟“

”یہ رو پیٹ کر کہیں غائب ہو گیا تھا۔ کوئی ایک سال بعد دوبارہ نظر آیا لیکن اب یہ بالکل بدل چکا ہے۔ پوجا پاٹ اور مندر تیرتھ کا ہو کر رہ گیا ہے۔ کہتا ہے کہ میں نے جوگ لیا ہوا ہے۔“

”لیکن یہ یہاں کیوں آیا ہے؟“

”پتا نہیں، عمران صاحب نے ہی بلایا ہوگا۔“

☆☆☆

میں عمران سے بہت کچھ کہنا اور سننا چاہتا تھا لیکن وہ ایسے وقت آیا جب روانگی بالکل قریب تھی۔ سوا دس بج چکے تھے اور کالی جھاڑ تک چالیس پینتالیس منٹ کا راستہ ہی تھا۔ عمران بڑے جارحانہ موڈ میں تھا۔ اس کی شوخی نہ جانے کن پردوں میں جا چھپی تھی۔ وہ اپنے بندوں کو مختلف ہدایات دے رہا تھا اور ان کی تیاری وغیرہ پر بھی نگاہ ڈال رہا تھا۔ میں

اور جگت سنگھ بھی تیار تھے۔ جگت سنگھ نڈر اور جی دار بندہ تھا۔ یہ جان کر کہ ہمارا سامنا جاوا سے ہونے والا ہے، جگت سنگھ کی آنکھوں سے چنگاریاں چھوٹنے لگی تھیں۔ اس نے عمران سے اصرار کر کے چار پانچ دستی بم بھی ساتھ رکھ لیے تھے۔ بہرحال، عمران نے اسے بڑی اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ یہ نہایت نازک معاملہ ہے اور کسی ہدایت کے بغیر وہ کسی طرح کی کوئی کارروائی نہیں کرے گا۔ اس حوالے سے میں نے بھی جگت سنگھ کو پابند کر دیا تھا۔

میں عمران کے چہرے پر اقبال کی موت کا غم ڈھونڈنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن یہ دل فگار غم شاید کہیں گہرائی میں دھکیل دیا گیا تھا۔ ویسے بھی عمران کے چہرے سے اس کی دلی کیفیت کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا تھا۔

ہم چار گاڑیوں میں بڑی برق رفتاری سے روانہ ہوئے۔ میں عمران کے ساتھ دو ہزار آٹھ ماڈل کی ایک لینڈ روور جیپ میں تھا۔ جگت سنگھ اور جیلانی بھی ہمارے ساتھ تھے۔ نصیر احمد، قربان علی کے ساتھ دوسری گاڑی میں تھا۔ پون گھنٹے کے اندر ہم ساحل پر پہنچ گئے۔ یہ ایک تاروں بھری رات تھی۔ آٹھویں نویں رات کا چاند بھی موجود تھا۔ سمندر پرسکون اور خاموش تھا۔ ہوا اور لہروں کی مدھم سرگوشیاں جاری تھیں۔

ہم نے مقررہ جگہ پر گاڑیاں روکیں۔ تقریباً یہی وقت تھا جب ممبئی کا خوں خوار جانور جاوا اپنے ساتھیوں کے ہمراہ موقع پر پہنچا۔ ان کی گاڑیاں ہماری گاڑیوں سے قریباً دو سو فٹ کے فاصلے پر رک گئیں۔ عمران کے سیل فون کی بیل ہوئی۔ عمران نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف حسبِ توقع جاوا ہی تھا۔

''ہیرو! میں جاوا ہوں۔ سامان لے آئے ہو؟''

''لے آیا ہوں جنابِ عالی۔۔۔ اور آپ؟''

''میں بھی لے آیا ہوں۔''

''اور ضامن؟''

''وہ بھی ہے۔''

''تو ٹھیک ہے، ان کو روانہ کرو۔ میں ادھر سے مورتی بھیجتا ہوں۔''

''لیکن پہلے میں چیک کرنا چاہوں گا۔''

''ٹھیک ہے، بندہ بھیج دو۔''

قریباً تین منٹ بعد دو بندے ہمیں اپنی طرف آتے دکھائی دیے۔ ان میں سے ایک تو جاوا کا کوئی گھاگ شوٹر تھا، دوسرا ایک کھچڑی بالوں والا ادھیڑ عمر بندہ تھا۔ قریب پہنچنے پر اندازہ ہوا کہ اس نے عینک لگا رکھی ہے۔ یقیناً یہ کوئی ماہر نوادرات تھا اور آراکوئے کی صحت جانچنے کے لیے آیا تھا۔

عمران نے لینڈ روور کے خفیہ خانے میں ہاتھ ڈال کر آراکوئے نکالا۔ اسے بڑی احتیاط سے فوم کی باریک تہ میں لپیٹا گیا تھا۔ اس کے اوپر ریگ زین کا کور تھا۔ شوٹر اور ادھیڑ عمر شخص لینڈ روور کے اندر ہی آ گئے۔ ان کے چہروں کو گہری سنجیدگی نے ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ یہ کس قدر گمبھیر صورتِ حال ہے۔ چاروں طرف آتشیں ہتھیار بالکل تیار حالت میں موجود تھے۔

عمران نے آراکوئے کو اس کے کورز میں سے نکالا۔ دو فٹ کا دھاتی مجسمہ جیپ کی اندرونی روشنیوں میں چمکنے لگا۔ اس کی دید متاثر کن تھی۔ ادھیڑ عمر شخص کے پاس نیلگوں روشنی والی ایک خاص قسم کی ٹارچ موجود تھی۔ اس نے ایک آنکھ پر محدب شیشہ چڑھایا۔۔۔ ٹارچ جلائی اور آراکوئے کے معائنے میں مصروف ہو گیا۔ اس نے آراکوئے کی پشت پر کندہ برمی زبان کے چند قدیم حروف کا بھی معائنہ کیا۔ اس کے بعد اثبات میں سر ہلا دیا۔

''میں مطمئن ہوں۔'' اس نے انگریزی میں کہا۔ جیب سے مارکر نکالا اور آراکوئے کی پشت پر سرخ مارکر سے اپنے سائن کر دیے۔ اس کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

عمران نے سرد آنکھوں والے شوٹر سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''جاوا سے کہو کہ وہ مجھ سے رابطہ کرے۔''

دونوں افراد واپس چلے گئے۔ قریباً پانچ منٹ بعد عمران کے فون پر جاوا کی آواز ابھری۔ ''کیا کہتا ہے؟''

''آواز سننا چاہتا ہوں میڈم صفورا اور ثروت کی اور ضامن کی بھی۔''

''او کے۔۔۔ دو منٹ ہولڈ کرو۔''

کچھ دیر بعد فون کے اسپیکر پر میڈم صفورا کی آواز ابھری۔ ''ہیلو عمران!''

''ہیلو میڈم! کہاں ہیں آپ؟''

''سامنے سرخ ہائی روف گاڑی میں۔ ثروت بھی میرے ساتھ ہے۔''

''ٹھیک ہے، ثروت سے بات کرائیں۔''

چند سیکنڈ بعد ثروت کی دبی ہوئی آواز سنائی دی۔

''ہیلو!''

عمران نے فون میری طرف بڑھا دیا۔ ''ہیلو ثروت! تم کیسی ہو؟''

''مم۔۔۔ میں بالکل ٹھیک ہوں تابش۔'' وہ رو دینے

کے قریب تھی۔ ''لیکن یہاں ہو کیا رہا ہے؟ یہاں بہت سے رائفلوں والے ہیں۔ آپ کہاں ہیں؟''

''پاس ہی ہیں۔ تمہیں لینے آئے ہیں۔ سمجھو پریشانی ختم ہو گئی ہے ثروت۔''

وہ سسک پڑی۔ کسی نے موبائل اس سے لے لیا۔ پھر جاوا کی منحوس آواز سنائی دی۔ ''بس یا کچھ اور؟''

عمران نے کڑے لہجے میں کہا۔ ''ضامن سے بات کروائیے جاوا صاحب۔''

''یہ شرط تم بڑی کڑی رکھ رہے ہو ہیرو بچے! کیا اس میں کوئی ردوبدل نہیں ہو سکتا؟''

''نہیں ہو سکتا جاوا حضور! اگر ہم ثروت کے سلسلے میں آپ پر اعتماد کر سکتے ہیں اور آپ اس اعتماد پر پورے بھی اتر سکتے ہیں تو پھر اس سلسلے میں بے اعتمادی کیوں؟ ضامن۔۔۔ ضامن ہے۔ جس حالت میں لیں گے، اسی حالت میں واپس کریں گے۔۔۔ پوری حفاظت کے ساتھ۔''

چند سیکنڈ بعد جاوا کی گمبھیر آواز ابھری۔ ''لو سریتا سے بات کرو۔''

سریتا کا نام سن کر میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ یہ تو وہی جاوا کی رکھیل تھی جس پر وہ بُری طرح فدا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ۔۔۔ آراکوئے کے لیے وہ اپنی بہت پیاری شے عارضی طور پر عمران کے حوالے کرنے کے لیے آمادہ ہو گیا تھا۔

کچھ دیر بعد ایک ٹھہری ہوئی سی باریک آواز سنائی دی۔ ''میں سریتا بول رہی ہوں۔''

''کہاں ہیں آپ؟'' عمران نے پوچھا۔

''سامنے گرے گاڑی کے اندر۔''

یہ گرے گاڑی وہی شاندار بلٹ پروف اور دھماکا پروف جیپ نما کار تھی جو لنگڑی پورہ سے فرید کوٹ آتے ہوئے جاوا کے پاس تھی۔ لڑائی کے دوران میں اس جیپ پر شدید فائرنگ کے علاوہ جگت سنگھ کے پھینکے ہوئے ''کالے اناروں'' کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

وہ مجہول سا جوگی نما شخص ہماری گاڑی سے باہر کھڑا تھا جس کا نام جیلانی نے جواہر بتایا تھا اور جس کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ وہ سریتا کا سابق پتی ہے۔ وہ ہماری گفتگو سن رہا تھا۔

عمران نے جیلانی سے کہا۔ ''اسے اندر لاؤ۔''

ڈرا سہما جواہر ہماری گاڑی کے اندر آ گیا۔ عمران نے کریکٹ سے ایک دو سوال مزید پوچھے پھر موبائل فون کے مائک کو ہتھیلی سے ڈھانپ کر جواہر سے پوچھا۔ ''یہ سریتا ہی کی آواز ہے؟''

جواہر کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اب دونوں طرف سے پوری تسلی کر لی گئی تھی، اس لیے تبادلے کا عمل شروع ہوا۔ ممبئی کے ماہر ترین گن مینوں نے گاڑیوں کے پیچھے پوزیشنیں سنبھال لیں۔ قریباً چار سو فٹ دور یقیناً جاوا کے لوگ بھی پوزیشنیں سنبھال چکے تھے۔ ہماری طرف سے عمران کا ساتھی قربان علی عرف شیکھر آراکوئے کے ساتھ آگے بڑھا۔ دوسری طرف سے ثروت اور میڈم صفورا نمودار ہوئیں۔ ان کے ساتھ ایک تیسری عورت بھی تھی جو یقیناً جاوا کی رکھیل سریتا تھی۔ مدھم چاندنی میں تینوں ہیولے آگے بڑھنے لگے۔ میں نے ٹیلی اسکوپ سے جائزہ لیا۔ ثروت کی دید نے دل و دماغ میں ہلچل سی مچا دی۔ ہوا کی وجہ سے اس کے ریشمی بال بار بار چہرے پر منتشر ہو رہے تھے، وہ انہیں پیچھے ہٹا رہی تھی۔ میڈم صفورا نے تسلی بخش انداز میں ثروت کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ میڈم صفورا کی بائیں جانب متناسب جسم والی وہ جواں سال لڑکی تھی جسے جاوا کی قربت کا شرف حاصل تھا اور جس کا نام سریتا بتایا جا رہا تھا۔ اس نے ساڑی باندھ رکھی تھی۔ ناک میں کوکے کی چمک تھی۔ کندھے پر شولڈر بیگ تھا۔ اس کے لمبے بال کسی فلمی سین کی طرح ہوا میں لہرا رہے تھے۔ ثروت کی طرح وہ بھی ڈری سہمی نظر آتی تھی۔ ان تینوں کے پیچھے جاوا کا قریبی ساتھی پریم چوپڑا تھا اور کھچڑی بالوں والا تھا۔

عمران دوسری ٹیلی اسکوپ سے جائزہ لینے لگا۔ چند سیکنڈ بعد اس نے مطمئن ہو کر ٹیلی اسکوپ رکھ دی اور رائفل پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ ہم نے ایک جیپ کے پیچھے پوزیشن لے رکھی تھی۔ جگت سنگھ ایک گھٹنا زمین پر ٹیک کر بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ٹرپل ٹو رائفل تھی اور وہ جوش سے بھرا ہوا تھا۔ ہمارے دائیں بائیں شوٹر بالکل چوکس تھے۔ انگلیاں ٹریگرز پر رکھ لی گئی تھیں اور فضا میں سنسناہٹ دوڑ رہی تھی۔

قربان علی آراکوئے کے ساتھ وسط میں پہنچا تو پریم چوپڑا بھی تینوں عورتوں کے ساتھ وسط میں پہنچ گیا۔ قربان علی نے آراکوئے پریم چوپڑا کو تھمایا۔ ٹارچ کی روشنی چمکی۔ میں نے ٹیلی اسکوپ میں دیکھا۔ کھچڑی بالوں والے نے آگے بڑھ کر آراکوئے کی پشت پر اپنے دستخط دیکھے اور آراکوئے وصول کر لیا۔

قربان علی نے ثروت، صفورا اور ضامن سریتا کو وصول کر لیا۔ اب آگے کا مرحلہ شروع ہوا۔ آراکوئے جاوا کی

طرف بڑھا اور ثروت وغیرہ ہماری طرف۔ یہ نازک لمحے تھے۔ کوئی گڑبڑ ہو سکتی تھی۔ دل دھڑک رہے تھے۔ عقابی نگاہیں گردش کر رہی تھیں... بہر طور خیریت گزری۔ قربان علی تینوں خواتین کے ساتھ ہمارے پاس پہنچ گیا اور پریم چوپڑا آرا کوئے کے ساتھ جاوا گروپ کے پاس۔ ثروت لپک کر میرے بازو سے لگ گئی اور سسکنے لگی۔ جگت سنگھ نے اسے پچکار کر کہا۔ ''اب کیوں روتی ہے چھوٹی! اب تو سب کچھ چنگا ہو گیا، واہگرو کی کرپا سے۔''

عمران نے بھی پیار سے ثروت کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ میڈم صفورا نے سریتا کو عمران کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''لو بھئی سنبھالو اپنی ''گارنٹی'' کو۔''

سریتا ایک بھرپور جواں سال عورت تھی۔ وہ خوب صورت بھی تھی۔ اس کی عمر چھبیس ستائیس سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔

میں نے دیکھا کہ جواہر نے اس پر ایک نگاہ ڈالنے کے بعد دوسری نگاہ نہیں ڈالی... وہ بالکل لاتعلق سا ہو گیا تھا۔ حالانکہ وہ کبھی اس کی پتنی تھی، اس کی بچی کی ماں تھی۔ جواہر کے کانوں میں جوگ کی بالیاں چمک رہی تھیں اور چہرے پر کرب کے آثار تھے۔

جیلانی نے جیب سے ایک تصویر نکالی اور تصویر سے موازنہ کر کے تصدیق کی کہ یہ سریتا ہی ہے۔ وہ سر جھکائے خاموش کھڑی تھی۔ عمران نے کہا۔ ''گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ہم وعدے کی پوری پابندی کریں گے۔ اگلے چند گھنٹوں میں تم اپنی بچی کے پاس واپس پہنچ جاؤ گی۔''

پروگرام کے مطابق ہم تیزی سے روانہ ہو گئے۔ اب ہمیں ممبئی واپس نہیں جانا تھا بلکہ ہائی وے پر سفر کرتے ہوئے صوبہ گجرات کی حدود میں داخل ہونا تھا اور پھر بھڑوچ اور احمد آباد سے ہوتے ہوئے تھر پارکر کے سرحدی علاقے کی طرف جانا تھا۔ یہ ایک لمبا سفر تھا لیکن امید تھی کہ ہم صبح دس بجے تک منزل کے قریب پہنچ چکے ہوں گے۔

تینوں گاڑیاں ہمارے ساتھ رہیں۔ سب سے آگے ایک ڈبل کیبن تھی جسے قربان علی خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ پورب کمار اور جیلانی بھی اس کے ساتھ تھے۔ اس کے بعد ہماری جیپ تھی۔ اس میں سب سے پچھلی نشست پر میں، ثروت اور میڈم صفورا بیٹھے تھے... لیکن پھر میڈم صفورا اٹھ کر درمیانی نشست پر سریتا کے پاس چلی گئی کیونکہ سریتا کچھ گھبرا رہی تھی۔ عمران، سریتا کی بائیں جانب بیٹھا تھا۔ سائلنسر لگا پستول اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ بالکل چوکس تھا۔ تاہم اس خیال سے کہ پستول کی دید سریتا کو ٹینشن میں مبتلا نہ رکھے، عمران نے اس پر ایک چھوٹا تولیا ڈال دیا تھا۔ جگت سنگھ اگلی نشست پر نصیر احمد کے ساتھ موجود تھا۔ ڈرائیونگ نصیر احمد کے ذمے تھی۔ جگت سنگھ کی عقابی نگاہیں ہر طرف گردش کر رہی تھیں۔ عمران نے موبائل فون پر پچھلی گاڑیوں سے مسلسل رابطہ رکھا ہوا تھا۔ ہم سے پیچھے جو گاڑی آرہی تھی، اس میں غمزدہ آنکھوں والا، جوگی نما جواہر بھی موجود تھا۔ پروگرام کے مطابق اسے ہم نے احمد آباد کے قریب اپنے قافلے سے علیحدہ کر دینا تھا۔ وہ وہاں کے ایک تیرتھ میں جانا چاہتا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اب وہ سریتا سمیت ہر چیز سے لاتعلق ہو چکا ہے... لاتعلق اور خوف زدہ... وہ ہماری رائفلوں وغیرہ کو دیکھتا تھا تو اس کے چہرے پر ہلدی سی بکھر جاتی تھی۔ لگتا تھا کہ ماضیِ قریب میں وہ بہت مشکل مراحل سے گزر چکا ہے۔ سریتا کی صورتِ حال بھی کچھ ایسی ہی نظر آتی تھی۔

آگے بھی جو کچھ ہوا، ہمارے پروگرام کے مطابق ہوا۔ ہم ایک چوراہے پر پہنچے تو بائیں طرف سے ایک ٹویوٹا جیپ نمودار ہوئی اور ہمارے قافلے میں شامل ہو گئی۔ اس جیپ میں زخمی ابرار صدیقی کے علاوہ ڈاکٹر مہناز، آہو چشم ایشوریا اور دونوں پاکستانی لڑکیاں موجود تھیں۔ ان لوگوں کو نصیر احمد کے گھر سے لانے والے قربان علی کے ساتھی ہی تھے۔ یہ وہی بندے تھے جنہیں اس نے ''اسٹینڈ بائی'' رکھا ہوا تھا۔ اس جیپ کے قافلے میں شامل ہوتے ہی ایک جیپ قافلے سے علیحدہ ہو گئی... یوں گاڑیوں کی کل تعداد چار ہی رہی۔

اب ہم تیزی سے ہائی وے پر رواں تھے... ہمارا رخ سورت شہر کی طرف تھا۔ رات نیم روشن اور خنک تھی۔ ثروت مجھ سے لگی بیٹھی تھی۔ نہ جانے کن خیالوں میں گم تھی۔ اس کا قرب اور قرب کی خوشبو مجھے بھولی بسری باتیں یاد دلا رہی تھیں۔ پچھلی گاڑی میں سے کسی نے عمران کے فون پر اطلاع دی۔ ''ایک گاڑی ہمارے پیچھے آرہی ہے جناب! گرے رنگ کی جیپ ہے۔ جاوا کی گاڑیوں میں سے ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔'' عمران نے کہا۔ ''یہ پروگرام کے مطابق ہی ہے۔'' چند سیکنڈ بعد آواز دوبارہ ابھری۔ ''لیکن جناب! شک پڑ رہا ہے کہ اس کے پیچھے بھی ایک یا دو گاڑیاں آرہی ہیں۔''

''غلط فہمی ہوئی ہوگی تمہیں۔ بس ایک گاڑی کی بات ہوئی تھی۔''

''ٹھیک ہے جی۔ میں چیک کرتا ہوں، میں نے رفتار

آہستہ کر دی ہے۔''

''او کے۔'' عمران نے کہا اور پھر ایک دوسرا نمبر پریس کیا۔ یہ جاوا ہی کا تھا۔ بیل ہوتی رہی لیکن کال ریسیو نہیں ہوئی۔ دوسری کوشش میں بھی یہی ہوا۔ اس دوران میں پچھلی گاڑی والے بندے کی کال پھر آگئی۔ اس نے کہا۔ ''کم از کم تین گاڑیاں مسلسل ہمارے پیچھے آرہی ہیں جی۔ دو جیپیں ہیں، ایک سیڈان کار۔ مجھے شک ہو رہا ہے کہ تینوں میں مسلح بندے گھسے ہوئے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، تم لوگ چوکس رہو۔ مسلسل رابطہ رکھو۔'' عمران نے کہا اور فون بند کر کے دوبارہ جاوا سے رابطے کی کوشش کی۔ رابطہ نہیں ہو سکا۔ اس نے پریم چوپڑا کا نمبر پریس کیا۔ کال مل گئی لیکن ابھی پریم چوپڑا نے ہیلو ہی کہا تھا کہ رابطہ منقطع ہو گیا۔

''کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو گئی؟'' میں نے عمران سے پوچھا۔

عمران کے بجائے نصیر احمد نے جواب دیا۔ ''گڑبڑ کیوں ہونی ہے جی۔ جب تک یہ بی بی سریتا ہمارے پاس ہے، کچھ نہیں ہوگا۔ ہو ہی نہیں سکتا۔''

سریتا سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔

عمران نے قربان علی کو فون پر ہدایت کی کہ وہ اپنی گاڑی کو ذرا آہستہ کر کے پیچھے لے جائے اور دیکھے کہ کیا صورتِ حال ہے۔

قربان علی نے اس ہدایت پر فوراً عمل کیا۔ ہم قربان علی اور پورب کمار والی گاڑی کو اوورٹیک کر کے آگے نکل گئے۔ دو تین منٹ بعد قربان علی کی کال آگئی۔ اس کی آواز سے پریشانی مترشح تھی۔ ''عمران صاحب! لگتا ہے جاوا کے ساتھی معاہدہ توڑ رہے ہیں۔ صرف ایک گاڑی کی بات ہوئی تھی لیکن تین چار گاڑیاں اپن کے پیچھے ہیں۔ یہ لوگ نزدیک آرہے ہیں۔ ان کے ارادے ٹھیک نا ہیں لگتے۔''

عمران جبڑے بھینچ کر رہ گیا۔ اس نے پستول کا سائلنسر اتار کر پستول کو اپنی پتلون کی بیلٹ میں اڑسا اور گن نکال لی۔ ہم بھی چوکس ہو گئے۔ سریتا کا چہرہ اب خوف و ہراس کی تصویر بنا ہوا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو سب سے پہلے اس کی ہی زندگی داؤ پر لگے گی۔

نصیر احمد نے سریتا کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''مجھے نہیں لگتا عمران صاحب کہ اس بی بی کے ہوتے ہوئے جاوا کسی حماقت کا سوچ بھی سکتا ہے۔ کہیں یہ کوئی اور گروپ تو نہیں؟''

''قربان علی پورے یقین سے کہہ رہا ہے کہ یہ جاوا کی گاڑیاں ہیں اور اس کے بندے ہیں۔'' عمران نے جواب دیا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ اس بی بی سریتا والا خطرہ مول لے ہی نہیں سکتا۔'' پھر وہ سریتا سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تم کیا کہتی ہو... یہ کیا ہے سب؟''

''مجھے کوئی جانکاری نہیں... کوئی نہیں۔'' وہ گردن جھکا کر سسک پڑی۔

اس دوران میں قربان علی کی چلاتی ہوئی سی آواز موبائل فون پر ابھری۔ ''سر! یہ لوگ کوئی کارروائی کرنے والے ہیں۔ پیچھے آنے والی گاڑیوں میں مجھے بی ایس ایف کی ایک گاڑی بھی دکھائی دے رہی ہے۔''

''او گاڈ!'' نصیر احمد نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

عمران نے جبڑے بھینچ رکھے تھے۔ اس کے چہرے پر بلا کی سختی ابھر آئی تھی۔

''یہ بی ایس ایف والا کیا معاملہ ہے؟'' میں نے عمران سے پوچھا۔

وہ میری بات نظرانداز کرتے ہوئے نصیر سے مخاطب ہوا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہمیں کہیں رک کر دیکھ لینا چاہیے کہ کیا مسئلہ ہے؟''

''رکنے کے لیے ایک بڑی مناسب سی جگہ تو ہے یہاں۔'' نصیر احمد نے کہا۔

اب ہم سورت کے قریب پہنچنے والے تھے۔ دور سے شہر کی ٹمٹماتی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ ہم ایک مضافات سے گزر رہے تھے۔ نصیر احمد نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ پیچھے آنے والی گاڑیاں بھی تیز ہو گئیں۔ عمران نے فون پر قربان علی وغیرہ کو ہدایت دی۔ ''ہم آگے جا کر کچھ دیر کے لیے رک رہے ہیں۔ تم سب نے بھی ہمارے ساتھ ہی رک جانا ہے۔ ہمیں فالو کرتے رہو۔''

''جی سر!'' قربان علی نے کہا۔

''لڑکیوں والی جیپ کا خاص دھیان رکھو۔'' عمران نے کہا۔

''ٹھیک ہے سر۔'' قربان نے جواب دیا۔

نصیر احمد بڑی برق رفتاری سے ایک بغلی سڑک پر مڑا اور پھر قریباً ایک کلومیٹر آگے جا کر ایک پارک نما جگہ پر رک گیا۔ یہاں کافی درخت تھے۔ یہ جگہ قدرے اونچائی پر تھی۔ اسٹریٹ لائٹس میں سرخ اینٹوں کی بنی ہوئی ایک عمارت نظر آرہی تھی۔ کوئی اسپورٹ کمپلیکس قسم کی شے تھی لیکن فی الوقت بالکل ویران پڑی تھی۔ کچھ فاصلے پر سورت شہر کی

روشنیاں بھی یہاں سے صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ نصیر احمد اس جگہ کا محلِ وقوع بڑی اچھی طرح سے جانتا ہے۔ وہ جیپ کو فراٹے سے ایک ڈرائیو وے پر لے گیا اور پھر ایک ادھ کھلے گیٹ سے گزر کر ایک احاطے میں رک گیا۔ ہماری باقی گاڑیاں بھی تیز رفتاری سے احاطے میں پہنچ گئیں۔ ہماری آخری گاڑی وہ تھی جس میں قربان علی تھا۔ قربان علی نے اپنی گاڑی احاطے میں داخل نہیں کی بلکہ کچھ فاصلے پر ہی روک لی۔ یقیناً وہ بلندی سے عقب کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ عمران سے مسلسل رابطے میں تھا اور گاہے بگاہے رننگ کمنٹری کے انداز میں بول رہا تھا۔ ”جی سر! گاڑیاں پہنچ گئی ہیں... یہ تعداد میں زیادہ ہیں۔ او گاڈ... یہ چھ سات کے قریب ہیں۔ یہ پھیل کر آگے آرہے ہیں۔ مجھے لگ رہا ہے جی... کہ...“ وہ کہتے کہتے خاموش ہوگیا۔

”ہاں ہاں قربان... کھل کر بتاؤ۔“

”مجھے لگ رہا ہے جی کہ وہ گھیر رہے ہیں ہم کو۔ شاید آپ بھی دیکھ رہے ہوں گے۔ دو گاڑیاں بائیں طرف سے گھوم کر آرہی ہیں۔“

”ہاں... مجھے نظر آرہا ہے۔“ عمران نے تائید کی۔

”یہ لیں جی... نئی خبر۔“ قربان کی سنسناتی آواز ابھری۔ ”ان دو گاڑیوں میں ایک وہی جاوا کی گرے جیپ ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ ان کی نیت میں فتور آچکا ہے۔ تم لوگ پوزیشنیں لے لو۔ ہم بھی لے رہے ہیں۔“

”اس چھوکری سریتا کا خاص دھیان رکھیں سر! اس وقت ہمارے ہاتھ میں وہی سب سے اہم پتا ہے۔“

”بے فکر رہو۔“ عمران نے کہا۔

رابطہ منقطع کرنے کے بعد عمران نے ایک بار پھر جاوا اور پریم چوپڑا کو فون کرنے کی کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔ اب صاف ظاہر تھا کہ وہ جان بوجھ کر رابطہ نہیں کررہے۔ یہ وہی صورتِ حال ہوگئی تھی جو ممبئی میں سامنے آئی تھی۔ لیکن تب تو ہمارے ہاتھ میں کچھ نہیں تھا، اب تو سریتا تھی۔

”اب یہ کیوں ہورہا ہے عمران؟“ میں نے پوچھا۔

”کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ یہ بات تو کنفرم ہے کہ یہ کتا جاوا اس سریتا کے ہوتے ہوئے کوئی غلط حرکت نہیں کرے گا۔“

”ہوسکتا ہے، بی ایس ایف والوں نے اسے مجبور کردیا ہو۔“ میں نے کہا۔

”لیکن بی ایس ایف کو خبر کس نے کی؟ جاوا کے سوا اور کسی کو پتا ہی نہیں تھا کہ ہم ہائی وے پر ہیں اور سورت کی طرف جارہے ہیں۔“

سرخ اینٹوں والی عمارت میں بس ایک سرکاری چوکیدار موجود تھا۔ وہ نیند سے جاگا تھا اور یہ ہنگامہ دیکھ کر ہکا بکا ہوگیا تھا۔ اس نے کسی کو فون کرنے کی کوشش کی مگر میں نے اس سے فون چھین کر اسے ایک باتھ روم میں بند کردیا۔ ہم نے مختلف جگہوں پر پوزیشنیں سنبھال لیں۔ جگت سنگھ میرے کندھے سے کندھا ملائے بیٹھا تھا اور اس کی آنکھوں سے شعلے لپک رہے تھے۔ یہ صورتِ حال اس کی خواہش کے عین مطابق تھی۔ وہ جاوا گروپ سے ٹکرانے کی شدید خواہش رکھتا تھا... اسے جاوا کی طرف سے آشا اور گوبند سنگھ کی موت کی صورت میں دو کاری زخم لگے تھے۔ وہ ان زخموں کا مداوا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ مجھ سے بھی بہت متاثر تھا۔ اس نے بارڈر ایریا میں میرے ہاتھوں انور گنجے کے پانچ خوں خوار کارندوں کو ذبح ہوتے دیکھا تھا۔ اس لڑائی نے اسے میرا گرویدا بنادیا تھا۔ وہ خوش تھا کہ آج اسے میرے کندھے سے کندھا ملا کر مشترکہ دشمن سے لڑنے کا موقع مل رہا ہے۔

عمران نے سریتا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ”تابی! تم اس حرامزادی کے سر پر کھڑے ہوجاؤ۔ ہمارے ساتھ کچھ ہوا تو پہلے اس کے ساتھ ہوگا۔“

”بے فکر رہو۔“ میں نے کہا اور سریتا کو چوٹی سے پکڑ کر نیچے فرش پر گرادیا۔ وہ خوف زدہ انداز میں چلا کر رہ گئی۔

اس کی آواز سن کر کچھ دور بیٹھا ماسٹر جواہر چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ یہاں جتنے لوگ موجود تھے، ان میں سب سے خوف زدہ وہی تھا۔ وہ جیسے موت کے فرشتے کو اپنے روبرو دیکھ رہا تھا۔ سریتا کبھی اس کی بیوی تھی، اس کی محبوب ہستی تھی لیکن آج وہ اس کی طرف سے بھی لاتعلق ہی دکھائی دے رہا تھا۔ وہ گاہے بگاہے پرارتھنا کے انداز میں ہاتھ جوڑتا تھا اور منہ میں کچھ پڑھنے لگتا تھا۔

ہم سرخ اینٹوں والی عمارت کی دوسری منزل پر تھے۔ یہ بیڈمنٹن کا ایک ہال تھا۔ ہم اس ہال میں سے فاصلے تک دیکھ سکتے تھے۔ جاوا اور اس کے ساتھیوں نے ہمیں تین اطراف سے گھیر لیا تھا اور اب چوتھی طرف بھی ان کی موجودگی ظاہر ہورہی تھی۔ نصیر احمد پھر بڑبڑایا۔ ”یہ نہیں ہوسکتا۔ یہ کمینہ جاوا اپنی اس رکھیل کی زندگی کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ یہ بات مشہور ہے کہ وہ اس پر جان دیتا ہے۔ سب جانتے ہیں اس بات کو۔“

قربان علی نے تائید کی۔ ”یہ واقعی انہونی ہورہی ہے۔“

یکا یک مین گیٹ کی طرف سے چند فائر ہوئے۔ یہ فائر یقیناً جاوا کے لوگوں کی طرف سے کیے گئے تھے۔ جواب میں پورب کمار اور جگت سنگھ نے بھی فائرنگ شروع کردی۔ دھماکوں اور شعلوں سے رات کا سناٹا چکنا چور ہوگیا۔ ہم نے بھی پوزیشنیں سنبھال لیں۔ دو تین منٹ تک زوردار فائرنگ ہوئی۔ دائیں طرف سے جاوا کے ساتھی مختلف چیزوں کی آڑ لیتے ہوئے آگے آگئے۔ اب ہمارے گرد ان کا گھیرا اور خطرناک ہوگیا تھا۔

کچھ دیر کے لیے فائرنگ تھم گئی۔ مجھے ماسٹر جواہر کے رونے کی آواز آئی۔ وہ ایک آہنی الماری کے پیچھے دبکا ہوا تھا۔

میں لپک کر اس کے پاس گیا۔ ”جواہر! کیا ہوا ہے تمہیں؟“

وہ ہچکیوں سے رونے لگا۔ دل فگار آواز میں بولا۔ ”یہ ماردیں گے۔ تم سب کو ماردیں گے۔ ایک بھی نہیں بچے گا۔ ہم سب کی ہتھیا ہوجائے گی۔ یہ لڑکی کسی کو نہیں بچا سکتی۔“

”کون لڑکی؟“

”یہی جسے تم... جسے تم... سریتا... سمجھ رہے ہو۔“

”سریتا سمجھ رہے ہو؟ یہ سریتا نہیں ہے؟“

”نہیں ہے... یہ نہیں ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”مم... میں... تم سب کا دوشی ہوں... مم... میں نے جھوٹ بولا۔ میں اپنے اندر اتنی ہمت پیدا نہ کرسکا کہ تمہیں سچ بتاتا۔“

”تمہارا مطلب ہے، یہ تمہاری پتنی سریتا نہیں ہے؟“

”نہیں ہے، مجھے اسی سے پتا چل گیا تھا جب تم لوگوں نے مجھے فون پر اس کی آواز سنائی تھی مگر میں چپ رہا۔ میں سریتا کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔“

عمران بھی اب ہمارے پاس پہنچ چکا تھا اور ہماری باتیں سن رہا تھا۔ اس نے جیب سے سریتا کی وہی تصویر نکالی اور اسے دھیان سے دیکھنے لگا۔ لڑکی سے موازنہ کرنے لگا۔

جواہر کراہا۔ ”تم لوگوں سے دھوکا ہوا ہے۔ جاوا نے دھوکا کیا ہے۔ اس کی شکل سریتا سے ملتی ہے لیکن یہ سریتا نہیں ہے۔“

میرے جسم میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ عمران کی آنکھوں میں بھی حیرت کی یلغار ہوئی۔ مجھے لگا جیسے اردگرد کی ہر شے نگاہوں میں گھوم رہی ہے۔ ہم ایک بات بالکل فراموش کر گئے تھے۔ جاوا ڈان ہی نہیں تھا۔ شوبز سے بھی گہرا تعلق رکھتا تھا۔ وہ بہت سے کام کرتا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ ملتے جلتے چہروں کا بیوپاری بھی تھا۔

تو کیا اس نے اپنی رکھیل معروف نیوز کاسٹر سے ملتا جلتا چہرہ بھی ڈھونڈ رکھا تھا؟

عمران گم صم تھا۔ غلطی انسان سے ہوتی ہے اور عمران بھی انسان تھا۔ ہم سب اسی زمرے میں آتے تھے... کیا واقعی ہم سے غلطی ہوچکی تھی؟

یکا یک پھر فائرنگ شروع ہوگئی۔ اس مرتبہ ہم پر چلنے والی گولیوں کا زاویہ زیادہ خطرناک تھا۔ چند گولیاں عین اس دیوار پر لگیں جس کی اوٹ میں ہم موجود تھے۔ ایک گولی پورب کمار کے کندھے پر لگی اور دوسری گردن میں پیوست ہوگئی۔ وہ پشت کے بل بیڈمنٹن کی کورٹ میں گرا اور ساکت ہوگیا۔ اس کی رائفل دور لڑھک گئی تھی۔

ہم نے پوزیشنیں سنبھال لیں اور فائرنگ کا بھرپور جواب دینے لگے۔ دوسری منزل کی بیشتر کھڑکیاں چکنا چور ہوگئیں۔ ہر طرف شیشے کی کرچیاں بکھر گئیں۔ نصیر کے ایک جواں سال ساتھی کے سینے پر پورا برسٹ لگا اور وہ کھڑکی میں سے تیرہ چودہ فٹ نیچے پختہ فرش پر جاگرا۔

میگافون پر ایک بھاری بھرکم آواز گونجی۔ ”تمہیں چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔ بھاگ نہیں سکتے ہو۔ قانون ہاتھ میں مت لو۔ بہتر ہے کہ ہتھیار پھینک کر باہر آجاؤ۔ یہ بی ایس ایف ہے۔ میں اعلان دہراتا ہوں...“ پُرتحکم آواز نے اعلان دہرایا۔ لب و لہجے سے یہ بارڈر فورس کا اہلکار ہی لگتا تھا۔

صورتِ حال سنگین تر ہوتی جارہی تھی اور اس سنگینی کی وجہ بھی اب ہماری سمجھ میں آرہی تھی۔ جن پتوں پر تکیہ تھا، وہی ہوا دینے لگے تھے۔

کچھ دیر بعد فائرنگ میں وقفہ آگیا۔ یہ وقفہ پھر ایک اناؤنسمنٹ کے لیے تھا۔ اس مرتبہ اناؤنسمنٹ سورت کے کسی ڈی ایس پی کی طرف سے کی گئی۔ اس نے بھی تقریباً وہی الفاظ دہرائے جو اس سے پہلے بی ایس ایف کے کمانڈر نے کہے تھے۔ ان لوگوں کو یقین تھا کہ ہم بہت جلد اپنی جانیں بچانے کا سوچیں گے اور ہتھیار ڈال کر باہر آجائیں گے۔

پورب کمار کی موت کے بعد قربان علی کا پارا ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا۔ اس نے ماسٹر جواہر کا گریبان پکڑ لیا اور اس پر گھونسوں اور لاتوں کی بارش کردی۔ وہ پھنکار رہا تھا۔ ”حرامزادے! ہم تجھے اپنا ہمدرد سمجھ کر لائے تھے لیکن تو

آستین کا سانپ نکلا۔ جاوا سے بڑھ کر دھوکا دیا تُو نے ہمیں۔ کیوں کیا... کیوں کیا ایسا؟"

عمران نے آگے بڑھ کر قربان علی کو بمشکل جواہر سے علیحدہ کیا۔ ماسٹر جواہر کے ناک منہ سے خون رسنے لگا تھا۔ وہ ..... کیچوے کی طرح فرش پر پڑا تھا۔

عمران اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اسے اٹھا کر دیوار کے سہارے بٹھایا۔ اس کے ہونٹوں سے خون پونچھنے کے لیے عمران نے اپنا رومال والا ہاتھ آگے بڑھایا تو جواہر بدک گیا۔ وہ سمجھا کہ شاید عمران بھی اسے مارنے لگا ہے۔

عمران نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ "جواہر! تیری وجہ سے ہم سب پھنس گئے ہیں۔ تُو نے کیوں کیا ایسا؟"

وہ بس ہچکیوں سے روتا چلا جا رہا تھا۔ عمران کے اصرار پر اس نے ٹکڑوں میں جو کچھ بتایا اور جو کچھ ہم نے اخذ کیا، وہ اس طرح تھا۔ جواہر اپنی بیوی اور بچی کو کھو چکا تھا... لیکن اس کے دل میں اب بھی ان کی محبت موجزن تھی۔ سریتا جہاں بھی تھی، وہ اسے زندہ دیکھنا چاہتا تھا۔ عمران اور نصیر... جواہر کو اس لیے لے کر آئے تھے کہ وہ فون پر سریتا کی آواز پہچان کر تصدیق کرے گا کہ جس لڑکی کو ضامن کے طور پر ہماری طرف بھیجا جانے والا ہے، وہ سریتا ہی ہے۔ دوسری طرف جواہر کے دل و دماغ میں کچھ اور چل رہا تھا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ یہاں دو نہایت خطرناک گروہوں کے درمیان خوفناک قسم کے حالات پیدا ہونے والے ہیں۔ وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ سریتا یرغمالی کے طور پر اس معاملے میں شامل ہو۔ اس لیے جب اس نے فون پر سریتا کے بجائے اس لڑکی کی آواز سنی تو فوراً "تصدیق" کر دی کہ یہی سریتا ہے۔ جواہر کو یقین تھا کہ جاوا جیسے شخص سے کچھ بھی بعید نہیں۔ بے شک وہ سریتا کے بجائے کسی اور لڑکی کو ضامن کے طور پر بھیج رہا تھا لیکن اگر اس کی یہ چال ناکام ہو جاتی تو وہ اپنے لالچ کی خاطر اصل سریتا کو بھی داؤ پر لگا سکتا تھا۔ لالچ کا جذبہ جاوا کے دیگر سارے کمزور اور قوی جذبوں پر حاوی تھا۔ یہی سبب تھا کہ جواہر نے فون پر سریتا کے بجائے کسی اور کی آواز سننے کے باوجود یہ کہہ دیا کہ یہ سریتا ہی کی آواز ہے۔ بعد میں شکلوں کی مماثلت نے کام دکھایا۔

پورب کمار کا خون فرش پر بکھرا ہوا تھا۔ ہم نے اس کی لاش اٹھا کر آڑ میں کر دی اور جگت سنگھ نے اپنی چادر اس پر ڈال دی۔ پولیس کی طرف سے ہونے والی اناؤنسمنٹ میں ہمیں پانچ منٹ کا وقت دیا گیا تھا۔ اس وقت کے ختم ہوتے ہی ایک بار پھر تابڑ توڑ فائرنگ شروع ہو گئی۔ ہم نے پانچوں لڑکیوں کو میڈم صفورا سمیت ایک محفوظ کمرے میں پہنچایا اور خود سینہ سپر ہو گئے۔ مخالفین کا پلڑا واضح طور پر بھاری تھا۔ ہماری تعداد بیس کے قریب تھی جبکہ وہ دگنا سے بھی زیادہ تھے۔ پھر ان کو ایمونیشن کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔

ابرار صدیقی ایک چوڑے ستون کی اوٹ میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اسے گاہے بگاہے شدید کھانسی ہونے لگتی تھی۔ وہ کھانستے کھانستے ہی بولا۔ "میں نے تم سے کہا تھا نا، یہ منحوس مورتی ہے۔ یہ خون خرابے کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ یہ ماسٹر جواہر ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ یہ لوگ سب کو مار دیں گے۔"

"تو کیا کریں پھر؟" میں نے چڑ کر کہا۔

جواہر بولا۔ "یہ لوگ جو کہتے ہیں مان لو۔ کم از کم جیون تو بچ جائے گا۔ تمہارے ساتھ نردوش عورتیں ہیں۔ وہ مفت میں ماری جائیں گی۔"

ابرار صدیقی نے کراہتے ہوئے کہا۔ "یہ نہ ہو کہ یہ وقت بھی ہاتھ سے نکل جائے۔ میں سمجھتا ہوں، جواہر ٹھیک کہہ رہا ہے۔"

ابھی ابرار کا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ ایک بار پھر تابڑ توڑ فائرنگ ہونے لگی۔ عمران کے شوٹر بھی بھرپور جواب دینے لگے۔ چند گولیوں نے اس ستون کے پلاستر کو ادھیڑ دیا جس کے عقب میں ابرار صدیقی موجود تھا۔ وہ مزید خوف زدہ ہو گیا۔ مجھے لگا کہ وہ ستون کی محفوظ آڑ چھوڑ کر کسی اور طرف جانا چاہ رہا ہے۔

میں نے چلا کر کہا۔ "نہیں صدیقی صاحب! پیچھے ہی رہو۔"

وہ رک گیا۔

لیکن جب دوسرا برسٹ ستون پر اسی جگہ لگا تو وہ ایک دم ٹوٹ گیا۔ اس نے پچھلے کمرے کی طرف جانا چاہا جہاں لڑکیاں موجود تھیں... کم از کم چار گولیاں اس کی پشت پر کندھوں کے درمیان لگیں اور وہ چت سے پختہ فرش پر گرا۔ اس کے گرنے کا انداز ہی بتا رہا تھا کہ وہ ختم ہو چکا ہے۔ پھر بھی جیلانی نے اس تک پہنچنے کی کوشش کی، وہ اس کے ساکت جسم کو کھینچ کر کسی اوٹ میں لے جانا چاہتا تھا۔ لیکن پھر ایک برسٹ آیا، جیلانی کے بازو میں دو گولیاں لگیں اور وہ تڑپ کر واپس اپنی پوزیشن پر چلا گیا۔ اگلے چند سیکنڈ میں گولیوں کی ایک باڑ نے ابرار صدیقی کو بھون کر رکھ دیا۔ اس کا جسم کئی بار فرش پر سے اچھل کر ساکت ہو گیا۔ نوادرات کے ایک پاکستانی بیوپاری کی روداد کئی موڑ مڑنے کے بعد ایک انجام کو پہنچ گئی تھی۔

ہم پر دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ جاوا کے خطرناک شوٹر اور سرکاری اہلکار گھیرا تنگ کرتے جا رہے ہیں۔ نہ جانے کیوں ان لمحوں میں اچانک میرے پردۂ تصور پر اسی نوجوان ملنگ کا چہرہ ابھر آیا جس سے ہماری ملاقات ہارون آباد کے ہوٹل میں ہوئی تھی۔ اس کا ہونق چہرہ، اس کا چربی دار برہنہ جسم، اس کی چمکیلی آنکھیں... سب کچھ میرے ذہن میں آیا۔ اس کے پُراندیش الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ اس نے کہا تھا۔ "تم مرنے جا رہے ہو... واپس چلے جاؤ تو تمہارے لیے بڑا چنگا ہے۔ یہ لڑکی مصیبت میں ہے۔ تم سب مصیبت میں آ جاؤ گے۔ تمہارے پیچھے کالے پرچھاوے ہیں۔ یہ تم کو مار دیں گے۔ تمہاری قبریں بنیں گی اور پتا نہیں قبریں بھی بنیں گی یا نہیں..." اس نے اسی طرح کی بے سروپا باتیں کی تھیں۔

مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ میرا دل چاہا، میں ثروت کو اپنے بازوؤں میں چھپاؤں اور اپنی جان پر کھیل کر اسے ہر آفت سے دور لے جاؤں۔ اگر مجھے موت بھی آئے تو اس اطمینان کے ساتھ آئے کہ ثروت محفوظ ہے اور اپنوں میں ہے۔

گولیاں مینہ کی طرح برس رہی تھیں۔ عمران اور اس کے ساتھی بھرپور جواب دے رہے تھے۔ زخمی جیلانی سمیت یہ سب کے سب بے حد تربیت یافتہ اور نڈر لوگ تھے۔ اور کیوں نہ ہوتے، عمران جیسا بندہ ان کو کمانڈ کر رہا تھا۔ وہ تو مردوں میں جان ڈال دیتا تھا، یہ تو پھر جوش سے بھرے ہوئے ٹرینڈ شوٹرز تھے۔

دائیں طرف سے وہ لوگ خاصے قریب آ گئے تھے۔ ایک ٹولی ہم سے صرف پندرہ بیس میٹر کی دوری پر تھی۔ ان لوگوں کی چلائی ہوئی گولیوں سے ہی ابرار صدیقی "ہٹ" ہوا تھا۔ اچانک ایک زوردار دھماکا ہوا۔ مختلف اشیا کے پرخچے ہوا میں اڑتے نظر آئے۔

یہ جگت سنگھ نے اپنا "کالا انار" استعمال کیا تھا۔ اب وہ دوسرے کالے انار یعنی دستی بم کی پن کھینچ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے روکوں یا اس کی حوصلہ افزائی کروں۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس نے ایک چنگھاڑ کے ساتھ یہ بم بھی نشیب میں پھینک دیا۔ سماعت شکن دھماکے سے شعلہ لپکا اور ایک انسانی جسم ہوا میں اڑتا ہوا نظر آیا۔ جگت سنگھ جوش سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس نے آٹو میٹک رائفل مضبوطی سے تھامی اور اٹھنا چاہا۔ وہ سارے اندیشے ایک طرف رکھ کر حملہ آوروں کی طرف لپکنا چاہ رہا تھا۔ یہ دلیری نہیں حماقت تھی... دیوانہ پن تھا۔ میں نے جگت کا بازو جکڑ لیا۔ "نہیں جگت! نیچے بیٹھو... نیچے بیٹھو۔" میں دہاڑا۔

ایک گولی آئی اور جگت کے سر کے پاس سے گزر گئی۔ میں نے کھینچ کر جگت کو نیچے بٹھا دیا۔ وہ سینے کی پوری طاقت سے چلا رہا تھا، للکار رہا تھا۔ "مار دوں گا... فنا کر دوں گا... فنا کر دوں گا۔"

اس کا جوش دیدنی تھا۔ پھر اس غیر معمولی جوش کی وجہ بھی میری سمجھ میں آ گئی۔ جگت کے پھینکے ہوئے دوسرے دستی بم کے دھماکے میں، میں نے جس انسانی جسم کو ہوا میں اچھلتے دیکھا تھا، وہ اب ایک لاش کی صورت ہم سے دس بارہ میٹر کی دوری پر پڑا تھا۔ اس لاش کی گردن پر سے کوئی آدھ کلو گوشت غائب تھا۔ انتڑیاں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ میں نے اسے اس کی غیر معمولی چوڑی ناک سے پہچانا۔ یہ پریم چوپڑا تھا۔ یہی شخص تھا جس نے لنگڑی پورہ میں آشا کور کو کمرے میں لے جا کر بے آبرو کیا تھا۔ نشے میں وحشت ہو کر وہ اس کی مجبوری سے کھیلا تھا اور بعد ازاں وہ جاوا کی فائرنگ سے جان کی بازی ہار گئی تھی۔

اب میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ جگت سنگھ نے اچانک اوپر تلے دو دستی بم کیوں پھینک دیے تھے۔ اس نے آشا کی عزت اور جان کے ہتھیارے کو دیکھ لیا تھا۔ اس کے بعد وہ برداشت نہیں کر پایا تھا۔ ابھی تو میں نے اسے پکڑ کر روک لیا تھا ورنہ وہ پتا نہیں مزید کیا کر گزرتا۔

"اچھا کیا جگت سنگھ۔" میں نے رائفل سے نیا میگزین اٹیچ کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن اب ذرا تحمل سے کام لو۔ ممکن ہے کہ کچھ دیر بعد ان دستی بموں کی اور زیادہ ضرورت ہو۔"

میرا فقرہ مکمل ہوا ہی تھا کہ گولیوں کی ایک بوچھاڑ آئی اور ہمیں اپنی پوزیشنوں پر دبکنا پڑا۔ ہمیں اندازہ ہوا کہ فائرنگ کا زاویہ اب بدل گیا ہے اور پہلے کی طرح ہمارے لیے زیادہ خطرناک نہیں رہا۔ اس کی وجہ جگت کے پھینکے ہوئے دو دستی بم ہی تھے۔ ان دو دھماکوں کے بعد آگے بڑھ آنے والے مدمقابلوں کو اب کافی پیچھے ہٹنا پڑ گیا تھا۔ تاہم انہوں نے ہمارے گرد اپنا گھیرا ٹوٹنے نہیں دیا۔ انہوں نے اردگرد کی سب روشنیاں آن کر دی تھیں اور اپنی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس سے بھی مدد لے رہے تھے...

یقیناً دو تین منٹ بعد یہ لوگ نئی صف بندی کے ساتھ پھر زوردار حملہ کرنے والے تھے۔ اپنے قریبی ساتھی کی موت نے یقیناً جاوا کو بھی شعلہ جوالا بنا دیا تھا۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' عمران نے سوالیہ نظروں سے نصیر احمد کی طرف دیکھا۔

''ہم یہاں سے نکل سکتے ہیں جی۔ ہم نکل جائیں گے۔''

''کیسے؟''

''ایک راستہ ہے یہاں۔ یہ پیچھے آپ جو پیالا سا دیکھ رہے ہیں نا، یہ سائیکل ریس کا اسٹیڈیم ہے۔ میں کالج کے زمانے سے جانتا ہوں اس جگہ کو۔ اس اسٹیڈیم میں داخل ہونے کے لیے ''سائیکلسٹ'' ایک سرنگ میں سے گزر کر آتے ہیں۔ یہ سرنگ آج کل ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے اور بند پڑی ہے۔ یہ ہمیں یہاں سے نکلنے کا موقع دے سکتی ہے۔''

''کتنی لمبی ہے؟ میرا مطلب ہے گھیرے سے نکال سکتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ضرور نکال دے گی جی۔ لیکن ایک مسئلہ ہوگا۔ ہماری گاڑیاں تو یہاں احاطے میں ہیں۔''

''کوئی بات نہیں۔ فی الحال یہاں سے نکلنے کا سوچنا چاہیے۔ بس ہو سکے تو کچھ ایمونیشن نکال لو گاڑیوں سے۔'' عمران نے کہا۔

ہم بڑی پلاننگ سے پیچھے ہٹے۔ تین چار رائفل بردار پوزیشن بدل بدل کر زوردار فائرنگ کرتے رہے۔ ہم نیچے آگئے۔ پورب کمار اور ابرار صدیقی کی لاشوں کو وہیں پر چھوڑنا دل و دماغ پر بہت گراں گزرا لیکن اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔ عورتوں کو اپنے درمیان رکھتے ہوئے ہم اسٹیڈیم کی سرنگ کے دہانے پر پہنچ گئے۔ عمران کے ساتھی اپنی گاڑیوں میں سے کچھ ایمونیشن نکالنے میں بھی کامیاب ہو گئے تھے۔

عمران نے موبائل پر جگت سنگھ کو ہدایت دیتے ہوئے کہا۔ ''دو گرینیڈ پھینکو اور پوزیشنیں چھوڑ کر نیچے بھاگ آؤ۔''

''جو حکم سرکار۔'' جگت سنگھ کی آواز ابھری۔

چند ہی سیکنڈ بعد دو کے بجائے تین زوردار دھماکے ہوئے جنہوں نے گھیرا ڈالنے والوں میں کھلبلی سی مچا دی۔ جگت سنگھ نے ایک بم اضافی پھینکا تھا۔ دستی بم تو اس کے ہاتھ میں آکر جیسے خود ہی بلاسٹ کے لیے مچلنے لگتا تھا۔ میں نے اسپورٹ کمپلیکس کی ایک کھڑکی میں سے دیکھا، جاوا گروپ کی ایک جیپ کو آگ لگی ہوئی تھی۔ جگت سنگھ اور باقی شوٹر سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے نیچے آئے اور ہمارے ساتھ اس تاریک زمین دوز راستے میں داخل ہو گئے۔ اس راستے کو ڈھلوان بنایا گیا تھا۔ شاید اس لیے کہ سائیکلسٹ اسٹیڈیم میں داخل ہوتے وقت رفتار پکڑ سکے۔ راستے کی چھت کئی جگہ سے بیٹھ چکی تھی۔ یہاں جھاڑ جھنکاڑ تھا اور آوارہ جانوروں کی غلاظت تھی۔ عمران کے پشتی تھیلے میں سے ایک بڑی ٹارچ نکل آئی تھی۔ ایک ٹارچ قربان علی کے پاس بھی تھی۔ ہم ان کی روشنی میں تیزی سے آگے بڑھتے چلے گئے۔ میڈم صفورا کو عمران نے ایک پستول دے دیا تھا۔ خواتین میں وہ سب سے زیادہ حوصلے میں تھی۔ وہ بار بار ارد گرد دیکھ رہی تھی۔ آخر اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''صدیقی کہاں ہے تابش؟''

میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ وہ جلدی سے بولا۔ ''وہ زخمی ہو گیا ہے میڈم... اسے ہم نے پہلے ہی یہاں سے نکال دیا ہے۔''

''کہاں؟''

''قربان کے بندے لے گئے ہیں۔'' عمران نے بات گول کی۔

میڈم صفورا جہاندیدہ عورت تھی۔ سمجھ گئی کہ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ بہرحال، اس نازک موقع پر اس نے عمران سے یا مجھ سے سوال جواب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ شدید تناؤ کی کیفیت تھی۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ جب ہم اس زمین دوز راستے سے باہر نکلیں گے تو صورتِ حال کیا ہوگی۔ رائفلیں ہمارے ہاتھوں میں بالکل تیار حالت میں موجود تھیں۔ ہمارا واسطہ ممبئی کے ظالم ترین لوگوں سے تھا۔

ہم اس زمین دوز راستے سے باہر نکلے تو قربان علی کی فہم و فراست پر یقین کرنا پڑا۔ ہم گھیرے سے باہر ایک محفوظ جگہ پر تھے۔ غالباً اس زمین دوز راستے والا آپشن قربان علی کے ذہن میں پہلے سے موجود تھا۔ اسی لیے یہاں رکتے وقت اس نے کہا تھا کہ رکنے کے لیے ایک بہت مناسب جگہ اس کے ذہن میں ہے۔

درختوں کے درمیان سے سامنے ایک سڑک کے آثار نظر آرہے تھے۔ قربان علی اور نصیر کی راہنمائی میں ہم اس سڑک کی طرف بڑھے۔ ہمارا ارادہ تھا کہ ہم یہاں سے گزرنے والی ایک دو گاڑیوں کو روکیں گے۔ مگر اس سے پہلے ہی میری نظر ایک بس پر پڑ گئی۔ یہ بس سڑک کے کنارے درختوں میں کھڑی تھی۔ اس اسٹائلش بس پر ایک بینر لگا تھا جس سے پتا چلتا تھا کہ یہ احمد آباد یونیورسٹی کے کچھ لوگوں کو تفریحی دورے پر لے کر سورت آئی ہوئی ہے۔

میں نے عمران کو بتایا۔ ہم نے فوری مشورہ کیا۔ ہم سب درختوں میں دبکے رہے۔ میڈم صفورا اس بس کی طرف گئی۔ اس کی شال کے نیچے پستول موجود تھا۔

اس نے بس کا دروازہ کھٹکھٹایا اور اندر موجود افراد سے کچھ بات کی۔ دروازہ کھلا تو میڈم نے پستول نکال لیا۔ میں اور نصیر احمد بھی جھپٹ کر موقع پر پہنچ گئے۔ بس میں صرف ڈرائیور اور کنڈیکٹر موجود تھے۔ دونوں نیند سے جاگے تھے اور ہکا بکا ہو کر ہمارے آتشیں ہتھیاروں کو دیکھ رہے تھے۔ فربہ اندام ڈرائیور کا تعلق یقیناً ممبئی سے تھا اور لگتا تھا کہ اس نے چرس کا سوٹا وغیرہ بھی لگا رکھا ہے۔ ہم نے سب سے پہلے ان کی تلاشی لی پھر ان کی مشکیں کس دیں۔ اس دوران میں لڑکیوں سمیت سب اندر داخل ہو چکے تھے۔ نصیر احمد نے ڈرائیور سے چابی لے کر بس کا انجن اسٹارٹ کر دیا لیکن لائٹس آن نہیں کیں۔ اسپورٹ کمپلیکس کی طرف تباہ ہونے والی کار کے شعلے نظر آرہے تھے اور فائرنگ کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ لوگ اب اسپورٹس کمپلیکس کے اندر گھس گئے ہیں۔ یہ بڑے نازک لمحے تھے۔ وہ کسی بھی وقت ہماری جانب آسکتے تھے۔ نصیر نے ماہرانہ انداز میں بس کو حرکت دی اور اس کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔

☆☆☆

بس برق رفتاری سے اپنی منزل کی طرف رواں ہو چکی تھی۔ یہ ایک اچھی ''رشین'' بس تھی۔ ایئر کنڈیشنڈ، آرام دہ اور پاورفل۔

اچانک عمران کے فون پر سگنل آئے۔ اسکرین پر جاوا کا ذاتی نمبر چمکا۔ یہ الٹی گنگا بہنا شروع ہوئی تھی۔ پہلے ہم جاوا کو فون کر رہے تھے اور وہ ہمیں گھاس نہیں ڈال رہا تھا۔

عمران نے کال ریسیو کی۔ جاوا بغیر کسی تمہید کے چنگھاڑا۔ ''ہیرو بچے! کہاں ہے تو؟''

''تیرا کیا خیال ہے... مجھے کہاں ہونا چاہیے؟''

وہ دہاڑا۔ ''ایک بات میں تجھے بتا دوں۔ زمین کی ساتویں تہ میں بھی چلے جاؤ گے نا حرامزادو تو وہاں سے بھی کھینچ لوں گا تم سب کو۔ تمہارے لیے بڑا اچھا ہے کہ اپنے ہاتھ سے خود کو گولیاں مار لو۔ ختم کر لو جیون اپنا... ختم کر لو... نہیں تو موت کی بھیک مانگنا پڑے گی اور وہ ملے گی نہیں تمہیں۔'' طیش کی شدت سے اس کی آواز پھٹ گئی۔

عمران نے کہا۔ ''ہم آتما ہتھیا کرنے والے لوگ نہیں ہیں۔ تو اپنی خیر منا جاوا۔ تیرا سورج غروب ہونے والا ہے۔ اگر پیچھے نہیں ہٹے گا تو پریم چوپڑے سے بری موت آئے گی تجھے ممبئی میں۔''

اس کے ساتھ ہی عمران نے فون بند کر دیا۔ وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ جاوا اسے باتوں میں لگائے اور اس طرح ہماری لوکیشن کے بارے میں کوئی اشارہ اسے ملے۔

یہ تو یقینی بات تھی کہ وہ لوگ بوگیر کتوں کی طرح چاروں طرف پھیل گئے ہیں اور ہماری تلاش پوری شدت سے شروع ہو گئی ہے۔ ہمارے حق میں صرف ایک ہی بات جاتی تھی، ہم پہلے والی گاڑیاں چھوڑ چکے تھے... اور جس نئی گاڑی میں ہم تھے، اس کے بارے میں ابھی تک جاوا اور اس کے حواریوں کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ دن چڑھ جاتا تو یقیناً وہ قدموں کے نشان ڈھونڈتے اور اس وقت تک شاید کسی کو یہ پتا بھی چلتا کہ یونیورسٹی کی بس یہاں درختوں میں کھڑی تھی اور اب وہ اپنی جگہ موجود نہیں ہے۔ سورت شہر سے تین بڑی سڑکیں مختلف اطراف میں نکلتی تھیں۔ ابھی تو جاوا وغیرہ کو یہ بھی پتا نہیں تھا کہ ہم کس رخ پر گئے ہیں۔ پندرہ بیس کلومیٹر مزید آگے جا کر ہم نے ایک اور کام کیا اور وہ یہ کہ ڈرائیور اور کنڈیکٹر کو نکالنے کے لیے بس روکی۔ ان دونوں کی مشکیں بڑی اچھی طرح کسی ہوئی تھیں اور منہ میں کپڑے ٹھنسے تھے۔ ہم نے سڑک سے کافی ہٹ کر انہیں درختوں کے ایک جھنڈ میں پھینک دیا۔ قوی امید تھی کہ وہ صبح تک یہاں سے نکل نہیں سکیں گے۔

... سب سے پہلے ہمیں بھڑوچ کے قریب ایک پولیس ناکے پر روکا گیا۔ یہاں نصیر احمد نے گاڑی کے کاغذات دکھائے۔ روٹ پرمٹ وغیرہ چیک کرایا اور بتایا کہ وہ روٹین کے مطابق سواریاں لے کر احمد آباد جا رہا ہے۔ ہمیں آگے جانے دیا گیا۔ تاہم ناکے پر غیر معمولی نفری دیکھ کر ہمیں اندازہ ہو گیا کہ چاروں طرف گھنٹیاں کھڑک چکی ہیں اور پولیس ہائی الرٹ ہے۔

ہم تیز رفتاری سے آگے بڑھتے رہے۔ نصیر احمد کی ڈرائیونگ زبردست تھی۔ ثروت میرے ساتھ بیٹھی تھی۔ وہ بالکل چپ تھی اور اداسی کی تصویر نظر آتی تھی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ وہ کوئی بات کرے لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ جب بھی کچھ کہے گی، نصرت یا پھر یوسف کے بارے میں ہی کہے گی۔ اس کے دل میں جو کچھ بھی تھا، وہ مجھ پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیتی تھی۔ چہرے سے یہی لگتا تھا کہ وہ مجھ سے اور میرے پیار سے لاتعلق ہو چکی ہے۔ اسے کوئی گناہ سمجھنے لگی ہے...

کچھ دیر بعد وہ بولی۔ میرے اندازے کے عین مطابق اس نے نصرت کے بارے میں ہی پوچھا۔

''تابش! نصرت کی طبیعت اب کیسی ہے؟ کچھ پتا چلا آپ کو؟''

''نہیں ثروت! تمہیں آخری فون کب آیا تھا؟''
''آپ کے جانے کے دوسرے دن۔ اس کے بعد ان لوگوں نے ہم سے فون ہی واپس لے لیا۔''
''شاید عمران کو کچھ پتا ہو۔'' میں نے کہا اور اٹھ کر عمران کے پاس آگیا۔
وہ پورب کمار کی موت پر قربان علی کو تسلی دے رہا تھا۔ میں اس کے ساتھ والی نشست پر بیٹھ گیا۔ ''کیا بات ہے تابی؟'' اس نے میرے تاثرات دیکھ کر پوچھا۔
''کیا کیا چھپاؤ گے عمران؟'' میں نے گمبھیر آواز میں کہا۔
''کیوں، کیا ہوا؟''
میں نے قربان علی کی طرف دیکھا۔ وہ میرا اشارہ سمجھ گیا اور اٹھ کر اگلی نشستوں پر چلا گیا۔ میں نے کہا۔ ''عمران! نصرت کے بارے میں کیا اطلاع ہے تمہارے پاس؟''
''وہی جو تمہارے پاس ہے۔''
''بکواس بند کرو۔'' میں نے دانت پیس کر کہا۔ ''بے وقوف بنا رہے ہو۔ تم سمجھتے ہو کہ ساری دنیا کی عقل سمٹ کر تمہارے ہی دماغ میں آگئی ہے... ہر چیز کے ٹھیکیدار بن جاتے ہو تم... تم نے بتایا کیوں نہیں کہ نصرت کی حالت اتنی خراب ہے۔ کہاں ہے وہ؟ پاکستان میں یا آسٹریا میں؟''
اس نے پلکیں جھپکا کر ذرا تعجب سے مجھے دیکھا پھر گہری سانس لی۔ ''مجھے لگتا ہے کہ تم نے نصیر کے کمپیوٹر سے چھیڑ چھاڑ کی ہے یا پھر...''
''کچھ بھی ہے۔'' میں نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ''کہاں ہے نصرت؟''
''ابھی لاہور میں ہی ہے۔ پرسوں اسے آسٹریا شفٹ کیا جائے گا۔''
''تم نے یہ سب کچھ کیوں چھپایا؟''
''تم پہلے ہی ثروت کی وجہ سے بہت پریشان تھے۔ میں تمہیں مزید پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ پھر تم کر بھی کیا سکتے تھے۔ میرے ذہن میں تھا کہ نصرت آسٹریا پہنچ جائے اور اس کی ٹریٹ منٹ شروع ہو جائے تو پھر تم دونوں کو بتاؤں۔''
''دیکھو، اتنی بڑی بات ہو گئی۔ اس کے جگر کی ٹرانسپلانٹیشن تک نوبت آگئی ہے اور تم نے مجھے اور ثروت کو بالکل بے خبر رکھا ہوا ہے؟''
''بے خبر نہیں رکھا ہوا... باخبر کرنے کا وقت ہی نہیں ملا۔ تم دیکھ ہی رہے ہو جب سے رتنا گری کے لیے روانہ ہوئے ہیں، کہیں ایک پل کی فرصت نہیں ملی۔''
''اتنی فرصت بھی نہیں ملی کہ یہ بتا دیتے... اقبال اب ہم میں نہیں ہے۔'' میری آواز بھرا گئی۔
اس نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر سنبھل کر بولا۔ ''ویری سوری تابی!... مجھے پتا ہے... تمہیں بھی اس کا اتنا ہی خیال تھا جتنا مجھے... بس اس کا اور ہمارا ساتھ اتنا ہی تھا۔'' عمران نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ بہت گہری سنجیدگی نے اس کے چہرے کو ڈھانپ لیا۔
مجھے کچھ اور کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ہم دونوں چند سیکنڈ تک بالکل گم صم بیٹھے رہے۔ اندر سے خالی اور ویران۔ آخر میں نے کہا۔ ''ایک طرف دوست بھی کہتے ہو... دوسری طرف اتنی اہم باتیں چھپاتے ہو۔ پتا نہیں کیا مجبوریاں ہیں تمہاری یا پھر مجھے اس قابل ہی نہیں سمجھتے ہو۔''
''نہیں تابی! بس سمجھو کہ ٹائمنگ کی تھوڑی سی گڑبڑ ہوئی ہے۔''
''یہ گڑبڑ تو اب بھی ہو رہی ہے۔ تم اب بھی مجھے اندھیرے میں رکھ رہے ہو۔''
وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔
میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ''تمہاری وہ کون سی بات ہے جس کا پتا جاوا کو چلا ہے... اور جس کے بعد... وہ ہاتھ دھو کر تمہارے بھی پیچھے پڑ گیا ہے... اور جاوا کے ساتھ پولیس اور بی ایس ایف بھی۔ ظاہر ہے کہ وہ کوئی معمولی بات تو نہیں ہوگی؟''
اس سے پہلے کہ عمران جواب میں کچھ کہتا، پولیس موبائل کا ہوٹر سنائی دیا۔ ہم نے مڑ کر دیکھا۔ ریوالونگ لائٹ والی ایک موبائل برق رفتاری سے ہمارے پیچھے آ رہی تھی۔ ہوٹر کا مطلب یہی تھا کہ ہمیں رکنے کے لیے کہا جا رہا تھا۔
''ہاں جی، کیا کرنا ہے؟'' نصیر احمد نے ڈرائیونگ کرتے کرتے عمران سے پوچھا۔
''رکنا پڑے گا۔ ورنہ یہ لوگ مزید بھائی بھائیوں کو بلا لیں گے۔'' عمران نے کہا۔
پولیس موبائل ہمارے پہلو میں آ چکی تھی۔ بائیں طرف بیٹھا ہوا باوردی آفیسر رکنے کا اشارہ دے رہا تھا۔ عمران کے کہنے پر نصیر نے بس کی رفتار آہستہ کر دی اور اسے کنارے کی طرف لے آیا۔ جیلانی نے اپنا زخمی بازو چادر میں چھپا لیا۔ اسلحہ نشستوں کے نیچے اور دیگر محفوظ جگہوں پر چھپا دیا گیا۔ عمران نے اپنے سینے پر اخبار پھیلا لیا اور سائلنسر لگا پسٹل اس کے نیچے رکھ لیا۔ دو مزید نقلیں بھی

پولیس والوں کا استقبال کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھیں لیکن وہ نظر نہیں آ رہی تھیں۔
بس رک گئی۔ نصیر احمد نے نیچے اتر کر پولیس والوں کو کاغذات چیک کرائے... اور ان کے سوالوں کے جواب دیے۔ یہ کل تین اہلکار تھے۔ انسپکٹر ابھی تک موبائل کی اگلی نشست پر براجمان تھا۔ یہ رات کے ڈھائی بجے کا عمل تھا۔ روڈ پر ٹریفک بہت کم تھی، پولیس موبائل کی اندرونی روشنی میں انسپکٹر کے کندھے کے تین پھول دمک رہے تھے۔
پلاننگ کے مطابق نصیر نے پولیس والوں کے سوالوں کے جواب دیے اور انہیں بتایا کہ وہ سورت سے روٹین کی سواریاں لے کر براستہ بھڑوچ، احمد آباد جا رہا ہے۔
سواریوں والا دروازہ کھلوا کر دونوں پولیس والے اندر آ گئے۔ ان کے پیچھے ہی پیچھے فربہ اندام انسپکٹر بھی چلا آیا۔ وہ بس کی تلاشی لینے لگے۔ ان کے حکم پر نصیر نے بس کی اندرونی روشنیاں جلا دیں۔ وہ ایک ایک کا چہرہ دیکھ رہے تھے اور سوال پوچھ رہے تھے۔ انہوں نے جگت سنگھ پر خصوصی توجہ دی۔ ''کہاں سے آئے ہو؟'' انسپکٹر نے کڑے لہجے میں پوچھا۔
''سورت سے۔ میں مزدوری کردا ہوں جی۔ وہاں احمد آباد میں میرا چھوٹا بھرا کرشنا گڈیوں کی مرمت شرمت کرتا ہے۔ اس کے گھر کا کا ہوا ہے۔ ودھائی دینے جا رہا ہوں...''
''شناختی کارڈ؟''
''شناختی کارڈ تو نہیں ہے جی اس ویلے۔ لائسنس ہے۔'' جگت سنگھ نے ایک پھٹا پرانا لائسنس دکھایا۔ یہ ڈرائیونگ لائسنس تھا اور یقیناً جگت کا اپنا نہیں تھا۔ پولیس والا پوری طرح مطمئن تو نہیں ہوا، بہرحال اس نے جامہ تلاشی کے بعد جگت کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
میڈم صفورا سے بھی سوال جواب کیے گئے۔ باقی لڑکیاں اپنے منہ سر لپیٹے بیٹھی تھیں۔ ان کے چہروں کا بہت تھوڑا حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ ایشوریا رائے کی تو بس آنکھیں ہی دکھائی دیتی تھیں۔ تلاشی اور پوچھ گچھ کے بعد پولیس والے گاڑی سے اتر گئے لیکن انسپکٹر اترتے اترتے رک گیا۔ اسے عمران پر کچھ شک ہوا تھا۔ وہ واپس آیا۔ عمران نے اخبار گود میں رکھ کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
''تمہارا شبھ نام؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔
''وجے کمار۔''
انسپکٹر نے مزید کوئی سوال کرنے کے بجائے اپنا موبائل فون نکالا اور ذرا رخ پھیر کر اس میں کچھ دیکھنے لگا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کیمرے کے آپشن میں جا کر فوٹو البم چیک کر رہا ہے۔ شاید اس البم میں عمران کی تصویر موجود تھی۔ چند سیکنڈ بعد انسپکٹر نے پلٹ کر عمران کو دیکھا... تب پھر سے موبائل فون کی اسکرین کو گھورا۔ خطرے کی گھنٹی بج اٹھی تھی۔ میں نے دیکھا، انسپکٹر نے اپنا ہاتھ اپنے ہولسٹر کی طرف بڑھایا ہے...
ایک سیکنڈ بعد سرکاری پستول اس کے ہاتھ میں آنے والا تھا... لیکن یہ سیکنڈ انسپکٹر کے لیے بہت طویل ثابت ہوا۔ اخبار کے نیچے سے عمران کے سائیلنسر لگے پسٹل نے ٹھک سے گولی اگلی اور انسپکٹر اپنے دل کو تھامتا ہوا زخمی جیلانی کے اوپر گرا۔ عمران کی چلائی ہوئی دوسری گولی نے اے ایس آئی کی پیشانی پر موت کی سرخ بندیا لگا دی۔ دوسرا شخص جو رائفل مین تھا اور بالکل نوجوان تھا، بس کے دروازے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس نے پھرتی سے نیچے اترنے کی کوشش کی۔ صفورا نے اس کے راستے میں ٹانگ اڑائی اور وہ اوندھے منہ نشستوں کے درمیانی راستے میں گرا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ عمران نے اس کی طرف پستول سیدھا کیا۔
''بھگوان کے لیے نہیں... مجھے مت مارو۔'' وہ ہکلایا۔
''تم جھوٹے پولیس مقابلوں میں بے گناہوں کو مار دیتے ہو، یہ تو سچا مقابلہ ہے۔'' عمران نے بے رحم لہجے میں کہا اور دو دفعہ ٹریگر دبا کر اس تیسرے اہلکار کو بھی ٹھنڈا کر دیا۔
ثروت قتل و غارت کی اس صورتِ حال پر ششدر تھی۔ اس کا چہرہ نقاب میں تھا لیکن آنکھوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ سرتاپا خوف کے نرغے میں ہے۔ ایشوریا سمیت تینوں لڑکیوں کا حال بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔
''کیا خیال ہے عمران! ان کی لاشیں ان کی گاڑی میں ہی نہ ڈال دی جائیں؟'' میں نے عمران کے کان میں سرگوشی کی۔
''مناسب خیال ہے۔'' وہ بولا۔ اس نے نصیر سے کہا کہ وہ بس چلا کر چالیس پچاس میٹر آگے درختوں میں لے جائے۔
نصیر نے اس ہدایت پر عمل کیا۔ میں بس سے نیچے اترا اور پولیس موبائل کو اسٹارٹ کر کے بس کے قریب لے گیا۔ تاریکی ہماری مدد کر رہی تھی۔ ہم نے تینوں لاشیں بس سے نکال کر پولیس کار میں رکھ دیں۔ ہم نے انہیں نشستوں پر اس طرح بٹھا دیا کہ وہ کار کے اندر ہی آرام کرتے نظر آ رہے تھے۔ عموماً پیٹرولنگ پولیس اسی طرح گاڑی کسی کنارے پر

لگا کر ستا لیا کرتی ہے۔ خاص طور سے انسپکٹر کو دیکھ کر تو یہی لگ رہا تھا کہ اخبار پڑھتے پڑھتے اسے چہرے پر پھیلا کر سو گیا ہے۔

بس آگے روانہ ہوگئی۔ عمران کے ساتھیوں نے بڑی تیزی کے ساتھ بس کے فرش کو خونی آلائشوں سے صاف کر دیا۔ انسپکٹر کا موبائل فون اور سب انسپکٹر کا وائرلیس سیٹ ہم اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ وائرلیس پر مسلسل پیغامات نشر ہو رہے تھے۔ ان پیغامات سے ہمیں کچھ مدد بھی ملی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ احمد آباد کے قریب مین روڈ پر ایک دو سخت ناکے لگے ہوئے ہیں۔ نصیر احمد اور قربان علی نے مشورہ کیا اور فیصلہ ہوا کہ ہم ایک دوسرا راستہ استعمال کریں گے۔ یہ سڑک ذرا طویل تھی لیکن یہاں خطرہ کم تھا۔ اس راستے پر پہنچنے کے بعد ہم نے پولیس والوں کا وائرلیس اور موبائل سیٹ دونوں بند کر دیے۔

میں قریب سے گزرا تو ثروت نے میری کلائی پکڑ کر مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔ ''نصرت کا کچھ پتا چلا؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں، اس کی طبیعت کچھ خراب ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اسے پھر آسٹریا لے جانا پڑے لیکن پریشانی کی کوئی بات نہیں ثروت! عمران بتا رہا ہے کہ وہ کھا پی رہی ہے اور خود چل کر واش روم تک جاتی ہے۔۔۔ اور۔۔۔''

''او گاڈ۔'' ثروت نے اپنا ماتھا پکڑ لیا۔ ''میرا دل کہتا تھا کہ وہ ٹھیک نہیں ہے۔ اگر اسے آسٹریا لے جا رہے ہیں تو پھر۔۔۔ وہ ٹھیک تو نہ ہوئی۔''

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''میں خود پوچھتی ہوں عمران صاحب سے۔''

عمران، قربان علی اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ مشورے میں مصروف تھا۔ میں نے ثروت کو کھینچ کر واپس بٹھا لیا۔ ''پلیز ثروت! ذرا حوصلے سے کام لو۔ ہمیں سب سے پہلے تو خود موت کے اس گھیرے سے نکلنا ہے، تب ہی نصرت یا کسی دوسرے کے لیے کچھ کر پائیں گے۔''

ایک بار پھر پولیس کی موبائل کاروں کے منحوس ہوٹر سنائی دیے۔ ہم سب چونک کر عقب میں دیکھنے لگے۔ نیلے اور سرخ رنگ کی ریوالونگ لائٹس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ دو کاریں ہیں۔

''لگتا ہے، کار میں پولیس والوں کی لاشیں دیکھ لی گئی ہیں۔'' جیلانی نے خیال ظاہر کیا۔

''ہوسکتا ہے اور نہیں بھی۔ بہرحال، اب رکنا مناسب نہیں ہوگا۔ اگر یہ لوگ فائرنگ کر کے ہمیں روکنا چاہیں تو فوراً جوابی فائرنگ کی جائے۔'' عمران نے کہا۔

''اور بڑی کڑاکے کی فائرنگ ہونی چاہیے۔'' جگت سنگھ نے لقمہ دیا۔ ''چھاننی کر دو ان کتوں کی گڈیاں۔''

''جگت ٹھیک کہہ رہا ہے۔ بس کا ٹائر برسٹ ہوگیا تو کچھ بھی ہوسکتا ہے۔'' عمران نے تائید کی۔

لڑکیاں سہم گئی تھیں۔ صرف میڈم صفورا اور ڈاکٹر مہناز کچھ حوصلے میں تھیں۔ عمران نے انہیں ہدایت کی کہ اگر فائرنگ شروع ہو جائے تو وہ نشستوں پر نہ رہیں بلکہ بس کے فرش پر بیٹھ جائیں یا لیٹ جائیں۔ ثروت نے مضبوطی سے میرا بازو پکڑ لیا۔ اس کے ناخن جیسے میرے بازو کے گوشت میں پیوست ہوتے چلے جا رہے تھے۔ میں نے اسے دلاسا دے کر خود سے جدا کیا اور بس کے عقبی حصے کی طرف چلا گیا۔

یہاں عمران کے شوٹر ہر صورتِ حال کے لیے بالکل تیار تھے۔ یہ زبردست پروفیشنل لوگ تھے۔ ان کے چہرے چٹانوں کی طرح سخت نظر آ رہے تھے۔ پولیس کی گاڑیاں شور مچاتی ہوئی بالکل قریب پہنچ گئیں۔ جگت سنگھ فائرنگ کرنے کے لیے بے تاب تھا۔ میں نے اسے روکا۔ غالباً عمران بھی یہی چاہتا تھا کہ فائرنگ میں پہل نہ کی جائے۔ ہم نے تحمل سے کام لیا۔ ہمارا یہ تحمل سودمند رہا۔ گاڑیاں شور مچاتی بس کے پہلو میں پہنچ چکی تھیں۔ ہم نے انگلیاں ٹریگرز پر رکھی ہوئی تھیں اور نگاہیں گاڑیوں پر مرکوز تھیں۔ دفعتاً ہمیں اندازہ ہوا کہ پولیس کی یہ گاڑیاں ہمیں اوورٹیک کر کے آگے جا رہی ہیں۔۔۔ اور ہم سے انہیں کوئی سروکار ہی نہیں ہے۔

اگلے دس پندرہ سیکنڈ میں صورتِ حال مزید واضح ہو گئی۔ پولیس کی گاڑیاں فرانے بھرتی ہوئی ہمارے پاس سے گزر گئیں۔ جگت سنگھ نے بلند آواز میں کہا۔ ''سجن جی! لگتا ہے کہ یہ شکاری کتے تو کسی اور شکار کے پیچھے ہیں۔''

''چلو بچ گئے بے موت مرنے سے۔'' قربان علی نے نفرت سے ہونٹ سکیڑ کر کہا۔

''کبھی کبھی انتظار کرنے میں فائدہ ہوتا ہے۔'' عمران نے کہا۔

گاڑیاں ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکی تھیں۔ میڈم صفورا کی آنکھیں سرخ تھیں۔ وہ بار بار ٹشو سے ان کی نمی صاف کرنے لگتی تھی۔ ابرار صدیقی کی موت کا دکھ تو ہم سب کو ہی تھا لیکن صفورا نے اس دکھ کو زیادہ محسوس کیا تھا۔ ابرار صدیقی سے میڈم کا پرانا تعلق تھا اور وہ اس کا ہم مزاج کاروباری پارٹنر رہا تھا۔ وہ بھانڈیل اسٹیٹ سے چند ماہ پہلے

ہماری ہی طرح بچ کر نکل آیا تھا لیکن مورتی کی نحوست اپنے ساتھ لے آیا تھا اور آج رات یہی منحوست اس کی جان لے گئی تھی۔ ہمیں افسوس تھا کہ ہم ابرار اور پورب کمار کی لاشوں کو اسپورٹس کمپلیکس میں چھوڑ آنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

جیلانی درد سے کراہ رہا تھا۔ مہناز تندہی سے اس کی تیمارداری میں مصروف تھی۔ وہ ایک ہمدرد لڑکی تھی۔ اپنے مریض کو اپنا ذاتی مسئلہ سمجھنے لگتی تھی۔ بابے جلالی کی مثال ہمارے سامنے تھی۔ بابے جلالی جیسے بوڑھے اور غصیلے شخص کے لیے ڈاکٹر مہناز نے بے مثال وفاداری کا مظاہرہ کیا تھا اور اس سے کیا ہوا وعدہ نبھانے کے لیے بہت سی مصیبتیں جھیلی تھیں۔ اب پھر اسے امید تھی کہ وہ اپنے شوہر سہراب جلالی سے مل سکے گی۔ اب دن کا اجالا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ کو مطلع گرد آلود تھا اور جھکڑ سے چل رہے تھے۔ ہم گاندھی نگر کی وسیع آبادی کو بائی پاس کرتے ہوئے شمال مغرب کی طرف بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ ہماری منزل تھرپارکر کا سرحدی علاقہ تھا۔ عمران کا کہنا تھا کہ ہم بارڈر کے ایک خاص پوائنٹ سے بہ آسانی گزر سکتے ہیں اور پاکستانی علاقے میں داخل ہو سکتے ہیں۔ وہ اس سے پہلے بھی اسی طرح کئی مصیبت زدہ پاکستانیوں کو انڈیا کی حدود سے نکال کر حفاظت سے پاکستانی سرزمین تک پہنچا چکا تھا۔ تھرپارکر کا یہ راستہ اس کا اور اس کے ساتھیوں کا دیکھا بھالا تھا۔ عمران نے مجھے وضاحت سے نہیں بتایا تھا لیکن یہاں اس کے کچھ ایسے سورسز موجود تھے جو اس کی مدد کرنے کا تجربہ رکھتے تھے۔ میں نے عمران سے جتنی بار پوچھا، اس نے یہی کہا۔ ''ہم بارڈر کے قریب پہنچ گئے تو پھر یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔'' اس کے لہجے میں ہر بار بلا کا اعتماد نظر آیا تھا۔

سڑک زیادہ اچھی نہیں تھی مگر نصیر احمد نے پھر بھی اسپیڈومیٹر کی سوئی ستر اسی کلومیٹر فی گھنٹا سے نیچے نہیں آنے دی تھی۔ ڈاکٹر مہناز سمیت چاروں لڑکیاں بار بار عمران سے سوال کرتی تھیں کہ بس کب تک پاکستانی علاقے میں پہنچ جائے گی۔ عمران ہر بار بڑی تسلی سے انہیں جواب دیتا تھا اور مطمئن کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ اندرونی طور پر وہ بھی بے حد تناؤ میں ہے۔ جاوا جیسا شیطان ہمارے پیچھے لگا ہوا تھا اور اسے قانون نافذ کرنے والوں کی پوری آشیرباد بھی حاصل تھی۔ یہ طرفہ تماشا تھا۔ انڈیا کا بدنام زمانہ قانون شکن جاوا۔۔۔ قانون کے محافظوں کے کندھے سے کندھا ملا کر ہمارے پیچھے آ رہا تھا۔

ڈاکٹر مہناز اپنے ساتھ کچھ سینڈوچز اور کولڈ ڈرنکس وغیرہ ممبئی سے ہی لے کر آئی تھی۔۔۔ ظاہر ہے ان اشیا کا انتظام نصیر احمد نے ہی کیا ہوگا۔ ابرار صدیقی چونکہ سبزی خور ہو گیا تھا اس لیے اس کے واسطے چکن کے بجائے ویجی ٹیبل رول تھے لیکن یہ رول کھانے کے لیے ابرار ہمارے ساتھ موجود نہیں تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس وقت اس کی لاش کی نمائش ممبئی کے مختلف ٹی وی چینلز پر کی جا رہی ہو۔

اپنا انرجی لیول برقرار رکھنے کے لیے ہم نے تھوڑا تھوڑا کھایا۔ میڈم صفورا اور ڈاکٹر مہناز کے اصرار پر لڑکیوں نے بھی چند نوالے لیے لیکن ثروت کچھ نہیں لے سکی۔ نصرت کی شدید علالت کی خبر نے اسے بالکل نیم جان کر ڈالا تھا۔ میرے ڈانٹنے پر اس نے بس ایک جوس کے چند گھونٹ لیے۔ میں اسے جوس پلانے میں کامیاب ہوا تو عمران نے ثروت کی نظر بچا کر اپنا انگوٹھا کھڑا کیا اور مجھے ویلڈن کا اشارہ دیا۔

ہم سائل پور کے قریب پہنچنے والے تھے جب ہمیں ایک اور ناکے کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ کافی بڑا ناکا تھا اور ایک موڑ مڑنے کے بعد اچانک ہی ہمارے سامنے آ گیا تھا۔ اب ہمارے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ بس کا روٹ پرمٹ ہماری موجودہ لوکیشن کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ اس پرمٹ کے مطابق ہمیں احمد آباد سے آگے نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس ناکے پر باقاعدہ بانس کی رکاوٹ تھی اور اردگرد پولیس اور بی ایس ایف والوں نے پوزیشن لی ہوئی تھی۔ کسی بھی مفرور کا تعاقب کرنے کے لیے ایک چوکس گاڑی بھی موقع پر موجود تھی۔ اس پر لگی ہوئی M16 ٹائپ مشین گن ہمیں صاف دکھائی دے رہی تھی۔

''کیا آرڈر ہے جی! رکنا ہے یا نہیں؟'' نصیر احمد نے پوچھا۔

چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد عمران نے کہا۔ ''روکو۔''

نصیر احمد نے گاڑی روک دی۔ اہلکار عقابی نظروں سے جائزہ لینے لگے۔ کچھ اہلکار ایک دوسری کار کے اندر گھس کر اکھاڑ پچھاڑ کر رہے تھے۔ ایک آفیسر کے اشارے پر نصیر احمد نیچے اترا اور کاغذات چیک کرائے۔ وہی مسئلہ ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ آفیسر نے روٹ پرمٹ طلب کیا۔ ظاہر ہے پرمٹ نہیں تھا۔

عمران کے اشارے پر قربان علی نیچے اترا۔ اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ آفیسر سے بات کی اور اس سے اپنا تعارف مہاراشٹر کی ایک معروف سیاسی شخصیت کے سیکریٹری

کے طور پر کرایا۔ اس نے آفیسر کو کوئی کارڈ بھی دکھایا۔ آفیسر نے کارڈ کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر پوچھا۔ ”کہاں تشریف لے جارہے ہیں؟“

”کھنہ شوگر مل جناب! کھنہ صاحب کو فوری بھرتی چاہیے۔ یہ بندے مل کی ملازمت کے لیے جارہے ہیں۔ آج سہ پہر تین بجے انٹرویوز ہیں جی ان کے۔ ان میں سات ناریاں ہیں، باقی مرد ہیں۔ بس ایمرجنسی سمجھیں جی...“

”اچھا، آپ گوپال کھنہ کی بات کررہے ہیں۔ وہ تو اپنے بھی بڑے اچھے سجن ہیں، ان سے بات کر لیتے ہیں۔ ابھی پرسوں ہی انہوں نے مجھے اپنا سیل نمبر عنایت فرمایا ہے۔“

قربان علی کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اس نے کن انکھیوں سے نصیر کی طرف دیکھا۔ بی ایس ایف کے آفیسر نے جیب سے سیل فون نکال کر کال ملانا شروع کردی۔ اب کسی بھی وقت ہمارا پول کھل سکتا تھا۔

کافی دیر بیل جاتی رہی لیکن کال ریسیو نہیں ہوئی۔ آفیسر نے دوسری دفعہ ٹرائی کی۔ ہمارے سانس سینے میں اٹکے ہوئے تھے۔ یہ دوسری کوشش بھی ناکام رہی۔ ”شاید فون ان کے پاس نہیں ہے۔“ آفیسر نے کہا اور اپنا فون یونیفارم کی چیسٹ پاکٹ میں رکھ لیا۔

ہم نے اطمینان کی سانس لی لیکن اس اطمینان کی عمر زیادہ طویل نہیں تھی۔ اچانک آفیسر کی پاکٹ میں رکھا ہوا موبائل بول اٹھا۔ گوپال کھنہ نامی شخص نے ”کال بیک“ کی تھی۔

”ہیلو کھنہ صاحب! کیا حال ہے... کہاں تھے جناب؟“

جواب میں کچھ کہا گیا جسے سننے کے بعد آفیسر نے کہا۔ ”کچھ مہمان آرہے ہیں جی آپ کے پاس... احمد آباد سے۔“

دوسری طرف سے غالباً حیرت کا اظہار کیا گیا تھا۔ اب مزید تاخیر نقصان دہ ثابت ہوسکتی تھی۔ نصیر احمد پہلے ہی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا تھا۔ قربان علی بھی گھوم کر بس کے اندر آگیا۔ گاڑی ابھی تک اسٹارٹ تھی۔ نصیر نے کلچ چھوڑ کر ایکسلریٹر دبایا اور وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ ٹائر گھومے اور چرچراہٹ کی بلند آواز پیدا ہوئی۔ فون سننے والا آفیسر چلایا۔ ”روکو ان کو روکو۔“

میں نے دیکھا سیکیورٹی فورس کے دو اہلکاروں نے بس کے ٹائروں کی طرف رائفلیں سیدھی کیں۔ میں نے اندھا دھند برسٹ چلایا۔ بس کے شیشے چکنا چور ہوئے اور دونوں اہلکار شدید زخمی ہوکر گرے۔ دوسری طرف عمران نے اس کیپٹن کو نشانہ بنایا جو نصیر پر اپنے سروس پسٹل سے فائر کرنا ہی چاہ رہا تھا۔ گولی عین اس کی پیشانی پر لگی اور وہ اپنے سارے کروفر سمیت اپنی جیپ کے بونٹ سے ٹکراتا ہوا زمین پر گرا۔

”فرش پر لیٹ جاؤ۔“ میں لڑکیوں سے مخاطب ہوکر چلایا اور ثروت کو اپنے ہاتھ سے فرش پر گرادیا۔

ناکے والوں نے بانس نیچے گرادیا تھا اور بڑی پھرتی سے تین چار تارکول سے بھرے ڈرم بھی آگے کردیے تھے۔ نصیر رکنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا اور اس نے اپنا ارادہ پورا کر دکھایا۔ وہ خود تو نیچے جھک گیا مگر اسٹیئرنگ کو سیدھا رکھ کر رفتار بڑھاتا چلا گیا... ہم پر رائفلیں سیدھی ہورہی تھیں۔ میں نے ایک اور برسٹ چلایا اور پھر خود کو اوندھے منہ بس کے فرش پر گرادیا۔

بس رکاوٹوں سے ٹکراتی اور انہیں توڑتی ہوئی نکل گئی۔ درجنوں گولیاں اس کی باڈی میں پیوست ہوئیں۔ کئی کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹے۔ ہم میں سے ایک کے سوا باقی سب فرش پر لیٹ گئے تھے۔ یہ شخص بدستور کھڑا رہا تھا اور اس نے جوابی برسٹ بھی چلائے تھے۔ یہ جگت سنگھ تھا۔ وہ جاوا اور اس کی سات پشتوں کو پنجابی کی چنی ہوئی کلاسیکل گالیاں دے رہا تھا اور یہ بھی بھول گیا تھا کہ اس بس میں ہمارے ساتھ خواتین بھی موجود ہیں۔ اس کا جوش اور غیظ و غضب دیدنی تھا۔

بس میں عجیب سی تھرتھراہٹ جاگ گئی تھی۔ ”یہ کیا ہوا ہے؟“ میں نے نصیر سے پوچھا۔

”لگتا ہے کہ پچھلے ٹائر میں گولی لگ گئی ہے۔“ اس نے بُری خبر سنائی۔

کچھ دیر بعد اندازہ ہوا کہ ٹائروں کے جوڑے میں سے گولی ایک ٹائر میں لگی ہے... دوسرا محفوظ ہے اور گاڑی کو رواں رکھے ہوئے ہے۔ میں التحیات کے انداز میں فرش پر بیٹھا تھا۔ آٹومیٹک رائفل میرے ہاتھ میں تھی۔ ثروت تعجب سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں نمی تھی۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں مجھ سے کہہ رہی تھی... آپ کتنے بدل گئے تابش۔ مجھے اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہوتا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ آپ کے ہاتھوں میں پھولوں، نظموں اور تصویروں کے بجائے رائفل ہوگی اور آپ اپنے ہی جیسے انسانوں پر اندھا دھند گولیاں

چلائیں گے۔

ہمارے پیچھے دو گاڑیاں لگ چکی تھیں۔ وہ تیزی سے درمیانی فاصلہ کم کررہی تھیں۔ ان کا نزدیک آنا ٹھیک نہیں تھا۔ بس کی پچھلی اسکرین ٹوٹ چکی تھی۔ عمران نے تین شوٹرز کو وہاں مقرر کردیا۔ ان میں سے ایک کے پاس اسنیپر گن بھی موجود تھی۔ عمران نے انہیں ہدایت کی۔ ”گاڑیوں کو جتنی دور رکھ سکتے ہو رکھو۔“

شوٹرز نے ان ہدایات پر عمل کیا۔ وہ مسلسل فائرنگ کرنے لگے۔ اسنیپر گن نے کام دکھایا۔ بی ایس ایف کی اگلی جیپ نشانہ بنی۔ ہم نے اسے سڑک سے اترتے اور پھر کسی درخت سے ٹکرا کر آگ پکڑتے دیکھا۔ یہ منظر ہم نے کافی فاصلے سے دیکھا... شاید ایک کلومیٹر دور سے۔ اس دوران میں ہماری بس تک کوئی گولی نہیں پہنچی۔ اندازہ ہوا کہ ان لوگوں کے پاس فی الوقت کوئی دور مار ہتھیار نہیں ہے۔ اگر انہوں نے اکا دکا فائر کیے بھی تھے تو وہ ہمیں نقصان پہنچانے میں بالکل ناکام رہے تھے۔

دفعتاً مجھے اندازہ ہوا کہ نصیر احمد بس ڈرائیو کرتے ہوئے ایک طرف جھکا ہوا ہے۔ میں نشستوں کے درمیان سے گزر کر اس کے پاس پہنچا۔ ”تم ٹھیک تو ہو نصیر؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔ آواز میں تکلیف کا اظہار تھا۔

میں نے آگے جھک کر دیکھا، اس کا دایاں پہلو خون سے لتھڑا ہوا تھا۔ جس وقت اس نے ناکے کی رکاوٹوں کو توڑا تھا، اسے گولی لگ گئی تھی۔ ”عمران۔“ میں نے پکار کر کہا۔

عمران اور ڈاکٹر مہناز دونوں میری طرف لپک آئے۔ ”نصیر زخمی ہے۔“ میں نے اطلاع دی۔

”کوئی بات نہیں سر! میں گاڑی چلا سکتا ہوں۔“ وہ بولا۔

وہ کہہ تو رہا تھا لیکن اس کی حالت ایسی ہرگز نہیں تھی۔ دوسری طرف ہم بس روکنے اور ڈرائیور تبدیل کرنے کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتے تھے۔ ہمارا تعاقب ہورہا تھا اور تعاقب کرنے والے لحہ بہ لحہ قریب پہنچ رہے تھے۔ انہیں دور رکھنے کے لیے عمران کا شوٹر گاہے بگاہے اسنیپر گن سے فائر کررہا تھا۔ مگر ایمونیشن محدود تھا، وہ بہت زیادہ فائر بھی نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے ڈاکٹر مہناز سے کہا۔ ”مہناز! آپ نصیر کے پاس جا بیٹھ جائیں۔ فی الحال اس کا خون روکنے کی کوشش کریں۔ باقی بعد میں دیکھا جائے گا۔“

مہناز اپنا سامان لے کر نصیر احمد کے پاس بیٹھ گئی اور قینچی سے اس کی قمیص کاٹ کر زخم کو دیکھنے لگی۔ گولی نصیر کے پیٹ میں گئی تھی اور وہ شدید تکلیف محسوس کررہا تھا۔ اس کی پیشانی پسینے سے تر تھی۔

”کتنے راؤنڈ رہ گئے ہیں؟“ عمران نے اسنیپر گن والے سے پوچھا۔

”بس آٹھ جی۔“

”ٹھیک ہے، دھیان سے استعمال کرو۔“

یہ اسنیپر بہت فائدہ دے رہی تھی۔ تعاقب کرنے والے ہم سے فاصلہ رکھنے پر مجبور تھے۔ وہ قریب آجاتے تو بہ آسانی بس کے ٹائروں کو نشانہ بناتے۔ ٹائر نشانہ بنتے تو اتنی رفتار سے چلتی بس کو سنبھالنا ناممکن ہوجاتا۔ وہ یقیناً کسی خوفناک حادثے کا شکار ہوتی۔

گرد آلود جھکڑ چل رہے تھے۔ ہمارے اردگرد جوار اور باجرے کے کھیت تھے۔ کہیں کہیں دور کھیتوں میں بھیڑ بکریوں کے ساتھ کوئی اونٹ بھی دکھائی دے جاتا تھا۔ یہ اس بات کی نشانی تھی کہ ہم بتدریج بارڈر کے قریب پہنچ رہے ہیں۔ جگت سنگھ بدستور کھڑا تھا۔ جب سے بس روانہ ہوئی تھی، وہ ایک لمحے کے لیے بھی بیٹھا نہیں تھا۔ سامنے دیکھتے ہوئے وہ ایک دم چلا اٹھا۔ ”بادشاہ زادے! اگے دیکھ کتوں نے رستہ بند کیتا ہویا ہے۔“

میں نے دیکھا، تقریباً 300 فٹ میٹر دور ایک بیل گاڑی اور ایک جیپ کو سڑک کے درمیان لاکر راستہ بلاک کر دیا گیا تھا۔ اردگرد بی ایس ایف والوں کی وردیاں نظر آرہی تھیں۔

”جانے دو۔“ عمران نے کہا۔

عمران نہ بھی کہتا تو نصیر رکنے والا نہیں تھا۔ اس نے رفتار کچھ اور بڑھادی۔ ہم نیچے جھک گئے اور مختلف چیزوں پر اپنی گرفت مضبوط کرلی۔ میں نے ثروت کو اپنی بانہوں میں جکڑا ہوا تھا۔ بس کو زوردار جھٹکا لگا۔ وہ ایک دھماکے کے ساتھ رکاوٹوں سے ٹکرائی۔ ونڈ اسکرین چکنا چور ہوگئی۔ میں نے چارے سے لدی ہوئی بیل گاڑی کو الٹ کر کھیتوں میں گرتے دیکھا... گاڑی پر فائرنگ ہوئی، جواب میں عمران کے شوٹرز نے بھی بھرپور جواب دیا۔ کوشش کے باوجود نصیر گاڑی کو سڑک پر نہ رکھ سکا۔ وہ کچے میں اتر گئی اور بے تحاشا اچھلنے لگی۔ عمران نے نصیر کی مدد کرتے ہوئے بمشکل گاڑی کو دوبارہ سڑک پر چڑھایا۔ نصیر کا زخم ایک دم کھل گیا اور خون تیزی سے بہنے لگا۔ مہناز نے مایوسی سے سر ہلایا۔

''قاسم! تم گاڑی ڈرائیو کرو۔'' عمران نے ایک شوٹر کو ہدایت جاری کی۔
''یس سر۔'' وہ سینہ تان کر بولا۔
گاڑی کو روکے بغیر نصیر کو ڈرائیونگ سیٹ سے ہٹایا گیا اور قاسم نامی نوجوان کو بٹھا دیا گیا۔ آندھی کے جھکڑ اب آزادانہ گاڑی کے اندر گھس رہے تھے۔ بیشتر کھڑکیوں کے علاوہ ونڈ اسکرین بھی تقریباً ناپید تھی۔
ڈاکٹر مہناز کے کہنے پر زخمی نصیر احمد کو نشستوں کے درمیانی راستے پر لٹا دیا گیا۔ اس کے جسم کا خون نچڑتا چلا جا رہا تھا۔ قربان علی نے آنکھوں سے ٹیلی اسکوپ لگا رکھی تھی۔ وہ بولا۔ ''کم از کم چار گاڑیاں پیچھے آ رہی ہیں۔ دو پولیس کی ہیں، دو بی ایس ایف کی۔''
''اسنیپر گن کی وجہ سے وہ دور ہیں۔ اسنیپر کے کتنے راؤنڈ رہ گئے؟'' عمران نے پوچھا۔
''صرف چار جی۔''
''اب ذرا وقفہ دو۔ ہمیں ان گولیوں کی سخت ضرورت ہے۔'' عمران نے کہا۔
''لیکن وہ قریب آتے جائیں گے۔'' گن مین نے کہا۔
''یہ رسک تو لینا ہی پڑے گا۔''
اگلا آدھ گھنٹا کافی اعصاب شکن تھا۔ تعاقب والی گاڑیاں قریب آ جاتی تھیں تو اسنیپر گن سے راؤنڈ چلانا پڑتا تھا۔ ایسے ہی ایک فائر میں بی ایس ایف کی ایک اور جیپ نشانہ بنی اور سڑک سے اتر کر کپاس کے کھیتوں میں گھس گئی۔ سارے راؤنڈ فائر ہو گئے تو تعاقب کرنے والوں کو زیادہ فاصلے پر رکھنا ناممکن ہو گیا۔ گن مین کے حساب سے ایک راؤنڈ باقی تھا لیکن وہ فائر ہو گیا تھا یا پھر کہیں لڑھک کر نشستوں کے نیچے چلا گیا تھا۔ وہ کہیں نہیں ملا۔ اب ہم نے آٹومیٹک رائفلوں سے فائرنگ شروع کی لیکن یہ فائرنگ بھی کفایت شعاری سے ہی کرنا پڑ رہی تھی۔ دوسری طرف سے اندھا دھند گولیاں چل رہی تھیں۔ اچانک مجھے لگا کہ ہماری بس بُری طرح لہرا رہی ہے۔
عمران نے پکار کر کہا۔ ''تابی! قاسم کو دیکھو۔''
میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ڈرائیور قاسم اسٹیئرنگ وہیل پر اوندھا پڑا تھا۔ اس کی پشت پر کندھوں کے درمیان قمیص سرخ ہو چکی تھی۔ میں ڈرائیونگ سیٹ سے زیادہ دور نہیں تھا، میں نے لپک کر اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ میڈم صفورا اور جگت سنگھ میری مدد کو آئے۔ ہم نے بس کو مکمل طور پر روکے بغیر مردہ قاسم کو ڈرائیونگ سیٹ سے ہٹا لیا... اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں ڈرائیونگ سنبھال لوں۔ میں اس خون آلود سیٹ پر بیٹھا اور بس ڈرائیو کرنے لگا۔ اتنی بھاری گاڑی چلانے کا مجھے اس سے پہلے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ مگر جو حالات تھے، ان میں کسی منصوبہ بندی کے بغیر ہی سب کچھ کرنا پڑ رہا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا، ثروت کا چہرہ بالکل ہلدی ہو رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ ڈرائیونگ سیٹ ''خونی سیٹ'' بنی ہوئی ہے۔ پہلے نصیر احمد گولی کا شکار ہو کر یہاں سے اٹھا تھا پھر قاسم کی لاش اٹھائی گئی تھی۔ اب میں یہاں بیٹھا تھا۔
میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا۔ تعاقب کرنے والی گاڑیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ اب وہ کافی نزدیک بھی آ گئے تھے۔ ہم سائل پور کو پیچھے چھوڑ آئے تھے اور اب رخ بارڈر کی طرف تھا۔ پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ مسلسل ہمیں کچوکے لگا رہا تھا۔ بس کے پچھلے حصے میں گولیوں کی ایک بوچھاڑ لگی۔ پہلے دائیں طرف کے ٹائر دھماکے سے پھٹے۔ اس کے بعد سارا بوجھ بائیں جانب کے اکلوتے ٹائر پر پڑا اور وہ بھی برسٹ ہو گیا۔ ثروت سمیت لڑکیاں چلا اٹھیں۔ اب بس کو بری طرح دھچکے لگ رہے تھے۔ میں بس کو اسی طرح دوڑاتا چلا جا رہا تھا مگر رفتار بہت کم ہو چکی تھی۔ اس بدترین صورتِ حال میں مثبت پہلو صرف یہی تھا کہ دونوں عقبی ٹائر برسٹ ہوئے تھے اور بس کے الٹنے کا اندیشہ نہیں تھا۔ بہرحال اس طرح زیادہ دور تک جایا نہیں جا سکتا تھا۔
''اب کیا کرنا ہے؟'' میں نے عمران سے پوچھا۔
''وہ دائیں طرف کچھ نظر آ رہا ہے۔ کیا ہے یہ؟'' عمران نے کہا۔
جیلانی نے ٹیلی اسکوپ میں دیکھا... ''کوئی پرانا ڈاک بنگلہ سا ہے... شاید ریسٹ ہاؤس۔'' جیلانی نے اطلاع دی۔
''ادھر موڑ لو۔'' عمران نے کہا۔
گاڑی کے ٹائر کٹ چکے تھے اور اب وہ لوہے کے رموں پر دوڑ رہی تھی۔ دوڑ بھی کیا رہی تھی، بس اچھل رہی تھی۔ کسی بھی وقت اس کا ٹائی راڈ وغیرہ ٹوٹ سکتا تھا اور اسے فل اسٹاپ لگ سکتا تھا۔ عمران نے سب کو گاڑی کے فرش پر لٹا دیا تھا اور خود بھی لیٹ کر ہی فائرنگ کا جواب دے رہا تھا۔ فقط جگت سنگھ نے یہ ہدایت تسلیم نہیں کی تھی اور بس ایک گھٹنا زمین پر ٹیکنے پر اکتفا کیا تھا۔ اب ہم ریتلی زمین پر تھے۔ راستہ نیم پختہ تھا۔ عقبی گاڑیاں تیزی سے پاس آ رہی تھیں۔ ہم ان کے پہنچنے سے پہلے اس ریسٹ ہاؤس نما عمارت میں

گھس جاتے تو یہ ہماری کامیابی تھی۔ بس کو لگنے والے شدید جھٹکوں کی وجہ سے اسٹیئرنگ سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ ایک گولی آئی اور اسٹیئرنگ کے نچلے حصے کو توڑ گئی۔ کرچیوں نے میرے ہاتھوں کو لہولہان کر دیا۔ میں کسی نہ کسی طرح گاڑی کو اس کھنڈر عمارت تک لے آیا۔ لکڑی کا پھاٹک دھماکے سے توڑتی ہوئی بس احاطے میں گھس گئی۔ یہاں لمبی گھاس تھی اور ویرانیوں کے ڈیرے تھے۔
عمران کی ہدایت پر سب گاڑی میں سے نکل آئے۔ میڈم صفورا لڑکیوں کو لے کر اندرونی کمروں کی طرف لپک گئی۔ سریتا کے نام پر ہمیں جو ڈمی لڑکی ملی تھی، وہ بھی ساتھ تھی۔ ہم نے بس کے پیچھے اور اس کے علاوہ مختلف جگہوں پر پوزیشنیں سنبھال لیں۔ قربان علی زخمی نصیر احمد کو لے کر قریبی کمرے کی طرف چلا گیا۔
عقبی گاڑیاں برق رفتاری سے دھول اڑاتی آئیں اور محفوظ فاصلے پر رک گئیں۔ یہ نصف درجن کے قریب گاڑیاں تھیں۔ کچھ جیپیں اور کچھ کاریں۔ ایک کھلی جیپ پر M16 ٹائپ کی مشین گن صاف دکھائی دے رہی تھی۔
جگت سنگھ کے گلے کی رگیں جوش سے پھولی ہوئی تھیں۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''بادشاہ زادے! اگر تمہارا آرڈر ہو تو میں ان سامنے والی جھاڑیوں میں جا کر اس بڑی گن والی جیپ کا کچومر بنا سکدا ہوں۔''
''کیا مطلب؟''
''کالا اتار پھینکوں گا اس پر۔ پندرہ سوٹوٹے ہو جائیں گے۔''
''نہیں، ابھی نہیں۔ عمران سے مشورے کے بعد۔'' میں نے کہا۔
ادھر اکا دکا فائر آنے شروع ہو گئے تھے۔ عمران کے شوٹر بھی جواب دینے لگے تھے۔ عمران نے انگلی سے اس پھاٹک کی طرف اشارہ کیا جسے ہم نے بس کی ٹکر سے ابھی توڑا تھا۔ پھاٹک کے خستہ حال تختوں کے ساتھ دو بڑی بڑی ہڈیاں بلکہ ہڈ لال ڈوری کے ساتھ جھول رہے تھے۔ نہ جانے کیوں لگا کہ یہ انسانی ہڈیاں ہیں۔
''یہ تو کوئی ٹونا لگتا ہے۔ وہ نیچے کچھ تعویذ وغیرہ بھی بندھے ہیں۔'' میں نے کہا۔ اسی دوران میں اندر سے ایک دم لڑکیوں کے رونے چلانے کی آوازیں آئیں۔ پھر ثروت، ایشوریا اور دیگر لڑکیاں بھرا مار کر باہر نکل آئیں۔ میڈم صفورا بھی ساتھ ہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ پھر اس نے ہمت کی اور کمرے کی طرف رخ کر کے گولی چلائی۔ میں دوڑ کر ان کی طرف گیا۔ میں نے دیکھا۔ ٹوٹے پھوٹے کمرے کے فرش پر ایک بڑے خارپشت کا خونچکاں جسم پڑا تھا۔ ایسے ہی دو تین مزید خارپشت پچھلے کمرے کی باہر والی دہلیز پر نظر آ رہے تھے۔ ایک ''جسیم'' کالا بلا کمرے کے گوشے میں کھڑا خارپشت کی لاش کو دیکھ رہا تھا۔
میڈم نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''یہاں اور بھی جانور ہیں۔ ابھی وہاں برآمدے میں دو بڑے ٹرٹلز (کچھوے) بھی دیکھے ہیں میں نے۔ کئی کیٹس بھی ہیں۔''
کالا بلا یقیناً جنگلی تھا۔ اس کا انداز خطرناک تھا۔ یوں لگتا تھا کہ کسی بھی وقت ہم پر جھپٹ پڑے گا۔ یہ دوطرفہ مصیبت تھی۔ باہر گھیرا ڈال کر فائرنگ شروع کر دی گئی تھی اور اندر یہ کریہہ المنظر جانور تھے۔ اسی دوران میں ایک اور کالے بلے یا بلی نے ایک روشن دان میں سے چھلانگ لگائی اور سیدھا خارپشت کی لاش پر گرا۔ اس بھوکے جنگلی بلے نے خارپشت کی لاش کو گھسیٹنا چاہا مگر ہمارے دھمکانے پر دور ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈالی ہوئی تھیں اور انداز خطرناک تھا۔ بہت جارح ہو رہا تھا وہ۔
شاید میں یا میڈم صفورا اس پر بھی گولی چلا دیتے لیکن عمران لپک کر اندر آ گیا۔ ''نہیں نہیں... ہمارے پاس فالتو گولیاں نہیں۔ میں دیکھ لیتا ہوں ان کو۔ تم لوگ باہر جاؤ... بی ایس ایف والے آگے آنے کی کوشش میں ہیں۔ سب سے پہلے پوزیشن لے لیں۔'' عمران بولا۔ پھر بلاتردد کالے جنگلی بلے کی طرف بڑھا۔ اس نے اسے شکارا تو وہ ایک دم خارپشت کی لاش سے دھیان ہٹا کر باہر نکل گیا۔
''یہ کیا چکر ہے تابش؟'' میڈم صفورا نے پوچھا۔
''مجھے تو لگ رہا ہے کہ کسی جادوٹونے کے سلسلے میں یہاں جان بوجھ کر یہ جانور چھوڑے گئے ہیں۔''
''ہم... میں اندر نہیں جاؤں گی۔'' ثروت نے گھبراتے ہوئے کہا۔
اپنی اس بات کا جواب اسے فوراً ہی مل گیا۔ گولیوں کی ایک باڑ آئی اور لڑکیوں کے سروں پر سے گزر گئی۔ ایشوریا رائے کو دو گولیاں لگیں۔ ایک گردن میں دوسری سینے میں۔ وہ پٹ سے ٹوٹے پھوٹے فرش پر گری اور خون تیزی سے اس کی گردن کو سرخ کرنے لگا۔ ''اندر جاؤ۔'' میں نے چلا کر کہا۔ لڑکیاں میڈم صفورا سمیت ایک تاریک کمرے میں گھس گئیں۔ حسن و نزاکت کا مجسمہ سوئٹی عرف ایشوریا رائے جو ایک فلم اسٹار بننے کے لیے گھر سے نکلی تھی، آج اس سرحدی علاقے کے اس خستہ حال کمرے کے فرش پر شدید زخمی پڑی

تھی۔ اس نے اپنی دلکش آنکھوں سے میری طرف دیکھا، جیسے خاموشی کی زبان میں کہا۔ ''مجھے بچاؤ، میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔ میں واپس جانا چاہتی ہوں۔ اپنے لاہور... اپنے بہن بھائیوں کے درمیان... میں نے اپنے کیے کی کافی سزا پالی ہے...''

میں نے جھک کر اسے گود میں اٹھایا اور قریبی کمرے میں لے جا کر گرد آلود فرش پر لٹا دیا۔ ڈاکٹر مہناز شدید فائرنگ کی پروانہ کرتی ہوئی تیزی سے ایشوریا رائے کی طرف لپکی۔ اس نے قینچی کی مدد سے بلاؤز کاٹ کر اس کا دودھیا سینہ عریاں کر دیا اور گولی کا مہلک زخم دیکھنے لگی۔ زخم دل کے مقام سے تھوڑا ہٹ کر آیا تھا لیکن بے حد کاری نظر آتا تھا۔ مہناز اور میڈم صفورا کو ایشوریا رائے کے پاس چھوڑ کر میں احاطے کی طرف بڑھا۔ یہاں دیواروں سے مردہ بیلیں چمٹی ہوئی تھیں اور اونچی خودرو گھاس ویرانی کا عجب نمونہ پیش کر رہی تھی۔ جس شخص کے جھوٹ کی وجہ سے ہم یہاں بری طرح پھنسے تھے (یعنی ماسٹر جواہر) وہ ایک ستون کی اوٹ میں دبکا ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ دونوں طرف سے زوردار فائرنگ جاری تھی۔ عمران نے پھاٹک کے پاس سب سے خطرناک جگہ پر پوزیشن لی ہوئی تھی اور ٹریل تو چلا رہا تھا۔ میں اس کے کندھے سے کندھا ملا کر بیٹھ گیا۔ اس کے کندھے کے لمس نے میرے سینے میں عجیب سا ولولہ بھر دیا۔ مرنے اور مار دینے کا جوش۔ آخری سانس تک لڑنے اور فتح پانے کا جنون۔ ''پیچھے چلا جا تابی۔'' عمران کرخت لہجے میں بولا۔

''بکواس بند کر۔ یہاں کوئی باس نہیں ہے۔''

''لیکن تابی۔''

''میں جھانپڑ مار دوں گا۔ سامنے دھیان رکھ۔'' اس کے ساتھ ہی میں نے پانچ گولی کا برسٹ چلایا اور ایک بلیے کو بھون کر رکھ دیا۔ وہ ریسٹ ہاؤس کے قریبی درختوں میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہم تاک تاک کر نشانے لگانے لگے۔ ہم سب پر سب سے زیادہ فائرنگ M16 مشین گن سے ہو رہی تھی۔ فی الحال اس کا کوئی توڑ ہمارے پاس نہیں تھا۔

''کیا خیال ہے... جاوا بھی ہے ان لوگوں میں؟'' میں نے عمران سے پوچھا۔ میری نگاہ سامنے تھی۔

''نہیں، ابھی تو وہ نظر نہیں آ رہا۔ لیکن لگتا ہے کہ جلد ہی پہنچ جائے گا۔'' عمران بھی سامنے نگاہ رکھتے ہوئے بولا۔

''بارڈر یہاں سے کتنی دور ہے؟''

''اب بھی پانچ چھ میل سے کم نہیں ہے۔''

''تو کیسے نکل سکیں گے یہاں سے؟ یہ تو سخت سیکیورٹی والا ایریا ہوگا۔''

''امید پر دنیا قائم ہے۔'' عمران نے کہا اور دو سنگل شاٹ چلائے۔ ایک جیپ کی ونڈ اسکرین چور ہو گئی۔ دور فاصلے پر دھول اڑ رہی تھی۔ یہ اس امر کی نشانی تھی کہ کچھ اور لوگ پہنچ رہے ہیں۔

میں نے ارد گرد نگاہ دوڑائی۔ یہ ریسٹ ہاؤس پرانا تو تھا لیکن اتنا زیادہ بھی نہیں۔ پھر پتا نہیں کیوں اسے یوں ویران چھوڑ دیا گیا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ ماضیِ قریب میں شکاری اور سرکاری اہلکار اسے استعمال کرتے رہے ہیں۔ پھاٹک سے جھولتی ہوئی ہڈیاں اور رنگ برنگے تعویذ ایک طرح کی پراسراریت پیدا کر رہے تھے۔

اندر سے لڑکیوں کے رونے کی آواز آئی۔ میں نے جگت سنگھ سے کہا۔ ''دیکھو، اب کیا ہوا ہے انہیں۔''

جگت سنگھ جھک کر بھاگتا ہوا اندر گیا اور کچھ دیر بعد واپس اپنی پوزیشن پر آ بیٹھا۔ ''بتایا نہیں تم نے۔ کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

وہ غمزدہ لہجے میں بولا۔ ''وہ بی بی... جسے ہم ایشوریا رائے کہندے ہیں...''

وہ فقرہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گیا تھا لیکن میں اور عمران سمجھ گئے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ ایشوریا رائے ختم ہو گئی تھی۔ اس کی حالت ہی بتا رہی تھی کہ اس کا بچنا مشکل ہے۔ دل و دماغ میں دکھ کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔

گھیرا ڈالنے والوں کو نئی کمک مل گئی تھی۔ ان کا گھیرا تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ چھوٹے بڑے ہتھیاروں کی گولیاں اب زیادہ خطرناک زاویے سے ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ پتا نہیں کیوں میرا دل چاہا، میں ایک بار ثروت کو جی بھر کر دیکھوں۔ اسے چھوؤں... اور اس سے کہوں۔ ''ثروت! میں نے تمہیں دنیا میں ہر چیز سے زیادہ چاہا ہے... اور چاہتا رہوں گا۔'' میں اِکا دُکا فائر کرتا ہوا پیچھے کی طرف جانے لگا۔ یہی وقت تھا جب میں نے ثروت کو دیکھا۔ وہ کمرے کے بجائے برآمدے میں تھی۔ گولیاں بارش کی طرح برس رہی تھیں... یہ بڑے نازک لمحے تھے۔

خطروں کے دائروں میں سفر کرتے جانبازوں کی داستان کے بقیہ واقعات آیندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

پاداش

میمونہ عزیز

جرم عادت بن جائے تو چلتے چلتے، بنا کچھ سوچے سمجھے بھی دل واردات پر مچل جاتا ہے... جرم کرنا ان کا ذریعۂ معاش تھا... مگر دونوں کو ایک دوسرے سے محبت بھی ٹوٹ کر تھی... پُرسکون زندگی اور سکھ بھرے خاندان کا خواب ان کی زندگی کا محور تھا... مگر اچانک ہی خوابوں کی تعبیریں... تشنگی میں ڈھل گئیں...

دوسروں کے منصوبے پر ہاتھ صاف کرنے والوں کا عبرت ناک انجام

''تجوری میں کتنی رقم تھی... ہنی؟'' انجلا نے پستول صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

''پچاس ہزار۔'' ایلکس نے بتایا۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''یہ سچ ہے۔'' ایلکس نے کہا۔ ''صرف یہی نہیں، یہ دیکھو مجھے تجوری میں سے اور کیا ملا ہے۔'' اس نے کاغذات کا ایک پلندہ سائیڈ پر اچھالتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا ہے؟''

''سکوں کی دکان کو لوٹنے کا منصوبہ۔ اس کے مطابق یہ واردات دو دن بعد عمل پذیر ہوگی۔ جب ہی تو تجوری میں

اتنی ساری رقم موجود تھی۔ غالباً یہ واردات کے اخراجات کے لیے رکھی ہوئی تھی۔'' ایلکس نے بتایا۔
''اوہ مائی گاڈ!'' اینجلا چیخ پڑی۔ ''تم نے یقیناً کسی مجرم گروہ کی رقم پر ہاتھ صاف کیا ہے۔ مجھے اس رقم میں سے اپنا حصہ نہیں چاہیے۔''
''لیکن اپنے حصے کی رقم سے تم اپنے لیے وہ فرکوٹ اور ڈائمنڈ.... بریسلٹ حاصل کرسکتی ہو جن کے لیے بہت عرصے سے بے تاب ہو اور میرے لیے اس کی اہمیت زیادہ ہے۔'' ایلکس نے کہا۔
''ہاں اور جب وہ تمہیں ڈھونڈ نکالیں گے تو تمہارے لیے ان کی گولیاں بھی بے شمار ہوں گی۔''
''بھلا وہ مجھے کیوں کر تلاش کر پائیں گے؟'' ایلکس نے پوچھا۔ ''ہمیں یہاں پر کوئی بھی نہیں جانتا۔ سنو، میں راستے میں کافی پینے کے لیے رکا تھا تو میں نے ان کا منصوبہ پڑھ لیا تھا۔ یہ انتہائی غیر معمولی ذہانت سے تیار کیا گیا ہے۔ منصوبہ ساز سکوں کی ایک ایسی دکان کو لوٹنا چاہتے ہیں جو کہ سونے اور چاندی کے ایسے سکوں اور ڈلوں سے بھری ہوئی ہے جن پر کوئی سلسلے وار نمبر کندہ نہیں ہیں۔ اس لیے میرے ذہن میں ایک نہایت عمدہ آئیڈیا آیا ہے۔''
''وہ کیا؟''
''ہم ان کے منصوبے کو ان سے پہلے استعمال میں لے آتے ہیں اور یہ واردات پہلے ہی سرانجام دے دیتے ہیں۔'' ایلکس نے پُرجوش لہجے میں کہا۔
''رک جاؤ۔'' اینجلا نے کہا۔ ''ہمیں ایک نہایت خطرناک معاملے پر بات کر رہے ہیں۔ تم نے ایک کمپنی کی تجوری سے رقم چرائی ہے۔ غالباً وہ کمپنی اس گروہ کی ہے جس کی آڑ میں وہ اپنی مجرمانہ کارروائیاں سرانجام دیتے ہیں۔ اس کمپنی کی آڑ میں انہیں قانونی تحفظ حاصل ہے اور تم نے نہ صرف ان کے پچاس ہزار ڈالرز اڑا لیے ہیں بلکہ ان کی ایک واردات کا منصوبہ بھی۔ اور یہ بہت بُرا ہوا ہے۔ اب ہوش میں آجاؤ! ہم ایک مجرم گروہ کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔ انہیں جب نقدی اور منصوبے کی چوری کا علم ہوگا تو وہ آگ بگولہ ہو جائیں گے اور بپھر کر ہماری تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے۔ ہمیں ڈھونڈنے کے لیے وہ اس شہر کو الٹ پلٹ کر رکھ دیں گے۔''
''وہ جو کچھ چاہیں کرتے رہیں، ہم اس وقت تک میکسیکو میں ہوں گے اور اپنا ہنی مون منا رہے ہوں گے۔'' یہ کہتے ہوئے ایلکس نے اینجلا کو اپنے قریب کرلیا۔
''میں تم سے بے حد محبت کرتی ہوں، ایلکس۔'' اینجلا نے کہا۔ ''تم جانتے ہو کہ میں تمہاری حفاظت کے بارے میں کتنی فکرمند رہتی ہوں۔ اب میری بات دھیان سے سنو۔ مجھے اس معاملے میں خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ پلیز... میری خاطر... ہم دونوں کے مستقبل کی زندگی کی خاطر... یہ سب چیزیں واپس لے جاؤ اور وہیں رکھ آؤ جہاں سے اٹھا کر لائے ہو۔ ہمارے پاس ابھی اتنا کچھ موجود ہے کہ آئندہ چھ ماہ بہ آسانی کٹ جائیں گے۔''
''کیا تم پاگل ہوگئی ہو؟'' ایلکس نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ ''تم چاہتی ہو کہ میں واپس اس کمپنی میں جاؤں، ان کی تجوری دوبارہ کھول کر نقدی اور پلان واپس وہیں رکھ دوں؟''
''ہاں اور یہ کام تمہیں ابھی کرنا ہوگا۔''
''تم اس معاملے میں میرے ساتھ نرمی کا برتاؤ نہیں کرسکتیں، ہنی؟''
''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' اینجلا نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''ہمیں اس قسم کی دیگر وارداتوں کے لیے اور بہت سے مواقع میسر آجائیں گے لیکن اس معاملے کو بھول جاؤ۔ میں نے جو کچھ کہا ہے اسے ذہن نشین کرلو اور وہی کرو جو میں کہہ رہی ہوں۔''
''کیا یہ تمہاری وجدانی کیفیت کا اثر ہے جو تم اس پر اصرار کر رہی ہو؟'' ایلکس نے کہا۔
''ہاں اور اس میں مجھے سراسر نقصان دکھائی دے رہا ہے۔ تم انہیں واپس لے جاؤ۔ فوراً اور ابھی۔'' اینجلا نے زور دیتے ہوئے کہا۔
ایلکس کو اینجلا کی وجدانی کیفیت کا تجربہ اور اس پر مکمل یقین تھا۔ گزشتہ چند ماہ کے دوران میں اینجلا کی اسی وجدانی کیفیت نے انہیں چند مخمصوں سے نجات دلا کر خطرے سے بچالیا تھا اور اس وقت بھی اینجلا اپنی اسی وجدانی کیفیت کا اظہار کر رہی تھی۔
ایلکس نے کوئی تبصرہ کیے بغیر تمام چیزیں سیاہ رنگ کے ایک بیگ میں ڈال دیں اور اینجلا کا بوسہ لے کر وہاں سے نکل گیا۔
ایلکس کو ایک عمدہ پلان ہاتھ سے نکل جانے کے تصور سے حقیقت میں ہیجان سا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ سونے اور چاندی کے تمام سکے اور ڈلے اور کوئی کیوں

لے جائے؟ فریسنو میں چارلی انہیں بہ آسانی پگھلا کر ہتھیلی کے سائز کی سلاخوں میں ڈھال سکتا ہے۔ پھر انہیں فروخت کرنا آسان ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ ہم اضافی رقم کو اپنی شادی کے اخراجات کے لیے استعمال میں لے آئیں گے جو ہم جلد کرنے والے ہیں۔ میں اینجلا کو وہ خوب صورت جڑاؤ بیلا بھی دلانا چاہتا ہوں جو اس کو بے حد پسند ہے۔
لیکن اینجلا کی وجدانی کیفیت کا کیا کیا جائے؟
اور تب ایک کافی شاپ کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کے مانند کوندا۔

☆☆☆

ایلکس جب موٹیل واپس پہنچا تو اینجلا نیند سے بیدار ہو چکی تھی۔
''دیکھو سویٹی! میں نے ان کے منصوبے کی کاپی کرالی ہے۔ اب ہمارے اور پلان کے درمیان کوئی واسطہ نہیں رہے گا۔ لہٰذا فکر کرنے کی قطعی ضرورت نہیں۔ ہم اس پر آج رات ہی عمل کرلیں گے۔ پھر سیدھا میکسیکو روانہ ہو جائیں گے اور وہاں پہنچ کر شادی رچالیں گے۔'' ایلکس نے کہا۔
یہ تفصیل سن کر اینجلا نے اپنے بازو ایلکس کی گردن میں حمائل کر دیے اور خوشی سے سرشار لہجے میں بولی۔ ''میں اس شخص سے شادی رچانے جا رہی ہوں جو اس پوری دنیا میں انتہائی ذہین ترین عادی مجرم ہے۔''
لیکن اینجلا نے اسے اپنی اس وجدانی کیفیت کے بارے میں مزید کچھ نہیں بتایا جو اب بھی اس کے ذہن پر ہوکے لگا رہی تھی اور خطرے کا پیشگی احساس دلا رہی تھی۔
پھر انہوں نے چند گھنٹے منصوبے کا جائزہ لینے میں صرف کر دیے۔
دوپہر کو وہ دونوں سکوں کی اس دکان کا جائزہ لینے چلے گئے۔ ایلکس نے دکان دار کو چاندی کا ایک یادگاری سکہ خریدنے کے معاملے میں الجھائے رکھا جبکہ اس دوران اینجلا اس دکان میں گھوم پھر کر اس کا جائزہ لیتی رہی۔
''سب کچھ ویسا ہی ہے جیسا کہ پلان کی ڈرائنگ میں دکھایا گیا ہے۔'' دکان سے نکلنے کے بعد اینجلا نے ایلکس سے کہا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے تھے۔ وہ منصوبہ ڈائنامائٹ ہے۔''
''ہم نصف شب کو اس پر اپنی کارروائی کریں گے۔'' ایلکس نے جواب دیا۔

☆☆☆

''اب اٹھ جاؤ اور کھڑے ہو جاؤ... ہنی۔'' اینجلا نے کہا۔ ''ان پیارے سکوں کو حاصل کرنے کا وقت ہوگیا ہے۔''
جب وہ سکوں کی دکان کی طرف جا رہے تھے تو انہیں درجن بھر فائر بریگیڈ کی گاڑیاں دکھائی دیے جو ان کے پاس سے گزر کر تیزی سے آگے کی جانب رواں تھیں۔

''واؤ!'' ایلکس نے کہا۔ ''لگتا ہے کہیں زبردست قسم کی آگ لگی ہے۔''

ابھی وہ سکوں کی دکان سے کئی بلاکس کی دوری پر تھے کہ سڑک پر کھڑی کی گئی رکاوٹوں نے انہیں اپنی کار روکنے پر مجبور کردیا۔

''کیا معاملہ ہے، آفیسر؟'' ایلکس نے وہاں موجود ایک پولیس افسر سے دریافت کیا۔

''پورا بلاک آگ کی لپیٹ میں ہے۔'' پولیس افسر نے بتایا۔

''اوہ گاڈ! میرے انکل کی سکوں کی دکان بھی آگے اس راستے پر ہے۔'' اینجلا نے مصنوعی تشویش کا اظہار کیا۔

''وہ دیگر کئی اسٹورز کے ساتھ جل کر راکھ ہوچکی ہے۔'' پولیس افسر نے بتایا۔

''سن آف اے بچ!'' ایلکس نے منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے گالی دی اور کار واپس موڑلی۔

اب اس کی کار کا رخ انٹر اسٹیٹ کی جانب تھا۔

''ہماری قسمت ہی خراب ہے۔ ہمیں ایک بڑا ہاتھ مارنے کا موقع ملا تھا اور یہ سب کچھ ہوگیا۔ یہ بالکل بھی درست نہیں ہے۔ میرے ہاتھ پچاس ہزار کی رقم لگ گئی تھی لیکن تم نے وہ بھی مجھ سے واپس کرادی۔ اب اپنی اس محنت اور بھاگ دوڑ کے باوجود ہمارے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہے۔'' ایلکس کا لہجہ شکایت آمیز تھا۔

''قسمت!'' اینجلا نے کہا۔ ''ہماری قسمت میں یہی لکھا تھا۔ اب ایسا کرو کہ سیدھا میکسیکو نکل چلو۔ پلیز!''

ایلکس نے کار کا رخ سرحد کی جانب والی سڑک پر موڑ دیا۔

جب ان کی کار سرحد کی جانب رواں دواں تھی تو ایلکس نے کار کا ریڈیو آن کر کے ایک نیوز اسٹیشن ٹیون کر دیا۔

ایک نیوز کاسٹر پولیس چیف کا انٹرویو لے رہا تھا۔

''ہمارا خیال ہے کہ آگ سکوں کے ایک ڈیلر کی دکان سے شروع ہوئی تھی۔'' پولیس چیف کہہ رہا تھا۔ ''مجرم نے وہ بوتل استعمال کی ہے جس میں آگ لگانے والا سیال بھرا ہوتا ہے۔ جب ہی تو آگ اتنی تیزی سے پھیلی ہے۔ اس وقت تک اس آگ سے تین افراد ہلاک ہوچکے ہیں جن میں ایک فائرمین بھی شامل ہے جس کی ایک بیوی اور چار بچے ہیں اور آگ پر ابھی بھی قابو نہیں پایا جاسکا ہے۔''

''سنا تم نے؟'' ایلکس نے کہا۔

''ہاں، ناگہانی اسی کو کہتے ہیں۔'' اینجلا نے جواب دیا۔

''وہ آگے کیا ہے؟''

''روڈ بلاک لگ رہا ہے۔'' اینجلا نے بتایا۔ ''پولیس کی درجنوں کاریں دکھائی دے رہی ہیں۔''

''فکر کی کوئی بات نہیں۔ وہ ہمارے پاس کوئی قابلِ اعتراض شے نہیں پائیں گے۔'' ایلکس نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

ایلکس نے کار رکاوٹوں کے پاس لے جاکر روک دی۔

تب اچانک پولیس والوں نے اپنی پستولیں ان پر تان لیں اور انہیں کار سے نیچے اترنے کا حکم دیا۔

''یہ سب کیا ہے؟'' ایلکس چیخ پڑا۔

''تم زیرِحراست ہو۔''

''کیوں؟''

''تم پر آگ لگانے اور قتل کا ارتکاب کرنے کے الزامات ہیں۔'' ایک پولیس افسر نے اپنا پستول لہراتے ہوئے کہا۔

''تم بہت بڑی غلطی کررہے ہو۔'' ایلکس نے پولیس افسر سے کہا۔ ''میں اس جھوٹی حراست کے خلاف تم پر مقدمہ کردوں گا۔''

''ہمارے پاس اس الزام کے ثبوت میں ایک عینی شاہد موجود ہے۔ اس نے تمہاری کار کی لائسنس پلیٹ کا نمبر نوٹ کرلیا تھا۔ اب تم خاموشی سے ہمارے ساتھ چلو۔''

☆☆☆

گیس چیمبر میں موجود اینجلا سوچ رہی تھی کہ کاش وہ سکوں کی اس دکان میں اس طے شدہ وقت سے ایک گھنٹا پہلے کبھی نہ گئی ہوتی جب انہوں نے اسے لوٹنے کا پروگرام بنایا تھا۔

''میرے پاس اور کوئی چوائس نہیں تھی۔'' وہ سائنائڈ گیس کے دھیرے دھیرے پھیلتے ہوئے بخارات دیکھ کر بڑبڑانے لگی۔ ''میں نے سکوں کی اس دکان کو آگ اس لیے لگائی تھی تاکہ ہم شادی کرسکیں اور ہمارے بچے بھی ہوں۔''

پھر آخری سانس لینے سے قبل وہ چیختے ہوئے بولی۔ ''اگر میں اسے آگ نہ لگاتی تو ہم ڈکیتی کی واردات کے دوران میں ہلاک کردیے جاتے!''

آہستہ آہستہ اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی۔

تلاش

آصف ملک

گزرتے وقت کے واقعات اور حالات میں انسان کو ہمیشہ ناخوشی کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے... حال سے وابستہ ہر شے میں عیب ہی ڈھونڈتا رہتا ہے... اور پھر وقت کے بہتے دھارے آگے نکل جاتے ہیں... جو حال کو ماضی بنادیتے ہیں... ماضی کی پرچھائیوں میں کھوئے ہوئے ایک بچے کی روداد جو گزرے وقت کی کھوج میں سرگرداں تھا...

گم گشتہ آشیاں کی تلاش میں دربدر بھٹکتے ایک معصوم کا قصہ

جیفؔ فادر ملر سے اتنا ہی بیزار تھا جتنا وہ اس سے بیزار تھے۔ جیف ان کے مشن اسکول کے لیے ایک خوفناک خواب کی حیثیت رکھتا تھا۔ تمام ٹیچر اور ساتھی بچے اس سے خوف زدہ رہتے تھے کیونکہ وہ نہ جانے کب کس کے خلاف کون سی شرارت کرجائے اور اسے کیا نقصان ہو، کسی کو اس کا اندازہ نہیں تھا۔ بارہ سالہ جیف جب یہاں آیا تو صرف چار سال کا تھا لیکن اس نے چند مہینوں میں اپنا تاثر بنا لیا تھا جو اب تک برقرار تھا بلکہ اس میں اضافہ ہی ہوا تھا۔ بچوں کے

...... جوتوں تلے خشک صابن لگاتا ہو یا ٹیچر کی کرسی پر سلوشن لگاتا۔ فادر طر کی چھڑی کو اس مہارت سے دو ٹکڑے کر کے جوڑتا ہو کہ بہ ظاہر وہ پہلے جیسی لگے یا پھر کلاس روم کے تالے خراب کرنا۔۔۔ یہ سارے کام وہ اتنی مہارت اور احتیاط سے کرتا تھا کہ براہِ راست مشکل سے ہی پکڑا جاتا تھا لیکن اس کی مہارت ہی اس کے خلاف گواہ بن جاتی تھی۔

اسے ہمیشہ شک کا نقصان ہوتا تھا جیسے مجرموں کو شک کا فائدہ دیا جاتا ہے۔ اس بار بھی جب پینے کے پانی کے فوارے میں کرنٹ پایا گیا اور جو لڑکا پانی پینے کی کوشش کرتا تھا، اسے کرنٹ لگتا تو معاملہ فادر طر تک گیا۔ فوارے کے معائنے کے دوران انہیں بھی کرنٹ لگا۔ اس لیے شک فوری طور پر جیف پر گیا اور اسے طلب کرلیا گیا۔ جیف بارہ برس کا تھا لیکن جسامت سے تیرہ چودہ کا دکھائی دیتا تھا۔ وہ فٹ بال اور بیس بال کا اچھا کھلاڑی تھا۔ یہ اور بات تھی کہ کھیل کے میدان میں بھی اس کی شہرت کھیل سے زیادہ شرارت تھی۔ مگر چہرے پر اتنی معصومیت تھی جیسے اس نے کبھی شرارت کا نام بھی نہ سنا ہو۔ اسے معصوم بننے کی خاص مشق تھی۔ اس وقت بھی وہ معصوم سی صورت بنائے فادر طر کے سامنے کھڑا تھا اور ان کا سرخ چہرہ بتا رہا تھا کہ ان کا بلڈ پریشر خاصا ہائی ہے۔ وہ دل کے مریض تھے۔ اگر انہیں بذاتِ خود کرنٹ نہ لگا ہوتا تو وہ آج جیف کو طلب کرنے سے گریز ہی کرتے کیونکہ اسے دیکھتے ہی ان کا اچھا بھلا نارمل بلڈ پریشر بھی شوٹ کر جاتا تھا۔ اس وقت تو وہ پہلے سے ہائی تھا۔ فادر طر نے کانپتے ہاتھوں سے نائٹروگلیسرین کی گولی زبان تلے رکھی اور چند گہرے سانس لیے۔

"فادر! آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا؟" جیف نے تشویش سے کہا تو فادر طر کو دوبارہ غصہ آگیا کیونکہ جیف اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ بلڈ پریشر کے مریض ہیں اور اس کے باوجود وہ یوں انجان بن کر پوچھ رہا تھا جیسے اسے پتا ہی نہ ہو۔ انہوں نے دانت پر دانت جما کر کہا۔

"جب سے تم اس ادارے میں آئے ہو میری طبیعت خراب ہی ہے۔"

"کیا آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ آپ کے انجائنا کو آٹھ سال ہو چکے ہیں؟" جیف نے معصومانہ انداز میں پوچھا۔

فادر طر نے بہتر سمجھا اس سے پہلے کہ ان کا بلڈ پریشر ہارٹ اٹیک کا باعث بن جائے، وہ اصل موضوع پر آجائیں۔ انہوں نے زبردستی لہجے میں ملائمت لاتے ہوئے کہا۔ "پینے کے پانی کے فوارے میں کرنٹ کیسے شامل ہوا؟"

"پانی میں کرنٹ؟" جیف نے حیرت سے کہا۔ "جناب! مجھے اس سلسلے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔"

فادر طر ذرا آگے جھکے اور پہلے سے زیادہ ملائمت سے بولے۔ "دیکھو جیف! میں اور تم اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ کام تمہارا ہے۔ اگرچہ اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اب یہ بتا دو کہ تم چاہتے کیا ہو؟"

جیف اس بار شاطرانہ انداز میں مسکرایا۔ فادر طر کے اعترافِ شکست سے اسے دلی خوشی محسوس ہوئی تھی۔ اس نے مؤدب آمیز استہزائیہ انداز میں کہا۔ "میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔"

"میں خود بھی یہی چاہتا ہوں۔" فادر طر نے بے ساختہ کہا اور پھر گہری سانس لی۔ "لیکن بدقسمتی سے یہ ممکن نہیں ہے۔ میں چاہوں بھی تو ایسا نہیں کرسکتا۔ تمہیں اٹھارہ سال کا ہونے تک یہاں رہنا ہوگا۔"

جیف نے ان کی بات پر غور کیا اور تجویز پیش کی۔ "ایسا نہیں ہوسکتا کہ میں چپکے سے یہاں سے چلا جاؤں اور آپ پولیس کو اطلاع نہ کریں؟"

"یہ ممکن نہیں ہے، تم جانتے ہو۔" فادر طر بے بسی سے بولے۔ "یہاں موجود ہر بچہ تم سمیت میری ذمے داری ہے۔"

"تب آپ اس شخص کو بلا کر مجھے اس کے حوالے کر دیں جو مجھے یہاں چھوڑ کر گیا تھا۔"

"کاش ایسا ہوسکتا۔" فادر طر نے ایک اور سرد آہ بھری۔ "لیکن وہ شخص تمہیں مشن کے حوالے کر کے ایسا گیا کہ دوبارہ پلٹ کر نہیں آیا۔ اس نے صرف اپنا نام بتایا تھا۔ رک مورفس۔۔۔ میں اس سے زیادہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ بدقسمتی سے میں ان دنوں بیمار تھا اور اسپتال میں داخل تھا۔ میرا نائب شپر جو یہاں کے معاملات دیکھ رہا تھا، اسے کچھ پتا نہیں تھا ورنہ اسے رک مورفس کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنا چاہیے تھیں۔"

شپر آج بھی فادر طر کا نائب تھا اور آج بھی اسے ادارے کے انتظام کے بارے میں کچھ خاص علم نہیں تھا۔ اس سے زیادہ تو جیف جانتا تھا۔ جیف جب یہاں آیا تو وہ چار سال کا تھا لیکن اب اپنے ماضی کے بارے میں اسے کچھ یاد نہیں تھا۔ کچھ دھندلی سی یادیں تھیں جن میں ایک شخص اور ایک عورت کی شبیہ نظر آتی تھی مگر وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اس کے ماں باپ تھے یا نہیں۔ البتہ ایک چیز اسے اچھی طرح یاد تھی کہ اسے اس ادارے سے پہلے دن ہی نفرت ہوگئی تھی۔ وہ اب تک خود پر جبر کر کے یہاں رہ رہا تھا۔ فرار کی راہ میں چند رکاوٹیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ دنیا میں اس کا اور کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ دوسرے وہ فرار ہوتا تو اتنا چھوٹا تھا کہ جلد پولیس کے ہاتھ لگ جاتا اور وہ اسے واپس مشن پہنچا دیتی۔ اس نے پُرامید لہجے میں کہا۔

"آپ کے ریکارڈ میں کچھ تو شامل ہوگا؟"

فادر طر نے نفی میں سر ہلایا۔ "جب میں اسپتال سے واپس آیا تو یہاں تم تھے اور تمہارے چند کپڑے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔"

"ممکن ہے، وہ شخص مجھے کہیں سے اغوا کر کے لایا ہو۔ آپ کو میرے ماں باپ کو تلاش کرنا چاہیے تھا۔" جیف کا لہجہ الزام دینے والا ہوگیا۔

"میں نے پولیس کو تمہارا کیس ریفر کیا تھا لیکن وہ تمام تر کوشش کے باوجود تمہارے لواحقین کا پتا نہیں چلا سکی۔ اخبارات اور ٹی وی پر تمہاری تصویروں کا اشتہار کئی دن چلتا رہا۔ انٹرنیٹ پر بھی کوشش کی گئی مگر کسی نے تمہارے لیے رابطہ نہیں کیا۔" فادر طر کا لہجہ نشتر زدہ ہوگیا۔ "شاید جس نے تمہیں بھیجا تھا، وہ بھی تم سے چھٹکارا چاہتا ہوگا۔ اگرچہ وہ تمہارا باپ ہوگا۔"

جیف کا چہرہ سخت ہوگیا۔ "اگر کسی نے ایسا کیا ہے تو میں اسے تلاش کرلوں گا۔"

"لیکن اس کے لیے تمہیں مزید چھ سال انتظار کرنا پڑے گا۔" فادر طر نے کہا۔ "تم تین دن کے لیے کھیل سے دور ہوگے۔ یہ تمہاری سزا ہے۔"

جیف نے کوئی اثر نہیں لیا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ "اب میں جاؤں؟"

"جاؤ میرے بچے اور ان تین دنوں میں کوئی نئی شرارت مت کرنا ورنہ سزا ڈبل ہوجائے گی۔"

جیف کو مشن کی عمارت سے بھی چڑ تھی۔ یہ اسے کسی جادوگر کا قید خانہ لگتی تھی جس میں اسے قید کر دیا گیا تھا اس لیے جب وہ کھیلنے کے لیے باہر جاتا تو چند گھنٹوں کی یہ آزادی اسے اچھی لگتی تھی۔ فادر طر کو معلوم تھا، اس لیے اسے یہ سزا دی۔ باہر نکل کر اس نے شپر کو تلاش کیا۔ وہ اسے عمارتوں کے درمیان والے باغ میں مل گیا۔ شپر سے اسے دشمنی نہیں تھی کیونکہ وہ سیدھا سا آدمی تھا۔ ایک دو بار جیف نے اس کے ساتھ شرارت کی تو وہ خاموشی سے پی گیا۔ اس کے بعد جیف

نے اسے مزید نہیں چھیڑا۔ اسے شرارت کا اصل مزہ ہی اس وقت آتا تھا جب اسے سزا ملتی۔ شپر اسے دیکھ کر کسی قدر خوف زدہ ہوگیا۔ وہ ایک کارڈ بورڈ پر نارنجی پھولوں کو چسپاں کر رہا تھا۔ یہ بورڈ وہ فادر طر کے کمرے کے لیے تیار کرتا تھا۔

"کیا بات ہے؟"

جیف اس کے پاس بیٹھ گیا۔ "کیا میں تمہاری مدد کروں؟"

"نن۔۔۔ نہیں، میں کرلوں گا۔" شپر نے جلدی سے منع کر دیا۔ "تم کھیلنے کیوں نہیں گئے؟"

"فادر طر نے مجھ پر تین دن کے لیے پابندی لگا دی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ پینے کے پانی کے فوارے میں کرنٹ میں نے چھوڑا ہے۔"

"تو یہ حرکت اور کون کرسکتا ہے؟" شپر بولا۔ اسے بھی یقین تھا۔

"میں نے یہ حرکت نہیں کی ہے۔" جیف نے اسے یقین دلایا۔

"تب کس نے کی ہے؟"

"ممکن ہے، پیچھے سرکٹ میں کوئی خرابی آئی ہو اور اس سے فوارے میں بھی کرنٹ آگیا ہو۔"

"فادر طر نے الیکٹریشن بلوایا ہے، وہ سب پتا چلا لے گا۔"

"اچھی بات ہے۔ اس طرح میری سزا بھی ختم ہو جائے گی۔ ویسے فادر طر تمہاری تعریف کر رہے تھے۔"

یہ دوسری ناقابلِ یقین بات تھی کیونکہ فادر طر غلطی سے بھی کسی کی تعریف نہیں کرتے تھے۔ مگر انسان اپنی تعریف کی بات پر یقین کرلیتا ہے، چاہے وہ کتنی ہی ناقابلِ یقین کیوں نہ ہو۔ شپر نے بھی کرلیا۔ وہ خوش ہو کر بولا۔ "اچھا، کیا کہہ رہے تھے؟"

"یہی کہ تم بہت اچھے نائب ہو اور ہمیشہ ان کی عدم موجودگی میں کام اچھی طرح سنبھالتے ہو۔ جیسے جب میں یہاں آیا، تب بھی تم ان کی جگہ تھے۔"

شپر نے سر ہلایا۔ "فادر ان دنوں اسپتال میں تھے۔"

"تمہیں یاد ہوگا کہ مجھے لانے والا آدمی کیسا تھا؟"

"بالکل یاد ہے۔ وہ جوان آدمی تھا، تیس یا بتیس سال کا ہوگا۔ مضبوط جسم اور نقوش بھی تمہارے جیسے تھے۔"

"تم نے اس کی کوئی شناختی چیز نہیں دیکھی تھی؟"

"نہیں، کام بہت تھا اور میں کچھ بوکھلایا ہوا تھا اس

لیے میرے ذہن سے نکل گیا۔"
"اس نے کوئی خاص بات کی تھی؟"
"خاص بات تو نہیں کی تھی لیکن اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ ایک سال بعد آ کر تمہیں لے جائے گا۔ دوسرے شاید وہ کولمبس سے آیا تھا۔"
"اس نے اپنے بارے میں اور کچھ نہیں بتایا؟"
"نہیں، بس اتنا ہی بتایا تھا۔ وہ مشکل سے دس منٹ یہاں رکا۔ میں کسی کام سے باہر گیا اور واپس آیا تو وہ جا چکا تھا۔"

جیف نے سوچا کہ وہ واقعی اس سے چھٹکارا حاصل کرنے آیا تھا۔ یعنی فادر ملر ٹھیک کہہ رہے تھے۔ لیکن جیف کو شیپر سے کام کی دو باتیں معلوم ہو گئی تھیں۔ ایک یہ کہ وہ کولمبس اوہائیو سے آیا تھا۔ مشن اسکول انڈیانا میں تھا۔ کولمبس یہاں سے دو سو کلومیٹرز کے فاصلے پر تھا۔ اس رات جب سب سو گئے اور میٹرن نے تمام لائٹس اور دروازے بند کر دیے تو جیف خاموشی سے اپنے بستر سے اٹھا۔ اس نے تکیہ اور کمبل اس طرح کر دیا جیسے وہ بدستور بستر میں ہو۔ اس نے اپنا اپر پہنا اور پاؤں میں سلیپر ڈالتے ہوئے خاموشی سے ہال سے باہر آیا۔ رہائشی عمارت سے باہر جانے والا دروازہ لاک تھا اور اس کی چابی میٹرن کے پاس تھی لیکن جیف نے اس کی ڈپلی کیٹ حاصل کی ہوئی تھی۔ اس کے پاس اکثر تالوں کی چابیاں تھیں۔ وہ آرام سے باہر آیا اور گیلری سے ہوتا ہوا فادر ملر کے دفتر پہنچا۔ اس کے تالے کی چابی بھی تھی۔ یہ چابیاں اس نے مختلف اوقات میں اس طرح جمع کی تھیں کہ کسی کو اس پر ذرا بھی شک نہیں ہوا تھا۔ وہ انہیں بڑی حفاظت سے رکھتا تھا۔ اس کام کے لیے اس نے لائبریری میں ایک خفیہ جگہ بنا رکھی تھی جہاں وہ چابیاں اور ایسی دوسری چیزیں رکھتا تھا جن کے رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ جب اسے ضرورت ہوتی، وہ وہاں سے نکال لیتا تھا۔

وہ فادر ملر کے دفتر میں داخل ہوا۔ یہاں ایک طرف لوہے کی بنی ہوئی درازوں میں یہاں موجود بچوں کے بارے میں تمام ریکارڈ تھا۔ اس نے چھوٹی سی ٹارچ روشن کی اور درازیں کھول کر ان میں اپنی فائل تلاش کرنے لگا۔ کام آسان تھا کیونکہ فائلیں الفابیٹ کے لحاظ سے رکھی تھیں۔ اپنی فائل اسے ایم سیکشن میں مل گئی۔ اس نے فائل نکالی اور میز کی آڑ میں بیٹھ کر اسے دیکھنے لگا۔ اسے مایوسی ہوئی کیونکہ فائل میں اس کے ماضی کے بارے میں بس وہی تھا جو شیپر نے بیان کیا تھا۔ البتہ اس کے ماضی قریب اور حالیہ کارناموں کی تفصیل فائل میں موجود تھی۔ فادر ملر نے ریمارکس میں اسے ناقابلِ اصلاح قرار دیا تھا۔ اس نے زیرِ لب فادر ملر اور اسکول والوں کو سنائیں اور فائل واپس رکھ دی۔ اس نے دل میں سوچ لیا تھا۔

"مجھے یہاں سے نکل کر اس رک مورفس کو تلاش کرنا پڑے گا۔"

دو دن بعد وہ رات ہوتے ہی خاموشی سے ہال سے نکلا۔ وہ لائبریری میں آیا جہاں اس کا خفیہ سیف تھا۔ اس سیف میں ایک کام کی چیز وہ رقم تھی جو اس نے گزشتہ چھ سات سال میں جمع کی تھی۔ اس کا کچھ حصہ تو جیب خرچ سے جمع کیا تھا لیکن بڑا حصہ ٹیچرز کی رقم چرا کر جمع کیا تھا۔ اکثر ٹیچرز اپنے پرس بے پروائی سے کلاس میں چھوڑ جاتی تھیں اور وہ موقع پا کر ان میں سے کچھ رقم چرا لیتا تھا۔ یوں اس کے پاس اچھی خاصی رقم جمع ہو گئی تھی۔ اس نے خفیہ خانے سے رقم نکالی۔ اس میں ایک چھوٹا سا پیراشوٹ کا تہ کیا ہوا بیگ بھی تھا۔ اس میں اس نے اپنے کپڑے اور دوسرا سامان رکھا اور اسے پشت پر باندھ کر باہر آیا۔ اس کے پاس مین گیٹ کے تالے کی چابی نہیں تھی لیکن یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ آرام سے اوپر چڑھ کر باہر کود گیا۔ مشن اسکول آبادی سے ہٹ کر اور ہائی وے سے کچھ ہی دور تھا۔ ہائی وے پر آ کر اس نے سڑک کے کنارے اوہائیو کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ وہ احتیاط کے طور پر سڑک سے ذرا دور سفر کر رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ پٹرولنگ پولیس نے اسے دیکھ لیا تو روک لے گی اور جیسے ہی اس کی حقیقت پتا چلے گی، وہ اسے واپس مشن پہنچا دے گی۔

صبح چھ بجے کے قریب وہ بہت دور نکل گیا تھا، جب اسے پہلی بس نظر آئی۔ وہ کولمبس نہیں جا رہی تھی لیکن اسے آگے ایک قصبے میں اتار دیا۔ یہاں اس نے ناشتا کیا اور کولمبس جانے والی بس میں سوار ہو گیا۔ بارہ بجے وہ شہر میں تھا۔ اس نے بس سے اترتے ہی قریبی فون بوتھ کا رخ کیا جہاں اسے فون ڈائریکٹری مل گئی۔ اس میں اس نے مورفس کے نام کا حصہ نکالا اور پھر رک مورفس دیکھا۔ کولمبس میں کوئی ایک درجن رک مورفس تھے۔ اتفاق سے ان سب کے نام ایک ہی صفحے پر تھے۔ اس نے یہ صفحہ پھاڑ کر جیب میں رکھا اور باہر نکل آیا۔ ایک بک شاپ سے اس نے شہر کا تفصیلی نقشہ خریدا اور ایک کیفے میں بیٹھ کر ان درجن مورفس کے پتوں کو دیکھ کر نقشے پر نشان لگانے لگا۔ اس نے طے کیا کہ اسے کس ترتیب سے ان پتوں کو چیک کرنا ہے۔ یہ کام کر کے اس نے لنچ کیا۔ اگرچہ اس کے پاس کوئی ہزار ڈالرز کی رقم تھی لیکن وہ

بہت کفایت شعاری سے خرچ کر رہا تھا۔ لنچ اس نے سستا کیا اور بس پیٹ بھر لیا۔

لنچ کرتے ہی وہ روانہ ہوا۔ نقشے میں بسوں کا روٹ بھی تھا لیکن پہلا پتا نزدیک کا تھا اس لیے وہ پیدل وہاں پہنچ گیا۔ یہ ایک کثیر المنزلہ عمارت کے ساتویں فلور کے اپارٹمنٹ کا پتا تھا۔ لیکن جس رک مورفس نے دروازہ کھولا، وہ ساٹھ سال سے اوپر کا تھا۔ جیف نے تصدیق کی کہ وہی رک مورفس ہے اور جب اس نے اثبات میں سر ہلایا تو جیف مڑ کر چل پڑا۔ بڑے میاں نے عقب سے ایک عدد گالی ارسال کی تو جیف نے مڑ کر اسے زبان چڑائی۔ دوسرا پتا ذرا فاصلے کا تھا اس لیے اس نے بس پکڑ لی اور ڈرائیور سے کہا کہ وہ اجنبی ہے اس لیے اسے مطلوبہ علاقے میں اتار دے۔ ڈرائیور نے دس منٹ بعد اسے اتار دیا اور وہ پیدل چلتا ہوا اس مکان تک پہنچا جس کا پتا تھا۔ مگر یہاں بھی مطلوبہ مورفس نہیں ملا۔ صرف یہی نہیں بلکہ شام تک اس نے دس پتوں پر جا کر دیکھا۔ اس کا مطلوبہ رک مورفس ان میں نہیں تھا۔ دو رک مورفس اسی عمر کے تھے جو شیپر نے بتائی تھی لیکن وہ شکل و صورت میں اس سے بالکل مختلف تھے۔ اب رات ہو گئی تھی اور وہ تھک کر چور ہو گیا تھا۔ اس لیے نظر آنے والے پہلے عام سے ہوٹل میں اس نے ایک کمرا لیا اور بستر پر لیٹتے ہی سو گیا۔ کلرک ایک باتصویر رسالے میں اتنا مگن تھا کہ اس نے جیف کی عمر پر غور کرنے کی زحمت نہیں کی۔ اس سے کرایہ وصول کیا اور چابی تھما کر دوبارہ رسالے میں گم ہو گیا۔

وہ صبح دیر سے اٹھا۔ پوری نیند لینے سے اس کی تھکن اتر گئی تھی اور گرم پانی کے شاور نے اسے تازہ دم کر دیا تھا۔ وہ تیار ہو کر اور بیگ لے کر نیچے آیا اور چابی کاؤنٹر پر دے کر باہر نکل آیا۔ صبح وہاں ایک لڑکی تھی جو حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اب اس کے پاس دو پتے تھے۔ ایک مرکزی شہر کا تھا اور دوسرا نواحی علاقے کا۔ اس نے پہلے مرکزی شہر کا پتا چیک کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے پاس بس آج کا دن تھا۔ اگر وہ ناکام رہتا تو اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ مشن اسکول واپس چلا جائے گا۔ وہ اسے معمول کی سزا دے سکتے تھے، اس سے زیادہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ وہ مطلوبہ علاقے میں پہنچا۔ یہ بلند عمارتوں والی گنجان آباد جگہ تھی۔ تنگ گلیوں میں پھرنے والے لوگ شکل سے ہی اچھے نہیں لگ رہے تھے۔ جیف کو احساس ہوا کہ یہ شاید جرائم پیشہ افراد کا علاقہ ہے۔ یہاں چھوٹی چھوٹی پُرہجوم دکانیں تھیں۔ سڑکوں پر لوگ آ جا رہے تھے۔ اس نے ایک دو افراد سے پتا معلوم کیا لیکن ان کو

معلوم تھا، تب بھی انہوں نے انکار کر دیا۔ بڑی مشکل سے وہ اس گلی میں پہنچا جہاں خاصے سرد موسم میں صورت سے بدمعاش نظر آنے والے افراد بنیانوں میں موجود تھے۔ وہ بیئر پی رہے تھے اور آپس میں فحش مذاق کر رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی وہ چوکنا ہو گئے حالانکہ وہ صورت اور جسامت سے لڑکا ہی لگ رہا تھا۔ ایک نے غرا کر پوچھا۔

''کیا ہے... یہاں کیوں آئے ہو؟''

''مجھے مسٹر رک مورفس سے ملنا ہے۔ ان کا پتا...''

آدمی نے اس سے کاغذ چھین لیا جس پر جیف نے پتا تحریر کیا تھا۔ ''پتا یہی ہے۔ تمہیں مورفس سے کیوں ملنا ہے؟''

''یہ میں اسے ہی بتا سکتا ہوں۔''

ان تینوں نے آنکھوں آنکھوں میں اشارے کیے۔ جیف کو خطرے کا احساس ہوا لیکن وہ یہاں سے جا بھی نہیں سکتا تھا۔ اوّل تو وہ اسے جانے ہی نہیں دیتے۔ اس کا اندازہ جیف کو یوں ہوا کہ انہوں نے اسے گھیر لیا تھا۔ دوسرے اسے رک مورفس سے ملنا تو تھا۔ بالآخر ان میں سے ایک بولا۔

''آؤ میرے ساتھ۔''

وہ اسے ایک عمارت کے ساتھ موجود تنگ سی گلی میں لے گیا۔ گلی کے آخر میں ایک آہنی دروازہ تھا۔ اس نے دستک دی تو اندر سے کسی نے پوچھا۔ ''کون ہے؟''

''کورڈ۔'' جیف کو لانے والے نے جواب دیا۔ ''ایک لڑکا باس سے ملنے آیا ہے۔''

''اسے بھگا دو۔ باس اس وقت کسی سے نہیں مل سکتا۔'' اندر سے کہا گیا۔

''اس سے کہو، یہ ملاقات اس کے لیے ضروری ہے۔'' جیف نے جلدی سے کہا ورنہ کورڈ واپس لے جانے کے لیے اس کا بازو پکڑ چکا تھا۔ ''اگر تم نے مجھے اس سے نہیں ملوایا اور اسے نقصان ہوا تو...''

''ایک منٹ رکو۔'' اندر سے آواز آئی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ پانچ منٹ بعد دروازہ کھلا اور ایک دیوقامت شخص نے جیف کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ کورڈ باہر رک گیا تھا۔ دیوقامت شخص جیف کو بازو سے پکڑ کر ایک کمرے تک لایا اور اس سے کہا۔ ''اگر تمہاری بات غلط نکلی تو تم یہاں سے سیدھا اسپتال جاؤ گے۔''

جیف خوف زدہ ہو گیا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ یہ رک مورفس اتنا خطرناک نکلے گا۔ یہ جگہ مجرموں کا اڈا لگ رہی تھی اور رک مورفس یہاں کا باس تھا۔ دیوقامت اسے اندر لایا جہاں پُرتعیش قسم کے ماحول میں ایک شخص بڑی سی آرام دہ کرسی پر بیٹھا ہوا سامنے چھوٹے سے اسٹیج پر رقص کرنے کے انداز میں اپنی نمائش کرنے والی لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے جسم پر نہ ہونے کے برابر لباس تھا۔ ایسے ہی حلیے میں ایک دوسری لڑکی آدمی کے عقب میں کھڑی اس کی گردن کا مساج کر رہی تھی۔ آدمی نے صرف پتلون پہن رکھی تھی اور اوپری جسم پر جا بہ جا ٹیٹوز بنے ہوئے تھے۔ وہ صورت سے ہی جرائم پیشہ لگ رہا تھا۔ اس نے سر گھما کر پہلے جیف اور پھر سوالیہ نظروں سے دیوقامت شخص کی طرف دیکھا۔ دیوقامت شخص نے شانے اچکائے اور بولا۔ ''کورڈ اسے لایا ہے۔''

جیف اس آدمی سے کچھ دور کھڑا تھا۔ وہ اسے صاف دیکھ سکتا تھا۔ اس بار آدمی نے جیف سے پوچھا۔ ''تم کون ہو اور مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟''

''تم رک مورفس ہو؟'' جیف نے پوچھا۔

آدمی نے سر ہلایا۔ ''میں ہی رک مورفس ہوں۔''

''میں جیف مورفس ہوں۔'' جیف نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

رک مورفس بے ساختہ کھڑا ہو گیا۔ ''جیف مورفس... کیا چاہتے ہو؟''

''یہ چاہتا ہوں۔'' جیف نے تیزی سے اپرے ہاتھ نکالتے ہوئے چاقو رک مورفس کے سینے پر بائیں طرف عین دل والی جگہ مارنا چاہا لیکن وہ بھانپ کر ایک طرف ہوا تو چاقو اس کے پہلو کو کاٹتا ہوا گزر گیا۔ وہ دھاڑ مار کر پیچھے گیا۔ اس سے پہلے کہ جیف دوسرا وار کرتا، دیوقامت شخص نے اسے کھینچ کر اس سے چاقو چھین لیا اور اسے مارنے کے لیے اوپر کیا۔ اپنی کرسی پر گرنے کے بعد رک مورفس نے ہاتھ سے اپنا زخم دبا رکھا تھا اور اس کا ہاتھ خون آلود ہو رہا تھا۔ دیوقامت شخص کو چاقو بلند کرتے دیکھ کر وہ بولا۔

''نہیں۔''

''باس! اس نے تمہیں زخمی کیا ہے۔'' وہ مشتعل تھا۔

''اسے لے جا کر بند کر دو اور جوزف کو بھیجو۔''

دیوقامت شخص اسے دھکیلتا ہوا ایک کوٹھری تک لایا اور اندر دھکا دے کر باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ یہاں کچھ نہیں تھا۔ جیف ایک طرف خالی فرش پر بیٹھ گیا۔ اس کا بیگ ابھی تک اس کے پاس تھا۔ اسے افسوس تھا کہ وہ ناکام رہا۔ جب اسے احساس ہوا کہ رک مورفس نے جو نام سے اس کا رشتے دار لگ رہا تھا، شاید وہ اس کا باپ تھا اور محض اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے اسے مشن اسکول میں چھوڑ دیا تھا، تب

اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اسے تلاش کر کے قتل کر دے گا۔ جب اس کا رک مورفس سے سامنا ہوا تو اسے اس کے خدوخال میں اپنی جھلک نظر آئی۔ وہ خود غرض اور سفاک جرائم پیشہ تھا جسے سوائے اپنے اور کسی سے محبت نہیں تھی۔ اس کی عمر بھی اڑتیس چالیس سال تھی۔ یہ وہی شخص تھا جو جیف کو اس جہنم میں جھونک گیا تھا۔ اس لیے اس نے رک مورفس کو قتل کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ اس کے دل میں خدشہ تھا کہ اس کے بعد یہ بدمعاش بھی اسے نہیں چھوڑیں گے لیکن وہ رک مورفس کو معاف کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس وقت بھی اسے واحد افسوس یہ تھا کہ رک مورفس بچ گیا۔ چاقو اس کے پہلو میں لگا تھا، دل میں نہیں اتر سکا تھا۔

اب وہ فکرمند تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو گا۔ اسے حیرت تھی کہ رک مورفس نے اسے بچایا تھا ورنہ دیوقامت شخص اسے چاقو مارنے والا تھا۔ وہ رات تک اسی کوٹھری میں رہا۔ صبح دروازہ کھلا تو جیف چونک گیا۔ اس نے خوف زدہ نظروں سے دیوقامت شخص کو دیکھا جو دروازے پر کھڑا تھا لیکن اس کے تاثرات نارمل تھے۔ اس نے جیف کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ اٹھ کر باہر آیا تو دیوقامت شخص نے اس کی تلاشی لی اور اس کی پشت سے بیگ اتار لیا۔ اس نے بیگ اپنے قبضے میں کر لیا اور جیف کو بازو سے پکڑ کر اسی کمرے میں لایا جہاں رک مورفس موجود تھا۔ وہ اس وقت بھی اسی صوفہ نما کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے پیٹ اور سینے پر بڑی سے پٹی بندھی تھی مگر اس کی حالت ٹھیک نظر آ رہی تھی۔ رک مورفس کے اشارے پر دیوقامت شخص نے اسے سامنے رکھی کرسی پر بٹھا دیا اور خود اس کے پیچھے چوکس کھڑا ہو گیا۔ رک مورفس غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بیئر کی بوتل تھی۔

''تم مجھے جانتے ہو؟'' اس نے اچانک پوچھا۔

جیف نے سر ہلایا۔ اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا تھا۔ رک مورفس نے دوسرا سوال کیا۔ ''تم نے مجھ پر حملہ کیوں کیا؟''

''تم نے مجھے مشن اسکول میں داخل کرایا تھا۔'' جیف نے صاف گوئی سے کہا۔ رک حیران ہوا پھر اس نے غرا کر کہا۔

''تمہارا دماغ درست ہے؟ میں نے تمہیں کون سے مشن اسکول میں داخل کرایا تھا؟''

''جھوٹ مت بولو، تم نے مجھے انڈیانا کے سینٹ جانز مشن اسکول میں داخل کرایا تھا اور وہاں داخل کرا کے خاموشی سے چلے گئے تھے، اپنا کوئی پتا دیے بغیر۔''

رک مورفس نے دیوقامت شخص کی طرف دیکھا اور کنپٹی کے پاس انگلی گھمائی۔ ''فرض کر لو اگر میں نے تمہیں مشن اسکول میں داخل کرایا تھا تو صرف اس بات پر تم نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی؟''

''ہاں، مجھے اس جگہ سے نفرت ہے۔ وہ جگہ میرے لیے قیدخانہ ہے اور میں نے سوچ لیا تھا کہ مجھے موقع ملا تو میں اس شخص کو ضرور قتل کروں گا جس نے وہاں مجھے داخل کرایا تھا۔''

رک مورفس بیئر کے گھونٹ لیتے ہوئے پُرخیال انداز میں سوچ رہا تھا۔ جیف اسے گھور رہا تھا۔ بالآخر رک مورفس نے کہا۔ ''تم کسی غلط فہمی کا شکار ہو۔ میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا ہے اور میں نے تمہیں یا کسی بھی بچے کو کسی مشن اسکول میں داخل نہیں کرایا۔''

''تم جھوٹ کہہ رہے ہو...''

''بکومت۔'' رک مورفس اس بار بھڑک گیا۔ ''مجھے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آخر تم کس وجہ سے ایسا سمجھ رہے ہو؟''

''کیونکہ تم رک مورفس ہو اور تمہاری صورت مجھ سے ملتی ہے اور تمہاری عمر چالیس کے پاس ہے۔ مجھے وہاں داخل کرانے والا ایسا ہی تھا۔'' جیف کہتے ہوئے مارے جذبات کے کانپنے لگا تھا۔ ''تم وہی ہو اور اب تم کہہ رہے ہو کہ...''

رک مورفس تکلیف کے باوجود ایک جھٹکے سے اٹھ کر اس کے پاس آیا اور اس کے بالکل پاس چہرہ لا کر بولا۔ ''سنو، مجھے اس چیز سے سخت نفرت ہے کہ مجھے جھوٹا سمجھا جائے جبکہ میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ تم نے صرف اس وجہ سے مجھے وہ شخص سمجھ لیا کہ میں رک مورفس ہوں، چالیس سال کا ہوں اور میری صورت تم سے ملتی ہے۔ کیا تم مجھے اپنا باپ سمجھ رہے ہو؟''

''ہاں۔''

''لیکن میں نہیں ہوں۔'' رک مورفس واپس کرسی پر جا بیٹھا۔ ''میرے ساتھی تمہارے ٹکڑے کر دینا چاہتے تھے لیکن مجھے تم پر ترس آ گیا۔ تم بچے ہو اس لیے میں تمہیں معاف کر رہا ہوں لیکن اب تم یہاں سے چلے جاؤ اور دوبارہ دکھائی مت دینا ورنہ اگلی بار تم بچو گے نہیں۔''

جیف بیٹھا رہا۔ دیوقامت شخص نے اسے اٹھانا چاہا تو اس نے اپنا شانہ چھڑایا اور بولا۔ ''اس کا کیا ثبوت ہے کہ تم وہی رک مورفس نہیں ہو؟''

رک اس کی بے خوفی پر حیران ہوا۔ پھر اس نے

بدمزگی سے کہا۔ ”تمہارا دماغ خراب ہے، میں کوئی ثبوت کیوں دوں؟“

”برخوردار! اب اٹھ جاؤ۔“ دیوقامت شخص نے اس کا بازو تھام کر کھڑا کر دیا۔ ”اس سے پہلے کہ باس کا موڈ بدل جائے۔“

دیوقامت شخص اسے کھینچ کر لے جانے لگا تو رک مورفس نے اسے آواز دی۔ ”اسے واپس لاؤ۔“

اس نے جیف کو واپس کرسی پر بٹھا دیا۔ رک مورفس نے اسے حکم دیا۔ ”اس کے لیے کھانے کو کچھ لاؤ۔“

دیوقامت شخص شاید متفق نہیں تھا کہ اسے رک مورفس کے پاس اکیلا چھوڑ کر جائے مگر اس میں باس کے حکم سے سرتابی کی مجال نہیں تھی۔ اس کے جانے کے بعد رک مورفس نے جیف کی طرف دیکھا۔ ”اگر کسی رک مورفس نے تمہیں مشن اسکول میں داخل کرا دیا تو یہ اس کا اتنا بڑا جرم تو نہیں تھا۔“

”جرم ہے۔“ جیف بولا۔ ”وہ میرا باپ یا کوئی قریبی رشتے دار تھا۔ اس نے مجھے وہاں بھیج دیا جس سے مجھے نفرت ہے۔ میں کسی صورت وہاں رہنا نہیں چاہتا۔“

”مشن اسکول والے اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟“

جب تک دیوقامت شخص اس کے لیے ناشتا لے کر آیا، اس نے رک مورفس کو تفصیل سے بتایا کہ وہ کس طرح مشن اسکول پہنچا اور اسے لانے والا اسے کس طرح چھوڑ کر نکل گیا۔ دیوقامت شخص اس کے لیے کسی فاسٹ فوڈ شاپ سے برگر، فنگر فرائی اور کولڈ ڈرنک لایا تھا۔ وہ کھانے میں مصروف ہو گیا۔ رک مورفس سوچ رہا تھا۔ اس نے اپنی کسی قدر بڑھی شیو کھجاتے ہوئے کہا۔ ”میں تو سمجھتا تھا کہ میں سخت دل ہوں لیکن یہ شخص مجھ سے زیادہ سنگ دل ثابت ہوا ہے۔ وہ بالکل اسی سلوک کا مستحق ہے۔“

جیف خوش ہو گیا۔ ”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ رک مورفس نے اس کی تائید کی۔ ”تم فکر مت کرو، میں اس شخص کو تلاش کروں گا۔“

”لیکن اب میرے پاس فہرست کے مطابق ایک ہی شخص باقی رہ گیا ہے۔“ جیف نے کسی قدر مایوسی سے کہا۔ ”اگر وہ بھی مطلوبہ رک مورفس نہ نکلا تو پھر اسے کیسے تلاش کریں گے؟“

”پہلے اسے دیکھ لیتے ہیں، اس کے بعد سوچیں گے کہ کیا کرنا ہے۔“

دیوقامت شخص حیرت سے اپنے باس کو دیکھ رہا تھا جو اس بچے کے لیے اتنا فکرمند ہو گیا تھا جس نے اسے قتل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی مگر وہ چپ رہا۔ جیف نے گزشتہ رات سے کچھ نہیں کھایا تھا اس لیے اس نے سب صاف کر دیا۔ ابھی اس کا پیٹ پوری طرح بھرا نہیں تھا مگر تسلی ہو گئی تھی۔ اس نے کھانا کھا لیا تو رک مورفس نے اس کا بند ہو جانے والا چاقو اس کی طرف اچھالا۔ ”اسے سنبھال کر رکھو، تمہیں شاید اس کی ضرورت پیش آئے گی۔“

”شکریہ مسٹر مورفس۔“ جیف نے چاقو اپنے اپر کی جیب میں رکھ لیا۔

”ایک بات بتاؤ۔“ رک مورفس شاید گفتگو کے موڈ میں تھا اس لیے وہ اس سے بات کر رہا تھا۔ ”مشن اسکول میں کیا بُرائی ہے؟ کیا وہاں بچوں کے ساتھ بُرا سلوک ہوتا ہے؟“

جیف نے سوچا اور نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں، بُرا سلوک نہیں ہوتا بس کسی حرکت پر سزا ملتی ہے۔“

”بچوں کو کھانا اور رہائش ٹھیک نہیں دیتے ہیں؟“

”کھانا اور رہائش بھی ٹھیک ہے۔“ جیف نے اعتراف کیا۔

”بچوں سے کسی اور قسم کا مس بی ہیو کیا جاتا ہے؟“

جیف نے سوچا اور ایک بار پھر نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں، فادر طرا اچھے انسان ہیں۔ وہ ہمارا خیال رکھتے ہیں۔ ٹیچرز میں سے ایک دو ایسے ہیں جو بچوں کو تنگ کرتے ہیں مگر فادر طرا انہیں بھی قابو میں رکھتے ہیں۔“

”تب تم اس جگہ سے نفرت کیوں کرتے ہو؟“

اس سوال نے جیف کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔ ”شاید اس لیے کہ مجھے وہاں میری مرضی کے خلاف بھیجا گیا تھا۔“

”یہ تو اس شخص کا قصور ہوا نا جس نے تمہیں تمہاری مرضی کے خلاف وہاں داخل کرایا۔“

”تبھی میں نے اس شخص کو قتل کرنے کا سوچا ہے۔“

”تم اپنے ارادے پر قائم ہو؟“

جیف کا چہرہ تن گیا۔ ”ہاں، میں اسے کسی صورت معاف نہیں کروں گا۔“

”اچھا فرض کرو کہ ہم اس شخص کو تلاش کر لیتے ہیں اور تم اس سے بدلہ بھی لے لیتے ہو... پھر تم کیا کرو گے؟“

”میں واپس مشن چلا جاؤں گا۔“

”تم مشن نہیں جیل جاؤ گے۔“ رک مورفس نے نفی میں سر ہلایا۔

”وہ کیسے؟“ جیف نے پوچھا۔

”آسان سی بات ہے۔ تم مشن اسکول سے غائب ہو اور پولیس کو تمہارے بارے میں رپورٹ کر دی گئی ہو گی۔ اس کے بعد جب رک مورفس نامی شخص کا قتل ہو گا تو پولیس تم پر شک کرے گی اور اسے ثبوت حاصل کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔“

جیف فکرمند ہو گیا۔ ”یہ تو میں نے سوچا نہیں تھا۔“

رک مورفس نے صورتِ حال کا تجزیہ جاری رکھا۔ ”اگر تم پکڑے گئے اور تمہیں سزا ہوئی تو تم یقیناً پانچ چھ سال کے لیے جیل چلے جاؤ گے۔ اب تم سوچ لو کہ چھ سال جیل میں رہنا مناسب ہے یا مشن اسکول میں۔“

جیف نے اس نقطۂ نظر سے تو سوچا نہیں تھا۔ وہ ایک شخص کو قتل کرنے کا ارادہ لے کر نکلا تھا۔ وہ پکڑا جا سکتا تھا اور اسے سزا ہو سکتی تھی۔ بے شک اسے کم عمر ہونے کی رعایت ملتی لیکن پھر اسے کئی سال جیل میں گزارنے پڑتے۔ اس نے جیل کا سوچا تو اسے جھرجھری آ گئی۔ اس کا دم تو مشن اسکول جیسی جگہ گھٹتا تھا جہاں اسے کسی حد تک آزادی حاصل تھی اور وہاں وہ پڑھتا بھی تھا۔ جیل میں تو اسے ایک کوٹھری میں بند کر دیا جاتا اور وہ زیادہ وقت اسی جگہ رہتا۔ وہ کسی سے بات نہیں کر سکے گا اور نہ آزادی سے گھوم پھر سکے گا۔ اس نے پریشان ہو کر رک مورفس کی طرف دیکھا۔

”یہ تو میں نے سوچا نہیں تھا۔ اب میں کیا کروں؟“

”اس پر سوچتے ہیں۔“ رک مورفس نے کہا۔ ”اب تم آرام کرو۔ یہاں تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔“

”مسٹر مورفس! تم مجھ پر اتنے مہربان کیوں ہو رہے ہو جبکہ میں نے تمہیں قتل کرنے کی کوشش کی ہے؟“

رک مورفس نے ایک بار پھر اپنی داڑھی کھجائی۔ ”پتا نہیں۔ شاید مجھے تم پر ترس آ گیا ہے۔“

جیف ہچکچایا پھر اس نے دوسرا سوال کیا۔ ”مسٹر مورفس! کیا مجھ پر باہر جانے کی پابندی ہے؟“

رک مورفس نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”نہیں، تم آزاد ہو۔ اگر چاہو تو جا بھی سکتے ہو لیکن تمہارے لیے کہیں جگہ حاصل کرنا مشکل ہو گا۔“

”میں باہر جا کر گھوموں پھروں گا اور رات کو واپس یہاں آ جاؤں گا۔“

رک مورفس نے سر ہلایا۔ گویا اسے اعتراض نہیں تھا۔ دیوقامت شخص کی راہنمائی میں جیف ایک کمرے تک پہنچا۔ وہاں اس نے اپنا سامان رکھا اور باہر نکل گیا۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ رک مورفس اور اس کے ساتھی جرائم پیشہ ہیں مگر وہ کیا کرتے تھے، جیف اس کا اندازہ نہیں کر پایا تھا اور یہ اس کا مسئلہ بھی نہیں تھا۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ رک مورفس اس کے ہاتھوں زخمی ہونے کے باوجود اس کی مدد پر آمادہ ہو گیا۔ شاید اس لیے کہ وہ بھی مورفس تھا۔ جیف سارا دن باہر گھومتا رہا اور ساتھ ہی جاننے کی کوشش کرتا رہا کہ اس کا پیچھا تو نہیں کیا جا رہا ہے۔ لیکن اسے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آیا جس پر وہ تعاقب کا شبہ کرتا۔ اس کا مطلب تھا کہ رک مورفس کو اس پر اعتماد تھا اور اسے جیف کا پیچھا کرانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ دوسرے لفظوں میں وہ اس سے سچ کہہ رہا تھا۔

جیف شام کو واپس رک مورفس کے ٹھکانے پر پہنچا تو وہ ڈاکٹر سے پٹی کرا رہا تھا۔ ڈاکٹر نے پرانی پٹی اتار دی تھی۔ اندر زخم پر ٹانکے لگے تھے اور وہ خشک ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے نئی پٹی کی، اسے انجکشن لگایا اور مزید دو دن پانی سے حفاظت کا کہہ کر رخصت ہو گیا۔ جیف کو ندامت ہوئی۔

”آئی ایم سوری مسٹر مورفس۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔ ”میری ایک بات یاد رکھو۔ جو گزر گیا اس پر کبھی شرمندہ مت ہو اور کبھی سوری مت کرو کیونکہ وہ کام تم نے ٹھیک سمجھ کر کیا ہو گا۔“

”تم نے میرے بارے میں کیا سوچا؟“

”تم دو دن رک جاؤ، میں ٹھیک ہو جاؤں پھر ہم مل کر رک مورفس کو تلاش کریں گے۔“

”تھینک یو مسٹر مورفس۔“ جیف نے خوش ہو کر کہا۔

لیکن اگلے دن وہ صبح رک مورفس کے ٹھکانے سے نکلا تو اسے خیال آیا کہ وہ ایک بار اس آخری رک مورفس کو جا کر دیکھے... ضروری نہیں تھا کہ وہ اسے قتل کرنے کی کوشش کرتا۔ ویسے بھی رک مورفس کو چاقو مارنے کے بعد اس حوالے سے اس کا ابال کم ہو گیا تھا۔ پتے والا کاغذ دیوقامت شخص نے اس سے لے لیا تھا اور پھر واپس نہیں کیا تھا لیکن یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ایک فون بوتھ میں ڈائریکٹری سے اس نے دوبارہ وہ صفحہ نکال لیا جس پر تمام رک مورفس کے پتے درج تھے۔ اس نے اسی فون بوتھ سے رک مورفس کے نمبر پر کال کی۔ کال خود اس نے ریسیو کی تھی۔ جیف کے پوچھنے پر اس نے تصدیق کی۔ ”بات کر رہا ہوں۔“

یہ تصدیق ہو جانے کے بعد کہ وہی رک مورفس ہے اور اپنے گھر میں ہے، اس نے کال منقطع کر دی اور روانہ ہو گیا۔ پتا ایک پوش علاقے کا تھا جہاں درمیانے سائز کے مکانات

ایک دوسرے سے ذرا فاصلے پر بنے ہوئے تھے۔ تمام مکانوں کے درمیان خالی جگہ تھی جس پر لوگوں نے درخت اور پودے لگا رکھے تھے۔ بعض نے خالی لان بنائے تھے۔ لیکن رک مورفس کے مکان کے چاروں طرف بہت بڑے بڑے بے ہنگم پیپل کے درخت تھے اور ان کے ساتھ جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ مکان کی حالت سے لگتا تھا کہ اس کی دیکھ بھال ہوئے برسوں گزر گئے ہیں۔ ڈرائیووے میں ایک خستہ حال پرانی پک اپ کھڑی تھی۔ وہ مکان کے برآمدے تک آیا اور اس نے گھنٹی بجائی۔ چند منٹ بعد دروازہ کھلا اور ایک وحشت زدہ چہرہ جیف کے سامنے تھا۔ کھڑے ہوئے چھوٹے بال، سرخ آنکھیں اور چہرہ یوں میلا تھا جیسے اسے کئی دن تک دھونے کی زحمت نہیں کی گئی ہو۔ اس کے پاس سے شراب کے بھبکے آرہے تھے۔ وہ تقریباً چالیس سال کا دراز قد اور دبلے جسم کا شخص تھا۔ چہرے کے نقوش بگڑے ہوئے تھے مگر جیف کو ان میں واضح طور پر اپنی جھلک محسوس ہوئی تھی۔ اس کا دل دھڑک اٹھا۔

'کیا یہ وہی رک مورفس ہے؟' اس نے سوچا اور پھر بولا۔ ''مسٹر رک مورفس؟''

وہ چونکا۔ اس نے کڑے تیوروں کے ساتھ کہا۔ ''تم وہی ہو؟''

اس سے پہلے کہ جیف کوئی جواب دیتا، اس نے اچانک اسے گردن سے پکڑ کر اندر کھینچا اور دھکا دے کر فرش پر گرا دیا۔ جب تک جیف اٹھتا، اس نے دروازہ اندر سے بند کردیا تھا۔ جیف خوف زدہ ہوگیا۔ اس نے اپر کی جیب میں ہاتھ ڈال کر چاقو پکڑا اور دل کڑا کر کے بولا۔ ''تم نے دروازہ کیوں بند کیا ہے؟''

''تم نے مجھے فون بھی کیا تھا اور تصدیق کی تھی کہ میں رک مورفس ہوں۔'' وہ کہتے ہوئے جیف کی طرف آنے لگا۔ ''کیوں فون کیا تھا اور یہاں کیوں آئے ہو؟''

جیف پیچھے ہٹنے لگا۔ ''میں تم سے ملنا چاہتا تھا۔''

''کیوں؟'' اس کا لہجہ خوفناک ہو گیا۔ اس نے اچانک جیف کو پکڑنے کی کوشش کی تو جیف نے اپر سے ہاتھ نکالتے ہوئے چاقو گھمایا۔ وہ رک مورفس کے بائیں بازو پر لگا اور اس نے کھال کاٹ دی۔ مگر اس نے زخم کی پروا کیے بغیر پھرتی سے جیف کا بازو پکڑ کر اسے مروڑا۔ تکلیف کی شدت سے چاقو اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ گھوم گیا تھا۔ رک مورفس نے عقب سے اس کی گدی پر سر مارا تو جیف کو چکر آگیا۔ دوسری بار سر مارنے پر وہ بے ہوش ہو گیا۔ رک مورفس کا انداز نہایت وحشیانہ تھا۔ اس نے بے ہوش جیف کا چاقو اٹھالیا اور اپنے زخم کی طرف توجہ دیے بغیر جیف کو ٹانگوں سے پکڑ کر وہاں سے لے گیا۔

☆☆☆

جیف کو ہوش آیا تو وہ ایک بستر پر بندھا ہوا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ کڑوں کی مدد سے اینگل آئرن کے بیڈ کے سرہانے بندھے ہوئے تھے اور اسی طرح کے کڑوں سے دونوں پاؤں بھی بندھے ہوئے تھے۔ یہاں نیم تاریکی، سیلن اور بدبو تھی۔ جیف کو کئی بار مشن اسکول کے تہ خانے میں جانے کا موقع ملا تھا۔ وہاں بھی اسے ایسی سیلن اور بدبو محسوس ہوئی تھی۔ مگر یہاں بدبو اور سیلن کہیں زیادہ تھی۔ وہ شاید مکان کے تہ خانے میں تھا۔ اس نے آزاد ہونے کی کوشش کی لیکن کڑے اور زنجیریں نہایت مضبوط تھے۔ وہ بارہ سال کا تھا۔ کوئی جوان آدمی بھی اسے نہیں توڑ سکتا تھا۔ اس کا دل خوف سے بھر گیا۔ اس آدمی نے اس سے یہ سلوک کیوں کیا تھا؟ وہ اس سے ملنے آیا تھا اور اسے جیف کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ اس پر یوں اسے قید کرنا کیا معنی رکھتا تھا؟ جیف کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

وہ آواز نکالتے ہوئے بھی ڈر رہا تھا کہ وہ آئے گا اور پھر نہ جانے اس کے ساتھ کیا کرے گا۔ اینگل آئرن کے بیڈ پر گدا نہیں تھا بلکہ اس پر تختے لگا کر اوپر چڑا بچھایا ہوا تھا۔ جیف کی کمر تلے تختے چبھ رہے تھے۔ کچھ دیر میں اس کی نظر ماحول کی عادی ہوگئی تھی، تب اس نے دیکھا کہ وہ تہ خانے میں ہی ہے۔ یہاں زمین کچی تھی اور اوپر سے سیڑھیاں نیچے آرہی تھیں۔ چھت کے پاس چھوٹے روشن دان تھے جن پر اندھے شیشے لگے تھے۔ ان سے معمولی سی روشنی اندر آرہی تھی۔ اچانک اوپر کوئی دروازہ کھلا اور پھر سیڑھیوں سے چاپ کی آواز آئی۔ رک مورفس نیچے آرہا تھا۔ اس نے ایک ایمرجنسی لائٹ اٹھا رکھی تھی۔ شاید یہاں تہ خانے میں بجلی نہیں تھی۔ جیف نے چلّا کر کہا۔

''تم نے مجھے کیوں باندھا ہے؟ مجھے چھوڑ دو۔''

وہ اس کے پاس چلا آیا۔ اس نے جیف کے بازو پر ہاتھ پھیرا۔ ''کیوں نہیں، میں جلد تمہیں آزاد کردوں گا۔''

اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ جیف کو اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ''سنو، مجھے ایک رک مورفس کی تلاش ہے لیکن وہ تم نہیں ہو۔ میں نے فون ڈائریکٹری کی مدد سے یہاں تمام رک مورفس کے پتے نکالے تھے اور انہیں تلاش کررہا ہوں۔''

جیف کو کچھ دیر میں احساس ہوا کہ وہ اس کی بات سن ہی نہیں رہا تھا۔ وہ لائٹ کی روشنی میں اس کا معائنہ کررہا تھا اور اس کے تاثرات عجیب ہورہے تھے۔ جیف کا اپر پہلے ہی غائب تھا۔ وہ صرف شرٹ اور پتلون میں تھا۔ رک مورفس نے ایمرجنسی لائٹ ایک طرف دیوار پر لٹکائی اور واپس آکر اس کے کپڑے اتارنے لگا۔ جیف نے مزاحمت کی لیکن بندھے ہاتھوں سے وہ اسے روکنے سے قاصر تھا۔ اس نے نہایت آسانی سے اس کے کپڑے پھاڑ کر اتار دیے۔ کڑوں سے اتارنے کے لیے اس نے انہیں چاقو کی مدد سے کاٹ دیا تھا۔ اب جیف کے جسم پر صرف ایک نیکر تھی اور اسے کسی قدر سردی لگ رہی تھی۔ اگرچہ باہر کے مقابلے میں یہاں سردی کم تھی مگر اتنی کم بھی نہیں تھی کہ وہ بغیر لباس کے آرام سے رہ سکتا۔ وہ کچھ خوف اور کچھ سردی سے کانپنے لگا۔ ''تم... کیا چاہتے ہو؟''

رک مورفس کسی بھیڑیے کی طرح دانت نکال کر مسکرایا۔ ''جلد تمہیں پتا چل جائے گا۔''

اس نے جیف کے کپڑے سمیٹ کر تہ خانے میں لگی بھٹی میں ڈال دیے اور پھر اوپر چلا گیا۔ رک مورفس کی صورت، عمر اور انداز جیف کو یقین دلا رہا تھا کہ یہ وہی رک مورفس ہے جو اسے مشن اسکول میں داخل کرا گیا تھا۔ وہ یہاں اکیلا تھا اور جیف کے ساتھ کیا جانے والا سلوک بتا رہا تھا کہ وہ کوئی اچھا انسان نہیں ہے۔ پتا نہیں وہ اس کے ساتھ کیا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ ابھی تو اس نے اسے کپڑوں سے محروم کر کے موسم پر چھوڑ دیا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کا جسم سردی کا عادی ہورہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر خود کو آزاد کرانے کی کوشش کی لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ اس کی کلائیاں چھل گئی تھیں اور ان میں تکلیف ہونے لگی تھی۔ اب وہ پچھتا رہا تھا کہ بدمعاش رک مورفس کے علم میں لائے بغیر وہ یہاں کیوں چلا آیا۔ مگر اسے کیا علم تھا کہ اسے ایسے رک مورفس سے واسطہ پڑے گا جو پہلے رک مورفس سے زیادہ خطرناک نکلے گا۔ وہ دل کا اچھا تھا، تب ہی اس نے جیف کی حرکت معاف کردی اور اس کی مدد پر بھی آمادہ ہوگیا تھا۔ جبکہ یہ رک مورفس اسے کوئی جنونی لگ رہا تھا۔ اس نے بلاوجہ اسے قید کردیا تھا۔

جیف ایک ڈیڑھ گھنٹے بے ہوش رہا تھا۔ اس کا اندازہ اسے روشن دانوں سے آنے والی روشنی سے ہورہا تھا۔ اب دن پوری طرح روشن تھا۔ پھر رفتہ رفتہ سورج ڈھلنے لگا تو تہ خانے میں اندھیرا بڑھ گیا اور سورج ڈوبنے سے پہلے اندر تاریکی چھا گئی تھی۔ بس شیشوں پر ہلکی سی روشنی جھلک رہی تھی۔ رات ہونے کے ساتھ سردی بھی بڑھ رہی تھی اور بعض اوقات وہ کانپ اٹھتا تھا۔ اسے یہاں بندھے سات آٹھ گھنٹے ہوگئے تھے۔ اوپر دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو جیف چونک گیا۔ رک مورفس نیچے آیا تو اس کا حلیہ چونکانے والا تھا۔ اس نے قصائیوں جیسا چمڑے کا اپرن رکھا تھا جو ان کے لباس کو خون سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس نے ایک تہ کیا ہوا کپڑا اٹھا رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ میں ایمرجنسی لائٹ تھی۔ اس نے لائٹ دیوار پر لٹکائی اور کپڑا زمین پر بچھا کر کھولنے لگا۔ جیف نے اٹھ کر دیکھا تو اس کے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ کپڑے میں کئی تیز دھار آلات تھے۔ ان میں چھوٹی چھریاں اور سرجری والے بلیڈز تھے۔ جیف پیاس اور بھوک محسوس کررہا تھا لیکن یہ سب دیکھ کر وہ بھوک و پیاس بھول گیا تھا۔ اس نے گھبرا کر کہا۔

''اے... یہ تم کیا کررہے ہو؟''

''مجھے تمہارے بارے میں پتا چل گیا ہے۔ تم مشن اسکول سے بھاگے ہو۔'' وہ بولا۔ ''تم ایک خراب بچے ہو اور خراب بچوں کو سزا ملنی چاہیے۔''

''تت... تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''ٹی وی پر تمہارے بارے میں آرہا ہے۔ تم اسکول سے بھاگے ہو۔''

جیف کا خوف بڑھ رہا تھا۔ ''تم... مجھے پولیس کے حوالے کردو۔''

''نہیں۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''میں خود تمہیں سزا دوں گا۔''

رک مورفس نے ایک چھوٹا چاقو اٹھایا اور اس کے پاس آیا۔ جیف بیڈ پر سرک کر ممکنہ حد تک دور ہوا لیکن وہ ایک حد سے زیادہ دور نہیں جا سکتا تھا۔ جیف چلّایا۔ ''دور رہو مجھ سے... کوئی ہے... مدد کرو... مدد۔''

''کوئی فائدہ نہیں ہے۔ تمہاری آواز اس مکان سے باہر نہیں جائے گی۔ چاہے تم کتنا ہی چلّالو۔''

جیف نے محسوس کیا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اس کے باوجود اس نے چیخ و پکار جاری رکھی۔ رک مورفس نے اپنے زخم کی خود ڈریسنگ کرلی تھی۔ ویسے بھی چاقو ہلکا سا لگا تھا اور بس کھال کٹی تھی۔ وہ جیف کی طرف جھکا تو اس کی فطری ہمت جاگ گئی اور اس نے اچانک آگے ہوتے ہوئے رک مورفس کے زخمی بازو پر لات ماری۔ اتفاق سے لات بالکل زخم پر اور پوری قوت سے لگی تھی۔ رک مورفس چیخ مار کر پیچھے ہٹا۔ اس نے بے اختیار چاقو پھینک کر اپنے بازو پر ہاتھ رکھا تو اس

کا ہاتھ خون سے بھر گیا۔ جیف کی لات نے زخم کو ہرا کر دیا تھا اور اس سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے مشتعل ہو کر جیف کو گالی دی اور اوپر چلا گیا۔ وہ یقیناً اپنے زخم کی ڈریسنگ کرنے گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد جیف نے کوشش کر کے جھک کر دیکھا۔ چاقو اور دوسرے آلات اس سے دور تھے اور اگر وہ ان کو حاصل کر بھی لیتا تو خود کو آزاد نہیں کرا سکتا تھا۔ یہ اس کی بیڑیاں نہیں کاٹ سکتے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ وہ جلد غصے سے بھرا ہوا آئے گا اور اس بار وہ اسے نہیں چھوڑے گا۔ اس کے عزائم پہلے ہی ٹھیک نہیں تھے۔

مگر جیف کا اندازہ غلط نکلا۔ رک مورفس اس رات واپس نہیں آیا۔ بندھے بندھے بھوک و پیاس سے جیف کی حالت خراب ہونے لگی تھی۔ خاص طور سے پیاس سے اس کے حلق میں کانٹے سے پڑ رہے تھے۔ صبح تک پیاس اتنی بڑھ گئی کہ وہ خوف کے باوجود رک مورفس کو پکارنے لگا۔ مگر اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ مسلسل بولنے سے جیف کا گلا بیٹھ گیا تھا اور اب اس سے ٹھیک سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ زندگی میں وہ بہت کم رویا تھا۔ اگر اسے رونا آتا بھی تو وہ اپنے آنسو روک لیا کرتا تھا۔ اسے رونے سے نفرت تھی۔ اس کے خیال میں آنسو شکست کی علامت ہوتے ہیں۔ مگر اس وقت وہ رو دیا۔ پھر اسے خیال آیا کہ رونے سے اس کے جسم کا پانی اور ضائع ہوگا اس لیے وہ چپ ہو گیا۔ ورنہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ دھاڑیں مار مار کر روئے۔ مایوسی کی کیفیت میں اسے خیال آ رہا تھا کہ شاید وہ بندھے بندھے مر جائے گا یا یہ جنونی اسے مار ڈالے گا۔ اب اس کو آزادی نہیں ملے گی۔

روشن دانوں سے صبح کی روشنی جھلکنے لگی تھی اور پھر سورج نکل آیا۔ کل دن تک جیف کو امید تھی کہ اس کی واپسی نہ ہونے پر رک مورفس اسے تلاش کرے گا اور شاید وہ یہاں تک پہنچ جائے مگر اب یہ امید بھی دم توڑ چکی تھی کیونکہ اگر وہ اسے تلاش کرنا چاہتا تو اب تک کر لیتا۔ یہ کام زیادہ مشکل نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ جیف کہاں جا سکتا ہے اور اس کے پاس اب رک مورفس کا پتا بھی موجود تھا مگر ایسا لگ رہا تھا کہ رک مورفس نے اسے خاص اہمیت نہیں دی تھی۔ شاید وہ سمجھ رہا تھا کہ جیف فرار ہو گیا ہے اور اب واپس نہیں آئے گا۔ اس لیے اس نے اسے تلاش کرنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ سیڑھیوں کی طرف سے آہٹ ہوئی تو جیف اونگھتے ہوئے چونک گیا۔ اس نے سہمے ہوئے انداز میں دیکھا۔ رک مورفس آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بید کی چھڑی تھی۔ اس کے عزائم اس کے چہرے سے جھلک رہے تھے۔ جیف نے دور ہونے کی کوشش کی لیکن رک مورفس نے آتے ہی اسے چھڑی ماری تو جیف تڑپ گیا۔ اس کی رانوں پر لکیریں بن گئی تھیں۔ رک مورفس نے تابڑ توڑ بید برسایا اور پھر رک کر ہانپتے ہوئے بولا۔

"اب تمہیں ڈبل سزا ملے گی۔ پہلے میں تمہارے جسم کی ساری کھال اسی طرح اتار دوں گا اور اس کے بعد تمہارے زخموں پر نمک چھڑکوں گا۔"

جیف کا ان چند ضربوں میں برا حال ہو گیا تھا۔ اس نے آج تک جو سزائیں بھگتی تھیں، وہ اس تکلیف کے آگے کچھ نہیں تھیں۔ اس نے کراہتے ہوئے کہا۔ "پلیز... میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟"

"تم ایک گندے بچے ہو اور میں گندے بچوں کو سزا دیتا ہوں۔ میں نے اور بھی گندے بچوں کو سزا دی ہے۔ وہ سب یہاں تہ خانے میں ہیں۔"

جیف کی جہاں تک نظر جاتی تھی، اسے تہ خانے میں سوائے اس بیڈ اور کونے میں لگی بھٹی کے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا تو وہ بچے کہاں تھے جن کا رک مورفس ذکر کر رہا تھا؟ پھر جیف کو یہاں کچی زمین کا خیال آیا اور اس کے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے رک رک کر کہا۔ "تم... بچوں کو... مار کر... یہاں دفن کر دیتے ہو؟"

رک مورفس نے دانت نکالے۔ وہ بالکل دیوانہ لگ رہا تھا۔ "میں ان کو سزا دیتا ہوں۔"

اس نے اقرار نہیں کیا۔ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ جیف نے پوچھا۔ "آج سے آٹھ سال پہلے تم نے مجھے مشن اسکول میں داخل کرایا تھا؟"

"مشن اسکول۔" رک مورفس نے بھویں سکیڑ کر کہا۔ "تم کیا..."

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا کیونکہ اوپر کسی نے کال بیل بجائی اور پھر گھنٹی پر انگلی رکھ کر بھول گیا۔ رک مورفس غرایا۔ "لعنت ہو۔" اس نے پھرتی سے بیڈ کے پیچھے دیوار پر ٹنگا ایک منہ بند کرنے والا پٹا اٹھایا اور زبردستی جیف کے منہ پر چڑھا دیا۔ اس میں لکڑی کی ایک بال لگی تھی جو جیف کے منہ میں فٹ آ گئی اور اب وہ غوں غاں تو کر سکتا تھا لیکن حلق سے کوئی آواز نہیں نکال سکتا تھا۔ یہ کام کر کے رک مورفس اوپر کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے تہ خانے کا دروازہ بھی بند کر دیا تھا۔ اوپر ویسے خاموشی رہتی تھی لیکن اس وقت شور سنائی دیا۔ ایسا لگا جیسے کئی افراد زور زور سے بول رہے ہوں۔

جیف کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ شاید اوپر باہر سے کوئی آیا تھا اور رک مورفس اس سے لڑ رہا تھا۔ اسے خیال آیا کہ وہ آنے والے کو متوجہ کرے مگر اس کا منہ بند تھا اور اگر کھلا بھی ہوتا تو اس کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ تہ خانے کا دروازہ بند ہونے کی وجہ سے یہ واضح نہیں تھا کہ اوپر کون آیا ہے اور کیا ہو رہا ہے۔ مگر اب شور کے ساتھ توڑ پھوڑ کی آواز بھی آ رہی تھی۔

جیف منہ سے آواز نکالنے کی کوشش کر رہا تھا مگر یہ اتنی تھی کہ بس اسے ہی سنائی دے رہی تھی۔ اچانک اسے خیال آیا اور اس نے ذرا اوپر ہو کر دائیں ہاتھ سے بندھا کڑا بیڈ کے سرہانے والے پائپ پر مارا۔ اس سے خاصی بلند آہنی جھنکار پیدا ہوئی۔ یہ دیکھ کر جیف کا حوصلہ بڑھ گیا اور وہ مسلسل کڑا پائپ پر مارنے لگا۔ یہ جھنکار خالی تہ خانے میں گونج کر اور بھی بڑھ گئی تھی۔ جیف اتنے زور سے کڑا مار رہا تھا کہ اس کی کلائی زخمی ہو گئی اور پھر اس سے خون رسنے لگا۔ جب تکلیف ایک حد سے بڑھ گئی تو اس نے بائیں ہاتھ کا کڑا پائپ پر مارنا شروع کر دیا۔ وہ دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ اوپر آنے والا یہ شور سن لے اور اسے آ کر بچا لے۔ اس کی یہ کلائی بھی زخمی ہو گئی تھی مگر اس نے ہاتھ نہیں روکا۔ بھوک، پیاس اور مسلسل بندھے رہنے سے وہ کمزور ہو گیا تھا اور اس ذرا سی کوشش سے ہانپنے لگا تھا۔ مگر وہ رکا نہیں، اسے معلوم تھا کہ یہ آخری موقع ہے اور اگر اوپر آنے والے چلے گئے تو وہ پھر اس شخص کے رحم و کرم پر رہ جائے گا۔ عین اس وقت جب اس کی ہمت بالکل جواب دے گئی تھی، قدرت کو اس پر رحم آ گیا اور تہ خانے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ جیف کے وجود میں بجلی کی سی لہر دوڑ گئی۔ وہ بول نہیں سکتا تھا اس لیے پہلے سے زیادہ جوش و خروش سے کڑا بجانے لگا۔ جب رک مورفس کا دیو قامت ساتھی سامنے آیا تو اسے ناقابلِ بیان مسرت ہوئی۔ اس نے آ کر جلدی سے جیف کا منہ کھولا۔

"تم ٹھیک ہو؟"

"ہاں لیکن مجھے پیاس لگی ہے۔ اس نے مجھے کھانا پانی کچھ نہیں دیا ہے۔"

دیو قامت شخص اس کے کڑوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے جیف کو تسلی دی۔ "تم فکر مت کرو، اس سے پورا حساب لیا جائے گا۔"

وہ شخص اوپر گیا۔ واپسی میں وہ اس کے لیے چابی، جوس کی بوتل اور ایک بڑی چاکلیٹ بار لایا تھا۔ اس نے جیف کو کھول دیا اور اسے چاکلیٹ اور پانی کی بوتل دی۔ "تھوڑا تھوڑا کر کے کھاؤ اور پانی پیو ورنہ طبیعت خراب ہو جائے گی۔"

جیف نے ایسا ہی کیا۔ دس منٹ میں آدھی بوتل اور چاکلیٹ کی بار ختم کر کے اس کی حالت بہت بہتر ہو گئی تھی۔ اس نے رک مورفس کے بارے میں پوچھا۔ دیو قامت شخص نے جواب دیا۔ "اوپر ہے، اپنے ہم نام سے پوچھ گچھ کر رہا ہے۔"

"تم لوگوں نے مجھے دیر سے تلاش کیا۔" جیف نے شکوہ کیا اور اپنے جسم پر چھڑی کے نشانات کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ دیکھو، اس نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔"

"سوری، مجھ سے وہ کاغذ گم ہو گیا تھا جس پر یہاں کا پتا لکھا ہوا تھا۔ بڑی مشکل سے کچھ دیر پہلے ملا اور ہم فوری روانہ ہو گئے۔ تم فکر مت کرو، یہ زخم چند دن میں ٹھیک ہو جائیں گے لیکن اس کے بدلے اسے جو زخم لگیں گے، وہ اتنی جلدی ٹھیک نہیں ہوں گے۔"

"شاید یہی شخص ہے جو مجھے مشن اسکول میں داخل کرا کے بھاگ گیا تھا۔"

"ابھی معلوم ہو جائے گا۔"

جیف کی حالت بہتر ہوئی تو وہ دیو قامت شخص کے ساتھ اوپر آیا جہاں رک مورفس نے اپنے ہم نام کو چھت کے کڑے سے یوں لٹکایا ہوا تھا کہ اس کا سر نیچے تھا۔ رک مورفس کا ایک آدمی اس کے بے ہنگم بالوں کو لائٹر سے جلا رہا تھا اور وہ بچنے کے لیے سر ہلا رہا تھا۔ جیف کی حالت دیکھ کر رک مورفس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے الٹے لٹکے رک مورفس کے سینے پر اپنے بھاری بوٹ سے کئی ضربیں لگائیں اور اس کی پسلیاں توڑ دیں۔ وہ اب پھڑک رہا تھا۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا ورنہ وہ چیخ چلا کر آس پاس کے لوگوں کو بھی جمع کر لیتا۔ اس وقت بھی وہ ناک سے عبرتناک آوازیں نکال رہا تھا۔ اپنا دل ٹھنڈا کر کے رک مورفس جیف کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گیا۔

"یہ کیا چکر ہے، اس شخص نے تمہیں کیوں قید کر رکھا تھا؟"

جیف نے اسے ساری کہانی سنائی۔ "اس نے اور بچوں کو بھی مار کر ان کی لاشیں تہ خانے میں دفنا دی ہیں۔ اسے پولیس کے حوالے کرو۔"

رک مورفس نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ ممکن نہیں ہے ورنہ یہ پولیس کو میرے بارے میں بھی بتا دے گا۔"

"یہ وہی شخص ہے جس نے مجھے مشن اسکول میں داخل کرایا تھا۔"

"میرے آدمی اس سے معلوم کر لیں گے۔" رک مورفس نے کہا اور پھر رک کر بولا۔ "میرا مشورہ ہے کہ تم اب انتقام کے چکر میں مت پڑو، واپس مشن اسکول جاؤ اور اپنے یہ چھ سال پڑھنے میں لگاؤ۔ مجھے یقین ہے کہ تم آگے جا کر ایک اچھے انسان بنو گے۔"

جیف نے سر ہلایا۔ "میں ایسا ہی کروں گا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ باہر کی دنیا اتنی خوفناک ہے۔"

اس کے کپڑے رک مورفس نے پہلے ہی جلا دیے تھے۔ دیوقامت شخص نے اسے ایک کمبل اوڑھا دیا اور اسے لے کر باہر آ گیا جہاں ایک وین کھڑی تھی۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد رک مورفس اور اس کے ساتھی بھی آ گئے۔ وہ خاموش تھے اور انہوں نے راستے میں بھی کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے جیف کو پتا چلتا کہ انہوں نے رک مورفس کے ساتھ کیا کیا ہے۔ راستے میں ایک اسٹور کے سامنے وین رکوا کر رک مورفس خود اتر گیا اور واپسی میں جیف کے لیے ویسے ہی کپڑے اور اپر لایا جیسے اس نے پہن رکھے تھے۔ جیف نے جلدی سے کپڑے پہنے اور اس کا شکریہ ادا کیا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" رک مورفس نے اسے کچھ رقم دی۔ "یہ لو، میں تمہیں بس ٹرمنل پر اتار دوں گا، وہاں سے تم مشن اسکول کی طرف جانے والی بس میں بیٹھ جانا۔ لیکن تم ان واقعات کا ذکر کسی سے نہیں کرو گے بلکہ کولمبس کا ذکر مت کرنا، کسی اور جگہ کا نام لینا کہ وہاں گئے تھے اور اب واپس آ گئے ہو۔ فادر طر سے معافی مانگ لینا۔ وہ اچھا آدمی ہے، تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔"

جیف ہچکچایا اور بولا۔ "کیا یہ وہی رک مورفس تھا؟"

رک مورفس نے منہ سے کچھ نہیں کہا، صرف سر ہلایا۔ کچھ دیر بعد وین بس ٹرمنل کے سامنے رکی اور دیوقامت شخص نے اس کا سلائڈنگ ڈور کھولا تو جیف ایک لمحے کو ہچکچایا پھر رک مورفس کے گلے لگ گیا۔ "تھینک یو مسٹر مورفس۔"

رک مورفس نے کچھ نہیں کہا، بس اس کی پیٹھ تھپکتا رہا۔ پھر وہ نیچے اتر گیا۔ رک مورفس نے اس سے پوچھا۔ "تمہیں واپس جانے میں کوئی مسئلہ تو نہیں ہوگا؟"

جیف کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے پورے اعتماد سے کہا۔ "ہاں، میں چلا جاؤں گا۔ مجھے راستہ مل گیا ہے، میں بھٹکوں گا نہیں۔"

جیف ٹرمنل کی عمارت میں داخل ہوا تو دیوقامت شخص نے وین کا دروازہ بند کر دیا اور وہ آگے بڑھ گئی۔ دیوقامت شخص نے رک مورفس سے پوچھا۔ "باس! یہ بچہ اس آدمی کی اولاد ہے؟"

"نہیں۔" رک مورفس نے گہری سانس لی۔ "وہ میری اولاد ہے۔"

وہ دنگ رہ گیا۔ وین کے عقبی حصے میں وہی اس کے ساتھ تھا اور وہ رک مورفس کا نائب تھا۔ شاید اسی لیے رک مورفس نے اعتراف کرنے میں حرج نہیں سمجھا تھا۔ دیوقامت شخص نے کہا۔ "تب تم نے اسے جانے کیوں دیا؟"

"میں نے ہی اسے وہاں داخل کرایا تھا۔ اس وقت میں نیا نیا جرائم کی دنیا میں آیا تھا اور میں نے محسوس کیا کہ مجھے اس بچے کو پالنے کا حق نہیں ہے۔ میرے ساتھ رہ کر وہ مجرم ہی بنے گا، اس لیے میں نے اسے مشن اسکول میں داخل کرا دیا۔"

دیوقامت شخص نے سر ہلایا۔ "تب ہی تم نے اسے معاف کر دیا تھا؟"

"ہاں، اس نے میرے ساتھ ٹھیک سلوک کیا۔ لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس راہ پر مزید آگے بڑھے۔"

"لیکن رک مورفس کی وجہ سے پولیس اس تک نہ پہنچ جائے؟"

"پولیس کو رک مورفس کا پتا نہیں چلے گا۔ وہ تہ خانے میں اپنے بنائے ہوئے بیڈ کے ساتھ قید ہے اور جب تک کوئی اسے تلاش کرے گا، وہ بھوک پیاس سے مر چکا ہوگا۔ پولیس جیف پر شک نہیں کرے گی۔ جب اس کی لاش کے ساتھ تہ خانے میں دفن بچوں کی لاشیں ملیں گی تو معاملہ خود کلیئر ہو جائے گا اور اگر پھر بھی جیف مشکل میں پڑتا ہے تو میں ہوں نا۔"

"تم نے تو اسے واپس بھیج دیا۔"

رک مورفس نے سر ہلایا۔ "کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ وہ اچھا انسان بنے، میری طرح مجرم نہ بنے۔ میں مجبور تھا۔ دشمنوں نے میری بیوی کو مار دیا تھا اور ان سے بدلہ لینے کے لیے مجھے مجرم بننا پڑا لیکن جیف کے ساتھ ایسی کوئی مجبوری نہیں ہے۔"

اس نے سر ہلایا۔ "تم نے ٹھیک کیا ہے باس۔"

☆

اس نے مجھے اندر اس طرح مدعو کیا جیسے یہ گھر خود اس کا ہو۔ وہ مجھے سیدھا لائبریری میں لے گیا۔ وہ جوایرون کا پسندیدہ کمرا تھا۔

مجھے وہاں پیکنگ کریٹس، خالی شیلف اور کورز سے ڈھکے ہوئے فرنیچر کو دیکھ کر حیرت نہیں ہونی چاہیے تھی۔

"ملازم کہاں ہیں؟ کیا تم کہیں جا رہے ہو؟" میں نے پوچھ لیا۔

اس کے ہونٹوں پر تمسخر آمیز مسکراہٹ اُبھر آئی۔ وہ

خوش اسلوب

سلیم انور

خود آگاہی اور خود اعتمادی کامیابی و فتح کے دو بڑے ستون ہیں... احساسِ شکست سے دور ایک شاطر کا کھیل... جو خوش اسلوبی سے تمام مراحل طے کر گیا۔

مغرب سے درآمد مختصر پیرائے میں مکمل کتھا کا مزہ

اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”کیرولین کو یہاں سے دور جانے کی ضرورت ہے۔ یہاں کی بہت سی چیزیں اسے یاد دلاتی رہیں گی۔“

ہماری کبھی ایک دوسرے سے ملاقات نہیں ہوئی تھی لیکن وہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا کہ مجھے توقع تھی... پُراعتماد، کارگزار اور بددماغ۔

ایرون کا شک و شبہ درست ہی تھا۔ جب میں اپنے ایک اور اسائنمنٹ سے لوٹا تو ایرون کا پیغام میرا منتظر تھا۔ لیکن اس وقت تک مجھے بہت دیر ہو چکی تھی لیکن مجھے یہ اسائنمنٹ مکمل کرنا بھی ضروری تھا۔ میں اس کا یہ قرض لوٹانے کا پابند تھا اور کچھ نہیں تو میں وفادار ضرور تھا۔

”مجھے کیرولین سے چند معاملات ڈسکس کرنا ضروری ہیں۔“ میں نے کہا۔

”ابھی نہیں۔ ابھی وہ آرام کر رہی ہے۔ جب ہم لوٹ آئیں گے پھر شاید یہ ممکن ہو۔“ اس نے کہا۔

”لیکن یہ نہایت ضروری ہے۔“

”تو تم مجھے بتا کیوں نہیں دیتے کہ تمہیں کیا چاہیے پھر میں فیصلہ کروں گا کہ آیا معاملہ اتنا اہم ہے کہ کیرولین کو زحمت دی جائے؟“

چونکہ اس نے مجھے بیٹھنے کی پیشکش نہیں کی تھی اس لیے میں نے خود ہی بیٹھنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے ایرون کی پُرتکلف آرائشی میز کے سامنے موجود کرسیوں میں سے ایک کا غلاف اتار دیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

وہ مجھے اس ملاقات کو ملتوی کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ میں ان دونوں کو اکٹھا دیکھنا چاہتا تھا۔

جب اس نے بھانپ لیا کہ میں اس کی مزاحمت کے سامنے ہتھیار نہیں ڈال رہا ہوں تو اس نے شائستگی سے پیش آنے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے اس کے بدلتے رویے کو اپنے لیے ایک وارننگ سمجھ لینا چاہیے تھا۔

”کیا تم کچھ پینا پسند کرو گے؟“ اس نے پوچھا۔

اور میں نے اس سے ایک گلاس طلب کر لیا۔

وہ کمرے سے چلا گیا اور چند منٹوں کے بعد دو گلاس ہاتھ میں تھامے پلٹ آیا۔ اس نے ایک گلاس میری جانب بڑھایا اور خود گھوم کر میز کے پیچھے ایرون کی کرسی پر جا بیٹھا۔ یہ اس کی گستاخی کی انتہا تھی۔ ”یہ بتاؤ کہ تم نے اس کے لیے کیا، کیا ہے؟“

”میں... ہوں... میں نے اس کے معاملات کی درستی کا کام سرانجام دیا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔

اس نے یہ سن کر ہلکا سا قہقہہ لگایا اور اپنے دونوں ہاتھ میز کی سطح پر پھیلاتے ہوئے قدرے آگے کی جانب جھکا اور بولا۔ ”ایک طرح کا صفائی ستھرائی کرنے والا؟ ویل، آئی ایم سوری مسٹر ڈینی۔ میں نہیں سمجھتا کہ کیرولین کو تمہاری خدمات کی ضرورت پڑے گی۔ اس کے پاس مدد کے لیے دوسرے ذرائع ہیں۔“

میں نے وائن کا ایک گھونٹ بھرا اور منہ بناتے ہوئے اس کے ذائقے کی بدمزگی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ کون سی شراب ہے؟“

یہ شراب خاصی تیز تھی اور اس مکان میں موجود شراب کے ذخیرے میں مجھے اس بدمزہ وائن کی توقع ہرگز نہیں تھی۔

تب میں نے دیکھا کہ اس نے اپنے گلاس کو چھوا تک نہیں تھا۔

”آئی ایم سوری۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میرے پاس تہ خانے کی چابی نہیں ہے۔ یہ بارڈولینو ہے جو مجھے ڈائننگ روم میں رکھی مل گئی تھی، اچھی نہیں ہے؟“

میں نے ایک اور چسکی لی۔ ”بوسیدہ سی لگ رہی ہے۔ اس کا ذائقہ گلی ہوئی لکڑی کا سا ہے۔“ میں نے اپنا جام پرے کھسکاتے ہوئے کہا۔

”سوری۔“ اس نے اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں کوئی دوسری بوتل دیکھتا ہوں۔“

میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ ”نہیں، زحمت مت کرو۔ مجھے اور بھی کام سرانجام دینے ہیں۔ میں کرولین سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”جیسا کہ میں نے بتایا تھا، وہ آرام کر رہی ہے۔“

اب اس کی ہٹ دھرمی ناقابلِ برداشت محسوس ہونے لگی۔ ”دیکھو، تم مجھے اس ملاقات سے باز رکھنا چاہتے ہو لیکن اس سے تمہارا کام نہیں بنے گا۔ ایرون کو علم تھا کہ اس کے خلاف کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

”معاف کرنا، کیا کہا؟“

وہ حقیقت میں اچنبھے میں پڑ گیا تھا۔ بہرحال، وہ مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتا تھا۔ میں اس کی جانب سے ابتدا ہی سے چوکنا تھا۔

ایرون میرا آقا تھا۔ وہ میرا دوست بھی تھا اور میں ان دونوں کو یوں بہ آسانی نکل بھاگنے کی اجازت ہرگز نہیں دے سکتا تھا۔ ”یوں بننے کی کوشش مت کرو جیسے تم جانتے ہی نہیں ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ ایرون بوڑھا ضرور تھا لیکن احمق قطعی نہیں تھا۔ یہ اس کی... میرا مطلب ہے کہ کیرولین کی تیسری شادی تھی؟“

”چوتھی۔“ اس نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ اس کی نگاہیں اپنی انگلیوں کے ناخنوں پر جمی ہوئی تھیں۔

”چوتھی۔ اور اس کے کم از کم دو سابقہ شوہروں کی موت عجیب حالات میں واقع ہوئی تھی۔ میں ایرون کو بات چیت کے ذریعے اس شادی سے روک تو نہیں سکا تھا لیکن اس نے قبل از شادی کے معاہدے کے بارے میں میری بات ضرور سنی تھی۔“

”آہ تو یہ تمہارا کارنامہ تھا۔“

”ہاں، وہ تمہارے بارے میں بھی جانتا تھا۔ تم کس طرح ہر وقت کیرولین کے گرد منڈلاتے رہتے تھے، اس سے سرگوشیاں کرتے رہتے تھے۔ جب تم اکٹھا باہر جاتے تھے۔ یہ سمجھتے تھے کہ اسے اس بات کا علم نہیں ہے۔“

یہ اس کی خودسری کی انتہا تھی کہ اس نے یہ سن کر بھی ایک قہقہہ بلند کیا اور بولا۔ ”کیا تم سمجھ رہے ہو کہ ہمارے درمیان کوئی افیئر چل رہا تھا؟ یہ بڑا مضحکہ خیز خیال ہے۔ وہ مجھ سے عمر میں تیس سال بڑی ہے۔“

”لیکن بات جب بہ آسانی ہاتھ لگنے والی دولت کی ہو تو عمر کے فرق کو کون خاطر میں لاتا ہے؟“ میں نے کہا۔

”حقیقت میں کیرولین میری محبوبہ نہیں ہے۔“

”تو پھر؟“

”وہ میری ماں ہے۔“

مجھے یہ سن کر شدید حیرانی ہوئی لیکن اس انکشاف سے اس معاملے پر کوئی فرق نہیں پڑتا تھا جس سلسلے میں، میں اس سے ملنا چاہتا تھا۔ ”ایرون کی موت سے ان کے درمیان شادی سے پہلے کا معاہدہ برطرف ہو چکا ہے۔ اب وہ ترکے میں ملنے والی ہر شے کی مالک ہو گی۔“

”اوں ہوں۔“

میں نے میز کی سطح پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”لیکن ایسا ہرگز نہیں ہو گا۔“

اس نے بھویں اچکاتے ہوئے میری طرف دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر ایک اور طنزیہ مسکراہٹ ابھر آئی۔

”اور تم اسے وارث بننے سے روکنے کے لیے کیا تجویز کرنا چاہتے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”میں...“ اچانک میرے معدے میں ایک آگ سی محسوس ہونے لگی۔ میری پیشانی پر پسینے کی بوندیں نمودار ہونے لگیں۔

وہ شراب!

میں نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے ابھی تک اپنے گلاس کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

”تم نے کیا کیا ہے؟“

وہ اطمینان سے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ محراب نما انداز میں جوڑ لیے اور ان کی اوٹ سے مجھے دیکھنے لگا۔ ”سب کچھ جلد ہی ختم ہو جائے گا۔ تمہیں کچھ تکلیف تو ہو گی لیکن یہ میرا وعدہ ہے کہ درد کی شدت زیادہ دیر قائم نہیں رہے گی۔“

”تم نے مجھے زہر دیا ہے؟“

”کسی بھی شخص کو کوئی سراغ چھوڑے بغیر ہلاک کرنے کے کئی ایک طریقے ہیں۔ فزیشن نے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ ایرون کی موت طبعی طور پر واقع ہوئی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا علم کتنا تھا۔ تمہارے کیس میں، ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ہماری کبھی ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ ہمارے درمیان کوئی تعلق بھی نہیں بنتا۔ اور جب تک وہ تمہیں تلاش کرتے ہوئے تم تک پہنچیں گے اس وقت تک ہم بہت دور نکل چکے ہوں گے...“ یہ کہہ کر وہ اٹھا اور میز کے گرد گھوم کر میرے نزدیک آ گیا۔

اس کے ہونٹوں پر ایک طنز آمیز فاتحانہ مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

میں حرکت کرنا چاہتا تھا۔ اپنی جیکٹ کی جیب میں موجود ریوالور نکالنا چاہتا تھا۔ لیکن میرے اعضا اکڑ چکے تھے۔ میری نگاہ دھندلا رہی تھی۔ میں نے بولنے کی کوشش کی تو میری زبان گنگ ہو گئی۔

اس نے میرا کاندھا تھپتھپایا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ”معاملات کو خوش اسلوبی کے ساتھ صاف ستھرے اور نفیس طریقے سے تکمیل تک پہنچانے میں صرف تم ہی یکتا نہیں ہو، مسٹر ڈینی!“

اسما قادری

قسط 47

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور با اثر سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے ... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے - پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو - محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہو جاتی ہے - دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے - زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں ... کبھی بازی پلٹ بھی جاتی ہے - بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے ... اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے - جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بارسوخ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہریار عادل ایک پُرجوش جوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیرِ نگیں ضلع کے سب سے بڑے گاؤں پیر آباد کا چودھری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہریار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا اور دونوں کے درمیان مخاصمت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ چودھری کی نفاست پسند بیٹی کشور، آفتاب سے خفیہ نکاح کر لیتی ہے۔ ماہ بانو کا تعلق بھی پیر آباد سے ہے۔ چودھری افتخار جب ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آ جاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چودھری کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ گورا جس کا نام ڈیوڈ ہے، اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ چودھری کو ماہ بانو کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ ادھر کشور آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ چودھری، آفتاب اور کشور کا سراغ لگانے کا حکم دیتا ہے۔ چودھری افتخار لندن پہنچتا ہے اور ہیروئن کی تیاری کے لیے لیب کے قیام والے معاملات طے کر لیتا ہے۔ شہریار کی ملاقات میجر ذیشان سے ہوتی ہے تو وہ اسے بتاتا ہے کہ ایک اسپیشل فورس قائم کر لی گئی ہے اور وہ خود اس میں شامل ہو گیا ہے۔ یہ فورس ایک سیکیورٹی ایجنسی کے طور پر خفیہ کام کرتی ہے۔ واپسی میں شہریار کو ماہ بانو کا فون موصول ہوتا ہے۔ وہ اس سے ایک ریسٹورنٹ میں ملتی ہے اور اسلم سے شادی کی خبر سنا کر اس سے اپنے شناختی کاغذات بنوانے کے لیے اس کی مدد چاہتی ہے۔ شہریار کو پتا چلتا ہے کہ ماریا اس کی جاسوسی کر رہی ہے۔ اسلم اور ماہ بانو شادی کے بندھن میں بندھ جاتے ہیں۔ ماریا، کرنل توحید کو رجھانے کی کوشش میں پکڑی جاتی ہے تاہم راستے میں را کے ایجنٹوں کی فائرنگ سے گاڑی میں آگ لگنے کے سبب ماریا بری طرح جھلس جاتی ہے اور اسپتال میں پوچھ گچھ کے دوران دم توڑ دیتی ہے۔ شہریار
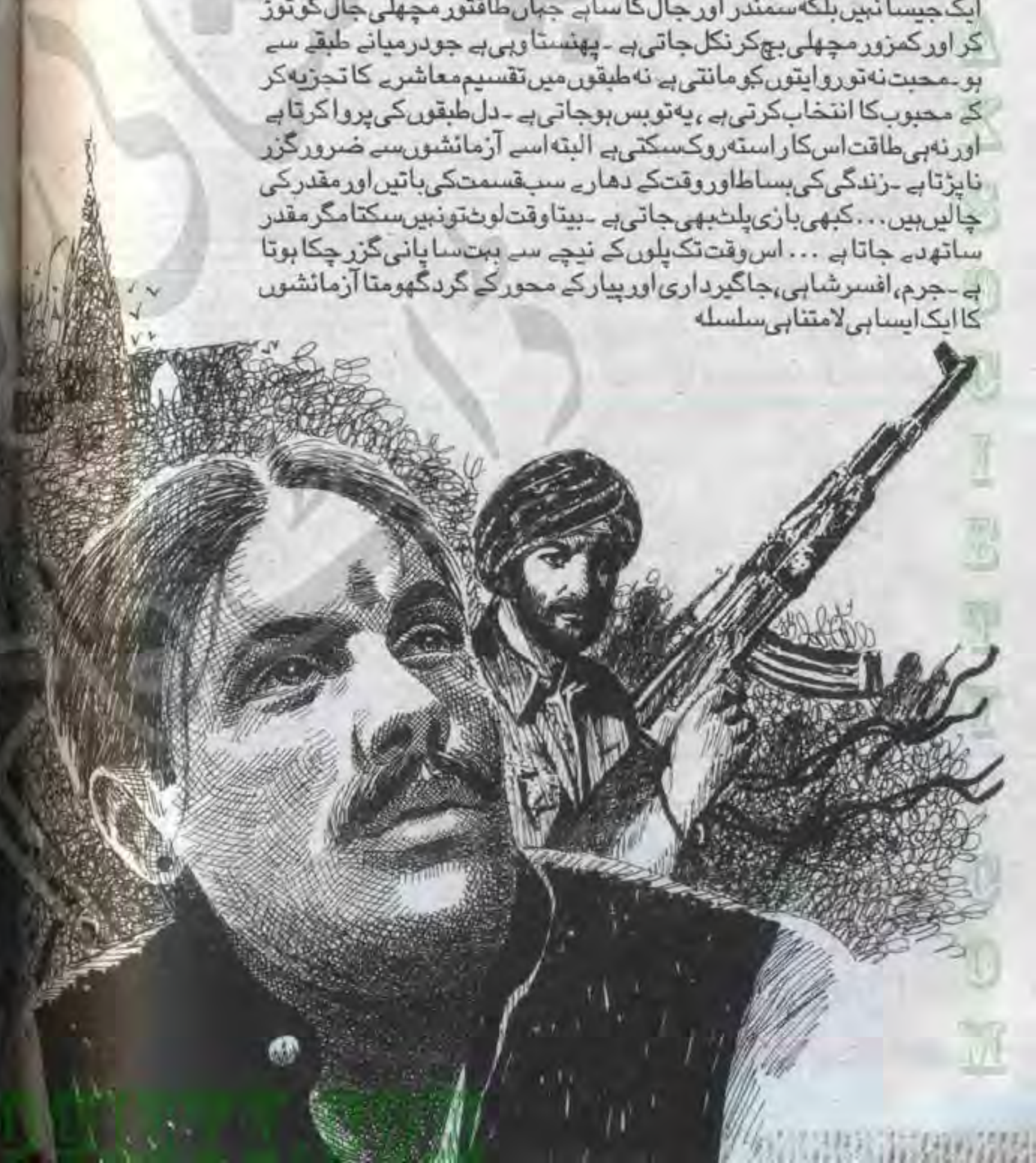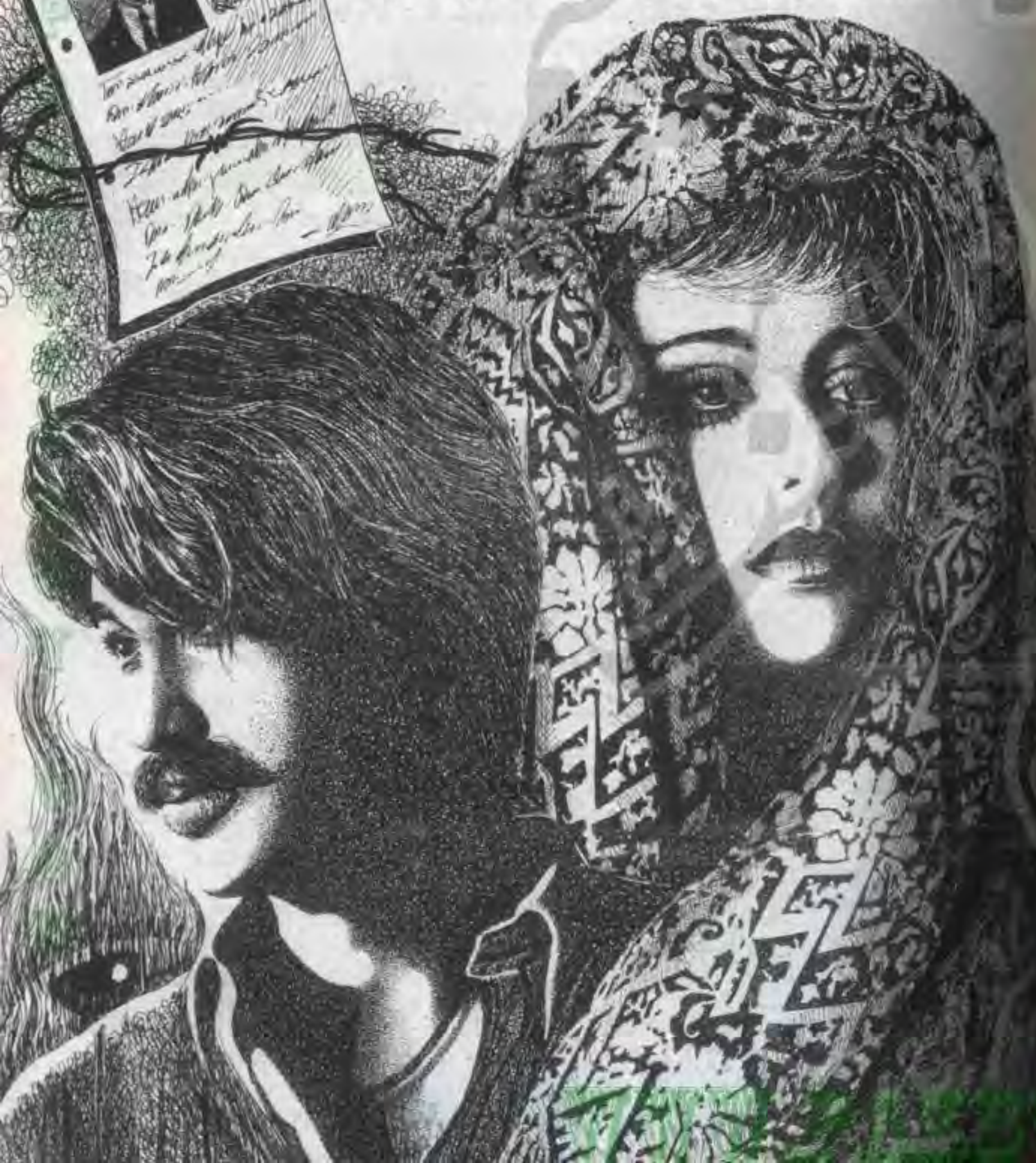
اس کی لاش کو لاوارثوں میں شامل کرنے کا حکم دیتا ہے۔ ادھر باریا کی ماں سلیتھیا جوزف ورما سے انتقامی کارروائی کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ شہریار اللہ [illegible] نورپور روڈ کے لیے نکلتا ہے۔ اس کی گاڑی کو بم سے اڑا دیا جاتا ہے لیکن وہ محفوظ رہتا ہے۔ شہریار کو کرنل توحید اپنی فورس میں شامل ہونے کا کہتے ہیں۔ شہریار فورس میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ شہریار کی شناخت چھپانے اور فورس میں آزادانہ کام کرنے کے لیے طے ہوتا ہے کہ شہریار کے [illegible] ایکسیڈنٹ کی افواہ پھیلائی جائے گی۔ شہریار، ماہ بانو اور اسلم کو امریکا بھجوا دیتا ہے۔ شہریار انڈر گراؤنڈ ہو جاتا ہے اور اس کی ٹریننگ اور حلیے میں تبدیلی کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ کشور اور آفتاب بھی نیویارک پہنچ جاتے ہیں مگر وہاں ایک شاپنگ سینٹر میں ان کی ملاقات مراد شاہ سے ہو جاتی ہے۔ ادھر شہریار کے کہنے پر ذیشان سی ایف پی کے نوجوان کو خواجہ سراؤں کے گروہ میں شامل ہونے کے لیے بھیجتا ہے۔ جاوید علی نامی سی ایف پی کا نوجوان خواجہ سراؤں میں شامل ہو کر کراچی نوازش علی نامی شخص کی کوٹھی میں پہنچ جاتا ہے۔ وہاں تمام ملازم خواجہ سرا تھے۔ وہاں جاوید علی کو پتا چلتا ہے کہ شالنی کسی چکر میں ملوث ہے۔ وہ ہیڈ کوارٹر رپورٹ کرتا ہے اور شالنی کے آدمی اسلحے سمیت پکڑے جاتے ہیں تاہم شالنی کو گرفتار کرنے کے بجائے اس کی نگرانی شروع کر دی جاتی ہے۔ جاوید علی ہیڈ کوارٹر رپورٹ کر رہا ہوتا ہے کہ نوازش علی کی بیٹی شاز مین اس کی گفتگو سن لیتی ہے۔ شالنی پکڑے جانے والے مال کے بارے میں ورما کو وضاحت دیتی ہے۔ وہ کراچی فون کر کے رنجنی پر نظر رکھنے کی ہدایت کرتی ہے۔ ورما اس کی گفتگو سن لیتا ہے اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ ورما اپنا ٹھکانا چھوڑ دیتا ہے مگر سی ایف پی کا اہلکار اس کا پیچھا کرتا ہے اور اس کے نئے ٹھکانے تک پہنچ جاتا ہے۔ ادھر جاوید علی شاز مین سے معلومات حاصل کرتا ہے۔ نوازش علی کی کوٹھی پر آپریشن کیا جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں وہاں موجود انتہا پسند کوٹھی کو بارودی مواد سے اڑا دیتے ہیں۔ جاوید علی شدید زخمی ہو کر اسپتال پہنچ جاتا ہے جبکہ نوازش علی زندگی کی بازی ہار جاتے ہیں البتہ شاز مین اور اس کی دونوں والدہ محفوظ رہتی ہیں۔ ادھر شہریار، ورما کے ٹھکانے پر پہنچ کر اسے قابو کر لیتا ہے۔ شاز مین دارالامان پہنچ جاتی ہے۔ وہ جاوید علی سے ملنے کے لیے اسپتال جاتی ہے۔ راوالے شاز مین کی گاڑی کا پیچھا کرتے ہیں اور اسپتال سے واپسی میں اسے اغوا کر لیتے ہیں۔ سنتھیا، شاز مین سے پوچھ گچھ کرتی ہے اور کسی واضح صورتِ حال سے آگاہ نہ کرنے پر اس پر جسمانی تشدد کا حربہ آزماتی ہے۔ پھر اس کو ایک مردہ سمجھ کر سنسان جگہ پھنکوا دیا جاتا ہے تاہم شاز مین بچ جاتی ہے اور اسپتال میں طبی امداد کے بعد اس کی حالت بہتر ہو جاتی ہے مگر شاز مین وہاں خودکشی کر لیتی ہے۔ مراد شاہ، کشور اور آفتاب کو کھانے پر گھر بلاتا ہے۔ وہاں اچانک واپسی پر اس کا کشور سے سامنا ہو جاتا ہے اور وہ غصے سے پاگل ہو جاتا ہے مگر مراد شاہ، کشور کو چودھری سے بچاتا ہے۔ ادھر شہریار کو ایکٹو کر دیا جاتا ہے اور اسے سلو والے مشن پر کراچی بھیجا جاتا ہے۔ چودھری کشور اور آفتاب کو ٹھکانے لگانے کے لیے کرائے کے آدمیوں کا سہارا لیتا ہے۔ تاہم وہ بچ جاتے ہیں اور انہیں مارنے کی نیت سے آنے والے لوگ پکڑے جاتے ہیں۔ سلو، وزیرِ اعلیٰ کے بیٹے کی دعوتِ ولیمہ میں... ایک اہم شخصیت کو مارنے کی کوشش کرتا ہے تاہم اسے گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ ادھر مشا برم خان کی والدہ انتقال کر جاتی ہیں اور اس کی شادی گل سے ہو جاتی ہے۔ شہریار کو بھارت ایک اہم مشن پر بھیجنے کا فیصلہ ہوتا ہے جہاں سے اسے ڈاکٹر فرحان نامی شخص کو رہا کرانے کا مشن سونپا جاتا ہے۔ سلو کو سی ایف پی والے جیل سے نکال کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ سلو کو شہریار کے پاس پہنچا دیا جاتا ہے۔ شہریار اسے اپنے مقاصد سے آگاہ کرتا ہے اور سلو شہریار کے ساتھ مشن پر جانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ اسمگلروں کے ایک قافلے کے ساتھ غیر قانونی سرحد عبور کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ سلو اور شہریار دہلی پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں ان کے مددگار ان کے حلیے میں تھوڑی بہت تبدیلی کرتے ہیں۔ انہیں اب اپنی دستاویزات بنوانی تھیں۔ جاوید علی، رائے چند نامی ہندو کے خلاف کارروائی کرتا ہے جو مہیندرا کا ایجنٹ ہوتا ہے۔ ادھر سلو اور شہریار ایک ہوٹل میں کھانا کھانے جاتے ہیں۔ وہاں ایک لڑکی کی عزت بچانے میں ان کا جھگڑا اناور نامی بدمعاش سے ہو جاتا ہے۔ وہ وہاں سے نکل کر اپنے مددگاروں کے ذریعے ایک سرائے میں ٹھہر جاتے ہیں۔ وہ سونے کے لیے لیٹتے ہیں کہ دروازے پر دستک ہوتی ہے اور وہاں پولیس پہنچ جاتی ہے..... پولیس وہاں ڈکیتوں کی تلاش میں آتی ہے اور ڈکیتوں کو گرفتار کر کے چلی جاتی ہے۔ جاوید علی، رائے چند سے حاصل شدہ معلومات کے مطابق ایک مساج سینٹر میں پہنچتا ہے۔ وہاں اسے عالیہ نامی عورت ملتی ہے جو مہیندرا کی ایجنٹ ہوتی ہے۔ جاوید علی کے ساتھی وہاں آپریشن کرتے ہیں اور اس عورت کو اٹھا لاتے ہیں۔ ادھر سلو اور شہریار کو کچھ لوگ اٹھا لے جاتے ہیں تاہم اندو نامی لڑکی کی مدد سے وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اندو انہیں دوبارہ دہلی کی ٹرین میں سوار کروا دیتی ہے لیکن وہ بیچ راستے میں اتر جاتے ہیں۔ وہ ایمبولینس کے ڈرائیور کو قابو کرتے ہیں مگر ایک شخص اچانک ان پر گن تان لیتا ہے۔ ان کے ساتھ ہی موجود ہائی روف گاڑی میں سوار مسلح افراد کے ہتھیاروں کی نالیں ان کی طرف اٹھی ہوتی ہیں۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

"دیکھ بھائی، ادھر ہمارا کسی سے کوئی لفڑا نہیں ہے۔ ہم اپنے کام سے جا رہے ہیں تو اپنا راستہ لے۔" وہ دونوں ہی اسلحہ دیکھ کر ڈر جانے والے نہیں تھے لیکن غیر متوقع مصیبت سر پر ٹوٹ پڑنے پر تھوڑے سے ٹپٹا گئے۔

"مجھے کیا کرنا ہے، میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تمہارے لیے بہتر ہے کہ اپنا منہ بند کر کے بیٹھو۔" ٹرین میں انہیں بڑے ادب سے اپنی خدمات پیش کرنے والا بیرا اس وقت یکسر بدل چکا تھا اور خوفناک تیور سے پیش آ رہا تھا۔

"اگر تجھے پتا ہے کہ تجھے کیا کرنا ہے تو ہم کو بھی تو پتا ہے کہ ہم کو کیا کرنا ہے۔ تیرے ساتھ جا کر اپنا ٹائم کیوں خراب کریں گے۔" سلو پر اس کے خوفناک انداز کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا اور وہ اپنی ہی ہانکے جا رہا تھا۔ شاید وہ اسے طیش دلا کر ایسا کوئی موقع تلاش کرنا چاہتا تھا جب اس پر ہاتھ ڈالا جائے لیکن شہریار دیکھ رہا تھا کہ موجودہ صورتِ حال میں یہ عملی طور پر ممکن نہیں ہے۔ اگر وہ ایمبولینس میں اس بیرے پر ہاتھ ڈالنے میں کامیاب بھی ہو جاتے تو ایمبولینس کے ساتھ ساتھ دوڑتی گاڑی میں سوار مسلح افراد کا کیا کرتے جن کی گنوں کے رخ انہی کی طرف تھے۔ ہائی روف میں سوار ان بندوں کی

جائزہ لیتے ہوئے اسے یکدم ہی احساس ہوا کہ ایمبولینس کے ساتھ بھی واحد گاڑی نہیں دوڑ رہی بلکہ پیچھے ایک پولیس جیپ بھی موجود ہے۔ یہ بڑی نازک صورتِ حال تھی اور وہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ ان سے ایسی کون سی غلطی ہوئی ہے جو ایمی نگر میں اترتے ہی انہیں پولیس نے گھیر لیا ہے۔ البتہ یہ طے تھا کہ جو بھی گڑبڑ تھی، اس کا آغاز ممبئی سے ہی ہو گیا تھا اور ان کے کوپے میں خدمات فراہم کرنے والے بیرے کو بطورِ خاص ان کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ مطلب صاف تھا کہ وہ بیرا نہیں بلکہ بیرے کا سوانگ بھر کر ان کی نگرانی کر رہا تھا۔ اپنے پیچھے آتی پولیس جیپ کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا بھی مشکل نہیں تھا کہ کسی وجہ سے وہ قانون کی نظر میں آ گئے ہیں۔

ایمبولینس کے ساتھ چلتی ہائی روف میں سوار مسلح افراد اگرچہ سادہ پوش تھے پھر بھی ان کی وضع قطع دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ پولیس کے محکمے سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔

موجودہ صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے اس کا ذہن بہت تیزی سے حالات کا تجزیہ کر رہا تھا۔ انہیں اندو نے ممبئی سے دہلی جانے والی ٹرین کے پہلے سے بک کوپے میں سوار کروایا تھا اس لیے یہ قیاس کیا جا سکتا تھا کہ وہ بیرا اسی کا آدمی تھا اور ان کے ٹرین سے اترتے ہی خود بھی پیچھے اتر گیا تھا۔

اگر وہ تنہا ان کے مقابل آتا، تب بھی شہریار اتنی بری طرح نہ چونکتا لیکن یہاں تو صورتِ حال یہ تھی کہ ایمبولینس کے اسٹیشن پہنچنے کے مختصر عرصے میں نہ صرف اس نے پولیس کی مدد حاصل کر لی تھی بلکہ خود بھی ذاتی طور پر انہی کی ایمبولینس میں گھس بیٹھا تھا۔ اتنی تیزی سے یہ سب کر لینا کسی عام شخص کے بس کی بات نہیں ہو سکتی تھی۔ اندو نے اپنا تعلق کسی اشوک صاحب کے گینگ سے بتایا تھا لیکن اسے نہیں لگتا تھا کہ ممبئی کے ایک غنڈے کی اتنی پہنچ ہو گی کہ وہ وہاں سے دور گاندھی نگر میں اتنا بہترین انتظام کر سکے اور پھر کسی گینگ سے تعلق رکھنے والے فرد کو اس کی ضرورت بھی کیا تھی۔ ایسے گینگ جو بھی قدم اٹھاتے ہیں، اپنے مفادات کی خاطر اٹھاتے ہیں اور ظاہر ہے سلو اور شہریار دونوں کا ان سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ چنانچہ اس کے ذہن میں رہ رہ کر یہ خیال کسی [illegible] سانپ کی طرح سنسنا رہا تھا کہ اندو وہ نہیں جو اس نے خود کو ان کے سامنے ظاہر کیا تھا۔ وہ شاید کسی خفیہ ادارے سے تعلق رکھتی تھی اور اپنے آدمیوں کی مدد سے بہت آسانی سے انہیں گھیر چکی تھی۔

"تیری ماں کی..." وہ ایمبولینس کے ساتھ اور پیچھے دوڑتی گاڑیوں کا جائزہ لیتے ہوئے حالات کا تجزیہ کرنے میں مصروف تھا کہ سلو نے ایمبولینس کے اندر کارروائی ڈال دی اور جانے کس ترکیب سے اپنے سر پر سوار بیرے سے اس کی گن چھیننے میں کامیاب ہو گیا۔ خود شہریار تو بس لمحہ بھر کی ہلچل کو محسوس کرنے کے ساتھ بیرے کے منہ سے نکلنے والی گالی ہی سن سکا اور اب حالات یہ تھے کہ بیرے کی اپنی گن کی نال اس کے سر سے لگی ہوئی تھی۔ سلو کی اس پھرتی پر جہاں وہ ششدر رہ گیا، وہیں ساتھ دوڑتی ہائی روف میں سوار افراد کے تیور بھی بگڑ گئے۔

"اسے چھوڑ دے ورنہ کتے کی موت مارا جائے گا۔" ان میں سے ایک نے چیخ کر دھمکی دی۔

"اپنی گاڑیاں یہاں سے دور لے جاؤ ورنہ میں اس کا بھیجا اڑا دوں گا۔" دھمکی سے خائف ہونے کے بجائے سلو نے جوابی دھمکی دی اور اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے بیرے کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر کھینچتے ہوئے اس کی کنپٹی پر گن کا دباؤ بڑھایا۔ اس کے اس انداز پر نہ صرف بیرے کا چہرہ متغیر ہوا بلکہ ہائی روف سواروں کے چہروں پر بھی تذبذب کی کیفیت نظر آنے لگی اور یوں محسوس ہوا کہ وہ فیصلہ نہ کر پا رہے ہوں کہ اب انہیں کیا کرنا چاہیے۔

"یہ تم اپنے لیے اچھا نہیں کر رہے ہو۔ اگر تم نے مجھے مار بھی دیا تو اس شہر سے باہر نہیں نکل پاؤ گے۔ پولیس ہر ایگزٹ پر ناکا لگا دے گی۔" بیرے نے سلو کو دھمکی آمیز انداز میں سمجھایا۔

شہریار خود بھی کسی حد تک اس سے متفق تھا لیکن اب جبکہ سلو قدم اٹھا چکا تھا تو اس کا ساتھ دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ یوں بھی وہ جس صورتِ حال میں گھرے ہوئے تھے، ان کے لیے آگے کھائی اور پیچھے کنواں والا معاملہ تھا۔ اگر ابھی گرفتار ہو کر پولیس کے کسی ٹھکانے پر پہنچ جاتے تو بھی پولیس نے ان کے ساتھ کوئی معزز مہمانوں والا برتاؤ نہیں کرنا تھا۔ چنانچہ ان کے شکنجے سے نکلنے کے لیے ایک کوشش کر لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ اپنا پسٹل تو پہلے ہی اس کے ہاتھ میں تھا جسے وہ کچھ دیر قبل ایمبولینس کے ڈرائیور کو دھمکانے کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ اب دوبارہ اس نے اس سے یہی کام لینا شروع کر دیا اور غراتی ہوئی آواز میں بولا۔ "تمہیں گاڑی کسی صورت نہیں روکنی ہے۔ اسے چلاتے رہو اور شہر سے باہر جانے والے راستے کی طرف چلو۔"

"ٹھیک ہے جناب۔" ڈرائیور گھگیایا۔ ادھر سلو ایمبولینس سے جونک کی طرح چمٹے پولیس اہلکاروں سے نمٹ رہا تھا۔

"دس تک گننے تک اگر تم لوگوں نے ہمارا پیچھا نہ چھوڑا تو میں انجام کا سوچے بغیر اس کا بھیجا اڑا دوں گا۔" دھمکی دینے کے ساتھ ہی وہ بلند آواز میں گنتی گننے لگا۔ ہائی روف، ایمبولینس سے اتنی قریب چل رہی تھی کہ یقیناً اس میں سوار لوگ سلو کی گنتی کو سن سکتے تھے۔

"پیچھے ہٹ جاؤ۔ میں ابھی زندہ رہنا چاہتا ہوں۔" کنپٹی سے لگی گن کے بڑھتے دباؤ کے ساتھ وہ صرف چھ تک گنتی برداشت کر سکا اور چیخ کر اپنے ساتھیوں سے بولا۔ اس کی چیخ کا خاطر خواہ اثر ہوا اور ہائی روف کی رفتار کم ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ہی پولیس جیپ نے بھی اپنی رفتار گھٹا دی۔ چند منٹوں میں ایمبولینس اتنی آگے بڑھ چکی تھی کہ دونوں گاڑیاں ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ اس طرف سے تھوڑا اطمینان ہوا تو شہریار پیچھے سے کود کر اگلی سیٹ پر چلا گیا۔ ڈرائیور جو پہلے ہی خوف زدہ تھا، اس نے اسے اپنے برابر میں بیٹھا دیکھا تو خوف سے اس کی گھگھی بن گئی۔

"میں غریب ڈرائیور ہوں صاحب! میرا کسی سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ آپ کو جہاں جانا ہے جاؤ، مجھے یہیں اتار دو۔" اس نے تقریباً روتے ہوئے شہریار سے التجا کی تو اسے اس پر رحم آ گیا۔ وہ غیر متعلقہ اور بے قصور آدمی تھا اور خوامخواہ اس مسئلے میں پھنس گیا تھا۔ انہوں نے وقتی طور پر تو بے شک پولیس والوں سے پیچھا چھڑا لیا تھا لیکن کچھ بھروسا نہیں تھا کہ شہر سے نکلنے کی کوشش میں وہ کسی ناکے پر دھر لیے جاتے۔ نکلتے بھی تو خاصی مارا ماری کے بعد اور اس چکر میں اگر وہ بے چارہ ڈرائیور زد میں آ جاتا تو جانے پیچھے اس کے گھر والوں پر کیا گزرتی۔ وطن اور مذہب کی تفریق سے قطع نظر وہ ایک انسان تھا۔ وہ بھی بے قصور و بے ضرر انسان جو جانے کتنے افراد کے کنبے کی کفالت کا ذمے دار تھا۔ اسے اس شخص کو اس جھگڑے سے الگ کر دینا ہی مناسب معلوم ہوا اور وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "گاڑی روکو۔" ڈرائیور نے فوراً اس کے حکم کی تعمیل کی۔

"نیچے اتر جاؤ۔" اس نے دوسرا حکم صادر کیا جس کی ڈرائیور نے پہلے سے بھی زیادہ پھرتی سے تعمیل کی۔ اس کے اتر کر دروازہ بند کرنے تک شہریار اس کی جگہ سنبھال چکا تھا۔ گاڑی ایک بار پھر چل پڑی۔ ایمبولینس ہونے کی وجہ سے اسے بہت اچھے حال میں رکھا گیا تھا اور زیادہ رفتار پر بھی وہ بڑی سبک روی سے چل رہی تھی۔

"تم اپنے ساتھ اچھا نہیں کر رہے ہو۔ ہم تمہیں صرف معمول کی پوچھ گچھ کے لیے لے جا رہے تھے لیکن تم نے اپنی حرکتوں سے ثابت کر دیا ہے کہ تم خطرناک مجرم ہو اور اب میرے ساتھی تم سے سختی کے ساتھ نمٹیں گے۔" سلو کی گن سے سانس لیتے بیرے نے انہیں دھمکی دی۔

"ہمارے ساتھ جو بھی ہو لیکن اس سے پہلے ہم تجھے نرگ میں پہنچا کر چھوڑیں گے۔" اس کی دھمکی سے خوف زدہ ہوئے بغیر سلو نے اسے اس کے انجام سے باخبر کیا۔

"ویسے تم جھوٹ خوب بولتے ہو نقلی بیرے صاحب۔ معمول کی پوچھ گچھ کے لیے اتنا کھڑاگ کون پھیلاتا ہے... اور تم تو ممبئی سے ہماری نگرانی کر رہے ہو۔ تم تو بس یہ بتاؤ کہ اس جرنلسٹ لڑکی اندو نے ٹپ دے کر تمہیں ہمارے پیچھے لگایا ہے یا وہ خود بھی تمہاری ساتھی یا باس ہے؟" اس بار ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان شہریار نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔ اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں ملا۔

"سنا نہیں بڑے بھائی نے تجھ سے کیا پوچھا ہے؟" سلو نے اس کی گدی پر زوردار ہاتھ مارتے ہوئے اس سے کہا۔

"تم اتنی آسانی سے مجھ سے کچھ معلوم نہیں کر سکتے۔" اس نے نفرت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

"کوئی بات نہیں، ہمیں مشکل کام کرنے میں مزہ آتا ہے۔" سلو نے اسے ایک اور ہاتھ دے مارا۔

"ذرا شانتی سے کام لے یار۔ ابھی اس کی ضرورت ہے۔" شہریار نے اسے ٹوکا۔ اس بندے کو ساتھ رکھ کر وہ بس حفاظت سے یہاں سے نکل جانے کا خواہش مند تھا۔ خوامخواہ کی مار دھاڑ اور خون خرابا بیکار تھا اور وہ اپنی توجہ اصل مقصد، یعنی ڈاکٹر فرحان جمیل کی بازیابی پر مرکوز رکھنا چاہتا تھا۔ سیدھی سڑک پر گاڑی دوڑاتے ہوئے اس کی خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طرح یہاں سے نکل جائے۔ ابھی تک کوئی رکاوٹ سامنے آئی بھی نہیں تھی۔ وہ شہر کے نقشے سے ناواقف تھے لیکن ڈرائیور کو اتارنے سے قبل اس سے فرمائش کر چکے تھے کہ شہر سے باہر جانے والے راستے پر چلے۔ ڈرائیور کو اتارنے کے بعد بھی وہ اسی سمت میں گاڑی دوڑا رہا تھا۔ خوش قسمتی سے یہ ایک ایسی سڑک تھی جو بالکل سیدھی سیدھی چلتی جا رہی تھی اور ابھی تک اس پر ایسا کوئی دوراہا نہیں آیا تھا کہ اسے تذبذب کا شکار ہونا پڑتا۔ سڑک کے اطراف میں آبادی بھی نہیں تھی۔ بس کہیں کہیں چھوٹے کھیت یا باغ نظر آ جاتے تھے ورنہ زیادہ تر زمین ویران پڑی تھی۔ اس ویرانے میں سفر کرتے ہوئے اچانک ہی ایمبولینس کو ایک زوردار دھچکا لگا اور فضا کان پھاڑ دینے والے دھماکے سے گونج اٹھی۔ پہلے

دھماکے کے بعد اگلے سیکنڈ میں ہی دوسرا دھماکا بھی سنائی دے گیا اور ایمبولینس بری طرح لہرانے لگی۔ سلو کی گن بیرے کی کنپٹی سے ہٹ گئی۔ اس نے موقع کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور نال پکڑ کر اس زور سے کھینچی کہ گن سلو کے ہاتھ سے نکل گئی۔ اس دھینگا مشتی کے نتیجے میں ایک فائر بھی ہوا لیکن کسی کو بھی نقصان پہنچائے بغیر گولی ایمبولینس کی باڈی میں ہی کہیں پیوست ہو گئی۔ بیرے نے قابلِ ستائش پھرتی سے کام لیتے ہوئے گن کو سیدھا کیا اور نال سلو کے پہلو سے لگا دی۔

"بس اب تمہارا کھیل ختم۔" نال کو اس کے پہلو میں چبھوتے ہوئے وہ بُری طرح غرایا۔ اس موقع پر شہریار، سلو کی مدد کرنا چاہتا تھا لیکن پہلے تو وہ پے در پے پھٹنے والے دو ٹائروں کی وجہ سے ڈگمگاتی ایمبولینس کو سنبھالنے میں الجھ گیا اور جب اسے روکنے میں کامیاب ہوا تو دس بارہ کے قریب افراد کہیں سے نکل کر سڑک پر امڈ آئے۔ وہ سارے کے سارے مسلح تھے اور انہوں نے پل بھر میں ایمبولینس کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔

"تم دونوں اپنے ہاتھ سر پر رکھ کر نیچے اتر آؤ۔ اگر اب کسی بدمعاشی کی کوشش کی تو سر سے لے کر پیر تک پورے جسم میں چھید کر دیں گے۔" مسلح افراد میں سے ایک نے خوفناک غراہٹ کے ساتھ احکامات جاری کیے۔ ان کے پاس اس کے حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ سلو کے پہلو سے پہلے ہی ایک گن کی نال لگی ہوئی تھی۔ شہریار نے گاڑی سے اترنے میں پہل کی۔ پچھلے حصے میں موجود سلو اور بیرا ابھی حرکت میں آئے۔ مسلح افراد میں سے ایک نے پہلے ہی پیچھے سے ایمبولینس کا ڈھکن نما دروازہ کھول دیا تھا۔ سلو جیسے ہی اس کے کنارے پر پہنچا، پیچھے سے بیرے نے اسے ایک زوردار لات رسید کی۔ وہ اڑتا ہوا منہ کے بل سڑک پر جا گرا لیکن کوشش کر کے چہرہ سڑک سے ٹکرانے سے روک لیا۔ پھر بھی اسے کافی چوٹیں برداشت کرنی پڑیں۔ ہتھیلیوں اور گھٹنوں پر سڑک سے لگنے والی رگڑ کے علاوہ بائیں ہتھیلی میں گھپ جانے والی کیل کی نوک نے اسے اچھا خاصا زخمی کر دیا تھا۔ بہرحال وہ سخت جان تھا اس لیے منہ سے کوئی کراہ یا سسکی نہ نکلنے دی اور ضبط سے وہ تکلیف سہہ کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

اسے چبھنے والی کیل کے علاوہ بھی سڑک پر جا بجا بہت سی کیلیں پھیلی ہوئی تھیں اور یقینی طور پر ایمبولینس کے ٹائروں کو پھاڑنے کا سبب بنی تھیں۔ یہ تو واضح ہی تھا کہ ان کیلوں کو سڑک پر انہی مسلح افراد نے پھیلایا تھا جو انہیں گھیرے کھڑے تھے۔ ان مسلح افراد میں سے کئی کے جسموں پر پولیس کی یونیفارم موجود تھی اور قیاس کیا جا سکتا تھا کہ یہ وہی لوگ تھے جن سے انہوں نے کچھ دیر پہلے جان چھڑائی تھی۔ علاقہ شناس ہونے کی وجہ سے انہوں نے بہت آسانی سے کسی دوسرے راستے سے سامنے سے آ کر انہیں گھیر لیا تھا۔ وہ بھی ایسی کامیابی سے کہ ان دونوں کو ہاتھ پیر ہلانے تک کا موقع نہیں ملا تھا۔

"آگے بڑھو۔" ان دونوں کو حکم دیا گیا اور چند فٹ کا فاصلہ پیدل چلایا گیا۔ آگے پہنچ کر انہیں اندازہ ہوا کہ آگے ایک ذیلی سڑک آ کر اس سڑک سے مل رہی ہے۔ پولیس والوں نے وہیں سے آ کر انہیں سامنے سے گھیرا تھا۔ مقامی ہونے کا اتنا ایڈوانٹیج تو انہیں حاصل ہی تھا اور وہ انجان ہونے کی وجہ سے بری طرح پھنس گئے تھے۔ ذیلی سڑک پر پولیس والوں کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ انہیں ایک گاڑی میں بیٹھنے کا حکم دیا گیا اور بیٹھتے ہی ان کے چہروں پر ایک پھوار سی پڑی۔ وہ کیا شے تھی، انہیں سوچنے کی فرصت نہیں ملی اور وہ بے ہوش ہو گئے۔ ہوش و حواس سے بیگانہ ان کے جسموں کو کس انجانی جگہ پر منتقل کیا جا رہا تھا۔ یہ تو شاید انہیں آنکھ کھلنے کے بعد بھی مشکل ہی سے پتا چلتا۔

☆☆☆

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟ کون ہو تم اور اس طرح مجھے یہاں لانے کا کیا مقصد ہے؟" عالیہ کو ہوش آیا تو اس نے اپنے سامنے بیٹھے جاوید علی کو گھورتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"اپنا تعارف تو میں پہلے ہی کروا چکا ہوں۔ یہاں لانے کا مقصد یہ سمجھ لو کہ ہم تمہیں کرنل توحید کے نزدیک لے آئے ہیں۔ تم بہت بے چین تھیں نا ان کے لیے... تو مجھے تمہاری اس بے قراری پر رحم آ گیا۔" جاوید علی نے سفاک مسکراہٹ کے ساتھ اس کے سوال کا جواب دیا۔

"بکواس مت کرو۔ مجھے تمہاری نیت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ کیا چاہتے ہو تم مجھ سے؟" وہ جاوید علی کی مسکراہٹ سے نروس ضرور ہوئی لیکن کسی نہ کسی طرح خود پر قابو پا لیا اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ وہ اس سے خوف زدہ نہیں ہے۔

"نیت کی خرابی سے اگر تمہارا مطلب ہے کہ میں تمہارے بکاؤ جسم کے چکر میں ہوں تو اس خوش فہمی کو دل سے نکال دو۔ تمہارے بے شمار بار استعمال شدہ جسم میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" اس نے عالیہ پر صورتِ حال واضح کی۔

"تم پولیس والے بھی نہیں لگتے... پھر کون ہو؟" وہ جس کاروبار میں ملوث تھی، اس میں پولیس سے مستقل واسطہ

پڑ تا رہتا تھا اس لیے اس کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ پولیس کی تحویل میں نہیں ہے۔ اس کے بعد ذہن میں ایک ہی خیال رہ جاتا تھا۔ کوئی خفیہ ادارہ... اور ظاہر ہے، یہ ایک اندوہناک خیال تھا اس لیے وہ اچھی خاصی گھاگ ہونے کے باوجود لرزیدہ تھی۔

”میں جہنم کا داروغہ ہوں اور اس وقت تمہارا اعمال نامہ اپنے ہاتھوں میں لیے بیٹھا ہوں۔ مساج سینٹر کے نام پر جاری شرمناک کاروبار کے ساتھ تم جتنی مکاری سے میری قوم کے جوانوں کی رگوں میں زہر اتار رہی تھیں، وہ قطعی قابلِ معافی نہیں ہے۔ ہاں اگر تم اپنے لیے ذرا نرم سزا کا انتخاب کرنا چاہتی ہو تو مجھے اپنے کاروبار کی ساری تفصیل سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ سیدھی طرح یہ بتا دو کہ تمہاری ڈوریاں کس کے ہاتھ میں ہیں؟“ اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔

”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں کسی کی آلۂ کار نہیں ہوں۔ مساج سینٹر میڈم دیبا کا ہے اور وہاں وہی کچھ ہوتا ہے جو وہ چاہتی ہیں۔ میں صرف ایک ملازمہ ہوں اور کسی غلط کام میں ملوث نہیں ہوں۔“ اس نے اپنے خشک ہوتے لبوں کو زبان پھیر کر تر کرتے ہوئے ایک بار پھر خود کو معصوم ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

”لیکن تم نے تو خود میرے سامنے اعتراف کیا تھا کہ تم میڈم دیبا کی پارٹنر ہو۔“ جاوید علی نے اسے گھیرا۔

”وہ تو میں نے بس ایسے ہی تمہارے سامنے شو مارنے کی کوشش کی تھی۔“ وہ پھر بھولی بنی۔

”میرا خیال ہے عالیہ بیگم کہ میں تم پر صورتِ حال کو اچھی طرح واضح کر دوں تاکہ تم بیکار جھوٹ بول کر اپنا اور میرا وقت ضائع نہیں کرو۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تم پورے آٹھ گھنٹے بعد ہوش میں لائی گئی ہو اور ظاہر ہے ان آٹھ گھنٹوں میں ہم ہاتھ پر ہاتھ دھر کر تو نہیں بیٹھے رہے تھے۔ اس عرصے میں ہم نے تمہارے پورے سینٹر کو ادھیڑ ڈالنے کے ساتھ ساتھ میڈم دیبا کی زبان بھی کھلوالی ہے۔ سینٹر میں موجود خفیہ کیمرے، مخربِ اخلاق فلموں اور نشہ آور ادویات سمیت سب کچھ ہمارے قبضے میں آچکا ہے۔ میڈم دیبا نے ہمارے سامنے اعتراف کیا ہے کہ مساج کے لیے استعمال ہونے والا مخصوص تیل تم ہی انہیں فراہم کرتی تھیں اور اس تیل کے لیبارٹری ٹیسٹ نے ثابت کر دیا ہے کہ اس میں ایک ایسا جز شامل تھا جو مساموں سے جسم میں سرایت کر کے جسم کو سرور کی کیفیت میں مبتلا کر دیتا تھا۔ اسی وجہ سے تمہارے مساج سینٹر میں آنے والے گاہک بار بار پلٹ کر تمہاری طرف آتے تھے حالانکہ ان میں سے کئی کو تم لوگ باقاعدہ بلیک میل کر رہے تھے۔ ہماری تحقیقات نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ تم منشیات کے جس دھندے میں ملوث ہو، میڈم دیبا کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ فحاشی اور بلیک میلنگ کے کاروبار میں تو تمہاری پارٹنر تھی لیکن اس دوسرے دھندے میں تم نے اسے شریک نہیں کیا تھا۔ اس کے ثبوت کے لیے اتنا کافی ہے کہ ہمیں وہاں سے ہیروئن اور دیگر نشہ آور اشیا کا جو اسٹاک ملا ہے، وہ تمہارے آفس کے خفیہ لاکر میں رکھا ہوا تھا جس کی چابی صرف اور صرف تمہارے ہی پاس ہوتی ہے۔ اب بتاؤ کہ ان حقائق کی موجودگی میں تم انجان یا معصوم بننے کی اداکاری کرنے کی جرأت کرو گی یا سچ بولو گی؟“ عالیہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اس نے بولنا شروع کیا تو اس کے ہر لفظ کے ساتھ اس کا رنگ پھیکا پڑتا چلا گیا۔

”اگر تمہارے ذہن میں اب بھی کوئی خوش فہمی ہے کہ تم کوئی جھوٹ بول کر اپنے ان تمام جرائم سے انکار کر سکو گی تو میں تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ رائے چند جسے تم غیر اخلاقی فلمیں اور ہیروئن فراہم کرتی تھیں، یہیں موجود ہے اور تمہاری تمام تر احتیاط کے باوجود تمہاری صورت سے ناآشنا نہیں۔ وہ تمہارے سامنے آکر تمہارے سارے جرائم گنوا سکتا ہے۔“ اس نے عالیہ کو یہ اطلاع فراہم کر کے گویا تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ رائے چند کی وہاں موجودگی کا سن کر وہ بالکل ڈھے گئی اور یکدم ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جاوید علی اس صورتِ حال پر شپٹا گیا۔ اس کے نزدیک وہ ایک تربیت یافتہ مجرم تھی اور وہ یہی سمجھتا تھا کہ اس سے حقائق اگلوانے میں اسے خاصی محنت کرنی پڑے گی اور تشدد کا سہارا بھی لینا پڑے گا لیکن اس نے تو کسی عام عورت کی طرح رونا دھونا شروع کر دیا تھا۔

”او میڈم! میرے پاس یہ ٹسوے دیکھنے کا ٹائم نہیں ہے۔ یہ رونا دھونا بند کرو اور میں جو پوچھ رہا ہوں وہ فٹافٹ بتاؤ۔“ چند لمحے اس کا رونا برداشت کرنے کے بعد اس نے جھنجلاہٹ کا اظہار کیا۔

”میں اپنی بدقسمتی پر رو رہی ہوں۔ یہ میری کالی قسمت ہی ہے جو مجھے جرم کی دنیا تک لے آئی ہے، ورنہ میرا باپ بہت عزت دار خاندان کا فرد تھا اور میں آج تک اس کے خاندان کی نیک نامی کو قائم رکھنے کے لیے اپنی عزت کو پامال کر رہی ہوں۔“ جاوید علی کی ڈانٹ سن کر اس نے ہچکیوں پر تو کسی طرح قابو پالیا لیکن بولی تو آواز بہر حال رندھی ہوئی تھی اور اس رندھی ہوئی آواز میں اس نے جو کچھ کہا تھا، وہ بہت مبہم تھا۔

”اگر تم کھل کر سب کچھ بتاؤ تو میں تمہاری بات سمجھ سکتا ہوں ورنہ تو میرا صرف ایک سوال ہے۔ تم مجھے اپنی ڈوریاں ہلانے والے آقاؤں کے نام پتے سے آگاہ کرو؟“ اس کے الفاظ سے کوئی نتیجہ نہ اخذ کر سکنے کی وجہ سے جاوید علی نے سخت لہجے میں وضاحت چاہی۔ اسے ایک شک یہ بھی تھا کہ عالیہ کوئی الٹی سیدھی کہانی سنا کر اس کا ذہن بھٹکانا چاہتی ہے اس لیے عورت کے سب سے بڑے ہتھیار کے سامنے بھی نرم نہیں پڑا تھا۔

”میں تمہارے اس سوال کا جواب بہتر طور پر دینے کے لیے اپنی داستان سنانا ضروری سمجھتی ہوں تاکہ تم میری پوزیشن کا درست اندازہ لگا سکو۔“ عالیہ نے تیزی سے خود کو سنبھال لیا۔

”ٹھیک ہے۔ تم بولنا شروع کرو۔ میں خود اندازہ لگاؤں گا کہ تمہاری داستان میں کتنی حقیقت ہے اور کتنا افسانہ۔“ آخرکار جاوید علی سننے کے لیے تیار ہو گیا اور ریلیکس موڈ میں بالکل ایزی ہو کر بیٹھ گیا۔ عالیہ کو ہاتھ پیر باندھ کر اس کے سامنے بٹھایا گیا تھا اس لیے اسے یہ اندیشہ قطعی نہیں تھا کہ وہ کوئی گڑبڑ کر کے یہاں سے نکلنے کی کوشش کر سکے گی۔ یوں بھی اس عمارت سے نکلنا اتنا آسان نہیں تھا۔ وہ یہاں خطرناک مجرموں کو لا کر ان سے پوچھ گچھ کرتے تھے تو سیکیورٹی کے انتظامات بھی اسی حساب سے کر رکھے تھے۔

”میری بربادی کی اس داستان کا آغاز اس وقت ہوا تھا جب میں اس دنیا میں بھی نہیں آئی تھی۔ یوں سمجھ لو کہ میں نے اپنے والد کے ایک غلط فیصلے کی سزا بھگتی ہے اور وہ غلط فیصلہ تھا میری ماں سے شادی کرنا۔ میرے والد ایک نواب خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور کسی ڈپلوما کے لیے جاپان گئے تھے۔ وہاں ان کی میری ماں سے دوستی ہو گئی اور یہ دوستی اس حد تک بڑھی کہ دونوں نے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ وہ شادی کر کے میری ماں کو اپنے ساتھ پاکستان لائے تو خاندان کے بزرگوں نے انہیں بطور بہو قبول نہیں کیا اور والد صاحب کو جائداد میں سے حصہ دینے کے بعد ان سے قطع تعلق کر لیا۔ دولت اور محبت دونوں پاس تھیں اس لیے انہوں نے اس قطع تعلق کی پروا نہیں کی اور اپنی زندگی میں مگن ہو گئے۔ میری ماں جاپان میں کسی بہت خوش حال خاندان سے تعلق نہیں رکھتی تھی چنانچہ دولت اور آسائشات کی فراوانی دیکھی تو آپے سے باہر ہو گئی اور ہر اس بری عادت کو اپنا لیا جسے ایک مہذب

خاندان میں کسی صورت برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ نشے کی کثرت، غیر مردوں سے آزادانہ میل جول، جوا... بس یہی سب کچھ تھا جو اس کے دل کو بھاتا تھا اور وہ مجھ سمیت پاپا کو بھی فراموش کر چکی تھیں۔ پاپا کو اپنی مصروفیات میں ان کی اس روش کی ذرا دیر سے خبر ہوئی اور جب بعد میں انہوں نے ممی کو روکنے کی کوشش کی تو اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ اب جانے یہ محبت کی زیادتی تھی یا پاپا کی بزدلی کہ وہ اس بگڑی ہوئی عورت کو چھوڑنے کی ہمت نہیں کر سکے اور اپنا دھیان بٹانے کے لیے خود کو نشے میں غرق کر لیا۔ ان حالات میں میری ذات ہی سب سے زیادہ متاثر ہوئی اور میں ماں باپ دونوں ہی کی توجہ سے محروم ہو گئی۔ اگر معاملات صرف یہیں تک رہتے تو بھی شاید اتنی خرابی نہ ہوتی لیکن ہوا یوں کہ آوارہ تتلی کی طرح محفلوں میں گھومنے والی میری ماں چند ایسے لوگوں کی نظر میں آگئی جنہوں نے اپنے مفادات کے حصول کے لیے انہیں ایک بہترین ذریعہ سمجھا۔ وہ نہ جانے کن کن دھمکیوں اور سازشوں کے نتیجے میں میری ماں کو اپنے ڈھب پر لانے میں کامیاب ہو گئے اور انہیں وطن دشمن سرگرمیوں کے لیے استعمال کرنے لگے۔

”ممی کی فطرت میں ایک عجیب سا چلبلا پن تھا۔ پھر پاکستان ان کا آبائی وطن بھی نہیں تھا چنانچہ وہ آسانی سے ان لوگوں کے جال میں پھنس گئیں اور ان کے مفادات کے لیے کام کرنے لگیں۔ ممی ہی کی وجہ سے میں بھی ان کی نظروں میں آگئی اور انہوں نے صرف سولہ سال کی عمر میں میری عزت کو پامال کر کے مجھے اپنے لیے کام کرنے پر مجبور کر دیا۔ اگر میں انکار کرتی تو وہ میری شرمناک تصویریں اور موویز پورے شہر میں پھیلا دینے کی دھمکی دیتے اور میں ایسا نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ پاپا پہلے ہی ممی کی وجہ سے بہت دکھی ہیں اور اگر میرے حوالے سے ایسی کوئی بات سامنے آئی تو ان کے لیے یہ صدمہ ناقابلِ برداشت ہوگا۔ بس یوں میں عزت بچانے کے لیے بے عزت ہوتی رہی۔ ممی کی ذہنی حالت تو ایسی تھی کہ انہیں کوئی احساس ہی نہیں تھا۔ پاپا کو میں نے خود پتا نہیں چلنے دیا اور چپ چاپ اذیت سے گزرتی رہی۔ جب میری عمر بیس سال تھی تو ممی نشے کی زیادہ مقدار لینے کی وجہ سے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ اس کے چند دن بعد پاپا کے روڈ ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہو جانے سے ثابت ہو گیا کہ وہ اپنی بے وفا بیوی سے کتنی محبت کرتے تھے۔ بہر حال، ان دونوں کی زندگی کا قصہ تو ختم ہو گیا لیکن میں جس دلدل میں پھنس چکی تھی، اس سے نکلنے کی کوئی راہ سجھائی نہیں

دی۔ مدد مانگتی بھی تو کس سے؟ ماں باپ اپنی اپنی زندگیاں گزار کر دنیا سے جا چکے تھے اور جو خاندان تھا، وہاں جانے کی ہمت میں کر نہیں سکتی تھی کہ میرے صیاد مجھ سے پہلے میری ذلت کی داستان ان لوگوں تک پہنچا دیتے۔ تم خود ہی سوچو کہ وہ خاندان جس نے ایک غیر ملک اور مذہب کی عورت کو قبول نہیں کیا تھا، اس عورت کی داغ دار بیٹی کو کیسے قبول کرتا؟ بس یوں میں ان لوگوں کے اشاروں پر ناچتی چلی گئی۔

''دیا مساج سینٹر میں میری شراکت بھی انہی لوگوں کا فیصلہ تھا۔ میڈم دیا لالچی عورت ہے۔ اپنے مساج سینٹر سے وہ پہلے ہی فحاشی کے اڈے کا کام لے رہی تھی۔ میری شمولیت سے یہ کام ذرا جدید انداز پر ہونے لگا لیکن یہ حقیقت ہے کہ بلیک میلنگ کے دھندے کے علاوہ وہ بہت سے حقائق سے واقف نہیں تھی۔ میرے ذریعے مختلف پارٹیوں کو ہیروئن کی سپلائی کا تو اسے قطعی علم نہیں تھا لیکن بہرحال وہ کوئی شریف عورت نہیں ہے اور اس کی وجہ سے کئی لڑکیاں ذلت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو چکی ہیں۔ تم مجھے میرے جرائم کی جو بھی سزا دو، مجھے اس پر اعتراض نہیں ہوگا لیکن ساتھ ہی میں تم سے یہ بھی کہوں گی کہ میڈم دیا کو بھی کسی صورت معافی نہیں ملنی چاہیے۔'' وہ سب کہہ چکی تو خاموشی اختیار کر لی۔

''مجھے ان لوگوں کے نام پتے لکھواؤ جنہوں نے تمہیں اس دھندے میں پھنسایا۔ اس کے علاوہ ان کے بارے میں بھی بتاؤ جنہیں تم غیر اخلاقی فلمیں اور ہیروئن سپلائی کرتی رہی ہو؟'' اس کی داستانِ حیات پر کوئی تبصرہ کیے بغیر جاوید علی نے سنجیدگی سے پوچھا۔ جواب میں اس نے ایک طویل فہرست لکھوا ڈالی۔ فہرست میں کئی نام ایسے تھے جو معززین شہر میں شمار ہوتے تھے اور جن کے بارے میں گمان ہی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث ہوں گے۔

''تم نے مجھ سے کرنل توحید کے بارے میں جاننے کی کوشش کیوں کی تھی؟'' فہرست مکمل ہو گئی تو جاوید علی نے اس سے ایک اہم سوال کیا۔

''مجھے اوپر سے حکم ملا تھا کہ اگر کوئی ایسا گاہک ملے جو میرے اندازے کے مطابق آرمی میں مضبوط روابط رکھتا ہو تو میں اس کے ذریعے کرنل توحید کے بارے میں کھوج لگانے کی کوشش کروں۔''

''یہ تو بڑے مبہم امکان پر کام کرنے والی بات ہے۔ میرے حساب سے تو اس بات کا ایک فیصد سے بھی کم امکان تھا کہ تمہیں ایسا کوئی کسٹمر ٹکرا جاتا۔'' اس کا جواب سن کر وہ حیران ہوا۔

''یہ ہدایات حاصل کرنے والی میں کوئی واحد لڑکی نہیں ہوں گی۔ اس شہر بلکہ پورے ملک میں بے شمار ایسی لڑکیاں ہیں جنہیں انہوں نے اپنا آلۂ کار بنا رکھا ہے اور ان کی مدد سے ایسے کام لیتے رہتے ہیں۔ خود مجھے حکم ہے کہ اپنے مساج سینٹر پر آنے والے گاہکوں پر گہری نظر رکھوں اور جو بھی کام کا بندہ نظر آئے، اس کے بارے میں معلومات حاصل کر کے اوپر والوں کو آگاہ کروں۔''

''یعنی تم ان کے لیے مخبر کا کام کرتی رہیں۔ یقینی طور پر تمہارے گاہکوں میں کئی ایسے سرکاری افسران بھی رہے ہوں گے جن سے تم کئی اہم ملکی راز حاصل کر کے ملک دشمنوں کو فراہم کرتی رہی ہو گی؟''

''میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ میں اپنے ہر جرم کی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔ تم مجھے جان سے مار دو، میں اُف تک نہیں کروں گی۔ بس میرا نام پبلک کے سامنے نہیں آنے دینا ورنہ میرے مرے ہوئے باپ کی رہی سہی عزت بھی خاک میں مل جائے گی۔'' اس نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے سلسلے میں کیا کیا جا سکتا ہے۔ اپنے بھیانک جرائم کے باوجود تم نے اس تعاون کی وجہ سے اپنے لیے کچھ آسانی پیدا کر لی ہے اور میں کوشش کروں گا کہ تمہاری خواہش کا خیال رکھا جا سکے۔'' جاوید علی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

''اگر تم ایسا کر سکے تو میں تمہاری شکر گزار ہوں گی۔ باقی تو میرے لیے کسی چیز کی کوئی اہمیت نہیں رہی ہے۔ میں اپنی اس زندگی سے اوب چکی ہوں۔ خودکشی کی ہمت نہیں تھی ورنہ اب تک خود ہی چھٹکارا حاصل کر چکی ہوتی۔ شاید تم یہ بات سمجھ نہ سکو لیکن حقیقتاً میرے لیے یہ احساس بڑا کرب ناک ہے کہ میں جس تھالی میں کھاتی ہوں، اسی میں چھید کر رہی ہوں۔'' اپنے الفاظ سے اس نے جاوید علی کے دل میں کچھ اور گنجائش پیدا کی۔

حالات کی ستم ظریفی کا شکار ہو کر دلدل میں جا پھنسنے والی اس لڑکی کو کم از کم اتنا تو احساس تھا کہ ارضِ وطن کو نقصان پہنچا کر وہ کوئی جرم کر رہی ہے ورنہ یہاں تو بڑے بڑے نام نہاد سیاست دان، بیوروکریٹس اور سماجی کارکن دن رات جانوروں کی طرح اس وطن کو بھنبھوڑ رہے تھے اور نام کو بھی شرمندہ نہیں تھے بلکہ بڑی ڈھٹائی سے اپنی حب الوطنی کے راگ الاپتے تھے۔

☆☆☆

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ پہلے رائے چند غائب ہوا اور اب عالیہ... اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ دونوں ہی پولیس کی کارروائی کے نتیجے میں غائب ہوئے ہیں۔ اتنے سالوں سے دونوں کامیابی کے ساتھ اپنا سیٹ اپ چلا رہے تھے۔ پولیس کے ساتھ بھی اچھی سیٹنگ تھی پھر اچانک کیا ہوا کہ پولیس ان کی دشمن بن گئی اور آگے پیچھے دونوں کو نشانہ بنا لیا؟'' سنتھیا کراچی سے لاہور آئی ہوئی تھی اور پانڈے کے سامنے بیٹھی حالات کی اس نئی کروٹ پر جلبلا رہی تھی۔

''میں خود پریشان ہوں۔ دونوں پولیس کے ریڈ کے نتیجے میں غائب ہوئے ہیں لیکن دونوں ہی کا کسی پولیس اسٹیشن سے کچھ پتا نہیں چل رہا۔ رائے چند کے بارے میں تو پھر بھی اتنا پتا چلا ہے کہ گرفتاری کے بعد چند گھنٹوں میں ہی اس نے تھانے دار سے مک مکا کر کے وہاں سے اپنی جان چھڑا لی تھی لیکن پھر اس کے بعد وہ اپنے گھر میں پہنچا، نہ ہی اس کے بارے میں کوئی خبر ملی... جبکہ عالیہ کی گرفتاری کا تو سرے سے کوئی ریکارڈ ہی نہیں ہے۔ مساج سینٹر سے میڈم دیا سمیت کئی ورکرز کو گرفتار کیا گیا ہے لیکن گرفتار ہونے والوں میں عالیہ کا نام شامل نہیں ہے۔ میں نے کئی ذرائع سے پولیس والوں کو کھنگالا ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی عالیہ کے بارے میں نہیں جانتا اور ایسا لگتا ہے کہ ریڈ کے وقت وہ وہاں موجود ہی نہیں تھی۔ لیکن میری معلومات کے مطابق اس روز عالیہ وہیں تھی اور شاید ریڈ کے وقت کسی طرح وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔''

''ایسی صورت میں اسے کسی سے رابطہ کرنا چاہیے تھا لیکن وہ تو اپنے اپارٹمنٹ بھی نہیں پہنچی۔'' سنتھیا نے تیز لہجے میں اپنا خیال ظاہر کیا۔

''شاید وہ موقع پا کر بھاگ نکلی ہے۔'' پانڈے نے کہا تو سنتھیا نفی میں اپنا سر ہلانے لگی۔

''نہیں پانڈے! مجھے یہ کوئی اور چکر لگتا ہے۔ کوئی تھرڈ پارٹی ہے جو یہ سارا چکر چلا رہی ہے اور اس نے پولیس کو کور کے طور پر فرنٹ پر رکھا ہوا ہے۔ تم اور میں ان پولیس والوں کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ یہ کبھی بھی اوپر سے دباؤ پڑے بغیر کسی ایسی جگہ ریڈ نہیں کر سکتے جہاں سے انہیں پابندی سے بھتہ ملتا ہو۔ تم رائے چند اور عالیہ دونوں کے غائب ہونے پر غور کرو۔ دونوں معاملات میں کتنی خوب صورتی سے پولیس کو ایکسپوز کروا دیا گیا ہے اور مجھے لگتا ہے کہ وہ دونوں لازماً کسی خفیہ ایجنسی کی تحویل میں ہیں اور یہ بات ہمارے لیے خاصی خطرناک ہے۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں نے خود بھی اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا اسی لیے پہلے ہی ان سارے لوگوں کو انڈر گراؤنڈ ہونے کا حکم دے چکا ہوں جن کے بارے میں عالیہ جانتی ہے۔ رائے چند سے تو خیر ایسا کوئی خطرہ ہی نہیں ہے۔ وہ ڈائریکٹ کسی سے رابطے میں نہیں رہتا تھا اس لیے کسی کے بارے میں کچھ بتا بھی نہیں سکتا۔''

''اور مجھے لگتا ہے کہ عالیہ اسی کی وجہ سے پھنسی ہے۔'' سنتھیا زیرِ لب بڑبڑائی۔ عہدے میں پانڈے سے نیچے ہونے کے باوجود اس کا ذہن زیادہ تیز تھا اور وہ حالات کا درست تجزیہ کرنے کی زیادہ صلاحیت رکھتی تھی اور ایسا اس لیے تھا کہ وہ را کے علاوہ موساد کی بھی تربیت یافتہ تھی جب ہی تو اتنے برسوں سے کامیابی سے اپنا کردار ادا کر رہی تھی اور کسی کو اس کے ڈبل ایجنٹ ہونے کا شبہ تک نہیں ہو سکا تھا۔ پانڈے جو اس کا سینئر بنا بیٹھا تھا، بالکل نہیں جانتا تھا کہ اس کی ناک کے عین نیچے سنتھیا منشیات کا دھندا بھی چلا رہی ہے اور عالیہ کو فحاشی اور جاسوسی کے علاوہ اس مقصد کے لیے بھی استعمال کرتی رہی ہے۔

''کیا کہا؟ میں نے سنا نہیں۔'' پانڈے نے اس کی بڑبڑاہٹ کو سمجھ نہ سکنے پر پوچھا۔

''کچھ نہیں، میں سوچ رہی ہوں کہ پے در پے خود کو پہنچنے والے ان نقصانات کا جواب کیسے دوں؟'' پانڈے کو یہ جواب دیتے ہوئے اس کے ذہن میں بلتستان میں مرنے والی اپنی ایجنٹ کا خیال بھی موجود تھا۔ اس ایجنٹ کے پاس موجود خفیہ آلات کی وجہ سے وہ وہاں کی صورتِ حال سے تو بے شک پوری طرح واقف ہو گئی تھی لیکن اسے بچانے کے لیے کچھ نہیں کر سکی تھی۔ مرنے والی وہ ایجنٹ را سے کوئی تعلق نہیں رکھتی تھی لیکن موساد کا سرمایہ تھی اس لیے اس کی جان جانے کا اسے زیادہ قلق تھا۔

''جواب ایک ہی ہو سکتا ہے۔ ہم نے خودکش حملہ آوروں کی جو فوج تیار کی ہے، اسے اس موقع پر کام میں لاؤ اور کراچی اور لاہور میں قیامت برپا کر دو۔ یہ ہنگامہ کھڑا ہوگا تو ایجنسیاں اس چکر میں پھنس جائیں گی اور ہم اپنے مہروں کو بچانے کی مہلت حاصل کر لیں گے۔'' پانڈے نے مکاری سے مشورہ دیا جو سنتھیا کو بھی مناسب لگا۔ اس نے را کے ساتھ مل کر معصوم ذہنوں کی برین واشنگ کی اس سازش کے لیے برسوں محنت کی تھی اور نتیجے میں ان کے پاس ایسے نوجوانوں اور بچوں کی ایک بڑی کھیپ موجود تھی جسے وہ

آسانی سے اس آگ میں جھونک سکتے تھے۔ ان کے پتھر دلوں کو اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ ان کی بربریت کا نشانہ بن جانے والے ان معصوموں کی مائیں ہر پل اپنے لختِ جگر کی واپسی کی آس لگائے رو رو کر اپنی آنکھوں کی روشنی گنوا رہی ہیں۔ ان کے نزدیک تو اپنے وطن اور قوم کی خاطر سب کچھ کرنا جائز بلکہ باعثِ فخر تھا اور اس فخر کو قائم رکھنے کے لیے وہ ہر سنگدلانہ فیصلہ بڑی آسانی سے کر ڈالتے تھے۔ اس بار بھی کراچی اور لاہور کی تقدیر کا فیصلہ بنا کسی حیل وحجت کے کر دیا گیا۔ نتیجے میں اگلے چند دن تک دونوں شہروں خصوصاً کراچی میں کھیلے جانے والے آگ اور خون کے کھیل نے انسانیت کو خون کے آنسو رلا ڈالا۔

☆☆☆

وہ دونوں نہیں جانتے تھے کہ کتنی دیر بے ہوش رہے اور کتنا سفر کر کے کہاں پہنچا دیے گئے۔ بس آنکھ کھلی تو انہوں نے خود کو ایسی تاریک جگہ پر پایا جہاں پر ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا اور ایسی خاموشی تھی، گویا انہیں دنیا سے کاٹ کر زندہ ہی کسی تاریک قبر میں اتار دیا گیا ہو۔ انہیں یہاں ڈالنے والوں نے بس اتنی مہربانی کی تھی کہ اس قبر میں ان کے ہاتھ پیر آزاد رہنے دیے تھے۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ کافی دیر تک اپنے ہاتھ پیروں کو حرکت میں لانے کے لیے ہلاتے جلاتے رہے جو شاید بے ہوشی کی کسی دوا کی وجہ سے یا بہت دیر تک بے حس وحرکت پڑے رہنے کے باعث سن سے ہو گئے تھے۔

''میں کیا بھائی جی، ہم زندہ تو ہیں نا یا سالوں نے ایک ہی قبر میں گاڑ دیا ہے؟'' جسم کو حرکت میں لانے کی کوشش میں وہ دونوں ہی اس حقیقت سے واقف ہو گئے تھے کہ اس تاریک جگہ پر انہیں اکٹھا رکھا گیا ہے چنانچہ سلو نے اپنے مخصوص انداز میں گفتگو کا آغاز کیا۔

''ایہہ تو مینوں نہیں ملوم پر یاد رکھ کہ تیرے سالوں کی اس بدتمیزی پر میں انہیں چھوڑنے والا نہیں ہوں۔ اگر مر بھی گیا ہوں تو بھوت بن کر بدلہ لوں گا۔'' اس کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کا دباؤ ڈالتے ہوئے شہریار نے اسی کے لہجے میں جواب دیا۔ ایک طرح سے یہ سلو کے لیے اشارہ تھا کہ کچھ بھی بولتے وقت محتاط رہے۔ انہیں جس انداز سے گاندھی نگر میں گھیرا گیا تھا، اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس ساری کارروائی کے پیچھے کسی غنڈا گروپ کا نہیں بلکہ حکومتی ادارے کا تعلق ہے اور ایسی صورت میں انہیں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت بھی تھی کیونکہ اس امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا تھا کہ انہیں یہاں قید کرنے والوں نے ان کی گفتگو سننے کا کوئی خفیہ انتظام کر رکھا ہو۔

''ایسی بھڑکیں نہ مارو بھائی جی! اگر میری گھر والی نے سن لیا تو مینوں چھڈے گی نہیں، بوہت مارے گی کہ تیرے بھرا نے ایسی گل کی کیسے، ہور تو نے سنی کیوں؟'' سلو اس کا اشارہ سمجھ گیا اور یونہی ہانکنے لگا۔

''تو تو وڈا زن مرید نکلا۔ زنانی سے اتنا ڈرا تو جیے گا کیسے؟'' ہاتھ پیروں کو حرکت کے قابل پا کر کھڑے ہوتے ہوئے شہریار نے اس کی فضول گوئی میں اس کا ساتھ دیا۔

''ویسے ہی جیسے تسی جیتے ہو۔ تسی بھی تو بھابو سے وڈا ڈرتے ہو نا۔'' سلو بھی اس کے ساتھ ساتھ ہی کھڑا ہوا اور شریر لہجے میں جواب دیا۔

''چل اوئے بکواس نہ کر، چپکا پڑا رہ۔'' شہریار نے اسے ڈپٹا اور اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے حرکت کرنے لگا۔ یہ شاید کسی دوا کا ہی اثر تھا کہ اب بھی چلتے ہوئے اسے اپنے پیروں میں بھاری پن کا احساس ہو رہا تھا۔ کچھ ایسی ہی کیفیت سلو کی بھی تھی لیکن وہ بھی اسی کی طرح ہر طرح کے حالات میں جدوجہد کرنے کی ہمت رکھتا تھا چنانچہ حرکت میں آ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ دس بارہ فٹ کے اس کمرے کو اپنے ہاتھوں کی مدد سے اچھی طرح ٹٹول چکے تھے جس کے نتیجے میں ان پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ کمرے کی دیواریں بالکل ٹھوس ہیں اور ان میں کہیں بھی کوئی کھڑکی یا دروازہ موجود نہیں ہے۔ اس سے وہ یہی اندازہ لگا سکے تھے کہ انہیں کسی تہ خانے میں رکھا گیا ہے جس کا داخلی راستہ یقینی طور پر چھت پر رکھا گیا تھا اور چھت اتنی اونچی تھی کہ سلو نے شہریار کو اپنے کندھوں پر سوار کر کے اس تک رسائی حاصل کرنے کی جدوجہد کی، تب بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس صورتِ حال پر وہ دم بخود رہ گئے۔ قید کرنے والوں نے انہیں ایسی جگہ قید کیا تھا کہ وہ اپنے طور پر باہر نکلنے کی جدوجہد بھی نہیں کر سکتے تھے اور اب صرف یہی چارہ رہ گیا تھا کہ اپنے صیاد کا انتظار کریں۔ تہ خانے کے ننگے فرش پر دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے انہوں نے یہ انتظار شروع کر دیا۔ انہیں بہت دیر اس اذیت سے نہیں گزرنا پڑا پھر بھی خاصی کوفت محسوس ہوئی۔ آپس میں الٹی سیدھی ہانکنے کا موڈ بھی صورتِ حال کی اس سنگینی نے ختم کر دیا تھا۔ کوئی سنجیدہ بات اس ڈر سے نہیں کر سکتے تھے کہ کہیں کسی خفیہ مائک کے ذریعے ان کی یہاں کی ہوئی بات چیت سنی نہ جا رہی ہو۔

انتظار کی یہ کوفت بھری گھڑیاں بہت عجیب انداز میں ختم ہوئیں۔ بیٹھے بیٹھے انہیں یہ محسوس ہوا کہ اوپر چھت کی

طرف ہلچل سی ہوئی ہو لیکن بس صرف حرکت کا احساس تھا۔ روشنی بالکل بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ کچھ دیکھ پاتے اور جب روشنی ہوئی تو اتنی تیز کہ کافی عرصے سے اندھیرے میں ڈوبی ان کی بصارت چندھیا سی گئی۔ کچھ پل بعد وہ دیکھنے کے لائق ہوئے تو تہ خانے کا منظر سامنے تھا۔ وہ ایک سپاٹ دیواروں والا کمرا تھا جو اس وقت پوری طرح روشنیوں میں نہایا ہوا تھا۔ ان روشنیوں کا منبع چھت پر نصب طاقتور لائٹس تھیں لیکن اس وقت ان کی توجہ کا اصل مرکز وہ شیشے کی کیپسول نما لفٹ تھی جس سے کئی مسلح نفوس نکل کر ان کے آس پاس پھیل گئے تھے۔ اور ظاہر ہے، ان کے ہاتھوں میں موجود ہتھیاروں کا رخ ان دونوں ہی کی طرف تھا۔ مسلح افراد کے درمیان اندو کو دیکھ کر انہیں بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی۔ وہ جن حالات سے گزرے تھے، پہلے ہی اندازہ لگا چکے تھے کہ ان کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا ہے، اس کے پیچھے اندو ہی کا ہاتھ ہے۔ چست جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس اندو نے فوری طور پر ان دونوں کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے اپنے ہاتھ میں پکڑے ریموٹ کنٹرول کا رخ لفٹ کی طرف کر کے کوئی بٹن دبایا تو لفٹ واپس جانے لگی۔ یہ عجیب طریقے سے کام کرنے والی لفٹ تھی اور بالکل اس انداز میں کام کر رہی تھی جیسے کسی ٹوکری کو رسی سے لٹکا کر بلند عمارت سے پھینکا اور واپس کھینچا جاتا ہے۔ لفٹ واپس چلی گئی تو چھت میں بننے والا گول خلا بھی بند ہو گیا۔

''ہاں تو مسٹر جگدیش اور مسٹر وریندر... آپ کی سواد مسالا کمپنی کا کام کیسا چل رہا ہے؟ گاندھی نگر میں آپ کو کچھ نیا بزنس ملا یا نہیں؟'' لفٹ واپس جانے کے بعد وہ ان دونوں کی طرف متوجہ ہوئی اور ایک دیوار سے پشت لگا کر کھڑے ہوتے ہوئے بہت طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''ہمیں یہاں لانے کا کارن بتاؤ؟'' شہریار نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے سخت لہجے میں پوچھا۔

''کارن تو تم بتاؤ گے کہ تم ممبئی سے دہلی جاتے ہوئے جھوٹا بہانہ کر کے گاندھی نگر میں کیوں اترے تھے؟''

''ہم دہلی واپس نہیں جانا چاہتے تھے۔ ہمیں ممبئی میں امپورٹنٹ بزنس ڈیل کرنی تھی لیکن تم نے ہماری ایک نہ سنی اور زور زبردستی سے دہلی جانے والی ٹرین میں بٹھا دیا۔ ایسے میں ہمیں جو سوجھا ہم کر گزرے۔'' شہریار نے محتاط انداز میں اس کے سوال کا جواب دیا۔

''بکواس مت کرو اور جھوٹ بولتے سے یاد رکھو کہ ہمارا ایک آدمی ٹرین میں تمہاری نگرانی کر رہا ہے۔ ویسے بھی میں یہ بات پہلے سے جانتی ہوں کہ تم کوئی بزنس مین نہیں ہو۔ کسی بزنس مین کے پاس ایسے بریف کیس نہیں ہوتے جنہیں کھولنا ماہر قفل سازوں کے لیے بھی ممکن نہ ہو۔ ہم نے تمہارے بریف کیسوں کو ایکسرے مشین سے گزار کر دیکھا تھا جس سے یہ بات بھی سامنے آ گئی تھی کہ ان میں خطرناک گنیں موجود ہیں۔ اب تم بتاؤ کہ کسی بزنس مین کو ایسی گنیں رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟'' وہ انہیں تیز نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

''گنیں ہم نے اپنی سیفٹی کے لیے رکھی تھیں۔ ہم ممبئی میں ہونے والی لوٹ مار سے خوف زدہ تھے اس لیے اپنی اور اپنی چیزوں کی حفاظت کا پورا بندوبست کر کے چلے تھے۔''

''اوکے، ایسا ہے تو مجھے ان دونوں بریف کیسوں کو کھولنے کا کوڈ بتا دو۔ میں انہیں کھول کر اپنی تسلی کر لوں گی کہ ان میں کوئی ایسی چیز تو موجود نہیں جو تمہیں بزنس مین کے بجائے کچھ اور ثابت کر دے۔'' اس نے معنی خیز لہجے میں شہریار کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مطالبہ کیا۔ ساتھ ہی مسلح افراد میں سے ایک نے دونوں بریف کیس لا کر اس کے قدموں میں رکھ دیے۔

''کیوں، کیا تم پولیس والی ہو جو تمہاری تسلی کروانا ضروری ہے؟ جاؤ نہیں بتاتا میں تمہیں کوڈ۔'' شہریار نے اڑیل پن کا مظاہرہ کیا۔ حقیقتاً وہ اس وقت صرف موقع تلاش کر رہا تھا کہ کسی طرح صورتِ حال کو اپنے حق میں کر سکے لیکن انہیں اپنی زد میں لیے کھڑے مسلح افراد اتنے چوکس تھے کہ کسی بھی غیر معمولی حرکت پر انہیں گولیوں سے بھون کر رکھ سکتے تھے۔ اور ظاہر ہے وہ اپنی زندگی بچا کر ہی کوئی کارنامہ انجام دے سکتے تھے۔

''تم مجھے پولیس والی ہی سمجھ لو لیکن یاد رکھو کہ میری بات مانے بغیر تم تو کیا، تمہاری آتما بھی اس جگہ سے باہر نہیں نکل سکتی۔'' اس کا لہجہ پہلے سے بھی زیادہ سنجیدہ ہو گیا۔

''لاک نہیں کھل رہا تو اسے توڑ دو یا بریف کیس کو کاٹ کر اس کے اندر کا راز جان لو۔ میں بہرحال تمہیں کوڈ نہیں بتاؤں گا۔'' شہریار نے تمسخرانہ لہجے میں اسے جواب دیا۔

''ہم ان ترکیبوں پر عمل کر سکتے تھے اگر یہ خطرہ نہیں ہوتا کہ ایسی کسی کوشش کے نتیجے میں کھولنے والا دھماکے سے نہیں اڑ جائے گا۔'' اندو کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

''ہاہاہا... تم کیا ہمیں کسی جاسوسی فلم کا کردار سمجھ رہی ہو جو ایسی خوفناک باتیں سوچ رہی ہو؟'' شہریار نے اس کا مذاق اڑایا۔

"میں تمہیں جاسوسی فلم کا کردار نہیں بلکہ سچ مچ کا جاسوس سمجھ رہی ہوں اور ایک بار پھر وشواس دلاتی ہوں کہ تم اپنی اصلیت اگلے بغیر مجھ سے اپنی جان نہیں چھڑا سکو گے۔" وہ غراہٹ آمیز لہجے میں بولی۔

"اوہ... تو اندو جی جو ایک جرنلسٹ ہونے کے ساتھ ساتھ اشوک صاحب کے گینگ کی ہمدرد ہونے کی دعویدار تھیں، اب اچانک دیش بھگت بن بیٹھی ہیں۔" شہر یار نے اس پر طنز کیا۔

"میں کیا ہوں اور کیا نہیں، اس کو جانے دو۔ لیکن اب تمہیں بتانا ہوگا کہ تم کون ہو؟" وہ خوفناک لہجے میں بولی اور ہاتھ میں پکڑے ریموٹ کنٹرول کا رخ چھت کی طرف کر کے کوئی بٹن دبا ڈالا۔ اچانک ہی چھت سے شیشے کا ایک کیس سا نمودار ہوا اور ان دونوں پر آ گرا۔ اب وہ دونوں اس باکس میں قید تھے اور صورتِ حال کو سمجھنے سے پہلے ہی ان پر افتاد آ پڑی تھی۔ باکس میں قید ہونے کے چند سیکنڈ کے بعد ہی انہیں اندازہ ہونے لگا کہ انہیں سانس لینے میں زبردست دشواری ہو رہی ہے۔

"یہ باکس آکسیجن سے بالکل خالی ہے اور اس میں امونیا گیس بھری ہوئی ہے۔ اگر تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا تو یہی باکس تمہاری قبر بن جائے گا۔" اندو کی آواز نے انہیں اپنے گھٹتے ہوئے سانس اور تیز چبھتی ہوئی بو کے راز سے آگاہ کیا۔ یہ واقعی بڑا زبردست ٹارچر تھا۔ کہنے کو اس نے انہیں انگلی بھی نہیں لگائی تھی لیکن شدید عذاب میں مبتلا کر دیا تھا۔

"میں تمہیں کوڈ بتاؤں گا اور اپنی حقیقت بھی۔" چند لمحے اور گزرے تو سلو نے حوصلہ ہار دیا اور زور سے چلایا۔ اس کی اس حرکت پر شہر یار چونک گیا۔ سلو نے اس مشن میں اس کے ساتھ شریک ہوتے وقت ہی واضح کر دیا تھا کہ وہ جذبہ حب الوطنی کے باعث نہیں بلکہ ذاتی انتقام کی آگ بجھانے اور پرکشش معاوضے کی خاطر اس کے ساتھ شریک ہو رہا ہے۔ اور ظاہر ہے، انتقام اور پیسے میں اتنی طاقت نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اپنی جان دینے پر راضی ہو جاتا۔

وہ سلو کو اس حرکت سے باز رکھنے کے لیے اس کی طرف لپکا لیکن اس سے قبل ہی شیشے کا وہ باکس ان پر سے ہٹ چکا تھا اور ابھی اس کا ہاتھ سلو کے کالر تک ہی پہنچا تھا کہ تین مسلح افراد بیک وقت اس پر پل پڑے۔ شہر یار کے لیے اس وقت سلو کو روکنا زندگی اور موت کے مسئلے سے بھی زیادہ اہم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آج اگر وہ دونوں جان سے بھی چلے گئے تو کل ان کے مشن کو پورا کرنے کے لیے کوئی اور میدان میں اتر جائے گا لیکن اگر ان کا مشن سامنے آ گیا تو ڈاکٹر فرحان جمیل کو تلاش کر کے واپس وطن پہنچانا پہلے سے بھی زیادہ دشوار ہو جائے گا۔ انہیں قیدی بنا کر رکھنے والے مزید محتاط ہو جائیں گے اور ان پر اتنے پہرے لگا دیں گے کہ ان تک رسائی ناممکن ہو جائے گی۔ اپنی اس سوچ کے تحت اس نے خود پر حملہ آور ہونے والوں کے پاس موجود اسلحے کا بھی خیال نہیں کیا اور بیک وقت ایک کو گھونسا اور دوسرے کو لات رسید کی۔ جواب میں اسے بھی ان کی گنوں کی آہنی ضربات برداشت کرنی پڑیں۔ اس نے ان ضربات کی پروا نہیں کی اور ان میں سے ایک کو اپنے بازوؤں میں اٹھا کر دو پر دے مارا۔

اب یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ کمرے میں موجود چوتھا مسلح شخص اپنی جگہ پر خاموش کھڑا رہتا۔ شہر یار کو گن سے دھمکانا تو اس لیے بیکار تھا کہ وہ اپنے مقابلے پر آنے والے تینوں افراد میں سے ایک کو دوبارہ اپنی گرفت میں لے چکا تھا اور اس پر گولی چلانے میں یہ احتمال تھا کہ گولی شہر یار کے بجائے اس کے اپنے ساتھی کو لگ جائے گی۔ وہ تیزی سے اپنے ساتھیوں کی مدد کو لپکا لیکن درمیان میں ہی سلو کی ٹانگ چل گئی اور وہ اپنی گن سمیت زمین بوس ہو گیا۔ اس اثنا میں گرنے والے دونوں افراد سنبھل چکے تھے۔ انہوں نے اپنی گنیں سیدھی کیں اور سلو کی طرف رخ کر کے فائر مار دیا۔ سلو کے لیے یہ غیر متوقع نہیں تھا چنانچہ اس نے چھلاوے کی طرح اپنی جگہ چھوڑ دی اور اچھل کر اس جانب پہنچ گیا جہاں اندو ریموٹ ہاتھ میں لیے انگشت بدنداں کھڑی تھی۔ شاید اسے توقع نہیں تھی کہ کوئی اتنا بے خوف بھی ہو سکتا ہے کہ چار عدد خطرناک گنز کی موجودگی میں مقابلہ کرنے کی احمقانہ جرأت کر سکے۔ لیکن وہ دونوں یہ کر چکے تھے اور لمحوں میں نہ صرف پانسا پلٹ کر رکھ دیا تھا بلکہ کوئین یعنی وہ خود ان کے قبضے میں پہنچ چکی تھی۔ سلو فائرنگ سے بچنے کے بعد اس تک پہنچا تھا تو اس نے کوشش کی تھی کہ اسے جوڈو کا کوئی کمال دکھا سکے لیکن وہ اس سے زیادہ باکمال نکلا اور اس کا وار روکنے کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ تھام کر بازو کو اتنی بری طرح پیچھے کی طرف موڑا کہ وہ کراہ کر رہ گئی۔

"اگر کسی نے اب کوئی حرکت کی تو میں اس کی گردن توڑ دوں گا۔" اندو کی نازک سی گردن کو اپنے بازو کے شکنجے میں جکڑ کر اس نے اس کے ساتھیوں کو دھمکی دی۔ ان چاروں میں سے ایک تو پہلے ہی شہر یار کی گرفت میں تھا، باقی تین بھی اس کی دھمکی سن کر ٹھٹک گئے۔ مسلح ہونے کے باوجود وہ اپنی باس کے جکڑے ہونے کی وجہ سے عملاً کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔

"اپنی گنز پھینک کر ہاتھ سر پر رکھ لو۔" سلو نے دوسرا حکم جاری کیا۔

"تم بہت بھیانک غلطی کر رہے ہو۔ ہمیں قابو میں کرنے کے بعد بھی تم اس عمارت سے نہیں نکل سکو گے۔" گلے پر دباؤ کے باعث اندو نے پھنسی پھنسی آواز میں اسے خبردار کیا۔

"وہ ہمارا پرابلم ہے۔ تم اپنے ساتھیوں کو سمجھاؤ کہ گنز پھینک دیں ورنہ تمہاری یہ نازک سی گردن ٹوٹ جائے گی۔" سلو غرایا اور اس کی گردن پر دباؤ بڑھا دیا جس کے نتیجے میں اس کے حلق سے خرخراہٹ سی برآمد ہوئی۔ خرخراہٹ کی اس آواز کو سن کر اب تک تذبذب کی کیفیت میں کھڑے اس کے ساتھیوں نے گنز دور پھینک دیں اور ہاتھ سر پر رکھ لیے۔ شہر یار جو چند لمحے قبل سلو کی طرف سے بدگمان ہو چکا تھا، اس کے کارنامے پر کھل اٹھا اور اپنے بازو میں جکڑے شخص کو کھڑی ہتھیلی کے ایک وار سے اٹا غفیل کرنے کے بعد لپک کر وہ پڑی گنز کی طرف لپکا۔

"اب تم تینوں دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔" اس نے ہوش و حواس میں موجود ان تینوں افراد کو حکم دیا۔ انہیں ناچار اس حکم کی پیروی کرنی پڑی کہ اسلحے سے محرومی اور باس کی خطرے میں پڑی زندگی ان کی مجبوری بن چکی تھی۔ شہر یار دونوں ہاتھوں میں گنز سنبھالے محتاط قدموں سے ان کے عقب میں پہنچا اور بائیں ہاتھ میں تھامی گن کو نال سے تھام کر اس کا دستہ ایک کے سر پر بجا ڈالا۔ وہ فوراً ہی تیورا کر گر پڑا۔ دوسرے شخص کے سر پر لگنے والی ضرب بھی جچی تلی اور کارآمد تھی لیکن اس کے بے ہوش ہو کر گرنے کے مختصر سے دورانیے میں تیسرے کو یکدم ہی جوش آ گیا اور وہ تیزی سے پلٹ کر شہر یار پر حملہ آور ہوا۔ اس بار شہر یار نے کسی قسم کی رعایت میں وقت ضائع کرنے کی زحمت نہیں کی اور دائیں ہاتھ میں موجود گن کا ٹریگر دبا دیا۔ ایک ساتھ کئی گولیاں برآمد ہوئیں۔ اتفاق سے اس شخص کا چہرہ زد میں تھا۔ گولیوں نے اس کا ہر نقش اڑا ڈالا اور اعضا کے چیتھڑوں کے ساتھ خون کے چھینٹے دور تک پھیل گئے۔

"تمہیں اپنی یہ حرکت بہت مہنگی پڑے گی۔ ہم سب کو مار کر بھی تم یہاں سے باہر نہیں نکل سکو گے۔" اپنے ساتھی کا حشر دیکھ کر اندو کا چہرہ لمحہ بھر کے لیے فق ہوا اور اس نے ایک بار پھر اپنی دھمکی دہرائی۔

"ہم تمہارے جیسے تھرڈ کلاس لوگ نہیں ہیں جو سستی حرکتیں کرتے پھریں۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہماری ہر حرکت بہت مہنگی ہے۔ تم بار بار یاد دلا کر اپنا ٹائم برباد مت کرو۔" سلو نے اسے تلخی سے جواب دیا اور بلاتکلف منہ پر ایک تھپڑ دے مارا۔ اس کے مارے گئے تھپڑ کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ نہ صرف اندو کے رخسار پر انگلیوں کے نشان چھپ گئے بلکہ گال اندر سے پھٹ جانے کے باعث باچھوں سے خون بہہ نکلا۔

"یو سن آف بچ۔ تم اپنے بارے میں نہ بھی بتاؤ تو میں پہچان چکی ہوں کہ تم بلڈی ایڈیس پاکستانی ایجنٹ ہو اور یہاں کسی خاص مشن پر آئے ہوئے ہو۔" تھپڑ کھا کر اندو پھٹ پڑی اور نفرت زدہ لہجے میں بولی۔

"اور تم ہورا کی نمک خوار جو شکار کی تلاش میں ادھر اُدھر بو سونگھتی پھرتی ہو۔" شہر یار جو اس کے ریموٹ کنٹرول کو اپنے قابو میں لے چکا تھا، اس سے بھی زیادہ نفرت سے بولا۔

"مجھے گرو ہے کہ میں اپنے دیش کی خاطر تم جیسے آتنک وادیوں کو ان کے انت تک پہنچاتی ہوں۔ اب بھی چاہے تم میری جان لے لو لیکن یہاں سے نکل نہ سکو گے۔" اس نے اپنی وہی دھمکی دہرائی جس نے انہیں سوچ میں ڈال دیا کہ یقیناً وہ کسی ایسی عمارت میں ہیں جہاں سیکیورٹی کا زبردست انتظام رکھا گیا ہوگا اور اس تہ خانے میں موجود افراد کے علاوہ بھی اوپر کئی افراد موجود ہوں گے۔ وہاں اب تک کسی نے کوئی مداخلت نہیں کی تھی تو اس کی صرف ایک وجہ تھی کہ تہ خانہ مکمل طور پر ساؤنڈ پروف ہے۔

"تمہیں ہم پر شک کیسے ہوا؟" اپنے اندیشوں اور سوچوں کو فی الحال ذہن سے جھٹکتے ہوئے شہر یار نے اس سے پوچھا۔

"تمہاری شامت تمہیں مجھ تک لے آئی۔" وہ تمسخر سے مسکرائی۔ تربیت یافتہ ایجنٹ ہونے کے باعث اس نے خود کو بہت تیزی سے اپنے ساتھی کی کراہیت آمیز موت کے جھٹکے سے سنبھال لیا تھا۔

"بکواس نہیں، سیدھی طرح جواب دو۔" اس کا جواب سن کر سلو غرایا اور اس کے کان کو پکڑ کر اس بری طرح موڑا کہ وہ چیخ اٹھی۔ اس کے چیخنے کے باوجود سلو نے اس کے کان پر سے اپنی گرفت ہلکی نہیں کی بلکہ کچھ اور بھی شدت سے زور لگایا۔ ایسا کرتے ہوئے اسے ذرا پروا نہیں تھی کہ وہ ایک عورت کے ساتھ یہ سلوک کر رہا ہے۔ اس کے مقابلے میں

شہر یار کے لیے شاید ایسا کرنا مشکل ہوتا۔

''اے جانور کی اولاد... چھوڑ مجھے۔'' دردناک چیخوں کے درمیان اس نے بلبلاتے ہوئے سلو سے کہا اور کوشش کی کہ اپنی ٹانگ سے اس پر وار کر سکے۔ سلو پوری طرح ہوشیار تھا۔ اس کی ٹانگ کے خود سے ٹکرانے سے پہلے اس نے اپنی ٹانگ کو حرکت دی اور اتنی زوردار ضرب لگائی کہ وہ تڑپ کر رہ گئی۔

''تم خوامخواہ کی زور آزمائی کر رہی ہو۔ یہ شخص تمہیں ذرا رعایت نہیں دے گا اس لیے بہتر ہے کہ شرافت سے ہمارے سوالوں کے جواب دیتی چلی جاؤ۔'' ریموٹ کے فنکشنز کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے شہر یار نے اسے تنبیہ کی۔

''میں نے کہا نا کہ تمہیں تمہاری شامت مجھ تک لے آئی تھی ورنہ میں تو بیچ صرف بھائی جی کے آدمی سے بچنے کے لیے تمہاری ٹیکسی میں بیٹھی تھی اور بعد میں بھی صرف انسانیت کے ناتے تمہیں بچانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن بعد میں تمہارے بریف کیسوں کی وجہ سے تمہاری طرف سے شک میں پڑ گئی اور بیرے کے روپ میں اپنا ایک آدمی تمہارے پیچھے لگا دیا۔ وہ تم دونوں کی باتیں سنتا رہا اسی لیے جب تم نے سیدھے دہلی جانے کے بجائے گاندھی نگر پر اترنے کا فیصلہ کیا تو اس نے مجھے انفارم کر دیا اور ہم نے وہاں کی لوکل پولیس کے ساتھ مل کر تمہیں اریسٹ کرنے کا پورا انتظام کر لیا۔ میں نے سنا تھا کہ اریسٹ ہونے سے پہلے بھی تم دونوں نے خاصی مار اماری کی تھی لیکن پھر بھی یہ امید نہیں تھی کہ یہاں اس جگہ تم اتنی آسانی سے میرے آدمیوں کو زیر کر لو گے۔'' انہیں پہلی بار اندو کی آواز میں مایوسی محسوس ہوئی۔ شاید اسی مایوسی کی وجہ سے اس نے سچ اگلنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔

''اوپر کتنے آدمی موجود ہیں؟'' اس کے بیان پر کوئی تبصرہ کیے بغیر شہر یار نے اس سے اگلا سوال کیا۔

''مجھے ان کی گنتی یاد نہیں لیکن وہ کئی ہیں اور پوری طرح ہتھیار بند ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''لفٹ کو نیچے لانے کے لیے کون سا بٹن دبانا ہوگا؟'' شہر یار نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''گرین بٹن۔'' اس کا جواب بے حد مختصر تھا جسے سن کر شہر یار نے سلو کو اشارہ کیا تو اس کے ہاتھ پاؤں چل پڑے۔

''سچ بول کتیا ورنہ تیرے سگوں کو یہاں سے تیری ہڈیاں بھی نہیں ملیں گی۔'' وہ اسے اتنی بری طرح مار رہا تھا کہ فاصلے پر کھڑے ہونے کے باوجود شہر یار کو اس کی ایک آدھ ہڈی ٹوٹنے کا یقین ہو گیا۔

''بلیو بٹن دباؤ، بلیو بٹن۔ لفٹ نیچے آجائے گی۔'' اس نے مار کھاتے کھاتے گویا ہار مان لی اور ہانپی ہوئی آواز میں چیخی۔

''یہ کسی لومڑی کی طرح مکار ہے۔ میں اس کی کسی بات پر عمل نہیں کر سکتا۔ کوئی اور کوشش کرنی ہوگی۔'' شہر یار نے اس کا جواب سن کر اعلان کرنے والے انداز میں کہا تو اندو کی آنکھوں میں مایوسی اتر آئی۔ جس نے واضح کر دیا کہ مشکل میں ہونے کے باوجود وہ مسلسل انہیں دھوکا دینے کی کوشش کر رہی تھی۔

''ٹھیک ہے، جب یہ ہمارے کام کی نہیں تو میں اسے ٹپکا دیتا ہوں۔'' سلو نے سفاکی سے کہا اور اس کی گردن پر دونوں ہاتھ رکھ کر دباؤ ڈالنے لگا۔ اندو ایک بار پھر بری طرح تڑپنے لگی۔

''ریڈ بٹن۔ ریڈ بٹن پش کرنے سے لفٹ نیچے آئے گی۔'' اپنی بچت کے لیے اس نے ایک اور آپشن پیش کیا لیکن اب اس کی ہر بات ناقابلِ یقین ہو چکی تھی چنانچہ سلو نے ڈراپ سین کر دینا ہی مناسب سمجھا۔

''ان میں سے کسی کو ہوش میں لاؤ۔'' اندو سے فارغ ہونے والے سلو کو شہر یار نے حکم دیا تو وہ کسی معمول کی طرح حرکت میں آگیا اور بے ہوش افراد میں سے ایک کے پہلو میں دو تین زوردار ٹھوکریں لگائیں۔ تکلیف کے باعث وہ کراہتا ہوا ہوش میں آگیا۔

''لفٹ نیچے لانے کے لیے کون سا بٹن دبانا ہوگا؟'' اسے سوچنے سمجھنے کی مہلت دیے بغیر شہر یار نے گن کی نال اس کی کنپٹی سے لگاتے ہوئے سوال کیا۔

''ریڈ بٹن۔'' اس نے بے ساختگی سے جواب دیا۔ اس بے ساختگی میں سچائی تھی اور شاید اس لیے تھی کہ وہ ابھی پوری طرح حواسوں میں نہیں لوٹا تھا۔ اس کا جواب سن کر شہر یار نے اللہ کا نام لیتے ہوئے سرخ بٹن دبانے کا فیصلہ کر لیا۔ انہیں اس قبر نما تہ خانے سے بہر صورت نکلنا تھا اس لیے رسک لینا ناگزیر تھا۔ خیر گزری کہ یہ فیصلہ ان کے حق میں بہتر ثابت ہوا اور وہی کیپسول نما لفٹ نیچے آگئی۔ اس بندے کو سلو کے رحم و کرم پر چھوڑ کر اس نے آگے بڑھ کر لفٹ کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اس میں ایک سوئچ پینل موجود تھا جس پر اسے آپریٹ کرنے کے لیے واضح اشارے موجود تھے ورنہ جو ریموٹ اس کے ہاتھ میں تھا، اس میں مختلف رنگ کے

بٹنوں کے علاوہ کوئی اشارہ ہی نہیں دیا ہوا تھا اور وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا کہ اگر اندو کی بات مان کر وہ اس کی مرضی سے کوئی بٹن دبا دیتا تو لفٹ نیچے آنے کے بجائے چھت سے کوئی زہریلا مادہ برسنا شروع ہو جاتا یا اوپر کی عمارت میں خطرے کا کوئی الارم بجنے لگتا اور ان کے فرار کی راہیں بالکل مسدود ہو کر رہ جاتیں۔

''اسے آف کرو اور بریف کیس لے کر لفٹ میں آجاؤ۔'' لفٹ آپریٹ کرنے کا سسٹم اچھی طرح سمجھنے کے بعد اس نے سلو سے کہا تو اس نے خاموشی سے ہوش میں آنے والے شخص کی تقدیر کا فیصلہ کیا اور بریف کیس سمیٹ کر اس کے ساتھ لفٹ میں آکھڑا ہوا۔

''آج تم نے ثابت کر دیا کہ اس مشن پر تمہیں اپنے ساتھ لانے کا میرا فیصلہ بالکل درست تھا۔'' لفٹ کا دروازہ بند کر کے اوپر جانے کے لیے بٹن دبانے سے پہلے شہر یار نے اس سے کہا۔

''کچھ دیر پہلے شاید تمہاری رائے کچھ اور تھی اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں تم مجھے جان سے مار دینے کا ارادہ رکھتے تھے۔'' سلو نے ناراض لہجے میں اسے جواب دیا تو اس کے چہرے پر حقیقی شرمندگی کے تاثرات پھیل گئے۔

''آئی ایم ویری سوری یار! اس وقت میں سچ مچ سمجھا تھا کہ تم اپنی جان بچانے کے لیے اندو کو کوڈ بتانے لگے ہو۔'' اس نے زبان سے اعتراف اور معذرت کرنے میں کوئی عار نہ سمجھا۔

''کون سا کوڈ؟ میں صرف اپنے بریف کیس کو کھولنے کا کوڈ جانتا ہوں اور اس میں ایک گن کے علاوہ کوئی کام کی چیز موجود نہیں ہے۔'' سلو نے نروٹھے پن سے جواب دیا تو وہ ہلکے سے مسکرایا پھر اپنے بریف کیس کو کوڈ کی مدد سے کھول کر اس میں رکھے سامان کو آگے پیچھے کرنے کے بعد اس میں سے ایک چھوٹا سا لفافہ برآمد کر کے اسے تھماتے ہوئے بولا۔ ''یہ میں نے تمہارے لیے ہی رکھا ہوا تھا اور فیصلہ کیا تھا کہ تمہیں اس وقت دکھاؤں گا جب تم پر اعتماد کرنے لگوں گا۔''

''شکریہ اتنی جلدی اعتماد کرنے کا۔'' سلو نے طنز سے کہتے ہوئے لفافہ کھول کر اس میں موجود شے باہر نکالی۔ وہ ایک پاسپورٹ سائز تصویر تھی۔

''یہ کیا...؟'' تصویر دیکھ کر وہ حیران ہوا۔

''ہم اس شخص کی تلاش میں یہاں آئے ہیں۔ رازداری کے خیال سے میں نے تمہیں کچھ باتوں سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ فی الحال تم اس تصویر کو اپنے ذہن میں نقش کر لو۔ یہاں سے باہر نکلنے کے بعد میں تمہیں باقی تفصیلات سے بھی آگاہ کر دوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ دیکھ لی تصویر۔ آگے کیا کرنا ہے؟'' سلو کے لہجے میں بظاہر بے نیازی تھی لیکن اس کی آنکھوں نے کسی ایکسرے مشین کی طرح تصویر کا جائزہ لیا تھا۔

''اسے پھاڑ دو۔ اب بس یہ ہمارے ذہنوں میں ہی رہے گی۔ میں مزید اس تصویر کو اپنے پاس رکھنے کا خطرہ نہیں مول لے سکتا، ورنہ کسی نہ کسی اسٹیج پر ہماری یہاں آمد کا مقصد سامنے آجائے گا۔''

شہر یار نے اسے ہدایت دیتے ہوئے پینل پر موجود ایک بٹن دبا دیا۔ اس دوران سلو نے اس کی بات سمجھتے ہوئے تصویر کے اتنے پرزے کر دیے تھے کہ کوئی انہیں جوڑنا بھی چاہتا تو نہیں جوڑ سکتا تھا۔

''اپنے بریف کیس کو یہیں چھوڑ دو۔ اس بوجھ کو اٹھائے پھرنا بیکار ہوگا۔'' وہ بریف کیس میں موجود اپنی اپنی گنیں پہلے ہی نکال چکے تھے۔ شہر یار نے پلاسٹک کا ایک لفافہ اپنے ٹراؤزر کی جیب میں منتقل کرتے ہوئے سلو کو ہدایت کی لیکن خود اپنا بریف کیس ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ سلو نے بنا حیل و حجت اس کی بات پر عمل کیا اور وہ لفٹ سے باہر آگئے۔ لفٹ نے انہیں جس کمرے میں پہنچایا تھا، وہ بڑا عجیب و غریب تھا اور پورے فرش پر مختلف قسم کی مشینیں وغیرہ نظر آرہی تھیں۔ یہاں انہوں نے شیشے کا وہ باکس بھی دیکھا جس میں کچھ دیر رہ کر انہوں نے آکسیجن کی محرومی اور امونیا کی موجودگی کی چبھن کو محسوس کیا تھا۔ انہیں سمجھ آگیا کہ نیچے موجود سپاٹ تہ خانے میں ہونے والی ساری کارروائیوں کا حقیقی انتظام اس کمرے میں ہے اور تہ خانے میں اس ریموٹ کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا جو انہوں نے اندو سے حاصل کیا تھا۔

اس کمرے کو دیکھ کر انہیں اور بھی زیادہ شدت سے احساس ہوا کہ یہاں بہت احتیاط اور حاضر دماغی سے کام لینا پڑے گا کیونکہ جس عمارت میں اتنے انتظامات تھے، وہ کوئی عام جگہ تو ہو نہیں سکتی تھی۔ ویسے بھی اندو ایک طرح سے یہ اعتراف کر چکی تھی کہ اس کا تعلق را سے ہے اس لیے یہ یقینی بات تھی کہ وہ را ہی کے کسی ٹھکانے پر موجود ہیں۔

''میں آگے چلوں گا، تم مجھے کور دینا۔'' کمرے کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے سرگوشی میں سلو سے کہا اور پھر دروازے کو بے آواز کھول کر پھرتی سے باہر نکل گیا۔ وہ ایک لمبا کوریڈور تھا جو اس وقت بالکل سنسان

پڑا ہوا تھا۔ کوریڈور میں اور بھی کمروں کے دروازے کھل رہے تھے۔ سلو کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتا ہوا، وہ دبے قدموں آگے بڑھا اور پہلے پڑنے والے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر جھکتے ہوئے کی ہول سے کمرے کے اندر جھانکا۔ اس کی نظروں نے فوراً ہی کمرے میں نصب کمپیوٹرز، دفتری سامان اور ایک دبلی پتلی سی لڑکی کا احاطہ کرلیا۔ لڑکی کی عمر پچیس کے آس پاس تھی اور شکل کے اعتبار سے وہ قبول صورت کہلائی جاسکتی تھی۔ البتہ اس کے اسمارٹ جسم پر جینز اور ٹی شرٹ جچ رہے تھے۔ وہ ریوالونگ چیئر پر اس طرح بیٹھی ہوئی تھی کہ اس کا رخ دروازے کی طرف تھا اور دیوار کے ساتھ نصب کمپیوٹرز کی اسکرینز پشت پر چلی گئی تھیں۔ شہریار کی ہول سے کان لگا کر اندر کی سن گن لینے لگا جبکہ سلو چوکس کھڑا گردوپیش پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

''میری مجبوری کو سمجھو شیکھر۔ میں ابھی تم سے ملنے نہیں آسکتی۔ میں نے اس ٹائم چھٹی مانگی تو میری جاب ختم ہو جائے گی۔'' وہ بڑے میٹھے لہجے میں اپنے کان سے لگے موبائل پر کسی سے بات کررہی تھی۔

''جاب تم سے بڑھ کر نہیں ہے لیکن اس پر ہمارا فیوچر ڈیپینڈ کرتا ہے۔ اچھی انکم کے بنا ہم ایک اچھی لائف کیسے گزار سکیں گے۔'' دوسری طرف سے شاید اسے جذباتی طور پر بلیک میل کرنے کی کوشش کی گئی تھی جس کا جواب اس نے قدرے جھنجلاہٹ آمیز دلیل کے ساتھ دیا تھا۔

''ہم نیکسٹ ویک کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں ساتھ لنچ کریں گے۔ بلکہ میں ایسا کروں گی کہ آفس سے چھٹی لے لوں گی پھر ہم پورا دن ساتھ گزاریں گے۔'' اس کی گفتگو سے دوسری طرف موجود شخص سے اس کے تعلق کی نوعیت کا اندازہ ہورہا تھا۔ وہ موبائل فون پر شیکھر نامی جس شخص سے بات کررہی تھی، وہ یقینی طور پر اس کا محبوب یا منگیتر رہا ہوگا جو دفتری اوقات میں اسے ڈسٹرب کرکے پیشہ ورانہ فرائض میں کوتاہی کا سبب بن رہا تھا۔

''ابھی میں فون بند کررہی ہوں۔ تمہاری ناراضگی جب تمہیں ملنے آؤں گی، تب دور کردوں گی۔'' اگلا بندہ شاید کسی طرح قائل نہیں ہورہا تھا چنانچہ اس نے یکدم ہی فون بند کرنے کا فیصلہ کرلیا اور کال منقطع کرنے کے بعد دونوں ہاتھوں سے اس طرح سر تھام کر بیٹھ گئی کہ اس کا موبائل فون، سر اور ہاتھ کے درمیان میں دبا ہوا تھا۔ شہریار کے لیے یہ ایک اچھا موقع تھا۔ اس نے ہینڈل دبا کر ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا اور برق رفتاری سے اندر داخل ہوگیا۔ سلو نے بھی اس کی تقلید کی کیونکہ کوریڈور میں اس طرح منہ اٹھائے کھڑے رہنا خطرناک تھا۔ اچانک ہی کوئی بھی کسی کمرے سے باہر نکل کر اسے وہاں کھڑا دیکھ سکتا تھا۔

''کک... کون ہو تم؟'' ان دونوں کے اس طرح اچانک کمرے میں داخل ہونے پر لڑکی بوکھلا کر اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی اور پھر یکدم ہی اس کے چہرے کے تاثرات ایسے ہوگئے جیسے اس نے اپنے سامنے کسی بھوت کو دیکھ لیا ہو۔

''تم لوگ تہ خانے سے باہر کیسے نکلے؟'' لمحہ بھر میں پہچان کے مراحل طے کرنے کے بعد اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے کچھ حیرت سے پوچھا۔ یقینی طور پر وہ تہ خانے میں ان دونوں کی موجودگی سے باخبر تھی اور اس کے حساب سے یہ ایک ناممکن سی بات تھی کہ کوئی اپنی مرضی سے تہ خانے سے باہر نکل سکے۔

''ہم لفٹ سے اوپر آئے ہیں۔'' شہریار نے نہایت سادگی سے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کمپیوٹر کی اسکرین پر نظر ڈالی۔ وہاں عمارت کے بیرونی حصے، مختلف زاویوں سے دکھائی دے رہے تھے جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ عمارت ایک ایسے علاقے میں موجود ہے جہاں بہت کم عمارتیں موجود ہیں اور اردگرد کا زیادہ تر علاقہ خالی پڑا ہوا ہے۔ عمارت کے دروازے پر دو سیکیورٹی گارڈز چوکس کھڑے دکھائی دے رہے تھے جبکہ چار دیواری خاصی بلند ہونے کے ساتھ اس پر خاردار تار بھی بچھے ہوئے تھے۔ شہریار کو یقین تھا کہ ان تاروں میں برقی رو دوڑانے کا انتظام بھی موجود ہوگا۔

''اندو میڈم اور ان کے ساتھی کہاں ہیں؟'' اس کا جواب سن کر لڑکی نے ایک اور سوال داغا اور آہستہ سے اپنا بایاں ہاتھ پشت کی طرف لے جانے کی کوشش کرنے لگی۔ موبائل فون اس کے دائیں ہاتھ میں موجود تھا اور وہ اس نے بالکل سامنے رکھا ہوا تھا۔

''اپنا ہاتھ سامنے کرو ورنہ اس گن سے نکلنے والی گولیاں تمہارے بھیجے میں گھس جائیں گی اور تمہیں خود ہی معلوم ہوجائے گا کہ تمہاری اندو میڈم اور ان کے ساتھی کہاں ہیں۔'' شہریار نے سخت لہجے میں اسے دھمکایا تو اس نے بے بسی کے عالم میں اپنا ہاتھ سامنے کرلیا۔ اسی وقت سلو آگے بڑھا اور اسے اتنی زور سے جھٹکا دے کر واپس کرسی پر بٹھایا کہ اس کا موبائل اس کے ہاتھ سے نکل کر نیچے گر گیا۔ فرش پر نرم و ملائم کارپیٹ بچھا تھا جس کی وجہ سے موبائل نیچے گرنے کی آواز پیدا نہیں ہوئی۔

''چھوڑو مجھے... کیا کررہے ہو؟'' لڑکی نے مزاحمت کی کوشش کی لیکن اس کی حالت سے ظاہر تھا کہ وہ اچانک پڑنے والی اس افتاد پر اچھی خاصی خوف زدہ ہوگئی ہے۔ ایئرکنڈیشنڈ کمرے کے باوجود اس کی پیشانی پسینے سے بھیگ چکی تھی۔ شاید وہ فیلڈ میں رہ کر کام کرنے کے بجائے دفتر تک محدود رہ کر کام کرنے کی عادی تھی اور اسے اس قسم کی صورتِ حال سے نمٹنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا یا پھر ایسا بھی ہوسکتا تھا کہ وہ یہ سوچ کر ضرورت سے زیادہ گھبرا گئی ہو کہ جو لوگ اندو اور اس کے مسلح ساتھیوں کو زیر کرکے تہ خانے سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوگئے تھے، وہ خاصے خطرناک ہوں گے۔

''آواز نکالے بغیر چپ چاپ بیٹھی رہو ورنہ گردن کی ہڈی توڑ کر ایسے جان نکالوں گا کہ تمہارے فرشتوں کو بھی تمہارے مرنے کی خبر نہیں ہوگی۔'' سلو نے غرا کر اسے دھمکی دی لیکن اس کی آواز بس اتنی تھی کہ کمرے سے باہر نہ نکل سکے۔ اس کمرے کے علاوہ بھی وہاں بہت سے کمرے تھے اور وہ نہیں جانتے تھے کہ کس کس کمرے میں کتنے افراد موجود ہیں جو آواز سن کر اس طرف متوجہ ہوسکتے ہیں۔

''یہ ٹھیک ہے۔ تم بس اس کا منہ بند رکھو۔ باقی میں خود دیکھ لوں گا۔'' شہریار اس کی کارکردگی کو سراہتے ہوئے کمپیوٹر کی طرف بڑھا۔ فوراً ہی اس کی نظر میں کی پیڈ سے ہٹ کر لگا ایک بٹن آگیا۔ لڑکی نے شاید ہاتھ پیچھے لے جاکر اسی بٹن کو دبانے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش کو دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ بٹن کسی الارم وغیرہ سے منسلک ہے۔ اس بٹن سے صرف نظر کرتا ہوا وہ کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہوا۔ ذرا ہی دیر میں اسے اپنی کوشش میں کامیابی حاصل ہوئی اور اسکرین پر موجود مناظر تیزی سے تبدیل ہونے لگے۔ اب وہ بیرونی مناظر کے بجائے عمارت کے اندرونی حصے کے مناظر بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ عمارت میں کوئی بارہ کے قریب کمرے موجود تھے جن میں تہ خانے کے اوپر والے کمرے کے علاوہ کمرا بھی شامل تھا جس میں وہ اس وقت موجود تھے۔ باقی کے دس کمروں میں سے دو گیسٹ روم کے انداز میں سجے ہوئے تھے جبکہ ایک ڈرائنگ روم کی طرز پر سیٹ تھا۔ ان تینوں کمروں میں کوئی ذی نفس نظر نہیں آرہا تھا البتہ ایک طویل ہال نما کمرے میں چھ افراد ڈائننگ ٹیبل کے گرد بیٹھے کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ ان چھ افراد کے علاوہ عمارت کے دیگر کمروں میں مزید پانچ افراد اور بھی موجود تھے جن میں سے تین تو ایک جگہ بیٹھے آپس میں کوئی گفتگو کررہے تھے جبکہ دو دفتری نوعیت کا کوئی کام کررہے تھے۔ شہریار نے مزید بٹن دبائے تو اسکرین پر تہ خانے کا منظر بھی نظر آنے لگا۔ وہاں اندو اور اس کے ساتھی فرش پر بے دست و پا پڑے بہ زبانِ خاموشی اپنی شکست اور ریزہ ریزہ غرور کی داستان سنا رہے تھے۔ شہریار نے سلو کو اشارہ کیا تو اس نے لڑکی کی کرسی کو گھما کر اس کا رخ اسکرین کی طرف کردیا۔ وہاں موجود منظر کو دیکھ کر اس کا چہرہ مزید سفید پڑ گیا۔

''پلیز! مجھے کچھ مت کہنا۔ میں ابھی جینا چاہتی ہوں۔ میں نے اور شیکھر نے ایک ساتھ جیون بتانے کے اتنے سپنے دیکھے ہیں۔ اگر مجھے کچھ ہوگیا تو شیکھر صدمے سے پاگل ہو جائے گا۔'' اس نے عجیب معصومانہ لہجے میں شہریار سے التجا کی اور یکدم ہی بری طرح سسکنے لگی۔

''اس انجام کے لیے تو تمہیں اسی وقت سے تیار رہنا چاہیے تھا جب تم نے را کے لیے کام کرنا شروع کیا تھا۔'' شہریار نے سپاٹ لہجے میں اسے جواب دیا۔

''میں مجبور تھی۔ میرے پاس یہ چوائس نہیں تھی کہ میں انہیں انکار کرسکوں۔'' اس نے اسی طرح سسکتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟ کیا را جیسے اداروں میں بھی جبری بھرتیاں ہوتی ہیں؟'' شہریار حیران ہوا۔

''دوسروں کا مجھے نہیں پتا لیکن میرے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔ یہ میری بیڈ لک تھی کہ میں نے ایم سی ایس کے ایگزامز میں ٹاپ کیا اور یکدم ہی بہت سے لوگوں کی نظروں میں آگئی۔ ان دنوں میں اپنی اس مشہوری کے لیے بہت خوش تھی۔ میں نے اور میرے ٹیچرز نے نیوز رپورٹرز کو بڑھ چڑھ کر بتایا کہ کمپیوٹر کی دنیا میں، میں کتنی جانکاری رکھتی ہوں اور کیسے کیسے کارنامے انجام دے سکتی ہوں۔ مجھے فوراً ہی کئی جگہ سے جاب کی آفرز آنا شروع ہوگئیں۔ میں نے اپنے پیرنٹس اور شیکھر سے رائے لے کر گورنمنٹ سیکٹر کی طرف سے ملنے والی سب سے اٹریکٹو آفر کو ایکسیپٹ کرلیا۔ وہاں تین مہینے تک مجھے پرکھا گیا اور پھر یہاں ٹرانسفر کردیا گیا۔ تمہیں معلوم ہے، یہ لوگ مجھ سے کیا کیا کام لیتے ہیں۔ انہوں نے مجھے کمپیوٹر ایکسپرٹ سے زیادہ ایک ہیکر کے طور پر استعمال کیا ہے۔ میں ان کے لیے اپنی ہی گورنمنٹ کے کئی آفیسرز اور نیتاؤں کے راز چوری کرتی ہوں۔ میں نے ان کے لیے کئی دولت مندوں کے اکاؤنٹس صاف کیے ہیں اور آگے بھی جانے یہ مجھ سے کیا کیا کام لینے والے ہیں۔ میں یہ جاب چھوڑ دینا چاہتی ہوں لیکن نہیں چھوڑ سکتی۔ مجھے اپنے منگیتر شیکھر سے ملنے کی پرمیشن بھی بہت مشکل سے ملتی ہے اور وہ بھی اس

طرح کہ ایک آدمی سارا ٹائم ہماری نگرانی کرتا رہتا ہے۔ میرے موبائل فون سے ہونے والی ہر کال کا ریکارڈ یہ لوگ چیک کرتے ہیں اور میں کسی سے اپنے من کی بات نہیں کر سکتی۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کسی دن یہ لوگ میرے پیرنٹس کی طرح شیکھر کی بھی جان نہ لے لیں۔ اس لیے میں خود بھی جان کر اس سے دور رہنے کی کوشش کرتی ہوں لیکن وہ میری سنتا ہی نہیں ہے۔" وہ رندھی ہوئی آواز میں انہیں ایک عجیب سی داستان سناتی چلی گئی۔

"تمہیں کیسے معلوم کہ تمہارے پیرنٹس کو ان لوگوں نے قتل کیا ہے؟" شہریار کا لہجہ خود بخود ہی اس کے لیے نرم پڑ گیا۔

"مجھ سے اپنے مطلب کے کام لینے سے پہلے مجھ پر زور دیا جا رہا تھا کہ میں چوبیس گھنٹے یہیں رہا کروں اور صرف ویک اینڈ پر اپنے پیرنٹس سے ملنے کے لیے جایا کروں۔ میں اپنے پیرنٹس کی اکلوتی اولاد ہوں اس لیے انہیں اور مجھے دونوں کو ہی یہ بات منظور نہیں تھی۔ میرے انکار پر پہلے تو مجھ پر بہت دباؤ ڈالا گیا لیکن جب میں نے جاب چھوڑنے کی دھمکی دی تو سب خاموش ہو گئے۔ پھر ٹھیک ایک مہینے بعد میرے پیرنٹس ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہو گئے۔ ان کے مرنے کے بعد شیکھر فوری طور پر مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن مجھے دفتر کی طرف سے بتایا گیا کہ ایگریمنٹ کے مطابق میں پانچ سال تک نہ تو یہ جاب چھوڑ سکتی ہوں اور نہ ہی شادی کر سکتی ہوں۔ مجھے نہیں پتا کہ یہ شرطیں کب اور کیسے ایگریمنٹ میں شامل کی گئیں لیکن چونکہ اس پر میرے دستخط موجود تھے، اس لیے میں اس سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔ ورنہ دوسری صورت میں مجھے پانچ سال جیل میں کاٹنے پڑتے۔ میں مجبور ہو کر چوبیس گھنٹے کے لیے یہاں رہنے پر راضی ہو گئی اور اب ان کے اشاروں پر ناچ رہی ہوں۔ یہ آفس میرا نہیں ہے۔ میں صرف کھانے کے وقفے میں یہاں بیٹھتی ہوں ورنہ میرے کام کا کمرا دوسرا ہے جہاں میں ان کی مرضی کے کام کرتی ہوں۔ اب تم ہی بتاؤ کہ ان حالات میں میرا یہ سوچنا غلط تو نہیں ہے کہ انہی لوگوں نے میرے پیرنٹس کو جان بوجھ کر حادثے کا نشانہ بنایا تھا۔" اس کا لہجہ نفرت اور دکھ میں ڈوبا ہوا تھا۔

شہریار کو اس کی داستان سن کر دلی دکھ ہوا۔ آج تک تو وہ اپنے ہی ملک میں را کی ریشہ دوانیوں سے خار کھاتا تھا لیکن یہاں تو انہوں نے اپنوں کو ہی نہیں چھوڑا تھا۔ بہر حال، اس وقت اسے اس لڑکی کے حالات پر کڑھنے کی فرصت نہیں تھی۔ اس وقت تو وہ لوگ خود مصیبت میں پھنسے ہوئے تھے اور انہیں کسی نہ کسی طرح یہاں سے نکلنا تھا چنانچہ اپنا توجہ اس طرف مبذول رکھی اور سلو سے مخاطب ہو کر بولا۔

"میرے خیال میں تم بنا ہتھیار کے خاموشی سے ان دو افراد کو تو آرام سے آف کر سکتے ہو۔"

"بالکل۔" سلو نے جواب دیا اور فوراً ہی کمرے سے باہر نکل گیا۔ شہریار اسے مانیٹر کی اسکرین پر دیکھ سکتا تھا۔ وہ پہلے نزدیک ترین کمرے کے دروازے پر پہنچا اور اسے نہایت آہستگی سے کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ اندر موجود شخص کو فوری طور پر اس کی آمد کا احساس نہیں ہوا اور جب ہوا تو مصیبت اس کے سر پر پہنچ چکی تھی۔ اس نے گھبرا کر اپنی جگہ سے اٹھنے اور دراز کھول کر شاید کوئی ہتھیار نکالنے کی بیک وقت کوشش کی لیکن دونوں ہی مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکا اور سلو نے اسے چھاپ لیا۔ معلوم نہیں وہ لڑنے بھڑنے والا آدمی تھا یا نہیں لیکن حقیقتاً اس پر اتنی اچانک یہ افتاد ٹوٹی تھی کہ ہاتھ پیر ہلانے کا موقع ہی نہیں ملا تھا اور وہ گردن کی ہڈی ٹوٹنے کے باعث چند لمحوں میں ہی اپنی زندگی سے محروم ہو گیا۔

اس شخص کو اپنے انجام تک پہنچانے کے بعد سلو نے دوسرے کمرے کا رخ کیا۔ وہ چونکہ اسکرین پر دیکھ کر عمارت کی لوکیشن اچھی طرح سمجھ چکا تھا اس لیے حرکت کرنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں کر رہا تھا۔ ادھر شہریار نے یہ احتیاط کی تھی کہ اپنے ساتھ موجود اس کمپیوٹر ایکسپرٹ لڑکی کی کرسی کا رخ اسکرین کی طرف سے پھیر دیا تھا تا کہ وہ یہ سب نہ دیکھ سکے۔ را کے ٹھکانے پر موجود ہونے کے باوجود اسے وہ لڑکی خاصی ڈرپوک لگی تھی اس لیے یہ احتیاط ضروری تھی کہ کہیں وہ کوئی اندوہناک منظر دیکھ کر اضطراری طور پر چیخ ہی نہ پڑے۔ لڑکی کی گردن سے گن کی نال لگا کر اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہوئے وہ اسکرین پر بھی توجہ رکھے ہوئے تھا۔ دوسرے کمرے میں داخل ہونے والے سلو کو اس دفعہ کچھ دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ کمرے کا دروازہ کھولتے ہی وہاں موجود شخص نے اسے دیکھ لیا اور پھرتی سے اپنا پسٹل نکال لیا۔ اس موقع پر سلو نے عجیب جرأت مندی کا مظاہرہ کیا اور اپنے ہاتھ میں موجود گن اس کے پسٹل والے ہاتھ پر دے ماری۔ اس کا نشانہ بے حد سچا تھا۔ اس آدمی کے ہاتھ سے پسٹل نکل گیا اور گن سمیت فاصلے پر جا گرا۔ سلو نے اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اپنی پینٹ میں اڑسی ہوئی دوسری گن نکال کر اس کا رخ آدمی کی طرف کر دیا تو شہریار کو اس

کے آرام سے گن دے مارنے کی وجہ سمجھ آئی۔ اس کے پاس اپنی ذاتی گن کے علاوہ اندو کے ساتھی سے چھینی گئی گن بھی موجود تھی جس کی وجہ سے اس نے نہایت ذہانت اور پھرتی سے کام لیتے ہوئے صورتِ حال کو اپنے حق میں کرلیا تھا۔

شہریار اس کی آواز نہیں سن سکتا تھا لیکن دیکھنے سے اسے سمجھ آرہا تھا کہ اس نے اس درمیانی عمر کے گنجے آدمی کو ہاتھ اوپر اٹھا کر میز کے پیچھے سے نکلنے کا حکم دیا ہے۔ اس حکم پر وہ آدمی کچھ بولا ضرور لیکن سلو کے خوفناک تیور دیکھتے ہوئے اسے انکار کی ہمت نہیں ہوئی اور وہ میز کے پیچھے سے نکل کر دیوار کی طرف بڑھ گیا اور اپنا رخ اس طرف کرکے کھڑا ہوگیا۔ سلو محتاط قدموں سے اس کی جانب بڑھا اور اپنا گن والا ہاتھ اوپر اٹھا کر پشت پر سے اسے ضرب لگانی چاہی لیکن وہ شخص اس کی توقع سے زیادہ ہوشیار ثابت ہوا اور یکدم ہی پلٹ کر اس پر حملہ آور ہوگیا۔ اچانک لگنے والے جھٹکے کی وجہ سے سلو کے ہاتھ سے گن نکل کر دور جاگری۔ کمرے کے فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا اس لیے گن کے گرنے کی آواز پیدا ہونے کا سوال ہی نہیں تھا۔ ورنہ دوسری صورت میں دوسرے دو کمروں میں موجود افراد شاید اب تک اس طرف متوجہ ہوچکے ہوتے۔

گن ہاتھ سے نکل جانے پر سلو نے جھنجلا کر اپنی لات چلائی جو مقابل کے پہلو میں لگی اور جواباً اس نے بھی سلو کے منہ پر ایک گھونسا دے مارا۔ اس گھونسے کے جواب میں سلو نے ایک بار پھر اپنی ٹانگ کا استعمال کیا اور دونوں رانوں کے بیچ میں ایسی نازک جگہ کو نشانہ بنایا کہ وہ شخص بلبلا اٹھا۔ لیکن آدمی جی دار تھا اس لیے منہ سے کوئی آواز نکالے بغیر مقابلے پر ڈٹا رہا اور سلو کی گردن کو کھڑی ہتھیلی کے وار کا نشانہ بنانا چاہا۔ سلو نے یکدم جھکائی دے کر نہ صرف خود کو اس کے اس وار سے بچایا بلکہ اس کے پیٹ میں اپنے سر سے زوردار ٹکر دے ماری۔ یقیناً یہ ایک زوردار ضرب تھی لیکن وہ شخص اسے جھیل گیا اور سلو کے بالوں کو اپنی دونوں مٹھیوں میں بھینچ لیا۔ کچھ ہی لمحوں میں وہ دونوں قالین پر گرے ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے۔ شہریار کے لیے یہ بڑے نازک اور صبر آزما لمحات تھے۔ اس نے ذہنی طور پر خود کو تیار کرلیا کہ اگر سلو اس آدمی پر قابو حاصل نہیں کرپایا تو اسے خود ایکشن میں آنا ہوگا کیونکہ اس صورت میں دوسرے افراد کا بھی باخبر ہو جانا لازمی تھا اس لیے اس کے لیے صورتِ حال بے حد تشویش ناک ہوجاتی۔ فی الحال تو قابلِ اطمینان بات یہ تھی کہ گفتگو اور کھانے میں مصروف آدمیوں کے دونوں ہی

گروہوں کو اپنے اردگرد کی بھنک نہیں پڑسکی تھی اور وہ [illegible] اپنی مصروفیت میں مشغول تھے۔

سلو اور اس کا مقابل آپس میں بدستور الجھے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ مقابل بھی لڑنے کے ہنر میں ماہر ہے البتہ سلو کو اس پر یہ برتری حاصل تھی کہ وہ اس کے مقابلے میں جوان اور زیادہ توانا جسم کا مالک تھا۔ آخر اس کی اس برتری نے مقابلے کا فیصلہ کردیا۔ سلو نے اچانک ہی اپنے مقابل کے دونوں کانوں کو مضبوطی سے گرفت میں [illegible] اور اس کا سر پوری قوت سے دیوار کے ساتھ دے مارا۔ [illegible] اتنی زوردار تھی کہ اس کے مقابل کی بالوں سے محروم کھوپڑی [illegible] چیخ کر رہ گئی اور وہ کسی مردہ چھپکلی کی طرح نیچے گر کر [illegible] حالت میں قالین پر لمبا لیٹا نظر آنے لگا کہ اس کے سر سے نکلنے والا خون تیزی سے قالین کو بھگو رہا تھا۔ اس کی حالت سے بے نیاز سلو اطمینان سے اسے چھوڑ کر کمرے کے ان حصوں کی طرف متوجہ ہوا جہاں اس کی دونوں گنز گری تھیں۔ گنز اپنے قبضے میں کرنے کے بعد وہ متوازن چال چلتا ہوا شہریار کے پاس واپس آگیا۔

”اب کیا کرنا ہے؟“ اندر گھستے ہی اس نے شہریار سے پوچھا اور یہ دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی کہ اس کے لباس پر نظر آنے والے خون کے چھینٹوں نے لڑکی کے خوف زدہ چہرے کی زردی میں کئی گنا اضافہ کردیا ہے۔ یہ خون اس گنجے کا تھا جس کا سر اس نے دیوار سے ٹکرا کر اس کی زندگی کا قصہ تمام کیا تھا۔

”اب ہمیں ان تینوں گروپس سے نمٹنا ہوگا۔“ اس کا اشارہ ڈائننگ ہال اور لیونگ روم کے علاوہ گیٹ پر موجود گارڈز کی طرف تھا۔ وہ کُل ملا کر گیارہ افراد تھے جن سے ان دونوں کو بیک وقت نمٹنا تھا۔ کرنے کو تو وہ یہ بھی کرسکتے تھے کہ اپنے ساتھ موجود لڑکی کو بے ہوش کرتے اور گیٹ چھوڑ کر کسی دوسرے راستے سے عمارت سے باہر نکلنے کی کوشش کرتے لیکن شہریار کے نزدیک وہ اس کے وطن کے بدترین دشمن تھے چنانچہ وہ انہیں ان کے انجام تک پہنچائے بغیر وہاں سے فرار نہیں ہونا چاہتا تھا۔

”اتنے افراد سے اکٹھا نمٹنے کے لیے ہمیں لازماً گنز کا استعمال کرنا پڑے گا اور ہم صرف دو ہیں۔ یعنی بیک وقت حملہ کرنے کی صورت میں ہمیں کسی نہ کسی ایک گروپ کو نظرانداز کرنا پڑے گا اور ظاہر ہے اس گروپ کے افراد فائرنگ کی آواز سن کر ہمارے مقابلے پر آجائیں گے۔“ سلو نے سنجیدگی سے صورتِ حال کا احاطہ کیا جس پر لڑکی نے ایک

بار پھر سسکنا شروع کردیا۔

”پہلے اس کا منہ تو بند کراؤ پھر کچھ کرتے ہیں۔“ سلو بیزاری سے بولا جس پر شہریار نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے سر پر ایک جچی تلی ضرب لگا کر اسے بے ہوش کردیا۔ بے شک وہ مظلوم تھی لیکن تھی تو دشمن کے کیمپ کا حصہ اس لیے وہ اس پر بھروسا نہیں کرسکتے تھے۔

”میں ڈائننگ ہال میں جاتا ہوں، تم لیونگ روم میں جاؤ۔ یہ لوگ اپنی مصروفیت میں مگن ہیں۔ ہم بیک وقت فائرنگ کریں گے تو کسی کو بھی سنبھلنے کا موقع نہیں ملے گا۔ جب تک گارڈز فائرنگ کی آواز سن کر اندر کا رخ کریں گے، ہمارا کام ختم ہوچکا ہوگا اور ہم انہیں سنبھال لیں گے۔“

لڑکی کو بے ہوش کرکے شہریار نے فوری طور پر اسے اگلے لائحہ عمل سے آگاہ کیا۔ اسکرین پر دیکھتے ہوئے وہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ ڈائننگ ہال میں موجود افراد کھانے کے اختتامی مراحل میں ہیں۔ اس لیے ان کا فوری ایکشن میں آنا ضروری تھا۔ اگر دیر ہوجاتی تو وہ چھ افراد تتر بتر ہوجاتے اور ایسی صورت میں ان پر قابو پانا زیادہ مشکل ہوجاتا۔ سلو بھی اس بات کو سمجھ رہا تھا چنانچہ تیزی سے حرکت میں آگیا۔ وہ دونوں ایک ساتھ اپنے ٹارگٹ تک پہنچے اور پھرتی سے دروازہ کھول کر دونوں ہاتھوں میں موجود گنز سے ایک ساتھ فائرنگ شروع کردی۔ گنز کے دہانوں سے نکلتی گولیوں نے انسانی جسموں کو بیدردی سے چھیدنا شروع کردیا۔ سلو کے سامنے تین افراد تھے۔ وہ تینوں ہی لمحوں میں گولیاں کھا کر لوٹ پوٹ ہوگئے۔ البتہ ڈائننگ ہال میں صورتِ حال ذرا مختلف تھی۔ دو گنز سے بیک وقت فائر کرنے کے باوجود شہریار ان چھ کے چھ افراد کو ایک ساتھ نشانہ نہیں بنا سکتا تھا اور ان میں سے دو افراد نے نیچے بیٹھ کر ڈائننگ ٹیبل کو الٹ کر خود کو اس کے پیچھے چھپا لیا۔ ڈائننگ ٹیبل کے الٹنے کے نتیجے میں اس پر موجود برتن اور خورونوش کی اشیا نیچے گر کر بکھر گئیں اور گولیاں کھا کر فرش پر گرنے والے اسی کھانے میں لوٹ پوٹ ہونے لگے جسے کچھ دیر قبل مزے لے لے کر کھا رہے تھے۔

یہ ساری سیکنڈوں کی کہانی تھی اور اگر شہریار نے خود کو یکدم ہی نیچے نہ گرا لیا ہوتا تو اس گولی کا نشانہ بن جاتا جو ڈائننگ ٹیبل کی آڑ میں چھپنے والوں میں سے ایک نے چلائی تھی۔ گولی ریوالور سے چلائی گئی تھی اور کھلے دروازے سے گزر کر کوریڈور میں سامنے والے کمرے کی دیوار سے ٹکرا گئی تھی۔ شہریار نے نیچے گرتے ہی ڈائننگ ٹیبل پر ایک برسٹ مارا۔ وہ مضبوط لکڑی کی بنی ہوئی ٹیبل تھی پھر بھی گولیوں نے اس میں کئی چھید کر ڈالے۔ ساتھ ہی ایک زوردار سسکاری بھی سنائی دی جو یقیناً ان دو میں سے کسی ایک کے زخمی ہونے کی نشانی تھی۔ برسٹ مارنے کے بعد شہریار ایک لمحہ بھی اپنی جگہ پر نہیں ٹھہرا اور فوراً ہی پوزیشن بدل لی۔ یہ چیز اس کے لیے سودمند ثابت ہوئی اور وہ ایک بار پھر اس فائر سے بچ گیا جو ڈائننگ ٹیبل کے پیچھے سے ریوالور ہی سے کیا گیا تھا۔ اس فائر نے اسے دو اہم حقائق سے آگاہ کیا۔ اول یہ کہ ان دونوں میں سے صرف ایک شخص مسلح تھا۔ دوسرے اس کے پاس بھی محض ریوالور ہی تھا۔ ظاہر ہے اپنے تئیں وہ لوگ اپنے ایک محفوظ ٹھکانے پر بیٹھے پُرتکلف کھانے سے لطف اندوز ہورہے تھے۔ اس لیے اسلحہ ساتھ رکھنا غیرضروری سمجھا ہوگا اور کسی ایک شخص کے پاس یہ ریوالور بھی بس اتفاقاً ہی موجود ہوگا۔ اسلحے کے معاملے میں اپنی برتری کو محسوس کرکے اس نے فرش پر پڑے پڑے ہی اندھا دھند فائرنگ شروع کردی۔ دونوں خطرناک گنز کے دہانوں سے نکلنے والی دہکتے انگاروں جیسی گولیوں نے سیکنڈوں میں فیصلہ سنا دیا اور اس نے اپنی فتح کو محسوس کرکے کھڑی ڈائننگ ٹیبل کے پیچھے جھانکا تو اسے دو نفوس اپنے ہی خون میں لت پت آخری سانسیں گنتے دکھائی دیے۔ ایک نظر میں ان چھ کے چھ کی موت کا یقین کرلینے کے بعد وہ باہر کی طرف لپکا تو اسے سلو کوریڈور کے آخری سرے پر موجود سیڑھیوں سے نیچے اترتا دکھائی دیا۔ اپنے شکاروں سے نمٹتے ہوئے اس نے باہر سے بھی فائرنگ کی آوازیں سنی تھیں چنانچہ جب سلو کے فتح مندی سے چمکتے چہرے کو دیکھا تو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ اپنے شکاروں سے نمٹنے کے بعد چھت پر چلا گیا ہوگا۔ مین گیٹ سے مرکزی عمارت ذرا فاصلے پر تھی چنانچہ جب گارڈز نے فائرنگ کی آواز سن کر اندر کا رخ کیا ہوگا تو انہیں کچھ وقت لگا ہوگا۔ اتنی مہلت چیتے کی سی پھرتی رکھنے والے سلو کے لیے کافی تھی۔ اس نے چھت پر سے ہی ان دونوں کو نشانہ بنا کر ان کا کام تمام کردیا ہوگا۔

”اب یہاں سے نکلنا چاہیے ورنہ فائرنگ کی آوازیں سن کر کوئی نہ کوئی پولیس کو خبر دے دے گا۔“ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی سلو نے کہا۔

”ہاں چلتے ہیں لیکن اس سے پہلے میں کچھ اور کرنا چاہتا ہوں۔ تم ایسا کرو کہ اس بے ہوش لڑکی کو لے کر کسی ایک گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ میں ابھی آتا ہوں۔“ اس نے سلو کو ہدایت دی تو وہ منہ بناتا ہوا پہلے اس کمرے میں گیا جہاں

صاف ستھرے طریقے سے مرنے والے شخص کی لاش پڑی تھی۔ اپنی خون آلود قمیص کی جگہ اس کی قمیص پہن کر وہ اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جہاں وہ لڑکی بے ہوش پڑی تھی۔ اسے کندھے پر ڈال کر وہ واپس آیا تو شہریار دکھائی نہیں دیا۔ اس کی فکر میں مبتلا ہونے کے بجائے وہ بھاگتا ہوا باہر نکل گیا۔ باہر تین عدد گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اس نے سیاہ شیشوں والی سرخ گاڑی کا انتخاب کیا اور لڑکی کو اس کی پچھلی سیٹ پر ڈال کر خود ڈرائیونگ سیٹ پر آبیٹھا۔ اس کی کاریگری نے چند لمحوں کے اندر بغیر چابی کے گاڑی کا انجن اسٹارٹ کر دیا۔ وہ اسے چلاتا ہوا عمارت کے مین گیٹ تک پہنچا۔ بڑے سے گیٹ کا ذیلی دروازہ کھلا ہوا تھا جو یقیناً باہر موجود گارڈز فائرنگ کی آواز سن کر بوکھلاہٹ میں کھلا چھوڑ آئے تھے۔ اس نے انجن کو اسٹارٹ چھوڑ کر ڈرائیونگ سیٹ سے اتر کر گیٹ کو چوپٹ کھول دیا۔ اسی وقت اسے شہریار اندر سے دوڑ کر آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے پہنچنے سے قبل وہ ایک بار پھر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا تھا۔ شہریار نے پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر ابھی دروازہ بند بھی نہیں کیا تھا کہ سلو...... گاڑی کو گولی کی طرح نکال کر باہر لے گیا اور اسی رفتار سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ پھر بھی اسے عقب نما آئینے میں عمارت سے بلند ہوتے شعلے نظر آ گئے تھے۔

''یہ کیا ہوا ہے؟'' اس نے تجسس آمیز لہجے میں دریافت کیا۔

''شارٹ سرکٹ۔'' شہریار نے سرد لہجے میں جواب دیا۔ راوالوں سے اس کی نفرت کی بنیادیں بہت گہری تھیں۔ انہوں نے اسے نجی اور قومی دونوں اعتبار سے شدید نقصان پہنچایا تھا۔ وہ نہ تو معصوم شینا کی دردناک موت بھول سکا تھا اور نہ ہی اپنے دوستوں جیسے بھائی سجاد رانا کا قتل۔ وطن کے خلاف کی جانے والی سازشیں اور ناقابلِ معافی جرائم اپنی جگہ تھے اسی لیے موقع ملنے پر ان کی ایک بڑی افرادی قوت کو نیست و نابود کرنے کے علاوہ اس نے انہیں زبردست مالی نقصان پہنچانے کا موقع بھی ضائع نہیں کیا تھا۔ اس عمارت میں موجود بہترین انتظامات دیکھتے ہوئے یہ اندازہ قائم کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ را کا کوئی اہم ٹھکانا تھی اور اب وہ لوگ اس ٹھکانے سے محروم ہو گئے تھے۔

''ہم اس گاڑی میں زیادہ دیر تک سفر نہیں کر سکتے۔ یہ گاڑی فوراً ٹریس ہو جائے گی۔'' اس کی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے سلو نے کوئی غیر ضروری بات کرنے کے بجائے خود بھی بے حد سنجیدگی سے ایک اہم نکتے کی طرف اس کی توجہ مبذول کروائی۔

''ہوں... ٹھیک ہے، ابھی تو چلتے رہو۔ ہم آگے جا کر یہ گاڑی چھوڑ دیں گے۔'' شہریار نے اسے جواب دیا اور برابر میں بے ہوش پڑی لڑکی کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہاں سے فرار ہوتے ہوئے وہ پچھلی نشست پر بیٹھا ہی اس لیے تھا کہ لڑکی کا کوئی بندوبست کر سکے۔ تھوڑی دیر کی کوشش کے بعد وہ ہوش میں آ گئی۔

''تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟'' ہوش میں آنے پر خود کو گاڑی میں دیکھ کر اس نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

''ہم تمہیں کہیں نہیں لے جا رہے۔ بس یوں سمجھو کہ تمہاری مظلومیت کو دیکھتے ہوئے ہم نے تمہاری جان بخش دی ہے اور اس کے بدلے میں تمہیں یہ کرنا ہو گا کہ جب تم سے تفتیش کی جائے تو کہہ دینا آج تم چھٹی پر تھیں اس لیے کچھ نہیں جانتیں۔'' اس نے سپاٹ سے لہجے میں لڑکی کے سوال کا جواب دیا اور پھر سلو سے بولا۔ ''گاڑی یہیں روک دو۔''

سلو نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور مصروف سڑک پر نظر آنے والے بس اسٹاپ کے قریب گاڑی روک دی۔

''اترو اور اپنے گھر جا کر خود کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔'' شہریار نے لڑکی سے کہا تو وہ یوں تیزی سے دروازہ کھول کر نیچے اتری کہ اگر ایک سیکنڈ کی بھی دیر ہو گئی تو وہ لوگ اپنا فیصلہ بدل لیں گے۔ اس کی بے یقینی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا تھا کہ اس نے نیچے اترنے کے بعد اپنے پیچھے گاڑی کا دروازہ تک بند کرنے کی زحمت نہیں کی اور بجائے بس اسٹاپ پر رکنے کے سڑک پار کر کے تیزی سے دوسری طرف جانے لگی۔ شہریار نے خود ہی ہاتھ بڑھا کر دروازہ بند کیا اور سلو ایک بار پھر گاڑی کو حرکت میں لے آیا۔ لیکن ابھی گاڑی چلی ہی تھی کہ وہاں ایک عجیب سا شور سنائی دیا۔ شہریار نے بے ساختہ ہی گردن موڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ ان کے پیچھے ٹریفک رکنے لگا تھا اور لوگ دوڑ کر سڑک پر ایک جانب جا رہے تھے۔

''وہ مر گئی۔ ہیوی ٹرک نے اسے روند ڈالا۔'' سلو بیک ویو مرر میں پہلے ہی لڑکی کو دیکھ رہا تھا اس لیے زور سے بولتے ہوئے اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اس انکشاف کو سن کر وہ ششدر رہ گیا۔ ابھی چند سیکنڈ ہی تو گزرے تھے جب اس نے لڑکی کو اس کی جان بخشی کا مژدہ سنایا تھا لیکن وہ جو کاتبِ تقدیر تھا اس نے اس کے فیصلے پر خطِ تنسیخ پھیر کر انسان کی بے بسی و بے اختیاری کو ثابت کر دیا تھا۔

''تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ مر گئی ہے۔ ہو سکتا ہے معمولی سا حادثہ ہوا ہو؟'' وہ جیسے یقین کرنے پر تیار نہیں تھا۔

''میں نے خود اسے ٹرک کے نیچے آتے دیکھا ہے اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی معجزہ نہ ہوا ہو تو وہ فوراً ہی اپنی جان سے چلی گئی ہو گی یا کم سے کم بھی اتنی شدید زخمی ہوئی ہو گی کہ عمر بھر کے لیے معذور تو ضرور ہو گئی ہو گی۔'' سلو نے بدستور ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے اسے جواب دیا۔ وہ اتنی رفتار سے گاڑی چلا رہا تھا کہ وہ لمحوں میں ہی جائے حادثہ سے کافی دور نکل گئے تھے اور اب اس کی کوشش تھی کہ مصروف سڑکوں کو چھوڑ کر کم ٹریفک والے راستوں کا رخ کرے کیونکہ ابھی انہیں اس گاڑی سے بھی نجات حاصل کرنی تھی۔

''بہت بدنصیب نکلی بے چاری۔ میں نے تو اس کی مظلومیت سے متاثر ہو کر اسے زندہ چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا تھا لیکن جو اللہ کو منظور۔'' شہریار ایک سرد آہ بھر کر رہ گیا۔

''اللہ نے ہمارے اور اس کے حق میں بہت بہتر فیصلہ کیا ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ اگر وہ تفتیش کے دوران وہ کہتی جو تم نے اس سے کہا تھا تو کیا وہ لوگ یقین کر لیتے؟ وہ حقیقت جاننے کے لیے اسے ادھیڑ کر رکھ دیتے اور ظاہر ہے، یہ ہمارے اور اس کے دونوں کے لیے بُرا ہوتا اس لیے سمجھو کہ جو ہوا اچھا ہوا۔ میں تو یوں بھی اسے زندہ چھوڑنے کے حق میں نہیں تھا لیکن تم باس ہو اس لیے اعتراض نہیں کیا۔'' سلو بولنے پر آیا تو تلخ لہجے میں بولتا چلا گیا۔ اس کے لہجے کی تلخی کے باوجود شہریار نے اپنے دل میں اعتراف کیا کہ وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ وہ کمزور لڑکی را کے بھیڑیوں کے سامنے زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتی تھی اور نتیجے میں وہ ان کے حلیوں سمیت اس سے ہر ممکنہ معلومات اگلوا لیتے۔

''میں گاڑی اس شاپنگ سینٹر کی پارکنگ میں روک دیتا ہوں۔ وہاں سے پھر ہم کسی اور طرف نکل جائیں گے۔'' جائے حادثہ سے دور نکلنے کے بعد سلو نے گاڑی کی رفتار نارمل کر لی تھی اور مستقل اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ ایک مصروف شاپنگ سینٹر نظر آنے پر اس نے شہریار سے کہا تھا۔ اس نے سر ہلاتے ہوئے منظوری دے دی۔ پارکنگ میں گاڑی کھڑی کرنے کے بعد انہوں نے گنز کو اپنے لباس میں چھپایا اور اس طرح باہر نکلے جیسے دو دوست خوش گوار موڈ میں خریداری کے لیے وہاں آئے ہوں لیکن پارکنگ سے نکل کر انہوں نے شاپنگ سینٹر کی عمارت کی طرف رخ کرنے کی زحمت نہیں کی اور ٹہلتے ہوئے دوبارہ سڑک پر آ گئے۔ چند قدم چلنے کے بعد انہیں ایک آٹو رکشا مل گیا۔ رکشے والے کو ایک قریبی علاقے کا پتا بتا کر وہ اس میں بیٹھ گئے۔ وہاں سے وہ کوئی دوسری پھر آگے تیسری سواری لیتے، تب کہیں جا کر کسی محفوظ ٹھکانے تک محفوظ طریقے سے پہنچنے میں کامیاب ہو پاتے۔

☆☆☆

وہ چاروں میز پر ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے تھے۔ ان کے درمیان آئندہ کی منصوبہ بندی سے متعلق ایک اہم میٹنگ اپنے اختتامی مراحل میں تھی اور دونوں گروپوں نے ایک دوسرے کی پیش کردہ تجاویز میں سے چند کو باہمی اتفاق سے منظور کر لیا تھا۔ ان دو گروپوں میں سے ایک موساد کے اسپیشل ایجنٹس لنڈا اور ڈیوڈ پر مشتمل تھا جبکہ دوسرے گروپ میں الفا اور بیٹا کہلانے والے ہیروئن کے وہ بین الاقوامی بیوپاری شامل تھے جو موساد کے تحت اسرائیل کے مفادات کو سامنے رکھتے ہوئے اپنا کاروبار جاری رکھے ہوئے تھے۔

''خوشی کی بات یہ ہے کہ ہمارا یہ اتحاد بہت سود مند ثابت ہوا ہے اور ہم چند مشکلات کے باوجود اپنے کام کو کامیابی سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ مجھے پوری امید ہے کہ ماضی کی طرح آئندہ بھی ہم اپنے منصوبوں پر کامیابی سے عمل کرتے رہیں گے۔'' بیٹا نے میز پر رکھی پرانی اور نادر شراب کی بوتل کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے خوش گوار لہجے میں کہا تو باقی افراد کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس میٹنگ میں ڈیوڈ اور لنڈا کی حیثیت مہمانوں کی تھی اور بیٹا میزبان ہونے کا حق ادا کرنے کے لیے خود اپنے ہاتھوں سے ان کے لیے جام تیار کر رہا تھا۔ لنڈا اور ڈیوڈ کے موساد سے متعلق ہونے کی وجہ سے میٹنگ کو اتنا خفیہ رکھا گیا تھا کہ وہاں کسی خدمت گار کو بھی آنے کی اجازت نہیں تھی اور شراب کے علاوہ کسی اور تکلف کی بھی زحمت نہیں کی گئی تھی۔

''میں آپ سے اتفاق کرتی ہوں مسٹر بیٹا اور مجھے یہاں طے ہونے والی ہر بات سے مکمل اتفاق ہے لیکن اس وقت میں ایک ایسی بات کو بھی آپ سے ڈسکس کرنا چاہتی ہوں جو ہماری میٹنگ کے ایجنڈے میں شامل نہیں تھی لیکن میں سمجھتی ہوں کہ اس پر آج ہی بات کر لی جائے۔'' لنڈا نے اس کے ہاتھ سے جام لیتے ہوئے اپنی اسی مسکراہٹ سے نوازا جس کے سامنے بڑے بڑے ڈھے جاتے تھے اور اس سے اختلاف کی ہمت کھو دیتے تھے۔

''کیوں نہیں مس لنڈا! تم اگر ایسا سمجھتی ہو تو ضرور بات کرو۔'' بیٹا نے فراخ دلی سے اسے اجازت دی۔ اس

دوران وہ باقی دونوں افراد کو بھی تیار شدہ جام تھما چکا تھا اور اب اپنے لیے جام تیار کر رہا تھا۔

"مسئلہ ہے پاکستان سے تعلق رکھنے والے چودھری افتخار عالم شاہ کا۔ ہم نے اس بندے کو ٹریپ کر کے آپ کے حوالے کیا تھا اور آپ جانتے ہیں کہ اس کی وجہ سے آپ پاکستان میں کس قدر اہم کامیابیاں حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ آپ لوگوں کی طرف سے اس بندے کو مناسب طریقے سے ٹریٹ نہیں کیا جارہا۔" اس نے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔

"تم یہ نہیں کہہ سکتیں مس لنڈا! وہ فیوڈل لارڈ کتے کی دم ہے جسے میں بالکل صحیح طریقے سے ٹریٹ کر رہا ہوں۔ اگر تمہارے کہنے پر میں نے اسے ڈھیل دی تو وہ ہمارے سر چڑھ جائے گا۔" بیٹا کے بجائے الفا نے تلخی سے اس بات کا جواب دیا۔

"میں آپ کو کوئی الزام نہیں دینا چاہتی مسٹر الفا لیکن آپ مشرق کے فیوڈل لارڈز کی نفسیات کو مجھ سے بہتر نہیں سمجھتے۔ وہ وقتی طور پر اپنی کمزوریوں کی وجہ سے آپ کے پریشر میں آگیا ہے لیکن کسی بھی دن اس کی کچلی ہوئی انا اچانک ہی پوری طاقت سے بیدار ہو جائے گی اور نتیجہ ہماری بربادی کی صورت میں بھی نکل سکتا ہے۔ آپ خود سوچیں کہ اس نے افیون کے کھیتوں کے علاوہ وہاں کتنے کام سنبھال رکھے تھے۔ اب اگر وہ کچھ نہ کرے اور صرف ان کھیتوں کے متعلق ہی اپنی گورنمنٹ کو بتا دے تو ہماری کتنی محنت اور سرمایہ ضائع چلا جائے گا۔" لنڈا نے لہجے کو مہذبانہ رکھا لیکن الفا سے دبے بغیر اپنی بات کہتی چلی گئی۔

"وہ لالچی بڈھا مر کر بھی ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔" الفا نے نفرت آمیز لہجے میں جواب دیا۔

"آپ کے پاس ایسی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔ اپنی کچلی جانے والی انا کو بحال کرنے کے لیے وہ کبھی بھی کچھ بھی کر سکتا ہے۔" لنڈا نے بلاجھجک اس سے اختلاف کیا۔ اس کے ساتھ آنے والا ڈیوڈ البتہ بالکل خاموش تھا۔ یہاں آنے سے قبل ہی ان کے درمیان یہ طے ہو چکا تھا کہ لنڈا اس معاملے کو میٹنگ کے اختتام پر اٹھائے گی لیکن وہ اس بحث میں حصہ نہیں لے گا۔

"تمہاری ان باتوں کا مقصد کیا ہے؟ کیا تم چاہتی ہو کہ میں اس ڈرٹی مین کو اپنے سر پر بٹھا لوں؟" یہ بات پوچھتے ہوئے الفا کے لہجے میں چودھری کے لیے بے پناہ حقارت تھی۔

"میں نے یہ نہیں کہا۔ بس میں یہ چاہتی ہوں کہ اسے بہتر طور پر ٹریٹ کیا جائے۔"

"تم اپنی بات کی ذرا وضاحت کرو۔" اس بار بیٹا نے مداخلت کرتے ہوئے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

"میں چاہتی ہوں کہ وقتاً فوقتاً چودھری سے ایسے کام لیے جاتے رہیں جن کی وجہ سے اسے یہ احساس ہو کہ وہ ہمارے لیے اہم ہے۔ اس کے علاوہ آپ کو اسے دی جانے والی رقم میں بھی اضافہ کرنا ہوگا۔ ہمارے لیے کام کرنے میں اس کے لیے سب سے بڑی کشش ہی یہ تھی کہ ہم اسے ایک کافی بڑی رقم دے رہے تھے۔ لالچی آدمی کو دولت سے دور کر دو تو وہ اپنی پوری صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر کام کرنے کا اہل نہیں رہتا۔" الفا کے بُرے بُرے منہ بنانے کے باوجود اس نے اپنی بات مکمل کی اور کہیں بھی اپنے لہجے میں تلخی یا تندی نہ آنے دی۔ منشیات کے اسمگلرز بے شک موساد کے تحت کام کرتے تھے لیکن وہ جانتی تھی کہ ایسے لوگوں کے بے شمار روابط ہوتے ہیں اور موساد سے بگڑنے کی صورت میں وہ کہیں اور کا بھی رخ کر سکتے ہیں۔ ان کے لیے سب سے بڑا خطرہ تو ان کا گاڈ فادر امریکا ہی تھا جس سے تمام تر مراعات حاصل کرنے کے باوجود وہ بہت چالاکی سے امریکیوں کو نشے کی لت میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔

"مس لنڈا کی بات معقول ہے۔ واقعی وہ شخص ہمارے لیے اہم ہے۔ کوشش کرو کہ اس سے بگاڑ پیدا نہ ہو۔ معاوضے کی ادائیگی کے لیے تو میں ابھی منظوری دے دیتا ہوں، باقی تم سوچ لو کہ اس کے لیے کیا کر سکتے ہو۔" بیٹا نے اپنے ساتھ بیٹھے الفا سے کہا تو وہ اپنی جگہ پر پہلو بدلنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکا۔ عہدے کے اعتبار سے برابر ہونے کے باوجود بیٹا کو اس کے مقابلے میں تنظیم سے پرانی وابستگی کی وجہ سے ذرا زیادہ اہمیت حاصل تھی اس لیے وہ اس سے اختلاف کو غیر مناسب سمجھتا تھا۔

"ایسا کرو، اسے انڈیا بھیج دو۔ ممبئی میں ایک گینگسٹر اشوک سے ہمیں کاروباری معاملات طے کرنے ہیں۔ وہ معاملات چودھری کے ذریعے طے ہو جائیں تو کوئی حرج نہیں ہوگا۔ کیوں لنڈا تمہارے خیال میں چودھری اس بات سے خوش ہوگا یا نہیں؟" الفا کو مشورہ دیتے ہوئے بیٹا نے اچانک ہی لنڈا کو مخاطب کیا۔

"بالکل خوش ہوگا۔ اگر اسے رقم کے علاوہ ممبئی فلم انڈسٹری کی چند پریوں کا جلوہ بھی دکھا دیا جائے تو..." لنڈا نے اپنی بات کے اختتام پر ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ اس نے

خود اپنے حسن کے زور پر ہی اب تک چودھری کو قابو میں رکھا ہوا تھا اس لیے یہ بات وثوق سے کہنے میں حق بجانب تھی کہ چودھری کو حسین چہروں اور جسموں کے ذریعے خوش کیا جا سکتا ہے۔

"ٹھیک ہے، یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ اس کا بندوبست تو اشوک آرام سے کر دے گا۔" بیٹا نے یقین دلایا تو الفا کے دل میں موجود تکدر کے باوجود ان کی یہ میٹنگ خوشگوار ماحول میں اختتام پذیر ہو گئی۔ لنڈا، ڈیوڈ کے ساتھ وہاں سے رخصت ہوئی تو اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ اس کے لیے چودھری اہم نہیں تھا لیکن الفا جیسے لوگوں کو کبھی کبھی یہ احساس دلانا ضروری تھا کہ وہ کتنے ہی اہم سہی، انہیں موساد کی برتری کو تسلیم کرنا ہوگا۔ آگے الفا چودھری سے کس طرح کام لیتا، یہ اس کا مسئلہ تھا۔ خود اس کے لیے تو بس اپنی اتنی ہی کامیابی کافی تھی۔

☆☆☆

عمیر نے سرسری نظروں سے اپنے ملاقاتی کا جائزہ لیا۔ وہ اچھے قد کاٹھ کا ذرا درشت چہرے والا آدمی تھا لیکن اس کے سامنے مؤدب بیٹھا ہوا تھا۔

"تو تم میرے لیے کیا کچھ کر سکتے ہو مسٹر جگو!"

"جو آپ حکم کریں سر! میں اپنے گھر والوں سے ملنے پنڈ آیا ہوا تھا۔ ذیشان صاحب سے میری بات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ میں یہاں ہوں تو آپ سے مل لوں۔ آپ کو کسی معاملے میں میرے جیسے آدمی کی ضرورت ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ میں آپ کو شہریار صاحب کی جگہ ہی سمجھوں اس لیے اب آپ مجھے اپنا خادم سمجھ لیں۔ شہریار صاحب نے ایک واری میرے اکلوتے پتر کی حیاتی بچائی تھی۔ میں نے اس احسان کے بدلے اپنی پوری حیات ان کے نام لکھ دی اور جب کبھی بھی انہوں نے مجھے کسی کام سے پکارا، فوراً خدمت میں حاضر ہو گیا۔ اللہ انہیں صحت تندرستی دے۔ سچ پوچھیں تو ان کی حالت کا سوچ کر دل بڑا کڑھتا ہے۔" اس کے مختصر سوال کا طویل جواب دیتے ہوئے جگو آخر میں آزردہ ہو گیا۔ اس نے اپنی ساری زندگی ایک بااثر سیاست داں کے لیے غنڈا گردی کرتے ہوئے گزاری تھی لیکن شہریار کو وہ اپنا محسن سمجھتا تھا اس لیے اس سے خصوصی محبت رکھتا تھا۔ ساری دنیا کی طرح اسے بھی یہی معلوم تھا کہ ایک حادثے کا شکار ہونے کے بعد شہریار اسپتال میں کومے کی حالت میں پڑا ہوا ہے۔ یہ شہریار کی مستقبل کے لیے کی گئی پیش بندی تھی کہ اس نے پہلے ہی جگو کو ذیشان سے متعارف کروا کر اسے ہدایت کر دی تھی کہ وہ وقتِ ضرورت ذیشان کی مدد کرے۔ اب تک ایسی نوبت نہیں آئی تھی لیکن چودھری کے ہاتھوں ہونے والے طوائف کے قتل کی تفتیش کرتے ہوئے عمیر کو کسی مددگار کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ مشابرم خان ہوتا تو کوئی پریشانی کی بات ہی نہیں تھی لیکن موجودہ حالات میں اسے فی الحال انڈر گراؤنڈ ہی رکھا جا رہا تھا۔ شہریار کی ٹیم میں شامل دوسرا مخلص بندہ عبدالمنان تھا لیکن وہ دفتری امور کی حد تک ہی مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔ لڑنے بھڑنے والے معاملات میں مدد کرنا اس شریف آدمی کے بس کی بات نہیں تھی۔ ایک تیسرا شخص جو ماضی میں شہریار کا ساتھ دیتا رہا تھا، وہ ڈی ایس پی منظور تھا لیکن اس کے تعاون کے پیچھے ترقی کا جذبہ زیادہ کارفرما رہا تھا اس لیے اب بھی اس پر بس ایک حد تک ہی اعتماد کیا جا سکتا تھا چنانچہ اب جگو یہاں تھا اور اسے عمیر کی مدد کرنی تھی۔

"شہریار صاحب جیسے مخلص آدمی کی حالت پر تو مجھے بھی دلی افسوس ہے لیکن جب میں ان کے تم جیسے چاہنے والے دیکھتا ہوں تو یقین ہونے لگتا ہے کہ انشاء اللہ وہ ایک دن ضرور کومے سے باہر آ جائیں گے کیونکہ ان کے ساتھ ایک نہیں بے شمار دعائیں ہیں۔" اس نے جگو کی تائید میں خود بھی چند جملے ادا کیے پھر کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کام کی بات چھیڑی۔

"میجر ذیشان کا کہنا ہے کہ شہریار صاحب نے جس جنگ میں خود کو ملوث کر رکھا تھا، تم بھی اس کا ایک حصہ تھے اس لیے اس بات سے اچھی طرح واقف ہو کہ جن لوگوں سے یہ جنگ لڑی جا رہی تھی اس میں ایک فرد چودھری افتخار عالم شاہ بھی ہے۔"

"بالکل سر! بلکہ شہریار صاحب کے کہنے پر میں نے کئی بار چودھری کو اچھا خاصا سبق بھی سکھایا تھا۔" جگو فوراً بول پڑا۔

"چودھری بڑی ڈھیٹ چیز ہے۔ چھوٹے موٹے سبق اس پر اثر نہیں کرتے۔ دولت اور طاقت کے نشے میں وہ دوسروں کو انسان سمجھنے کے لیے ہی تیار نہیں ہے۔ اب بھی اس نے ایک طوائف پر بڑا ظلم ڈھایا ہے۔ وہ بے چاری جوان عورت تھی اور چودھری نے بلاوجہ ہی اسے قتل کر ڈالا۔ یہ واقعہ عین اس روز پیش آیا جب پیر آباد میں عرس منایا گیا تھا اور حویلی کی روایت کے مطابق چودھری نے اپنی اور اپنے خاص مہمانوں کی دل بستگی کے لیے جو اس رات حویلی میں ہی ٹھہرے ہوئے تھے، طوائفوں کے ایک گروپ کو وہاں بلا رکھا

تھا۔ موت کا شکار ہونے والی لڑکی کو چودھری کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا اور حتمی طور پر وہ اسی کے تشدد کا شکار ہو کر اپنی جان سے گئی۔ لیکن یہاں مسئلہ یہ ہے کہ چودھری نے نائیکا کے ساتھ ساز باز کر لی اور قتل کے کیس کو دبا دیا گیا۔ میں نے کافی کوشش کر کے یہ معلوم کر لیا ہے کہ مرنے والی طوائف کا ایک چھوٹا بھائی بھی ہے جو کوٹھے پر مختلف خدمات انجام دیتا ہے۔ اگر کسی طرح اس لڑکے کو اس بات پر راضی کر لیا جائے کہ وہ اپنی بہن کے قاتل کے خلاف رپورٹ درج کروائے اور اس کی قبر کشائی کر کے پوسٹ مارٹم کی درخواست کرے تو ہمارے لیے چودھری پر دباؤ ڈالنا آسان ہو جائے گا۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں خود اس معاملے میں سامنے نہیں آنا چاہتا اور خود چودھری سے دوستانہ تعلقات رکھنا چاہتا ہوں اس لیے اس لڑکے تک رسائی حاصل کرنے کے لیے کسی ایسے شخص کی مدد درکار ہے جسے میرے حوالے سے شناخت نہ کیا جا سکے۔۔۔ اور وہ اتنا جی دار ہو کہ خطرہ محسوس کرنے کے باوجود کوٹھے پر جانے کے لیے تیار ہو جائے۔ میجر ذیشان کے مطابق تم اس کام کے لیے ایک موزوں آدمی ہو۔ وہ لڑکا ہم تک پہنچ گیا تو تمہارا کام ختم ہو جائے گا اور ہم ایک این جی او کی مدد سے باقی کا سارا کام کروائیں گے۔'' عمیر نے اسے ساری تفصیلات سے آگاہ کیا۔

''اگر ایسا ہے تو میں سیدھا سیدھا اس لڑکے کو اغوا کروا لیتا ہوں۔ میں کہوں گا تو میرے آدمی اسے دن دہاڑے بھی کوٹھے سے اٹھا کر لے آئیں گے۔'' جگو نے مونچھ کو بل دیتے ہوئے دعویٰ کیا۔

''نہیں، ایسا نہیں کرنا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو وہ نائیکا شور مچا دے گی اور کیس بھی بے جان ہو جائے گا کیونکہ وہ لوگ یہی کہیں گے کہ لڑکے کو زبردستی یہ سب کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ تمہیں کچھ ایسا کرنا ہوگا کہ وہ لڑکا راضی خوشی تمہارے ساتھ آنے کے لیے تیار ہو جائے۔ اس کے لیے تمہیں اس شہر جانا پڑے گا جہاں اس طوائف کا کوٹھا ہے۔ تم کوٹھے پر دو تین بار جا کر محفلوں میں شرکت کرو اور کوشش کرو کہ لڑکا تمہاری صورت سے آشنا ہو جائے۔ اس کے بعد کوٹھے کی نگرانی کرواتا اور لڑکے کے کسی کام سے باہر نکلنے کی صورت میں اس سے اچانک کہیں مل بیٹھنا۔ یہی وہ مناسب وقت ہوگا جب تم اسے ٹٹول بھی سکو گے اور اپنے ساتھ راضی خوشی چلنے پر آمادہ کر لو گے۔'' جگو کی تجویز رد کرتے ہوئے اس نے اسے منصوبے سے آگاہ کیا۔

''ٹھیک ہے سر! میں سمجھ گیا۔ آپ مجھے کوٹھے کا پتا اور لڑکے کا نام وغیرہ بتا دیں۔ باقی کام میں خود دیکھ لوں گا۔'' جگو فوراً اس کی بات سمجھ گیا تو وہ اسے ان تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا جو اس کام کے لیے اسے درکار تھیں۔ جگو کی توجہ اور انہماک کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ یہ کام بخوبی انجام دے ڈالے گا۔

☆☆☆

وہ تینوں جاگنگ سوٹس میں ملبوس تھے اور جاگنگ ٹریک سے ہٹ کر گھاس کے ایک قطعے پر اس طرح بیٹھے ہوئے تھے جیسے جاگنگ کر کے تھک چکے ہوں اور کچھ دیر یونہی بیٹھ کر ستاتے ہوئے گپ شپ لگا رہے ہوں۔ لیکن حقیقت اس کے بالکل برخلاف تھی۔ اس وقت وہ تینوں ایک نہایت اہم معاملے پر گفتگو کرنے کے لیے یکجا ہوئے تھے اور میٹنگ کے لیے پارک کے اس سنسان گوشے کا انتخاب اس لیے کیا گیا تھا کہ کسی ہوٹل کے بند کمرے میں ہونے والی گفتگو کے لیک آؤٹ ہو جانے کا نسبتاً زیادہ امکان ہوتا ہے۔

ان تین افراد میں سے دو تو شہریار اور سلو تھے جبکہ تیسرا مقامی ایجنٹ کلام تھا۔ شہریار اور سلو کے حلیے گزشتہ روز کے مقابلے میں خاصے مختلف تھے اور اس تبدیلی کے لیے انہیں کسی ہوٹل میں کمرا حاصل کرنے سے پہلے خاصی محنت کرنی پڑی تھی۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے شہر کی تین مختلف باربر شاپس سے کام نکالا تھا۔ ان کے حلیوں میں بالوں کی رنگت اور اسٹائل کی تبدیلی کے علاوہ بڑھے ہوئے شیو کو فرنچ کٹ میں تبدیل کر دینے سے خاصا فرق پڑا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے ایک جگہ سے کانٹیکٹ لینس خرید کر وہ بھی آنکھوں میں لگا لیے تھے اور ذرا مشکل تھا کہ کوئی پہلی نظر میں انہیں اس حیثیت سے شناخت کر پاتا کہ وہ وہی ہیں جو را کے ایک ٹھکانے پر قید تھے۔ حلیوں کی تبدیلی کے ساتھ انہوں نے ایک پی او بکس میں رکھے ہوئے نئے شناختی کاغذات بھی حاصل کر لیے تھے اور اپنے لیے نئے لباس اور جوتے بھی۔ اس سلسلے میں دہلی میں ملنے والے ان کے مددگاروں کے فراہم کردہ کریڈٹ کارڈ نے بہت مدد دی تھی اور وہ آرام سے خرچ کرتے چلے گئے تھے۔ ہر طرف سے مطمئن ہونے کے بعد انہوں نے ایک ہوٹل کا رخ کیا تھا اور وہاں رات آرام سے گزارنے کے علاوہ اس بات کا بھی بندوبست کر لیا تھا کہ کلام سے ایک ملاقات ہو جائے۔

''آپ لوگ کہاں غائب تھے؟ میں انتظار کرتا رہا کہ آپ لوگ مجھ سے رابطہ کریں گے لیکن آپ کی کوئی خبر ہی نہیں تھی۔ آپ نے مجھے یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ آپ لوگ

کس جگہ ٹھہرے ہوئے ہیں اس لیے میں اپنے طور پر بھی آپ کی کوئی خیر خبر نہیں لے سکا اور آج انتہائی خراب حالات کے باوجود آپ سے ملنے کے لیے تیار ہو گیا۔" گفتگو کا آغاز کلام نے کیا۔

"ہم ایک ناگہانی مصیبت میں پھنس گئے تھے دوست... لیکن تم یہ بتاؤ کہ تم نے حالات کی خرابی کا ذکر کیوں کیا ہے؟ ہم صبح ہوٹل سے اخبار دیکھ کر نکلے تھے اور اخبار میں ایسی کوئی خبر نہیں تھی جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ شہر کے حالات خراب ہیں۔" اسے جواب دینے کی ذمے داری شہریار نے نبھائی جبکہ سلو مزید بے فکرے پن کا مظاہرہ کرنے کے لیے گھاس پر نیم دراز ہو گیا۔

"حالات عام لوگوں کے لیے ٹھیک ہیں لیکن ہم جیسے لوگوں کے لیے تشویش ناک۔ آپ نے اخبار میں ساؤتھ کے علاقے میں ایک سرکاری عمارت کے جلنے کی خبر تو ضرور پڑھی ہوگی؟"

"ہاں پڑھی تھی۔ خبر کے مطابق آگ شارٹ سرکٹ کی وجہ سے لگی تھی جس کے نتیجے میں دفتر کا سارا عملہ اور سامان جل کر راکھ ہو گئے۔" کلام کی بات نے اسے تھوڑا سا چونکایا ضرور لیکن اس نے اپنے تاثرات سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔

"یہ صرف میڈیا کو دی جانے والی بریفنگ ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ عمارت کسی عام سرکاری دفتر کی نہیں بلکہ را کی ملکیت تھی اور کل وہاں سے فائرنگ کی خاصی آوازیں سنی گئی تھیں۔ وہاں جتنی ہلاکتیں ہوئی ہیں، کوئی بھی آگ میں جلنے کی وجہ سے نہیں ہوئیں۔ وہ سارے کے سارے پہلے ہی کسی نہ کسی طور ہلاک کر دیے گئے تھے۔ بعد میں ان کی لاشیں جل کر خاک ہو گئیں۔ مجھے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق اس وقت عمارت میں موجود افراد میں سے صرف ایک میناکشی نامی لڑکی وہاں نہیں مری بلکہ کچھ دیر بعد ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ماری گئی۔ اس حادثے کے عینی شاہدین کے مطابق میناکشی کو حادثے سے کچھ دیر پہلے ایک سرخ گاڑی سے بس اسٹاپ پر اترتے دیکھا گیا تھا اور اہم بات یہ ہے کہ وہ سرخ گاڑی راہی کی ملکیت تھی جسے فائرنگ کے بعد آگ پھیلنے سے کوئی لمحہ بھر قبل اس عمارت سے نکلتے دیکھا گیا تھا۔ کار کے شیشے سیاہ تھے اس لیے دیکھنے والوں کو یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ اس میں کون اور کتنے لوگ سوار ہیں۔ وہ گاڑی بھی بعد میں ایک شاپنگ پلازا کی پارکنگ میں کھڑی مل گئی تھی لیکن وہاں نصب کیمروں نے بھی صرف اتنا دکھایا کہ اس میں دو افراد سوار تھے۔ فاصلے کی وجہ سے ان افراد کی واضح تصویر نہیں آسکی۔ البتہ مجھ تک اڑتے اڑتے اتنی خبر ضرور پہنچی ہے کہ جلنے والے را کے اس ٹھکانے پر کچھ قیدی لائے گئے تھے اور یہ سارا انہی کا کیا دھرا ہے۔ اب آپ لوگ تھوڑی اندازہ کر سکتے ہیں کہ را والے اس وقت کتنی بری طرح بلبلائے ہوئے ہوں گے۔ ایک طرف ان کے قیدی نکل بھاگے اور دوسری طرف وہ اپنی بڑی افرادی قوت کے ساتھ ساتھ ایک اہم ٹھکانے سے بھی محروم ہو گئے۔ اپنی ان معلومات کی روشنی میں، میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ را کے کتے سارے شہر میں ان دونوں افراد کی بو سونگھتے پھر رہے ہوں گے اور ساتھ ہی ایسے لوگوں کو بھی ٹٹولا جا رہا ہوگا جو ان کے خیال میں ان کے مددگار ہو سکتے ہیں۔ میری ذات اب تک بظاہر شک و شبہے سے پاک رہی ہے لیکن کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ میں کب ان کی نظروں میں آجاؤں۔ اسی لیے حالات کے پیشِ نظر آج محتاط رہنا چاہتا تھا لیکن آپ سے ملاقات سے انکار ممکن نہیں تھا، چنانچہ آگے پیچھے تھوڑا دیکھ بھال کر یہاں چلا آیا۔" اس نے پوری صورتِ حال ان کے گوش گزار کی جو خود اس صورتِ حال کے ذمے دار تھے۔

"ویری گڈ کلام! مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ تم اتنے ایکٹو ہو کہ اتنے مختصر وقت میں اتنی ساری معلومات حاصل کر لی ہیں۔" صورتِ حال پر کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے شہریار نے اس کی کارکردگی کو سراہا۔

"ہم یہاں ہیں ہی اس لیے۔" اس نے بے نیازی سے جواب دیا تو شہریار مسکرا دیا پھر سرسری لہجے میں بولا۔

"تمہارے خیال میں ان حالات میں پریم ناتھ کو اغوا کرنا کیسا رہے گا؟"

"میرے حساب سے تو یہ وقت بالکل مناسب نہیں ہے۔ دو چار دن بعد کارروائی کریں گے تو بہتر ہوگا۔" اس نے فوراً جواب دیا۔

"کیسا تضاد ہے۔ ادھر ہمارے ملک میں یہ لوگ دن رات خون کی ہولی کھیل رہے ہیں، یہاں کا میڈیا بھی مسلسل خبریں دیتا رہتا ہے کہ کراچی اور لاہور میں کس دن کتنے بم بلاسٹ ہوئے لیکن خود اپنے گھر میں جب اس آگ کی ذرا سی تپش پہنچی ہے تو یہ بلبلا اٹھے ہیں۔" شہریار نے افسوس کا اظہار کیا۔

"یہ تضاد ہمارے اپنوں کی کرم فرمائیوں کا ہی نتیجہ ہے۔ ہمارے لوگوں میں آدھے لوگ کرپٹ اور آدھے نااہل ہیں۔ مخلص لوگوں کی تعداد تو آٹے میں نمک کے برابر ہی ہے۔ ایسی صورت میں ملک کا یہ حال تو ہونا ہی تھا۔" اس نے بھی تاسف بھرے لہجے میں شہریار کے دکھ میں ساتھ دیا۔ اس کا یہ افسوس اور دکھ غلط نہیں تھا۔ وطن سے دور، اپنوں کی جدائی برداشت کر کے وطن کی خدمت کے لیے جان ہتھیلی پر رکھ کر سرگرداں رہنے والے شخص کو پورا حق حاصل تھا کہ وہ ان حالات پر جلے کڑھے۔

"نااہلوں اور بے ایمانوں کو جانے دو کلام... مجھے یقین ہے کہ ہم چند مخلص لوگ مل کر بھی وطن دشمنوں کے دانت کھٹے کرتے رہیں گے اور انہیں ایسی ہی ضربیں لگاتے رہیں گے جو کل انہوں نے سہی ہے۔"

"کیا مطلب؟ کیا آپ جانتے ہیں کہ را کے اس ٹھکانے کو کس نے تباہ کیا ہے؟" اس کی تسلی کو سن کر کلام بری طرح چونکا۔

"ہاں، وہ ہمارا ہی کارنامہ تھا۔" اس نے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ بتایا۔

"او مائی گاڈ۔" کلام نے اپنا سر تھام لیا۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ دونوں اتنا بڑا کارنامہ انجام دینے کے بعد یوں آزادانہ گھومتے پھر رہے ہیں۔"

"تمہارے پاس اس واقعے کے بارے میں اتنی معلومات ہیں تو یقیناً ان دو افراد کے حلیے بھی تمہارے علم میں آئے ہوں گے جنہیں اس کا ذمے دار ٹھہرایا جا رہا ہے؟ ہمیں دیکھو، ہم دونوں میں سے کوئی اس حلیے پر پورا اترتا نظر آرہا ہے کیا؟"

"نہیں، واقعی آپ کو دیکھ کر میرا دھیان بالکل بھی آپ کی طرف نہیں گیا تھا لیکن اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آج میں آپ دونوں کو پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ اگر پہلے سے دیکھ رکھا ہوتا تو شاید اندازہ ہو جاتا۔ بہرحال، میرا مشورہ ہے کہ فی الحال آپ دونوں کو سخت احتیاط کرنی چاہیے۔" اس کے سوال کا جواب دینے کے ساتھ ہی اس نے مشورے سے بھی نوازا۔

"ہم بھی خوامخواہ اپنی جان خطرے میں نہیں ڈالتے لیکن ایک حد تک ہی محتاط رہتے ہیں۔ ہمارے جیسے کام کرنے والے لوگوں کو اپنا دل مضبوط کرنا ہی پڑتا ہے۔" شہریار نے بے نیازی سے جواب دیتے ہوئے ایک نظر سلو پر ڈالی۔ نیم دراز تو وہ پہلے ہی تھا، اب آنکھیں بھی بند کر لی تھیں اور ظاہری طور پر اردگرد سے بالکل بے نیاز محسوس ہو رہا تھا۔

"آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں لیکن مجھے یہ بتائیں کہ آپ نے یہ سب کچھ کیسے کیا؟" اس سے اتفاق کرتے ہوئے کلام نے تجسس اور اشتیاق سے پوچھا۔ جواب میں اس نے اسے اسٹیشن پر پہلی بار اندو سے واسطہ پڑنے سے لے کر اپنی گرفتاری اور پھر فرار تک کی ساری داستان سنا ڈالی۔

"امیزنگ... آپ دونوں نے تو کمال ہی کر دیا۔ صرف دو افراد کا اتنے سارے مسلح افراد سے نمٹنا اور سیکیورٹی کے سارے انتظامات توڑ کر بھاگ نکلنا کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ را والے تو حقیقتاً بھنا کر رہ گئے ہیں۔" اس نے پُرستائش لہجے میں اپنے خیال کا اظہار کیا۔

"انہیں تو ابھی ہم سے اور بھی بہت چوٹیں کھانی ہیں لیکن مجھے اصل سکون اس وقت ملے گا جب ہم ڈاکٹر فرحان جمیل کو ان کے قبضے سے نکال کر لے جائیں گے۔"

"یہ بھی انشاء اللہ ہو جائے گا۔ بس ذرا پریم ناتھ ہاتھ آجائے تو اس سے ایسی معلومات حاصل ہو جائیں گی جو ڈاکٹر صاحب تک پہنچنے کے لیے ہمیں درکار ہیں۔" کلام نے اسے تسلی دی۔

"تم یہ بتاؤ کہ یہ بھائی جی اور اشوک صاحب کا کیا چکر ہے؟ وہ را کی ایجنٹ لڑکی اندو ایک طرف تو اشوک کے گینگ کا حصہ بنی ہوئی تھی تو دوسری طرف بھائی جی کے بارے میں جاسوسی کرتی پھر رہی تھی۔"

"یہ دونوں ممبئی کے دو بڑے غنڈے ہیں۔ اشوک کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک ہندو انتہا پسند ہے جو مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ یہاں تک کہ یہاں کی ہندو انتہا پسند مذہبی جماعتیں نازک مواقع پر اس کی خدمات حاصل کرتی ہیں اور اس کے گینگ کے لوگ چند گھنٹوں میں ہی.... مسلمانوں کو ہلا دیتے ہیں۔ منشیات، اسلحہ، جسم فروشی، نائٹ کلبس، جوئے کے اڈے، سارے دھندے کرتا ہے وہ اور اس کے را کے افسران سے مراسم کی بھی سن گن ملی ہے۔ اس کے مقابلے میں بھائی جی مسلمان ہونے کے ناتے یہاں کی مسلم آبادی سے ہمدردی رکھتا ہے اور ان پر کوئی برا وقت پڑنے کی صورت میں اس کے آدمی مسلمانوں کی مدد کے لیے میدان میں اتر آتے ہیں۔ دو تین بار اشوک اور بھائی جی کے آدمیوں کے درمیان اچھا خاصا خطرناک تصادم ہو چکا ہے لیکن پھر اسٹیبلشمنٹ ہی ہر بار دونوں کے درمیان صلح صفائی کروا دیتی ہے۔"

"دھندے وہ بھی سارے اشوک والے کرتا ہے لیکن اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک تو ہیروئن کے

دھندے میں نہیں پڑتا، دوسرے اس کے لیے کام کرنے والی لڑکیوں میں سے کسی کو بھی جبراً اس دھندے میں نہیں لایا جاتا۔ میری اس سے کبھی براہِ راست ملاقات نہیں ہوئی لیکن میرے ایک ساتھی کے اس سے مراسم ہیں جس کی وجہ سے میں یہ جانتا ہوں کہ ہندوستان میں پیدا ہونے کے باوجود وہ پاکستان کے لیے اپنے دل میں خاصا نرم گوشہ رکھتا ہے۔ شاید اس کی اسی ادا کی وجہ سے اندو نامی را کی ایجنٹ اس کے بارے میں سن گن لیتی پھر رہی تھی۔ اس مقصد کے لیے اس نے اشوک کے گینگ میں شمولیت اس لیے اختیار کی ہوگی کہ اگر بھائی جی کے خاص آدمی سے مراسم بڑھا کر معلومات حاصل کرنے کی کوشش میں... کبھی اس کی ذات شک کی زد میں آبھی جائے تو وہ لوگ زیادہ سے زیادہ اسے اشوک گروپ کی جاسوس سمجھیں اور اس کی اصلیت چھپ جائے۔" کلام کا تجزیہ پُردلیل تھا اس لیے اسے اس سے اتفاق کرنا پڑا۔

"واقعی وہ بڑی عیار تھی اور بہت خوبی سے اپنا کام انجام دے رہی تھی۔"

"لیکن آپ کے سامنے تو اس کی ساری عیاری دھری رہ گئی اور دنیا سے جاتے جاتے وہ اپنے کئی ساتھیوں کی جانیں بھی ساتھ لے گئی۔" کلام نے برجستگی سے تبصرہ کیا تو وہ فقط مسکرا کر رہ گیا۔

"اچھا تو پھر مجھے اجازت دیجیے۔ معمول کے مطابق میں پریم ناتھ پر نظر رکھوں گا اور اس کے اغوا کی کارروائی اسی طرح کی جائے گی جیسے ہم پہلے طے کر چکے ہیں۔ بس نئی تاریخ کا تعین ہم حالات کو دیکھنے کے بعد کریں گے۔" اس نے ان لوگوں سے رخصت چاہی۔

"ذرا ایک نظر اس مچھر پر بھی ڈال لینا جو تمہارے ساتھ لگ کر یہاں تک آیا ہے۔" پوری گفتگو کے دوران مداخلت نہ کرنے والے سلو نے اچانک آنکھیں کھول کر کہا تو کلام بُری طرح اچھل پڑا۔

"کون... کون میرے پیچھے آیا ہے؟"

"وہ جو ادھر بینچ پر بیٹھا بظاہر اڑتے پرندوں کو دیکھ رہا ہے لیکن اصل میں ہماری نگرانی کر رہا ہے۔" سلو نے اسی طرح لیٹے لیٹے انگوٹھے سے خفیف سا اشارہ کیا تو کلام نے چور نظروں سے اس شخص کی طرف دیکھا۔ اسے وہ چہرہ کچھ شناسا محسوس ہوا اور پھر فوراً ہی یاد آ گیا کہ آج صبح ہی اس نے اس شخص کو اس بیکری میں دیکھا تھا جہاں سے وہ اپنے لیے ڈبل روٹی، انڈے اور مکھن وغیرہ خریدتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شدید تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ البتہ اس نے اپنے چہرے کے تاثرات پر قابو رکھا اور دوبارہ اس شخص کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔

"میں نے اسے تمہارے پیچھے ہی پارک میں آتے ہوئے دیکھا تھا لیکن اس وقت یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ تمہیں فالو کر رہا ہے لیکن اب کافی دیر اس کا جائزہ لینے کے بعد مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ تم پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ میں نے کئی بار اسے جیب سے موبائل نکال کر کسی سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے لیکن کسی وجہ سے اس کی بات نہیں ہو سکی ہے۔ ایک بار یہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا بھی ہوا تھا اور مجھے لگا تھا کہ باہر جانے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن پھر ہم لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے دوبارہ بینچ پر بیٹھ گیا۔" سلو کی باتیں سن کر انہیں اندازہ ہوا کہ ان کی گفتگو کے دوران آنکھیں موند کر پڑا سلو کیسے اہم کام میں مصروف تھا۔

"مجھے بالکل اندازہ نہیں ہوا کہ یہ شخص میری نگرانی کر رہا ہے۔ میں جس اپارٹمنٹ بلڈنگ میں رہتا ہوں، یہ بھی شاید اسی میں رہتا ہے لیکن میری اس سے کبھی بات چیت نہیں ہوئی بلکہ سامنا بھی ایک آدھ بار ہی ہوا ہوگا۔ آج صبح یہ مجھے بلڈنگ کے سامنے موجود بیکری میں نظر آیا تھا۔" کلام نے ایسے لہجے میں یہ سب بتایا جیسے کسی جرم کا اعتراف کر رہا ہو۔

"اٹس اوکے۔ ہم اس سے ابھی نمٹ لیں گے۔" شہریار نے اس کے شانے کو تھپتھپا کر تسلی دی۔

"تم بالکل اس طرح یہاں سے جاؤ جیسے تمہیں کچھ علم نہیں ہے۔ اور ہاں، یہ بتاؤ کہ تم یہاں آئے کیسے ہو؟"

"میرے پاس کار ہے۔" اس نے بتایا۔

"ویری گڈ! بس تم آگے چلو ہم بھی پیچھے آ رہے ہیں۔" شہریار نے اس سے کہا اور پھر ان تینوں نے آپس میں اس انداز میں مصافحہ کیا جیسے ایک دوسرے سے رخصت ہو رہے ہوں۔ بینچ پر بیٹھا مونچھوں والا آدمی بھی پرندوں میں اپنے انہماک کو بھول کر کھڑا ہو گیا اور ان سے پہلے ہی پارک سے باہر نکل گیا۔ ان تینوں میں سے کلام پہلے باہر نکلا اور چند لمحوں کے وقفے کے بعد وہ بھی اس کے پیچھے چل پڑے۔ وہ جس ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے، وہ اس پارک سے نزدیک تھا۔ اس لیے انہوں نے کسی سواری کا استعمال کرنے کے بجائے یہاں تک پیدل آنا پسند کیا تھا۔ پارک سے باہر نکلتے ہی انہوں نے اس حصے کا جائزہ لیا جہاں لوگوں نے اپنی گاڑیاں پارک کر رکھی تھیں۔ فوراً ہی کلام اور وہ مونچھوں والا ان کی نظروں میں آ گئے۔

کلام اپنی گاڑی کا لاک کھول کر اس میں بیٹھ رہا تھا جبکہ مونچھل بائیک پر بیٹھا اس طرح کک لگا رہا تھا جیسے اس کی کوشش کے باوجود بائیک اسٹارٹ نہ ہو کر دے رہی ہو۔ ان دونوں نے آپس میں نظروں کا تبادلہ کیا اور اس کی طرف بڑھ گئے۔

"کیا بات ہے بھائی، بائیک خراب ہو گئی ہے کیا؟" شہریار نے آگے بڑھ کر بڑے دوستانہ انداز میں اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، بس کچھ گڑبڑ کر رہی ہے۔" ایک تو وہ دونوں اس کے دائیں بائیں کھڑے تھے، اس پر سے براہِ راست مخاطب بھی تھے اس لیے وہ کچھ گھبرا گیا۔

"تو ایسا کریں اسے یہیں چھوڑ دیں۔ ہم آپ کو اپنی گاڑی میں لفٹ دے دیتے ہیں۔" شہریار کی یہ پیشکش اس کے لیے مزید بوکھلاہٹ کا سبب بنی۔

"نہیں جناب! اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود چلا جاؤں گا۔"

"لیکن ہمیں تو تمہاری ضرورت ہے نا، اس لیے اب تم وہیں جاؤ گے جہاں ہم تمہیں لے جائیں گے۔" اس بار سلو اس سے مخاطب ہوا۔ اس کے لہجے کی کاٹ کے ساتھ مونچھل نے اپنے پہلو میں لوہے کی چبھن بھی محسوس کی اور سخت سراسیمہ ہو گیا۔

"یہ آپ لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں تو آپ لوگوں کو جانتا بھی نہیں۔"

"جان پہچان بھی ہو جائے گی۔ ہم، تم سے اچھی طرح اپنا تعارف کروائیں گے۔ تم بس ہمارے ساتھ چلو۔" سلو نے ایسے اس کے گلے میں ہاتھ ڈالا جیسے وہ اس کا کوئی دیرینہ دوست ہو اور اچانک ہی اس سے ملاقات ہو گئی ہو۔

"نہیں، میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔" وہ بری طرح بدکا۔

"اگر ہمارے ساتھ نہیں جاؤ گے تو پھر اوپر جاؤ گے۔" اس کے پہلو پر نال کا دباؤ کچھ اور بڑھاتے ہوئے اس نے بڑے فلسفیانہ لہجے میں اعلان کیا جسے سن کر مونچھل کا چہرہ بالکل ہی تاریک پڑ گیا۔

"اب اور دیر مت کرو۔ میرا یہ ساتھی کریک ہے اور گولی چلانے میں زیادہ دیر نہیں لگاتا۔" اس بار شہریار نے گفتگو میں مداخلت کی۔ لمحہ لمحہ زرد پڑتی رنگت کے ساتھ وہ شخص بائیک سے نیچے اتر آیا اور ان کے اشارے پر اس طرح کلام کی گاڑی کی طرف بڑھا جیسے اسے ذبح کرنے کے لیے لے جایا جا رہا ہو۔ کلام گاڑی اسٹارٹ کیے ان کا منتظر تھا۔ اس شخص کو ان کے ساتھ آتا دیکھ کر اس نے پھرتی سے پیچھے کے دونوں دروازے کھول دیے۔ وہ دونوں اسے درمیان میں رکھتے ہوئے پچھلی نشست پر سوار ہو گئے۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم لوگ میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہو؟ میں ایک شریف اور غریب آدمی ہوں۔ میری کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے اور نہ ہی میرے بدلے میں کوئی تمہیں بھاری تاوان مل سکتا ہے۔" گاڑی میں بیٹھ جانے کے بعد اس نے اپنی مدافعت میں صفائی دینے کی کوشش کی۔

"اس کا منہ بند کرو یار۔ میں سارے راستے یہ بکواس نہیں سن سکتا۔" شہریار نے ناگواری سے کہا تو سلو نے اس کے سر پر آہنی دستہ جما کر اسے بے ہوش کرنے میں لمحہ بھر بھی نہیں لگایا۔

"اسے کہاں لے کر چلنا ہے سر؟" کلام نے گاڑی پارکنگ سے نکال کر روڈ پر ڈال دی تھی اور اب شہریار سے پوچھ رہا تھا۔ اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس ساری صورتِ حال پر تھوڑا سا نروس ہے۔

"کسی ایسی جگہ جہاں ہم اس سے تھوڑی سی پوچھ گچھ کر سکیں۔ اور ظاہر ہے ایسی جگہ تم ہی ہمیں پہنچا سکتے ہو۔" شہریار نے کچھ سرد مہری سے اس کے سوال کا جواب دیا تو وہ گردن سیدھی کر کے پورے انہماک سے ڈرائیونگ کرنے لگا۔

کافی طویل سفر طے کرنے کے بعد گاڑی ممبئی کے ایک ایسے علاقے میں داخل ہوئی جہاں غربت اور غلاظت نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ تنگ و تاریک گلیوں میں اڑتا کچرا، گندے پانی کی نالیاں اور ننگ دھڑنگ بچے دیکھ کر کہیں سے نہیں لگتا تھا کہ وہ بھارت کے معاشی دارالخلافہ ممبئی کا ہی ایک حصہ ہے۔ ان کی گاڑی وہاں داخل ہوئی تو کئی بچے اس طرف متوجہ ہوئے لیکن کوئی قریب نہیں آیا۔

"یہ جگہ تو کچھ نامناسب لگتی ہے۔ یہاں تو ہم کئی لوگوں کی نظروں میں آ جائیں گے۔" شہریار کو وہاں کا ماحول دیکھ کر تشویش ہوئی۔

"اس بندے کو ہوش میں لے آئیں۔ یہ اپنے پیروں پر چل کر مکان میں داخل ہوگا تو کوئی توجہ نہیں دے گا۔ ویسے آپ کے اطمینان کے لیے میں یہ بتا دوں کہ اس علاقے میں رہنے والے بیشتر افراد کسی نہ کسی طور غیر قانونی کام میں ملوث رہتے ہیں۔ جیب کترے، منشیات فروش، چور، نوسرباز سب آپ کو اس علاقے میں ملیں گے لیکن یہ سب چھوٹے مجرم

ہیں، اس لیے اپنی غربت سے جان چھڑانے میں کامیاب نہیں۔ ان میں سے اگر کوئی تھوڑا بہت زیادہ کما بھی لیتا ہے تو اس روپے کو شراب اور بازاری عورتوں کے چکر میں گنوا دیتا ہے۔ اس قسم کی آبادی ہونے کی وجہ سے یہاں مکان حاصل کرنے میں کوئی مشکل نہیں ہوتی۔ مالک مکان کو کرائے کے علاوہ کسی بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ میں نے بھی یہاں فرضی نام سے ایک مکان حاصل کر رکھا ہے جو زیادہ تر بند ہی پڑا رہتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر کسی کو یہاں ہم پر کوئی شک گزرا، تب بھی وہ پولیس کو اطلاع دینے کی غلطی نہیں کرے گا۔ یہ خود مجرم ہیں اس لیے پولیس سے دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بالفرض اگر کسی نے بعد میں کچھ بتا بھی دیا تو ہمارا کچھ نہیں بگڑنے والا۔ یہاں کسی کو میرے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ میری اس گاڑی کی نمبر پلیٹ بھی جعلی ہے اس لیے پولیس کے لیے مجھے ٹریس کرنا آسان نہیں ہوگا۔'' وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پا چکا تھا چنانچہ پورے اعتماد سے بولا اور گاڑی ایک چھوٹے سے بوسیدہ گھر کے سامنے روک دی۔ اس دوران سلو بے ہوش آدمی کے ساتھ کوئی ایسی کارروائی کر چکا تھا کہ وہ ہوش میں آگیا تھا اور اب آنکھیں پھاڑے اردگرد کے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''بنا آواز نکالے گاڑی سے باہر نکلو۔'' سلو نے اس کے پہلو میں پسٹل کی نال چبھوتے ہوئے سرد لہجے میں حکم دیا تو اس کو تعمیل کرنی پڑی۔ کلام پہلے ہی گاڑی سے اتر چکا تھا اور مکان پر لگا تالا کھول دیا تھا۔ وہ اپنے قیدی سمیت تیزی سے مکان میں داخل ہو گئے۔ انہیں یقین تھا کہ باہر گلی میں موجود افراد میں سے کوئی بھی اس دوران ان کا اتنی اچھی طرح جائزہ نہیں لے سکا ہوگا کہ پوچھنے پر تفصیلی حلیہ بیان کر سکے۔

''تم لوگ مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟ میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ میں تو تمہیں جانتا تک نہیں پھر میرے پیچھے کیوں پڑے ہو؟'' مکان نیم تاریک سا تھا اور وہاں عجیب سی وحشت برس رہی تھی۔ ان کے قیدی نے اندر پہنچتے ہی سراسیمہ لہجے میں اپنی صفائی پیش کرنی شروع کر دی جس پر ظاہر ہے، ان میں سے کسی نے کان نہیں دھرے۔

''نام کیا ہے تمہارا؟'' تفتیش کا آغاز شہریار نے کیا جبکہ کلام انہیں وہاں چھوڑ کر خود دوسرے کمرے میں چلا گیا تھا۔

''ونود۔'' اس نے جھٹ جواب دیا۔

''کہاں رہتے ہو؟'' شہریار نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دوسرا سوال کیا جس کے جواب میں اس نے اس بلڈنگ کا نام بتا دیا جہاں کلام کی رہائش تھی۔

''کلام کا پیچھا کیوں کر رہے تھے؟'' شہریار نے اس سے تیسرا سوال کیا جس پر اس کے چہرے پر لمحہ بھر کے لیے گھبراہٹ کا تاثر ابھرا لیکن پھر اس نے خود پر قابو پالیا اور بولا۔

''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''اگر یہ غلط فہمی ہے تو تم اپنی رہائش گاہ سے اتنی دور اس پارک میں کیا کر رہے تھے؟'' شہریار نے ذرا تحکمانہ انداز سے پوچھا۔

''وہ تو میں بس ہوا خوری کے لیے نکلا تھا۔'' اس کا لہجہ ہی گواہ تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ شہریار نے اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ دے مارا۔

''جھوٹ بولو گے تو اپنے لیے مشکلات کھڑی کرلو گے۔''

''میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ اگر تم نے مجھ پر تشدد کی کوشش کی تو میں چیخ چیخ کر لوگوں کو یہاں جمع کرلوں گا۔'' اپنا گال سہلاتے ہوئے اس نے دھمکی دی۔

''تم ایسا نہیں کرسکو گے۔ ہمارے پاس اس کا معقول انتظام ہے۔'' کلام اسی وقت کمرے میں داخل ہوا اور اس کی دھمکی کے جواب میں بولتے ہوئے ہاتھ میں موجود سامان زمین پر رکھ کر خود ایک جانب بڑھ گیا۔ وہاں ایک اسٹیریو رکھا ہوا تھا جس سے چھیڑ چھاڑ کرنے کے نتیجے میں کمرا تیز موسیقی کی آواز سے گونج اٹھا۔ معلوم نہیں کلام اس مکان کو کن مقاصد کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ بہرحال، یہ طے تھا کہ یہاں جو کچھ بھی ہوتا ہوگا، وہ اسے خفیہ رکھنے کی کوشش کرتا ہوگا اسی لیے معمولی فرنیچر والے دھول مٹی سے اٹے اس گھر میں یہ اسٹیریو موجود تھا۔ بلند موسیقی کی آوازیں اندر ہونے والی گفتگو کو باہر جانے سے روکنے کے لیے ایک اچھا ذریعہ تھیں۔

موسیقی کی آواز بلند ہوتے ہی سلو اور کلام نے مل کر ونود کو رسیوں میں جکڑ دیا اور ساتھ ہی اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اس کی بولتی بھی بند کر دی۔

''اب تم مجھے شرافت سے میرے ہر سوال کا صحیح جواب دو گے ورنہ یہ دونوں تمہاری درگت بنا کر رکھ دیں گے اور یہ تو اب تم خود بھی سمجھ سکتے ہو کہ یہاں تمہاری مدد کے لیے کوئی نہیں آئے گا، نہ ہی تم کسی کو بلا سکو گے۔ ہم وہ لوگ ہیں جو مارتے ہیں اور بندے کو رونے بھی نہیں دیتے۔ تمہارے منہ میں ٹھنسا کپڑا اب اسی وقت باہر آئے گا جب تم سچ اگلنے کے لیے تیار ہو گے۔'' ونود کے تمام تر احتجاج کے باوجود نہ صرف اسے رسی سے باندھ دیا گیا تھا بلکہ منہ میں کپڑا ٹھونس کر احتجاج سے بھی محروم کر دیا گیا تھا۔

اس بندش کے ساتھ اس پر کتنا ہی تشدد کر لیا جاتا، کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو سکتی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں اس حکمت عملی کا نتیجہ سامنے آگیا اور ونود نے ہار مان کر اشارے سے سچ بتانے کا عندیہ دے دیا۔ فوراً ہی اس کے منہ کو آزاد کر دیا گیا اور خشک ہو جانے والے گلے کو تر کرنے کے لیے پانی پلایا گیا۔ اپنے اعترافی بیان میں اس نے جو کچھ بتایا، اس کے مطابق وہ ایک چھوٹا موٹا جرائم پیشہ تھا جس کے پولیس سے معاندانہ کے بجائے دوستانہ تعلقات تھے اور وہ وقتِ ضرورت پولیس کے لیے مخبر کا کام بھی انجام دیتا تھا۔ اس کام کو انجام دیتے ہوئے اسے اردگرد پر کڑی نظر رکھنے کی عادت ہو گئی تھی اور وہ لوگ جو اکیلے رہتے تھے، اس کی توجہ کا خصوصی مرکز ہوتے تھے۔ کلام پر بھی وہ اسی حوالے سے کڑی نظر رکھتا تھا لیکن اسے مشکوک سمجھنے کے باوجود اس کے بارے میں کبھی کوئی ایسی بات معلوم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا جس کی بنیاد پر پولیس میں اس کی مخبری کر سکے۔ بس ایک امید کے سہارے وہ اس پر نظر رکھے ہوئے تھا لیکن بہت غیر محسوس انداز میں۔ احتیاط کے سبب اس نے کلام سے راہ و رسم بڑھانے یا اس کے سامنے زیادہ آنے سے بھی گریز کیا تھا اسی لیے کلام اس سے اچھی طرح واقف نہیں تھا۔

اس نے آج صبح پہلے کلام کو بیکری پر دیکھا تھا لیکن یہ کوئی اتنی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ البتہ جب وہ اسے جاگنگ سوٹ میں پارکنگ کی طرف جاتا نظر آیا تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ اتنے عرصے سے اس پر نظر رکھنے کے باعث اسے معلوم تھا کہ کلام جاگنگ کرنے کا عادی نہیں ہے۔ چنانچہ اس تبدیلی کی وجہ جاننے کے لیے اس نے کلام کا پیچھا کرنے کا فیصلہ کیا اور اس پارک تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا جہاں وہ سلو اور شہریار سے ملاقات کرنے پہنچا تھا۔ اسے ان دونوں کے ساتھ دیکھ کر اسے لگا کہ ہو نہ ہو، دال میں کچھ نہ کچھ کالا ضرور ہے۔ وہ کوشش کرنے لگا کہ کسی طرح اس پولیس انسپکٹر سے رابطہ ہو جائے جس کے لیے وہ کام کرتا تھا لیکن اتفاق سے اس کا فون مسلسل بند جا رہا تھا۔ آخر کار اس نے اپنے طور پر فیصلہ کر لیا کہ وہ کلام کے ملاقاتیوں کا پیچھا کر کے ان کے بارے میں جاننے کی کوشش کرے گا۔ کلام پارک سے نکلا تو وہ خود بھی اس خیال سے باہر نکل گیا کہ اس کے ساتھی بھی کسی نہ کسی سواری پر ہی وہاں آئے ہوں گے اور وہ اپنی موٹر سائیکل پر ان کا پیچھا کر کے ان کے بارے میں کھوج لگانے کی کوشش کرے گا۔ لیکن قسمت کی خرابی سے وہ خود ان لوگوں کی نظروں میں آگیا اور وہ تعداد میں زیادہ ہونے کے باعث اس پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئے۔

''تم نے کبھی کسی پولیس والے کے سامنے اس بات کا اظہار کیا تھا کہ تم کلام کو مشکوک شخص سمجھتے ہو؟'' اس سے ساری معلومات اگلوانے کے بعد شہریار نے اس سے پوچھا۔

''خاص طور پر نہیں لیکن میں نے اپنی بلڈنگ میں اکیلے رہنے والے جن افراد کی لسٹ پولیس کو دی تھی، اس میں کلام کا نام بھی شامل تھا۔'' اس نے بتایا۔

''او کے، اس کا منہ دوبارہ بند کر دو پھر سوچتے ہیں کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے۔'' شہریار نے سلو کو اشارہ کیا۔

''بھگوان کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ میں کسی کے سامنے بھی تم لوگوں کا ذکر نہیں کروں گا بلکہ تم کہو گے تو یہ شہر ہی چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ لیکن تم مجھے چھوڑ دو۔'' وہ ایک مخبر تھا اس لیے حالات کی سنگینی کو بھانپ سکتا تھا۔ اسے اپنا انجام اچھا نظر نہیں آرہا تھا، سو منتوں پر اتر آیا تھا۔ شہریار نے اس کی کسی بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا اور سلو نے دوبارہ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر پٹی باندھ دی۔ یہ سب چیزیں انہیں اسی گھر سے کلام نے مہیا کی تھیں۔

''اس کا کیا کرنا ہے؟'' شہریار اشارے سے کلام کو دوسرے کمرے میں لے گیا اور اس سے مشورہ چاہا۔

''ہمارے لیے اتنا اہم آدمی نہیں ہے لیکن خطرناک ضرور ہو گیا ہے۔ اگر ہم اسے یہاں سے زندہ جانے دیتے ہیں تو یہ ہمارے، خصوصاً میرے لیے بڑی مشکلیں کھڑی کر دے گا۔''

''یہی میں بھی سوچ رہا ہوں۔ ہمیں خود کو بچانے کے لیے اسے آف کرنا پڑے گا لیکن یہ سوچو کہ طریقہ کار کیا ہوگا۔ اگر یہ کوئی عام جگہ ہوتی تو ہم اسے قتل کر کے یہیں چھوڑ جاتے لیکن یہ تمہارا ایک ٹھکانا ہے جس سے محروم ہونا ٹھیک نہیں ہوگا۔ اگر ہم اسے گولی مار کر لاش اپنے ساتھ گاڑی میں لے جاتے ہیں، تب بھی پکڑے جانے کا ڈر ہے۔ کہیں کسی ناکے پر پولیس والوں نے روک کر چیکنگ کر لی تو بڑی مصیبت ہو جائے گی۔'' اس سے اتفاق کرنے کے ساتھ شہریار نے آگے کے حالات کا بھی تجزیہ کیا۔

''لاش کو ٹھکانے لگانا اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ یہاں سے سمندر نزدیک ہے اور سمندر کی طرف جاتے ہوئے کئی ایسے سنسان مقامات آتے ہیں جہاں ہم لاش پھینک سکتے ہیں۔ میں ایسے راستوں سے واقف ہوں جہاں ہمارا پولیس سے واسطہ نہیں پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے جو تم مناسب سمجھو۔'' شہریار نے اس سے اتفاق کر لیا۔

''لیکن یہاں میرے پاس ایسا انتظام نہیں ہے کہ لاش کو چھپا کر لے جاسکوں۔ اس کے لیے مجھے مارکیٹ سے کوئی بڑا سوٹ کیس وغیرہ خرید کر لانا پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ تم سوٹ کیس لے آؤ۔ ہم یہیں رک کر تمہارا انتظار کرتے ہیں۔'' شہریار نے اس کو اجازت دی اور طے پایا کہ ونود کو سائیلنسر لگے ریوالور سے قتل کرنے کا کام سلو انجام دے گا۔ سائیلنسر لگا ریوالور کلام نے فراہم کر دیا اور خود فوراً سوٹ کیس کی خریداری کے لیے روانہ ہو گیا۔

''ایسی موت جانے کب ہمارا مقدر بن جائے کچھ معلوم نہیں ہے۔'' ونود کو عین دل کے مقام پر گولی مار کر ہمیشہ کی نیند سلانے کے بعد سلو نے تبصرہ کیا تو شہریار اس سے اختلاف نہیں کرسکا۔

''خیر میں ان باتوں سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔ ان سالے بھارتیوں نے اپنی ٹریننگ ہی ایسی کی ہے کہ مرنا اور مارنا دونوں مشکل نہیں لگتا۔ تمہارے ساتھ رہ کر وطن پرستی وغیرہ کا بھی تھوڑا سا سبق پڑھ لیا ہے۔ پھر یہ بھی اطمینان ہے کہ ادھر میں مروں گا تو ادھر تم لوگ میرے ماں باپ کا خیال رکھو گے۔ بس وہ میری بے چاری منگیتر خوار ہو جائے گی۔ بڑا پیار کرتی ہے مجھ سے لیکن پیار کا کیا ہے، کوئی اور مجھ سے اچھا مل گیا تو اس سے بھی کرنے لگے گی۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں بول رہا تھا لیکن شہریار سمجھ گیا کہ ایک انسانی جان لینے کا ڈپریشن اس کے حواسوں پر چھا رہا ہے۔ گزشتہ روز را کے ایک ٹھکانے پر بھی انہوں نے کئی لوگوں کو موت کی نیند سلایا تھا لیکن اس وقت وہ اپنی جان بچا کر بھاگنے کے چکر میں تھے اس لیے وہ قتل و غارت گری لازمی تھی۔ اس وقت جس شخص کو ہلاک کیا تھا، وہ ایک چھوٹا مجرم تھا۔ شاید اسی لیے اسے مار کر وہ خود کو مجرم محسوس کر رہا تھا۔

''اتنی ٹینشن مت لو۔ اگر ہم اس شخص کو چھوڑ دیتے تو کل یہ ہمارے لیے موت کا پروانہ بن جاتا۔ یہ کلام سے اچھی طرح واقف تھا اور ظاہر ہے کلام کے ذریعے ہمارا کھوج لگانا زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ اس لیے اسے ختم کرنا ہماری مجبوری تھی۔'' شہریار نے اس کا شانہ تھپتھپا کر اسے تسلی دی۔

''میں ٹینشن وینشن لینے والا آدمی نہیں ہوں۔ بس ایسے ہی ایک بات بول دی تھی۔'' وہ فوراً ہی طرح دے گیا اور اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''یہ اپنے کلام بھیا کی چوائس بھی ایویں ہے۔ اتنے بور گانے لگا کر گیا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کوئی اچھے گانے والوں کا کلیکشن بھی ہے یا نہیں اس کے پاس۔'' وہ دیوار گیر ریک میں رکھا کلیکشن چیک کرنے لگا۔ پھر شاید اپنے مطلب کا کوئی ریکارڈ مل گیا تو اسٹیریو آف کر کے اسے تبدیل کرنے لگا۔ خاموشی کے اس قلیل سے وقفے میں انہوں نے پولیس کی گاڑیوں کے سائرن سنے۔ دونوں ہی بری طرح چونک گئے۔ آوازیں زیادہ دور سے نہیں آرہی تھیں اور ایسا لگ رہا تھا کہ گاڑیوں کا رخ اسی طرف ہے۔ وہ دم سادھے ان آوازوں کو سننے لگے جو چند لمحوں میں ہی اتنی قریب آگئی تھیں کہ انہیں اپنے کان سنسناتے محسوس ہو رہے تھے۔

ان دونوں ہی نے ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ دونوں ہی کے چہروں پر کئی سوال تھے۔ کیا کسی کو ان کے بارے میں کوئی سن گن مل گئی تھی؟ کیا کسی نے ونود کا قتل ہوتے دیکھ لیا تھا؟ کیا ونود نے ان سے غلط بیانی کی تھی اور ان کی گرفت میں آنے سے قبل وہ کسی کو ان کے بارے میں آگاہ کر چکا تھا؟ کلام جو سوٹ کیس خریدنے گیا تھا، اب تک واپس کیوں نہیں پہنچا تھا؟

فی الحال ان کے ذہنوں میں موجود ان سوالوں کا جواب دینے والا کوئی نہیں تھا اور پولیس موبائلوں کے سائرن تھے کہ چیخے چلے جا رہے تھے۔ اب تو وہ یقین سے یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ گاڑیاں اسی گلی میں یا اس کے کارنر پر موجود ہیں۔ شہریار نے گلی میں کھلنے والی کھڑکی کے قریب پہنچ کر آہستہ سے اس کے پٹ کو بس اتنا کھولا کہ ذرا سی جھری بن جائے۔ اس جھری سے اس نے جو پہلا چہرہ دیکھا، وہ ایک مسلح پولیس اہلکار کا تھا۔ اس کے بعد اسے مزید کئی پولیس والے وہاں دکھائی دے گئے۔

''دونوں قاتلوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ ہاتھ اٹھا کر مکان سے باہر آجاؤ ورنہ پولیس مکان کا دروازہ توڑ کر اندر آجائے گی۔'' گلی کے کونے پر کھڑی پولیس وین سے میگافون کے ذریعے اعلان کیا گیا تو ان دونوں کا خون رگوں میں اچھل پڑا اور بے ساختہ ہی ان کی نظریں ونود کی لاش کی طرف گئیں۔ منہ میں کپڑا ٹھنسا ہونے کی وجہ سے اس کے حلق سے اپنی زندگی کی آخری چیخ بھی برآمد نہیں ہو سکی تھی لیکن موت کی دہشت اس کے چہرے پر ثبت ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی خوف زدہ بے نور آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی تھیں اور ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کہہ رہا ہو۔ ''مجھے قتل کر کے تم خود کیسے بچ سکو گے؟''

یہ پُرپیچ وسنسنی خیز داستان جاری ھے
مزید واقعات آیندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

سراغرساں کمپیوٹر

مختار آزاد

الفریڈ ہچکاک سے ایک سائنسی انتخاب

ماضی کی یادیں بڑی سہانی ہوتی ہیں... یادداشت کے سہارے ہی یہ یادیں زندہ و جاوید رہتی ہیں... یادداشت ذہن کا خزانہ ہی نہیں بلکہ ایک سرمایہ ہے... جس میں عمر رفتہ کے ساتھ گھٹاؤ بڑھاؤ کا سلسلہ جنم لینے لگتا ہے... ذہن کے پردے پر ڈوبتی... اُبھرتی تصویروں کی تلاش وکھوج کا دلچسپ قصّہ... ایسے ہم نشینوں کی بیٹھک جس کے مہمان آپ بھی ہو سکتے ہیں...

عمل کے ذریعے اپنی شناخت کی دریافت اور گمشدگی کا احوال...

وہ کھڑی اس سے ٹوتھ پیسٹ کے بارے میں بولے جا رہی تھی اور اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ یہ سب کچھ اس سے کیوں کہہ رہی ہے۔

''میں ہمیشہ سے ہی وائٹ گولڈ پیسٹ خریدتی ہوں۔ مجھے تو اس سے بہت اُنسیت ہے۔ اتنی کہ میں اس کے بجائے کوئی دوسرا برانڈ خریدنے کا سوچ ہی نہیں سکتی۔'' وہ اپنی دُھن میں بولے چلی جا رہی تھی۔ ''میں تو اس کی بڑی ٹیوب ہی لیتی ہوں۔ اکانومی سائز ہوتی ہے نا اس لیے بہت چلتی

ہے۔ ابھی بھی میں نے پھر وہی خریدی ہے۔ یہ دیکھو...'' اس نے پرس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ''جیری کو گزرے پانچ برس ہو چکے مگر میں تو اب بھی...'' وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوئی اور ہینڈ بیگ کے اندر جھانکا۔ ''جانتے ہو، یہ ہر قسم کے دانتوں کے لیے بہترین پیسٹ ہے۔'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ''میں کنجوس نہیں ہوں مگر یہ کفایتی ہے اور ویسے بھی ہر آدمی کو ایک ایک پیسا بچانا چاہیے۔'' اس نے یہ کہتے ہوئے بیگ سے ٹیوب نکال کر اس کے سامنے کی۔ ''یہ کم قیمت بھی ہے۔ کیا تم اسے دیکھنا چاہو گے؟''

اس کے ہاتھ میں ایک ٹوتھ پیسٹ تھا۔ نیم سپاٹ ٹیوب کو دیکھنے سے صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ زیر استعمال ٹیوب تھی۔ ایک نظر ڈالنے پر وہ غیر معروف برانڈ قطعی نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے ٹیوب پر ایک نظر ڈال کر پھر اس کی طرف دیکھا۔

''اس صبح یہ میرے واش روم کی میڈیسن کیبنٹ میں تھی۔'' اس نے ٹیوب کو اپنی نگاہوں کے سامنے کیا۔ ''یہ دیکھو...'' اس نے انگلی سے ٹیوب کے سرے پر انگلی کی پور رکھی۔ ''یہ چوڑی دار ڈھکن والی ہے۔'' اس نے ایک بار پھر نگاہ اوپر کر کے اسے دیکھا۔ ''اب میں تمہیں بتانا چاہوں گی کہ میں ہمیشہ اسی ٹائپ کے ڈھکن والی ٹیوب لیتی ہوں، حالانکہ اس میں دو تین طرح کے ڈھکن والے ٹوتھ پیسٹ بھی آتے ہیں، اسی برانڈ کے۔''

''ہمیشہ...؟'' اس نے حیرت بھرے لہجے میں سوال کیا۔ لگ رہا تھا کہ اب اسے بھی اس کی باتوں میں دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔ جس دلچسپی سے اس نے سوال سنا، لگ رہا تھا کہ وہ جواب دے گی مگر وہ چپ تھی جس سے کوئی اندازہ لگانا مشکل تھا۔

وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس وقت وہ یہاں کیا کرنے آئی ہے۔ وہ تو کمرے میں ملزم کے سراغ تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ ایک ہاسٹل تھا جہاں ذہنی امراض کے شکار ان معمر افراد کو رکھا جاتا تھا جن کے مرض کی شدت کسی دوسرے کے لیے خطرناک نہیں تھی۔ یہ لوگ ہاسٹل کے اپارٹمنٹ نما کمروں میں رہتے اور اپنے کھانے پینے کا بھی زیادہ تر خود انتظام کرتے تھے۔ ویسے ان کے لیے ہاسٹل میں کیفے ٹیریا بھی تھا۔ اگر کوئی چاہے تو وہاں جا کر تین وقت کا کھانا کھا سکتا تھا۔

اسی طرح کے ایک اپارٹمنٹ میں بیٹھی وہ عورت ٹوتھ پیسٹ کی بات کیے جا رہی تھی۔ اپارٹمنٹ بہت چھوٹا تھا جس میں زیادہ سامان رکھنے یا لوگوں کے رہنے کی گنجائش کم ہی تھی۔ البتہ وہاں پر فرنیچر اور اس طرح کا دوسرا سامان بھی ہی تھا۔ ایک ٹی وی تھا۔ دیوار کے ساتھ کتابوں کا ایک ... اور اس کے ساتھ صوفہ کم بیڈ تھا۔ دیوار پر قدرتی منظر کی ایک خوبصورت تصویر آویزاں تھی۔ کھلی کھڑکی سے آنے والی سورج کی روشنی سیدھی تصویر پر پڑ رہی تھی جس سے ... گہرے سبز اور نیلے رنگوں کے امتزاج میں دھندلی دکھائی دے رہی تھی۔

''کیا میں...'' اچانک عورت نے مبہم جملہ کہا۔

''میں نے کیا؟'' اس نے وضاحت طلب لہجے میں پوچھا۔ مگر اس عورت کو دیکھ کر یہ نہیں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے اس نے یہ بات سنی ہوگی۔ ''میرے ڈش لیکوڈ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔'' اس نے اپنی دھن میں کچھ اور ہی کہنا شروع کر دیا۔ ''میں پچاس سال تک ایک ہی برانڈ استعمال کرتی رہی۔ تمہیں معلوم ہے کہ کل رات جب میں برتن دھونے گئی تھی تو کیا ہوا؟ وہ تھوڑا سا، بالکل ذرا سا...'' اس نے ہاتھوں کی مدد سے اشارہ کرتے ہوئے بات سمجھانا شروع کی۔

وہ گڑبڑا گیا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ ... لے کر بیٹھ گئی۔ ''اوہ... معاف کیجیے۔'' اس نے بات بنانے کی کوشش کی۔

''اس نے رات کو کسی وقت آ کر بوتلیں بدل دی تھیں۔ بڑی کے بجائے چھوٹی بوتل رکھ دی تھی۔'' یہ کہہ کر اس نے چہرہ اوپر اٹھایا۔ لمحہ بھر اسے دیکھا۔ ''تمہیں معلوم ہے، وہ زیادہ قیمتی تھی مگر سستی والی رکھ دی۔ وہ سمجھی کہ شاید مجھے پتا ہی نہیں چل سکے گا مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ میں سب کچھ اچھی طرح سمجھ چکی ہوں۔ ابھی جا رہی ہوں بار برا کے پاس، اس معاملے پر بات کرنے کے لیے۔''

یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر توقف کیا اور کچھ سوچنے کے بعد بولی۔ ''ہاں، یہ آئیڈیا ایک دم شان دار ہے۔ مجھے باربرا سے بات کرنی ہی چاہیے۔''

''اب یہ باربرا کون ہے؟'' وہ زیر لب بڑبڑایا۔ وہ جو کوئی بھی تھی، کم از کم اُس کے لیے تو قطعی غیر اہم تھی۔ اسے یہ نام سن کر کچھ یاد نہیں آیا تھا۔

''اچھا...'' یہ کہہ کر وہ کھڑی ہونے لگی۔ ''میں جا رہی ہوں باربرا کے پاس۔'' اس نے بدقت تمام صوفے سے اٹھنے کی کوشش کی مگر لگتا تھا کہ وہ اتنی صحت مند نہیں تھی کہ بنا کسی سہارے کے اٹھ کھڑی ہو۔ اس نے اٹھنے کے لیے ایک ہاتھ صوفے کے ہتھے پر رکھا اور دوسرا سامنے کی طرف پھیلایا۔ ایسا لگا جیسے اسے اٹھنے کے لیے کسی سہارے کی ضرورت ہو۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی ہی تھی کہ وہ آگے بڑھا مگر اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ ''مجھے کسی کا سہارا لینا گوارا نہیں ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ آخر اپنے قدموں پر کھڑی ہو گئی۔ پھر اس نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ ''میں اکثر بھول جاتی ہوں کہ اس عمر میں اٹھنے بیٹھنے کے لیے سہارے کی ضرورت پڑ ہی جاتی ہے۔'' وہ گہری سانس لے کر اس طرح بولی جیسے صوفے سے اٹھ کر کھڑا ہونے کی اس مشقت میں اس کے جسم کی ساری توانائی خرچ ہو چکی ہو۔

''ہو سکتا ہے وہ میری بات پر یقین ہی نہ کرے۔'' اس نے صوفے کی پشت کا سہارا لے کر کہنا شروع کیا۔ ''وہ مجھے بھی دوسری بڑھیا عورتوں کی طرح خبطی سمجھتی ہوگی مگر جب بھی ملتی ہے بس مسکراتی رہتی ہے، ہنستی رہتی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکی اور پھر اس کی طرف گہری نظروں سے دیکھا۔ ''تم نہیں سمجھتے ایسے لوگوں کو۔'' یہ کہتے ہوئے اس کا لہجہ زہر آلود تھا۔

یہ کہہ کر اس نے دروازے کی طرف ایک قدم بڑھایا اور پھر ٹھہر گئی۔ ''ہو سکتا ہے، وہ اس وقت نہ ملے مگر پھر بھی۔ میں چلتی ہوں اُس کی طرف۔'' اس نے دروازے پر پہنچ کر ناب گھمائی۔ ''تم انہیں ضرور پکڑ لو گے فرینک! آخر تم ایک سراغ رساں ہو۔'' وہ باہر نکلنے سے پہلے پھر اس سے مخاطب ہوئی۔

فرینک نے گہری سانس لی۔ یہ پہلا موقع تھا جب وہ اس کی بات سن کر حیران نہیں ہوا۔ اس نے بھی پہلی بار درست شخص سے، درست بات کہی تھی۔ ''کوشش بھی ہے۔'' وہ مسکرایا۔ وہ فرینک ہی تھا ایک سابق پولیس افسر جو کبھی بطور سراغرساں کام کرتا تھا مگر اب وہ بوڑھے نفسیاتی لوگوں کے اس اسپتال نما ہاسٹل میں رہتا تھا۔

وہ تم کامیاب ہو گے۔'' یہ کہہ کر وہ بوڑھی عورت اپارٹمنٹ سے نکل گئی۔

''گڈ بائے۔'' فرینک نے نرم لہجے میں اسے الوداع کہا۔

اُس کے جاتے ہی وہ پلٹا اور صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ وہ بالکل خالی دماغ تھا۔ نہ سوچ رہا تھا اور نہ ہی کچھ کر رہا تھا۔ کچھ دیر تک وہ یونہی بیٹھا رہا اور پھر ہاتھ بڑھا کر سائڈ ٹیبل پر سے ریموٹ اٹھایا اور ٹی وی آن کر دیا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جس دنیا میں ہے، وہ اس کے لیے ہر لحاظ سے مکمل تھی۔

فرینک فورڈ نے متعدد بار مشکلات کو شکست دی تھی

سنگنی کی انگوٹھی

ایک شخص سنار سے۔ ''میں نے جو منگنی کی انگوٹھی تم سے خریدی تھی، وہ واپس لے لو۔''

سنار۔ ''کیوں جناب کیا ان کو انگوٹھی پسند نہیں آئی؟''

وہ شخص بولا۔ ''انگوٹھی تو پسند آ گئی تھی لیکن میں پسند نہیں آیا۔''

☆☆☆

بیمار میاں اپنی تیز مزاج بیگم سے بولے۔

''بیگم میرے مرنے کے بعد تم دھرم سنگھ سے شادی کر لینا۔''

بیوی بولی۔ ''کیا کہا، وہ تو تمہارا جانی دشمن ہے۔''

''ہاں بیگم اگر میں اپنی زندگی میں اپنے دشمن سے بدلہ نہیں لے سکا تو مرنے کے بعد ہی سہی۔'' میاں نے اطمینان سے جواب دیا۔

(ریاض بٹ، حسن ابدال)

اور کئی ایک اس کے سامنے تھیں۔ وہ جب بھی کسی مشکل سے نکلتا خود کو فاتح محسوس کرتا تھا۔ اچانک اسے ایک قتل کی مدتوں پرانی واردات یاد آ گئی۔ اسے سراغ ملا تو وہ گھر سے نکل پڑا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ اتنا آسان نہ ہوگا۔ راستہ بھی ڈھلوان تھا اور معاملہ بھی پیچیدہ مگر اسے یقین تھا کہ قاتل پکڑا جائے گا۔ رات گئے جب وہ پلٹا تو کافی دیر تک بستر پر لیٹا کڑیاں ملاتا رہا۔ آخر وہ برش کرنے اٹھا اور جب اس نے باتھ روم کی لائٹ آن کی تو چونک گیا۔ سنک کے ساتھ وائٹ گولڈ ٹوتھ پیسٹ کی بڑی ٹیوب رکھی تھی۔ اچانک اسے ایک بار پھر جولی اور اس کا ٹوتھ پیسٹ یاد آ گیا۔ اس کا دماغ اچانک نادیدہ الجھنوں میں الجھ گیا۔

☆☆☆

فرینک کچن کی ڈائننگ ٹیبل پر ایک بہت پرانا اخبار رکھ کر میگنی فائی گلاس کی مدد سے پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دی ٹائمز میں اس پر مضمون تھا مگر وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ جو کچھ لکھا گیا، وہ سب کچھ اس نے کیسے کر لیا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون لوگ تھے، کیا چاہتے تھے اور انہوں نے اس کی دیکھ بھال کیوں کی تھی؟ اسی دوران دروازے پر دستک ہوئی۔ ''اندر آ جاؤ، دروازہ کھلا ہے۔'' اس نے اخبار میز پر

رکھا اور دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ کچن کے عین سامنے فلیٹ کا داخلی دروازہ تھا۔

دروازہ آہستگی سے کھلا اور چھوٹے قد کا ایک شخص مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا۔ ”گڈ مارننگ ڈیمرٹس۔“ اسے دیکھتے ہی فرینک نے کہا۔ فرینک اسے تب سے جانتا تھا جب وہ دونوں یوینا کاؤنٹی میں بے فکری کی آزاد زندگی گزار رہے تھے۔ وہ اُن دنوں کا شمار زندگی کے بہترین اور سنہری ایام میں کرتا تھا۔

”تمہارا مطلب ہے گڈ آفٹر نون۔“ ڈیمرٹس نے دروازہ بند کرتے ہوئے جواب دیا۔ وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔ ”اس وقت دن کے تقریباً دو بج چکے ہیں اور تم لنچ کے لیے نیچے بھی نہیں آئے۔ یقیناً تم اس وقت بھوکے ہو۔“ وہ اس کے سامنے کھڑا کہہ رہا تھا۔

یہ کہہ کر ڈیمرٹس خاموش ہو گیا اور فرینک کے جواب کا منتظر رہا۔ ”نہیں... ایسی کوئی بات نہیں۔“ کچھ دیر بعد فرینک نے کہنا شروع کیا۔ ”میں سوچ رہا تھا کہ ذرا بھوک اور تیز ہو تو پھر ہاٹ ڈاگ کھانے جاؤں۔ آج یہ کھانے کو دل مچل رہا ہے۔“

”اوکے...“ ڈیمرٹس نے جواب دیا۔ ”میں چلتا ہوں۔“ وہ دروازے کی طرف بڑھا اور پھر جاتے جاتے پلٹا۔ ”اپنی دوا لینا نہ بھولنا۔“ یہ کہہ کر اس نے دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔

کچھ دیر بعد وہ مائکروویو اوون میں کھانا گرم کرنے لگا۔ اسے چولہا جلانے سے ڈر لگتا تھا۔ وہ ڈرتا تھا کہ چولہا جلانے سے آگ لگ سکتی ہے۔ اسے آگ سے بہت خوف آنے لگا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جلنے کی تکلیف ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔ اب وہ کوشش کرتا تھا کہ چولہا جلانے کی نوبت ہی نہ آئے۔ حالانکہ گیس کے چولہے کو صرف ایک چنگاری کی ضرورت ہوتی ہے مگر اسے اب بھی سب کچھ یاد تھا۔ وہ ایک قاتل کو پکڑنے گیا مگر اس نے اس کی کار پر بم پھینک دیا جس سے گاڑی جل گئی۔ خود وہ بھی بُری طرح جھلس گیا تھا مگر بروقت علاج نے اسے بچا لیا۔

کھانا ختم کرنے کے بعد اس نے برتن سمیٹے اور انہیں دھو کر پلٹا۔ ہاتھ خشک کر کے وہ آگے بڑھا تو اسے کچھ نظر آیا۔ اس نے ہاتھ بڑھایا۔ باتھ روم کی چھوٹی کیبنٹ کے ساتھ ایک چٹ رکھی تھی جس پر لکھا ہوا تھا:

”لارج وائٹ گولڈ پیسٹ... جوائے... جولیس...؟“

جولی سامنے والے فلیٹ میں رہتی تھی۔ وہ ایک اچھی ہمسایہ تھی۔ عمر کافی تھی اور باتونی بھی بہت تھی۔ اکثر آجاتی اور صوفے پر بیٹھتے ہی بے تکان بولنا شروع کر دیتی تھی۔ فرینک کو اکثر سمجھ نہیں آتا تھا کہ وہ کہنا کیا چاہ رہی ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ شاید کل ہی اس کے گھر آئی تھی مگر پھر وہ یہ چٹ کیوں چھوڑ گئی؟ وہ چند لمحے تک اسے غور سے دیکھتا رہا اور پھر اسے کافی دیر بعد یاد آیا کہ یہ شکستہ تحریر تو خود اس کی اپنی ہے۔

اچانک اسے یاد آ گیا کہ جس دن اس نے یہ چٹ لکھی، اُس روز بدھ تھا اور اس دن وہ اینڈریو سے ملا۔ دونوں نے اکٹھے لنچ کیا تھا۔ اینڈریو اس سے ملنے ہر بدھ کو آتا تھا اس لیے اسے یقین تھا کہ اس روز یہی دن ہوگا۔ دونوں اسپیگیٹی کھانے کیفے ٹیریا جاتے تھے۔ ایک اور خاص بات بدھ کو اینڈریو کے آنے کی یہ تھی کہ اسے بھی اسپیگیٹی پسند تھی اور وہ کیفے مینیو میں صرف بدھ کو شامل ہوتی تھی۔ اس کے ذہن میں گزری باتیں ایک ایک کر کے یاد آنے لگیں۔

”تمہیں یہ بہت اچھی لگتی ہے؟“ فرینک نے پوچھا۔

اینڈریو نے سر ہلایا اور ایک بار پھر کانٹے میں اسپیگیٹی پرونے لگا۔ ”مجھے پسند بھی ہیں اور یہ بنی بھی بہت لذیذ ہیں۔“ کھانا ختم ہو چکا تھا مگر پھر بھی وہ وہیں بیٹھے رہے۔ دونوں خاموش تھے۔ ان کے پاس کہنے اور سنانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

اینڈریو اس کا دوست نہیں بلکہ اس کے ایک بہت پرانے دوست کا بیٹا تھا۔ دونوں نے پولیس میں کئی سال اکٹھے گزارے تھے اور ایک دن وہ مجرم کا پیچھا کرتے کرتے اس کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ اب تو شاید ہی کسی کو اس کا نام یاد ہو۔ اینڈریو بچپن سے ہی اس کے بہت قریب تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد وہ اس کے اور نزدیک آ چکا تھا۔

بیرنی، فرینک کا بہت قریبی دوست تھا اور فرینک کو اس کے ساتھ گزرے ماہ و سال اب بھی بہت اچھی طرح یاد تھے۔ فرینک جانتا تھا کہ اس کی کوئی آل اولاد نہیں۔ وہ مر گیا تو دنیا شاید اسے ایک دن بھی یاد نہیں رکھ پائے گی۔

اینڈریو کمپیوٹر شعبے میں مہارت رکھتا تھا۔ اس نے اپنے اسٹور کی ایک چین بنا رکھی تھی۔ کاروبار خاصا منافع بخش چل رہا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے بارے میں وہ کچھ اور نہیں جانتا تھا۔ بس اس کے لیے یہی کافی تھا کہ وہ اس کے نہایت عزیز مرحوم دوست کا بیٹا تھا اور وہ بچپن سے ہی اس کے بہت قریب رہا ہے۔ اس کے علاوہ اسے کچھ علم نہیں تھا۔ وہ شادی کر چکا، اس کے بچے ہیں، وہ گالف کھیلتا ہے، اسے پینٹنگ کا شوق ہے، وہ گھوڑوں کی ریس میں دلچسپی لیتا ہے... فرینک کو اس کی نجی زندگی کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا اور نہ ہی اس نے کبھی یہ سب کچھ جاننے کی کوشش کی تھی۔

اینڈریو ہر بدھ کو اس کے پاس آتا تھا۔ اس نے کبھی نہیں پوچھا کہ وہ اس دن باقاعدگی سے کیوں آتا ہے؟ وہ اس کے بارے میں نہ کچھ جانتا تھا اور نہ ہی ایسی کوئی بات کرتا کہ جس میں اُس کے خاندان، شوق یا کسی اور شے کا تذکرہ ہو۔ وہ آتا تو فرینک اسے چھوٹے چھوٹے قصے سناتا۔ اس کے باپ کے ساتھ گزرے یادگار لمحوں کی بات کرتا اور بس... لنچ کے بعد اینڈریو چلا جاتا، اگلے بدھ کو دوبارہ آنے کے لیے۔

اُس دن بدھ تھا۔ اسے اینڈریو کے آنے کا انتظار تھا مگر وہ نہ آیا۔ اسی وجہ سے اس نے لنچ بھی بہت دیر سے کیا تھا۔ ”میرا خیال ہے کہ اب مجھے اپنا ٹوتھ پیسٹ بدل دینا چاہیے۔“ اس نے اینڈریو کے نہ آنے کا خیال سر سے جھٹکا اور چٹ جیکٹ کی جیب میں رکھتے ہوئے خود کلامی کی۔

وہ گھر سے باہر نکلا تو سامنے سے اینڈریو آتا نظر آیا۔ وہ چیونگم چباتا ہوا اس کی طرف ہی آ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ لمحہ بھر کو رکا اور پھر آگے بڑھا۔ ”کیسے باہر نکل آئے؟“ اس نے فرینک سے پوچھا۔

”وہ جوائے، میرا مطلب ہے کہ وہ عورت...“ فرینک نے اٹکتے ہوئے بے ربط بات کی۔ ”میرا مطلب ہے کہ وہ ٹوتھ پیسٹ، وہی ڈش لیکوڈ والی...“ اینڈریو حیرانی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے۔

”میرا مطلب ہے جوائے اس کا ڈش واشر لیکوڈ ہے۔“ چند لمحوں کے بعد فرینک نے سنبھلتے ہوئے وضاحت کی۔

”اوہ... تو یہ بات ہے۔“ اینڈریو نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”یہ سب کچھ کیسے ہوا؟“

”معلوم نہیں۔“ فرینک نے چند لمحوں کے توقف کے بعد کہا۔ ”یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں مگر کچھ ٹھیک سے یاد نہیں آ رہا۔“

”تو ایک نیا معما، ایک نئی مشکل۔“ اینڈریو نے شگفتہ لہجے میں کہا۔ ”بے فکر رہیں، مجھے یقین ہے آپ یہ معما حل کر لیں گے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟ میں پاگل نہیں ہوں۔“ اس کے لہجے میں خفگی تھی۔

”میں نے ایسا تو نہیں کہا۔“ اینڈریو نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

”لنچ کر لیا؟“ فرینک نے نرم لہجے میں پوچھا۔

”نہیں۔“

”تو چلو پہلے پیٹ پوجا کرتے ہیں۔“ فرینک نے اسے بازو سے پکڑتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں اپنے پسندیدہ کیفے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

فرینک کو یاد نہیں تھا کہ وہ لنچ کر چکا ہے۔ بدھ تھا اور اس روز اسے اینڈریو کے ساتھ اسپیگیٹی کھانا ہوتی ہے۔ وہ دونوں خاموشی سے کھانا کھانے میں مگن تھے کہ ایک دراز قد جوان عورت ان کی طرف بڑھی۔ گھنے سیاہ بالوں والی عورت مسکرا رہی تھی۔ فرینک نے اس پر ایک نظر ڈالی۔ وہ اسے پہچانتا تھا۔ یہ کیفے وہی چلا رہی تھی۔ وہ اسے پہچان تو چکا تھا مگر اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ سوچنے لگا کہ اس کا نام کیا ہے۔ وہ ذہن پر زور ڈالتا رہا اور آخر اسے یاد آ گیا۔ ”ہیلو باربرا۔“ اس کے قریب آتے ہی اس نے مہذب انداز میں مسکرا کر کہا۔ ”کیسی ہو... سب ٹھیک چل رہا ہے؟“

”ہیلو فرینک...“ اس نے جواباً کہا پھر مسکراتے ہوئے اینڈریو کی طرف مڑی۔ ”تمہیں یہاں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔“

اصول

نقب لگانے کے بعد اچانک چوروں کو پتا چلا کہ جس مکان میں وہ لوگ گھسے تھے، وہ مشہور و معروف کے باز محمد علی کلے کا مکان تھا۔ سارے چور یہ معلوم ہوتے ہی تھر تھر کانپنے لگے۔

ایک نے کہا۔ ”چپکے سے کھسک لو، کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔“

دوسرا بولا۔ ”ہائے! محمد علی کے مار مار کر ہماری ہڈی پسلی ایک کر دے گا۔“

تیسرے نے جو معمر اور تجربے کار تھا، ساتھیوں کی ہمت بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”گھبراؤ نہیں یارو! میں محمد علی کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ جب تک کم سے کم پچاس ہزار ایڈوانس نہ لے لے، ایک مکا بھی نہیں مارے گا۔“

(لاہور سے عثمان ریاض)

”مجھے بھی یہاں آکر بڑی خوشی ہوتی ہے۔“ اینڈریو نے پلیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ مجھے ہر ہفتے یہاں کھینچ لاتی ہے۔“

جواب میں باربرا کھڑی مسکراتی رہی۔ اس کی پوری توجہ اینڈریو پر تھی۔ ”میں سمجھتی ہوں تم اپنا وعدہ نہیں بھولے ہوگے۔“ چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے اینڈریو سے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

یہ سن کر اینڈریو مسکرادیا۔ ”تم ڈی وی ڈی پراجیکٹ والی بات کررہی ہونا؟“

باربرا نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”میں ابھی ڈیڑھ گھنٹا پہلے ہی واپس پہنچا ہوں۔ ابھی کام پر بھی نہیں گیا۔ اگر تم چاہو تو لنچ کے بعد ہم اکٹھے بیٹھ کر اس موضوع پر بات کرسکتے ہیں۔“ اینڈریو نے اسپیگٹی سے بھرا چمچ منہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”مجھے لگتا ہے کہ میں تمہارا لنچ خراب کررہی ہوں۔“ باربرا نے کہا۔

”نہیں... اب ایسی بھی کوئی بات نہیں، بس ختم ہی کرنے والا ہوں۔“

باربرا فرینک کی طرف مڑی۔ ”مائنڈ تو نہیں کریں گے اگر میں آپ کے مہمان کو اغوا کرلوں تھوڑی دیر کے لیے۔“ یہ کہہ کر وہ مسکرادی۔

”کروں گا مائنڈ...“ فرینک نے سنجیدگی سے کہا۔

”ہاں، وہ جیسے ہی لنچ ختم کرلے، تم اسے اغوا کرسکتی ہو۔“ یہ کہہ کر اس نے زور کا قہقہہ لگایا۔ باربرا بھی ہنس پڑی۔

اسی دوران اینڈریو نیپکن سے منہ صاف کرتا ہوا آگے بڑھا اور فرینک کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”اگلی ملاقات جمعرات کو ہوگی۔“

”جمعرات کو...؟“ فرینک نے استفساریہ لہجے میں کہا۔

”ہاں ہاں جمعرات کو۔“ وہ مسکرایا۔ ”میں ہر جمعرات کو ہی تم سے ملنے آتا ہوں۔“ اینڈریو کہہ رہا تھا۔ ”تم یہ بات اچھی طرح جانتے ہو...“

”بات یہ ہے باربرا کہ...“

”جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا، اس میں باربرا کو کوئی دلچسپی نہیں۔“ اینڈریو نے فرینک کی بات کاٹی۔ وہ ڈش لیکوڈ اور ٹوتھ پیسٹ کے بارے میں کہنے جارہا تھا مگر اینڈریو کی بات سن کر اس نے اپنا ارادہ ملتوی کردیا۔

اچانک اسے جھرجھری آئی۔ آنکھ کھلی تو ٹی وی چل رہا تھا اور ریموٹ اس کے ہاتھ میں تھا۔ فرینک نے ہچکچاتے ہوئے ٹی وی بند کیا اور ریموٹ ایک طرف ڈال دیا۔

اچانک اسے لگا جیسے وہ پولیس اسٹیشن میں بیٹھا ہے۔ ”اس کے بعد کیا ہوا تھا؟“ اس نے سامنے بیٹھے شخص سے پوچھا۔

”میں نے کھانا کھایا، تھوڑے سے انگور لیے اور بس...“

”اوہ...“ فرینک نے کہا۔ ”اوکے...“ اس نے دونوں ہاتھ اوپر کیے۔

”میں آپ سے یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ میری غیر موجودگی میں کوئی میرے کمرے میں داخل ہوا اور میرے کھانے پینے کی ہر شے تباہ و برباد کردی۔“ یہ کہہ کر اس نے چند لمحے توقف کیا۔ ”برائے مہربانی میری بات سمجھنے کی کوشش کیجیے۔“

”کوئی ایسا کیوں کرے گا؟“ فرینک نے استفساریہ نگاہوں سے دیکھا۔

”شاید اچھا کھانا چوری کرنے کے لیے، شاید مجھے کے لیے یا پھر شاید مجھے پریشان کرنے کے لیے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا کہ جس نے بھی یہ کیا، ایسا کیوں کیا۔“

”کوئی تمہیں کیوں پریشان کرنا چاہے گا؟“

”شاید میں ہی وہاں پر ایک ایسا شخص باقی بچا ہوں جو پتھر کی طرح ڈٹا ہوا ہوں۔“ اس نے ذرا جذباتی انداز میں جواب دیا۔

”واقعی... تم ایسا ہی سوچتے ہو؟“ فرینک نے پرسکون لہجے میں کہا۔

”تو تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ میں سٹھیایا ہوا بڈھا ہوں۔“ وہ غصے سے بولا۔

”نہیں نہیں...“ فرینک گڑبڑا گیا۔ ”میرے کہنے کا مقصد یہ نہیں تھا...“

”تو کیا تھا؟“

”کیا ہوتا اگر... مطلب کہ اگر... اگر کیا ہوتا؟“

فرینک گڑبڑا چکا تھا۔ اچانک اس کے دماغ کو ایک جھٹکا لگا۔ اب اسے جولی اور ٹوتھ پیسٹ یاد آگیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اسے جولی کو کچھ بتانا چاہیے۔ وہ اسے ٹوتھ پیسٹ کے بارے میں بتانا چاہتا تھا مگر لاکھ ذہن پر زور دینے کے باوجود اسے یاد نہیں آرہا تھا کہ وہ اسے کیا بتانا چاہتا تھا۔ مگر اسے صرف یہ یاد آرہا تھا کہ وہ آئی تھی اور باتیں کرتے کرتے اٹھ کر دروازے سے باہر نکل گئی تھی۔

”مجھے اسی وقت باربرا کے پاس جانا چاہیے۔“ فرینک خود کلامی کررہا تھا۔ ”مجھے اس کو ساری بات بتانی چاہیے پھر ہم مل کر یہ دیکھتے ہیں کہ سٹھیایا ہوا کون ہے۔“ وہ بے ربط بات کیے جارہا تھا۔

اچانک اسے محسوس ہوا کہ جولی تو کمرے میں اس کے سامنے کھڑی ہے۔ ”جولی! رک جاؤ، ابھی کچھ مت کرو۔“ وہ کہنے لگا۔ ”تم انتظار کرلو، کل صبح باربرا آئے گی تو بات کریں گے۔“

جولی نے سسکی بھری۔ ”فرینک! اس وقت صبح کے ساڑھے دس بج رہے ہیں۔“ اس نے انگلی سے دیوار پر لگی گھڑی کی طرف اشارہ کیا۔

جولی کم و بیش پینسٹھ ستر برس کی بوڑھی عورت تھی۔ وہ روئے جارہی تھی اور پھر اسی طرح روتے روتے کمرے سے نکل گئی۔ اس کے جانے کے فوراً بعد فرینک صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ٹی وی ریموٹ تھا۔ وہ اپنی سمجھ کے مطابق ٹی وی آن کرچکا تھا مگر حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ اس نے پاور بٹن دبایا ہی نہیں تھا۔

جولی کے جانے کے کچھ دیر بعد وہ لرزتے قدموں سے صوفے پر سے اٹھا اور کچن میں پہنچ گیا۔ کچھ دیر تک وہ کچن کیبنٹ کے مختلف دروازے کھولتا بند کرتا رہا اور پھر کچھ دیر کی کوشش کے بعد اسے وہ دروازہ مل گیا جس کی اسے تلاش تھی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ دروازے کھول بند کرتے کرتے اسے بازو میں کھنچاؤ محسوس ہونے لگا تھا۔ پھر اچانک وہ بھول گیا کہ کس چیز کی تلاش میں وہ کچن کیبنٹ کی طرف آیا تھا۔ جب ذہن پر کافی زور دینے کے بعد بھی اسے یاد نہ آیا تو وہ فریج کی طرف بڑھا اور دو انڈے باہر نکالے۔ کچھ دیر اس نے انہیں ہاتھ میں پکڑے رکھا اور پھر واپس رکھ کر فریج کا دروازہ بند کردیا۔

اسی دوران میں دروازہ کھلا اور ڈیمرٹس اندر داخل ہوا۔ اسے کچن سے عجیب طرح کی بُو آتی محسوس ہوئی۔ وہ سیدھا کچن میں پہنچا۔ ”تمہیں پتا ہی نہیں چلتا کہ تم کیا کررہے ہو۔“ اس نے سرزنش کی۔ مائکروویو اوون سے بیم برگر جلنے کی بُو پورے کچن میں پھیل چکی تھی۔

فرینک آگے بڑھا، اوون سے جلا ہوا بیم برگر نکالا اور سنک کے قریب رکھے ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔ ”بھول گیا تھا۔“ اس نے ڈیمرٹس کی طرف دیکھ کر بھولپن سے کہا۔

”مجھے نہیں لگتا کہ جولی کوئی پاگل عورت ہے۔“

فرینک نے ڈیمرٹس سے کہا۔ ”کسی نے اس بارے میں کچھ تو اسے بتایا ہوگا۔“ اس کے لہجے سے لگ رہا تھا جیسے وہ شک بھرے انداز میں سوچ رہا ہو۔

اچانک نہ جانے فرینک کو کیا سوجھی، وہ تیزی سے باہر نکلا اور ایک کے بعد ایک کرکے مختلف گھروں کے دروازوں پر دستک دینے لگا۔ وہ اُن سے بات کرنا چاہتا تھا مگر اس کے چہرے پر جو وحشت طاری تھی، اس پر نظر پڑتے ہی ہر کھلنے والا دروازہ اگلے ہی لمحے بند ہوجاتا تھا۔ اس نے دروازوں پر دستک دینا بند کی اور سڑک پر آگیا۔ وہ راہ چلتے لوگوں کو روک روک کر ان سے باتیں کرنے کی کوشش کررہا تھا مگر کوئی نہیں رک رہا تھا۔ سب ہاتھ چھڑا کر قدموں کی رفتار تیز کرتے رہے۔

صرف ایک نے رکتے ہی پوچھا تھا۔ ”تمہیں کس بات کی جلدی ہے؟“

فرینک کیا جواب دیتا۔ اس دوران تو وہ یہ بھول ہی چکا تھا کہ اسے کیا بات کرنی تھی۔ اس نے بھی ایک لمحے انتظار کیا اور اگلے ہی لمحے آگے بڑھ گیا۔

وہ اسی طرح بے مقصد گھومتا گھماتا واپس اپنی بلڈنگ میں پہنچ گیا۔ وہ لابی میں ہی تھا کہ اچانک اس کی نظر سامنے پڑی اور اسے یاد آگیا کہ وہ کس کو ڈھونڈ رہا تھا۔ ”مجھے اس سے ہی بات کرنا تھی۔“ فرینک نے خود کلامی کی اور ڈیمرٹس کی طرف بڑھا۔ اس وقت اسے دیکھ بھال کرنے والے سب لوگوں میں سے صرف ڈیمرٹس ہی یاد رہ گیا تھا۔ اسے یہ بھی یاد آگیا تھا کہ وہ دونوں پرانے دوست تھے۔ ویسے بھی آپ کسی اجنبی کو روک کر اس طرح بات شروع نہیں کرسکتے کہ میں کون ہوں اور مجھے آپ سے کیا بات کرنی ہے مگر فرینک اسی طرح بول رہا تھا۔ ایک ڈیمرٹس تھا جو اسے بتا سکتا تھا کہ وہ کون ہے اور اسے کیا بات کرنی تھی۔

”ڈیمرٹس، ڈیمرٹس، رکو... مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“ وہ اسے دیکھتے ہی چلایا اور تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔

”آہستہ بولو...“ کمرے سے باہر نکلتے ایک شخص نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ”بڑی مشکل سے مسز مارکیز کی آنکھ لگی ہے۔ ذرا سی آواز ان کے کانوں میں پہنچی تو وہ چونک کر اٹھ جائیں گی۔“ اس نے فرینک کے قریب آکر سرگوشی میں کہا۔

فرینک چپ ہوگیا۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ مسز مارکیز کو جانتا ہے یا نہیں۔ وہ اب اس ادھیڑ بُن میں پڑ گیا

تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ مسز مارکیز بہری ہوں گی، جیسے یہاں اور بہت سے دوسرے ہیں۔ ''سنو...'' اس نے سرگوشی میں خود سے کہا۔ ''میں بھی بہت آہستہ بولوں گا، ورنہ مسز مارکیز جاگ جائیں گی۔ ایسا ہوا تو یہ بہت بری بات ہوگی۔''

''سنو...'' اس نے ڈیمرلس کے نہایت قریب ہو کر سرگوشی کی۔ ''کل رات میں اس جگہ تم سے ملا تھا، تمہیں یاد ہے۔ اس وقت سب سو رہے تھے اور اور میں یہاں تم سے ملا تھا۔'' یہ کہہ کر اس نے ڈیمرلس کی طرف دیکھا۔

''کل رات میں یہاں پر نہیں تھا۔ تم نے ایڈی، فلیسا یا جینی سے بات کی ہوگی۔'' ڈیمرلس نے جواب دیا۔

یہ سنتے ہی فرینک نے کچھ دیر تک فرش پر نظریں گاڑے رکھیں اور پھر اتنی تیزی سے ایک طرف دوڑا کہ اس کے سر کے بال بھی ہوا میں اڑنے لگے۔

ڈیمرلس نے ایک ہی سانس میں کئی نام لے دیے تھے اور فرینک کی مشکل ایک بار پھر بڑھ گئی تھی۔ اس کے لیے یہ بات نہایت ہی پریشان کن تھی۔ وہ گھومتا رہا۔ اندھیرا بڑھتا چلا گیا مگر اسے یاد نہیں آرہا تھا کہ وہ کس سے ملا تھا۔ اس کا دماغ بری طرح الجھ چکا تھا۔ ''باربرا کو پتا ہوگا، وہ کچھ جانتی ہوگی۔'' فرینک نے خود کلامی کی۔ اس سے ملنا چاہیے۔ ہاں ڈیمرلس نے بھی یہی کہا تھا۔'' اچانک اسے یاد آگیا۔ ''ہاں ہاں، وہ بھی تو کہہ رہا تھا کہ باربرا کچھ جانتی ہو شاید...'' وہ بڑبڑایا۔

''اے سنو...'' اچانک اس کے سامنے ڈیمرلس آگیا۔ ''میں سارا دن تمہیں ڈھونڈتا پھرا ہوں، کیا کرتے رہے تم سارا دن؟'' یہ کہہ کر وہ چند لمحے رکا اور اسے بازو سے پکڑا۔ ''چلو...'' یہ کہہ کر اس نے فرینک کو کھینچا۔ ''ہر اُس جگہ تمہیں تلاش کیا، جہاں تم جا سکتے تھے مگر تم کہیں پر بھی آج نہیں پہنچے، کیا کرتے رہے ہو؟ کچھ یاد بھی ہے...''

''میں کہاں گیا تھا؟'' فرینک نے کھوئے کھوئے لہجے میں جواب دیا۔

''پتا نہیں کیا ہوا ہے تمہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اب تم سوتے میں بھی چلنے لگے ہو یا پھر کچھ...'' ڈیمریٹس خفگی سے کہہ رہا تھا مگر فرینک نے چونک کر اس کی بات کاٹ دی۔

''یہ کچھ کیا ہے؟''

''لو ایک اور مسئلہ کھڑا ہوگیا۔'' ڈیمرلس بڑبڑایا۔ وہ اسے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے واپس لے جا رہا تھا۔

''میں نے پوچھا تھا...''

''یہ کچھ کوئی بھی چیز ہو سکتی ہے... چابی، بٹوا، ماچس، گاڑی۔'' ڈیمرلس نے جواب دیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ بات اس کے دماغ میں کھب چکی ہے اور اسے مطمئن کیے بغیر جان چھڑانا ممکن نہیں۔

''یہ نہیں...'' وہ رک گیا۔ ''تم تشریح کرنے لگے۔'' فرینک نے ناراض لہجے میں کہا۔

''تم سمجھ نہیں رہے ہو، میرا مطلب تھا کہ...'' ڈیمرلس کہتے کہتے رک گیا۔

فرینک نے تھوک نگلا اور کچھ کہنے کے لیے منہ کھول دیا مگر بولا کچھ نہیں۔ وہ اس کے بولنے کا منتظر تھا۔

''فرینک...'' آخر ڈیمرلس نے خاموشی توڑی۔ ''تم نے آج صبح اپنی دوا لی تھی نا؟'' اس کا لہجہ سوالیہ تھا۔

یہ سن کر فرینک سوچ میں پڑ گیا۔ اب اس کے سامنے یہ سوال ایک نئی پریشانی لے آیا۔ وہ سر جھکائے کچھ دیر تک سوچتا رہا اور پھر سر اٹھا کر بڑی سادگی سے کہا۔ ''معلوم نہیں، مجھے یاد نہیں۔ شاید لی تھی، شاید نہیں لی تھی۔''

☆☆☆

یہ شاید اس واقعے سے اگلے یا پھر اس سے اگلے روز کی بات ہوگی۔

ٹوسٹر میں جل کر کوئلے کی طرح سیاہ ہو جانے والے ڈبل روٹی کے سلائس سامنے تھے مگر فرینک کو مکھن نہیں مل رہا تھا۔ آخر اس نے مکھن ڈھونڈنا ترک کیا اور کیفے ٹیریا جانے کا سوچا۔

کیفے ٹیریا میں بوفے ناشتے کا انتظام تھا۔ وہ اپنی پسند کی چیزیں ڈھونڈتا رہا مگر اسے جو چاہیے تھا شاید وہ وہاں نہیں تھا۔ اوپر سے وہاں کافی سارے لوگ تھے جو سب کے سب اس کے لیے اجنبی تھے۔ اسے ڈھیر سارے لوگوں کو دیکھ کر پہلے ہی الجھن ہو رہی تھی، اوپر سے ناشتے کے لیے مناسب شے کا نہ ملنا۔ اس کا دماغ ایک بار پھر اسے گڑبڑائے جا رہا تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ کیفے میں موجود لوگ ہی نہیں، دو چار کو چھوڑ کر اس کے لیے تو پوری دنیا ہی اجنبی تھی۔

وہ کیفے ہال سے نکل ہی رہا تھا کہ ریک روم کے دروازے کے قریب اسے جولی کھڑی نظر آگئی۔ ریک روم ایسی جگہ تھی جو فرینک کو بالکل ناپسند تھی۔ وہاں زیادہ تر لوگ بیٹھے تاش کھیلتے تھے یا پھر یوگا کلاسیں ہوتی تھیں۔ اسے یہ دونوں باتیں سخت ناپسند تھیں۔ جولی دو تین لوگوں کے ساتھ کھڑی باتیں کر رہی تھی لیکن جب فرینک قریب سے گزرا تو اس پر جیسے ہی نظر پڑی وہ بولی۔ ''ہائے... کیسے ہو تم؟''

''ٹھیک ہوں۔'' اس نے شرمندہ شرمندہ لہجے میں

جواب دیا۔

''ان سے ملو... یہ واپس لوٹ آئے ہیں۔'' جولی نے اُن لوگوں کی طرف اشارہ کیا جن کے ساتھ کھڑی وہ باتیں کر رہی تھی۔

''کون لوٹ آئے ہیں؟'' اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''یہ... یہ لوگ۔'' جولی نے ان کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ اس نے یہ بات کچھ اس طرح کہی جیسے ابھی رو پڑے گی۔ ''دیکھو باربرا نے بھی کچھ نہیں کیا اور یہ آگئے۔ یہ میری ساری جیولری، بہترین انگوٹھیاں اور سارے اچھے کپڑے بھی لے گئے اور پیچھے سب پرانے کپڑے چھوڑ دیے۔'' اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

''اچھے لوگ تھے، تبھی تو تمہارے پہننے کے لیے کچھ چھوڑ گئے ورنہ...'' قریب کھڑے ایک بوڑھے شخص نے جولی کی طرف دیکھتے ہوئے لقمہ دیا۔

''ہاں ہاں... یہ بات تو ہے۔'' جولی کے پیچھے کھڑی عورت نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میرے لیے کمبخت وہ بھی نہیں چھوڑ کر گئے تھے۔''

بوڑھے اور اس عورت نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو غور سے دیکھ کر کچھ اشارے کیے مگر جولی نے اس پر توجہ نہیں دی۔

وہ حیرانی سے کھڑا یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ اس عورت نے رخ موڑا۔ ''ہاں تو فرینک... تم کچھ کر سکتے ہو جولی کے لیے... ویسے تمہیں اس کی مدد کرنی چاہیے۔''

یہ سنتے ہی وہ گڑبڑا گیا اور تیز تیز چلتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ وہ جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اپنے کمرے کے اندر پہنچا اور سب کچھ بھول بھال کر تلاش شروع کر دی۔ میز کی درازیں اُلٹ دیں، الماری کو اُلٹ پلٹ کر دیا۔ بیڈ سے گدا اٹھا کر دیکھ لیا۔ اس کے نیچے تک تلاش کر لیا۔ وہ جولی کی جیولری تلاش کر رہا تھا۔ وہ اس کی مدد کرنا چاہتا تھا مگر کافی دیر تک تلاشی کے باوجود اسے کچھ نہ ملا۔ ہوتا تو ملتا۔

وہ پرانے رسالوں اور کتابوں کے ڈھیر کی طرف آیا اور ڈھونڈ ڈھانڈ کر پرانی ٹی وی ڈائریکٹری نکالی اور صوفے پر پھیلا کر یلو پیجز کی ورق گردانی کرنے لگا۔ ڈائریکٹری کے بیچ جگہ جگہ ڈیلی ٹائمز کے صفحات پن سے لگے ہوئے تھے۔ یہ اس کی بیوی کی عادت تھی۔ وہ ڈائریکٹری کے صفحات پر اکثر

''یتیم''

یتیم لڑکے کے دودھ جیسے اجلے کپڑوں کی طرف دھیان سے دیکھتے ہوئے جگو نے پوچھا۔

''تو اسکول جاتا ہے؟''

''ہاں! یتیم خانے کے سارے بچے جاتے ہیں۔''

''بڑا قسمت والا ہے تو!'' جگو نے اسے حسرت سے دیکھا۔

''یتیم کے ساتھ مذاق نہیں کرتے۔'' لڑکا دکھ سے بولا۔

''تو قسمت والا ہے پیارے! میرے پاس نہ تیرے جیسے کپڑے ہیں نہ میں اسکول جا سکتا ہوں۔'' جگو کی آنکھیں بھر آئیں۔

''تو اسکول نہیں جاتا؟ پھر سارا دن کیا کرتا ہے؟'' یتیم لڑکے نے حیرانی سے پوچھا۔

''ہوٹل میں برتن مانجھتا ہوں۔''

''تو... تو یتیم خانے میں کیوں نہیں آجاتا؟''

''جی تو بہت چاہتا ہے لیکن وہ لوگ مجھے رکھتے نہیں۔''

''کیوں...؟'' یتیم حیران تھا۔

''میرے ماں، باپ جو زندہ ہیں۔''

(ہندی پنجابی ادب۔ شیام سندر اگروال)

(انتخاب: محمد الیاس چوہان، کراچی)

عملی مظاہرہ

ایک دیوہیکل پہلوان ٹائپ آدمی ایک شراب خانے میں آیا اور بارٹینڈر سے کہنے لگا۔ ''میں نے سنا ہے کہ تمہیں ایک گن کٹے بدمعاش کی ضرورت ہے جو ناپسندیدہ افراد سے نمٹ سکے۔''

''ضرورت تو بڑی شدید ہے مگر تمہیں اس کام کا کوئی تجربہ بھی ہے؟'' بارٹینڈر نے پوچھا۔

''تجربہ تو کوئی خاص نہیں لیکن میں عملی مظاہرہ کر کے دکھا سکتا ہوں۔''

یہ کہہ کر گن کٹے بدمعاش نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ساتھ والے کمرے میں ایک مست شرابی قسم کا آدمی فون پر کسی کو گالیاں دے رہا تھا۔ گن کٹے نے کمرے میں جا کر اس شخص کو دبوچا اور کسی احتجاج کی پروا کیے بغیر اسے شراب خانے سے باہر پھینک دیا اور فاتحانہ انداز سے جھومتا ہوا واپس آکر کہنے لگا۔

''عملی مظاہرہ پسند آیا؟''

''بہت خوب۔'' بارٹینڈر نے کہا۔ ''مگر نوکری کی اجازت تمہیں باس سے لینی پڑے گی۔''

''باس کہاں ہے؟'' بدمعاش نے پوچھا۔

''جسے تم باہر پھینک آئے ہو وہی اس بار کا مالک ہے۔''

ان لوگوں پر مشتمل خبروں اور فیچر کے تراشے لگا دیتی تھی جن کا ڈائریکٹری میں تذکرہ ہوتا تھا۔ تراشے دیکھ کر اسے بیوی یاد آگئی اور اس کی عادت بھی مگر اس دوران میں وہ یہ بھول گیا کہ ڈائریکٹری کیوں کھولی تھی۔

"مجھے بالکل پسند نہیں۔" اس نے ڈائریکٹری اٹھا کر ایک طرف پھینکی۔ "کسی چیز کو اس طرح خراب نہیں کرنا چاہیے۔" یہ کہہ کر اس نے گہری سانس لی اور لمحہ بھر کے لیے صوفے کی پشت سے سر لگا دیا اور پھر اگلے ہی لمحے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس کا ذہن خالی ہو چکا تھا مگر آنکھوں میں حیرانی تھی۔ اچانک اس کے چہرے پر غصے کے آثار نظر آئے۔

"مجھے کوئی ضرورت نہیں یہ سب کچھ یاد کرنے کی۔" اس نے زور سے سر جھٹکا۔ "مجھے ان لوگوں سے کیا لینا دینا، کیا تعلق ہے ان لوگوں سے میرا... کیا ملے گا مجھے یہ سب کچھ کر کے۔" وہ غصے میں بولے جا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ بیٹھ گیا اور پرانی کتابوں کے ڈھیر سے ملی اس فائل کی ورق گردانی کرنے لگا جس میں پرانی خبروں کے تراشے تھے۔ یہ وہ خبریں تھیں جو اس کے بارے میں تھیں۔ پولیس کی ملازمت کے دوران اس نے درجنوں کیسز حل کیے تھے، کئی نامی گرامی مجرموں کو پکڑا تھا۔ "واقعی... یہ سب کچھ میں نے کیا ہے؟" اس نے کافی دیر تک ورق گردانی کے بعد خود کلامی کی۔ اس بار وہ خاصا پُرسکون دکھائی دے رہا تھا۔

اسے خود پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ کبھی وہ پولیس افسر اور ذہین سراغ رساں تھا۔ وہ اب بھی یہ محسوس نہیں کر سکتا تھا کہ وہ سراغ رساں رہا ہے۔ وہ تو خود کو ایک چور محسوس کرنے لگا تھا جو دوسروں کی چیزیں لوٹ کر بھاگ جاتا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ چور ہے تو پھر اس کا ٹوتھ پیسٹ، اس کی شناخت اور پھر اس کی ساری زندگی... کیسے، کب اور کس نے چرا لی؟ اس کے دماغ کو ایک اور تشویش لاحق ہو چکی تھی۔

اس دوران میں اسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کے پیچھے آ رہا ہے۔ اس نے محسوس تو کیا پر مڑ کر نہیں دیکھا۔ قدموں کی چاپ سے بھی اسے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ وہ خوش ہو گیا کہ... کم از کم اس وقت اس کے دماغ کو کوئی تشویش لاحق نہیں تھی۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ معما تو حل ہو چکا ہوتا ہے مگر اس کا کوئی ٹکڑا نہ ہونے کے باعث وہ مکمل نہیں کہلا سکتا۔ آپ معمے کی اصل شکل دیکھ سکتے ہیں مگر پھر بھی اسے مکمل کہنے سے ڈرتے ہیں۔ کچھ یہی کیفیت فرینک کی تھی۔ وہ بھول جاتا تھا مگر پھر بھی وقت پڑنے پر اس کی یادداشت ساتھ دے جاتی تھی۔ وہ معما حل کر لیتا تھا مگر اس کا کوئی ٹکڑا ہمیشہ غائب رہتا تھا جس کی وجہ سے کوئی اسے مکمل نہیں کہہ سکتا تھا اور نہ ہی اسے حل کرنے والا... دوسرے پر معما مکمل ماننے کے لیے زور دے سکتا تھا۔ فرینک خود کو اسی طرح کی صورت حال میں پھنسا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اس کے معمے کا ایک ٹکڑا غائب تھا، وہ اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ کہاں گیا۔ وہ ملتا تو تصویر مکمل تھی، سب کڑیاں مل جاتیں مگر وہ خود کو بہت بے بس تصور کر رہا تھا۔ اس کی یادداشت ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

☆☆☆

وہ جمعرات کا دن تھا اور حسب معمول اینڈریو لنچ کی دعوت کے لیے کیفے ٹیریا پہنچ گیا تھا۔ فرینک نے اسے ایک لفافہ دیا۔ اب خود فرینک کو بھی یہ علم نہیں تھا کہ اس کے اندر کیا ہے۔ اسے صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ لفافہ سربمہر ہے۔ وہ لفافہ وزن میں بہت ہلکا تھا اور پچھلے کئی روز سے فرینک کی ڈائننگ ٹیبل پر رکھا رہا تھا۔ اس لفافے کے اوپر خود فرینک نے اپنی ہینڈ رائٹنگ میں لکھا تھا: "کھلا خط... اینڈریو کے لیے۔"

"یہ کیا ہے؟" لفافہ تھامتے ہوئے اینڈریو نے سوال کیا۔

"یہ تو میں نہیں جانتا۔ کیا مجھے تمہیں کوئی رقم دینا تھی؟"

"یقیناً نہیں..." وہ مسکرایا۔ "نہ کبھی آپ نے مجھ سے کوئی رقم لی اور نہ ہی آپ مجھے کچھ رقم دینے کا ارادہ رکھتے تھے۔" یہ کہہ کر وہ ہنس دیا۔

فرینک یہ سن کر کھسیانی ہنسی ہنس دیا۔ "کہیں ایسا تو نہیں کہ تم کچھ بھول رہے ہو۔"

"اور تمہیں یہ بات یاد ہے؟" اس نے نہایت سنجیدگی سے استفسار کیا۔

فرینک نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہمیں لنچ منگوانا چاہیے، تمہیں بھوک لگ رہی ہوگی۔" وہ نہیں چاہتا تھا کہ اینڈریو اس موضوع پر کچھ اور بات کرے ورنہ اس کے دماغ میں ایک نئی ہلچل مچ سکتی تھی۔

☆☆☆

فرینک کو یوگا پسند نہ تھا۔ چیئر یوگا سے تو اسے سخت چڑ تھی۔ کرسی پر عجیب طرح سے بیٹھ کر بازوؤں کو ایک نئی پوزیشن میں منٹوں کھڑا رکھنا اسے بے وقوفی لگتی تھی مگر ہفتے میں ایک بار یہ ورزش ان کے لیے لازمی تھی اور ریک روم میں اس کے لیے سب کی موجودگی لازمی تھی۔ اُس دن بھی یوگا ایکسرسائز کلاس تھی اور جامنی رنگ کے ٹراؤزر اور بلیک

ٹی شرٹ والی یوگا ٹرینر بھی پہنچ چکی تھی۔ فرینک بھی بادلِ ناخواستہ پہنچ گیا۔

"ونڈرفل۔" ٹرینر نے سب کی پوزیشن پر طائرانہ نظر ڈال کر تالی بجاتے ہوئے کہا۔ "بس... اپنی توجہ صرف اپنے اوپر رکھو اور باقی ساتھیوں کو بھول جاؤ۔" اس نے گونج دار آواز میں کہا۔

اس نے نظر گھما کر ڈیمرٹس کی طرف دیکھا۔ اس نے بھی کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا اور سب سے نظریں بچا کر مسکرا دیا۔ فرینک جانتا تھا کہ ڈیمرٹس یوگا کلاس پسند کرتا تھا۔ وہاں جولی سمیت ایسے کئی لوگ تھے جو صرف ڈیمرٹس کے زور دینے پر ہی وہاں آئے تھے۔ فرینک نے آنکھیں بند کیں اور جس طرح وہ ٹرینر کہہ رہی تھی، اسی انداز میں کرسی پر بیٹھا رہا۔

چند لمحے ہی گزرے تھے کہ کمرے میں ٹرینر کی آواز گونجی۔ "مسٹر فرینک... آپ ایکسرسائز ادھوری چھوڑ کر جا سکتے ہیں۔ آپ سے ملنے کے لیے آپ کا پوتا موجود ہے۔"

اپنا نام سنتے ہی فرینک نے آنکھیں کھولیں۔

"آپ ہیں؟"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"باہر جا کر چوکیدار سے پوچھ لیں میک کے بارے میں۔" ٹرینر نے چٹ پر نظر ڈالی۔ فرینک کو یاد ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون ہو سکتا ہے۔ وہ کھوئے کھوئے انداز میں بیٹھا رہا۔

"آپ جا سکتے ہیں۔"

"مگر... میک..." فرینک نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

اس کی ہچکچاہٹ دیکھتے ہی ٹرینر نے ایک بار پھر چٹ پر نظر ڈالی۔ "وزیٹر ریکارڈ روم نے تو یہی بتایا ہے۔ فرینک کے لیے ان کا پوتا میک..." اس نے بلند آواز میں چٹ پڑھنے کے بعد فرینک کی طرف دیکھا۔

فرینک اٹھ کر کمرے سے باہر نکلا۔ وہ چوکیدار کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کا نام بھی بھول چکا تھا۔

"میک..." اسے بوڑھا چوکیدار نظر آ گیا تھا۔ وہ لاکھ ذہن پر زور دے رہا تھا مگر اسے یاد نہ آ سکا۔

بوڑھے چوکیدار نے اسے استفساریہ نگاہوں سے دیکھا۔

"میک کہاں ہے۔"

بوڑھے نے اِدھر اُدھر دیکھا اور انکار میں سر ہلا دیا۔

"یہاں تو کوئی ایسا نظر نہیں آ رہا؟" جولی نے کہا۔ وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے نکل آئی تھی۔ "ہو سکتا ہے وہ مِک کہہ رہی ہو۔" جولی نے خواہ مخواہ کا لقمہ دیا اور فرینک پریشان ہو گیا۔ اس کا دماغ میک اور مِک کے چکر میں الجھ گیا تھا۔

"ارے..." ٹریزا بھی باہر آ چکی تھی۔

"یہاں تو وہ نہیں ہے؟" فرینک نے پریشان لہجے میں کہا۔

"میک کا مطلب کمپیوٹر ہے۔" وہ ہنس پڑی۔ "تمہارا پوتا آن لائن میک کمپیوٹر پر ہے۔" اس نے فرینک کا بازو پکڑا۔ "اصل میں مجھے بھی بعد میں یہ خیال آیا تھا۔ وزیٹر روم انٹرکام کر کے پوچھا تو پتا چل گیا۔"

ٹریزا اسے وزیٹر روم کی طرف لے کر بڑھی۔ وہاں میز پر میک برانڈ کا ایک لیپ ٹاپ رکھا تھا۔ "اس میں کیمرا بھی ہے اور مائک بھی۔ یہاں تم بیٹھ کر اپنے پوتے سے آن لائن بات کر سکتے ہو۔"

"تمہارا پوتا کئی بار فون کر چکا ہے۔ وہ آن لائن چیٹ کرنا چاہتا تھا۔" وزیٹر روم کے انچارج نے فرینک سے کہا مگر اسے اپنے پوتے کے بارے میں کچھ بھی یاد نہیں آ رہا تھا۔ فرینک نے بے بسی سے جولی کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا دی۔ "تم جانتی ہو، یہ کس پوتے کی بات کر رہے ہیں؟"

جولی نے انکار میں سر ہلا دیا۔ اس وقت تک وہاں کئی اور لوگ بھی آ چکے تھے۔ مجمع دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ وہ چند لمحوں تک اپنی جگہ کھڑا رہا اور پھر تیزی سے لپک کر کمرے سے باہر نکلا۔ وہ جلد سے جلد وہاں سے بہت دور چلا جانا چاہتا تھا۔ اس کے دماغ میں ایک بار پھر آندھیاں چلنے لگی تھیں۔

☆☆☆

اُس روز جمعرات نہیں تھی۔ فرینک ٹی وی پر گیزر سراغ رساں شو دیکھ رہا تھا۔ یہ مزاحیہ کردار تھا جو اپنی مضحکہ خیز حرکتوں کے ذریعے کیس کی تہ تک پہنچتا تھا۔ وہ آدھا پروگرام دیکھ چکا تھا جس دوران دو وقفے ہوئے مگر اب تک واضح نہیں تھا کہ انجام کیا ہوگا۔ اس کے لیے پچاس منٹ کا پورا شو دیکھنا ضروری تھا لیکن فرینک کے دماغ پر بوجھل پن طاری ہونے لگا تھا۔

وقفہ ختم ہونے والا تھا جس کے بعد آخری حصہ نشر ہوتا۔ فرینک نے ایک بار پھر پوری توجہ ٹی وی اسکرین پر مرکوز کر دی۔ اسی دوران میں دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے بیٹھے بیٹھے گردن گھما کر دروازے کی طرف دیکھا۔

وہ چاہتا تھا کہ دستک نظر انداز کر کے ٹی وی دیکھتا رہے مگر دستک بدستور ہوتی رہی۔ بادلِ ناخواستہ وہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا، سامنے جولی کو پایا۔ وہ ایک طرف ہو گیا اور وہ تیزی سے اندر داخل ہو گئی۔ فرینک دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ اس کی نظریں جولی پر تھیں۔

"اسے بند کر دو۔" جولی نے ٹی وی کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ "ہمارے پاس تمہیں دکھانے کے لیے کچھ ہے۔"

اسی دوران میں باربرا اور اینڈریو بھی کمرے میں داخل ہو چکے تھے۔

"اینڈریو..." جیسے ہی اس پر نظر پڑی فرینک نے حیرت سے کہا۔

"مداخلت کی معذرت چاہتا ہوں۔" اس نے ایک نظر جولی پر ڈالتے ہوئے کہا۔ اس کے ہاتھ میں مستطیل ڈبا تھا۔ "مداخلت تو ہو گئی لیکن یہ تمہیں دکھانا ضروری تھا۔" اس نے دوسرے ہاتھ سے ڈبے کی طرف اشارہ کیا۔

"ادھر لاؤ..." جولی نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے ریموٹ لیا اور خود ہی ٹی وی بند کر دیا۔ فرینک اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں تھا۔

اس دوران میں اینڈریو ڈبا کھولنے لگا۔ یہ ایک لیپ ٹاپ تھا۔ اینڈریو نے اسے آن کیا اور فرینک کی طرف بڑھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔ اس نے تجسس سے نگاہیں اسکرین پر جما دیں۔ لیپ ٹاپ کھل رہا تھا۔

جیسے ہی لیپ ٹاپ پوری طرح کھلا، اسکرین پر ایک مرد کا چہرہ اُبھرا۔ اسے دیکھتے ہی فرینک کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے۔ اس کی تھوڑی پتلی، ناک موٹی اور بھدی، سر کے بال گہرے سیاہ اور گھنگرالے تھے۔ اسے دیکھتے ہی فرینک کے چہرے پر شدید حیرت کے آثار نظر آنے لگے...... "یہ... یہ تو... وہ بالکل، اس جیسا..." اس نے اٹکتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اس تصویر والے کا نام یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

"ایڈی..." باربرا نے کہا۔

"بالکل بالکل..." باربرا نے اس کی مشکل آسان کر دی... "ہاں ہاں... یہی تھا۔ اس رات یہی وہاں پر، اس کمرے سے شاپنگ بیگ لے کر نکل رہا تھا..." وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا۔ "میں درست کہہ رہا ہوں؟" اس کا لہجہ استفسار یہ تھا۔

باربرا نے تاسف سے نفی میں سر ہلایا۔ "اب یہ نہیں رہا۔"

"کیا مطلب؟" فرینک چونکا۔ "میں کچھ سمجھا نہیں۔"

"میں نے جولی کو عارضی طور پر ایک لیپ ٹاپ دیا تھا۔" اس کی بات سن کر فرینک نے کہنا شروع کیا۔ "اس میں کیمرا، جی پی ایس اور اینٹی تھیف سافٹ ویئر لگا تھا جس کی وجہ سے لیپ ٹاپ کی چوری ناممکن تھی۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکا اور فرینک پر گہری نظر ڈالی۔ وہ حیرت سے یہ سن رہا تھا۔ "تو ہوا یہ کہ جیسے ہی اس نے چوری کے بعد اسے پہلی بار آن کیا، کیمرے نے اس کی تصویر لے کر ویب سائٹ پر اپ لوڈ کر دی اور جی پی ایس نے اس کی لوکیشن انفارمیشن بھی دے دی۔ یوں تصویر اور لوکیشن دونوں ایڈمنسٹریٹر تک پہنچ گئیں۔" یہ کہہ کر وہ رکا۔

"بالکل ٹھیک۔" فرینک نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بظاہر پُراعتماد لہجے میں کہا مگر اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ لوگ کس کے بارے میں کیا بات کر رہے تھے۔ اسے اینڈریو کی بات کا ایک لفظ بھی پلے نہیں پڑا تھا۔ "ذرا کھل کر بتاؤ سیدھے سادے الفاظ میں۔" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے اینڈریو کو مخاطب کیا۔

"ایڈی نے لیپ ٹاپ چوری کیا تھا... فرینک۔" اینڈریو کے کچھ بولنے سے پہلے باربرا نے ٹھہرے ٹھہرے انداز میں اسے سمجھانا شروع کیا۔ "وہ جولی کے کمرے میں چوری چھپے گھسا اور پھر لیپ ٹاپ چوری کر کے اپنے گھر لے گیا۔"

"اوہ... تو یہ بات تھی۔" فرینک نے سر ہلاتے ہوئے۔ "یہ تو چور پکڑنے کا بہترین طریقہ ہے۔" اس نے انگلی سے لیپ ٹاپ کی طرف اشارہ کیا اور پھر زور سے ہنس دیا۔ "سراغ رساں کمپیوٹر۔"

"بالکل ٹھیک کہا۔" یہ کہتے ہوئے اینڈریو نے کوٹ کے اندر کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ہاتھ باہر آیا تو اس میں تہ شدہ ایک کاغذ تھا۔ اس نے کاغذ کھولا اور اسے فرینک کی نگاہوں کے سامنے کیا۔ یہ دی ٹائمز میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ کا تراشہ تھا۔ اس کی سرخی تھی: "لیپ ٹاپ نے اپنے چور کو پکڑوا دیا۔" فرینک بڑی سرخی کے سوا کچھ نہ پڑھ سکا۔ اس کی نگاہیں بہت کمزور تھیں اور وہ میگنی فائنگ گلاس کی مدد سے اخبار پڑھتا تھا۔

"ایک تو تم یہ تراشہ جولی کو دے دو، اس میں اس کا ذکر ہے۔" یہ کہہ کر وہ باربرا کی طرف پلٹا۔ "باقی تفصیل تم چاہو تو مجھے پڑھ کر سنا دو۔ افسوس کہ میں سرخی کے سوا کچھ

نہیں پڑھ سکا۔" اس کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔

"مجھے ایک اعتراف کرنا ہوگا۔" باربرا نے مسکرا کر کہا۔ "جب جولی نے کمرے سے چیزیں غائب ہونے کی شکایت کی اور پھر یہ شکایتیں تواتر کے ساتھ ہونے لگیں تو مجھے یقین ہو گیا کہ کوئی چور اُچکا ضرور ہے جو ہاتھ کی صفائی دکھا رہا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر توقف کیا اور جولی کی طرف دیکھا۔ "تمہارا چور پکڑنے کے لیے اس سے اچھا کوئی طریقہ نہیں تھا۔"

"بہت اچھا آئیڈیا تھا۔" فرینک نے لقمہ دیا۔

"اس روز یوگا کلاس کے موقع پر تم تو بھاگ گئے تھے مگر تمہارے جانے کے بعد سب کے سامنے جولی کو یہ لیپ ٹاپ پیش کیا گیا تھا کہ وہ اس کے ذریعے آن لائن اپنے گھر والوں سے بات کر سکے۔" باربرا نے کہا۔

"یوں چور کو پتا چل گیا کہ جولی کے کمرے میں لیپ ٹاپ آ گیا ہے۔" اینڈریو نے مسکرا کر کہا۔

"انہیں یقین تھا کہ وہ چوری نہیں ہو سکتا۔" باربرا نے انگلی سے اینڈریو کی طرف اشارہ کیا۔ "اس لیے فوراً انہوں نے میرے کہنے پر ادھار کے طور پر یہ لیپ ٹاپ دیا تھا۔" اس نے وضاحت کی۔

"تمہیں پتا نہیں کہ مجھے اس چور نے کتنی ذہنی اذیت پہنچائی ہے۔" جولی نے دونوں ہاتھوں سے سر تھامتے ہوئے کہا۔ "کام وہ دکھاتا رہا اور میں سوچتی رہی کہ کس طرح میرا ٹوتھ پیسٹ کم ہو گیا، کیسے میں اتنا سارا ڈش لیکوڈ استعمال کر گئی..." وہ لمحہ بھر کو رکی۔ "باربرا! وہ میری جیولری اور دوسری چیزیں..."

"پولیس برآمد کرا لے گی ایڈی سے۔" اس نے تسلی دی۔ "فکر کی کوئی بات نہیں۔"

"دیکھا فرینک... میں کہتی تھی نا کوئی مجھے پاگل بنا رہا ہے۔"

"ایڈی رات کی ڈیوٹی کرتا تھا اور مجھے یقین ہے کہ اس نے کسی کو بخشا نہیں ہوگا۔" اینڈریو نے گفتگو میں مداخلت کی۔

"میرا خیال ہے وہ مکھن، جام، جیلی بھی چراتا تھا۔" فرینک نے کہا۔ اسے اچانک یاد آ گیا تھا کہ اس کے کچن سے اکثر ڈبل روٹی، مکھن وغیرہ غائب ہو جاتا تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ ختم ہو گیا ہوگا اور اسے یاد نہیں رہا۔ اسی لیے وہ اکثر ناشتا نہیں کر پاتا تھا۔ "ہاں... یاد آ گیا۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"کیا..." باربرا اور اینڈریو نے یک زبان ہو کر کہا۔

"اکثر میرے کھانے پینے کی چیزیں غائب ہو جاتی ہیں۔"

"اب نہیں ہوں گی۔" اینڈریو نے مسکرا کر کہا۔

"ہم ایڈی کے پکڑے جانے پر آپ کے شکر گزار ہیں۔" باربرا مسکرائی۔ "اب آپ مطمئن ہو جائیں، اب کوئی چیز چوری نہیں ہوگی۔"

فرینک سمجھ نہیں سکا کہ وہ کس بات پر شکریہ ادا کر رہی ہے تاہم اس نے خوش دلی سے کہا۔ "یو آر ویلکم۔"

"اگر تم نے اُس رات جولی کے کمرے سے نکلتے ہوئے ایڈی کو نہ دیکھا ہوتا اور اس کا خاکہ نہ بنا لیا ہوتا تو شاید ہمارا دماغ ایڈی کی طرف نہ جاتا۔" باربرا نے کہا۔

"اوہ..." فرینک کو اچانک سب کچھ یاد آ گیا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ اسے وہ رات یاد آ گئی جب وہ گھبراہٹ کے باعث لابی میں ٹہل رہا تھا، جب اس نے ایڈی کو ایک بڑا شاپنگ بیگ لیے جولی کے کمرے سے باہر نکلتے دیکھا اور پھر واپس آ کر ویسے ہی وقت گزاری کے لیے اس کا خاکہ بنانے لگا۔ سراغ رساں کے علاوہ وہ پولیس کے لیے خاکے بھی بناتا رہا تھا۔

"یہ لفافہ لو..." کوٹ کے اندر کی جیب سے اینڈریو نے ایک لفافہ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

"یہ کیا ہے؟"

"وہ رقم جو تم نے مجھے اس میں رکھ کر دی تھی۔"

"مگر کب..." فرینک کو یاد نہیں تھا۔

"یہ رہنے دو، اسی لفافے کے پیچھے تم نے ایڈی کا خاکہ بنایا تھا۔" اینڈریو نے اسے لفافہ تھماتے ہوئے کہا۔ "ضروری نہیں کہ ہاسٹل میں جو کچھ ہو، تم ہی اس کے ذمے دار ہو۔ مت سمجھا کرو ایسا، تم چور نہیں پولیس والے ہو۔"

"اینڈریو..." فرینک نے پیار سے کہا۔ "تمہارے ڈیڈی اچھے انسان تھے۔"

"جانتا ہوں۔" اینڈریو مسکرا دیا۔ "میرا پورا نام اینڈریو فرینک ہے۔" یہ کہہ کر وہ اس سے لپٹ گیا۔ "آپ ہی میرے ڈیڈی ہیں۔"

"میں..." فرینک گڑبڑا گیا۔ وہ تو کب کا یہ بات بھول چکا تھا کہ اینڈریو اس کا بیٹا اور باربرا اس کی بہو ہے۔ اسے تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ وہ شیزوفرینیا کا مریض تھا اور ہاسٹل میں ہونے والی چوریوں کے باعث وہ خود کو چور سمجھنے لگا تھا۔

*

انوکھا مشورہ

بابر نعیم

بروقت اور برمحل مشورہ بھی نصیب سے ملتا ہے... اپنے شوہر کی گمشدگی سے پریشان خاتون کی کشمکش... اسے اپنے شوہر اور اپنے تحفظ کا مسئلہ درپیش تھا... اچانک ہی اس کے تفکرات اور الجھنوں کی شدت میں بدلاؤ کا سنسنی خیز سنگِ میل آگیا...

ایک نرم گرم مشورے کی چاشنی کا پُرلطف ماجرا

"اسپیڈ سراغ رساں ایجنسی میں خوش آمدید۔ اگر آپ کی زندگی کو فوری طور پر کوئی خطرہ ہے تو براہِ کرم مقامی پولیس سے رابطہ کریں۔ انگریزی میں بات کرنے کے لیے لائن پر موجود رہیں۔ دیگر زبانوں کے لیے ایک کا بٹن دبائیں۔ اگر آپ ہمارا ہفتہ وار کرائم بلیٹن سننا چاہتے ہیں تو دو دبائیں۔ جاری تحقیقات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے تین دبائیں۔ نئی تحقیقات شروع کرنے کے لیے چار دبائیں۔ پانچ دبائیں... (بیپ کی آواز)

"آپ نے نئی تحقیقات کو منتخب کیا ہے۔ اگر جرم کا تعلق بلیک میلنگ یا زبردستی سے ہے تو ایک دبائیں۔ اغوا کے لیے دو دبائیں۔ غداری یا بغاوت کے لیے تین دبائیں اگر جرم کا تعلق کسی قتل سے ہے تو چار دبائیں۔ (بیپ کی آواز)

"آپ نے چار دبایا ہے جس کا مطلب ہے کہ یہ قتل کی واردات ہے۔ اگر مقتول آپ کا کاروباری پارٹنر یا دوست تھا تو ایک دبائیں۔ شوہر یا محبوب کے لیے دو دبائیں۔ اگر... (بیپ کی آواز)

"آپ نے شوہر یا محبوب کو منتخب کیا ہے۔ اگر مقتول کو زہر دیا گیا تو ایک دبائیں۔ تیز دھار آلہ سے مارا گیا ہے تو دو دبائیں۔ گولی سے ہلاک ہونے کی صورت میں تین دبائیں۔ کار دھماکا ہوا ہے تو چار دبائیں۔ اگر مقتول کی موت کسی اور طرح واقع ہوئی ہے تو پانچ دبائیں۔ (بیپ کی آواز)

"آپ نے دیگر کا انتخاب کیا ہے۔ براہِ کرم توقف کریں۔ آپ کا رابطہ ہمارے انتہائی قابل پرائیویٹ سراغ رساں سے کرایا جارہا ہے۔"

"معاف کیجیے۔ اس وقت تمام سراغ رساں مصروف ہیں۔ آپ کو تقریباً پانچ منٹ انتظار کرنا ہوگا۔"

(موسیقی کی آواز۔ پینتالیس منٹ بعد)

"اسپیڈ سراغ رساں ایجنسی فون کرنے کا شکریہ۔ میرا نام ہمیش ہے۔ فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟"

"میں کسی سراغ رساں سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"میں پرائیویٹ سراغ رساں ہمیش بول رہا ہوں۔ آپ اپنا مسئلہ بیان کیجیے۔"

"مجھے شبہ ہے کہ میرے شوہر کو قتل کردیا گیا ہے اور

میں اس سلسلے میں کسی سراغ رساں کی خدمات حاصل کرنا چاہتی ہوں۔"
"شکریہ خاتون! آپ اپنا نام بتانا پسند کریں گی؟"
"نینسی مارلو۔ آپ مجھے نینی بھی کہہ سکتے ہیں۔"
"شکریہ مادام! آپ کے شوہر کا نام کیا ہے؟"
"مارلو ڈریوڈ۔"
"شکریہ مادام! براہِ مہربانی آپ مجھے اپنے شوہر کی موت کے بارے میں بتائیں۔"
"کیا شکریہ شکریہ کی رٹ لگا رکھی ہے۔ تم مجھے مادام کے بجائے صرف نینسی بھی کہہ سکتے ہو۔"
"شکریہ مادام! اوہ معاف کیجیے مس نینسی۔ میں اپنا سوال پھر دہراتا ہوں۔ مجھے اپنے شوہر کی موت کے بارے میں کچھ بتائیے؟"
"تین ہفتے پہلے وہ اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ کوہ پیمائی کے لیے گیا تھا۔ وہ کافی اونچائی پر تھا کہ اچانک وہ رسی ٹوٹ گئی جس کے ذریعے مارلو اپنے ساتھی کے ساتھ بندھا ہوا تھا اور وہ نیچے کھائی میں جا گرا۔ سب سے زیادہ حیرت ناک بات یہ ہے کہ کسی نے بھی اسے گرتے ہوئے نہیں دیکھا جبکہ رسی بھی نئی اور کافی مضبوط تھی جو اتنی آسانی سے نہیں ٹوٹ سکتی۔ میرا خیال ہے کہ کسی نے اسے کاٹ دیا ہوگا۔"
"کیا تمہارے شوہر کی عالمِ ارواح تک رسائی ہے؟"
"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"
"بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ کسی نے اسے گرتے ہوئے نہیں دیکھا اور نہ ہی اس کی لاش دستیاب ہوئی پھر وہ کہاں چلا گیا۔ اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہارے شوہر کی موت کی خبر غلط ہے۔"
"کیا بکواس کر رہے ہو۔ میرے پاس ان فضول باتوں کے لیے وقت نہیں ہے۔ میں جلد از جلد کسی سراغ رساں سے ملاقات کرنا چاہتی ہوں۔ کیا تم اس کا بندوبست کر سکتے ہو یا نہیں؟"
"مجھے افسوس ہے مس نینسی! یہ ممکن نہیں۔ ہماری ایجنسی کا طریقۂ کار کچھ مختلف ہے۔ ہم صرف ٹیلی فون کے ذریعے ہی تحقیقات کرتے ہیں۔"
"یہ طریقہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ مجھے تو کسی ایسے سراغ رساں کی ضرورت ہے جو اپنا کام اچھی طرح جانتا ہو۔ ٹیلی فون پر یہ کس طرح ممکن ہے۔ سراغ تلاش کرنا، گواہوں سے جرح کرنا اور وہ سب کچھ جو پرائیویٹ سراغ رساں کرتے ہیں۔"
"مس نینسی! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھے اپنے کام کے بارے میں مکمل معلومات ہیں۔ میں نے نئی دہلی کے اسکول فار ڈیٹیکٹو اسٹڈیز سے مرڈر انویسٹی گیشن کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا ہے۔ شاید آپ نے اس اسکول کا نام سن رکھا ہو۔ یہ نئی دہلی کا چوتھا بڑا سراغ رسانی کا اسکول ہے۔ اگر آپ کسی دوسری جگہ سے پرائیویٹ سراغ رساں کی خدمات حاصل کرنا چاہیں گی تو آپ کو کئی ہزار ڈالر فیس دینا ہوگی جبکہ ہم اس ہفتے میں خصوصی رعایت دے رہے ہیں جس کی رو سے آپ کو قتل کی تحقیقات کے لیے انتہائی مناسب فیس دینی ہوگی۔"
"لیکن یہ سب تم کس طرح کرو گے؟"
"میں آپ سے شوہر کی موت کے سلسلے میں کچھ سوالات کروں گا۔ اس کے بعد میں اپنی صلاحیتوں کو کام میں لے کر اس کیس کو حل کر لوں گا۔ اگر اس میں ناکام رہا تو آپ کی اگلے قتل کی تحقیقات بلامعاوضہ ہوں گی اور ہم اس کی کوئی فیس نہیں لیں گے۔ کیا آپ تحقیقات جاری رکھنا چاہتی ہیں؟"
"میرا خیال ہے کہ آزمانے میں کوئی ہرج نہیں۔"
"میں پھر پوچھوں گا کہ کیا آپ کے شوہر کی لاش مردہ خانے لائی گئی تھی؟"
"نہیں۔"
"کیا اس کا پوسٹ مارٹم ہوا تھا اور کیا آپ نے لاش شناخت کر لی تھی؟"
"تم گھما پھرا کر ایک ہی بات کیوں کر رہے ہو۔ میں بتا چکی ہوں کہ اس کی لاش نہیں مل سکی۔ ایسی صورت میں اس کو شناخت کرنے یا اس کے پوسٹ مارٹم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میرا مارلو... ابھی تک وہیں پڑا ہوا ہے میں صرف دعا ہی کر سکتی ہوں کہ کسی روز لاش مل جائے اور اسے اس کی ماں کے پہلو میں دفن کر دیا جائے۔"
"شاید یہ ممکن نہ ہو کیونکہ اب تک جنگلی جانور اس کی لاش کو چیر پھاڑ چکے ہوں گے۔ اگر اس کی کچھ ہڈیاں مل جائیں تو اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھیں۔ انہیں آپ خاموشی سے اپنے خاندانی قبرستان میں دفن کر سکتی ہیں۔"
(دوسری جانب سے سسکیوں کی آواز)

"معافی چاہتا ہوں مس نینسی! مجھے یقین ہے کہ تمہارا شوہر ایک عظیم شخص تھا اور مرنے کے بعد اس کی روح کو سکون مل گیا ہوگا۔ کسی بھی قتل کی تحقیقات میں پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ مارلو کی موت سے کسے فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ کیا اس کا کوئی دشمن تھا یا کاروباری شریک؟"
"نہیں۔ اس کا کوئی شریک نہیں تھا۔ وہ تنہا ہی کام کرتا تھا۔ اس کی نوعیت ہی ایسی تھی۔ میرا مطلب ہے کہ وہ انشورنس ایجنٹ تھا۔"
"اس کی سیکریٹری کے بارے میں کیا کہو گی۔ ممکن ہے کہ اس نے اسے محبت کا جھانسا دیا ہو اور بعد میں مکر گیا ہو اور انتقام کے جوش میں سیکریٹری نے اسے قتل کر دیا ہو۔"
"ہرگز نہیں۔ وہ ایک وفادار شوہر تھا اور اس نے کبھی کسی دوسری عورت کی طرف نہیں دیکھا۔"
"تم یہ بات اتنے یقین سے کس طرح کہہ سکتی ہو؟"
"تمہاری جرأت کیسے ہوئی یہ بات کہنے کی، تمہیں اندازہ نہیں کہ وہ مجھ سے کتنی محبت کرتا تھا۔"
(ہلکی سی سرگوشی) "نہیں، آج تمہارے ساتھ لنچ نہیں کر سکوں گا۔ میں اس وقت ایک احمق عورت کے ساتھ سر پھوڑ رہا ہوں جس کا شوہر مر چکا ہے۔ حیرت ہے اس ہفتے میں یہ تیسرا کیس ہے۔"
"یہ تم کس سے باتیں کر رہے ہو؟"
"اوہ، معاف کرنا۔ میں دراصل ایک اور سراغ رساں سے تمہارے کیس کے متعلق گفتگو کر رہا تھا۔ ہاں تو ہم کیا بات کر رہے تھے؟"
"میں تمہیں بتا رہی تھی کہ میرا شوہر مجھ سے کتنی زیادہ محبت کرتا تھا۔"
"مجھے یقین ہے کہ تم بہت اچھی عورت ہو۔ کیا میں تمہاری مالی حیثیت کے بارے میں جان سکتا ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ تمہیں کسی کا قرض تو نہیں دینا؟"
"میں ایسا نہیں سمجھتی۔ مارلے نے تمام بل ادا کر دیے تھے۔ جہاں تک میں جانتی ہوں وہ بلوں کی ادائیگی میں کوئی تاخیر نہیں کرتا تھا۔"
"کیا تمہارے علم میں ہے کہ وہ اپنا حساب کتاب کہاں رکھتا تھا۔ میں صرف یہ تصدیق کرنا چاہ رہا ہوں کہ اس نے تم سے اس سلسلے میں کوئی بات تو نہیں چھپائی۔"
"اس کے لیے مجھے اس کی میز تک جانا ہوگا۔ میں اسپیکر آن کر دیتی ہوں۔ تم ایک سیکنڈ ہولڈ کرو۔"
(مختصر سے وقفے کے بعد) "ہاں، مجھے مارگیج کا کاغذ مل گیا ہے اوہ میرے خدا! اس بار ہمیں قسط کی ادائیگی میں تین ماہ کی تاخیر ہو گئی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"
"اگر اس کی میز پر چیک بک اور کریڈٹ کارڈ ہو تو اس پر بھی ایک نظر ڈال لو۔"
"ہاں، یہ دونوں چیزیں موجود ہیں۔ چیک بک سے پتا چلتا ہے کہ ہم نے اپنی بچت سے زیادہ رقم نکال لی ہے اور کریڈٹ کارڈ بتا رہا ہے کہ ہم اکتیس ہزار چار سو پندرہ ڈالر کے مقروض ہیں۔"
"گویا تمہارا شوہر دیوالیا ہو چکا تھا؟"
"میں ایسا نہیں سمجھتی۔"

مزاج پُرسی

بیوی خاوند سے۔ "آپ نے کہا تھا کہ سگریٹ لینے صرف سڑک کے پار جانا ہے مگر آپ نے دو گھنٹے لگا دیے؟"
خاوند: "بات یہ ہے کہ سڑک پر مجھے پڑوس والی بیگم مل گئیں اور میں غلطی سے ان کا مزاج پوچھ بیٹھا۔"
(صائمہ خان، لاہور)

شادی اور اسمبلیاں

صاحب! اسمبلیاں اور انڈے جلد ٹوٹ جاتے ہیں لیکن ہمارے ہاں شادیاں اکثر اپنی مدت پوری کرتی ہیں۔ ازدواجی اختلافات سے شادی کمزور ہو تو جمہوریت مضبوط ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں بیوی، میاں سے نہ لڑے تو وہ سمجھتا ہے یہ مجھے میاں سمجھتی ہی نہیں۔ ایک ایسے میاں بیوی کے جھگڑے میں دوست کو گواہ کے طور پر پیش کیا گیا۔ عدالت نے پوچھا۔ "جب اصل گڑبڑ شروع ہوئی تب آپ موجود تھے۔" گواہ بولا۔ "بالکل جناب عالی۔ میں نے ان کی شادی میں شرکت کی تھی۔" پرتگالی کہاوت ہے۔ شادی اور مکان بنانے سے جیب خالی ہو جاتی ہے مگر بندے کو عقل آ جاتی ہے۔ لیکن جناب ہمارا سوال تو یہ ہے کہ بعد میں عقل آنے سے کس کو فائدہ ہوتا ہے؟
ڈاکٹر محمد یونس بٹ کی کتاب "ٹوک جھوک" سے انتخاب
(ریاض بٹ حسن ابدال)

''کیا یہ ممکن ہے کہ اس نے کسی جرائم پیشہ شخص سے اُدھار لیا ہو۔ کیا تم نے اس کی زبان سے کوئی ایسا نام سنا جو عام طور پر ایسے لوگوں کے لیے کہے جاتے ہیں مثلاً موٹا پالی، مشین گن کیلی، ٹوکن سام یا ٹونی ٹائیگر وغیرہ وغیرہ۔''

''نہیں کبھی نہیں۔''

''سڑک چھاپ لوگوں کے بارے میں کیا خیال ہے۔ کہیں وہ بھی ان لوگوں میں تو شامل نہیں ہو گیا تھا جو چوری چھپے منشیات فروخت یا لوگوں کو غلط ترغیب دیتے ہیں؟''

''یہ تم کیا بکواس کررہے ہو؟''

''ناراض ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم آگے بڑھتے ہیں۔ تم اس کی میز کی تلاش جاری رکھو۔ کیا تمہیں کوئی غیر معمولی بات نظر آئی؟''

(طویل وقفے کے بعد) ''مجھے ایک لفافہ ملا ہے جس میں بہت سی رسیدیں ہیں۔ یہ پھولوں اور جیولری کی خریداری اور موٹیل کے کرائے کی رسیدیں ہیں۔ اوہ میرے خدا! اس نے تو مجھے کبھی یہ چیزیں نہیں دیں۔''

''اور کچھ؟''

''ہاں، مجھے ایک گھڑی کی رسید بھی ملی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک گفٹ کارڈ بھی منسلک ہے۔ جس پر لکھا ہوا ہے 'میری پیاری ایگی کے لیے' اوہ مارلے! تم نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟''

''یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ میرے پاس اس ہفتے تین مقتول شوہروں کے کیس آئے ہیں اور وہ تینوں دوسری عورتوں کے ساتھ تعلق استوار کیے ہوئے تھے۔''

(سسکیوں کی آواز)

''کیا تم جانتی ہو کہ یہ ایگی کون ہے اور تمہارے شوہر سے اس کا کیا تعلق تھا؟''

''وہ، وہ اگاتھا ہارڈی ہے۔ مارلے کے بہترین دوست جوئے کی بیوی۔''

''کیا وہ کینہ پرور عورت ہے اور مارلو کو حاصل نہ کرنے کی صورت میں اسے قتل کرسکتی ہے؟''

''مجھے کیا معلوم، اوہ میرے خدا! البتہ ایک بات میرے ذہن میں آرہی ہے۔''

''وہ کیا؟''

''جوئے کوہ پیمائی میں مارلے کا پارٹنر تھا۔ ممکن ہے کہ اسے اس تعلق کی بھنک مل گئی ہو اور اس نے جوش میں آکر مارلے کو قتل کردیا ہو؟''

''تمہارا کہنا ہے کہ جب مارلو کی موت واقع ہوئی تو وہ جوئے کے ساتھ چڑھائی چڑھ رہا تھا۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ جوئے کو مارلو اور اگاتھا کے تعلقات کا علم ہو گیا تھا اور اس نے عین اس وقت رسی کاٹ دی جب مارلو ایک چٹان سے لٹکا ہوا تھا۔ اس کے نتیجے میں وہ پہاڑی سے نیچے جاگرا اور غالباً جنگلی جانوروں کی خوراک بن گیا اس لیے کسی کو اس کی لاش نہ مل سکی۔''

(کتے کے بھونکنے کی آواز)

''اسکوبی، خاموش ہوجاؤ۔ ہمیش کیا تم ایک سیکنڈ کے لیے ہولڈ کرسکتے ہو۔ کوئی دروازے پر ہے۔ اوہ مائی گاڈ! میں نہیں بتاسکتی کہ وہ کون ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ وہ دروازہ کھولنے کی کوشش کررہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ گھر کے اندر داخل ہوچکا ہے۔ مجھے اس کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی ہے۔ یقیناً وہ جوئے ہوگا۔ اس نے پہلے مارلے کو ماردیا اور اب وہ مجھے قتل کرنے آرہا ہے۔ میری مدد کرو۔ ہمیش! میں کیا کروں؟''

''مادام! میرا مطلب ہے مس نینسی! میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تم ایک منٹ ہولڈ کرو۔ میں کسی سینئر سراغ رساں سے بات کرتا ہوں۔''

(وقفے کے دوران موسیقی کی آواز)

''ہیلو مس نینسی! انتظار کرنے کا شکریہ۔ میرے ساتھ ماربل لائن پر ہے۔ اس کا شمار ہمارے انتہائی تجربہ کار سراغ رسانوں میں ہوتا ہے۔''

''ہیلو مادام! تم کیسی ہو؟''

''میں جوئے کے قدموں کی آواز سن سکتی ہوں۔ وہ میری تلاش میں آرہا ہے۔ وہ مجھے مار ڈالے گا۔''

''مادام! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ کیا تمہارے پاس کوئی گن ہے؟''

''نہیں، ہمارے پاس کوئی گن نہیں۔''

''کوئی تیز دھار آلہ تو ہوگا مثلاً خنجر یا کلہاڑی وغیرہ؟''

''گھر میں ایسی کوئی چیز نہیں۔ اوہ میرے خدا! وہ میرا نام لے کر بلا رہا ہے۔ یقیناً وہ میری تلاش میں ہے۔''

''تمہارے پاس کرکٹ میں استعمال ہونے والی وکٹ ہے؟''

''وہ کیا ہوتی ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ ماربل کا اشارہ بیس بال بیٹ کی

طرف ہے۔''

''تھینک یو ہمیش۔ میں بھول گیا تھا کہ ہم امریکا بات کررہے ہیں۔ مادام! تمہارے پاس کوئی بیس بال بیٹ ہے؟''

''نہیں، میرے پاس اس طرح کی کوئی چیز نہیں۔ اوہ میرے خدا! میرا خیال ہے کہ وہ اوپر آرہا ہے۔''

''کمرے میں دیکھو، کیا یہاں ایسی کوئی چیز ہے جس سے تم اس پر حملہ کرسکو؟''

''ہاں، مارلے کی ٹرافی ہے جو اسے گزشتہ برس سال کا بہترین سیلز مین کے طور پر ملی تھی۔''

''اگر اس کے پاس گن ہوئی تو یہ ٹرافی اس کا مقابلہ نہیں کرسکے گی۔ بہرحال تمہارے پاس دفاع کے لیے کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے۔ دروازے کے پیچھے کھڑی ہوجاؤ۔ جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہو، تم اس پر حملہ کردینا۔ ہم اسپیکر آن کررہے ہیں۔ اگر تمہیں ہماری ضرورت محسوس ہوئی تو فوراً لائن پر آجائیں گے۔''

''ٹھیک ہے، میں کوشش کرتی ہوں۔''

''ہمیش! کیا تم نے ابھی تک لنچ نہیں کیا؟''

''نہیں، میں ساری دوپہر اس کال میں پھنسا رہا۔''

''میں تمہارا مطلب سمجھ گیا۔ مادام! تم ہماری آواز سن رہی ہو۔ تمہیں پوری قوت سے اس پر حملہ کرنا ہے۔ اگر پہلے وار میں اسے ناک آؤٹ نہ کرسکیں تو وہ تمہیں شوٹ کردے گا۔''

''اس تحقیقات کے مکمل ہونے کے بعد کیا تم میرے ساتھ لنچ کرنا پسند کرو گے؟''

''ہاں کیوں نہیں۔ میرا تو بھوک کے مارے دم نکل رہا ہے۔''

(تھوڑی دیر بعد)

''میں نے اسے ماردیا۔ میں نے اسے ماردیا۔''

''مس نینسی! یہ تم ہو یا جوئے بول رہا ہے۔''

''یہ میں ہوں نینسی۔ میں نے بالکل ویسے ہی کیا جو تم نے کہا تھا۔ وہ میرا نام لیتے ہوئے کمرے میں آیا اور میں نے عقب سے اس پر زوردار حملہ کردیا۔''

''کیا وہ ڈھیر ہوگیا؟''

''ہاں، وہ بالکل بھی حرکت نہیں کررہا بلکہ اس کی سانس بھی نہیں چل رہی۔''

''وہ جوئے ہی ہے۔ تم نے اسے دیکھا تھا؟''

''نہیں، اس کی پشت میری جانب تھی۔ اب دیکھتی ہوں۔ اوہ میرے خدا یہ تو مارلے ہے۔''

''ایک منٹ ہولڈ کرو۔ ہمیش! میرا خیال ہے کہ تم نے مقتول شوہر کا نام مارلو بتایا تھا؟''

''وہ اب مرا ہے جبکہ میں نے شروع میں ہی نینسی سے کہہ دیا تھا کہ اس کی موت کی خبر غلط ہے لیکن اس نے میری بات کا یقین نہیں کیا۔''

''مجھے سمجھانے کی کوشش مت کرو۔ ہمیں ہمیشہ ایسی ہی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لوگ فون کرکے ہم سے مدد تو مانگتے ہیں لیکن ہماری کوئی بات سننے پر تیار نہیں ہوتے... اگر نینسی نے بھی تمہاری بات پر دھیان دیا ہوتا تو یہ نوبت نہ آتی۔''

''مجھے یقین نہیں آرہا۔ میں نے اپنے شوہر کو مار ڈالا۔ اس کے ہاتھ میں ٹرین کے دو ٹکٹ تھے۔ وہ مجھے مارنے نہیں بلکہ کہیں لے جانے کے لیے آیا تھا۔''

''تمہارا اندازہ درست تھا ہمیش! مارلو انشورنس ایجنٹ تھا اور بیمہ فروخت کرنے کے لیے اِدھر اُدھر جاتا رہتا تھا۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ بیوی کو بتائے بغیر کسی مشن پر نکل گیا اور وہ یہی سمجھتی رہی کہ اسے قتل کردیا گیا ہے۔''

''تمہیں معلوم ہے ماربل! مس نینسی اب پہلے سے بہتر حالت میں ہے۔''

''تم کیا کہنا چاہ رہے ہو ہمیش؟''

''اس کی نہ صرف بے وفا شوہر سے جان چھوٹ گئی بلکہ اسے انشورنس کمپنی سے ایک اچھی خاصی رقم بھی مل جائے گی اگر مارلو کی لاش کو ٹھکانے لگا دیا جائے تو حکام یہی سمجھتے رہیں گے کہ وہ پہاڑ کی اونچائی سے گر کر فوت ہوچکا ہے اسی لیے میں نے کہا کہ اب وہ پہلے کے مقابلے میں بہتر پوزیشن میں ہے۔''

''واقعی، یہ ایک اچھا نکتہ ہے ہمیش۔''

''شکریہ ماربل! مس نینسی! کیا تم ابھی تک لائن پر ہو؟''

''ہاں، میں نے تم دونوں کی ساری باتیں سن لی ہیں۔ مجھے لاش ٹھکانے لگانے کے لیے کیا کرنا ہوگا؟''

''اسپیڈ ڈیٹیکٹو ایجنسی فون کرنے کا شکریہ۔ براہِ کرم لائن پر ہی رہو، میں تمہاری کال کسٹمر سروس گروپ کو منتقل کررہا ہوں۔ وہ اس سلسلے میں تمہاری راہنمائی کریں گے۔''

(موسیقی کی آواز)

محبتوں... عنایتوں میں آجانے والی رنجشوں کی روداد

بدنیّت

جمال دستی

تادیر قائم رہنے والی دوستی میں شوق اور ذوق کی مماثلت اہم کردار ادا کرتی ہے... ان دوستوں کا گروپ بھی موسیقی کی لہروں سے بندھا ہوا تھا... اچانک ہی خوشیوں کے راستے میں جرم کے سنگ ریزے آگئے...

میرا نام سوزن والٹ ہے۔ شمالی کیرولینا کے قصبے رلیے میں میری ریکارڈ شاپ ہے۔ میرے پاس بہترین ریکارڈز کا ذخیرہ ہے اور میں خود بھی وینائل ریکارڈز کی دیوانی ہوں کیونکہ یہی وہ واحد کمپنی ہے جو نایاب گانوں اور موسیقی کے ریکارڈ تیار کرتی ہے اور موسیقی کے شائقین ان کے حصول کے لیے بے تاب نظر آتے ہیں۔ اسی لیے میری کوشش ہوتی ہے کہ جہاں سے بھی یہ ریکارڈز ملیں، انہیں حاصل کر کے اپنے پاس ذخیرہ کرلوں تاکہ مجھے اپنے گاہکوں کی فرمائش پوری کرنے میں آسانی رہے۔

وہ سوموار کی ایک خوشگوار صبح تھی جب میں سورج نکلنے سے پہلے اپنی دکان سے روانہ ہوگئی۔ میرا رخ مغرب کی جانب تھا۔ مجھے سفر کرتے ہوئے دو گھنٹے ہوئے ہوں گے کہ شدید بارش شروع ہوگئی جس کی وجہ سے میرے لیے سفر جاری رکھنا دشوار ہوگیا۔ میں نے مضبوطی سے دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ وہیل پر جمائے اور آگے کی طرف جھک کر ونڈ شیلڈ کے باہر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی جیسے کوئی سوئی تلاش کررہی ہوں جبکہ میری نظریں سرمئی پہاڑیوں کے دامن میں واقع اپنے دوست ڈربی بارنر کے کیبن کو ڈھونڈ رہی تھیں جو میری طرح وینائل ریکارڈز کا رسیا تھا۔ گزشتہ شب ہی اس نے مجھے فون پر پندرہ ایسی البمز کے نام بتائے تھے جنہیں وہ مناسب داموں پر مجھے دے سکتا تھا۔

ہم دونوں بچپن کے دوست تھے اور ہمیں جنون کی حد تک موسیقی کا شوق تھا۔ میرے والد سونی والٹ، کاپر ہل نامی بینڈ کے بانی اراکین میں سے ایک تھے۔ اس بینڈ میں دو خواتین بھی شامل تھیں جن میں سے ایک ڈربی کی ماں سارہ تھی۔ گوکہ اس بینڈ کی شہرت دور دور تک تھی لیکن سارہ کی نجی زندگی خوشگوار ثابت نہ ہوسکی۔ وہ ایک جارح مزاج عورت تھی اور اسی وجہ سے ڈربی کا باپ بھی اس سے دور رہتا تھا۔

میں نے ابھی اپنے پیروں پر چلنا بھی شروع نہیں کیا تھا کہ میری ماں چلی گئی۔ میری دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں تھا اور میں ایک خودرو پودے کی طرح بینڈ کے لوگوں کے درمیان پرورش پاتی رہی جبکہ ڈربی کی پرورش گھر کی خادمہ نادیہ نے کی اور ابھی تک اس کی دیکھ بھال وہی کررہی تھی۔ ہم اس لحاظ سے خوش قسمت تھے کہ ہمیں ماں باپ میں سے کسی ایک کی سرپرستی میسر تھی۔ گوکہ ہماری پرورش میں ان کا کردار بے حد محدود تھا لیکن نام کی حد تک ہمارے لیے ان کا وجود غنیمت تھا۔ ہمارا بچپن بیت گیا تھا لیکن ہم اب بھی اپنے حصے میں آنے والے دکھوں کی کہانیاں ایک دوسرے سے شیئر کرتے تھے۔

ہمارے تعلق کو مضبوط بنانے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ہم دونوں وینائل سے جڑے ہوئے تھے۔ دو سال پہلے میں نے اپنا وینائل ریکارڈ اسٹور کھولنے کی خاطر اکاؤنٹنٹ کی ملازمت چھوڑ دی تھی۔ گوکہ مجھے مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑرہا ہے لیکن اُمید ہے کہ بہت جلد میں اپنے اسٹور کو اس مقام تک لے جاؤں گی جب بڑے بڑے گلوکار اور موسیقار یہاں آنے میں فخر محسوس کریں گے۔ ڈربی کی ماں کو احساس تھا کہ وہ اس کی پرورش پر پوری توجہ نہ دے سکی چنانچہ اس نے اس کا ازالہ اس طرح کیا کہ وقت سے پہلے ہی ڈربی کے نام اس کے حصے کا ترکہ منتقل کردیا اور اس کی بدولت وہ اکیس سال کی عمر میں خاصا امیر شخص بن چکا تھا۔ اس نے ایک چھوٹے سے کیبن سے کاروبار شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اسے ایک بڑے ذخیرے کی شکل دے دی۔ اسے نادر و نایاب ریکارڈز جمع کرنے کا شوق تھا اور موسیقی کے شائقین اپنی مطلوبہ البم کے لیے اسی سے رجوع کیا کرتے تھے۔

ڈربی کی رہائش گاہ کے قریب پہنچ کر مجھے بڑے زور کی ہنسی آئی۔ وہ ابھی تک اس جگہ کو کیبن کہا کرتا تھا جبکہ اس نے چھ سال پہلے سات سو مربع فٹ پر مشتمل یہ عمارت اور اس سے ملحق پہاڑی کا کچھ حصہ خریدا تھا اور اب یہ عمارت تین ہزار مربع فٹ تک پھیل چکی تھی۔ اس کے علاوہ رہائش گاہ کے جنوبی حصے میں تعمیر کا سلسلہ جاری تھا۔

جونہی میں نے اپنی گاڑی پورچ میں پارک کی تو بارش بھی رک گئی تاہم ہلکی ہلکی پھوار ابھی پڑرہی تھی جس سے فضا میں تازگی کا احساس بڑھ گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کار سے باہر آتی، ڈربی مرکزی ہال کے دروازے سے برآمد ہوا جو اس نے گزشتہ برس ہی تعمیر کروایا تھا۔ اس نے میرے سر پر چھتری تان لی اور میری گردن میں بازو ڈال کر گرم جوشی سے بھینچ لیا۔ پھر ہم شانے سے شانہ ملا کر مرکزی ہال کی جانب بڑھنے لگے۔ اس کا قد بمشکل مجھ سے ایک انچ زیادہ ہوگا اور ہم دونوں بھورے بالوں اور تیکھے نقوش کی وجہ سے جڑواں لگتے تھے۔

''تمہیں یہاں دیکھ کر خوشی ہورہی ہے البتہ افسوس سے کہنا پڑرہا ہے کہ میں تمہارے لیے اچھے موسم کا بندوبست نہ کرسکا۔ کاش یہ میرے اختیار میں ہوتا۔''

میں جیسے ہی اس نو تعمیر شدہ ہال میں داخل ہوئی، اسے دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس کی سجاوٹ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اسی کمرے میں بیٹھ کر وہ موسیقی سے لطف اندوز ہوتا اور البمز کی کاپیاں بناتا۔ ساؤنڈ اور ریکارڈنگ سسٹم کو جدید اور بہتر بنانے کے لیے اس نے ایک ساؤنڈ انجینئر کی خدمات حاصل کی تھیں۔ اس ہال کے عقب میں اس کی ذاتی ریکارڈ لائبریری تھی جس کے خانوں اور بکسوں میں سیکڑوں نادر و نایاب ریکارڈز جمع تھے۔ اس نے ان ریکارڈز کی فہرست مرتب کررکھی تھی جسے وہ ہمیشہ مقفل رکھتا۔

''امید ہے کہ تم یہاں کچھ روز قیام کروگی؟'' ڈربی نے پُراشتیاق لہجے میں کہا۔

''پھر بھی رک جاؤں گی کیونکہ مجھے ایک ضروری کام کی وجہ سے رات کو ہی جانا ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا پھر بولی۔ ''بیتھ کہاں ہے؟''

''یہیں کہیں ہوگی۔'' اس نے بے پروائی سے کہا اور دائیں بائیں دیکھنے لگا جیسے خود بھی اپنی بیوی کو ڈھونڈ رہا ہو۔

''میں حاضر ہوں۔'' میرے عقب سے آواز آئی۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا تو وہ خیر مقدمی انداز میں مسکرا رہی تھی۔ اس نے معمول کے مطابق گھریلو لباس یعنی بند گلے کی ٹی شرٹ، لمبا سا اسکرٹ اور سردی سے بچنے کے لیے لانگ شوز پہن رکھے تھے۔ اس کی سال بھر پہلے ہی شادی ہوئی تھی لیکن وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ جوان اور خوب صورت نظر آرہی تھی۔

''کیسی ہو؟'' اس نے عام سے انداز میں پوچھا۔

یہ سمجھنا مشکل تھا کہ وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوئی یا اسے میرا آنا اچھا نہیں لگا۔ مجھے اس کی پروا بھی نہیں تھی کیونکہ میں ڈربی کی دوست ہی نہیں بلکہ مستقل گاہک بھی تھی اور اس سے جو کچھ لے کر جاتی، اس کی معقول قیمت بھی ادا کرتی تھی۔

''میں تم لوگوں کے لیے کھانے کا بندوبست کرتی ہوں۔ کک نے سوپ بنایا ہے جس کی خوشبو سے ہی پتا چل رہا ہے کہ بہت اچھا بنا ہوگا۔''

''ہاں، یہ ٹھیک رہے گا۔'' وہ شیلف میں سے کچھ ریکارڈز نکالتے ہوئے بولا۔ ''سوپ کے ساتھ کچھ اور چیزیں بھی لیتی آنا۔ سوزن لمبا سفر کر کے آئی ہے۔ خالی سوپ سے اس کا پیٹ نہیں بھرے گا۔''

جیسے ہی وہ جانے کے لیے مڑی، ڈربی نے کہا۔ ''تم اسے کک مت کہا کرو۔ وہ اس لفظ سے چڑتی ہے، اس کا نام نادیہ ہے۔ اسے اسی نام سے بلایا کرو۔''

بیتھ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن فوراً ہی ارادہ بدل دیا۔ شاید وہ میری موجودگی میں کوئی بحث نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔

''کیا تم کچھ سننا چاہو گی؟'' اس کے جانے کے بعد ڈربی نے کہا۔ اس کے ہاتھ میں نک ڈریک کی البم کی کاپی تھی جو 1986ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

''اگر یہ کاپی مجھے فروخت کر رہے ہو تو میں نہیں چاہوں گی کہ اس پر کوئی نشان یا دھبا آجائے۔'' میں دیکھ چکی تھی کہ وہ البم اوریجنل حالت میں ہے اور اس پر وینائل کے حروف جگمگا رہے تھے۔ مجھے بڑی آسانی سے اس کے دو سو ڈالرز مل سکتے تھے۔

''یہ میری اپنی کاپی ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''لیکن تمہیں اس کی آواز سن کر یقین نہیں آئے گا۔''

میں ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور آنکھیں بند کر کے موسیقی سے لطف اندوز ہونے لگی۔ اس کی مسحور کن آواز سن کر یوں لگا جیسے کمرا چاند کی کرنوں سے روشن ہوگیا ہے۔

''مجھے بھی یہ گانا بہت پسند ہے۔'' میں نے ایک جانی پہچانی آواز سنی اور آنکھیں کھول دیں۔ ڈربی کی پرانی خادمہ نادیہ ہاتھوں میں ٹرے سنبھالے ہال میں داخل ہو رہی تھی۔

''تمہیں تو ہر گانا ہی پسند آجاتا ہے۔'' میں اس کے گلے لگتے ہوئے بولی۔

''تمہارا الزام درست ہے۔'' وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ''کیسی ہو سوزن؟ بہت دنوں بعد تمہیں دیکھا ہے۔ سارے اچھے موسم آئے اور چلے گئے لیکن تم کام کے علاوہ گھر سے باہر نہیں نکلتیں۔''

اس کی بات ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ مرکزی ہال کا دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھلا اور ہم نے ایک بھاری بھرکم شخص کو وہاں کھڑے دیکھا۔ پہلے تو میں اسے پہچان نہیں پائی کیونکہ بارش دوبارہ شروع ہوچکی تھی اور وہ سر سے پاؤں تک پانی میں بھیگا ہوا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ صاف کیا تو مجھے اسے شناخت کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ وہ رونالڈ نکلسن تھا اور نایاب البم پر شکاری کتے کی طرح جھپٹتا تھا۔ اس سے میری ملاقات ڈربی کے توسط سے ہی ہوئی تھی۔ وہ دونوں اچھے دوست تھے یا کم از کم اس وقت تک میرا یہی خیال تھا۔

''اوہ... تو یہ قصہ ہے۔'' وہ ڈربی کی طرف دیکھ کر چلّاتے ہوئے بولا۔ ''تم یہ ریکارڈ اس عورت کے ہاتھ فروخت کر رہے ہو؟'' پھر وہ میری طرف مڑا اور فضا میں انگلی نچاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''اے سوزن! تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ میرا اور ڈربی کا معاملہ ہے۔''

''تم نے وعدہ کیا تھا کہ کام مکمل ہونے کی صورت میں تم یہ ریکارڈ مجھے فروخت کرو گے۔'' اس نے باہر ہونے والے تعمیراتی کام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس سلسلے میں ہمارے درمیان معاہدہ بھی ہوگیا تھا۔''

''یہ اس وقت کی بات ہے جب تمہارے کیے ہوئے کام کا معائنہ نہیں ہوا تھا۔'' ڈربی نے کہا۔ ''تم نے گھٹیا کام کیا ہے اور اس کی ذمے داری تم پر عائد ہوتی ہے۔ لہٰذا میری طرف سے وہ معاہدہ ختم سمجھو۔''

میں اور نادیہ تماشائیوں کی طرح یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ الزامات اور ایک دوسرے کو بے عزت کرنے کا سلسلہ جاری تھا اور میں ڈر رہی تھی کہ کہیں ان دونوں کے درمیان ہاتھاپائی کی نوبت نہ آجائے۔

''ڈربی۔'' بیتھ کمرے میں دوڑتی ہوئی آئی اور اس نے دھیمے لیکن مضبوط لہجے میں کہا۔ ''خدا کے واسطے خاموش ہوجاؤ۔ کیوں اپنا تماشا بنا رہے ہو؟''

یہ کہہ کر وہ کسی میچ ریفری کی طرح ان دونوں کے درمیان ہاتھ پھیلا کر کھڑی ہوگئی اور بولی۔ ''تم دونوں کو شرم آنی چاہیے۔ پرانے دوست ہونے کے باوجود چند ریکارڈز کے لیے لڑ رہے ہو۔''

''یہ وینائل ریکارڈز ہیں۔ انہیں معمولی مت سمجھو۔'' ڈربی نے کہا۔

''وینائل۔'' وہ آنکھیں گھماتے ہوئے طنزیہ بولی۔

ڈربی اور رونالڈ سر جھکائے کھڑے تھے جیسے اپنے جوتوں کا معائنہ کر رہے ہوں۔ سردی کے باوجود میری پیشانی عرق آلود ہوگئی تھی۔ میرے لیے یہ صورتِ حال انتہائی تکلیف دہ تھی اور میں اپنے آپ کو کسی جھگڑے میں ملوث کرنا نہیں چاہ رہی تھی۔

رونالڈ نے ہال کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی دو آدمی دروازے پر نمودار ہوئے۔ انہوں نے بارش سے بچنے کے لیے زرد رنگ کی برساتیاں اوڑھ رکھی تھیں۔ وہ سنجیدگی سے کھڑے ہو کر صورتِ حال کا جائزہ لینے لگے۔

''کیا ہم غلط وقت پر آئے ہیں؟'' ان میں سے چھوٹے قد والا بولا۔

رونالڈ نے اس شخص کو گھور کر دیکھا تب تک ڈربی انہیں اندر آنے کا اشارہ کرچکا تھا۔ نادیہ نے آگے بڑھ کر دروازہ بند کیا اور اس کی چٹخنی چڑھا دی تاکہ مزید کسی کی مداخلت کا امکان نہ رہے۔ اب وہ ہونٹ بھینچے اگلے منظر کا انتظار کر رہی تھی۔

''ہیلو ٹیڈ!'' رونالڈ نے لفظوں کو چباتے ہوئے کہا جیسے اس کے منہ کا ذائقہ خراب ہوگیا ہو۔

''رونالڈ!'' اس شخص نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں یہ سن کر خوشی ہوگی کہ معائنے کے دوران تمہارے کام میں کوئی نقص نہیں پایا گیا۔ اب تم بجلی کا کام شروع کر سکتے ہو۔''

''اسے تو پہلی بار ہی میں پاس ہوجانا چاہیے تھا۔'' رونالڈ نے فقرہ اچھالا۔

''دیکھو رونالڈ! یہ کوئی ہائی اسکول نہیں ہے اور یہ بات میں نے تمہارے آدمی جان کو سمجھا دی ہے۔'' اس شخص نے

شریف لڑکی

فرانس کے سابق صدر پنکارا PINCKRA اپنی جوانی کے دور میں پیرس کے ممتاز وکیل تھے۔ وہ جنگ عظیم کے ابتدائی چھ سال میں فرانس کے صدر تھے۔ ان کو ایک لڑکی سے محبت تھی اور وہ اس سے شادی کے خواہاں تھے۔ انہوں نے سوچا کیوں نہ شادی سے پہلے اس کے متعلق تحقیقات کرالی جائے۔ چنانچہ انہوں نے پیرس کے ایک مشہور سراغ رساں کو خط لکھا کہ میں اپنی ہونے والی بیوی کے متعلق چھان بین کرانا چاہتا ہوں، ساتھ ہی انہوں نے ایک ہزار روپے کا چیک بھی بھیج دیا۔

پندرہ دن بعد سراغ رساں کا جواب آیا۔ لکھا تھا۔

''لڑکی واقعی بڑی شریف ہے۔ محنت کشوں کے ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتی ہے لیکن کچھ عرصے سے ایک وکیل کے ساتھ دیکھی جارہی ہے جس کی لوگ بڑی برائی کرتے ہیں۔ اس کا نام پنکارا ہے۔ اگر وہ لڑکی اس وکیل سے قطع تعلق کرلے تو بہت اچھی اور شریف لڑکی ثابت ہوسکتی ہے۔''

(طارق علی صدیقی، نارتھ ناظم آباد کراچی)

اپنے پیچھے کھڑے ہوئے دراز قد جان کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ اس کی غلطی نہیں تھی۔ میرے خیال میں جان ڈیوس اس علاقے میں سب سے اچھا فورمین ہے۔''

''ٹھیک ہے اگر یہ میرے فورمین کی غلطی نہیں تھی اور نہ ہی تمہاری تو پھر اس کا ذمے دار کسے ٹھہرایا جائے؟''

''کسی کو بھی نہیں۔'' ٹیڈ نے کہا۔ میں سمجھ گئی تھی کہ وہ بلڈنگ انسپکٹر ہے۔ اس نے مسکراتے ہوئے رونالڈ کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''اب تم اطمینان سے اپنا کام جاری رکھ سکتے ہو۔''

اس پوری گفتگو کے دوران رونالڈ کا فورمین جان ڈیوس خاموش کھڑا رہا۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثرات نہیں تھے اور جب اس کا ذکر آیا، تب بھی وہ خالی خالی آنکھوں سے فضا میں گھورتا رہا۔ لگتا تھا جیسے وہ وہاں موجود ہی نہیں ہے۔ وہ لمبے قد اور مضبوط جسم کا مالک تھا اور اس کے چہرے پر چھائی ہوئی سختی دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ مزدوروں سے کام لینا جانتا ہے۔

رونالڈ نے پھر کوئی اعتراض کرنا چاہا لیکن ڈربی نے اسے روک دیا اور بولا۔ ''ٹیڈ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس موضوع

پر بہت بات ہو چکی۔ میں ہی بے وقوف تھا۔ نہ جانے میرے ذہن میں کیا بات تھی۔"

اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں میرے چہرے پر جما دیں۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ اس بے مقصد سفر کے لیے میں نے خوامخواہ اپنا وقت اور پیسے ضائع کیے۔ اس نے شاید میری سوچ پڑھ لی اور بولا۔

"میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"

بیتھ نے اس کے شانے پر تھپکی دی اور بولی۔ "یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔ اب کیا میں تم لوگوں کے لیے کچھ لا سکتی ہوں؟"

میں نے دیکھا کہ نادیہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ شاید وہ سمجھ رہی تھی کہ بیتھ اچھی میزبان ثابت نہیں ہو سکتی۔ اسی وقت میری نگاہ کچن کی جانب جانے والے راستے پر گئی جہاں ایک نوعمر لڑکا کھڑا ہوا تھا۔ بیتھ نے میری نظروں کا تعاقب کیا اور بہ آوازِ بلند بولی۔

"سب لوگ متوجہ ہوں۔ یہ میرا چھوٹا بھائی کائل ہے۔" پھر اس نے اسے اپنی طرف آنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "انہیں ہیلو کہو۔"

کائل کمرے میں تو آ گیا لیکن اس نے کسی کو ہیلو کہنے یا تعظیم دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ اجنبی انداز میں دیوار پر نظریں جمائے ہوئے تھا اور یوں لگتا تھا کہ وہ سب لوگوں کے درمیان بے آرامی محسوس کر رہا ہے۔ بیتھ کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا اور وہ اسے لے کر باہر چلی گئی۔

ڈربی ان کے جانے کے بعد ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولا۔ "اپنے دماغ سے بوجھ ہٹا دو رونالڈ۔ ہم کوئی نہ کوئی حل نکال لیں گے۔ ٹیڈ! تمہارا کیا پروگرام ہے؟ سوپ پینے کے بعد ہم کچھ اچھی دھنیں سنیں گے۔ کیا تم کچھ دیر کے لیے رک سکتے ہو؟"

ٹیڈ راضی ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی فورمین جان ڈیوس ایک لفظ کہے بغیر دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ نادیہ کے سوا کسی نے بھی اس کے جانے کا نوٹس نہیں لیا۔ البتہ اس نے دروازے کی چٹخنی گرا دی تا کہ وہ باہر جا سکے۔ میں نے دیکھا کہ ان دونوں کے درمیان نظروں کا تبادلہ ہوا لیکن فوری طور پر یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ ان میں کیا پیغام چھپا ہوا ہے۔

میں نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی اور وقت کا حساب لگانے لگی۔ کام کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے مجھے وہاں مزید دو گھنٹے رکنا تھا۔ ممکن تھا کہ ڈربی کی وجہ سے کچھ دیر ہو جاتی کیونکہ بدلی ہوئی صورت حال میں اسے میرے ساتھ کیا گیا وعدہ پورا کرنے میں مشکل پیش آ سکتی تھی۔

سوپ بہت عمدہ تھا اور اس کے ساتھ رکھے گئے دیگر لوازمات نے کھانے کا مزہ دوبالا کر دیا۔ اس کے بعد ڈربی نے اپنے منتخب ریکارڈز سنانا شروع کر دیے۔ باتوں باتوں میں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ رونالڈ اور ٹیڈ، اسکول کے زمانے میں ایک ساتھ فٹ بال کھیلا کرتے تھے۔

"ساری محنت میری ہوتی اور نام اس کا ہو جاتا۔" رونالڈ منہ بناتے ہوئے بولا۔ "میں ہاف لائن میں تھا جبکہ یہ فارورڈ پوزیشن پر کھیلتا تھا۔ میں مخالف ٹیم کے دفاع کو توڑ کر آگے بڑھتا اور یہ میرے پاس پر بڑے آرام سے گول کر دیتا اور تماشائی جوش کے عالم میں اس کا نام لے کر نعرے لگاتے۔ جب یہ جیتنے کے بعد خوشی کے عالم میں رقص کر رہا ہوتا تو میں سائڈ لائن پر بیٹھا اپنی ناقدری پر آنسو بہایا کرتا۔"

"تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ میں نے ہی اس بزنس کو شروع کرنے میں تمہاری مدد کی تھی۔" ٹیڈ کھسیانا ہوتے ہوئے بولا۔ "میں نے تمہیں اپنی تمام سی ڈیز اور لانگ پلے ریکارڈز دے دیے لیکن تم نے یہ کبھی نہیں بتایا کہ ایک روز ان کی قدر و قیمت میں اتنا اضافہ ہو جائے گا۔"

"اسے تم میری دور اندیشی کہہ سکتے ہو۔" رونالڈ نے کہا۔ "لوگ سمجھتے ہیں کہ لحیم شحیم نظر آنے والے عام طور پر بے وقوف ہوتے ہیں لیکن مجھے اپنے ذہن کا استعمال کرنا اچھی طرح آتا ہے۔"

بیتھ اس کے بعد کمرے میں نہیں آئی لیکن مجھے شبہ تھا کہ وہ کہیں آس پاس موجود ہے۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ ہماری نگرانی کی جا رہی ہے کیونکہ میں نے دو مرتبہ کسی کو راہداری میں نقل و حرکت کرتے دیکھا تھا۔ چار بجے کے قریب ٹیڈ جانے کے لیے تیار ہو گیا اور میں نے بھی موقع غنیمت جان کر واپسی کا ارادہ ظاہر کیا۔ لیکن ڈربی نے اصرار کر کے مجھے مزید کچھ دیر کے لیے روک لیا۔ پھر وہ اپنے ریکارڈ روم میں گیا اور دس منٹ بعد اپنے ہاتھوں میں ریکارڈز کا ڈھیر پکڑے باہر آ گیا۔

"رونالڈ! مجھے اپنے طرزِ عمل پر افسوس ہے۔ تم یہ البمز اسی قیمت پر خرید سکتے ہو جو میں نے سوزن کو بتائی تھیں۔" یہ کہہ کر اس نے ایک لانگ پلے ریکارڈ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "مجھے معلوم ہے کہ تمہیں اس کی تلاش تھی، لہٰذا میری طرف سے اسے قبول کرو۔"

میں نے رونالڈ کے چہرے پر خوشی اور آنکھوں میں ایک خاص چمک دیکھی۔ وہ گرانڈ فنک ریل روڈ کا نایاب گا

تھا جس پر رونائل کی سنہری مہر لگی ہوئی تھی۔ گو کہ اس البم کی زیادہ سے زیادہ قیمت بیس سے تیس ڈالرز ہو گی لیکن رونالڈ کی مسرت کا یہ عالم تھا جیسے اس کی لاٹری نکل آئی ہو۔ میں جانتی تھی کہ رونالڈ کے لیے اس کی قیمت کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی بلکہ وہ اپنے ذخیرے میں اس البم کی کمی محسوس کر رہا تھا۔

ڈربی نے بقیہ البمز ایک کریٹ میں رکھیں اور اسے میرے قدموں کے نزدیک کرتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے کہ اس سے تمہارا کام چل جائے گا۔"

میں کریٹ کی طرف بڑھی اور اس سے قیمت کے بارے میں پوچھنے لگی لیکن اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور بولا۔ "یہ ایک حیران کن انتخاب ہے۔ اسے میری طرف سے تحفہ سمجھو۔ گھر جا کر آرام سے دیکھنا۔"

میں ان لوگوں کو وہیں چھوڑ کر کچن کی طرف گئی تا کہ نادیہ کو الوداع کہہ سکوں۔ وہ عقبی دروازے میں کھڑی جان ڈیوس سے دھیمی آواز میں باتیں کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ کچھ گھبرا سی گئی۔ ڈیوس نے بھی چونک کر دیکھا اور سر ہلاتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔

"یہ لوگ ہر وقت مجھے تنگ کرتے رہتے ہیں۔" وہ باہر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "ڈربی کو تو اپنے ریکارڈز سے ہی فرصت نہیں ہے اور اس کی بیوی یہ فیصلہ بھی نہیں کر سکتی کہ اسے صبح .... کون سا لباس پہننا ہے۔ لہٰذا ہر مسئلے کا حل مجھے ہی تلاش کرنا پڑتا ہے۔"

"جبکہ تمہارے اوپر پہلے ہی کام کا بہت زیادہ بوجھ ہے۔" میں نے ہمدردی جتاتے ہوئے کہا۔ "میں بیتھ کو بھی الوداع کہنا چاہ رہی تھی لیکن وہ مجھے نظر نہیں آ رہی۔"

"وہ شاید اپنے بھائی کے ساتھ کہیں باہر گئی ہوئی ہے۔"

"کیا اس کا بھائی بھی یہیں رہتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" نادیہ نے جواب دیا۔ "وہ یہاں صرف دو ہفتے کے لیے آیا تھا جس میں سے ایک گزر چکا ہے۔ مجھے تو اس لڑکے کے ساتھ کچھ گڑبڑ معلوم ہوتی ہے۔"

"اس عمر میں نوجوان اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ زیادہ ہی حساس ہوتے ہیں۔ تم ڈربی کا وقت بھول گئیں؟"

"سوزن! مجھے وہ باتیں مت یاد دلاؤ۔" وہ کھسیانی ہوتے ہوئے بولی۔ "ڈربی نے اپنا مستقبل خود بنایا ہے۔"

"اسی طرح کائل بھی کوئی باعزت پیشہ اختیار کرے گا، بشرطیکہ آوارہ لڑکوں کی صحبت سے دور رہا۔"

میں نے اپنی کار میں بیٹھنے سے پہلے البمز کا کریٹ

نہیں دیکھا۔ ان کی تعداد اٹھارہ تھی اور وہ ان کے مقابلے میں زیادہ بہترین تھی جن کا وعدہ ڈربی نے پہلے مجھ سے کیا تھا۔ ڈربی نے کچھ زیادہ ہی سخاوت کا مظاہرہ کیا تھا اور میں سوچ رہی تھی کہ انہیں لیتے ہوئے مجھے تھوڑی بہت ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا مگر ایسا نہیں ہوا۔

دوسرے روز میں اپنی دکان میں بیٹھی ہوئی ڈیوی کے سامنے شیخی مار رہی تھی۔ "وہاں پہنچنے پر ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے کہ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے ڈربی اپنا وعدہ پورا نہ کر سکے گا لیکن اس نے توقع سے زیادہ ہی مجھے دے دیا۔"

ڈیوی میرے ساتھ دکان پر کام کرتا ہے۔ ہم ایک دوسرے کو کافی عرصے سے جانتے ہیں۔ وہ مجھ سے عمر میں بڑا ہے اسی لیے چھوٹی بہن سمجھ کر سلوک کرتا ہے۔ جب اس کا موڈ اچھا ہو تو بڑی خوش اسلوبی سے اپنا کام سرانجام دیتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کے بغیر میں اپنے کاروبار اور زندگی میں اتنا کچھ حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ وہ میرا بہترین دوست ہے۔ اس نے وہ تمام ریکارڈز دیکھنے کے بعد ایک ہلکی سی سیٹی بجائی اور بولا۔

"ڈربی نے تمہیں یہ نایاب ریکارڈز تو دے دیے لیکن اب وہ پچھتا رہا ہوگا۔"

میں نے اسے ڈربی کے گھر ہونے والے واقعے کی روداد سنائی تو وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں رونالڈ کو تو نہیں جانتا لیکن

شوربے کا شوربہ

ایک مرتبہ، ایک کسان احمد نامی ملا نصر الدین کا مہمان ہوا۔ اس نے ایک چوزہ ملا کو تحفتہً دیا۔ ملا نے اس کی بہت خاطر تواضع کی۔ چند روز بعد ایک اور شخص آیا اور کہا۔ "میں احمد کا دوست ہوں۔" ملا نے اس کی بھی بہت خاطر مدارات کی۔ تیسرے دن ایک اور شخص آیا اس نے بھی کہا۔ "میں احمد کا دوست ہوں۔" ملا نے پھر وضع داری کا ثبوت دیا۔ لیکن ایک ہفتے بعد پھر ایک شخص آیا کہ میں احمد کا دوست ہوں۔ ملا نے اسے اپنے دیوان خانے میں بٹھایا۔ دسترخوان بچھایا تو ملا نے مہمان کے ایک بڑے کٹورے میں خالی کھد بداتا ہوا گرم پانی رکھ دیا اور کہا۔ "یہ احمد کے دیے ہوئے چوزے کے شوربے کے شوربے کے شوربے کا شوربہ ہے۔ نوش جان فرمائیں۔"

(کتاب: "دنیا کے مشہور حاضر جواب سے" ماخوذ)

(مرسلہ: طیب اسد، ڈی آئی خان)

ڈربی ایسا شخص نہیں جو اپنی کہی ہوئی بات سے پھر جائے۔"

میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ دوسری طرف سے بیتھ بھرائی ہوئی آواز میں بول رہی تھی۔ "سوزن! تم جلدی سے یہاں آجاؤ۔ بہت گڑبڑ ہوگئی ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ کیا کروں۔ ڈربی بھی یہی چاہتا ہے کہ تم فوراً چلی آؤ۔"

"کیا ہوا... سب خیریت تو ہے؟" بیتھ کی بھرائی ہوئی آواز سن کر میں یہی سمجھی کہ ان دونوں کے بیچ کوئی بڑا جھگڑا ہوگیا ہے اور اب مجھے مصالحت کنندہ کا کردار ادا کرنا پڑے گا جس سے میں ہمیشہ چڑتی تھی۔

"وہ مرچکا ہے۔" بیتھ چلّاتے ہوئے بولی۔ "رونالڈ مرگیا ہے اور ڈربی پر اس کے قتل کا شبہ ظاہر کیا جارہا ہے۔"

بیتھ کو اپنے جذبات پر قابو نہ رہا اور وہ ہسٹریائی انداز میں چلّانے لگی۔ میں اس کی پوری بات نہ سمجھ سکی لیکن اتنا اندازہ ضرور ہوگیا کہ معاملہ سنگین ہے۔ میں نے اسے پُرسکون کرنے کی کوشش کی اور یقین دلایا کہ انتظامات پورے ہوتے ہی میں یہاں سے روانہ ہوجاؤں گی۔

میں نے سیل فون بند کردیا اور اپنے اعصاب پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی لیکن میرے چہرے کے تاثرات دیکھ کر ڈیوی نے اندازہ لگالیا کہ میں نے کوئی بری خبر سنی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتا، دکان میں رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے لپک کر ریسیور اٹھالیا کیونکہ نہیں چاہتی تھی کہ ڈیوی کال ریسیو کرے۔ حالانکہ عام طور پر وہی یہ خدمت انجام دیا کرتا تھا۔

دوسری طرف سے بولنے والے نے اپنا تعارف شیرف کے نائب جیری فاؤلر کے طور پر کرایا اور جب اسے یقین ہوگیا کہ میں سوزن ہی بول رہی ہوں تو اس نے انتہائی سنجیدہ اور گمبھیر لہجے میں کہا۔ "شیرف نیل پارس نے میری ڈیوٹی لگائی ہے کہ کل تم نے جو کچھ ڈربی کے گھر میں دیکھا، اس کے بارے میں کچھ سوالات کروں۔ میری درخواست ہے کہ تم اپنی جگہ پر رہو اور اس وقت تک کسی سے کوئی بات نہ کرو جب تک میں تم سے نہ مل لوں۔ میں راستے میں ہوں اور ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔"

میں نے اسے یقین دلایا کہ اس کی بات سمجھ گئی ہوں۔ اس کے بعد ریسیور رکھا اور ڈیوی سے باتوں میں مصروف ہوگئی۔ میں نے اسے تفصیل سے سب کچھ بتادیا تاکہ ضرورت پڑنے پر وہ میری مدد کرسکے۔

میں نے ویلس سے کہہ دیا کہ وہ ہماری غیر موجودگی میں دکان سنبھال لے۔ وہ ہمارے پاس پارٹ ٹائم کام کرتا تھا۔ میرے ذہن میں کئی سوالات جنم لے رہے تھے لیکن جب فاؤلر آیا تو اس نے مجھے بولنے کا موقع ہی نہ دیا اور سوالات کی بوچھاڑ کردی۔ میں نے جہاں تک ممکن ہوسکا، اس کے سوالات کے مختصر مگر جامع جواب دیے اور وہ فہرست اٹھا کر پڑھنے لگی جو فون کے ساتھ رکھی تھی۔ اس پر ان تمام البمز کی تفصیل درج تھی جو دو روز پہلے ڈربی نے مجھے دینے کے لیے کہا تھا۔

"جہاں تک قیمت کا تعلق ہے تو ان ریکارڈز کے زیادہ سے زیادہ پندرہ سو ڈالرز مل جائیں گے۔ البتہ میں زیادہ قیمت حاصل کرسکتی ہوں کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ کون لوگ ان کی تلاش میں ہیں۔"

فاؤلر جوان اور خوب صورت شخص تھا تاہم اس نے پوری گفتگو کے دوران اپنا پیشہ ورانہ انداز برقرار رکھا اور اپنی چھوٹی سی نوٹ بک میں تمام باتیں لکھتا رہا۔ میں نے اسے بتادیا تھا کہ ڈیوی میرے مشیر کے طور پر موجود رہے گا۔ میں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ وکیل ہے لیکن اگر فاؤلر کوئی نتیجہ اخذ کرتا تو میں ڈیوی کی مدد لے سکتی تھی۔ حالانکہ میں جانتی تھی کہ اس کے پاس قانون کی ڈگری ہے۔ جیسے جیسے مجھے اس کے ماضی کے بارے میں معلومات ملتی گئیں تو میری حیرانی بڑھتی گئی۔

مجھے اس بات پر فخر ہے کہ ہنگامی حالت میں بھی پُرسکون رہتی ہوں لیکن اس وقت میں نے فاؤلر سے سوالات کرتے ہوئے اپنی آواز میں واضح ارتعاش محسوس کیا۔ فاؤلر میری پریشانی بھانپ گیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ "فی الحال حالات ڈربی کے حق میں نہیں ہیں لیکن میں نہیں سمجھتا کہ حقیقی ثبوت ملنے کے بعد اس پر الزام ثابت ہوسکے گا۔ گوکہ یہ سچ ہے کہ رونالڈ اس کے مہمان خانے میں مردہ پایا گیا اور ڈربی بھی اسی کمرے میں بے ہوش پڑا ہوا تھا اور ممکن ہے کہ ڈربی کی انگلیوں کے نشانات اس پیالے پر موجود ہوں جسے کسی نے رونالڈ کے سر پر ضرب لگانے کے لیے استعمال کیا تھا۔ ابھی ان سب باتوں کی وضاحت ہونا باقی ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ ڈربی ایسا آدمی نہیں ہے۔ میں نے اس کے بارے میں جو رائے قائم کی ہے، بہتر ہوگا کہ تم شیرف کے سامنے اس کا تذکرہ نہ کرو۔ وہ پہلے ہی یہ سمجھ رہا ہے کہ میں اس معاملے میں نرمی برت رہا ہوں۔"

"کیا تم ڈربی کے دوست ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، میں ایسا ہی سمجھتا ہوں۔" اس نے کہا۔ "میں اسے اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ اس علاقے میں آیا تھا۔ میں کبھی کبھی اس کے گھر جاکر گانے سنا کرتا تھا۔ اس نے میرے ہاتھ کئی ریکارڈ فروخت کیے۔ اس طرح میرے پاس بھی ایک چھوٹا موٹا ذخیرہ جمع ہوگیا۔ گوکہ میں تم دونوں کی برابری نہیں کرسکتا لیکن پھر بھی میرے پاس کچھ اچھے ریکارڈز ہیں۔" پھر وہ میری طرف جھکتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔ "تم مجھے صرف جیری کہہ کر بھی بلاسکتی ہو لیکن یہ بات بھی شیرف کو نہیں بتانا۔"

"ٹھیک ہے۔ نہیں بتاؤں گی۔" میں اپنی ہنسی روکنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "کیا اس پر فردِ جرم عائد کردی گئی ہے؟"

"شاید لیکن وہ اسے غیر ارادی قتل قرار دے رہے ہیں جس میں جذبات کی گرمی شامل تھی۔ اس کی ضمانت ہوجائے گی اور یہ تو تم جانتی ہی ہو کہ ڈربی کے لیے پیسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اس لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

ڈیوی میرے پیچھے آکر کھڑا ہوگیا اور ہم دونوں فاؤلر کو جاتا ہوا دیکھتے رہے۔ ڈیوی اس کا مذاق اڑاتے ہوئے بولا۔ "مجھے لگتا ہے کہ یہ تم پر ریجھ گیا ہے جبھی کہہ رہا تھا کہ مجھے صرف جیری کہو۔"

"بکواس مت کرو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ایک شخص کا قتل ہوگیا ہے۔"

"یہ بات اس ڈپٹی کو سمجھاؤ۔" ڈیوی لفظوں کو چباتے ہوئے بولا۔ "اسے بھی یہی موقع ملا تھا تم سے عشق جھاڑنے کا۔"

"وہ تو نہیں، البتہ تم یہ فرض انجام دے رہے ہو۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔ سنا نہیں وہ کیا کہہ رہا تھا کہ ڈربی بے قصور ہے لیکن میں اس کی بات پر یقین نہیں کرسکتی۔ رونالڈ مرچکا ہے اور ڈربی جیل میں ہے۔ مجھے فوراً وہاں جانا ہوگا۔ کیا تم میری غیر موجودگی میں دکان سنبھال سکتے ہو؟"

"نہیں۔" ڈیوی نے کہا۔ "اگر ویلس یہاں رکنے پر تیار نہیں ہوا تو میں ٹریکر کو بلالوں گا۔ وہ بھی بھروسے کا آدمی ہے۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔ تم مجھے ڈپٹی ڈیوی سمجھ لینا لیکن صرف ڈیوی کہہ کر بھی بلاسکتی ہو۔" اس کے انداز پر میں مسکرادی۔

بیتھ کچن ٹیبل پر بیٹھی ٹشو پیپر سے بار بار چہرہ صاف کررہی تھی۔ مجھے یہ معلوم ہوچکا تھا کہ ڈربی حوالات میں ہے اور کل صبح اس پر فردِ جرم عائد کی جائے گی۔ نادیہ نے بتایا کہ جب تک اسے جیل نہیں بھیج دیا جاتا، کسی کو اس سے ملنے کی اجازت نہیں اور نہ ہی اسے فون کی سہولت حاصل ہے۔

ڈیوی قصبے کا چکر لگانے گیا تھا تاکہ لوگوں کے

تاثرات معلوم کرکے حالات کا جائزہ لے سکے۔ وہ اس معاملے میں بہت تیز تھا۔

میں نے شائستہ انداز میں نادیہ اور بیتھ سے پوچھا۔ "کیا ہوا تھا؟"

"میں نہیں جانتی۔" بیتھ بھرائی ہوئی آواز میں بولی اور ایک بار پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ "میں تو اتنا جانتی ہوں کہ ڈربی نے یہ قتل نہیں کیا۔ اس نے کبھی کسی کو تکلیف نہیں پہنچائی۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے اپنی آواز میں نرمی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ مجھے اس عورت پر ترس آرہا تھا۔ وہ خاصی پریشان نظر آرہی تھی۔ چھوٹی سی عمر میں ہی اسے یہ عذاب سہنا پڑ گیا تھا۔ جب ڈربی سے اس کی پہلی ملاقات ہوئی تو وہ کالج میں پڑھ رہی تھی۔ تین مہینے تک وہ ایک دوسرے سے ملتے رہے پھر انہوں نے شادی کرلی۔

نادیہ میرے لیے کافی لے کر آئی اور جب وہ اسے پیالیوں میں انڈیلنے لگی تو اس نے نادیہ کا ہاتھ پکڑلیا اور بولی۔ "کیا تم ہمارے ساتھ نہیں بیٹھ سکتیں؟"

نادیہ اپنا ہاتھ چھڑا کر پیچھے ہٹ گئی پھر بیتھ کے برابر میں بیٹھ کر اس کا ہاتھ سہلانے لگی۔

"تم نے ہی اسے سب سے پہلے دیکھا تھا۔" میں نادیہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

اس نے تائید میں سر ہلایا اور بولی۔ "اس روز میری آنکھ سورج نکلنے سے پہلے ہی کھل گئی تھی۔ لہٰذا میں نیچے آکر ناشتا تیار کرنے لگی۔ میرا خیال تھا کہ شاید ڈربی اور بیتھ ہال میں ہی ناشتا کرنا پسند کریں لہٰذا میں آتش دان میں آگ روشن کرنے چلی گئی۔ وہاں میں نے رونالڈ کو فرش پر بے ڈھنگے انداز میں لیٹا ہوا دیکھا۔ میں نے اس کے سر کے پچھلے حصے پر خون دیکھا اور سمجھ گئی کہ وہ مرچکا ہے۔ پھر میری نظر ڈربی پر گئی جو ایک کرسی میں دھنسا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن بند ہونے لگی اور میں سمجھی کہ وہ بھی مرچکا ہے۔ پھر مجھے اس کے کراہنے کی آواز آئی۔ کمرے میں شراب کی بُو پھیلی ہوئی تھی۔ پھر میری نظر میز پر گئی جہاں اسکاچ کی تقریباً خالی بوتل رکھی ہوئی نظر آئی۔ میں سمجھ گئی کہ وہ یہ بوتل رونالڈ کے لیے لایا ہوگا لیکن مجھے یقین نہیں آیا کہ اس نے خود بھی شراب پی ہوگی۔ شاید تمہیں معلوم نہ ہو کہ شراب اس کی صحت کے لیے نقصان دہ تھی اور وہ کئی برس پہلے اسے چھوڑ چکا تھا۔"

"ڈربی کیا کہتا ہے... کیا تم نے اس سے بات کی

تھی؟"

"ہاں۔" نادیہ نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس وقت وہ اپنے ہوش وحواس میں نہیں تھا۔ وہ بہکی بہکی باتیں کررہا تھا اور اس کا کہنا تھا کہ اسے گزشتہ روز کی کوئی بات یاد نہیں آرہی۔ میں نے فوراً شیرف کو فون کردیا۔ چند منٹ بعد ہی ایمبولینس آگئی اور وہ رونالڈ کی لاش کے ساتھ ڈربی کو بھی لے گئے۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ ڈربی کسی کو تکلیف نہیں پہنچا سکتا لیکن حقائق کو جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ اب میں صرف یہی دعا کرسکتی ہوں کہ سچ سامنے آجائے۔"

"جب یہ واقعہ پیش آیا، اس وقت تم دونوں کہاں تھیں؟" میں نے پوچھا۔

بیتھ جھجکتے ہوئے بولی۔ "میں اس وقت یہاں نہیں تھی۔" اس نے ایک اور ٹشو پیپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "میں کائل کو دیکھنے باہر گئی ہوئی تھی۔ بعض اوقات وہ پاگلوں جیسی حرکتیں کرنے لگتا ہے۔ اسی لیے میرے والدین نے اسے یہاں بھیجا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ کچھ دن سب سے الگ تھلگ رہ کر وہ سدھر جائے گا لیکن اس نے یہاں بھی دوست بنالیے۔ خاص طور پر تعمیراتی کمپنی کے ایک بندے سے اس کی اچھی خاصی دوستی ہوگئی ہے اور وہ اس کے ساتھ گھومتا پھرتا ہے۔ مجھے اس کی ہر وقت فکر لگی رہتی ہے۔ اس وقت بھی میں اسے کلبز اور بار میں ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔"

"کیا وہ تمہیں مل گیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، مجھے اس کو ایک بار سے نکال کر لانا پڑا۔ میں ان لوگوں پر ناراض بھی ہوئی کیونکہ وہ ابھی کم عمر ہے اور انہوں نے اسے کیسے اندر آنے دیا۔ کائل مجھ سے ناراض ہے کہ میں نے سب کے سامنے اس کی بے عزتی کیوں کی۔ لیکن اس وقت میں اس بارے میں نہیں سوچ رہی۔"

"تم کائل کو لے کر کس وقت واپس آئی تھیں؟"

"میرا خیال ہے کہ رات دو بجے کا وقت ہوگا۔ اس وقت بھی کمرے سے موسیقی کی آواز آرہی تھی۔" وہ نادیہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "لگتا تھا وہ دونوں دیر تک جاگتے رہے تھے۔"

"صرف وہی نہیں، مجھے بھی صبح اس لیے جلدی اٹھنا پڑا تاکہ کمرے کی صفائی کرسکوں۔" نادیہ کاؤنٹر پر سے برتن اٹھاتے ہوئے بولی۔ "تم بھی اپنے بھائی سے کہہ دو کہ وہ اپنے کمرے میں گلاس نہ رکھا کرے۔ ڈربی کے پسندیدہ سیٹ میں سے ایک گلاس کم ہے۔"

"میں اسے سمجھادوں گی۔" بیتھ نے کہا۔

ایک گھنٹے بعد شیرف نیل پائرس اپنے نائب جیری فاؤلر کے ساتھ آگیا۔ وہ پہلے ہی میری دکان پر فون کرکے معلوم کرچکا تھا کہ میں ڈربی کے گھر میں ہوں۔ وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوتے ہوئے بولا۔

"یہ بھی اچھا ہوا کہ تم یہاں موجود ہو ورنہ مجھے فاؤلر کو تمہیں لانے کے لیے بھیجنا پڑتا۔"

فاؤلر نے میری طرف دیکھ کر تعظیماً سرخم کیا لیکن جیسے ہی شیرف کی توجہ دوسری جانب ہوئی، اس نے میری جانب ایک بھرپور مسکراہٹ اچھال دی اور مجھے یہ جان کر سکون محسوس ہوا کہ قانون نافذ کرنے والوں میں بھی ڈربی کا ایک ہمدرد موجود ہے۔

"میں چاہوں گا کہ تم سب میرے ساتھ باری باری جائے واردات تک چلو۔"

اس کی بات سن کر مجھے جھرجھری آگئی جبکہ بیتھ پہلے ہی خوف زدہ تھی۔ شیرف نے نادیہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "مس نادیہ! سب سے پہلے تم ہمارے ساتھ چلوگی کیونکہ تم اس گھر کے چپے چپے سے واقف ہو اور تم ہی سب سے پہلے جائے وقوعہ پر پہنچی تھیں۔"

جب وہ دونوں چلے گئے تو جیری بولا۔ "ڈربی کی حالت پہلے سے بہتر ہے۔ گوکہ وہ پریشان ہے لیکن اس کا ذہن کام کررہا ہے۔ اس نے میرے ذریعے تمہیں پیغام بھجوایا ہے کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، وہ جلد ہی گھر واپس آجائے گا۔"

جب میری اندر جانے کی باری آئی تو شیرف نے مجھے پلاسٹک کے کور دیے تاکہ انہیں اپنے جوتوں پر چڑھالوں۔ اس نے سختی سے تاکید کی کہ میں اپنے دونوں ہاتھ جینز کی جیبوں میں رکھوں تاکہ کسی چیز کو چھونے کا احتمال باقی نہ رہے۔ میں اس شخص سے نفرت کرنا چاہ رہی تھی لیکن وہ کسی انکل کی طرح مہربان نظر آرہا تھا۔ اس نے کہا۔

"میں جانتا ہوں کہ تم ڈربی کی دوست ہو اور اس کی مدد کرنا چاہ رہی ہو۔ تم میرے سوالوں کے جواب ایمان داری سے دینا، ممکن ہے کچھ ایسے حقائق سامنے آجائیں جن سے اس کی بے گناہی ثابت ہوسکے۔"

ہال کے فرش پر چاک سے اس جگہ کے گرد دائرہ کھینچ دیا گیا تھا جہاں رونالڈ کی لاش ملی تھی۔ مجھے بہت زور کی ابکائی آنے لگی لیکن شیرف وہاں رکا نہیں بلکہ مجھے لے کر ڈربی کے ریکارڈ روم کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے ایک نظر وہاں کا جائزہ لیا اور بولی۔ "میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکوں گی کیونکہ پہلے یہاں کبھی نہیں آئی۔"

"کبھی نہیں؟" اس نے بے یقینی کے انداز میں کہا۔

"ہاں کیونکہ یہ اس کا ذاتی کمرا تھا اور وہ یہاں کسی کو نہیں آنے دیتا تھا۔"

شیرف نے میرا بازو پکڑا اور فرش پر پڑے ہوئے ریکارڈز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "کیا یہ وہی ریکارڈز ہیں جن کی فہرست تم نے کل فاؤلر کو دی تھی؟ مجھے لگتا ہے کہ یہی ریکارڈز تنازع کا سبب بنے۔"

اس نے ایک ایک کرکے وہ ریکارڈ مجھے پکڑانا شروع کیے اور بولا۔ "ممکن ہے کہ تمہارے جانے کے بعد معاملہ بگڑ گیا ہو اور یہ ریکارڈز یہیں رکھے رہ گئے ہوں۔"

"مجھے لگتا ہے کہ یہ اصلی ریکارڈز نہیں ہیں۔" میں نے ایک البم کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا۔ "ڈربی اسی وقت کوئی البم فروخت کیا کرتا تھا جب اس کے پاس اس کی بہتر حالت میں دوسری کاپی ہو۔ میرا خیال ہے کہ اس نے پہلے سے یہ ریکارڈز نکال کر رکھ لیے تھے اور یہ اصل نہیں بلکہ ڈپلیکیٹ ہیں.... تم نے ہال میں اور ریکارڈز تو نہیں دیکھے؟"

شیرف نے میری بات کا جواب نہیں دیا اور الماری میں سے مختلف ریکارڈ نکال کر دیکھنے لگا۔

"گویا تم یہ بتانا چاہ رہی ہو کہ یہ وہ نادر ونایاب البم نہیں ہیں جن کی تلاش میں لوگ مارے مارے پھرتے ہیں؟"

"ہاں کیونکہ ہر البم ذخیرہ کرنے کے قابل نہیں ہوتی۔"

ہال میں واپس آنے کے بعد میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں لیکن مجھے وہ ریکارڈز کہیں نظر نہ آئے جو اس واقعے کی بنیاد تھے۔ شیرف نے مجھ سے مزید کچھ سوالات کیے اور اندازہ ہوگیا کہ وہ ایمان داری سے واقعات کی کڑیاں ملانے کی کوشش کررہا ہے۔ آخر میں اس نے پوچھا کہ کیا مجھے کوئی غیر معمولی بات نظر آئی؟

"ہاں۔" میں نے میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ڈربی کبھی اس طرح ریکارڈز نہیں رکھا کرتا تھا۔"

"کیا تمہارے خیال میں یہ کام رونالڈ کا ہے؟"

"اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی کیونکہ میں اسے زیادہ نہیں جانتی تھی۔"

☆☆☆

بیتھ کا اصرار تھا کہ میں اس کے گھر میں ہی قیام کروں۔ وہ مجھے مہمانوں کے حصے میں ایک بڑے ہال کی جانب لے گئی اور مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرانی ہوئی کہ یہ مکان

کتنا پھیل چکا تھا۔ بیتھ، ڈربی اور نادیہ کے کمرے مخالف سمت میں تھے اور اگر رات میں کوئی شخص یہاں آیا ہو تو انہیں اس کے آنے کا پتا بھی نہ چلا ہوگا۔ اس کے جانے کے بعد ڈیوی نے مجھے اپنی کارگزاری بیان کرنا شروع کی۔

"رونالڈ کے بارے میں عام تاثر یہی ہے کہ وہ ایک اچھا انسان تھا لیکن اس میں ایک خامی تھی کہ غلط وقت پر غلط بات کہہ جاتا تھا اور اسے خوامخواہ لوگوں سے الجھنے کی عادت تھی۔"

"لوگوں کی اس واقعے کے بارے میں کیا رائے ہے؟"

"اس سے پہلے بھی ڈربی اور رونالڈ کے درمیان چھوٹے موٹے تنازعات ہوتے رہے ہیں۔ اس لیے لوگ ڈربی کو ہی اس کا ذمے دار سمجھ رہے ہیں۔"

یہ سن کر میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ میں نے ڈیوی کو بیتھ، نادیہ اور شیرف کے ساتھ ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا۔ ڈیوی اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے بولا۔

"اس کی موت گزشتہ شب نو اور گیارہ کے درمیان ہوئی تھی۔"

میں سوالیہ انداز میں اس کی جانب دیکھنے لگی۔

"ہمیں یہ جاننا ہوگا کہ اس وقت بیتھ اور نادیہ کیا کررہی تھیں؟"

"تم پاگل تو نہیں ہوگئے۔ وہ بھلا رونالڈ کو کیسے نقصان پہنچا سکتی ہیں؟ بیتھ بڑی مہربان اور محبت کرنے والی عورت ہے۔ وہ تو ایک مکھی بھی نہیں مارسکتی اور یہی حال نادیہ کا بھی ہے۔"

"اور اگر سوال ڈربی کو بچانے کا ہو تو؟"

"کیا مطلب؟"

"اس کہانی میں اب بھی کئی جھول ہیں۔" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

"میں سوچ رہی ہوں کہ کائل کس وقت باہر گیا ہوگا؟"

"دس بجنے میں دس منٹ پر وہ مرکزی سڑک پر کھڑا نیٹ نامی شخص کا انتظار کررہا تھا جو تعمیراتی کمپنی میں کام کرتا ہے۔"

"واہ.... تم نے تو اچھی خاصی معلومات حاصل کرلیں۔" میں نے تحسین آمیز انداز میں کہا۔

"کائل نے اسے کچھ چیزیں دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن

نہیں دے سکا۔ البتہ اس نے نیٹ کو یقین دلایا کہ اگلی مرتبہ وہ یہ سامان ضرور لے کر آئے گا۔"

"نیٹ نے تمہیں یہ سب باتیں کیسے بتا دیں؟" میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"میں کسی سے کچھ بھی اگلوا سکتا ہوں۔" وہ سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔ "میں نے اسے یہ تاثر دیا کہ میرا تعلق ایک خفیہ ایجنسی سے ہے۔"

یہ کہہ کر ڈیوی نے جیب سے ایک کارڈ نکال کر لہرایا۔ دور سے دیکھنے پر وہ اسٹیٹ بیورو آف انویسٹی گیشن کا شناختی کارڈ لگتا تھا لیکن اگر نیٹ اسے قریب سے دیکھنے کی کوشش کرتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ وہ کارڈ جعلی ہے۔

"اس جعلی کارڈ کی وجہ سے تم کسی روز مشکل میں پڑ سکتے ہو۔" میں نے اسے ڈرایا۔

"اب تک تو ایسا نہیں ہوا لیکن مجھے لگتا ہے کہ اس نے سب کچھ سچ نہیں بتایا۔"

"تمہارے خیال میں وہ کیسا آدمی ہے؟ کیا وہ کوئی گڑبڑ کر سکتا ہے؟"

"یہ صلاحیت تو تھوڑی بہت ہر شخص میں ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ بھی اپنے بارے میں خوش فہمی کا شکار ہو کہ وہ کسی کو بھی تشدد کا نشانہ بنا سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ پکڑے جانے سے ڈرتا ہو۔"

"کیا تمہیں اندازہ ہے کہ کائل اس کے لیے کیا چیزیں لے کر آنے والا تھا؟ ممکن ہے کہ وہ البمز ہی ہوں۔ شیرف نے تو مجھے نہیں بتایا لیکن میرا خیال ہے کہ کچھ البمز غائب ہیں۔"

"نیٹ نہیں جانتا کہ کائل اس کے لیے کیا چیزیں چرانے والا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ یہ کام کسی اور شخص کا ہے اور اس کے پاس اس کی کوئی وجہ بھی ہوگی۔ کیا ہم یہ جان سکتے ہیں کہ متعلقہ افراد اس وقت کہاں تھے جب یہ واقعہ پیش آیا؟"

"ٹیڈ کا کہنا ہے کہ وہ گھر میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا جبکہ جان ڈیوس نے اپنے بارے میں بتانے سے صاف انکار کر دیا کہ وہ اس وقت کہاں تھا۔ نیٹ کا کہنا ہے کہ وہ دس بجے کے قریب کائل کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ نادیہ اور بیتھ کے بارے میں تم جان ہی چکی ہو۔ اب ڈربی کے علاوہ کون بچا؟"

"کائل کے بارے میں یہ سب باتیں شیرف کے علم میں ہونی چاہئیں۔ مجھے امید ہے کہ رونالڈ کے قتل سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوگا لیکن جیسا کہ شرف نے کہا ہمیں تمام حقائق پر نظر رکھنا ہوگی۔"

دوسری صبح میں گھر سے باہر نکل کر فون کرنے کے لیے درختوں کی قطار کے ساتھ کافی دور تک چلی گئی کیونکہ میں نہیں چاہتی تھی کہ کوئی ہماری باتیں سن سکے۔ جب میں نے شیرف کو کائل اور نیٹ کے بارے میں بتایا تو وہ بولا۔ "میں نہیں سمجھتا کہ تم سے یہ پوچھنا عقل مندی ہوگی کہ تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟"

"میں تمہیں صرف معلومات دے رہی ہوں کیونکہ تم نے ہی کہا تھا کہ ہمیں حقائق تک پہنچنا ہوگا۔"

"اس کے لیے میں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ "لیکن بہتر ہوگا کہ تم اور تمہارا دوست ڈیوی مجھے اپنے طور پر تحقیقات کرنے دیں۔ اس کاؤنٹی میں ہونے والی کوئی بات مجھ سے چھپی نہیں رہتی۔ جلد یا بدیر سب معلوم ہو جاتا ہے۔"

میں نے اس سے وعدہ کر لیا کہ ہم اس معاملے سے الگ رہیں گے جبکہ میں اور ڈیوی گزشتہ شب ہی منصوبہ بنا چکے تھے کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے۔ اس کے مطابق جیسے ہی ڈربی کی ضمانت کے لیے گھر سے باہر جاتی تو میں کائل کو گھیر کر اس سے مزید کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتی۔ مجھے پورا اعتماد تھا کہ اس لڑکے کو بولنے پر آمادہ کر لوں گی لیکن میرا خیال غلط ثابت ہوا۔ ابھی میں نے اس سے کچھ پوچھنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ وہ بھڑک اٹھا۔ اس نے مجھے کمرے سے نکل جانے کا حکم دیا اور زور سے دروازہ بند کر دیا۔

اسی وقت میری نظر بیرونی دروازے پر گئی اور مجھے جیری اندر آتا دکھائی دیا۔ میں نے اسے راہداری کے وسط میں ہی روک لیا اور بولی۔ "میں سمجھ سکتی ہوں کہ شیرف نے تمہیں کائل کے بارے میں بتا دیا ہے۔"

"ہاں۔" اس نے کہا۔ "میں اسی سے کچھ سوالات کرنے آیا ہوں۔ کیا اس نے تمہیں کچھ بتایا؟"

"نہیں۔"

"ممکن ہے کہ میں اس سے کچھ معلوم کرنے میں کامیاب ہو سکوں۔" اس نے کہا۔ "مجھے اس طرح کے آوارہ لڑکوں سے نمٹنا آتا ہے کیونکہ میں خود بھی ماضی میں ایسا ہی تھا۔"

"میں صرف اتنا ہی جانتی ہوں کہ وہ کچھ چرانے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ ممکن ہے کہ اس کی نظریں ان البمز پر ہوں جو ڈربی، رونالڈ کو دینے والا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ

خاصے قیمتی ریکارڈز ہیں۔"

"میں کوشش کرتا ہوں، شاید اس طرح ہم ڈربی کو بچانے میں کامیاب ہو جائیں۔"

میں دوپہر کے وقت ٹہلتی ہوئی کچن میں گئی تو میں نے کھڑکی میں سے ڈیوی کو جان ڈیوس سے باتیں کرتے دیکھا جو دو آدمیوں کے ہمراہ تعمیراتی کام کروا رہا تھا اور میں سوچنے لگی کہ رونالڈ کے بعد اس کی کمپنی کا مستقبل کیا ہوگا۔

بیتھ میز پر بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ میں اس کے پاس بیٹھ کر دلاسا دینے لگی۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"پہلے ڈربی مجھ سے جدا ہوا۔ اب یہ لوگ کائل کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ تمہیں معلوم ہے، وہ ڈپٹی اس سے پوچھ گچھ کرنے آیا تھا۔ کائل نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ اس کا کہنا ہے کہ اس نے کوئی ناگوار کام کیا ہے لیکن وہ مجھے نہیں بتائے گا۔ اس نے اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیا ہے۔"

میں نے اپنے پیٹ میں مروڑ محسوس کی۔ میں ڈربی کو آزاد کرانا چاہتی تھی لیکن اس کے لیے کائل کی قربانی دینا گوارا نہیں تھا۔ اگر وہ کسی ایسی کارروائی میں شامل تھا جس کا تعلق رونالڈ کے قتل سے ہوتا تو ایسی صورت میں اس کا خاندان تباہ ہو سکتا تھا۔

"بیتھ۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "اپنے آپ کو سنبھالو۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

بیتھ نے اپنے دونوں ہاتھ میز پر رکھے اور بولی۔ "ہر کوئی یہی کہہ رہا ہے۔ میں کیسے پریشان نہ ہوں۔ میں کوئی دودھ پیتی بچی نہیں ہوں جو ایسی باتوں سے بہل جاؤں گی۔ میں خوف کے گڑھے میں اترتی جا رہی ہوں۔ کم از کم مجھے رونے کے حق سے تو محروم نہ کرو۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ تمہیں رونے کا پورا حق ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا اور وہاں سے اٹھ گئی۔

رات ہونے والی تھی جب ڈیوی میرے پاس آیا اور اپنا سیل فون مجھے دیتے ہوئے بولا۔ "تمہارے انکل شیرف بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"کیونکہ تم نے اس کیس میں ہماری بہت مدد کی ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم اور ڈیوی بھی اس شخص سے مل لو جسے ہم نے شبے میں گرفتار کیا ہے۔"

جب ہم پولیس اسٹیشن پہنچے تو یہ جان کر میرے پورے بدن میں سنسنی پھیل گئی کہ ڈربی کو بے گناہ قرار دے دیا گیا ہے اور اس کی رہائی کے لیے ضروری کارروائی کی جا رہی ہے۔ لیکن اس کے بعد جو کچھ ہونے والا تھا، وہ بھی کافی سنسنی خیز تھا۔

دروازہ کھلا اور جیری دوسرے دو پولیس آفیسرز کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے مجھے دیکھ کر سر ہلایا لیکن اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔ وہ چلّاتے ہوئے بولا۔

"یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے۔ تم پاگل ہو گئی ہو۔ تم نے مجھ پر کیوں الزام لگایا؟"

"گولڈ ریکارڈ۔" میں نے کہا۔ "یہ اس فہرست میں شامل نہیں تھا جو میں نے تمہیں دی تھی اور اس وقت ہم تینوں ہی وہاں موجود تھے جب ڈربی نے اسے رونالڈ کو دیا تھا۔ رونالڈ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ ڈربی کو اس دن کی کوئی بات یاد نہیں آ رہی اور میں خود بھی اسے بھول چکی تھی۔ اسی لیے میں نے تمہارے یا شیرف کے سامنے اس کا ذکر نہیں کیا۔"

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ "اس سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ ڈربی اور میں اکثر ایک دوسرے کے ریکارڈ سنا کرتے تھے لہٰذا انگلیوں کے نشانات سے کچھ معلوم نہیں ہوگا۔ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔"

اس کے جانے کے بعد شیرف بولا۔ "مجھے کبھی ایسے ڈپٹی سے واسطہ نہیں پڑا۔ ہمیں یہ البمز اس کے گھر سے ملیں اور اس نے انہیں چھپانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ البتہ اس کا کہنا صحیح ہے کہ ہم انہیں ڈربی کی ملکیت ثابت نہیں کر سکتے۔ کوئی بھی اچھا وکیل اسے اس الزام سے بری کروا سکتا ہے۔"

میں مسکراتے ہوئے بولی۔ "اب میں تمہیں ایک راز کی بات بتاتی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ڈربی اس پر ناراض نہیں ہوگا۔ وہ ہر ریکارڈ کے گرد پوش کے اندر ایک نوٹ چسپاں کر دیا کرتا تھا جس پر درج ہوتا تھا کہ اس نے یہ ریکارڈ کب اور کہاں سے حاصل کیا۔ آپ اس بارے میں اس وقت تک نہیں جان سکتے جب تک اسے تلاش نہ کرنا چاہیں۔ عام طور پر وہ ریکارڈ فروخت کرتے وقت انہیں نکال لیتا تھا لیکن وہ یہ ریکارڈ مجھے فروخت کر رہا تھا اور جانتا تھا کہ مجھے ان معلومات سے دلچسپی ہو سکتی ہے۔ میں شرطیہ کہہ سکتی ہوں کہ یہ نوٹ اب بھی موجود ہوں گے۔"

"یہ جان کر خوشی ہوئی۔" شیرف مسکراتے ہوئے بولا۔

"کیا تم ہمیں اس بارے میں تفصیل سے بتا سکتے ہو؟" ڈیوی نے کہا۔

شیرف نے ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ "ڈربی کو جب ہم نے گرفتار کیا تو وہ عجیب و غریب حرکتیں کر رہا تھا جیسے نشے کی حالت میں ہو جبکہ بیتھ کا کہنا تھا کہ اس نے شراب نہیں

پی رکھی تھی۔ اس کا اصرار تھا کہ... ڈربی کا طبی معائنہ کرایا جائے کیونکہ اسے شبہ تھا کہ ڈربی ایسی دوا کے زیرِ اثر ہے جس سے یادداشت متاثر ہوتی ہے۔ اس کی ایک سہیلی کو بھی کسی پارٹی میں یہ دوا دی گئی تھی اور دوسرے روز وہ ڈربی کی طرح سب کچھ بھول چکی تھی۔"

"میں اب بھی کچھ نہیں سمجھی۔" میں نے بے چین ہوتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں شروع سے بتاتا ہوں۔" شیرف نے کہا۔ "اس رات غالباً فاؤلر کی ملاقات ٹیڈ سے ہوئی جس نے اسے ڈربی اور رونالڈ کے درمیان ہونے والے سودے کے بارے میں بتایا۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ بھی وہاں جاکر دیکھے گا کہ ان دونوں کے درمیان کیا کچھ طے پارہا ہے کیونکہ اسے خود بھی نایاب البمز سے دلچسپی ہے۔ اس کے علاوہ وہ بڑے لوگوں کے درمیان اٹھنے بیٹھنے کا بھی شوقین ہے۔ وہ پہلے ایک ایسے بار میں گیا جہاں غیر قانونی نشہ آور ادویات ملتی ہیں۔ اس نے وہاں سے جی ایچ بی کا ایک وائل خریدا۔ ٹیلی فون ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈربی اس وقت اپنے کسی کاروباری دوست سے فون پر گفتگو کررہا تھا۔ جب فاؤلر وہاں پہنچا تو وہ اسے رونالڈ کے پاس چھوڑ کر ٹیلی فون سننے اپنے دفتر میں چلا گیا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ ان دونوں کے درمیان کیا گفتگو ہوئی لیکن کسی بات پر بحث ضرور ہوئی ہو گی۔ اسی لیے فاؤلر کے ہاتھ میں جو چیز آئی، وہ اس نے رونالڈ کے سر پر ماردی۔ مجھے یقین ہے کہ اس کا ارادہ اسے قتل کرنے کا نہیں تھا۔ وہ بے ضرر انسان ہے لیکن اس کی نیت خواہ کچھ بھی ہو، رونالڈ اس ضرب کی تاب نہ لاسکا اور اس کی موت واقع ہوگئی۔"

"پھر وہ ڈربی کو وہاں تک کیسے لے کر آیا؟" ڈیوی نے پوچھا۔

"ڈربی کے آنے سے پہلے وہ رونالڈ کی لاش کو گھسیٹ کر ریکارڈ روم میں لے گیا۔ جب ڈربی ہال میں واپس آیا تو رونالڈ کو وہاں نہ دیکھ کر یہی سمجھا کہ وہ باتھ روم میں ہوگا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا جوس کا گلاس میز پر رکھا اور رونالڈ کو دیکھنے باہر چلا گیا اسی وقت فاؤلر نے جلدی سے دوا کے کچھ قطرے گلاس میں ٹپکا دیے اور چھپ کر ڈربی کا انتظار کرنے لگا۔ ڈربی نے واپس آکر جوس کے چند گھونٹ لیے اور فوراً ہی بے ہوش ہوگیا۔ فاؤلر نے ہوشیاری یہ دکھائی کہ وہ گلاس اپنے ساتھ ہی لے گیا لیکن اسے ضائع کرنا بھول گیا۔ ہم نے وہ گلاس اس کے گھر سے برآمد کرکے معائنے کے لیے بھیج دیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ دوبارہ رونالڈ کی لاش کو گھسیٹ کر ہال میں لایا اور ریکارڈ کا ایک ڈھیر گراموفون ٹیبل پر رکھ دیا جس سے ظاہر ہو کہ وہ دونوں آخری وقت تک موسیقی سنتے رہے۔ اس کے ساتھ ہی بہت زیادہ شراب نوشی بھی کرتے رہے اور جاتے جاتے اپنے ساتھ وہ ریکارڈ بھی لے گیا۔"

سب کچھ واضح ہو چکا تھا لیکن مجھے ابھی تک یہ گرید ہوئی تھی کہ کائل کیا چیز چرانے والا تھا۔ یہ معما اس وقت حل ہوا جب ہم ڈربی کی واپسی کا جشن منارہے تھے۔ تب بیتھ نے مجھے ایک طرف لے جاکر بتایا کہ کائل نے بالآخر اعتراف کر لیا ہے۔ وہ اس کے کچھ قیمتی زیورات چرانا چاہ رہا تھا جو ڈربی نے اسے دیے تھے لیکن اسے یہ موقع نہیں مل سکا۔

واپسی کے سفر میں ہم دونوں خاموش رہے، تب ڈیوی سے نہ رہا گیا اور وہ بول پڑا۔ "ہم چالیس میل کا فاصلہ طے کرچکے ہیں لیکن تم نے اس دوران ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ خیریت تو ہے؟"

"ہاں۔" میں نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ "میں اسی واقعے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ مجھے رونالڈ کے مرنے کا بہت افسوس ہے۔ یقین نہیں آرہا کہ فاؤلر نے کس طرح مجھے بے وقوف بنایا اور میں اس کی مسکراہٹ پر فدا ہونے لگی۔"

"اگر تم اس کے حسن سے متاثر نہ ہوتیں تو شاید میں بھی رقابت محسوس نہ کرتا اور اسے نظر انداز کردیتا لیکن جب میں نے اس کا رجحان تمہاری طرف دیکھا تو برداشت نہ کر سکا اور اس کی اصلیت جاننے کی کھوج میں لگ گیا۔"

"اس کے لیے ہمیں بیتھ کا بھی شکر گزار ہونا چاہیے اگر وہ ڈربی کے طبی معائنے پر اصرار نہ کرتی تو اصل حقیقت بھی سامنے نہ آتی۔ میں نے اسے سمجھنے میں غلطی کی۔"

"اسے سمجھنے کے لیے تمہارے پاس بہت وقت ہے۔" ڈیوی شرارت آمیز مسکراہٹ سے بولا۔ "ڈربی نے اگلے ہفتے ہمیں پارٹی میں بلایا ہے جہاں ہم سب جمع ہو کر رونالڈ کی یاد میں اچھی اچھی دھنیں سنیں گے۔"

"خیال تو اچھا ہے۔" میں مسکراتے ہوئے بولی۔ "لیکن فاؤلر جیسے رقیب کی عدم موجودگی میں تمہارے پاس کرنے کے لیے کچھ نہ ہوگا۔" یہ کہہ کر میں آسمان کی طرف دیکھنے لگی۔ موسمِ خزاں کا چاند گلابی کے بجائے سنہری رنگت اختیار کرچکا تھا۔

☆

امیمہ سلیم

زہریلا تریاق

اقدار کی پابندی اور احکامات کی پاسداری کا خیال رکھنے والے کبھی اپنے اصولوں پر سمجھوتا نہیں کرتے... گزشتہ نشیب و فراز... نارسائیاں... ناتجربہ کاریاں... اپنی غلطیاں اور فتح مندیاں آن واحد میں سب کچھ بدل کے رکھ دیتی ہیں... شاندار ماضی اور تابناک مستقبل کے خواب اس کی زندگی کا حاصل تھے... اسی سرمستی اور جوش ولولے سے سرشار وہ فتح کے گھوڑے پر سرپٹ دوڑ رہا تھا کہ اچانک ایک ٹھوکر لگی اور وہ زمین بوس ہوگیا...

دشمنوں کے نرغے میں آجانے والے ایک سرفروش کی نہ ختم ہونے والی جدوجہد کا تیز رفتار احوال...

میجر تیمور کا کورٹ مارشل کر دیا گیا تھا... یہ خبر اس کے لیے کسی سانحے سے کم نہیں تھی۔ اس وقت وہ شدید جذباتی ہیجان کا شکار تھا...

میجر تیمور کا تعلق ایک ایسے گھرانے سے تھا جس کا پیشہ کئی پشت سے سپاہ گری تھا۔ اس کے پردادا نے پہلی جنگِ عظیم میں اپنی بہادری کے صلے میں وکٹوریہ کراس حاصل کیا تھا۔ اس وقت تک ان کا گھرانا معمولی سا ایک زمیندار گھرانا تھا۔ تیمور کے پردادا رسالدار علیم الدین

خان کو وکٹوریہ کراس ملا تو اس گھرانے کی قسمت ہی بدل گئی۔ رسالدار علیم الدین کو وکٹوریہ کراس کے ساتھ بے شمار مراعات بھی ملی تھیں۔

علیم الدین کے بیٹے کریم الدین خان یعنی تیمور کے دادا نے بھی دوسری جنگِ عظیم میں کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ انہیں وکٹوریہ کراس تو نہیں لیکن ملٹری کراس ضرور ملا۔ ملٹری کراس بھی برطانوی فوج کا بہت بڑا اعزاز ہے۔ اس کے نتیجے میں اس خاندان کو تاجِ حکومت برطانیہ کی طرف سے مزید زمینیں اور مراعات دی گئیں۔ یوں اس گھرانے کا شمار جہلم کے بڑے زمینداروں میں ہونے لگا۔

اس وقت تک انگریزوں نے مقامی لوگوں کو اس پابندی سے بھی مستثنیٰ قرار دے دیا تھا جس کے تحت کوئی مقامی شخص آرمی میں افسر نہیں ہوسکتا تھا۔ میجر تیمور کے والد منظور خان نے قیامِ پاکستان کے بعد فوج میں کمیشن حاصل کیا اور 65ء اور 71ء کی جنگ میں بہادری کے جوہر دکھائے ان دونوں جنگوں میں بہادری کے جوہر دکھانے پر انہیں ستارۂ جرأت سے نوازا گیا۔

تیمور چار بھائیوں اور تین بہنوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ اس نے ہوش سنبھالا تو گھر میں ہر طرف فوجی وردیاں دیکھیں اور جنگوں کے قصے ہی سنے۔ اس کے دو بڑے بھائی بھی اپنی خاندانی روایات پر عمل کرتے ہوئے آرمی میں کمیشن حاصل کر چکے تھے اور اس وقت کیپٹن تھے جب تیمور صرف چوتھی جماعت کا طالب علم تھا۔ اپنے سپاہ گر خاندان کی طرح اسے بھی بچپن ہی سے فوج میں جانے کا شوق تھا۔

جو خاندان کئی پشتوں سے پیشۂ سپاہ گری سے وابستہ ہو، جس نے برطانوی فوج کا اعلیٰ ترین اعزاز وکٹوریہ کراس اور اپنے ملک کے اعلیٰ اعزازات حاصل کیے ہوں، اس کی وفاداری پر کون شک کرسکتا ہے لیکن چند حاسد افسران کی سازش نے تیمور کے لیے ایسے حالات پیدا کردیے کہ اس کی وفاداری مشکوک ہوچکی تھی۔

ایک ہفتے بعد میجر تیمور کے فیصلے کی توثیق کے لیے پھر فوجی عدالت بلائی گئی۔ اس میں چیف اور ڈائریکٹر جنرل کے ساتھ تیمور کے شعبے کے ڈائریکٹر جنرل بھی موجود تھے۔

''میجر تیمور!'' چیف نے بھاری آواز اور سپاٹ لہجے میں فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔ ''عدالت میں آپ کے خلاف الزامات ثابت ہوچکے ہیں اس لیے فوجی ضابطوں اور قوانین کے تحت آپ کا کورٹ مارشل ہوگا۔'' اس نے چند لمحے توقف کیا۔ ''لیکن آپ کی گزشتہ خدمات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے میں آپ کے ساتھ اتنی رعایت کرسکتا ہوں کہ آپ کو گرفتار کرکے پولیس کے حوالے نہ کیا جائے۔''

''سر! میں کچھ کہنا چاہوں گا۔'' میجر نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

''فیصلہ ہوچکا ہے میجر!'' چیف نے کہا۔ ''اب کچھ بھی کہنے سننے کا فائدہ نہیں ہے۔ بہرحال، تم کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''سر! آرمی کورٹس نے جلد بازی میں یک طرفہ فیصلہ کرتے ہوئے آرمی کو ایک بہترین جنرل سے محروم کردیا ہے۔ اب میری صرف اتنی درخواست ہے کہ کورٹ مارشل کے بجائے مجھے پھانسی دے دیں۔'' وہ کورٹ مارشل کا ذلت آمیز منظر جانتا تھا۔ پوری بٹالین بلکہ پورے بریگیڈ کے سامنے ذلیل و خوار ہونے سے بہتر تو یہی تھا کہ اسے پھانسی دے دی جائے۔

''آرمی کورٹ کا ہر فیصلہ باضابطہ قانون کے مطابق ہوتا ہے میجر۔'' چیف صاحب نے کہا۔ ''کورٹ کسی کی فرمائش پر سزا میں کمی بیشی نہیں کرسکتی۔'' یہ کہہ کر اس نے عدالت برخاست کرنے کا اعلان کردیا اور میجر کے دائیں بائیں کھڑے ہوئے چاق و چوبند جوان اسے.... باعزت طریقے سے لے گئے کیونکہ اس کے جسم پر ابھی تک وردی تھی۔

کورٹ مارشل کی روداد بہت تکلیف دہ اور تحقیر آمیز تھی۔

تیمور جب اپنے کمرے میں پہنچا تو اس کے جسم پر صرف خاکی وردی تھی۔ اس کی کراس بیلٹ، مخصوص بیلٹ اور شانوں پر لگے ہوئے کراؤنز کی جگہ خالی تھی۔ اس کی ٹوپی پر لگا ہوا بیج بھی اتار لیا گیا تھا۔

وہ اپنے کمرے میں بیٹھا دیر تک ان حالات پر غور کرتا رہا۔

ایک لمحے کو تو غم و غصے سے اسے اپنے جذبات پر قابو نہ رہا اور بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

کوریڈور میں قدموں کی آہٹ گونجی تو اس نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ لیے اور کپڑوں کی الماری کھول کر یونہی اس کا جائزہ لینے لگا۔

اس وقت اس کا ایک ساتھی کیپٹن نعیم کمرے میں داخل ہوا۔ وہ دونوں نہ صرف کالج میں ایک ساتھ پڑھتے تھے بلکہ انہیں کمیشن بھی ساتھ ہی ملا تھا۔

وہ کمرے میں داخل ہوکر خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

تیمور نے اس کی طرف دیکھا پھر دوبارہ الماری سے کپڑے نکال نکال کر بیڈ پر ڈھیر کرنے لگا۔ ''میں ان چھچھوروں کو چھوڑوں گا نہیں۔'' نعیم نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔

''کن چھچھوروں کی بات کررہا ہے یار؟'' تیمور کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''میں کیپٹن اکرم، ناصر اور بلال کی بات کررہا ہوں۔'' نعیم نے بلند آواز میں کہا۔

''دفع کر یار!'' تیمور نے کہا۔ ''کیا تو چاہتا ہے کہ تیرا بھی کورٹ مارشل ہوجائے؟ دیکھ نعیم! یہ ملازمت میرے لیے محض شوق تھی۔ مجھے کسی بھی جاب کی ضرورت نہیں ہے لیکن تو ایسی کوئی بات مت کرنا جس سے تیری ملازمت پر آنچ آئے۔''

''تو مجھے غریبی کا طعنہ دے رہا ہے؟'' نعیم جھنجلا کر بولا۔

''بکواس کی تو ابھی الٹے ہاتھ کا ایک تھپڑ رسید کردوں گا۔ تو غریب کہاں سے ہے؟ آرمی کا ایک معزز افسر ہے، چند ماہ بعد تیری ترقی ہونے والی ہے۔ ہاں، یہ جاب چھوڑنے کے بعد تیرے لیے مسئلہ پیدا ہوجائے گا۔''

''تو سمجھا نہیں۔ میں ان لوگوں کے ساتھ بھی وہی کچھ کروں گا جو انہوں نے تیرے ساتھ کیا ہے۔''

''اچھا چھوڑ ان باتوں کو۔'' میں نے کہا۔ ''اپنے بیٹ مین سے ذرا وہ اسپیشل قسم کی کافی تو بنوا۔''

وہ اسپیشل کافی تیمور ہی نے نعیم کے بیٹ مین کو بنانا سکھائی تھی کیونکہ وہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ پڑھا لکھا تھا۔

''تم نے یہ کیوں کہا کہ کورٹ مارشل کے بجائے مجھے سزائے موت دے دیں؟'' نعیم نے پوچھا۔

''یہ سوال تم کررہے ہو؟'' تیمور نے پوچھا۔ ''تم تو مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔''

''ہاں جانتا ہوں۔'' نعیم نے کہا۔

''اس کے باوجود تم ایسی بات کررہے ہو؟'' تیمور کا لہجہ انتہائی تلخ تھا۔ ''اب تو جو ذلت ہونا تھی، وہ ہوگئی۔'' تیمور نے کہا۔ ''اب اس بات کے ذکر کا فائدہ؟''

''تم گاؤں کب جارہے ہو؟'' نعیم نے پوچھا۔

''میں گاؤں کیا منہ لے کر جاؤں گا؟'' تیمور نے دکھی لہجے میں کہا۔ ''کئی پشتوں سے میرے خاندان کا پیشہ سپہ گری ہے۔ ہمارے خاندان کی بہادری کا اعتراف انگریزوں نے بھی کیا ہے اور پاکستان آرمی نے بھی۔ اب میں گاؤں والوں کو جا کر کیا بتاؤں گا کہ میرا کورٹ مارشل ہوچکا ہے اور مجھے ذلیل کرکے فوج سے نکالا جاچکا ہے۔ ہمارے گاؤں کے آدھے سے زیادہ بلکہ ستر فیصد لوگ آرمی میں ہیں۔ وہ سب جانتے ہیں کہ کورٹ مارشل کیوں ہوتا ہے اور کیسے ہوتا ہے۔ کل تک جو لوگ مجھے ادب سے سلام کرتے تھے، وہ مجھے تمسخر سے دیکھیں گے، مجھ پر حقارت بھری نظر ڈالیں گے۔''

نعیم کچھ دیر خاموش رہا پھر پوچھا۔ ''ابھی فوری طور پر تم کہاں جاؤ گے؟'' اس نے موضوع بدلنے کے لیے پوچھا۔

''لاہور میں اچھے ہوٹلوں کی کمی نہیں ہے۔'' تیمور نے کہا۔ ''اور تم جانتے ہو کہ ملازمت اب ہمارے خاندان کی ضرورت نہیں بلکہ شوق ہے۔ میں ملازمت کے بغیر بھی زندگی گزار سکتا ہوں۔''

''وہ تو میں جانتا ہوں۔'' نعیم نے کہا۔ ''لیکن یہ خبر اب تک تمہارے گاؤں پہنچ چکی ہوگی۔''

''ہوگی نہیں بلکہ پہنچ چکی ہے۔'' تیمور نے کہا۔ ''صبح سے بابا نے کئی مرتبہ مجھے ٹیلی فون کیا ہے لیکن میں نے ان کے کسی فون کا جواب نہیں دیا۔ تین دفعہ داجی بھی فون کرچکے ہیں لیکن میں نے انہیں بھی جواب نہیں دیا۔ انہیں جواب دوں بھی تو کیا؟'' تیمور کا لہجہ زہریلا ہوگیا۔ ''یہ کہ ان کے پوتے کو ملک و قوم سے غداری کے الزام میں کورٹ مارشل کے بعد فوج سے ذلیل ہوکر نکالا گیا ہے؟ میں نے فی الحال تو اپنا سیل فون ہی آف کردیا ہے۔''

تیمور نے اپنا سامان سمیٹا، اپنے ٹو آئی سی (سیکنڈ اِن کمانڈ) کو بلا کر باضابطہ اپنے سامان کی تلاشی دی اور ان سے کلیئرنس کی رسید حاصل کرنے کے بعد اس نے اس کمرے، اس بٹالین کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔

اس کے پاس جدید ماڈل کی ذاتی کار تھی۔ اس نے اپنی گاڑی کی بھی باضابطہ تلاشی دی اور آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی لیے وہاں سے روانہ ہوگیا۔

اس کی گاڑی دیکھ کر گیٹ پر کھڑے ہوئے سنتری نے اسے سیلوٹ کیا اور جلدی سے بیریئر ہٹا دیا۔

اس نے لاہور کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں کمرا بک کرایا اور کمرے میں پہنچ کر نڈھال سا ہوکر بیڈ پر گر گیا۔

وہ نہ جانے کب تک اسی طرح بیڈ پر پڑا رہا، پھر اس نے تمام وسوسوں، فکروں اور پریشانیوں کو ذہن سے جھٹکا اور باتھ روم میں گھس گیا۔

اس نے صبح سے اب تک کچھ نہیں کھایا تھا۔ اس نے روم سروس کو کھانے کا آرڈر دیا اور ٹی وی دیکھنے لگا۔ اس کا

خیال تھا کہ شاید میڈیا والوں کو بھی یہ خبر دی گئی ہو گی لیکن کسی بھی نیوز چینل سے ایسی کوئی خبر نشر نہیں ہوئی۔ اس نے اکتا کر ٹی وی بند کر دیا۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ روم سروس والے کھانا لے کر آئے ہوں گے۔ وہ بلند آواز میں بولا۔ ''یس، کم ان۔''

دوسرے ہی لمحے دروازہ کھلا اور اسے اپنے بابا کا چہرہ دکھائی دیا۔ ان کے پیچھے داجی (دادا جی کو وہ داجی کہتا تھا) بھی تھے۔ داجی کے پیچھے اس کا بھائی منصور تھا جو خود بھی اس وقت لیفٹیننٹ کرنل تھا اور جلد ہی بریگیڈیئر بننے والا تھا۔

بابا اسے چند لمحے تک غور سے دیکھتے رہے، پھر بے اختیار اس سے لپٹ گئے۔ اس کے ضبط کا بند بھی ٹوٹ گیا اور وہ بلک بلک کر رونے لگا۔

''نہ رو پتر نہ... میرا شیر ببر... اوئے شیر بھی کبھی روتے ہیں؟''

''نہ میرا شہزادہ بیٹا!'' داجی نے کہا۔ ''مرد روتے ہوئے اچھے نہیں لگتے۔''

وہ داجی سے لپٹ گیا اور بمشکل تمام اپنے آنسوؤں پہ قابو پایا۔ پھر منصور نے اسے گلے لگایا۔

''ہوا کیا تھا تیمور؟'' داجی نے پوچھا۔ ''تیرے کورٹ مارشل کا سن کر مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ تیرے افسروں کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''مجھے تو لگتا ہے داجی! کسی نے میرے خلاف سازش کی ہے۔''

''تو فکر مت کر۔ ہندوستان میں گنتی کے چند لوگوں نے وکٹوریہ کراس اور ملٹری کراس لیا ہے۔ ہمارا خاندان کوئی معمولی خاندان نہیں ہے پتر! میں خود چیف سے بات کروں گا۔'' داجی نے کہا۔ ''میں ابا جی کے، اپنے اور تیرے باپ کے سارے تمغے بھی اپنے ساتھ لایا ہوں۔''

''کوئی فائدہ نہیں ہے داجی۔'' تیمور نے کہا۔ ''اس فوجی عدالت میں چیف بھی موجود تھے۔''

''تیمور!'' بابا نے پوچھا۔ ''اس الزام میں کتنی سچائی ہے؟'' وہ باپ سے اچانک افسر بن گئے۔

اس نے حیرت سے انہیں دیکھا اور شکستہ لہجے میں کہا۔ ''بابا! کیا آپ بھی مجھے ایسا ہی سمجھ رہے ہیں؟ آپ اپنے خون، اپنی خاندانی روایات پر شک کر رہے ہیں؟'' اس کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا تیمور بیٹا۔'' بابا نے نرم لہجے میں کہا۔ ''میں تو صرف حقیقت جاننا چاہتا ہوں۔''

''مجھے حقیقت کا علم ہوتا تو کورٹ مارشل کی نوبت ہی کیوں آتی؟'' تیمور نے کہا۔ ''لیکن میں حقیقت معلوم ضرور کروں گا۔''

اسی وقت روم سروس والا کھانا لے کر آ گیا۔ تیمور نے اس سے مزید کھانا لانے کو کہا اور منصور بھائی سے کہا۔ ''بھائی جان مبارک ہو، آپ کا پروموشن ہونے والا ہے۔''

''میں نے تو سوچا تھا کہ میں اپنے اور تیرے پروموشن کی خوشی میں ایک شاندار پارٹی دوں گا۔'' منصور بھائی نے پھیکے سے لہجے میں کہا۔ ''تو نے بھی تو بہت کم عمری میں میجر کا رینک حاصل کر لیا تھا۔''

''اب اس بات کو جانے دے منصور!'' داجی نے کہا۔ ''میں اپنے پتر کو... کاروبار کراؤں گا۔'' پھر وہ تیمور سے بولے۔ ''تو سیدھا گھر کیوں نہیں آیا، یہاں کیوں پڑا ہے؟''

''میں کس منہ سے گھر آتا داجی؟'' اس نے کہا۔ ''میں تو خود اپنی نظروں میں گر گیا ہوں۔'' اس کے لہجے میں تھکن تھی۔ ''میں ابھی لاہور ہی میں رہنا چاہتا ہوں۔ ابھی میں گاؤں والوں کا سامنا نہیں کرنا چاہتا۔''

''تیمور ٹھیک کہہ رہا ہے داجی۔'' منصور بھائی نے کہا۔ ''ابھی تو گاؤں کا ہر شخص مارے تجسس کے ہماری حویلی کی طرف بھاگا آئے گا۔'' پھر وہ تیمور سے مخاطب ہوئے۔ ''تیمور! تم میرے ساتھ کھاریاں چلو۔'' منصور بھائی ان دنوں کھاریاں میں تعینات تھے۔

''ابھی میں کہیں بھی جانے کے موڈ میں نہیں ہوں۔'' تیمور نے کہا۔ ''مجھے لاہور ہی میں رہنے دیں یا پھر میں کراچی چلا جاؤں؟''

''نہ تمو بیٹے!'' داجی نے کہا۔ ''تو لاہور میں رہنا چاہتا ہے تو لاہور ہی میں رہ لیکن یہ ہوٹل چھوڑ کر اپنے بنگلے میں شفٹ ہو جا۔ تجھے معلوم نہیں کہ گلبرگ میں ہمارا بنگلا بھی ہے؟''

''میں جانتا ہوں داجی۔'' اس نے کہا۔

''وہاں ابھی تو صرف ایک چوکیدار ہے۔ میں گاؤں سے دو تین نوکر اور بھجوا دوں گا۔''

اب طے ہو گیا کہ میں لاہور ہی میں رہوں گا۔ داجی کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ حکم کا درجہ رکھتا تھا۔

وہ لوگ دیر تک تیمور کی دل جوئی کرتے رہے پھر داجی جانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ ان کے ساتھ ہی منصور

بھائی بھی کھڑے ہو گئے اور بولے۔ ''تیمور! کوئی پریشانی ہو تو مجھے ضرور بتانا۔ داجی اور بابا تو یہاں سے دور ہیں لیکن میں تم سے زیادہ دور نہیں ہوں۔''

ان کے جانے کے بعد کمرے میں اچانک سناٹا چھا گیا۔

تیمور نے وال کلاک پر نظر ڈالی۔ ابھی صرف شام کے چھ ہی بجے تھے اس کا ارادہ تھا کہ کچھ دیر سونے کے بعد تازہ دم ہو کر باہر نکلے گا۔ وہ اب ہر قسم کی پابندی سے مبرا تھا اور دل بھر کے انجوائے کرنا چاہتا تھا۔

اس نے کھڑکیوں کے پردے گرائے، ٹیوب لائٹ بند کی اور سونے کے ارادے سے بستر پر دراز ہو گیا۔

وہ ابھی پوری طرح سونے بھی نہیں پایا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے جھنجلا کر دروازے کی طرف دیکھا اور سوچا، اب کون آ مرا؟ یہی سوچتا ہوا وہ دروازے کی طرف بڑھا اور دروازہ کھول دیا۔ دروازے پر ارشد تھا۔ اسے دیکھ کر تیمور کی ساری کوفت دور ہو گئی۔ وہ تیمور کے ساتھ اسکول اور کالج میں پڑھتا تھا اور نعیم کی طرح وہ بھی تیمور کا بہترین دوست تھا۔ تیمور نے آرمی جوائن کی تو وہ مقابلے کا امتحان دے رہا تھا پھر کافی عرصے تک اس سے تیمور کی ملاقات نہیں ہوئی۔ اس نے نعیم ہی سے سنا تھا کہ ارشد آج کل اسسٹنٹ کمشنر ہو گیا ہے اور پنجاب کی کسی تحصیل میں تعینات ہے۔

اب برسوں بعد اسے اپنے سامنے دیکھ کر تیمور پُرجوش انداز میں اس سے لپٹ گیا۔

''کیا یہیں کھڑے کھڑے میری پسلیاں توڑے گا؟'' ارشد نے ہنس کر کہا۔

وہ اسے کمرے میں لے آیا اور لائٹ آن کر دی۔

''اس کا مطلب ہے کہ تو ابھی سے سونے کی تیاری کر رہا تھا؟''

''ہاں۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''لیکن اب تو میری نیند تیری وجہ سے رفوچکر ہو گئی۔''

''یار تیمور! مجھے نعیم نے بتایا تھا کہ تو اس ہوٹل میں مقیم ہے۔'' اس نے تیمور کے پوچھنے سے پہلے ہی بتا دیا پھر اس نے تیمور سے کورٹ مارشل کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ پوچھا۔

وہ کافی دیر تک گزرے دنوں کی یادوں کو تازہ کرتے رہے۔ اس دوران میں انہوں نے دو دفعہ کافی پی۔ ارشد اسے نہ جانے کب کب کے واقعات اور لطیفے سنا کر ہنساتا

رہا۔ اس کے آنے سے تیمور کے ذہن کا بوجھ کافی حد تک ہلکا ہو گیا۔

انہوں نے ایک ساتھ کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد وہ سگریٹ سلگا کر بولا۔ ”یار! جب میں یہاں آرہا تھا تو میں نے داجی اور انکل کو دیکھا تھا۔ وہ جی ٹی روڈ پر اپنے گارڈز کے ساتھ جارہے تھے۔“

”وہ مجھ ہی سے ملنے آئے تھے۔ میں اب لاہور ہی میں رہوں گا۔“ تیمور نے کہا۔

”ہاں یار! تو اتنے مہنگے ہوٹل میں رہ سکتا ہے۔“ اس نے ہنس کر کہا۔

”یہ تو مجھ پر طنز کر رہا ہے؟“ تیمور نے منہ بنا کر کہا۔

”میں تو ہمیشہ تجھ پر اور تیرے خاندان پر رشک کرتا آیا ہوں۔ تو اگر کچھ بھی نہ کرے تو بھی نوابی ٹھاٹ کے ساتھ رہ سکتا ہے۔“ پھر وہ سنجیدہ ہو کر بولا۔ ”ویسے اب کیا کرنے کا ارادہ ہے؟“

اس نے اب بھی براہِ راست تیمور سے کورٹ مارشل کے بارے میں نہیں پوچھا۔ تیمور جانتا تھا کہ نعیم نے اسے سب کچھ بتادیا ہوگا۔

”سب سے پہلا کام تو میں یہ کروں گا کہ جن لوگوں نے میرے خلاف سازش کی ہے، ان سے نمٹوں۔“

ارشد نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یار تیمور! ہمیں باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ جب میں یہاں آیا تھا تو میں نے گھڑی دیکھی تھی اس وقت سوا چھ بج رہے تھے اور اس وقت ساڑھے گیارہ بجے ہیں۔ میرا گن مین اور ڈرائیور پریشان ہو گیا ہوگا کہ صاحب اتنی دیر تک کہاں بیٹھ گیا۔“

”اگر آپ نے جانے کا ارادہ کر ہی لیا ہے اے سی صاحب تو میں بھلا آپ کو کیسے روک سکتا ہوں؟“

”او بھائی! میں اب اے سی نہیں بلکہ ڈی سی ہوں۔“

”یعنی تو ڈپٹی کمشنر ہو گیا اور تو نے اس کی اطلاع تک نہیں دی؟“

”میں نے اطلاع دینے کی کوشش کی تھی لیکن تو اس وقت شاید کسی ٹریننگ پر گیا ہوا تھا۔“

”اوکے ڈی سی صاحب۔“ تیمور نے ہنس کر کہا۔ ”میں تو فارغ ہوں۔ آپ کے پاس جب بھی وقت ہو آجایئے گا۔“ تیمور نے کہا۔ ”لیکن یہاں نہیں، کل میں اپنے گلبرگ والے بنگلے میں شفٹ ہو جاؤں گا۔“

اب تیمور واقعی بُری طرح تھک گیا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر لائٹ آف کی اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔

☆☆☆

اسی وقت اس ہوٹل کے پانچویں فلور کے ایک کمرے میں چار غیر ملکی مرد اور ایک لڑکی سر جوڑے بیٹھے تھے۔ ان میں سے دو کا تعلق امریکا سے تھا، ایک مرد آسٹریلین تھا، ایک اٹالین تھا اور لڑکی بھی امریکن تھی۔

”ہمارے راستے کا ایک کانٹا تو خود ہی ہٹ گیا۔“ انجلی نے کہا۔

”کون سا کانٹا؟“ فلپ چونک کر بولا۔ اس کی عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان رہی ہوگی۔ جسم گٹھا ہوا اور ورزشی تھا اور کنپٹیوں پر سے اس کے بال سفید ہو گئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں سانپ جیسی چمک اور چہرے پر لومڑی جیسی مکاری تھی۔ وہ اس وقت تھری پیس سوٹ میں ملبوس تھا۔

”میں میجر تیمور کی بات کر رہی ہوں۔“ انجلی نے کہا۔ ”اس نے کئی موقعوں پر ہمیں بہت نقصان پہنچایا ہے۔“

”اس خوش فہمی میں مت رہنا بے بی!“ جونی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”اسے پاکستان آرمی سے نکالا ضرور ہے لیکن وہ ابھی موجود ہے۔“ جونی کا تعلق اٹلی سے تھا۔ اس کی عمر تیس، بتیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کی زندگی جرائم پیشہ لوگوں میں گزری تھی۔

”انجلی کا خیال ٹھیک ہے۔“ میک نے کہا۔ ”وہ جرمن تھا اور وہاں جرائم کی کئی سنگین وارداتوں میں ملوث ہونے کے بعد پولیس کے خوف سے امریکا فرار ہو گیا تھا۔ وہ ابھی نوجوان تھا، اس پورے گروپ میں وہی زبردست نشانے باز اور مارشل آرٹ کا ماہر تھا۔ یوں تو ہر شخص ہی کسی نہ کسی فن میں طاق تھا لیکن میک بہت جنونی شخص تھا۔

”تم لوگ اس کی فکر مت کرو۔“ فلپ نے کہا۔ وہ اپنے اندازِ گفتگو سے ان کا لیڈر لگ رہا تھا۔ ”میجر تیمور ایک ایسا سانپ ہے جس کا زہر نکل چکا ہے، دانت ٹوٹ چکے ہیں اور اس کی حیثیت اب کسی کیچوے سے بھی بدتر ہے۔ وہ اب کسی کے بھی خلاف کوئی کارروائی کرنے کی حالت میں نہیں ہے۔ اس نے ایسا کیا بھی تو یہاں کی مقامی پولیس اس کے ساتھ وہی سلوک کرے گی جو تیسرے درجے کے ایک بدمعاش کے ساتھ کیا جاتا ہے۔“

”لیکن اگر اسے بھنک بھی مل گئی کہ ہم اس کے ملک میں موجود ہیں تو وہ ہر قیمت پر ہمارا راستہ روکنے کی کوشش کرے گا۔“ جیک نے تشویش سے کہا۔

”میں نے اس کا بندوبست بھی کر لیا ہے۔“ فلپ مکاری سے مسکرایا۔ ”صبح تک وہ کیچوا رینگنے کے قابل بھی نہیں رہے گا۔“

انجلی اس کی بات پر کھلکھلا کر ہنسی۔ ”کہاں میجر تیمور! ہماری راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ، انتہائی زہریلا کوبرا اور کہاں ایک بے ضرر کیچوا۔“ پھر وہ ہنستے ہنستے سنجیدہ ہو کر بولی۔ ”تم نے ایسا کیا بندوبست کیا ہے کہ....“

”بس تم خاموشی سے دیکھتی جاؤ بے بی!“ فلپ نے مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”وہ ابھی اپنے گاؤں نہیں گیا ہے اسی ہوٹل کے ساتویں فلور پر مقیم ہے۔“

☆☆☆

تیمور انتہائی گہری نیند میں تھا جب اس کے دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ وہ لاکھ تھکن کا شکار ہو لیکن معمولی سی ایک آہٹ سے بھی بیدار ہو جاتا تھا۔ یہ تو پھر زوردار دستک تھی۔

وہ بھنا کر انگریزی میں چیخا۔ ”کون ہے؟“

”پولیس۔“ باہر سے ایک کرخت آواز سنائی دی۔

”ذرا صبر کرو، میں آرہا ہوں۔ دروازہ توڑو مت۔“ تیمور نے پھر رواں انگریزی میں کہا اور شرٹ پہن کر دروازہ کھول دیا۔

دروازہ کھلتے ہی پولیس کے ایک سب انسپکٹر اور دو سپاہی دندناتے ہوئے کمرے میں داخل ہو گئے۔

”کیا پرابلم ہے آفیسر؟“ تیمور نے چیخ کر کہا۔ ”یہ کیا بے ہودگی ہے؟“

”پرابلم تو میں تجھے تھانے لے جا کر سمجھاؤں گا۔“

اس دوران میں دونوں سپاہیوں نے اس پر یوں رائفلیں تان لیں جیسے اس کے حرکت کرتے ہی وہ اسے گولی ماردیں گے۔

”تمہارے پاس وارنٹ ہے؟“ تیمور نے سخت لہجے میں پوچھا۔

سب انسپکٹر نے غیر متوقع طور پر اس کے چہرے پر تھپڑ رسید کر دیا۔ ”تو انسپکٹر بھٹی سے وارنٹ مانگ رہا ہے۔ اب یہ فوج کی ”پھوں پھاں“ چھوڑ اور شرافت سے ہمارے ساتھ چل ورنہ اِن کاؤنٹر میں میرے ہاتھوں مارا جائے گا۔“

”لیکن میرا قصور کیا ہے؟“ تیمور نے تلخ لہجے میں پوچھا۔

”قصور بھی پولیس اسٹیشن چل کر ہی معلوم ہوگا۔“ پھر وہ چونک کر بولا۔ ”تیرے ساتھ اور کون ہے؟“

”ابھی تو میں اکیلا ہی ہوں۔“ تیمور نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

سب انسپکٹر بھٹی نے ایک سپاہی کو اشارہ کیا۔ اس نے کمرے اور باتھ روم کا اچھی طرح جائزہ لیا پھر بولا۔ ”اور کوئی نہیں ہے جناب۔“

وہ لوگ تیمور کو تیسرے درجے کے ایک ملزم کی طرح دھکیلتے ہوئے وہاں سے لے گئے۔ فائیو اسٹار ہوٹلوں میں رات کے وقت بھی اچھی خاصی رونق ہوتی ہے۔ لوگوں نے حیرت سے تیمور کو دیکھا، استقبالیہ کلرک کے چہرے پر بھی حیرت تھی۔

اس لمحے تیمور کا دل چاہ رہا تھا کہ ان پولیس والوں کو زندہ دفن کر دے۔ اتنی تذلیل تو اس نے زندگی میں کبھی بھی برداشت نہیں کی تھی۔ تیمور اپنی یہ تذلیل کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔

سب انسپکٹر بھٹی نے اسے حوالات میں دھکیل کر دروازہ بند کر دیا۔

حوالات میں چار ملزم پہلے سے موجود تھے۔ ان لوگوں نے بھی حیرت سے تیمور کو دیکھا۔ تیمور اس وقت سلیپنگ سوٹ میں تھا لیکن اس کے چہرے کے وقار اور رکھ رکھاؤ سے وہ لوگ بھی مرعوب ہو گئے۔

تیمور حوالات کی اس مختصر کوٹھری میں جھنجلاہٹ اور غصے میں ٹہل رہا تھا۔

اچانک دروازے پر ایک سنتری نمودار ہوا اور اس نے کہا۔ ”تم میں سے تیمور کون ہے؟“

”میں ہوں تیمور۔“ اس نے جواب دیا۔

”چلو، تمہیں صاحب نے بلایا ہے۔“ سنتری نے کہا۔ وہ بھی اس کی بارعب شخصیت سے مرعوب ہو گیا تھا ورنہ وہ لوگ گالی پہلے دیتے ہیں، بات بعد میں کرتے ہیں۔

لاک اَپ کا دروازہ کھول کر ایک سنتری اندر آیا اور اس کے ایک ہاتھ میں ہتھکڑی ڈال دی۔ ہتھکڑی کا دوسرا سرا سنتری کی کمر سے بندھی ہوئی بیلٹ میں تھا۔ تیمور حیران ہو رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ ان لوگوں نے نہ تو اسے لاتیں ماریں، نہ دھکے دیے بلکہ اسے شرافت سے اس کمرے میں لے گئے جس پر انچارج کے نام کی تختی لگی تھی۔

اس کی توقع کے برعکس پولیس اسٹیشن کا انچارج انسپکٹر یوسف گردیزی انتہائی اسمارٹ اور چاق و چوبند شخص تھا۔

اس نے تیمور کو دیکھتے ہی پوچھا۔ ”تو تم ہو تیمور علی، سابق میجر اور...“

''ہاں، میں ہی تیمور ہوں۔'' تیمور نے ایک مرتبہ پھر رواں انگلش کا سہارا لیا۔ وہ جانتا تھا کہ ہمارا ملک ذہنی طور پر انگریزوں اور انگریزی کا غلام ہے اس لیے انگریزی کے ہتھیار سے اس نے اچھے اچھوں کو ڈھیر کیا تھا۔ ''لیکن مجھے کس جرم میں اریسٹ کیا گیا ہے؟''

''تم پر اپنے ایک ساتھی کیپٹن اکرم کے قتل کا الزام ہے۔ موقع پر کچھ ایسے لوگ بھی موجود تھے جنھوں نے تمھیں پہچان لیا ہے۔''

تیمور کا دل اچھل کر گویا حلق میں آ گیا۔ ''تو کیا اکرم کو قتل کر دیا گیا؟'' اس نے شکستہ لہجے میں پوچھا۔

''زیادہ اداکاری دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' انسپکٹر نے کہا۔ ''اور مجھ سے سیدھی طرح انسان کا بچہ بن کر بات کرو۔ زیادہ انگریزی جھاڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' انسپکٹر نے کہا۔ ''تم نے اکرم کو کیوں قتل کیا؟'' انسپکٹر نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''اپنے مفروضے تم لوگ اپنے پاس ہی رکھو۔'' تیمور نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''میرے لیے بھی یہ ایک اطلاع بلکہ اندوہناک اطلاع ہے کہ کیپٹن اکرم قتل ہو گیا ہے۔''

''دیکھو تیمور!'' انسپکٹر تم سے تو پر آ گیا۔ ''اب تو اس فوجی ''پھوں پھاں'' کو بھول جا اور مجھ سے جھوٹ بولنے کی کوشش مت کر۔''

''اپنی زبان کو لگام دے انسپکٹر۔'' تیمور نے بھنا کر کہا۔ ''میں...''

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ اس کے پیچھے کھڑے ہوئے سپاہی نے اس کی گردن پر زوردار ہاتھ مارا اور بولا۔ ''صاحب کے سامنے اپنی آواز نیچی رکھ۔''

تیمور کے جسم میں آگ سی دہکنے لگی۔ کل تک پولیس کے یہ چھوٹے چھوٹے اہلکار اسے جھک کر سلام کرتے تھے، اب وہی اسے کسی گھٹیا ملزم کی طرح ذلیل کر رہے تھے۔

پیچھے کھڑے ہوئے سپاہی نے پھر اس کی گردن پر ہاتھ مارا اور بولا۔ ''تجھے سنائی نہیں دے رہا ہے کہ صاحب کیا پوچھ رہے ہیں؟''

اسے واقعی سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے چیخ کر کہا۔ ''تمہارا صاحب الو کا پٹھا ہے اور تم...''

انسپکٹر اتنی تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھا کہ تیمور سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے تیمور کے بال پکڑ لیے اور دائیں ہاتھ سے اس کے چہرے پر اتنا زوردار تھپڑ مارا کہ اس کے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی اور توہین کے احساس سے وہ غصے میں بُری طرح لرزنے لگا۔

''تو نے مجھے گالی دی، انسپکٹر گردیزی کو؟ میرے نام سے بڑے بڑے سکہ بند بدمعاش لرزتے ہیں۔ بتا تو نے اکرم کو کیوں قتل کیا؟''

''میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔'' اس نے دانت پیس کر کہا۔

''تو ابھی بولے گا اور بہت کچھ بولے گا۔'' انسپکٹر گردیزی نے کہا۔ پھر وہ سنتری سے بولا۔ ''اسے لے جاؤ اور محمد خان کے حوالے کر دو۔ وہ آدھے گھنٹے کے اندر اندر سب کچھ معلوم کر لے گا۔''

سنتری اسے گھسیٹتا ہوا وہاں سے لے گیا۔ پہلے وہ سنتری تیمور کی بارعب شخصیت سے مرعوب تھا۔ ممکن ہے اسے یہ بھی علم ہو کہ وہ فوج کا سابق میجر ہے لیکن اپنے انچارج کا رویہ دیکھ کر وہ بھی شیر ہو گیا تھا۔ اس نے تیمور کو حوالات لے جانے کے بجائے ایک دوسرے کمرے میں دھکیل دیا۔ کمرے میں رکھا ہوا ساز و سامان دیکھ کر ہی تیمور سمجھ گیا کہ یہ ان کا ٹارچر روم ہے جہاں وہ لوگ ملزمان سے ''تفتیش'' کرتے ہیں۔

اس کا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ رہ رہ کر یہی سوال اس کے ذہن میں چبھ رہا تھا کہ کیپٹن اکرم کو قتل کس نے کیا اور اس کے قتل کا شبہ مجھ پر کس نے ظاہر کیا؟

دروازہ کھلا اور ورزشی جسم کا لمبا تڑنگا ایک شخص اندر داخل ہوا۔ اس کے جسم پر سینڈو کٹ بنیان اور خاکی پینٹ تھی۔

وہ قد اور جسامت میں تیمور سے کم نہیں تھا۔ اس نے ناقدانہ انداز میں تیمور کا جائزہ لیا۔ پھر وہاں پڑی ہوئی ایک بینچ پر بیٹھ گیا اور بولا۔ ''دیکھ بھئی میجر! میرا اصول ہے کہ میں کسی بھی ملزم سے تفتیش کرنے سے پہلے ایک موقع ضرور دیتا ہوں۔ میں تجھے بھی دس منٹ دوں گا۔ تو اس دوران میں اچھی طرح سوچ سمجھ لے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی جیب سے سستے برانڈ کے سگریٹ کا ایک پیکٹ نکالا اور اس میں سے ایک سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔

''دیکھو... کیا نام ہے تمہارا؟''

''محمد خان۔'' اس نے سگریٹ کا بھرپور کش لیتے ہوئے کہا۔

''ہاں، تو محمد خان!'' تیمور نے کہا۔ ''میں ایک شرط پر یہ سب کچھ سچ سچ بتا دوں گا۔''

''اچھا۔'' اس نے اچھا کو لمبا کرتے ہوئے کہا۔

''تیری کوئی شرط بھی ہے؟''

''مجھے صرف یہ بتا دو کہ ایف آئی آر کس نے درج کرائی ہے؟''

''یہ معلوم کر کے کیا کرے گا؟''

''محمد خان!'' تیمور نے سرد لہجے میں کہا۔ ''بات ذرا تیز سے کرو۔ میرے لیے یہ معلوم کرنا بہت ضروری ہے کہ ایف آئی آر کس نے درج کرائی ہے؟''

''آپ کے خلاف ایف آئی آر آپ ہی کے ایک افسر نے لکھوائی ہے۔'' محمد خان نے کہا۔ ''اس نے بتایا ہے کہ وہ اس واقعے کا چشم دید گواہ ہے۔ کیپٹن اکرم اور کچھ دوسرے افسر ایک خصوصی پروگرام میں گئے تھے۔ کیپٹن اکرم پارکنگ کی طرف جا رہا تھا کہ تم نے اس پر فائر کھول دیا۔ وہ موقع ہی پر جاں بحق ہو گیا۔ اس افسر نے تمھیں خود فائر کرتے ہوئے دیکھا تھا۔'' محمد خان نے اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اس افسر کا نام یاد نہیں آ رہا ہے لیکن ایف آئی آر دیکھ کر یاد آ جائے گا۔''

تیمور نے طویل سانس لی اور کہا۔ ''جب اس قتل کا ایک چشم دید گواہ بھی موجود ہے تو مزید انکار کرنا بیکار ہے۔'' اس نے سوچا کہ فضول میں پولیس کا تشدد برداشت کرنے سے بہتر ہے کہ فوری طور پر اپنے جرم کا اقبال کر لیا جائے۔ اس اقبالِ جرم کی قانونی طور پر کوئی حیثیت نہیں ہوتی ہے۔ کورٹ میں وہ اپنے بیان سے منحرف ہو سکتا تھا پھر جس وقت قتل ہوا، اس وقت اس کے پاس سول سروس کا ایک اعلیٰ عہدے دار بیٹھا تھا۔ اس کی گواہی سے ثابت ہو جائے گا کہ تیمور نے قتل نہیں کیا۔

''آپ کچھ بتانے والے تھے؟'' محمد خان نے اسے چونکا دیا۔

''ہاں، اکرم کو میں نے قتل کیا ہے؟'' تیمور نے طویل سانس لے کر کہا۔

''لیکن کیوں؟'' محمد خان حیرت اور جوش میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''اس نے میرے خلاف گواہی دے کر میرا کیریئر ختم کر دیا۔ میں اس بے عزتی کو کیسے بھول سکتا تھا محمد خان؟''

''آلۂ قتل کہاں ہے؟'' محمد خان نے پوچھا۔

''تم مجھ سے یہ توقع رکھتے ہو کہ میں آلۂ قتل اپنے ساتھ لے کر پھروں گا۔ میں نے آلۂ قتل یعنی وہ گن وہیں پھینک دی تھی۔ اگر وہ تمھیں مل بھی جائے گی تو اس پر میری انگلیوں کے نشانات نہیں ملیں گے۔''

''آپ بیٹھیں، میں ابھی آتا ہوں۔'' محمد خان نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ وہ چند منٹ بعد دوبارہ آیا اور بولا۔ ''چلیے، آپ کو صاحب بلا رہے ہیں۔''

اس مرتبہ تیمور کے سر پر ایک رائفل بردار سپاہی تو ضرور مسلط تھا لیکن محمد خان نے اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی نہیں ڈالی تھی۔

وہ انچارج کے کمرے میں پہنچا تو وہ اپنی گھومنے والی کرسی پر نیم دراز تھا۔ اس نے بہت غور سے تیمور کا جائزہ لیا۔ اس کی منحوس صورت دیکھتے ہی تیمور کے دل میں نفرت کی لہر اٹھی لیکن اس نے اپنی زبان پر قابو رکھا۔

''ابھی کچھ دیر پہلے تو تم بہت سختی سے اس بات کی تردید کر رہے تھے۔'' انسپکٹر نے کہا۔ ''اب اچانک اپنے جرم کا اقبال کر لیا، کیوں؟''

''محمد خان نے مجھے کچھ ایسے حقائق سے آگاہ کیا جنھیں دنیا کی کوئی عدالت نہیں جھٹلا سکتی۔ اس قتل کا ایک نہیں بلکہ کئی چشم دید گواہ ہیں۔ میرا ارادہ اسے قتل کرنے کا نہیں تھا لیکن اسے دیکھ کر میں خود پر قابو نہ رکھ سکا۔''

انسپکٹر نے ایک سنتری کو آواز دے کر کہا کہ ہیڈ محرر کو یہاں بھیج دو۔ اس سے کہنا کہ کاغذ اور قلم لے کر آئے۔ مجھے ملزم کا بیان لینا ہے۔''

ہیڈ محرر دبلا پتلا، لمبا سا مدقوق شخص تھا۔ وہ کاغذ قلم سنبھال کر بیٹھ گیا اور تیمور نے اپنا بیان شروع کر دیا۔

پھر اس نے بیان پڑھ کر سنایا اور جب تیمور نے اطمینان کا اظہار کیا تو انسپکٹر نے وہ آگے بڑھا دیا اور بولا۔ ''اس پر سائن کر دیں۔''

تیمور نے اس کاغذ پر لکھی ہوئی جناتی تحریر پڑھنے کی کوشش کی لیکن سوائے چند الفاظ کے وہ کچھ بھی نہ پڑھ سکا۔ ہیڈ محرر نے چند الفاظ کو بہت گھسیٹ کر لکھا تھا اور چند الفاظ کی ساخت ایسی تھی کہ وہ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ تیمور کو اس سے کیا غرض تھی کہ اس نے کیا لکھا ہے؟ اس نے بیان پر اپنے دستخط کر دیے۔ ہیڈ محرر نے اس کے نیچے لکھا۔ ب، س، ص، ت۔

''یہ تم نے کیا لکھا ہے؟'' تیمور نے الجھ کر پوچھا۔

''اس کا مطلب ہے کہ بیان سن کر صحت تسلیم کی۔'' انسپکٹر نے کہا۔ ''یہ ''ب، س، ص، ت'' اسی کے مخفف ہیں۔''

''اب میں ایک ٹیلی فون کر لوں؟'' تیمور نے پوچھا۔

''کہاں ٹیلی فون کرو گے؟'' انسپکٹر چونک کر بولا۔

”میں اپنے وکیل سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے آخر وکیل کی ضرورت پڑے گی۔“

انسپکٹر نے چند لمحے سوچا، پھر ٹیلی فون سیٹ اس کی طرف بڑھادیا۔

تیمور نے ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنا چاہا لیکن اسے کوئی نمبر یاد ہی نہیں تھا۔ جب سے سیل فون آیا تھا، اس نے لوگوں کے نمبر ذہن نشین کرنا چھوڑ دیے تھے۔ اس کا سیل فون اس وقت پولیس کی تحویل میں تھا۔

اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے صرف نعیم کا سیل نمبر یاد تھا۔ وہ اس لیے کہ اس کا نمبر بہت آسان تھا اور ایک دفعہ سننے کے بعد ذہن میں محفوظ ہو جاتا تھا جسے وہ بہت فخر سے گولڈن نمبر کہتا تھا۔ تیمور نے اس کا نمبر ڈائل کیا۔ دو تین گھنٹیاں بجنے کے بعد اس کی غنودہ آواز سنائی دی۔

”ہیلو۔“

”نعیم! میں تیمور بول رہا ہوں۔“

”تیمور!“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”اس وقت؟“

”ہاں یار! میں اس وقت بہت مصیبت میں ہوں۔ پولیس نے مجھے ایک قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا ہے۔“

”وہاٹ؟“ نعیم کی نیند ایک دم اڑ گئی۔ ممکن ہے وہ بیٹھے سے کھڑا ہو گیا ہو۔ ”تو اس وقت کہاں سے بول رہا ہے؟“

”یار! مجھے پولیس نے گرفتار کیا ہے تو میں پولیس اسٹیشن ہی سے بول سکتا ہوں۔“

”تو کس پولیس اسٹیشن میں ہے؟“

میں نے اسے پولیس اسٹیشن کا نام بتایا۔

”ٹھیک ہے، میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”ارشد کو بھی بتا دینا۔“ میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

”اس کے اقبالی بیان لینے کے بعد انچارج کا رویہ حیرت انگیز طور پر تبدیل ہو گیا تھا۔ اس نے تیمور کے لیے ایک مسکہ بن اور کولڈ ڈرنک منگائی تھی۔

تیمور نے کولڈ ڈرنک ختم ہی کی تھی کہ نعیم کی گاڑی پولیس اسٹیشن میں داخل ہوئی۔ وہ سیدھا انچارج کے کمرے میں آیا اور اسے آرام سے بیٹھا دیکھ کر خاصا پُرسکون ہو گیا۔ نعیم نے اس وقت سوٹ پہن رکھا تھا اس لیے اس نے انچارج سے اپنا تعارف کرایا۔ ”کیپٹن نعیم۔“

انسپکٹر نے جلدی سے اٹھ کر اس سے ایک مرتبہ پھر ہاتھ ملایا۔

نعیم، تیمور سے مخاطب ہوا۔ ”تجھ پر کس کے قتل کا الزام ہے؟“

”اکرم کے قتل کا۔“ میں نے جواب دیا۔

”کیا؟“ نعیم نے حیرت سے کہا۔ ”ان لوگوں نے اس کا قتل تیرے کھاتے میں ڈال دیا؟“

ابھی وہ بات کر ہی رہا تھا کہ باہر ایک گاڑی رکنے کی آواز آئی، پھر ارشد بہت تیزی سے اندر داخل ہوا۔

”انچارج اسے دیکھ کر بوکھلا گیا۔ ”سر... آ... آپ؟“

☆☆☆

”ہمارا یہ وار بھی ضائع ہو گیا۔“ فلپ نے آہستہ سے کہا۔

”تمہیں یقین تھا کہ تیمور کو اس مرڈر کیس میں سزا ہو جائے گی؟“ جیک نے کہا۔

”ہاں، مجھے یقین تھا۔ میں نے موقع کے ایسے گواہ تیار کرلیے تھے کہ وہ کورٹ میں تیمور کے خلاف بیان دیتے۔“

”لیکن اس کی ضمانت تو پہلی ہی پیشی میں ہو گئی۔ دوسری یا تیسری پیشی میں وہ بری ہو جائے گا۔“

”آخر یہ سب کچھ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟“ جونی نے کہا۔ ”میں سیدھا سیدھا تیمور ہی کو ٹھکانے لگا دیتا ہوں۔“

”اس کے پاس ہمارے بہت سے قیمتی راز ہیں۔“ فلپ نے کہا۔ ”میں اس سے معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ کیا کچھ جانتا ہے۔ جیل میں بھی ہمارے آدمی ہیں۔ وہ جیل میں ہوتا تو وہ اس سے معلوم کر لیتے کہ وہ کیا جانتا ہے لیکن وہ تو سرے سے جیل گیا ہی نہیں۔“

”یہ بھی کون سا مشکل ہے۔“ جونی نے کہا۔ ”میں کل ہی اسے اٹھا لیتا ہوں۔“

فلپ طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ ”تیمور کوئی بھیڑ کا بچہ نہیں ہے کہ تم اسے اٹھاؤ گے اور وہ تمہارے ساتھ چلا آئے گا۔“

”آپ مجھے ایک موقع تو دیں باس۔“ جونی نے کہا۔

”ایک طریقہ اور بھی ہے۔“ جیک نے پہلی دفعہ زبان کھولی۔ ”تیمور کے ساتھ اتنی زیادتی ہوئی ہے کہ وہ اب اپنے ہی لوگوں سے بدظن ہو چکا ہوگا۔ یہ انسانی نفسیات بھی ہے۔ کوئی شخص اگر دیانت داری اور فرض شناسی سے اپنا کام کر رہا ہو تو اس قسم کے حالات میں اسے شدید صدمہ پہنچتا ہے۔ ہم کسی طرح اسے دوست بھی تو بنا سکتے ہیں۔“

فلپ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ”گڈ! میں نے اس پہلو پر تو سوچا ہی نہیں تھا۔ اب یہ سوچو کہ اسے گھیرا کیسے جائے؟“

”یہ بھی کوئی پرابلم ہے؟“ جونی نے کہا۔ ”یہ انجلی کس موقع پر کام آئے گی؟“

”نہیں، انجلی اس کام کے لیے مناسب نہیں رہے گی۔ ہمیں کسی مقامی لڑکی کی ضرورت پڑے گی۔“

”ہمارے تین بہترین مقامی ایجنٹ بھی ہیں۔“ جیک نے کہا۔ ”ایک تو ائرلائن کی ائرہوسٹس رمشا ہے، دوسری شائلہ ہے جو ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں استقبالیہ کلرک ہے۔“

”گڈ!“ فلپ نے کہا۔ ”اس کام کے لیے شائلہ بہترین ہے۔ وہ ایسے حالات میں تیمور سے ٹکرائے گی کہ وہ بھی شائلہ سے ہمدردی محسوس کرے گا۔“

”تو پھر یہ طے ہو گیا کہ شائلہ ہی یہ کام کرے گی؟“ جونی نے کہا۔

☆☆☆

تیمور اب اپنے گلبرگ والے بنگلے میں مقیم تھا۔ اس کے بنگلے سے کچھ فاصلے پر ...... فلم انڈسٹری کی ایک معروف اداکارہ کا بنگلا بھی تھا۔ فلم انڈسٹری زوال کا شکار ہو چکی تھی لیکن اس بنگلے میں اب بھی خوب رونق ہوتی تھی۔ رات بھر وہاں گاڑیوں کی آمدورفت جاری رہتی تھی اور خوب ہلا گلا ہوتا تھا۔

اس وقت تیمور اپنے لاؤنج میں بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا ڈی سی دوست ارشد، کیپٹن نعیم اور اس کا بھائی منصور بھی تھا۔ وہ اب بریگیڈیئر ہو چکا تھا اور ابھی تک کھاریاں ہی میں تھا۔

اگلے روز عدالت میں تیمور کی پیشی تھی اور ان لوگوں کو یقین تھا کہ اس پیشی میں بیرسٹر احسان اسے بری کرالے گا۔ بقول ارشد کے بیرسٹر احسان آج تک کوئی کیس نہیں ہارا تھا۔ پھر تیمور کے کیس میں تو اب بالکل جان ہی نہیں تھی۔ قتل کے وقت وہ ارشد کے ساتھ ہوٹل کے کمرے میں موجود تھا۔ اس کا گواہ روم سروس کا ویٹر بھی تھا جو ان کے لیے کھانا اور بعد میں کافی لے کر آیا تھا۔

تیمور نے جان بوجھ کر اپنے داجی کو اس پیشی کی اطلاع نہیں دی تھی۔ وہ اپنے بابا اور داجی کو سرپرائز دینا چاہتا تھا۔

”یار ارشد!“ تیمور نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ”یہاں سے کچھ فاصلے پر فلموں کی ایک معروف اداکارہ کا بنگلا بھی ہے۔“

”تو پھر... اب کیا تو فلموں میں کام کرے گا؟“ نعیم نے ہنس کر کہا۔ ”ویسے بھی اب پاکستان میں فلمیں بن ہی کب رہی ہیں؟“

”میں یہی تو بتانا چاہ رہا ہوں۔“ تیمور نے کہا۔ ”اگر فلمیں بن رہی ہوتیں تو مجھے بالکل تشویش نہیں ہوتی لیکن اس کے باوجود اس اداکارہ کے گھر میں خوب صورت اور کم سن لڑکیاں رات گئے تو موجود رہتی ہیں۔ وہاں رات بھر ہلا گلا ہوتا ہے اور...“

”تو تمہیں کیا پریشانی ہے؟“ منصور نے اس کی بات کاٹ دی۔

”اس اداکارہ کے شاہانہ ٹھاٹ دیکھ کر تو بالکل لگتا ہی نہیں کہ اس کے پاس پیسے کی کمی ہوگی۔ پریشانی تو ارشد کو ہونا چاہیے کیونکہ یہ علاقہ اس کا ہے۔“

”ارے یار! تم بھی کن چکروں میں پڑ گئے۔“ ارشد نے کہا۔ ”ان لوگوں کا رابطہ ڈائریکٹ علاقے کے متعلقہ پولیس اسٹیشن سے ہوگا۔ عیاشی کے اڈے ان لوگوں کی سرپرستی کے بغیر نہیں چلتے۔ میں کارروائی کرنا بھی چاہوں تو وہ لوگ اس اداکارہ پر آنچ بھی نہیں آنے دیں گے اور پھنسیں گے بے گناہ۔“

”اس کا مطلب ہے کہ تم بھی اس معاملے میں بے بس ہو؟“ تیمور نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”میں بے بس تو نہیں ہوں لیکن اوپر سے نیچے تک کرپشن کا ایسا جال پھیلا ہوا ہے کہ اسے ختم کرنے میں برسوں لگ جائیں گے۔ کم سے کم میں تو اس وقت تک ریٹائر ہو جاؤں گا۔“ ارشد ہنس کر بولا۔

”میری بلا سے۔“ تیمور نے کہا۔ ”مجھے اپنی محنت اور فرض شناسی کا کیا صلہ ملا ہے؟“

”اتنا زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے تیمور۔“ نعیم نے کہا۔

”جذباتی!“ تیمور نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”میں تو جب سوچتا ہوں تو میرا دماغ چٹخنے لگتا ہے۔ میں نے اپنی تمام تر صلاحیتیں اس ملک کے لیے وقف کر دیں اور جواب میں مجھے کیا ملا؟ کورٹ مارشل، تذلیل، تحقیر، قتل کا مقدمہ...“

”اب رات بہت ہو گئی ہے اس لیے میں تو سونے جا رہا ہوں۔“ منصور نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”تم لوگ بھی سو جاؤ۔“ وہ اس کی باتوں سے الجھ گیا تھا۔

☆☆☆

عدالت میں تیمور کا نمبر آیا تو بیرسٹر احسان نے اپنے

دلائل سے ثابت کر دیا کہ تیمور اس وقت جائے واردات سے کئی کلومیٹر دور تھا۔ پبلک پراسیکیوٹر بھی بیرسٹر احسان سے خاصا مرعوب تھا اس لیے وہ احسان کے سامنے زیادہ دیر تک نہ سکا۔

تھوڑی دیر بعد جج نے تیمور کو باعزت بری کرنے کا فیصلہ سنا دیا۔

کورٹ کے احاطے میں پہنچ کر تیمور نے نعیم سے کہا۔ ''اب میں سیدھا گاؤں جاؤں گا۔ داجی اور بابا کو سرپرائز دوں گا۔ تم چلنا چاہو تو تم بھی چل سکتے ہو۔'' پھر وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''لیکن تم کیسے جاؤ گے؟ تم تو غلام ہو اور غلام اپنے آقا کی مرضی کے بغیر اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتے ہیں۔''

''مت بھولو کہ کل تک تم بھی غلام تھے۔'' نعیم نے کہا۔ ''تم آج مجھے غلامی کا طعنہ دے رہے ہو؟ برا مت ماننا، تمہارا تو پورا خاندان...''

''بس کرو نعیم۔'' تیمور بھنّا کر بولا۔ ''میرے خاندان کی بات مت کرو۔ وہ سادہ لوگ تھے۔ اپنے فرض کو زیادہ مقدم سمجھتے تھے لیکن یہی ان کی بھول تھی۔ اب اس موضوع کو جانے دو۔''

نعیم نے اچانک کہا۔ ''تیمور! تم اس آدمی کو دیکھ رہے ہو، وہ جو نیلی شرٹ میں ہے۔ وہ عدالت کے کوریڈور سے ہمارے پیچھے پیچھے ہے۔ میں نے ابھی اسے غور سے دیکھا تو وہ مجھ سے نظریں چرا کر دوسرے لوگوں کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ ابھی فوراً مت دیکھنا ورنہ...''

''میں جانتا ہوں۔'' تیمور نے کہا اور اپنی جیب سے سیل فون نکال کر یوں بات کرنے لگا جیسے کسی کی کال آئی ہو۔ اس نے غیر محسوس طریقے سے اس شخص کو بھی دیکھا۔ خاصا خوش لباس اور اسمارٹ نوجوان تھا۔ اس نے نیلی شرٹ پر گہرے نیلے رنگ کی پینٹ پہن رکھی تھی۔ تیمور کو خیال آیا کہ اس نے اسے عدالت... میں دیکھا تھا پھر عدالت کے کوریڈور میں بھی۔ وہ عام لوگوں کے مقابلے میں زیادہ خوش لباس اور وجیہہ تھا اس لیے اسے دیکھ کر اس کی شخصیت ذہن میں رہ جاتی تھی۔

''یار! اس وقت تو کوئی ایسا آدمی بھی نہیں ہے جو اس کا پیچھا کرے۔'' تیمور نے سیل فون کان سے لگائے لگائے نعیم سے کہا۔ ''وہ تو جا رہا ہے۔'' پھر وہ سر جھٹک کر بولا۔ ''ہو گا کچھ، اب میں ڈیوٹی پر تو ہوں نہیں کہ کوئی میرا پیچھا کرے گا۔''

وہ دونوں وہاں سے بات کرتے ہوئے پارکنگ لاٹ میں آئے تو وہ نوجوان اپنی موٹر سائیکل پر وہاں سے نکل رہا تھا۔ منصور کچھ دیر پہلے جا چکا تھا۔ اسے فوری طور پر کھاریاں پہنچنا تھا۔

☆☆☆

تیمور اپنی لینڈ کروزر میں جی ٹی روڈ پر انتہائی تیز رفتاری سے جا رہا تھا۔ وہ اس وقت تنہا ہی تھا لیکن پوری طرح مسلح تھا۔ اس کی ملازمت ضرور گئی تھی لیکن اس کے دشمنوں کی تعداد ہزاروں میں نہیں تو سیکڑوں میں ضرور ہو گی۔ وہ اس کے ذاتی دشمن نہیں تھے بلکہ ملک اور قوم کے دشمن تھے۔ وہ اب بھی تیمور کو نقصان پہنچا سکتے تھے۔

رات کا اندھیرا تیزی سے پھیل رہا تھا۔ ویران سی ایک جگہ پر تیمور کو دو گاڑیاں دکھائی دیں جو سڑک کے کنارے کھڑی تھیں۔ ایک گاڑی دوسری کے سامنے کچھ اس انداز میں کھڑی تھی کہ اسے دیکھتے ہی محسوس ہوتا تھا کہ اس گاڑی نے پہلی گاڑی کا راستہ مسدود کر کے اسے رکنے پر مجبور کیا ہے۔ دونوں گاڑیاں خالی تھیں۔ آگے والی گاڑی کے اگلے دونوں دروازے کھلے ہوئے تھے۔

تیمور کے تربیت یافتہ ذہن نے یہ سب کچھ لمحے کے ہزارویں حصے میں محسوس کر لیا۔

اچانک اس کے کانوں میں ایک گھٹی گھٹی آواز آئی۔

''بچاؤ... بچاؤ... ہیلپ... ہیلپ...'' آواز نسوانی تھی۔

تیمور کچھ مزید آگے بڑھا تو آواز دوبارہ سنائی دی۔ اس دفعہ وہ بہت واضح تھی۔ ''تمہیں اللہ رسول کا واسطہ مجھ پر رحم کرو۔ میرے پاس جو کچھ ہے تم لے لو... میری گاڑی بھی لے جاؤ لیکن...''

''بکواس بند کر۔'' کوئی غرا کر بولا۔

تیمور نے ان دونوں گاڑیوں سے آگے لے جا کر اپنی گاڑی روکی اور اپنا پسٹل لے کر تیزی سے ان آوازوں کی طرف بڑھا جو خودرو گھنی جھاڑیوں کے عقب سے آ رہی تھیں۔

''دیکھو... آگے مت بڑھنا... ورنہ...'' لڑکی نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

''ورنہ... ورنہ کیا؟'' اب دوسری مردانہ آواز سنائی دی۔

تیمور نے چھلانگ لگا کر اچانک وہ جھاڑیاں پار کیں اور وہاں پہنچ گیا۔ ''ورنہ یہ کہ تم لوگ اپنی جان سے جاؤ گے۔'' تیمور نے آتش فشاں لہجے میں کہا۔

''کون ہے بے تو؟'' ان میں سے ایک چیخ کر بولا۔

تیمور نے دیکھا، دوسرا آدمی اپنا ریوالور نکال رہا تھا۔ اس نے اچانک اس کے اسی ہاتھ پر فائر کر دیا۔ وہ کربناک انداز میں چیخا اور اپنا زخمی ہاتھ دوسرے ہاتھ سے پکڑ کر کراہنے لگا۔

''تم نے حرکت کی تو تمہارا ابھی یہی انجام ہو گا۔'' اس نے دوسرے بدمعاش سے کہا جو پہلے کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ سرکش لگ رہا تھا۔ ''اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھو اور سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔'' تیمور نے درشت لہجے میں اسے حکم دیا۔ ''ورنہ اس مرتبہ میں تمہارے ہاتھ کو نہیں بلکہ کھوپڑی کو نشانہ بناؤں گا۔''

اس نے جلدی سے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لیے۔

تیمور آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھا اور اچانک گھوم کے اس کی پشت پر پہنچ گیا۔ پھر اس نے نہایت مہارت سے اس بدمعاش کی تلاشی لی۔ اس کی جیب میں بھدا سا ایک درہ ساختہ ریوالور موجود تھا۔ اس کے علاوہ ایک چوڑے پھل کا چاقو اور ساڑھے پانچ سو روپے بھی تھے۔

اس سے فارغ ہو کر اس نے دوسرے بدمعاش کی تلاشی لی جو ابھی تک کراہ رہا تھا۔

اس نے شاید زندگی میں پہلی مرتبہ گولی کا زخم کھایا تھا۔ خوف سے اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ ابھی اتنا اندھیرا نہیں پھیلا تھا کہ تیمور کو دیکھنے میں دقت ہوتی۔

''اب بتاؤ، کون ہو تم لوگ اور اس لڑکی کے پیچھے کیوں لگے ہوئے تھے؟''

زخمی بدمعاش نے نحیف آواز میں کہا۔ ''ہمیں تو یہ لڑکی اچانک نظر آ گئی تھی۔ استاد نے کہا کہ...''

''شیدے!'' استاد ڈپٹ کر بولا۔ ''اب تیری زبان سے ایک لفظ بھی نکلا تو...''

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا کیونکہ تیمور نے اچانک اس کی پشت پر زوردار لات ماری تھی۔ ''چل تو ہی بتا کہ تو کون ہے؟'' تیمور نے اس سے پوچھا اور اپنی گن اس کی کنپٹی پر رکھ دی۔

''میں سعید ہوں... لاہور میں ایک آٹو ورکشاپ ہے، اس میں مکینک ہوں۔''

''وہ تو خیر تیری حالت ہی بتا رہی ہے تو اس لڑکی کے پیچھے کیوں لگا تھا؟''

''میں نے سوچا کہ اکیلی لڑکی ہے، گاڑی بھی دو سال پرانے ماڈل کی ہے، اور اس کے پاس کیش بھی ہو گا۔''

''ان سب چیزوں کے علاوہ لڑکی تم لوگوں کو بونس میں مل رہی تھی۔'' تیمور نے طنزیہ لہجے میں کہا پھر اس نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ ایک کونے میں سمٹی سمٹائی بیٹھی تھی۔ اس کے جسم پر جدید تراش کا لباس تھا۔ قمیص کا گلا خاصا نیچا تھا۔ بھاگ دوڑ میں اس کے کپڑے جھاڑیوں میں اٹک کر کچھ پھٹ گئے تھے لیکن چہرے پر خراش نہیں آئی تھی۔ اس کے بال بے ترتیب ہو گئے تھے جو اس نے جلدی سے سمیٹ لیے۔ وہ خاصی پُرکشش اور خوب رو لڑکی تھی۔ کانوں میں دل کی شکل کے سونے کے بُندے تھے اور ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں بھی تھیں۔ ممکن ہے یہ سب جیولری سونے کی نہ ہو لیکن موجودہ حالات میں تو ایسی جیولری پہن کر تنہا نکلنا چور اچکوں کو خود ہی دعوت دینا تھا۔

تیمور فوری طور پر کسی بکھیڑے میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ اس نے دونوں بدمعاشوں سے کہا۔ ''اب یہاں سے دفع ہو جاؤ، آئندہ تم لوگوں نے ایسی کوئی حرکت کی تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تم لوگ شاید مجھے جانتے نہیں ہو۔''

وہ دونوں اٹھے اور یوں بھاگے جیسے موت ان کا تعاقب کر رہی ہو۔

ان کے جانے کے بعد تیمور نے لڑکی سے کہا۔ ''اب تم بھی نکلو یہاں سے۔''

''میں... یہاں سے... اب اکیلی تو نہیں جاؤں گی۔ ہو سکتا ہے وہ... دونوں میری گھات میں بیٹھے ہوں۔''

''تم کہاں جا رہی ہو؟'' تیمور نے پوچھا۔

''میں جہلم جا رہی ہوں۔ وہاں میرے ایک چچا رہتے ہیں۔''

''تمہارا نام کیا ہے؟'' تیمور نے پوچھا۔

''میرا نام شمائلہ ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میں لاہور کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ریسپشنسٹ ہوں۔''

''چلو، تم میری گاڑی کے آگے آگے چلو، میں بھی جہلم کی طرف جا رہا ہوں۔'' تیمور نے کہا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

دونوں بدمعاشوں کی گاڑی وہاں سے غائب تھی۔ لڑکی کی ہنڈا سوک اگرچہ دو سال پرانی تھی لیکن بالکل نئی لگتی تھی۔

تیمور نے لڑکی سے پوچھا۔ ''یہ گاڑی تمہاری اپنی ہے؟''

''نہیں، یہ ہوٹل کی گاڑی ہے۔ میں ایمرجنسی میں جہلم جا رہی ہوں اس لیے یہ کار اپنے جی ایم سے مانگ لی تھی۔ میرے چچا کی حالت بہت خراب ہے۔''

"اچھا اب چلو، پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔" تیمور نے کہا۔

اس نے اپنی گاڑی کا انجن اسٹارٹ کیا اور شائلہ کو آگے آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ اس کے آگے بڑھنے کے بعد تیمور کی لینڈ کروزر بھی حرکت میں آ گئی۔ اس نے دیکھا کہ لڑکی نے گاڑی سڑک پر لا کے سیل فون نکالا اور ڈرائیونگ کے دوران میں کسی سے باتیں کرنے لگی۔

☆☆☆

فلپ اور جیک اس وقت کمرے میں بیٹھے تھے۔ فلپ نے کہا۔ "تم نے جن لوگوں کو شائلہ کے اغوا کا ڈراما کرنے کے لیے بھیجا تھا، وہ لوگ اب تک وہاں پہنچے کیوں نہیں؟"

اچانک فلپ کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ فلپ نے چونک کر سیل فون اٹھا کر دیکھا پھر بولا۔ "شائلہ کی کال ہے۔" اس نے بٹن دبا کر کال ریسیو کر لی۔

"ہیلو شائلہ! ہاں... کیا رہا؟... اچھا... ویری گڈ... تم اس وقت کہاں ہو... کیوں تیمور نے تمہیں اپنی گاڑی میں نہیں بٹھایا؟... اچھا ٹھیک ہے... بس تم کسی طرح تیمور کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کرو... تمہارے چچا... ہاں ہاں اس کا بندوبست بھی ہو گیا ہے۔ جہلم کے ڈسٹرکٹ ہاسپٹل میں خیر دین نام کا ایک مریض ہے جس پر دل کا دورہ پڑا ہے... ہاں، میں نے اس کے بیٹے کو تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے، میں جانتا ہوں بے بی... ہاں، وہ بال کی کھال تو نکالے گا... اس لیے یہ بندوبست کرنا پڑا... او کے وش یو گڈ لک۔" اس نے سلسلہ منقطع کر کے جیک سے کہا۔ "ہمارا ڈراما کامیاب رہا ہے اور تیمور دھوکا کھا گیا ہے لیکن تمہارے آدمیوں سے ایک غلطی ہو گئی ان لوگوں نے شائلہ کی گاڑی کے ٹائروں کو ناکارہ نہیں کیا ورنہ اس وقت وہ بھی تیمور کے ساتھ ہوتی۔"

"یہ اچھا ہی ہے۔" جیک نے کہا۔ "تیمور کے ساتھ ہوتی تو وہ تم سے اتنی کھل کر بات کیسے کرتی؟" فلپ نے گھور کر اسے دیکھا۔ "ہم نے شائلہ کو پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ وہ کیا بات کرے گی اور اس کا مطلب کیا ہوگا؟ پھر اس نے کسی کا نمبر ملایا اور بولا۔ "ہاں شفیق! وہ لڑکی جہلم کی طرف آ رہی ہے۔ تم ہاسپٹل کے گیٹ پر موجود رہنا۔ وہ بلیک رنگ کی ہنڈا سوک میں ہے۔ ہاسپٹل میں داخل ہوتے وقت وہ ڈرائیونگ سیٹ کی طرف کا شیشہ اتار دے گی۔ اس نے دل کی شکل کے بندے پہنے ہوئے ہیں۔ تم اسے شائلہ کہہ کر مخاطب کرو گے تو وہ تم سے بات کرے گی۔ بہت ہوشیار رہنا۔ میں نے اتنی رقم تمہیں یونہی نہیں دی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ "یس کم اِن۔" فلپ نے کہا۔

دوسرے ہی لمحے وہی نوجوان اندر داخل ہوا جسے تیمور نے عدالت کے احاطے میں دیکھا تھا۔ اس وقت بھی اس نے وہی نیلی قمیص پہن رکھی تھی۔

"ویل ڈن ناصر!" فلپ نے کہا۔ "تمہاری اطلاع سو فیصد درست ثابت ہوئی۔ تم نے بتایا تھا کہ تیمور آج کسی وقت جہلم جائے گا وہ اس وقت جہلم پہنچنے والا ہوگا۔" یہ کہہ کر اس نے کوٹ کی جیب سے کچھ بڑے نوٹ نکالے اور بغیر گنے ناصر کی طرف بڑھا دیے۔

ناصر نے وہ نوٹ لے کر اپنی جیب میں رکھے اور بولا۔ "تیمور اور اس کا ساتھی مجھے گھور گھور کر دیکھ رہے تھے جیسے انہیں مجھ پر شک ہو گیا ہو۔"

"نو پرابلم۔" فلپ مسکرا کر بولا۔ "اسے شک ہو بھی جائے تو کیا ہے۔ ہمارا مقصد تو پورا ہو چکا ہے۔" پھر وہ ناصر سے بولا۔ "تم کافی لو گے یا..."

"نو تھینکس۔" ناصر نے کہا۔ "میں کچھ بھی نہیں لوں گا۔ مجھے اب اجازت دیں۔"

اس کے جانے کے بعد فلپ بیٹھا ہی تھا کہ جیک کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے چونک کر اپنے سیل فون کا اسکرین دیکھا، پھر حیرت سے بولا۔ "یہ غلام رسول اس وقت کیوں کال کر رہا ہے؟"

"اسے پیسے چاہیے ہوں گے۔" فلپ نے کہا۔ "ان پاکستانیوں میں یہ بہت بری عادت ہے کہ کام کرتے ہی پیسوں کا تقاضا کرتے ہیں حالانکہ تم نے اسے اچھی خاصی رقم دی ہو گی۔"

"کیا امریکا میں یہ نہیں ہوتا؟" جیک نے کہا۔ "وہاں بھی لوگ سو قسم کے کاموں کا آدھا معاوضہ پہلے مانگتے ہیں اور آدھا کام ہوتے ہی۔" اس نے سیل فون کان سے لگا لیا۔

"ہاں غلام رسول! وہاٹ...؟ کیسی گڑبڑ؟"

اس کی بات سن کر فلپ بھی چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"تم وہاں پہنچے تو... وہاٹ؟" جیک پھر دہاڑا... "تم نے اپنے کچھ اور لوگوں کو بھی اس کام پر لگایا تھا؟ واپس آ جاؤ اور مجھ سے ملو۔" جیک نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

"کیا ہوا؟" فلپ نے بے چینی سے پوچھا۔ "کیا

تیمور کو ہمارے ڈرامے کے بارے میں معلوم ہو گیا؟"

"نہیں۔" جیک نے کہا۔ "بلکہ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات ہوئی ہے۔"

"یار! صاف صاف بتاؤ۔" فلپ جھنجلا گیا۔

"غلام رسول اور اس کے آدمی اس لڑکی کو اغوا نہیں کر سکے۔ وہ دوبارہ جی ٹی روڈ پر پہنچے تو انہیں لڑکی کی گاڑی دکھائی دی لیکن اس کے پیچھے تیمور کی لینڈ کروزر بھی تھی اس لیے وہ لڑکی کو اغوا کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔"

"تو پھر یہ کام کس نے کیا؟" فلپ حیران ہو کر بولا۔

"یہ تو شائلہ سے معلوم کرنا پڑے گا۔"

"حیرت کی بات ہے۔ یہ حرکت کس کی ہو سکتی ہے؟" فلپ نے کہا۔ "کیا کوئی اور پارٹی بھی تیمور میں دلچسپی لے رہی ہے؟"

"کسی اور کو دلچسپی ہوتی تو وہ تیمور کا راستہ روکتا۔ وہ شائلہ کو کیا جانے؟"

تھوڑی دیر بعد وہاں جونی، میک اور انجلی بھی آ گئی۔

"کیا رہا؟" جونی نے پوچھا۔

جیک نے مختصراً اسے بتایا کہ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔

اسی وقت فلپ کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے اسکرین پر نظر ڈالی اور کال ریسیو کر کے بولا۔ "ہاں، شائلہ!"

"میں جہلم پہنچ چکی ہوں۔ اپنے بیمار چچا سے بھی مل چکی ہوں اور تیمور کو بھی کسی حد تک شیشے میں اتار لیا ہے۔ وہ اپنے گھر والوں سے مل کر دوبارہ یہاں آئے گا۔ شفیق نے اس کے سامنے اپنی غربت کا ایسا نقشہ کھینچا کہ تیمور کا دل پسیج گیا۔ اس نے مجھے جہلم کے ایک اچھے ہوٹل میں کمرا بک کرا دیا ہے۔ چچا تو گاؤں میں رہتے ہیں۔ جہلم میں ان کا مکان نہیں ہے۔ تیمور نے تو شفیق سے بھی کہا تھا کہ تم بھی ہوٹل میں ٹھہر جاؤ لیکن باپ کی وجہ سے اس نے انکار کر دیا۔ آخر وہ شفیق کا تو حقیقی باپ ہے۔"

"ویل ڈن شائلہ! تم بہت اچھی جا رہی ہو۔ بس کسی طرح تیمور سے دوستی کر لو۔"

"وہ مجھے ایسا آدمی لگتا نہیں ہے جو لڑکیوں کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ لڑکیاں تو مردوں کی نظریں پہچانتی ہیں۔"

"بس یہی تو تمہارا امتحان ہے۔" فلپ نے کہا۔ "یہ سمجھ لو کہ یہ تمہارے لیے ایک چیلنج ہے۔" وہ مسکرایا۔ "او کے، وش یو گڈ لک۔" اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

"یہ ان پاکستانی بیک ورڈ لڑکیوں کا کام نہیں ہے۔" انجلی نے منہ بنا کر کہا۔

"ارے چھوڑو۔" جونی نے کہا۔ "آؤ، میں تمہیں لونگ ڈرائیو پر لے چلوں۔"

ان دونوں کے جانے کے بعد جیک نے کہا۔ "میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ بگ باس نے انجلی کو ہمارے سروں پر کیوں مسلط کیا ہے؟"

"تم شاید انجلی سے اچھی طرح واقف نہیں ہو۔" فلپ نے کہا۔ "وہ یہاں کی مقامی زبان یعنی اردو ہم سے بھی اچھی بولتی ہے۔ ہم لوگوں میں صرف جونی اور میک ہی ایسے ہیں جو اردو سے ناواقف ہیں۔" فلپ کچھ توقف کے بعد بولا۔ "اس کے علاوہ انجلی مارشل آرٹ میں ماہر ہے... بہترین پیراک ہے اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ ...... بہت بہترین ڈرائیور ہے۔ اس کی ضرورت ہمیں کہیں بھی پڑ سکتی ہے۔"

"یہ نازک اندام لڑکی مارشل آرٹ کی ماہر ہے؟" جیک نے کہا اس پر فلپ مسکرانے لگا۔

☆☆☆

تیمور اچانک گھر پہنچا تھا تو اس کے گھر والوں کو بے انتہا خوشی ہوئی۔ داجی نے اسی وقت دو بکرے منگا کر اس کا صدقہ اتارا۔ اس سے ملنے گاؤں کے کئی لوگ آئے لیکن تیمور چند ایک کے علاوہ کسی سے بھی نہیں ملا اور طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر دیا۔

دوسری صبح وہ پھر نکلنے لگا تو داجی نے پوچھا۔ "پُتر! اب تو کہاں جا رہا ہے؟"

"میں جہلم تک جا رہا ہوں داجی۔" تیمور نے کہا۔ "وہاں مجھے کچھ ضروری کام ہے۔"

"پُتر! اس علاقے میں ہمارے سو سجن اور سو دشمن ہیں تو اپنے ساتھ دین محمد اور احمد علی کو لے جا۔"

"داجی! یہاں بھلا میرا کون دشمن ہو سکتا ہے؟" تیمور نے کہا۔

"پُتر! تو نہیں جانتا کہ ہمارے یہاں کتنے دشمن ہیں۔ حاسد تو ہر جگہ ہوتے ہیں۔ میری بات مان تو دین محمد اور احمد علی کو لے جا۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولے۔ "وہ تیرے ساتھ گاڑی میں نہیں بیٹھیں گے، دوسری گاڑی میں تیرے پیچھے پیچھے چلیں گے۔"

"یہ تو مجھے بالکل پسند نہیں داجی۔" تیمور نے کہا۔ "میں انہیں اپنے ساتھ ہی لے جاؤں گا۔"

"احمد علی بہت اچھا ڈرائیور ہے۔ وہ گاڑی ڈرائیو کر لے گا۔" داجی نے کہا۔

"اور دین محمد اس کے ساتھ پسنجر سیٹ پر بیٹھ جائے

گا۔'' بابا نے کہا۔ ''تو آرام سے صاحب بہادر بن کر پچھلی سیٹ پر بیٹھتا۔''

تیمور جہلم پہنچا تو دن کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ اس کی لینڈ کروزر احمد علی ڈرائیو کر رہا تھا اور اس کے ساتھ دین محمد بیٹھا تھا۔ وہ دونوں پوری طرح مسلح تھے۔ خود تیمور بھی مسلح تھا۔ اس نے اپنے بغلی ہولسٹرز میں دو دو ریوالورز لگا رکھے تھے۔ اس نے اوپر سے جیکٹ پہن لی تھی۔ اس کے دونوں ریوالورز لائسنس یافتہ تھے۔

وہ پہلے ہاسپٹل پہنچا۔ شفیق وہاں موجود تھا۔ تیمور کو دیکھ کر وہ بھاگا ہوا اس کے پاس پہنچا۔

''کیسی طبیعت ہے اب چاچا خیر دین کی؟'' تیمور نے پوچھا۔

''ان کی طبیعت تو ٹھیک ہے جی لیکن...''

''لیکن کیا؟'' تیمور نے پوچھا۔

''اسپتال کا بل اور دواؤں کا خرچہ...''

''اس کی فکر تم مت کرو۔'' تیمور نے کہا۔ ''میں ابھی ڈاکٹرز سے ملتا ہوں اور صحیح صورتِ حال معلوم کرتا ہوں۔''

''ابھی وہ بھی آپ کو پوچھ رہی تھیں۔'' شفیق نے کہا۔

''کون؟'' تیمور نے پوچھا۔

''وہ شمائلہ جی!''

''اچھا، وہ تمہارے چاچا کی بیٹی؟ وہ کہاں ہیں؟''

''ان کے موبائل میں بیلنس ختم ہو گیا تھا۔ وہ موبائل کارڈ لینے گئی ہیں۔'' شفیق نے کہا۔

''میں ذرا ڈاکٹر صاحب سے بات کر لوں۔'' تیمور نے کہا اور اندر کی طرف بڑھ گیا۔

وہ ڈاکٹر کے روم میں پہنچا تو وہ کوئی ایکسرے دیکھ رہا تھا۔ تیمور نے کہا۔ ''ایکسکیوز می۔''

ڈاکٹر نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر حیرت نظر آئی پھر وہ آگے بڑھ کر تیمور سے لپٹ گیا۔ ''تو کہاں غائب ہے تیمور؟'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''آج برسوں بعد تیری شکل نظر آئی ہے۔''

''تو کیسا ہے عادل؟'' تیمور نے پوچھا۔

''میں جیسا بھی ہوں، تیرے سامنے ہوں۔'' عادل نے کہا۔

عادل اس کے ساتھ مری کے اسکول، پھر کالج میں پڑھتا رہا تھا۔ انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد تیمور نے آرمی جوائن کر لی اور عادل نے ایم بی بی ایس میں داخلہ لے لیا۔

''اچھا یہ بتا، تو آج کل کس شہر میں ہے۔ جب میں لاہور میں تھا تو تو آرمی کی ٹریننگ کر رہا تھا، پھر تو کوہاٹ چلا گیا۔''

تیمور کے دل پر گھونسا سا لگا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''میں آج کل لاہور میں ہوں۔''

''اب تک تو تو جنرل بن گیا ہو گا؟'' عادل نے ہنس کر کہا۔

عادل اس کے دل پر چرکے پر چرکے لگا رہا تھا۔ اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ''تو کیا مجھ پر طنز کر رہا ہے؟''

''یار! تو اب تک پہلے کی طرح بات بات پر برا مان جاتا ہے۔ یہ بتا، گھر میں تو سب خیریت ہے؟ تجھے کیسے معلوم ہوا کہ میں جہلم میں ہوں؟''

''مجھے معلوم نہیں تھا کہ تو ماہرِ امراضِ قلب ہو چکا ہے۔ میں ایک مریض کے سلسلے میں آیا تھا۔''

''تیرا کون سا مریض ہے یہاں؟'' عادل نے حیرت سے پوچھا۔

''یار! وہ ہمارا ایک مزارع تھا، خیر دین۔ اس کے بارے میں...''

''اچھا وہ خیر دین!'' عادل جلدی سے بولا۔ ''اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ اس کا بائی پاس ہو گا اور ظاہر ہے اسے لاہور لے جانا پڑے گا۔''

''بائی پاس ہو گا؟'' تیمور نے کہا۔

''ہاں، اگر اس کا بائی پاس نہ کیا گیا تو اس کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ میں نے اس کے بیٹے کو تو سمجھا دیا تھا لیکن شاید اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔''

''میں اس کے بیٹے سے بات کر لیتا ہوں۔'' تیمور نے کہا۔ ''تجھ سے تو اب ملاقات ہوتی رہے گی۔ میں ابھی جہلم میں ہی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ باہر نکل آیا۔

کوریڈور میں شفیق کے ساتھ شمائلہ بھی موجود تھی۔ تیمور کو دیکھ کر شفیق لپک کر اس کے پاس آیا اور بولا۔ ''کیا کہہ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب؟''

''تم فوری طور پر لاہور جانے کی تیاری کرو۔'' تیمور نے کہا۔ ''تمہارے ابا کا علاج یہاں نہیں ہو سکتا۔ انہیں لاہور لے جانا پڑے گا۔''

''لاہور؟'' شفیق تھوک نگل کر مرے مرے لہجے میں بولا۔

''ہاں، ان کا بائی پاس ہو گا۔ بائی پاس بہت بڑا آپریشن ہوتا ہے۔''

''اس میں خرچہ کتنا آتا ہے جی؟'' شفیق نے پوچھا۔

''شفیق بھائی!'' شمائلہ نے کہا۔ ''بائی پاس میں تو اچھا خاصا خرچہ ہو گا۔ لاہور کے کسی سرکاری اسپتال میں تو تمہیں کئی مہینے بعد کی تاریخ ملے گی۔ اس کے باوجود وہاں ڈیڑھ، دو لاکھ روپے تو خرچ ہو ہی جائیں گے۔''

''میں ذرا اپنے گھر والوں سے بات کر لوں۔'' شفیق نے جیب سے سیل فون نکالا اور کوریڈور کے ایک گوشے میں چلا گیا۔

☆☆☆

فلپ اس وقت کہیں جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ سیل فون کی گھنٹی بجی۔ نمبر اس کے پاس محفوظ تھا۔ اس نے سیل فون کان سے لگا لیا اور بولا۔ ''ہاں شفیق؟''

''سر جی... میرے باپ کی حالت تو بہت خراب ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اسے لاہور لے جانا پڑے گا۔ میرے پاس تو اتنے پیسے نہیں ہیں۔''

''تمہیں کتنے پیسوں کی ضرورت ہے؟'' فلپ نے اکتائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''مجھے دو لاکھ روپے کی ضرورت تو پڑے گی۔'' شفیق نے کہا۔

''میں نے تمہیں پچاس ہزار روپے دیے تو تھے۔ میری سیکریٹری کو یہاں کچھ لوگوں سے خطرہ تھا۔ میں نے اسے تمہاری کزن بنا کر جہلم بھیج دیا۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ...''

''آپ میری مجبوری بھی تو سمجھیں صاحب۔'' شفیق نے رو دینے والے انداز میں کہا۔

''اچھا، میں کچھ کرتا ہوں۔'' فلپ نے کہا۔ ''لیکن یہ بات کسی کو معلوم نہ ہو کہ شمائلہ تمہارے چچا کی بیٹی نہیں ہے۔''

''نہیں معلوم ہو گی صاحب۔'' شفیق جلدی سے بولا۔

''اگر کسی کو بھی معلوم ہوا تو تمہارا باپ تو بیماری کی وجہ سے مر ہی جائے گا۔ میں تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

''آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں صاحب! آپ مجھ پر اتنا بڑا احسان کریں گے تو میں کسی کو کیوں بتاؤں گا؟''

''ٹھیک ہے، کل میرا آدمی رقم لے کر پہنچ جائے گا۔'' یہ کہہ کر فلپ نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

اس وقت جونی اور جیک کمرے میں داخل ہوئے۔ جیک نے کہا۔ ''فلپ! کیا ہم لوگ یہاں صرف آرام کی غرض سے آئے ہیں؟ جب سے آئے ہیں صرف آرام کر رہے ہیں۔ تمہارا پلان کیا ہے؟''

''میں ابھی اس پر کام کر رہا ہوں۔ پاکستانی اب بہت چالاک ہو گئے ہیں۔ خاص طور پر ان کی ایجنسیاں تو بہت زیادہ سرگرمِ عمل ہیں۔''

''تو کیا، ہم مشن ادھورا چھوڑ کر واپس چلے جائیں؟''

''میں نے جب بھی کسی کام کا بیڑا اٹھایا ہے تو اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے۔''

''لیکن یہاں ہماری دال گلتی نظر نہیں آتی۔'' جیک نے کہا۔ ''یہاں ایجنسیوں نے ایسا فول پروف سسٹم بنا رکھا ہے کہ...''

''تم شاید بھول رہے ہو کہ میں الیکٹرانک کا ماہر ہوں۔ جب بگ باس نے لندن کے ایک میوزیم سے لاکھوں پاؤنڈز کے نوادرات کیسے نکالے تھے۔ وہاں بھی انتہائی حساس اور جدید ترین الیکٹرانک فول پروف سسٹم تھا۔ کیا وہاں تک پہنچنے میں کسی بھی دشواری کا سامنا ہوا تھا، کوئی سی سی ٹی وی کیمرا، کوئی الارم کام کر سکا تھا؟''

''اس کی بات اور تھی۔'' جیک نے کہا۔

''یہی تو میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ وہ اس کے مقابلے میں بہت چھوٹا آپریشن تھا لیکن اس کی تیاری میں ہمیں مہینوں لگ گئے تھے۔''

''لیکن اب ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔''

''میں جانتا ہوں اور تم شاید بھول رہے ہو کہ اس ٹیم کا لیڈر میں ہوں۔''

''او مین، کم آن۔'' میک نے کہا۔ وہ نہ جانے کب کمرے میں آ گیا تھا۔ ''تمہیں ایسی کیا جلدی ہے۔ بگ باس نے ہمیں کوئی ٹائم فریم نہیں دیا ہے۔ فلپ ہمارا ٹیم لیڈر ہے اور بہت تجربہ کار بھی ہے۔ بگ باس کو بھی یہی جواب دہ ہے۔ پھر ہم آپس میں کیوں لڑ رہے ہیں؟''

''اختلافِ رائے کا حق تو ہوتا ہے میک۔'' فلپ ہنس کر بولا۔ ''یہ کوئی لڑائی نہیں ہے۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔ ''یہ دیکھو، میں تمہاری باتوں میں ایک اہم بات بھول گیا۔ جہلم میں جس شخص کا باپ بیمار تھا۔ وہ اب اس کے علاج کے لیے مجھ سے دو لاکھ روپے مانگ رہا ہے۔''

''کیا وہ تمہیں بلیک میل کر رہا ہے؟'' جیک نے پوچھا۔

''نہیں بلیک میل تو نہیں کر رہا ہے لیکن بلیک میل کر بھی سکتا ہے۔ اس نے اگر کسی کو بتا دیا کہ شمائلہ اس کی کزن نہیں ہے بلکہ اس کام کے لیے ہم نے اسے پچاس ہزار روپے دیے تھے تو ہمارا سارا پلان چوپٹ ہو جائے گا۔'' پھر وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔ ''اس کا ایک ہی طریقہ ہے۔ جونی! تم جہلم جاؤ اور اس شخص کو ٹھکانے لگا دو۔''

''اس مریض کو؟'' جونی نے پوچھا۔
''مریض کو نہیں بلکہ اس کے بیٹے کو۔'' فلپ نے سفاک لہجے میں کہا۔
''ایسا بھی کیا ہے باس؟'' میک نے کہا۔ ''وہ آخر کسے بتائے گا اور اس کے بتانے سے ہمیں کیا نقصان ہوگا؟''
''تم شاید بھول رہے ہو کہ شمائلہ کے ساتھ تیمور بھی ہے۔ شمائلہ بتا رہی تھی کہ تیمور اس کے ''چچا'' کے سلسلے میں بہت فکرمند ہے اور اکثر اسپتال بھی جاتا ہے۔''
''پھر تو یہ ہمارے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔'' جونی نے کہا۔ ''میں آج ہی جہلم کے لیے روانہ ہو جاتا ہوں۔''
''لیکن بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔'' فلپ نے کہا۔ ''وہاں تیمور بھی موجود ہے۔''
''تیمور... تیمور... تیمور۔'' جونی چڑ کر بولا۔ ''کہو تو شفیق کے ساتھ ساتھ تیمور کے ہاتھ پاؤں بھی توڑ دوں؟ تم چاہتے ہو کہ وہ زندہ رہے تو زندہ رہے گا ہاتھ پیر ٹوٹنے سے کوئی مرتا نہیں ہے۔''
''یہ بات نہیں ہے جونی۔'' فلپ نے ہنس کر کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تم بھی زندہ رہو۔'' پھر وہ موضوع بدل کر بولا۔ ''تم شفیق کو پہچانو گے کیسے؟''
''میں شمائلہ کو پہچانتا ہوں۔'' جونی نے کہا۔ ''وہ شفیق کی نشاندہی کر دے گی۔''
''میں پھر تم سے یہی کہوں گا کہ بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔''

☆☆☆

''اتنے اُداس کیوں ہو شفیق؟'' تیمور نے کہا۔ ''بابا انشاء اللہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔'' اس سے مل کر تیمور اپنا غم بھول گیا تھا۔
''بابا کیسے ٹھیک ہوں گے۔ ان کا آپریشن تو دور کی بات ہے، میرے پاس تو اتنے پیسے بھی نہیں ہیں کہ میں انہیں لاہور ہی لے جا سکوں۔''
''تم اس کی فکر مت کرو۔'' تیمور نے کہا۔ ''بابا کے علاج میں جتنے بھی پیسے خرچ ہوں گے، وہ میں دوں گا۔''
''آ... آ... پ دیں گے؟'' شفیق نے حیرت سے تیمور کو دیکھا۔ ''شمائلہ بی بی بتا رہی تھیں کہ کسی سرکاری اسپتال میں تو انہیں آپریشن کی تاریخ ہی اتنی لمبی ملے گی کہ بابا زندہ ہی نہیں رہ سکیں گے اور پرائیویٹ اسپتالوں میں اس آپریشن پر کم سے کم چھ، سات لاکھ روپے خرچ آتا ہے۔ ہاں، آپ کا کوئی دوست یا رشتے دار یہ آپریشن کرتا ہو تو الگ بات ہے۔''
''تمہارا بینک اکاؤنٹ ہے؟'' تیمور نے پوچھا۔
شفیق اس بات پر ہنسنے لگا۔ ''کیسی بات کرتے ہیں صاحب! میرے پاس کبھی اتنے پیسے ہی نہیں ہوئے کہ انہیں بینک میں رکھنے کی ضرورت پیش آئے۔ میں نے تو کوئی بینک اندر سے بھی نہیں دیکھا۔''
شمائلہ بھی وہاں موجود تھی اور حیرت سے تیمور کو دیکھ رہی تھی کہ یہ شخص لاکھوں کی باتیں یوں کر رہا ہے جیسے چند سو روپے کی بات ہو۔
''کوئی پرابلم نہیں ہے۔'' تیمور نے کہا۔ ''تم ابھی میرے ساتھ چلو اور بینک میں اکاؤنٹ کھول لو۔ میں اس میں دس لاکھ روپے جمع کرا دیتا ہوں۔''
''دس لاکھ!'' شفیق کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ''آپ مجھے دس لاکھ روپے دیں گے؟''
''اگر ضرورت پڑی تو اور بھی دوں گا۔'' تیمور نے کہا۔ ''چلو میرے ساتھ میں تمہارا اکاؤنٹ کھلوا دوں۔ تمہیں اپنے دستخط کرنا تو آتے ہیں نا؟''
''ہاں جی، میں نے پانچ جماعت تک پڑھا ہے۔ میں انگریزی میں بھی اپنا نام لکھ سکتا ہوں۔''
''شمائلہ!'' تیمور نے کہا۔ ''تم یہاں موجود رہو، میں شفیق کا اکاؤنٹ کھلوا کر آتا ہوں۔ ویسے تو یہاں تمہاری ضرورت نہیں ہے لیکن ڈاکٹر ایمرجنسی میں کوئی بھی دوا منگوا سکتے ہیں۔''
وہ دونوں شمائلہ کو چھوڑ کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ تیمور کے گارڈز بھی گاڑی میں موجود تھے۔
ان کے جانے کے بعد جونی اسپتال میں داخل ہوا۔ وہ یوں ظاہر کر رہا تھا جیسے کسی مریض کو دیکھنے جا رہا ہو۔ اس کے ہاتھ میں پھلوں کا ایک شاپر بھی تھا۔ کوریڈور میں اسے اچانک شمائلہ نظر آ گئی۔
شمائلہ بھی اسے دیکھ کر چونک اٹھی۔ جونی سیدھا اس کی طرف بڑھ گیا اور آہستہ سے بولا۔ ''شمائلہ! ذرا میری ایک بات سن لو۔''
شمائلہ اٹھ کر اس کے ساتھ کوریڈور کے دوسرے سرے پر چلی گئی۔
''شفیق کہاں ہے؟'' جونی نے پوچھا۔
''کیوں؟''
''سوال مت کرو، باس نے اس کے لیے پیسے بھیجے ہیں۔''

''وہ پیسے مجھے دے دو۔ میں اس تک پہنچا دوں گی۔'' شمائلہ نے کہا۔ ''ابھی تو وہ کسی ضروری کام سے گیا ہوا ہے۔''
''اور تم اپنے ''چچا'' کی دیکھ بھال کے لیے یہاں رہ گئیں؟''
''مجھے باس نے جس مقصد کے لیے بھیجا ہے میں پورا کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔'' شمائلہ نے سرد لہجے میں کہا۔ ''شفیق کے ساتھ تیمور بھی ہے۔''
''ویری گڈ!'' جونی نے کہا۔ ''اب مجھے شفیق کو پہچاننے میں دقت نہیں ہوگی۔ میں تیمور کو تو اچھی طرح جانتا ہوں۔''
جونی نے پھلوں کا وہ شاپر شمائلہ کے حوالے کیا اور خود سیٹی بجاتا ہوا باہر نکل گیا۔
شمائلہ حیرت سے کبھی پھلوں کے شاپر کو دیکھ رہی تھی، کبھی جونی کو جو مین گیٹ سے باہر نکل رہا تھا۔

☆☆☆

تیمور، شفیق کے ساتھ بینک سے باہر نکلا تو شفیق بہت خوش تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ عقیدت سے تیمور کے پاؤں چوم لے۔
اسپتال کے نزدیک پہنچ کر تیمور نے اس سے کہا۔ ''اب تم بےفکر ہو کر اپنے بابا کے پاس جاؤ۔ میں کل پھر آؤں گا۔ ہاں، یہ میرا ٹیلی فون نمبر رکھ لو۔ اگر اس دوران میں خدانخواستہ کوئی ایمرجنسی ہو جائے تو مجھے ٹیلی فون کر دینا۔''
شفیق نے تیمور کا سیل نمبر اپنے سیل میں محفوظ کر لیا۔
اسپتال کے گیٹ پر پہنچ کر تیمور، شفیق کے ساتھ نیچے اترا اور بولا۔ ''ہاں، اگر شمائلہ اندر ہو تو اسے بھی بھیج دینا۔ وہ بےچاری بھی دو تین گھنٹے سے بےآرام ہے۔ اس سے کہنا کہ وہ بھی ہوٹل جا کر آرام کر لے۔''
ایک الیکٹرک پول کی آڑ میں چھپا ہوا جونی ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اس انتظار میں تھا کہ تیمور وہاں سے جائے تو وہ کوئی کارروائی کرے۔
تیمور چند لمحے کھڑا شفیق کو دیکھتا رہا پھر کچھ سوچ کر وہ بھی شفیق کے پیچھے لپکا۔
جونی نے غصے میں سر جھٹکا اور منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ ''لگتا ہے اس کے ہاتھ پاؤں بھی توڑنا ہی پڑیں گے۔''
وہ اندر جانے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے تیمور کی گاڑی سے دونوں گارڈز کو اترتے دیکھا۔ وہ دونوں اسلحے سے مسلح تھے۔ ان کے گلے میں ایک ایک ریوالور بھی پڑا تھا۔
اس کا سارا جوش و خروش ماند پڑ گیا۔
شفیق نے گھوم کر دیکھا تو تیمور کو آتے دیکھ کر رک گیا۔
''میں نے سوچا کہ ڈاکٹر صاحب سے معلوم کر لوں کہ بابا خیر دین ابھی اس حالت میں ہے کہ وہ لاہور کا سفر کر سکے گا یا نہیں؟''
''اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا تیمور صاحب۔'' شفیق نے ممنونیت سے کہا۔
تیمور اس کی بات کا جواب دیے بغیر ڈاکٹر عادل کے کمرے میں چلا گیا۔
''آ یار! کچھ دیر میرے ساتھ بھی بیٹھ جا۔'' عادل نے کہا۔
''یار تیرے ساتھ بیٹھنے کو بہت وقت ہے، تو یہ بتا کہ بابا خیر دین اس وقت اس پوزیشن میں ہے کہ اسے لاہور منتقل کیا جا سکے؟''
''ابھی کم سے کم میں دو دن اسے انڈر آبزرویشن رکھوں گا۔'' عادل نے کہا۔ وہ انجکشن اور دواؤں سے اس قابل تو ہو جائے گا کہ کسی آرام دہ ایمبولینس میں لاہور تک سفر کر سکے۔''
''اس وقت اس کی حالت کیسی ہے؟'' تیمور نے پوچھا۔
''تو نے دیکھا تو ہے کہ وہ آئی سی یو میں ہے لیکن حالت خطرے سے باہر ہے۔''
''میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ اس کا اٹینڈنٹ بہت زیادہ پریشان ہے۔ اکیلا آدمی ہے اس لیے رات دن جاگ جاگ کر تھک گیا ہے۔ اگر اسے کسی پرائیویٹ نرس کی ضرورت ہو تو اس کا بندوبست کر دے۔''
''یار! پرائیویٹ نرس کیوں؟'' عادل نے کہا۔ ''یہاں موجود نرسیں کس لیے ہیں۔ میں ابھی ایک نرس کی ڈیوٹی لگا دیتا ہوں۔ وہ بابا خیر دین کا خیال رکھے گی اور اس کے بیٹے سے کہنا کہ وہ یہاں بیٹھ کر فضول میں تھکن کا شکار نہ ہو۔ اگر خدانخواستہ کوئی ایمرجنسی بھی ہوئی تو میں اسے ہینڈل کر لوں گا یا اسے کال کر لوں گا۔''
''ہاں، کسی بھی دوا کی ضرورت ہو تو وہ بھی منگوا لینا۔ میں بعد میں اس کی ادائیگی کر دوں گا۔'' تیمور نے کہا۔
''اس کی فکر مت کر۔'' عادل نے کہا۔
تیمور اس سے رخصت ہو کر باہر آیا تو شفیق کے ساتھ شمائلہ بھی موجود تھی۔ تیمور نے شفیق سے کہا۔ ''شفیق! بابا خیر دین کی حالت اب خطرے سے باہر ہے لیکن ڈاکٹر

صاحب کم سے کم چوبیس گھنٹے اسے انتہائی نگہداشت کے شعبے میں رکھیں گے۔ اس صورت میں تمہارا یہاں رکنا فضول ہے۔ میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ ایک نرس ہر وقت بابا خیر دین کی دیکھ بھال کرے گی۔ اگر خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو ڈاکٹر صاحب تمہیں فون کرلیں گے۔ تم بلاجھجک مجھے فون کردینا۔ میں اسی وقت گاڑی لے کر آجاؤں گا۔ ویسے بھی تمہارا گاؤں میرے گاؤں کے راستے ہی میں تو پڑتا ہے۔"

"آپ انسان نہیں فرشتہ ہو صاحب۔" شفیق نے کہا۔

"میں تو پوری طرح انسان بھی نہیں ہوں۔" تیمور نے ہنس کر کہا۔ پھر وہ شمائلہ سے مخاطب ہوا۔ "شمائلہ! اب تم بھی لاہور چلی جاؤ۔ پرسوں تک شفیق، بابا خیر.... کو لے کر لاہور پہنچ ہی جائے گا۔"

"تو پھر میں واقعی جاؤں؟" شمائلہ نے پوچھا۔

"میں تمہیں اپنے گاؤں لے جاتا لیکن میرا گھرانا بہت دقیانوسی ہے۔" تیمور نے اسے ٹالنے کو کہا ورنہ اس کا گھرانا بالکل بھی دقیانوسی نہیں تھا۔ "شفیق کے گھر میں اتنی جگہ نہیں ہوگی۔"

"گھر میں تو جگہ ہے تیمور صاحب لیکن شمائلہ بی بی اس ماحول میں پریشان ہوجائیں گی۔" شفیق نے کہا۔

"میں نے ہوٹل کے کمرے کی پیشگی ادائیگی کردی تھی۔"

"اچھا، پھر میں چلتی ہوں۔" شمائلہ نے کہا اور پارکنگ کی طرف بڑھ گئی۔

شفیق، باپ کو چھوڑ کر جانے پر راضی نہیں تھا لیکن تیمور کے بہت زیادہ اصرار اور اس کی تسلی دینے پر راضی ہوگیا۔

تیمور، شفیق کو اپنی لینڈ کروزر میں لے کر روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

جونی نے انہیں جاتے دیکھا پھر اس نے شمائلہ کا نمبر ملایا اور بولا۔ "شمائلہ! یہ شفیق کہاں گیا ہے؟"

"اسے تو تیمور اس کے گھر چھوڑنے گیا ہے لیکن تم کہاں تھے۔ میں تو اسی انتظار میں رہی کہ تم اب آؤ گے لیکن تم نہ جانے کہاں چلے گئے تھے؟"

"مجھے باس نے ایک ضروری کام سے گجرات بھیج دیا تھا۔" جونی نے کہا۔ "تمہیں معلوم ہے کہ شفیق کس گاؤں میں رہتا ہے؟"

"گل بہار کلاں یا اسی طرح کا کوئی نام ہے اس کے گاؤں کا۔" شمائلہ نے کہا۔ "جہلم سے تقریباً چالیس کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔" پھر وہ کچھ توقف کے بعد بولی۔ "میں بھی آج لاہور جارہی ہوں۔"

"کیوں کیا تمہارا کام ختم ہوگیا؟"

"میرا کام تو ابھی ختم نہیں ہوا ہے لیکن اب یہاں رکنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ کل کسی وقت تیمور بھی لاہور روانہ ہوجائے گا۔" اس نے جان بوجھ کر جونی کو یہ نہیں بتایا تھا کہ تیمور نے شفیق کو دس لاکھ روپے دیے ہیں۔

"او کے جنی!" جونی نے کہا۔ "اب لاہور میں ملاقات ہوگی۔"

"مسٹر جونی!" شمائلہ نے سرد لہجے میں کہا۔ "مجھے تمہارا یہ طرزِ تخاطب پسند نہیں ہے۔" یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کردیا۔

جونی کچھ دیر سوچتا رہا، پھر وہ بھی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا اور بڑبڑایا۔ "اب میں اس شفیق کا کام تمام کرہی دیتا ہوں۔ اس دھول اور مٹی میں مجھ سے نہیں رہا جاتا۔" اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور اس سڑک پر روانہ ہوگیا۔ جو "گل بہار کلاں" کی طرف جاتی تھی۔

☆☆☆

تیمور ابھی جہلم سے روانہ ہی ہوا تھا کہ چند کلو میٹر بعد اس کی گاڑی کا ایک ٹائر برسٹ ہوگیا۔

تیمور جھنجلا کر نیچے اترا۔ دوسری طرف سے احمد علی بھی گاڑی سے باہر آگیا اور دین محمد بھی۔

"صاحب... وہ..." احمد علی ہچکچا کر بولا۔

"احمد علی! وہ... وہ کرنے کے بجائے گاڑی کا ٹائر تبدیل کرو۔"

"صاحب! میں آپ کو یہی بتانے کی کوشش کررہا ہوں کہ گاڑی میں فاضل ٹائر بھی نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟" تیمور کو واقعی غصہ آگیا۔

"صاحب... میرا مطلب ہے کہ وہ ٹائر بھی ناکارہ ہے۔"

"بے وقوف آدمی! تم نے اسے بنوایا کیوں نہیں؟"

"صاحب جی... میرے ذہن میں تو تھا... لیکن میں... بھول گیا تھا۔"

"اب کیا کریں؟" تیمور نے کہا۔ "کیا میں پیدل یہاں سے جاؤں؟"

"جادہ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ وہاں اس وقت پنکچر کی دکانیں بھی کھلی ہوں گی اور پیٹرول پمپ بھی۔ میں دس منٹ میں بنوالاؤں گا۔"

اب رات کا اندھیرا تیزی سے پھیل رہا تھا۔ اچانک تیمور کو ایک گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنی دکھائی دی۔ جہلم کی طرف سے کوئی گاڑی ان کی طرف آرہی تھی۔

وہ گاڑی ان کے نزدیک آکر رک گئی۔ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک نوجوان تھا اور پسنجر سیٹ پر ادھیڑ عمر کا ایک باوقار سا شخص بیٹھا تھا۔

"کیا ہوا بیٹا؟" ادھیڑ عمر شخص نے سر باہر نکال کر پوچھا۔

"چاچا جی! میری گاڑی کا ایک ٹائر پنکچر ہوگیا ہے اور فاضل ٹائر بھی ناکارہ ہے۔"

"میں گل بہار کلاں کے نزدیک چک دو سو پینتیس تک جاؤں گا۔ تم کہاں جاؤ گے؟"

"آپ اگر ہمیں گل بہار کلاں تک چھوڑ دیں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔"

"مہربانی کیسی بیٹا! آؤ بیٹھو۔"

"تم لوگ شفیق سے پتا سمجھ لو اور گاڑی بنوا کر وہیں آجانا۔ میں شفیق کے گھر پر تمہارا انتظار کروں گا۔"

"ٹھیک ہے صاحب۔" احمد علی نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔

تیمور نے ایک مرتبہ پھر ان صاحب کا شکریہ ادا کیا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔

گاڑی تیز رفتاری سے روانہ ہوگئی۔ ان لوگوں کو بھی شاید جلدی پہنچنا تھا اس لیے وہ نوجوان بہت تیز رفتاری سے گاڑی ڈرائیو کررہا تھا۔

آدھے گھنٹے کے اندر اندر وہ گل بہار کلاں پہنچ گئے۔

"تیز رفتاری اچھی چیز ہے لیکن اس وقت تک جب تک گاڑی ڈرائیور کے کنٹرول میں ہو۔" تیمور نے کہا۔

"یہ نالائق تو سمجھتا ہی نہیں ہے۔" ادھیڑ عمر صاحب بولے۔ "ویسے تم کیا گل بہار کلاں میں رہتے ہو؟"

"میں تو رسالہ گاؤں کا رہنے والا ہوں۔" اس کے پردادا رسالدار.... کی وجہ سے اس گاؤں کا نام ہی رسالہ گاؤں پڑ گیا تھا۔ گاؤں کیا، وہ خاصی بڑی جاگیر تھی۔

"اچھا اچھا، کریم خان کے گاؤں کے ہو؟" وہ صاحب بولے۔ "ہم دونوں نے برسوں ایک ہی یونٹ میں ایک ساتھ کام کیا ہے۔ وہ ترقی کرکے کرنل بن گیا۔ میں میجر تک پہنچ کر ہی ریٹائر ہوگیا۔ میرا نام میجر آفتاب ہے۔" پھر وہ چونک کر بولے۔ "اب تم وہاں کیسے جاؤ گے؟"

"میرا ڈرائیور گاڑی بنالائے گا نا؟" میں نے کہا۔

"اچھا بیٹا خدا حافظ۔" انہوں نے کہا اور بیٹے کو چلنے کا اشارہ کیا۔

گاڑی دھول اڑاتی ہوئی آگے بڑھ گئی کیونکہ اب وہ پختہ سڑک سے نیچے آگئے تھے۔

"آپ کرنل صاحب کے بیٹے ہیں نا؟" شفیق نے کہا۔

"ہاں، میں ان کا بیٹا ہوں لیکن میں نے جان بوجھ کر میجر صاحب کو نہیں بتایا ورنہ یہ ابھی اور اسی وقت مجھے اپنے گھر لے جاتے۔ خاطر تواضع کرتے اور آرمی کا کوئی قصہ چھیڑ دیتے۔ اس لیے میں نے انہیں بتانا مناسب نہیں سمجھا۔"

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے گاؤں کی حدود میں داخل ہوگئے۔

"میرا مکان آپ کے شایانِ شان تو نہیں ہے۔" شفیق نے کہا۔ "لیکن..."

"شفیق!" تیمور نے اسے ٹوک دیا۔ "آئندہ میرے سامنے اس قسم کی بات مت کرنا۔ کیسی شان اور کہاں کی شان؟ وہ جاگیر تو میرے باپ دادا نے بنائی ہے۔ میرا اس میں کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ ہاں، میں چاہتا ہوں کہ اپنے گاؤں کے لیے کچھ کروں۔"

اسی دوران میں شفیق ایک پختہ دو منزلہ مکان کے سامنے رک گیا اور بولا۔ "تیمور صاحب! یہ میرا غریب خانہ ہے۔"

"یہ غریب خانہ ہے؟" تیمور نے ہنس کر کہا۔ "کسی غریب نے سن لیا تو بہت برا مانے گا۔"

شفیق بھی اس کی بات پر ہنسنے لگا۔ اس نے دروازے پر دستک دی تو اندر سے کسی عورت کی آواز آئی۔ "کون؟"

"ماں جی! میں شفیق ہوں۔"

دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ صحن میں بلب کی مدھم روشنی تھی۔ تیمور نے دیکھا کہ ادھیڑ عمر کی ایک عورت صاف ستھرے کپڑوں میں وہاں کھڑی ہے۔ "اندر آجاؤ شفیق پُتر! تیرا بابا تو ٹھیک ہے؟"

"بابا بالکل ٹھیک ہے ماں جی۔" شفیق نے کہا۔ "میرے ساتھ ایک مہمان بھی ہے۔"

"بیٹے، تو نے مہمان کو باہر کھڑا کر رکھا ہے۔ اندر لے آ اسے بھی۔"

شفیق کے کہنے پر تیمور بھی اندر داخل ہوگیا۔ ماں جی نے غور سے تیمور کا جائزہ لیا پھر اس کی باوقار شخصیت اور قیمتی

لباس سے مرعوب ہو کر بولیں۔ ''شفیق! مہمان کو بیٹھک میں لے جا، میں چائے پانی کا بندوبست کرتی ہوں۔''

''اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے ماں جی۔'' تیمور جلدی سے بولا۔

''پتر تکلیف کیسی؟ مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔''

شفیق اسے کمرے میں بٹھا کر باہر چلا گیا۔ وہ تقریباً دس بارہ منٹ بعد واپس آیا۔ چند منٹ بعد ماں جی بھی وہیں آگئیں اور بولیں۔ ''بیٹا! تم نے ہم پر اتنا بڑا احسان کیا ہے۔ اللہ تمہارے ماں باپ کو سلامت رکھے، تمہیں بھی عمر عطا فرمائے۔ تم انسان نہیں...''

''ماں جی!'' تیمور نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''آپ مجھے اس طرح شرمندہ کرتی رہیں تو میں ابھی یہاں سے چلا جاؤں گا۔''

''اچھے لوگوں کو تو سب ہی اچھا کہتے ہیں پتر۔'' ماں جی نے کہا۔ ''تم اتنے بڑے خاندان کے ہو لیکن تم میں جاگیرداروں والی کوئی بات نہیں ہے۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولیں۔ ''تم بھی جاگیرداری کرتے ہو؟''

میرے دل پر پھر ایک گھونسا سا لگا۔ میں نے بہت مشکل سے خود پر ضبط کیا اور بولا۔ ''ماں جی! زمین داری میں تو میرا دل لگتا نہیں۔ میں اپنا کاروبار کرنا چاہ رہا ہوں۔''

''ضرور کرو پتر! اللہ ترقی دے گا۔'' پھر وہ بلند آواز میں بولیں۔ ''مینو! چائے یہیں لے آ۔''

اچانک ملگجی روشنی والی اس بیٹھک میں جیسے چاند طلوع ہو گیا۔ وہ اتنی ہی خوب صورت تھی۔ اس کے جسم پر معمولی سی لان کی شلوار قمیص تھی لیکن حسن لباس کی خوب صورتی کا محتاج نہیں ہوتا۔ اس کے چہرے پر ایسی کشش تھی کہ نظریں ہٹانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ اس کا جسم متناسب تھا اور ان معمولی کپڑوں میں بھی قیامت ڈھا رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی بھوری آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ اس کے بال براؤن تھے جو اس وقت اس کی پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے دوپٹا اوڑھ رکھا تھا لیکن دوپٹے کے کناروں سے بھی نیچے اس کے بال لٹک رہے تھے۔ چہرے کی رنگت سرخ و سفید تھی جو اس وقت شاید شرم کی وجہ سے مزید سرخ ہو گئی تھی۔

تیمور نے جلدی سے نظریں ہٹا لیں کہ ماں جی اور شفیق کیا سوچیں گے؟

''یہ میری بیٹی مینو ہے۔'' ماں جی نے کہا۔

''مینو!'' تیمور نے آہستہ سے کہا۔

اس نے چونک کر تیمور کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کو ان دونوں کی نظریں ٹکرائیں اور تیمور کو ایسا لگا جیسے وہ ان گہری آنکھوں میں ڈوب گیا ہو۔

''نام تو اس کا ثمینہ ہے لیکن ہم اسے مینو کہتے ہیں۔''

''بہت خوب صورت نام ہے۔'' تیمور نے کہا۔ حالانکہ اس سے قبل اسے اس نام میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوئی تھی۔

تیمور نے تو یہ بھی دھیان نہیں دیا تھا کہ مینو لے کر کیا آئی تھی۔ تپائی پر گرما گرم پکوڑے تھے، حلوہ تھا، ابلے ہوئے انڈے تھے، مونگ پھلی والا خصوصی گڑ تھا اور نام کے لیے چائے بھی تھی۔ تیمور نے حیرت سے کہا۔ ''ماں جی! یہ چائے ہے؟''

''بیٹا! اس وقت تو اسی کو چائے سمجھ لے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تیری زیادہ خدمت نہیں کر سکی۔''

''ماں جی!'' تیمور نے برا مان کر کہا۔ ''میں...''

''اچھا پتر! غلطی ہو گئی۔ چل اب شروع ہو جا، پتا نہیں تم لوگوں نے دوپہر میں کچھ کھایا ہے یا نہیں۔'' بابا خیر دین کا حال وہ شاید شفیق سے پوچھ چکی تھی اس لیے خاصی مطمئن نظر آ رہی تھی۔

تیمور کو واقعی بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے پہلے گرما گرم پکوڑے کھائے پھر حلوے پر ہاتھ صاف کیا۔ وہ ان چیزوں کا شوقین نہیں تھا لیکن شاید یہ مینو کے خوب صورت ہاتھوں کا جادو تھا جو اسے کھانے پر مجبور کر رہا تھا۔

پھر اس نے چائے کا کپ اٹھایا۔ پہلا گھونٹ لیتے ہی اسے ایسا لگا جیسے اس نے کسی مقوی خمیرے یا شیرے کا گھونٹ لیا ہو۔ مینو نے دودھ میں پتی ڈال کر اس میں نہ صرف الائچی ڈالی تھی بلکہ چائے میں ادرک کا مزہ بھی تھا۔

عام حالات میں تیمور شاید اس چائے کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کرتا لیکن اس وقت وہ شیرہ نما چائے اسے دنیا کا بہترین مشروب لگ رہی تھی۔

اس نے ابھی چائے کے دو چار ہی گھونٹ لیے تھے کہ ایسا لگا جیسے صحن میں کوئی دھپ سے کودا ہو۔ اگر آواز ہلکی ہوتی تو شاید وہ لوگ یہ سمجھتے کہ صحن میں بلی کودی ہے۔

مینو اس وقت شاید باورچی خانے میں تھی۔ آواز سن کر وہ بھی صحن میں نکل آئی۔ دوسرے ہی لمحے اس کے حلق سے سریلی سی ایک چیخ برآمد ہوئی۔

تیمور نے پلک جھپکتے ہی اپنا ریوالور نکال لیا اور باہر کی طرف لپکا۔

وہ جونی تھا جو صحن کی دیوار پھلانگ کر اندر آیا تھا۔ تیمور کو دیکھ کر وہ بری طرح چونک اٹھا۔ اس نے مینو کو ڈھال بنا رکھا تھا اور ایک تیز دھار خنجر اس کے مرمریں گلے پر رکھا ہوا تھا۔ مینو بری طرح سہمی ہوئی تھی اور کسی ایسی چڑیا کی طرح لگ رہی تھی جسے بلی نے اپنے جبڑے میں دبا رکھا ہو۔

''آگے مت بڑھنا تیمور!'' جونی چیخ کر بولا۔ ''ورنہ میں اس بلبل کی گردن پر خنجر پھیر دوں گا۔''

''کیا چاہتے ہو؟'' تیمور نے پوچھا۔

''تم سے میری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ تم بس شفیق کو میرے حوالے کر دو۔''

''شفیق کو؟'' تیمور نے حیرت سے کہا۔ ''شفیق سے تمہاری کیا دشمنی ہے؟''

''باتوں میں وقت ضائع مت کرو تیمور۔'' جونی غرا کر بولا۔ ''ورنہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شفیق کے ساتھ ساتھ تم بھی اپنی جان سے جاؤ۔''

جونی کا قد تیمور کے برابر ہی تھا۔ مینو اس کے سامنے ایسی لگ رہی تھی جیسے ننھی سی کوئی بچی۔

''میری بات سنو!'' تیمور نے کہا۔ ''کیا ہم اطمینان سے بات نہیں کر سکتے۔ پھر تم ایک نرم و نازک لڑکی کا سہارا لے رہے ہو، تم کیسے مرد ہو؟''

''میں تین تک گنوں گا۔'' جونی نے ہذیانی انداز میں کہا۔ ''اگر اس کے باوجود تم نے شفیق کو میرے حوالے نہ کیا تو میں اس نرم و نازک چڑیا کے گلے پر خنجر پھیر دوں گا۔'' اس کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ وہ ایسا کر بھی سکتا ہے۔ اس نے گنتی شروع کر دی۔ ''ایک...''

تیمور کا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ سوائے سر اور گردن کے اس کا پورا جسم مینو کے پیچھے ہوا تھا۔ ایک لمحے کو تیمور نے یہ بھی سوچا کہ وہ اس کے خنجر والے ہاتھ کے شانے پر فائر کر دے لیکن جونی ذرا سا بھی ہلتا تو گولی مینو کو لگ سکتی تھی۔

''دو...'' جونی نے کہا۔

تیمور نے اچانک اپنا ریوالور سیدھا کیا اور پلک جھپکتے میں فائر کر دیا۔ گولی جونی کی پیشانی پر لگی کیونکہ اس کا سر اور پیشانی ہی فائر کرنے کے لیے سب سے مناسب جگہ تھی۔

گولی کے دھماکے کے ساتھ جونی کی کربناک چیخ بلند ہوئی اور وہ الٹ کر گرا۔ مینو دوڑ کر ماں جی سے لپٹ گئی۔ وہ بہت بری طرح کانپ رہی تھی۔ اس کی گردن پر تیز دھار خنجر کا ہلکا سا چرکہ لگ گیا تھا۔ تیمور نے جھپٹ کر پہلے مینو کی گردن کا جائزہ لیا۔ وہ بہت معمولی سا زخم تھا جو شاید اس وقت آیا ہوگا جب جونی گولی کھا کر گرا ہوگا۔

پھر تیمور نے جونی کا جائزہ لیا۔ تیمور کی چلائی ہوئی گولی اس کی پیشانی کے عین وسط میں لگی تھی اور اس کی کھوپڑی کا پچھلا حصہ تربوز کی طرح بکھر گیا تھا۔

''ماں جی! آپ مینو کو اندر لے جائیں۔ اس کی حالت غیر ہو رہی ہے۔''

شفیق اور ماں جی مینو کو سہارا دے کر اندر کمرے میں لے گئے۔

فائر کی آواز سن کر شفیق کے پڑوسی اور دوسرے گاؤں والے ان کے دروازے پر آگئے۔

کسی نے دروازے پر دستک دی اور بلند آواز میں بولا۔ ''شفیق پتر! خیر تو ہے؟''

''ہاں، سب خیر ہے چاچا جی۔ گھر میں ایک چور آگیا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے میرے اشارے پر دروازہ کھول دیا۔

گاؤں کے کئی آدمی ایک دم اندر گھس آئے۔

ایک بزرگ نے کہا۔ ''یہ... تو کوئی انگریز ہے۔''

''تو کیا انگریز چور نہیں ہوتے؟'' میں نے کہا۔

شفیق نے انہیں مختصر طور پر بتایا کہ یہ واقعہ کیسے پیش آیا۔

سنجیدہ سے ایک صاحب بولے۔ ''کوئی بھی لاش کو ہاتھ نہ لگائے۔'' ''شفیق پتر! تو کسی بندے کو پولیس چوکی بھیج دے۔ یہ پولیس کیس ہے۔''

وہ جانتا تھا کہ پولیس چوکی تک کوئی شخص اگر سائیکل پر بھی جاتا تو اسے کم سے کم آدھا گھنٹا تو لگتا۔ یہ الگ بات ہے کہ گاؤں میں کسی کے پاس موٹر سائیکل ہوتی اور وہ اطلاع کرنے چلا جاتا۔

''آپ لوگ سب باہر نکلیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں پولیس کے آنے تک اس مکان کو بند کر رہا ہوں۔'' گاؤں کے ایک شخص نے کسی لڑکے کو سائیکل پر پولیس چوکی کی طرف دوڑا دیا۔

میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں اس سے پہلے بھی قتل کے جرم میں ملوث رہ چکا تھا۔ اس مرتبہ گرفتار ہوتا تو پولیس میرے ساتھ رعایت کرتی، نہ عدالت۔

اسی وقت احمد علی اور دین محمد میری گاڑی لے کر آگئے۔ گھر کے باہر لوگوں کا مجمع تھا۔ وہ سمجھے کہ میں کسی مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ احمد علی چیخ کر بولا۔ ''سب لوگ یہاں سے دفع ہو جاؤ۔'' اس نے اپنی رائفل اتار کر اس کا

رخ مجمع کی طرف کر دیا۔ لوگ گرتے پڑتے وہاں سے بھاگے۔ میں نے احمد علی اور دین محمد کو اندر بلا لیا اور انہیں پورا واقعہ سنا دیا۔ پھر میں نے دین محمد سے کہا۔ ”دین محمد! تم جانتے ہو کہ مجھ پر قتل کا ایک جھوٹا مقدمہ پہلے بھی چل چکا ہے۔ اگر تم...“

”میں سمجھ گیا صاحب۔“ دین محمد نے کہا۔ ”آپ اپنا ریوالور مجھے دے دیں۔ آپ نے مجھے شفیق کے ساتھ یہاں بھیجا تھا۔ ماں جی نے مجھے چائے پینے کو روک لیا۔ اسی وقت ایک شخص دیوار پھاند کر اندر آیا اور اس نے مینو بیٹی کو یرغمال بنا کر گھر کو لوٹنا چاہا۔ ماں جی نے مینو کی شادی کے لیے کچھ زیورات بنوا رکھے ہیں۔ وہ تو غنیمت ہے کہ بابا خیر دین کی بیماری میں ان کے بکنے کی نوبت نہیں آئی۔ ان زیورات میں ماں جی کے زیورات بھی شامل ہیں۔ بس آپ فکر مت کریں۔ اس قتل کے چشم دید گواہ صرف تین آدمی ہیں۔ ماں جی، مینو اور شفیق۔ وہ تینوں یہ گواہی دیں گے کہ اس شخص پر گولی میں نے چلائی ہے۔ بس آپ اتنا کریں کہ اپنے کپڑے مجھے دے دیں اور میرے کپڑے آپ پہن کر یہاں سے احمد علی کے ساتھ نکل جائیں۔ جلدی کریں صاحب جی، میں نے مینو کو بچانے کے لیے اور اپنے دفاع میں اس شخص کو ہلاک کیا ہے۔ اس کی جیب میں ریوالور یا پسٹل بھی ہوگا۔ وہ بھی اس کی جیب سے نکال کر اس کے ہاتھ میں پکڑا دیتا ہوں۔ خنجر پر تو اس کی انگلیوں کے نشانات ہیں ہیں ریوالور پر بھی ہوں گے۔ آپ جائیں مجھے کچھ نہیں ہو گا۔ بڑے صاحب، صبح تک پورے پولیس ڈپارٹمنٹ کو ہلا کر رکھ دیں گے۔“

تیمور نے بیٹھک میں جا کر اپنے کپڑے بدلے۔ دین محمد بھی بیٹھک ہی میں تھا۔ تیمور نے اپنی پینٹ اتار کر اسے دے دی اور اس کی شلوار پہن لی۔ پھر دین محمد نے تیمور کو اپنا کرتہ بھی دے دیا اور اس کی قیمتی شرٹ پہن لی۔ تیمور نے اسے اپنی گھڑی بھی دے دی اور جتنے پیسے نقد تھے۔ سب شفیق کے حوالے کر دیے کہ پولیس اسے بھی پریشان کر سکتی تھی۔

دین محمد کے کپڑے پہن کر اور پگڑی باندھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہی وہ شخص ہے جو کچھ دیر پہلے صحن میں کھڑا تھا۔ تیمور نے دین محمد کی رائفل بھی کندھے سے لٹکا لی اور بولا۔ ”دین محمد! فکر مت کرنا، میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔“

”آپ جائیں صاحب جی! میری کئی پشتوں نے آپ کا نمک کھایا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ اپنے کسی آدمی کو مصیبت میں نہیں چھوڑتے۔“

تیمور رائفل لٹکا کر باہر نکلا تو دروازے سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہوئے لوگ پھر ایک طرف بھاگ لیے۔ وہ اطمینان سے جا کر گاڑی میں بیٹھا۔ اس کے ساتھ احمد علی بھی تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ اس نے سنبھالی اور گاڑی لمحوں میں وہاں سے کئی کلومیٹر دور نکل آئی۔

تیمور گاؤں پہنچا تو سامنے کے دروازے سے جانے کے بجائے وہ .... حویلی کی عقبی سمت سے نیم کے ایک درخت پر چڑھ کر حویلی میں داخل ہوا اور سیدھا اپنے کمرے میں پہنچا۔ اس نے جلدی جلدی غسل کیا۔ دوسرے کپڑے پہنے اور اوپر سے یوں اترا جیسے وہ کافی دیر سے گھر میں موجود ہو۔

اس وقت صرف داجی جاگ رہے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ تیمور کے انتظار میں جاگ رہے ہوں گے۔ تیمور نے سوچا کہ میں داجی کو سب کچھ سچ سچ بتا دوں۔ پھر وہ اپنے طور پر اس مسئلے سے نمٹ لیں گے۔ انہوں نے اب تک بے شمار مقدمے لڑے تھے۔ بس وہ صرف ایک میرے مقدمے میں بے بس ہو گئے تھے کیونکہ کورٹ مارشل کے بعد اس کی اپیل صرف چیف........ اور صدر پاکستان سے کی جاتی ہے لیکن صدر........ نے تو پہلے ہی تیمور کے کورٹ مارشل کے احکامات صادر کر دیے تھے۔

”تیمور پُتر!“ داجی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”تو ابھی اور اسی وقت لاہور نکل جا۔ یہاں کے معاملات سے میں نمٹ لوں گا۔ دین محمد کا بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔ بس تو جا۔ احمد علی کو ساتھ لے جا اور گل بہار کلاں سے بچ کر نکلنا۔“ پھر وہ کچھ سوچ کر بولے۔ ”ایسا کر تو اپنی گاڑی کے بجائے میری گاڑی لے جا۔“

”آپ کی گاڑی بہت قیمتی ہے داجی!“ اس نے کہا۔

”اوئے اس کی قیمت تجھ سے زیادہ تو نہیں ہے۔“

داجی کے پاس جدید ماڈل کی بی ایم ڈبلیو تھی۔

وہ جلدی جلدی تیار ہوا۔ اس وقت رات کے بارہ بج رہے تھے۔ اگر تیمور مناسب رفتار سے بھی چلتا تو صبح ہونے سے پہلے لاہور پہنچ جاتا۔

داجی نے احمد علی سے اپنی گاڑی نکلوائی اور تیمور کو رخصت کرنے حویلی کے گیٹ تک آئے پھر اس کی پیشانی چوم کر بولے۔ ”جا میرا پتر! رب راکھا۔“

احمد علی ڈرائیونگ سیٹ پر تھا۔ وہ گاڑی کو ہوا کی طرح

اڑا رہا تھا۔

صبح ہونے سے پہلے پہلے وہ لوگ لاہور پہنچ گئے۔

تیمور نے احمد علی کو ناشتا کرایا۔ داجی کا حکم تھا کہ تیمور کو لاہور چھوڑ کر احمد علی واپس گاؤں آجائے اور جتنی جلدی ممکن ہو، پہنچ جائے۔

وہ ناشتا کر کے پھر گاڑی لے کے نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد تیمور سونے کے لیے لیٹا ہی تھا کہ شائلہ کی کال آگئی۔ اس نے ناگواری سے اس کی کال ریسیو کی تھی اس وقت وہ صرف سونا چاہتا تھا۔

”تیمور صاحب! آپ خیریت سے تو ہیں؟“

”ہاں، میں بالکل خیریت سے ہوں۔“ تیمور نے چڑ کر کہا۔

”اور شفیق؟“ شائلہ نے پوچھا۔ ”وہ بھی ٹھیک ٹھاک ہے؟“

وہ چونک کر اٹھا اور شائلہ سے پوچھا۔ ”تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“

”ایک منٹ ذرا ہولڈ کریں۔ میرے لینڈ لائن نمبر پر کسی کی کال آرہی ہے۔“

اس نے تیمور کو دو منٹ انتظار کرایا۔

پھر اس کی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو تیمور صاحب!“

”ہاں بولو، تم نے تو مجھے ہولڈ کرا کے بور کر دیا۔“

”مجھے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ جہلم کے قریب کسی گاؤں میں جونی مارا جا چکا ہے۔“

”کون جونی؟“ تیمور نے پوچھا۔

”یہ باتیں سیل فون پر اتنی تفصیل سے نہیں ہو سکتیں۔ کیا میں آپ کے گھر آسکتی ہوں؟“

”میرے گھر۔“ تیمور نے چونک کر کہا۔ ”کیا تم نے میرا گھر دیکھا ہے؟“

”ہاں، میں نے آپ کا گھر دیکھا ہے۔“ اس نے کہا۔

”تو پھر آجاؤ۔“ میں نے کہا۔ ”میں تو رات بھر کا جاگا ہوا تھا اور اب سونے جا رہا تھا لیکن تم نے میری نیند اڑا دی۔ جلدی پہنچو، میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“

اسی وقت اکبر نے کمرے میں جھانکا۔ وہ تیمور کا ملازم بھی تھا اور کک بھی۔ اس نے پوچھا۔ ”چھوٹے صاحب! ناشتا لے آؤں؟“

”ہاں لے آؤ لیکن دو آدمیوں کا۔“ پھر وہ باتھ روم میں گھس گیا۔ وہاں سے فارغ ہو کر نکلا تو تھکن خاصی حد تک اتر گئی تھی۔

پھر اکبر اور شائلہ ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔

تیمور نے پہلے ناشتا کیا کیونکہ اسے شدید بھوک لگ رہی تھی۔ شائلہ بھی اس کے ساتھ شریک ہوگئی۔

ناشتے کے بعد تیمور نے پوچھا۔ ”ہاں، اب بتاؤ، تم کیا کہہ رہی تھیں؟“

”بات بہت طویل ہے لیکن میں کوشش کروں گی کہ اسے مختصر کر کے بتاؤں۔“

☆☆☆

”میرا تعلق ایک متوسط گھرانے سے ہے۔ والدین کے انتقال کے بعد میری پرورش ماموں نے کی لیکن ان کے بچوں کو وہاں میرا رہنا گوارا نہیں تھا اس لیے میں نے میٹرک کرنے کے بعد ایک ادارے میں استقبالیہ کلرک کی جاب کر لی اور عورتوں کے ایک ہاسٹل میں رہنے لگی۔ پھر مجھے فائیو اسٹار ہوٹل کی جاب ملی تو حالات خاصے بہتر ہو گئے۔ میں ہاسٹل سے کرائے کے فلیٹ میں شفٹ ہو گئی۔ اس ہوٹل میں امریکا کا ایک ڈان فلپ اکثر ٹھہرا کرتا تھا۔ اس نے پہلے مجھے پیسے کے ذریعے ورغلانے کی کوشش کی۔ وہ چاہتا تھا کہ میں یہاں ٹھہرنے والے ہر سیاست داں کی رپورٹ اسے دوں۔ وہ کس سے ملا۔ اس سے کون سے دوسرے سیاست دان ملنے آئے وغیرہ وغیرہ۔ میں نے انکار کر دیا تو اس کم بخت نے نہ جانے کیسے میری فیک تصاویر (FAKE) بنا لیں جو انتہائی قابلِ اعتراض حالت میں تھیں۔ وہ تصویریں دکھا کر اس نے مجھے بلیک میل کیا اور اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنے لگا۔ میں بھی آہستہ آہستہ اس زندگی کی عادی ہو گئی۔ فلپ ہر چھ، سات مہینے بعد پاکستان آتا تھا اور کوئی نہ کوئی نیا گل کھلا کر جاتا تھا۔ وہ اب مجھ پر بھی اعتماد کرنے لگا تھا۔ اس کے قریب رہ کر مجھے معلوم ہوا کہ اس کا تعلق امریکا کی ایک جرائم پیشہ مافیا سے ہے۔ وہ مافیا اتنی طاقتور ہے کہ بہت سی حکومتیں بھی غیر قانونی کاموں کے لیے اس کی مدد لیتی ہیں۔ فلپ ہی کے ایک آدمی جیک نے کیپٹن اکرم کو قتل کیا تھا اور آپ کو پھنسانے کی کوشش کی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ آپ کو اس کیس میں سزا ہو جائے، پھر وہ اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے آپ کو جیل سے رہائی دلاتے۔ چونکیے مت، ان کا پاکستانی اداروں پر بھی انتہائی اثر ہے۔ آپ ان کے اس جال سے بچ گئے تو

انہوں نے میری ڈیوٹی لگائی کہ میں آپ کو اپنے حسن کے جال میں پھانس کر ان کے ساتھ شامل کرلوں۔ وہ آپ کی صلاحیتوں اور مختلف کارناموں کی وجہ سے آپ سے بہت مرعوب ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ اگر آپ ایک دفعہ ان کے ساتھ مل جائیں تو وہ آپ کو پاکستانی نیٹ ورک کا چیف بنا دیں گے۔ پھر فلپ کو بار بار پاکستان نہیں آنا پڑے گا۔ وہ میرا اغوا وغیرہ سب پہلے سے طے شدہ ڈراما تھا۔ ان کے ایک آدمی نے آپ کی اور آپ کے دوست کی گفتگو سن لی تھی جس سے اسے معلوم ہوا کہ آپ آج ہی شام جہلم جا رہے ہیں۔ انہوں نے فوراً ڈراما اسٹیج کر دیا لیکن یہ بھی عجیب بات ہے کہ ان کے بھیجے ہوئے آدمیوں سے پہلے دو اصل اچکے میرے پیچھے پڑ گئے۔ جہلم میں میرا کوئی چچا نہیں ہے۔ بابا خیر دین سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان لوگوں نے فوری طور پر معلوم کیا کہ ایک شخص کو دل کا دورہ پڑا ہے اور وہ اسپتال میں داخل ہے۔ ان کے ایک آدمی نے شفیق سے مل کر اس بات پر راضی کیا کہ وہ مجھے آپ کے سامنے اپنے چچا کی بیٹی تسلیم کرے گا۔ ان لوگوں کو خدشہ تھا کہ اگر آپ میرے ساتھ جہلم جائیں گے تو وجہ بھی ضرور پوچھیں گے اس لیے ان لوگوں نے پکا بندوبست کرلیا تھا۔"

وہ سانس لینے کو رکی پھر بولی۔ "جب ڈاکٹرز نے بابا خیر دین کو بائی پاس کرانے کو کہا تو شفیق نے انہی لوگوں سے رقم مانگی، ان کا مقصد پورا ہو چکا تھا اب ان لوگوں کو یہ خدشہ پیدا ہو گیا کہ شفیق کہیں آپ کے سامنے زبان نہ کھول دے۔ فلپ نے شفیق کو ختم کرانے کا منصوبہ بنایا اور جونی کو جہلم بھیج دیا۔

"اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ جونی، شفیق کے گاؤں بلکہ اس کے گھر میں مارا گیا ہے۔ ان لوگوں کو حیرت ہے کہ شفیق نے جونی جیسے آدمی کو کیسے مار دیا۔ پھر پولیس رپورٹ کے ذریعے معلوم ہوا کہ جونی کو شفیق کے ایک مہمان نے مارا ہے۔ وہ سیلف ڈیفنس کا کیس تھا۔ ثبوت کے طور پر شفیق کی بہن کی گردن پر لگا ہوا خنجر کا زخم اور جونی کا ریوالور کافی تھے پھر جونی دیوار پھاند کر ان کے گھر میں داخل ہوا تھا۔ پولیس کو دیوار پر اور اس کے باہر جونی کے قدموں کے نشانات بھی مل گئے ہیں۔ فلپ کو ابھی تک حیرت ہے کہ شفیق کے مہمان کا نشانہ اتنا زبردست تھا کہ اس نے ثمینہ کی جان کا رسک لے کر جونی پر گولی چلائی جو اس کی پیشانی کے عین وسط میں لگی۔ فلپ کو شبہ ہے کہ یہ کام آپ کا ہے۔"

وہ بولتے بولتے تھک گئی تھی اس لیے پورا پانی ایک سانس میں پی گئی۔

☆☆☆

"اب تم فلپ سے کہو کہ میں نے تیمور کو اپنے جال میں پھنسا لیا ہے اور وہ آپ کے ساتھ ہاتھ ملانے کو تیار ہے۔"

"اتنی جلدی نہیں۔" شمائلہ نے کہا۔ "میں پہلے دو چار دن آپ کے ساتھ آؤٹنگ کروں گی، ہوٹلوں میں جاؤں گی۔ ان کا کوئی آدمی مسلسل میری نگرانی کرتا ہے۔ اس وقت بھی باہر کوئی موجود ہوگا۔"

"تم خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ ذہین بھی ہو۔" تیمور نے کہا۔ "چلو کچھ دن بعد سہی۔ ہم آج ہی سے گھومنا پھرنا شروع کر دیتے ہیں لیکن فوری طور پر میں سونا چاہتا ہوں۔"

"پھر میں شام کو آؤں گی۔" شمائلہ نے کہا اور رخصت ہو گئی۔

شام سے پہلے پہلے داجی نے تیمور کی لینڈ کروزر بھی بھجوا دی۔ پھر تیمور اور شمائلہ خوب گھومے پھرے، خوب تفریح کی۔ ان لوگوں کا ایک آدمی مسلسل تیمور کی نگرانی کرتا تھا۔

اب تو تیمور بھی اس نوجوان کو پہچاننے لگا تھا، یہ وہی نوجوان تھا جو تیمور اور نعیم کو عدالت میں نظر آیا تھا۔ آخر ایک دن شمائلہ نے فلپ کو اطلاع دی کہ میں نے تیمور کو پوری طرح اپنے جال میں پھانس لیا ہے۔ وہ فوج سے پہلے ہی بددل ہے اور آپ سے ہاتھ ملانے کو تیار ہے۔

☆☆☆

تیمور کے سامنے دنیا کی ایک بہت بڑی کرمنل مافیا کا ایک اعلیٰ عہدے دار بیٹھا تھا۔ وہ ایشیائی اور مشرق وسطیٰ کے معاملات کا ذمے دار تھا۔ اس نے اپنا تعارف فلپ کے نام سے کرایا تھا۔

"تو مسٹر تیمور! آخر تم ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئے؟" اس نے گونج دار آواز میں کہا۔

"وقت اور حالات انسان کو مجبور کر دیتے ہیں مسٹر فلپ۔" تیمور نے کہا۔ "اس ملک نے مجھے دیا ہی کیا ہے؟ ذلت، بدنامی اور رسوائی۔ میں نے اس ملک کے لیے اپنی جان کی بازی لگا کر کئی کارنامے انجام دیے۔" تیمور کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "اس کا صلہ مجھے کورٹ مارشل کی صورت میں ملا۔ بہرحال، اب میں آپ کے ساتھ کام کرنے کو تیار ہوں لیکن میری دو عادتیں بہت بُری ہیں۔ میں کسی کے ناجائز احکامات، وہ احکامات جو میری نظروں میں غلط ہوں، نہیں مانتا۔ یہ اور بات ہے کہ مجھے قائل کر دیا جائے کہ جو کہا جا رہا ہے وہ ہماری تنظیم کے فائدے میں ہے۔"

"اور دوسری بات میرا مطلب ہے دوسری برائی؟" فلپ نے پوچھا۔

"دوسری برائی یہ ہے کہ میں اپنی کوئی بات اپنے لوگوں سے نہیں چھپاتا، نہ یہ پسند کرتا ہوں کہ مجھ سے کوئی بات چھپائی جائے۔ اس سے کارکردگی پر بُرا اثر پڑتا ہے۔"

"یہ برائیاں نہیں بلکہ اچھائیاں ہیں مسٹر تیمور!" فلپ نے کہا۔

"اگر یہ اچھائی ہے تو سن لو کہ جونی میرے ہاتھوں مارا گیا ہے۔" تیمور نے اطمینان سے کہا۔

"مجھے یقین تو نہیں لیکن شبہ تھا۔" فلپ نے مسکرا کر کہا۔ "ایسے آدمی کا مارا جانا ہی بہتر تھا۔ وہ کسی بھی طور ہماری تنظیم میں فٹ نہیں تھا۔ یہاں جوش سے نہیں ہوش سے کام لینا پڑتا ہے۔ اب تم سچ بول ہی رہے ہو تو سن لو کہ کیپٹن اکرم کو ہم نے مارا تھا۔ اسے بھی ہم بلیک میل کر رہے تھے۔ ہم لوگوں ہی نے اسے مجبور کیا تھا کہ وہ تمہاری تحویل سے وہ خفیہ فائلیں نکالے۔ اس نے فائلیں تو نکال لیں لیکن پھر وہ اس کے ہاتھ سے بھی نکل گئیں۔ جب تمہارا کورٹ مارشل ہوا مسٹر تیمور تو اکرم بہت ڈسٹرب تھا۔ ہمیں خدشہ تھا کہ یہ کسی بھی وقت بھانڈا پھوڑ سکتا ہے اس لیے ہم نے اسے قتل کر کے ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہے لیکن تم ہمارے جال سے نکل گئے۔"

ان کی یہ گفتگو تیمور ہی کے کہنے پر ہو رہی تھی۔

"میں تو چاہتا ہوں کہ برصغیر کا پورا نیٹ ورک تم سنبھالو۔" اس نے کہا۔

"مسٹر فلپ! تم نے اتنی اچھی اردو کہاں سے سیکھی؟"

"ہمارا تو کام ہی یہ ہے۔" فلپ نے کہا۔ "تمہیں بھی پشتو، فارسی، عربی اور ایک آدھ زبان مزید سیکھنا پڑیں گی۔"

"یہاں میرے ماتحت کتنے آدمی ہوں گے؟" تیمور نے پوچھا۔

پاکستان میں ہمارے گیارہ سو کے قریب ایجنٹ ہیں۔ میرے علاوہ جیک، انجلی، میک اعلیٰ عہدے دار ہیں۔ اب تو تم میری جگہ سنبھالو گے۔"

"اور یہاں کے نیٹ ورک کے اخراجات کیسے پورے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات تو لاکھوں روپے خرچ کر کے لوگوں کو خریدنا پڑتا ہے؟"

"ہمارا سب سے بڑا ذریعہ کرپٹ سیاست داں ہیں۔" انہیں بلیک میل کر کے ہم ہر ماہ کروڑوں روپے کما لیتے ہیں۔"

"اچھا اب ذرا اس مشن پر بات ہو جائے جس پر اس دفعہ تم آئے ہو؟"

"تمہارا ایٹمی پلانٹ۔" فلپ نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم اسی علاقے سے ہو اس لیے تم زیادہ بہتر جانتے ہو گے کہ وہاں کس قسم کا سیکیورٹی سسٹم ہے؟"

"ہاں، میں جانتا ہوں۔" تیمور نے کہا۔ "لیکن پہلے مجھے تمہاری طرف سے اختیارات ملیں گے تو میں کچھ کروں گا۔ میں اکیلا تو کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ ہماری تنظیم کے جتنے اعلیٰ عہدے دار کراچی میں ہیں، انہیں آج شام میری طرف سے کھانے کی دعوت پر بلالو۔"

"وہ بہت گھاگ لوگ ہیں۔" فلپ نے کہا۔ "وہ کبھی یہاں نہیں آئیں گے۔"

"تم ٹیلی فون پر تو انہیں بتا سکتے ہو پھر میں خود ان سے مل لوں گا۔" تیمور نے کہا۔

"ہاں یہ ہو سکتا ہے لیکن وہ اتنی آسانی سے تمہاری باتوں پر یقین نہیں کریں گے۔" فلپ نے کہا۔ "اور تم نے میرے بارے میں بہت غلط اندازہ لگایا ہے۔ میں اتنا ہی احمق ہوتا تو دنیا کی سب سے بڑی کرمنل مافیا کا اتنا بڑا عہدے دار نہ ہوتا۔"

"میں سمجھا نہیں مسٹر فلپ!" تیمور نے چونک کر اسے دیکھا۔

"ابھی سمجھ جاؤ گے۔" فلپ نے کہا اور اچانک ریوالور نکال لیا۔ "میں نہ جانے تم جیسے کتنے حقیر ایجنٹوں کو چیونٹی کی طرح مسل چکا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ ہماری گفتگو ٹیپ ہو رہی ہے اور وہ اسی بنگلے میں ٹیپ ہو رہی ہے۔ میں تو تمہیں آزمانا چاہ رہا تھا۔ اکرم کی طرح تم بھی اندر سے پاکستانی ہو۔ اسے تو میں نے بہت خطرناک طریقے سے بلیک میل کیا تھا۔ سیدھی طرح وہ ٹیپ میرے حوالے کر دو ورنہ جیسے تم نے جونی کو مارا تھا بالکل اسی طرح میں بھی تمہیں ماروں گا۔ تمہاری پیشانی کے عین وسط میں سوراخ کر دوں گا۔ میرا نشانہ تم سے زیادہ اچھا ہے۔"

''میں بھی تمہیں آزمارہا تھا۔'' تیمور نے کہا۔ ''میں نے جونی کو دیکھا تک نہیں، اسے قتل کرنا تو دور کی بات ہے۔''

''اچھا اب سیدھی طرح ہماری بات چیت کی ڈی وی ڈی میرے حوالے کردو۔'' وہ ریوالور کو جنبش دے کر بولا۔ ''میں بھول جاؤں گا کہ کبھی اس موضوع پر تم سے بات ہوئی تھی۔''

''تم تو واقعی باکمال آدمی ہو۔'' تیمور نے کہا۔ ''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ ہماری یہ بات چیت کہیں ریکارڈ ہورہی ہے؟''

''میری یہ گھڑی دیکھ رہے ہو؟'' اس نے کہا۔ ''اس میں ایک ایسی ڈیوائس ہے جو چھپے ہوئے کیمروں اور مائیکرو فون کی نشاندہی کردیتی ہے۔ میں جب سے یہاں آیا ہوں، گھڑی کی سوئی مسلسل حرکت میں ہے۔''

''کون سی چھوٹی سوئی؟'' تیمور نے آگے بڑھ کر وہ گھڑی دیکھنا چاہی۔

بس یہیں فلپ تھوڑا سا چوک گیا۔ تیمور نے پانی کا بھرا ہوا گلاس اس کے چہرے پر دے مارا۔

اس کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ کر گر پڑا۔ تیمور کی دوسری لات سے وہ اچھل کر کچھ فاصلے پر گرا۔ اس نے اپنی جیب سے اچانک ایک چھوٹی سی پرفیوم کی شیشی نکالی اور وہ پرفیوم تیمور کے چہرے اور آنکھوں پر اسپرے کردیا۔

وقتی طور پر تیمور اندھا ہوگیا۔ فلپ وہاں سے اٹھ کر بھاگا۔ میز پر پانی کا جگ رکھا تھا۔ تیمور نے ٹھنڈے پانی سے اپنا چہرہ اور آنکھیں دھوئیں تو اسے دھندلا دھندلا دکھائی دینے لگا۔ وہ بھی باہر کی طرف دوڑ پڑا۔ فلپ اتنا زیادہ بوکھلا گیا تھا کہ اپنی گاڑی میں فرار ہونے کے بجائے پیدل ہی بھاگ نکلا۔ تیمور نے جلد ہی اسے جالیا۔ وہ تھری پیس سوٹ میں بھاگتا ہوا عجیب لگ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد تیمور اسے گھسیٹتا ہوا دوبارہ اپنے بنگلے میں لے آیا۔ پھر اس نے سب سے پہلے تو فلپ کی تلاشی لی۔ اس کی جیب سے پرفیوم کی وہ شیشی، زہریلی سوئیوں کی ایک شیشی اور اس کا سیل فون قبضے میں لے لیا۔

یہ شمائلہ کی چال تھی کہ اس ملاقات کا علم فلپ کے کسی ساتھی کو نہیں تھا ورنہ وہ اتنی آسانی سے قابو میں نہیں آتا۔

شمائلہ نے فلپ کے ایک ایک اہم ساتھی کو پکڑنے میں تیمور کی مدد کی اور دیکھتے ہی دیکھتے فلپ سمیت اس کے تمام ساتھی تیمور کے قبضے میں تھے۔

☆☆☆

اس بنگلے پر ایک شاندار تقریب ہورہی تھی۔ اس تقریب میں تمام اعلیٰ عہدے داران شریک تھے۔ جب اتنے وی آئی پی اکٹھے ہوں تو سیکیورٹی کے انتظامات بھی بہت سخت ہوتے ہیں۔

سب سے پہلے چیف نے کہا۔ ''خواتین و حضرات! توجہ فرمائیں، میجر تیمور کا کورٹ مارشل ایک ڈراما تھا۔ مجھے اپنے ذرائع سے اطلاع ملی تھی کہ وہ لوگ تیمور سے بہت متاثر ہیں۔ اب یا تو وہ اسے خریدنے کی کوشش کریں گے یا بلیک میل کریں گے۔ اس سے پہلے کہ وہ ایسا کچھ کرتے، ہم نے میجر تیمور کا کورٹ مارشل کردیا۔ اس کا موقع بھی ہمیں کیپٹن اکرم کی وجہ سے ملا۔ اس بے چارے کو یہ لوگ نہ جانے کس طرح بلیک میل کررہے تھے۔ اکرم بڑی بڑی تجوریاں کھولنے کا ماہر تھا۔ میجر تیمور کا سیف اس کے سامنے کیا حقیقت رکھتا تھا۔ اس کے بیٹ مین نے اسے فائلیں نکالتے اور اپنی الماری میں چھپاتے دیکھ لیا۔ اس نے موقع پاکر وہ فائلیں نکالیں اور اپنے آفیسر کے حوالے کردیں۔ بس یہیں سے ہمیں تیمور کا کورٹ مارشل کرنے کا موقع مل گیا۔ میں میجر تیمور سے بھی معذرت چاہوں گا کہ ایک مہینے تک انہوں نے یہ ذہنی اذیت برداشت کی۔ تیمور کا کورٹ مارشل محض ایک دکھاوا تھا۔ فلپ اور اس کے ساتھی ہمارے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس گئے۔ اس کے ساتھ ہی میں مس شمائلہ کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس ملک کے لیے اتنا بڑا کام کیا اور اپنی جان داؤ پر لگا دی۔ میجر تیمور! تم اب بھی پاک فوج کے ایک ذمے دار آفیسر ہو۔ اپنی ڈیوٹی اسی طرح ذمے داری اور فرض شناسی سے نبھاتے رہنا۔''

چیف کی بات سن کر حاضرین نے پُرزور انداز میں تالیاں بجائیں۔

☆☆☆

یہ واقعات زیادہ پرانے نہیں ہیں اس لیے میں ابھی تک میجر ہوں۔ ممکن ہے آئندہ ایک دو سال میں لیفٹیننٹ کرنل بن جاؤں لیکن میں دولہا بن چکا ہوں۔ آپ کا خیال بالکل صحیح ہے۔ شفیق کی بہن ثمینہ عرف مینو میری بیوی نہیں ہے۔ میری بیوی شمائلہ بھی نہیں ہے بلکہ رمشا ہے۔ آپ لوگ بھی حیران ہوں گے کہ یہ رمشا کون ہے؟ اصل میں شمائلہ کا اصل نام رمشا ہے۔

دراڑ

مریم کے خان

زندگی کی رنگینی کو چھوڑ کر لالچ کا ہاتھ تھامنے والوں کا پُراثر المیہ

رشتے ناتے برف کے گالوں کی طرح نازک ہوتے ہیں... جو چند گرم لفظوں کی آنچ سے یکدم پگھل جاتے ہیں... یہ رشتے ایک عمر کی ریاضیت کے بعد اعتبار اور یقین کی سیڑھی چڑھتے ہیں... ان کی بے فکر زندگی میں مسافت کی وہ رات بہت عجیب تھی... بے تحاشا اندھیروں کو ہٹاتے ہوئے وہ اس خرابے کی جانب گامزن تھے جہاں تاریکیاں... اجالوں کو نگل لیتی ہیں... کمزور لمحوں کی نذر ہو جانے والے ایسے ہی کرداروں کی ٹوٹ پھوٹ کا دل گداز فسانہ...

وہ شخص اندھا دھند بھاگ رہا تھا۔ حلیے سے وہ کھاتا ہٹا اور اونچے طبقے کا آدمی لگ رہا تھا۔ عمر تیس بتیس کے پاس گی۔ اس نے تھری پیس سوٹ مع ویسٹ کے ساتھ پہن رکھا

کر رہے تھے لیکن اس وقت...... اس کا چہرہ وحشت زدہ تھا۔ وہ یوں بھاگ رہا تھا جیسے اس کے پیچھے دنیا جہاں کی بلائیں لگی ہوں۔ بھاگتے بھاگتے وہ پولیس اسٹیشن میں داخل ہو گیا۔ گیٹ پر موجود سپاہی نے اسے روکنا چاہا لیکن اس کا حلیہ دیکھ کر وہ رک گیا۔ اس دیہی علاقے میں اس قسم کا حلیہ کم ہی دیکھنے میں آتا تھا۔ وہ پولیس اسٹیشن کی عمارت کے اندر داخل ہوا۔ یہ زیادہ بڑا پولیس اسٹیشن نہیں تھا۔

اندر موجود ایس ایچ او کی عظیم الشان توند بتا رہی تھی کہ وہ کس قسم کا تھانے دار ہے۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی لنچ میں سالم مرغ نمٹا کر بیٹھا تھا اور اس وقت ماچس کی تیلی سے دانتوں میں خلال کر رہا تھا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ اس وقت اسے آس پاس کہیں قتلِ عام کی اطلاع بھی ملتی تو وہ ایک ڈیڑھ گھنٹے سے پہلے اس کرسی سے حرکت میں نہ آتا مگر اس شخص کو دیکھ کر وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ پرانا تجربہ کار تھانے دار تھا اور حلیے سے اندازہ کر لیتا تھا کہ بندہ کس طبقے سے تعلق رکھتا ہے اور اس سے کیسا سلوک کرنا مناسب ہے۔ اس وقت بھی وہ جان گیا کہ آنے والا اوپری طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس سے اسی حساب سے پیش آنا تھا۔ اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ”آؤ سرکار... خیریت تو ہے؟“

سوٹ پوش کرسی پر گر کر ہانپتے ہوئے بولا۔ ”ڈاکوؤں نے... میری بیوی اور بچوں کو اغوا کر لیا ہے۔“

”ایک منٹ... ایک منٹ... آرام سے سرکار... پہلے اپنا نام پتا تو بتاؤ۔“ تھانے دار نے کہا اور گھنٹی بجائی۔ سپاہی نے اندر جھانکا تو اس نے کہا۔ ”پانی لا... جھٹ پٹ۔“

سپاہی پانی لایا جسے سوٹ پوش نے ایک سانس میں پی لیا۔ اس کی حالت کچھ بہتر نظر آنے لگی۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر منہ صاف کیا اور بولا۔ ”میرا نام عدیل احمد ہے۔ میں برٹش شہری ہوں اور بیوی بچوں کے ساتھ پاکستان آیا ہوا ہوں۔ یہ میرا آبائی علاقہ ہے۔ یہاں سے کوئی تیس میل دور آبائی گاؤں رحیم پور ہے۔ میں اپنی بیوی بچوں کو لے کر رحیم پور جا رہا تھا کہ یہاں سے کوئی پانچ چھ میل دور ایک جیپ پر سوار ڈھاٹا پوشوں نے میری گاڑی روک لی اور مجھے زبردستی اس سے اتار کر گاڑی، میری بیوی اور بچوں سمیت لے گئے۔“

اس کے برٹش شہری ہونے کا سن کر ہی ایس ایچ او کے ہوش اڑ گئے تھے پھر عورت اور بچوں کے اغوا کی اطلاع نے اس کی حالت خراب کر دی۔ عدیل چپ ہوا تو اس نے بڑی مشکل سے پوچھا۔ ”سرکار! وقوعہ کب ہوا اور کتنے بندے اغوا ہوئے ہیں؟“

”میری بیوی کہکشاں اور دو بیٹے عثمان احمد اور علی احمد اغوا ہوئے ہیں۔“ عدیل نے جواب دیا۔ ”یہ کوئی ایک گھنٹا پہلے کی بات ہے۔“

”ایک گھنٹا آپ اتنی دیر سے تھانے پہنچے؟“

”ہاں کیونکہ تھانے کا نام سن کر ہی کوئی گاڑی والا مجھے لفٹ دینے کو تیار نہیں تھا۔“ عدیل نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”پلیز جلدی کچھ کریں۔ اس سے پہلے کہ میرے بیوی بچوں کو کوئی نقصان ہو۔“

”اغوا کنندگان کس طرف سے آئے تھے اور کس طرف چلے گئے؟“

”پتا نہیں وہ کہاں سے آئے کیونکہ ان کی جیپ پہلے سے وہاں موجود تھی مگر بعد میں وہ مخالف سمت میں گئے تھے۔“

ایس ایچ او نے ایف آئی آر درج کی اور فوری طور پر اس واقعے کی اطلاع مقامی ایس پی آفس کو دی۔ معاملہ غیر ملکی شہری کا تھا اس لیے اوپر اطلاع کرنا لازمی تھی۔ اس کے بعد وہ عدیل احمد کے ساتھ جائے واردات کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس نے سرچ پارٹی ساتھ لی تھی جو اغوا کنندگان کے پیچھے جاتی۔ مگر وہ خود کہاں گئے تھے، یہ پولیس کو نہیں معلوم تھا اور نہ ان میں اتنی اہلیت تھی کہ وہ اغوا کرنے والوں کا پیچھا کر سکتے۔

☆☆☆

کہکشاں اور بچے سہمے ہوئے تھے۔ کہکشاں تقریباً ستائیس اٹھائیس برس کی جوان اور بہت دلکش عورت تھی۔ سرخی مائل سفید رنگت اور تیکھے نقوش تھے۔ بلوری آنکھیں اس کے حسن میں مزید اضافہ کر رہی تھیں۔ اس نے مناسب میک اپ کیا ہوا تھا مگر اس وقت چہرے پر فکر اور تشویش کے آثار تھے۔ مشکل سے نصف گھنٹا پہلے وہ سفر کو انجوائے کرتے رحیم پور کی طرف جا رہے تھے تو اچانک ہی ان لوگوں نے انہیں روک لیا۔ دو دن پہلے وہ جب لندن سے اسلام آباد کے لیے روانہ ہو رہے تھے تو کہکشاں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ انہیں ایسی کسی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ دو افراد نے کھینچ کر عدیل کو کار سے باہر نکالا پھر کہکشاں کو نیچے اترنے کا حکم دیا۔ اس وقت ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کار چھیننا چاہ رہے ہوں لیکن جب انہوں نے زبردستی کہکشاں کو اس کے بچوں کے ساتھ پچھلی نشست پر بٹھانا چاہا تب کہکشاں کو پتا چلا کہ یہ کوئی دوسرا چکر ہے۔ اس نے مزاحمت کی تو ایک نقاب پوش نے پکار کر کہا۔ ”ٹھیک ہے، اسے بھی چھوڑو بچوں کو لے چلو۔“

یہ سنتے ہی کہکشاں خود کار میں آ گئی۔ دونوں نقاب پوش کار کے اگلے حصے میں آئے۔ عدیل آگے آیا۔ ”اے، میرے بیوی بچوں کو کہاں لے جا رہے ہو؟“

”آرام سے عدیل صاحب۔“ ایک نقاب پوش بولا۔ ”انہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا بشرطیکہ ہمارا مطالبہ پورا کر دیا گیا۔ پولیس کے پاس جانا چاہو تو ضرور جاؤ۔ پولیس ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔“

اس سے پہلے کہ عدیل کچھ کہتا، وہ کار لے کے آگے بڑھ گئے۔ ان کا راستہ روکنے والی جیپ پہلے ہی آگے جا چکی تھی۔ کہکشاں نے بچوں کو خود میں سمیٹ لیا اور پلٹ کر دیکھا۔ عدیل سڑک پر کھڑا ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ دو دن پہلے پاکستان آئے تھے اور ایک دن اسلام آباد میں رکنے کے بعد آج اپنے آبائی گاؤں رحیم پور کی طرف جا رہے تھے۔ کہکشاں اور عدیل آپس میں کزن تھے۔ دونوں دو بھائیوں کی اولاد تھے۔ کہکشاں نے نقاب پوشوں سے پوچھا۔ ”تم لوگ کیا چاہتے ہو؟“

”یہ تو ہمارا سردار ہی بتائے گا۔“

”سردار کون ہے؟“

”یہ بھی وہی بتائے گا۔“ ڈرائیو کرنے والے نے جواب دیا۔ ”ویسے وہ اگلی گاڑی میں ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے نقاب اتار دیا۔ اس کے ساتھی نے بھی اتار دیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ انہیں کہکشاں اور بچوں سے کوئی خطرہ نہیں۔ نقاب انہوں نے صرف عدیل سے اپنا چہرہ چھپانے کے لیے لگائے تھے۔ جیپ سڑک سے اتر کر ایک کچے راستے پر آئی اور ان کی کار بھی کچے راستے پر اتر گئی۔ کوئی فرلانگ بھر کے بعد جیپ رکی اور کار بھی اس کے پیچھے رک گئی۔ دونوں افراد نیچے اتر آئے۔ ایک نے کہکشاں سے کہا۔ ”نیچے اترو۔“

”تم ہمیں کہاں لے جا رہے ہو؟“ کہکشاں ان کے چہرے دیکھ کر سہم گئی تھی کیونکہ ان پر جرم اور بدمعاشی کی چھاپ نمایاں تھی۔

جواب میں ایک نے دروازہ کھولا اور کہکشاں کو بازو سے پکڑ کر نیچے کھینچ لیا۔ اس نے مزاحمت کی لیکن کھینچنے والا طاقتور تھا۔ وہ باہر آئی اور جھٹکا دے کر اپنا بازو چھڑا لیا۔ ”خبردار مجھے ہاتھ مت لگانا۔“

”کیوں، کیا کرنٹ مارتی ہو۔“ آدمی نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ اس دوران میں جیپ سے ایک لمبے بالوں اور بھاری جسم کا آدمی اتر کر آیا۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور چھوٹی آنکھوں میں سفاکی نمایاں تھی۔ اس نے ان سب کو دیکھا اور سخت لہجے میں بولا۔

”کیا ہو رہا ہے، کیا ادھر رکنا ہے؟“

”سردار! یہ اترنے کے لیے تیار نہیں تھی، ہاتھ لگاؤ تو کرنٹ مارتی ہے۔“

”اس کا کرنٹ بھی دیکھ لیں گے۔“ سردار نے سرد لہجے میں کہا۔ ”ان کو لاؤ۔“

کہکشاں اور بچوں کو کار سے اتار کر جیپ میں لایا گیا۔ اس کے پیچھے والے حصے میں جگہ خالی تھی۔ انہیں وہاں بٹھا کر دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا۔ اس دوران میں ایک آدمی کار کے دروازوں اور اسٹیئرنگ سے انگلیوں کے نشانات صاف کر رہا تھا۔ جیپ میں چار آدمی تھے۔ دو ان کے ساتھ آ گئے تھے اور دو جیپ میں رہے تھے۔ ان کے بیٹھتے ہی جیپ دوبارہ روانہ ہوئی لیکن کچھ آگے جا کر وہ ایک اور راستے سے گھوم کر سڑک پر آئی اور مزید کچھ دیر سفر کے بعد وہ دوسری طرف کچے میں اتر گئی۔ مارچ کا آغاز تھا۔ پوٹھوہار کے علاقے میں یہ موسم خوشگوار تھا۔ سردی نہیں تھی لیکن گرمی بھی نہیں تھی پھر وہ انگلینڈ سے آئے تھے تو ان کے لیے یہ موسم بہت خوشگوار تھا لیکن حالات خوشگوار نہیں رہے تھے۔ عثمان تقریباً آٹھ سال کا تھا اور علی اس سے دو سال چھوٹا تھا۔ کہکشاں نے ان لوگوں کی گفتگو سے اندازہ لگایا تھا کہ آنے والا وقت اس کے اور بچوں کے لیے خاصا سخت ہو سکتا ہے۔ یہ جرائم پیشہ تھے اور انہیں یقیناً کسی مقصد کے تحت اغوا کر کے لے جا رہے تھے۔ وہ بچوں کو بازوؤں میں سمیٹے بیٹھی تھی۔

☆☆☆

راحت کمال گھر میں داخل ہوا۔ اس نے شاپرز اٹھا رکھے تھے۔ آج کا دن بہت مصروف گزرا تھا اس لیے وہ... بہ مشکل آتے ہوئے اپنے لیے کچھ سامان لے سکا تھا۔ وہ اکیلا رہتا تھا اس لیے کھانا پینا بھی خود کرنا پڑتا تھا۔ وہ ایک فیڈرل ایجنسی میں کام کرتا تھا۔ چھ سالوں میں اس کا تبادلہ کئی شعبوں میں ہو چکا تھا کیونکہ اس کے مزاج کی وجہ سے اوپر والوں کی اس سے بہت کم بنتی تھی۔ ان دنوں وہ گمشدہ یا اغوا ہو جانے والے افراد کے شعبے میں کام کر رہا تھا۔ وہ اسلام آباد کے قریب ایک متوسط آبادی میں ایک کمرے کے مکان میں رہتا تھا۔ کمرے کے ساتھ ہی واش روم اور ایک چھوٹا سا

کچن تھا مگر یہ اس کی ضرورت کے لحاظ سے کافی تھا۔ اس نے سامان کچن میں رکھا تھا کہ اس کے موبائل نے بیل دی۔ اس نے موبائل نکال کر دیکھا اور زیرِ لب بولا۔ ''شٹ....'' پھر اس نے کال ریسیو کی۔ ''یس سر۔''

''راحت۔'' دوسری طرف اس کے شعبے کا باس شفقت کریم تھا لیکن ماتحتوں میں وہ شفقت چیمہ مشہور تھا۔ ایک تو وہ دیکھنے میں ویسا ہی لگتا تھا، دوسرے سرکاری معاملات وہ اسی اسٹائل میں نمٹاتا تھا۔ ''ایک مسئلہ ہوگیا ہے۔ فوراً دفتر آؤ۔''

''میں ابھی تو گھر.... آیا ہوں، صبح چھ بجے کا نکلا ہوا تھا۔'' اس نے احتجاج کیا مگر شفقت نے اس کا احتجاج نظر انداز کر کے کہا۔

''معاملہ اوپر کا ہے۔''

اس نے کال منقطع کر دی۔ راحت نے موبائل رکھ کر اوپر والوں کو دل کھول کے سنائیں مگر جانا تو تھا۔ اس نے سامان اپنی جگہ رکھا۔ واش روم میں جا کر منہ ہاتھ دھویا اور دفتر کی طرف روانہ ہوگیا۔ دفتر اس کے گھر سے دس منٹ کی ڈرائیو پر تھا۔ اس وقت دفتر کی پارکنگ خالی تھی اس لیے اسے آسانی سے جگہ مل گئی۔ وہ اندر آیا ریسپشن پر اسے بتایا گیا۔ ''اوپر میٹنگ روم نمبر دو میں چلے جائیں۔''

وہ اوپر آیا تو وہاں شفقت کریم کے ساتھ ایک آدمی اور تھا۔ شفقت نے اسے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ''یہ وزارتِ داخلہ سے آئے ہیں۔''

آنے والے کے انداز میں بیوروکریسی کی چھاپ تھی اس لیے راحت نے اس سے ہاتھ ملانے یا سلام دعا کی کوشش نہیں کی۔ ''یس سر۔''

افسر نے کہا۔ ''آج دوپہر میں پوٹھوہار ریجن میں ایک برٹش عورت اور اس کے بچوں کو اغوا کر لیا گیا ہے۔''

''پاکستانی نژاد؟'' راحت نے پوچھا۔

افسر نے اس مداخلت پر بُرا منایا مگر اس نے سر ہلا کر جواب دیا اور بولا۔ ''ان کی بازیابی کے لیے ایک ٹیم تشکیل دی گئی ہے۔ اس میں تمہارے ادارے کی طرف سے تمہارا نام دیا گیا ہے۔''

راحت نے شفقت کریم کی طرف دیکھا اور گہری سانس لے کر بولا۔ ''مجھے کب اور کہاں جانا ہوگا؟''

''یہ تمہیں مسٹر کریم بتائیں گے۔'' افسر نے کہا اور کھڑا ہوگیا۔ ''وش یو گڈ لک۔''

راحت کمال کے خیال میں اس کی گڈ لک ایسی ہی تھی جیسے کسی کو سیلابی دریا میں دھکا دے کر وش یو گڈ لک کہا جائے۔ مگر حکم حاکم تھا مرگِ مفاجات کے تحت جانا ہی تھا۔ افسر دروازے تک گیا اور رک کر بولا۔ ''برٹش سفارت خانے کو اس کی اطلاع مل گئی ہے۔ ان کی طرف سے وزارتِ داخلہ سے رابطہ کیا گیا ہے۔ اس کیس میں مثبت پیش رفت لازمی ہے۔''

☆☆☆

کہکشاں کو نہیں معلوم تھا کہ ان کو اغوا کرنے والے انہیں کہاں لے جا رہے تھے۔ جیپ کی کھڑکیوں سے جو نظر آ رہا تھا، اس سے ظاہر تھا، وہ غیر آباد علاقے اور راستوں سے گزر رہے تھے۔ بعض اوقات جیپ ایسی جگہ سے گزرتی جہاں سرے سے راستہ ہی نہیں ہوتا تھا اور وہ بڑی مشکل سے گزرتی تھی۔ یہ مشکل ان کو بھی برداشت کرنا پڑتی تھی۔ ... گھنٹے بعد جیپ رکی تو کہکشاں اور بچوں کا بُرا حال تھا۔ وہ ایسے مشکل سفر کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے جو انہوں نے اس روز کیا تھا۔ عثمان اور علی راستے میں اس سے سوالات کرتے رہے لیکن اس کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ انہیں چپ کراتی رہی مگر وہ چپ کرنے والے کہاں تھے۔ البتہ جب انہیں جیپ سے اتارا گیا تو وہ اغوا کنندگان کو دیکھ کر چپ ہوگئے۔ کہکشاں نے دیکھا، یہاں کوئی آبادی نہیں تھی بلکہ خاردار جھاڑیوں کی باڑھ تھی۔ اس نے بچوں کو قریب کر لیا۔ سردار ان کی طرف آیا۔ اس نے کہکشاں سے کہا۔

''تمہیں اور تمہارے بچوں کو کچھ دن ہمارے پاس رہنا ہوگا، جب تک تمہارا شوہر ہمارا مطالبہ پورا نہیں کر دیتا۔ اس کے بعد ہم تمہیں چھوڑ دیں گے لیکن اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی یا کوئی بات نہیں مانی تو تمہارے ساتھ بہت بُرا سلوک بھی کیا جا سکتا ہے۔''

''مطالبہ....'' کہکشاں پریشان ہو کر بولی۔ ''کیا مطالبہ.... کیا تم ہمارے بدلے تاوان لو گے؟''

سردار نے سر ہلایا۔ ''دس کروڑ روپے۔''

کہکشاں مزید پریشان ہو گئی۔ ''دس کروڑ روپے....! یہ تو بہت بڑی رقم ہے۔ ہم انگلینڈ سے آئے ہیں اور ہمارے پاس زیادہ رقم نہیں ہے اور اتنی بڑی رقم تو ہم اپنا سب کچھ بیچ کر بھی نہیں دے سکتے۔''

سردار مسکرایا تو اس کے دانت بھیڑیے کی طرح نمایاں ہونے لگے۔ ''یہ سوچنا تیرے شوہر کا کام ہے۔ اسے اپنے بیوی بچے چاہئیں تو دس کروڑ روپے کا بندوبست کرے ہی

گا۔'' اس نے کہہ کر ایک نوجوان کو آواز دی۔ ''فریدے.... اِدھر آ۔''

جھاڑیوں میں سے ایک شخص برآمد ہوا۔ اس نے کریو ...ن بال بنوار کھے تھے اور اچھا خاصا خوش شکل نوجوان تھا۔ ...اس نے تابع داری سے کہا۔ ''حکم سردار۔''

''ان تینوں کو لے جا.... اب یہ تیری ذمے داری ہے۔'' فریدے نے سر ہلایا اور کہکشاں سے کہا۔

''آئیں جی، بچوں کو بھی لے آئیں۔''

کہکشاں حیران تھی کہ اس ویران علاقے میں وہ ...یں کہاں لے جاتا مگر فرید انہیں جھاڑیوں کی طرف لایا۔ ...نے جھاڑیوں میں ایک پتلے سے راستے کی طرف اشارہ ...یا۔ وہ اسی سے برآمد ہوا تھا۔ ''اس میں چلیں جی۔''

''یہاں راستہ کہاں ہے؟''

''راستہ ہے، بس کانٹوں سے بچنا۔'' فرید نے نرمی ...ے کہا۔ ''تھوڑا سا راستہ ہے۔''

ابھی سورج مغرب کی طرف جھکا تھا اس لیے روشنی ...بھی خاصی تھی۔ وہ جھاڑی کو دیکھ سکتے تھے۔ کہکشاں نے ...بچوں کو پیچھے کر لیا اور خود ہاتھوں سے جھاڑیاں ہٹاتی ہوئی ...اندر جانے لگی۔ یہاں کانٹوں سے بچنا ناممکن تھا۔ اس لیے ...اندر آتے آتے اسے کئی بار کانٹے لگے اور اس کے کپڑے ...کانٹوں سے الجھ گئے مگر پھٹے نہیں۔ فرید کی تسلی کے برعکس ...جھاڑیوں کا سلسلہ کوئی دس بارہ گز تک چلا تھا۔ جب وہ ...دوسری طرف نکلے تو کہکشاں حیران رہ گئی۔ یہاں باقاعدہ ...کمرے بنے ہوئے تھے۔ یہ کچی مٹی سے بنے نیچی چھتوں ...والے کمرے تھے۔ ایک بڑی جگہ کے چاروں طرف ایسی ...ہی خاردار جھاڑیاں تھیں۔ یہ اتنی اونچی تھیں کہ باہر سے ...اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ ان کے وسط میں کوئی جگہ خالی ہے۔ ...صحن میں چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں اور فی الحال وہاں کوئی ...نظر نہیں آ رہا تھا۔

فرید انہیں ایک کمرے میں لایا جس کے فرش پر کھجور ...کی چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ فرید نے کہکشاں سے کہا۔ ''بی بی! ...آپ اور بچوں کو یہاں رہنا ہوگا۔ آپ بغیر اجازت کے باہر ...نہیں جائیں گی اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے آواز دیجیے ...گا۔''

''ہمیں پیاس لگ رہی ہے۔'' کہکشاں نے کہا۔

''میں پانی لاتا ہوں۔'' فرید نے کہا اور کچھ دیر بعد وہ ...منرل واٹر کی بوتل اور ایک گلاس انہیں دے گیا۔ کہکشاں حیران ہوئی کہ اس ویرانے میں ان کے پاس منرل واٹر بھی تھا۔ اس نے عثمان اور علی کو پانی دیا۔ اس سفر نے انہیں نڈھال کر دیا تھا۔ اس لیے پہلے وہ چٹائی پر بیٹھے اور پھر لیٹ گئے۔ کہکشاں نے ان کے سر اپنے زانو پر رکھ لیے تھے۔ علی نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ماما! یہ ہمیں ماریں گے۔''

''نہیں.... جب پاپا ان کو رقم دے دیں گے تو یہ ہمیں چھوڑ دیں گے۔'' عثمان نے بڑے ہونے کے ناتے عقل مندی کا مظاہرہ کرنا ضروری سمجھا۔ اس نے سردار کی بات سن لی تھی۔

''ہمیں کچھ نہیں ہوگا۔'' کہکشاں نے انہیں پیار کیا۔

''ماما! پولیس آ کر ہمیں چھڑا لے گی؟'' عثمان نے پوچھا۔

''ہاں بیٹا۔'' کہکشاں نے اسے تسلی دی اور دل میں سوچا کہ یہ پاکستان کی پولیس ہے۔ ان کو دوسرے کاموں سے فرصت ملے تو لوگوں کی مدد کریں۔ کہکشاں اسی ملک میں پیدا ہوئی اور پلی بڑھی تھی۔ وہ بچوں کی خاطر خود کو سنبھالے ہوئے تھی مگر اندر سے وہ بہت خوف زدہ تھی۔ اسے معلوم تھا کہ یہ لوگ اس کے اور اس کے بچوں کے ساتھ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ اسے سب سے زیادہ خطرہ اپنی عزت کا تھا۔ وہ حسین اور جوان عورت تھی۔ باہر سورج ڈوبنے کے قریب تھا اور تاریکی چھانے والی تھی۔

☆☆☆

گاڑی میں ڈرائیور کے علاوہ وہ تین افراد تھے۔ راحت کمال کے ساتھ پنجاب پولیس کا ایک ایس پی فرخ راجا اور ایک فیڈرل ایلیٹ فورس کا سوار خان تھا۔ وہ رات ہی کو اسلام آباد سے روانہ ہو گئے تھے۔ ان کی منزل جائے واردات کے علاقے کا ایس پی دفتر تھا۔ وہاں پہنچ کر انہیں اپنا لائحہ عمل طے کرنا تھا۔ مقامی پولیس کو ان سے تعاون کا حکم تھا۔

روانگی کے دو گھنٹے بعد وہ مقامی ایس پی آفس پہنچ گئے۔ وہاں ایس پی نے ان کا استقبال کیا۔ اتنی رات گئے دفتر میں موجود رہنے پر وہ کچھ جھنجلایا ہوا تھا۔ اس نے سپاٹ لہجے میں ان کو ابتدائی تفتیش کے نتائج سے آگاہ کیا۔ رپورٹ سننے کے بعد راحت کمال نے عدیل احمد کے بارے میں استفسار کیا۔ ایس پی نے بتایا۔ ''وہ مقامی سرکاری ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرا ہوا ہے۔''

''ممکنہ طور پر یہ اغوا برائے تاوان کا کیس ہے۔ کیا اغوا کنندگان نے عدیل احمد سے رابطہ کیا ہے؟''

مقامی ایس پی نے شانے اچکائے۔ ’’مجھے اس بارے میں کچھ نہیں معلوم۔‘‘

’’تب آپ نے کیا کیا ہے؟ اسے مستقل پولیس کی تحویل میں ہونا چاہیے۔‘‘

ایس پی طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ ’’وہ برٹش شہری ہے اس لیے اسے پابند نہیں کیا جاسکتا۔‘‘

’’درست فرمایا۔‘‘ راحت نے تلخ لہجے میں کہا۔ ’’اگر کسی مقامی غریب آدمی کے بیوی بچے اغوا ہوئے ہوتے تو اب تک ان کی ایف آئی آر بھی نہیں لکھی گئی ہوتی۔‘‘ اس نے اپنی پاکٹ ڈائری میں یہ چیز نوٹ کی اور ایس پی سے مطالبہ کیا۔ ’’ہمیں ایک یا دو مقامی پولیس مین دیے جائیں جو اس سارے علاقے سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اس کے علاوہ ہمیں ایک گاڑی بھی چاہیے۔‘‘

فرخ راجا نے مداخلت کی۔ ’’ابھی تک لائحہ عمل تو طے نہیں ہوا ہے۔ اس سے پہلے اس طرح کے مطالبات ٹھیک نہیں ہیں۔‘‘

’’یہ مطالبات نہیں، ہماری لازمی ضرورت ہے۔‘‘ راحت نے کسی قدر طنزیہ انداز میں کہا اور مقامی ایس پی کی طرف متوجہ ہوا۔ ’’آپ لوگوں نے کسی وسیع سرچ آپریشن کے لیے کیا کیا ہے؟ اس کے لیے ہمیں مقامی پولیس ہی درکار ہوگی۔‘‘

’’دوسرے علاقوں سے نفری اور گاڑیاں منگوا لی ہیں۔‘‘

’’ہمیں اس علاقے کا نقشہ چاہیے۔‘‘ راحت نے مطالبہ کیا تو اسے نقشہ فراہم کیا گیا۔ سوار خان حسب معمول خاموش تھا لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ وہ راحت کمال کے طریقہ کار اور مطالبات سے متفق ہے۔ راحت نے نقشہ دیکھا۔ وہ بھی اس کے ساتھ نقشے پر جھکے ہوئے تھے۔ راحت نے مقامی ایس پی سے پوچھا۔ ’’واردات کہاں ہوئی؟‘‘

اس نے نقشے پر ایک جگہ انگلی رکھی۔ ’’یہاں پر...‘‘

’’لازمی بات ہے، اغوا کرنے والے نہ تو بہت دور سے آئے ہوں گے اور نہ ہی اغوا کے بعد مغویوں کو زیادہ دور لے گئے ہوں گے۔‘‘

’’کیوں نہیں لے جاسکتے؟‘‘

’’اس میں رسک بہت زیادہ ہے۔ ان کو کئی چیک پوسٹوں سے گزرنا پڑتا اور کچے میں سفر کی صورت میں یہ بہت طویل اور دشوار ہو جائے گا۔ اس علاقے کی ساخت ایسی ہے کہ بعض جگہوں پر تو راستہ ہی نہیں ہے۔‘‘ اس نے نقشے پر انگلی رکھی۔ ’’ایس پی صاحب! اپنی فورس کو ان تین جگہوں پر ناکا لگانے کا حکم دیں۔‘‘ اس نے سڑکوں کی نشان دہی کی۔

’’فائدہ۔‘‘ فرخ راجا نے اعتراض کیا۔ ’’وہ کچے راستے سے آجا سکتے ہیں؟‘‘

’’ناکا ان کو اس علاقے سے باہر جانے سے روکنے کے لیے ہے۔ جب ان کی بڑے پیمانے پر تلاش شروع ہو گی تو وہ یہاں سے فرار کا سوچ سکتے ہیں۔‘‘

مقامی ایس پی نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔ ’’یہ سب بیکار کی باتیں ہیں۔ مسئلہ تاوان سے حل ہوگا۔ اس کے بعد ہم ان کو دیکھ لیں گے۔‘‘

’’یہ ایک مفروضہ ہے۔‘‘ راحت نے کہا۔ ’’مہربانی کر کے صبح تک یہ کام کرالیں اور ایک پارٹی کو جائے واردات پر بھیج دیں۔ وہ وہاں کسی کو پاس نہ آنے دیں۔ ممکن ہے کوئی نشان ہو جو ضائع ہو جائے۔‘‘

’’ٹھیک ہے، صبح تک یہ سارے کام ہو جائیں گے۔‘‘

’’اپنا آدمی ساتھ کر دیں۔ وہ ہمیں سرکاری ریسٹ ہاؤس تک چھوڑ دے جہاں عدیل احمد مقیم ہے۔‘‘

ایک پولیس کانسٹیبل ان کے ساتھ ریسٹ ہاؤس تک آیا۔ ان کی راہنمائی بھی اسی کے ذمے تھی۔ ریسٹ ہاؤس میں افسران کے لیے پُرآسائش کمرے تھے جو خوش قسمتی سے خالی بھی تھے۔ ان کی رات کا باقی حصہ سکون سے گزرا۔

☆☆☆

کہکشاں کے خوف کے برعکس یہ رات سکون سے گزری۔ فرید نے انہیں رات کے کھانے کے بعد چٹائیوں پر بچھانے کے لیے صاف ستھرے گدے دیے اور اوڑھنے کے لیے ہاتھ کے بنے ہلکے کمبل دیے تھے۔ یہاں رات سرد ہو جاتی تھی اور کسی اوڑھنے والی گرم چیز کے بغیر سکون سے نیند نہیں آتی۔ کھانے میں آلو گوشت کا سالن اور تندوری روٹیاں تھیں۔ اگرچہ بچوں سے مشکل سے کھایا گیا لیکن کسی نہ کسی طرح بچوں نے پیٹ بھر لیا۔ کہکشاں ایسی خوراک کی عادی تھی۔ اگرچہ اسے بھی کھائے ہوئے برسوں گزر گئے تھے۔ فرید نے اس سے کہا۔ ’’میں ادھر باہر چارپائی لگا کر سو رہا ہوں۔ کوئی بات ہو تو مجھے آواز دے لینا۔‘‘

کمرے کا دو پٹ والا دروازہ باہر کھلتا تھا۔ فرید نے اسے بند کر کے اپنی چارپائی اس کے ساتھ لگا دی۔ یوں اس نے پہرے کا مناسب بندوبست کر لیا تھا اور خود آرام سے سو گیا۔ رات کسی وقت علی کو ضرورت ہوئی تو اس نے کہکشاں کو اٹھایا۔ ’’مام! مجھے ٹوائلٹ جانا ہے۔‘‘

کہکشاں ڈر رہی تھی مگر اس نے ہمت کر کے دروازہ ہلایا اور آہستہ سے آواز دی۔ ’’سنو۔‘‘

فرید فوراً اٹھ گیا۔ ’’جی بی بی؟‘‘

’’میرے بیٹے کو ٹوائلٹ جانا ہے۔‘‘ کہکشاں نے ہچکچا کر کہا۔

فرید نے جلدی سے چارپائی ہٹا کر دروازہ کھولا۔ ’’آؤ میرے ساتھ۔‘‘

مگر علی اس کے ساتھ اکیلے جانے کو تیار نہیں تھا۔ وہ کہکشاں سے چمٹ گیا تو مجبوراً وہ بھی ساتھ جانے کو تیار ہوئی۔ عثمان بے خبر سو رہا تھا۔ فرید ان دونوں کو عقب میں لے گیا۔ یہاں زمین کسی قدر ڈھلان میں تھی اور بو بتا رہی تھی کہ اسے فراغت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ وہاں زمین میں کچھ چھوٹے گڑھے بھی کھدے ہوئے تھے۔ کہکشاں نے علی کی مدد کی اور وہ فارغ ہوا۔ فرید نے لوٹے میں پانی لا دیا تھا۔ وہ اندر آئے تو فرید نے دوبارہ دروازہ بند کر کے ان کے آگے اپنی چارپائی لگا لی۔ کہکشاں نے محسوس کیا کہ وہ اچھا آدمی ہے۔ اگرچہ وہ اغوا کنندگان کا ساتھی تھا مگر وہ اس سے پورے احترام سے پیش آ رہا تھا۔ اس نے ایک بار بھی کہکشاں کو غلط نظروں سے نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی اس کے لہجے میں کبھی ہلکا پن آیا تھا۔ صبح ہوئی تو فرید نے چارپائی ہٹائی۔ اب کہکشاں ضرورت محسوس کر رہی تھی لیکن وہ اس کھلی جگہ جانے کے لیے تیار نہیں تھی۔ مگر ساتھ ہی گزرتے وقت کے ساتھ اس کی ضرورت قابو سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔ فرید چائے اور پاپوں پر مشتمل ناشتا لے کر آیا تو اس نے بہت مجبور ہو کر آہستہ سے کہا۔

’’سنو، مجھے بھی جانا ہے۔‘‘

فرید نے اس کی طرف دیکھا اور سمجھ گیا۔ اس نے کہا۔ ’’آپ بچوں کو ناشتا کراؤ، میں آتا ہوں۔‘‘

وہ پانچ منٹ بعد آیا اور کہکشاں سے کہا۔ ’’چلیں بی بی۔‘‘

’’مام! آپ کہاں جا رہی ہیں؟‘‘ علی نے بے چین ہو کر پوچھا۔

’’جہاں آپ رات کو گئے تھے۔‘‘ کہکشاں نے اسے سمجھایا۔ ’’میں ابھی آتی ہوں۔‘‘

فرید اسے عقب میں لایا تو کہکشاں نے یہ دیکھ کر اطمینان محسوس کیا کہ اس نے ایک چارپائی اس طرح کھڑی

کر دی تھی کہ اس سے پردہ ہو گیا تھا۔ وہ فرید کی شکر گزار ہوئی جس نے اس کے لیے یہ سب کیا تھا۔ اس نے منہ ہاتھ بھی دھو لیا تھا۔ اس کے لیے فرید الگ سے پانی لایا تھا۔ ویسے بھی یہاں دھول مٹی نہیں تھی جو ان کا حلیہ خراب ہوتا۔ سڑک سے ہٹ کر انہوں نے جس علاقے میں سفر کیا تھا، وہ نہایت سرسبز تھا اور مٹی صرف راستوں پر تھی۔ فرید نے ناشتے سے پہلے بھی انہیں منہ ہاتھ دھونے کا مشورہ دیا تھا۔ کہکشاں واپس آئی تو بچے ناشتا کر چکے تھے۔ اس کی چائے کسی قدر ٹھنڈی ہو گئی تھی مگر گزارے کے لیے ٹھیک تھی۔ فرید دروازے کی چوکھٹ پر ٹک کر بیٹھ گیا۔ کہکشاں نے اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں دیکھا تھا۔ سادہ شلوار سوٹ میں وہ کہیں سے بھی مجرم نہیں لگ رہا تھا لیکن یہ حقیقت تھی کہ وہ مجرموں کا ساتھی تھا اس لیے لازمی خود بھی مجرم تھا۔ ناشتا کر کے کہکشاں نے برتن اس کی طرف سرکائے۔ فرید کا رویہ اب تک جو تھا، اس سے کہکشاں نے کچھ ہمت پکڑی اور آہستہ سے بولی۔

’’سنو، میں کچھ پوچھ سکتی ہوں؟‘‘

فرید نے اس کی طرف دیکھا۔ ’’کیوں نہیں بی بی؟‘‘

’’یہ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟‘‘

’’مجھے نہیں معلوم بی بی! میں تو یہاں ہوتا ہوں۔ باہر جو ہوتا ہے، اس کا مجھے معلوم نہیں۔‘‘ اس نے سادگی سے کہا۔

’’پھر بھی تمہیں کچھ تو پتا ہوگا۔‘‘ کہکشاں نے اصرار کیا۔

فرید ہچکچایا پھر اس نے کہا۔ ’’بی بی! یہ لوگ تاوان کے لیے بندے اٹھاتے ہیں۔ جس کا تاوان مل جاتا ہے، اسے چھوڑ دیتے ہیں۔‘‘

کہکشاں اگرچہ اغوا کرنے والوں کے منہ سے سن چکی تھی مگر فرید نے اس کی تصدیق کر دی۔ اس کا دل رک سا گیا۔ ’’اور جن کا تاوان نہیں ملتا، ان کے ساتھ کیا ہوتا ہے؟‘‘

فرید نے اس کی طرف دیکھا۔ ’’آپ خود سمجھدار ہو بی بی! باہر سے آئی ہو۔ آپ کو پتا ہوگا کہ بندے کا تاوان نہ ملے تو اس کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔‘‘

خوف سے کہکشاں کا چہرہ سفید پڑ گیا لیکن اس نے بچوں کے سامنے بولنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس کا خوف دیکھ کر فرید نے اسے تسلی دی۔ ’’ڈرو مت بی بی! اچھا ہی ہوگا۔ تمہارا مرد تاوان کی رقم دے گا اور تم لوگ چھوٹ جاؤ گے۔‘‘

مگر کہکشاں جانتی تھی کہ عدیل کسی صورت دس کروڑ کی رقم کا بندوبست نہیں کر سکتا۔ اس کے پاس اتنی رقم نہیں تھی۔

اور ایک اچھی قسم کی موٹر سائیکل جس کا انجن زیادہ شور نہیں کرے۔"

"دونوں چیزیں میرے دفتر سے ملیں گی۔" ایس پی نے اس بار کسی قدر معقولیت سے کہا۔ غالباً اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس کا کام راحت کمال سے تعاون کرنا ہے اور اس کے حق میں بہتر یہی ہے کہ وہ اسے شکایت کا موقع نہ دے۔ اگر مغوی بازیاب ہو گئے تو یقیناً اسے بھی کریڈٹ ملے گا یا کم سے کم اوپر سے عتاب نہیں آئے گا۔ بہر حال، یہ اس کا علاقہ تھا اور اس سے پوچھ گچھ ہوتی۔ اس نے کہا۔ "لنچ کا وقت بھی ہو گیا ہے۔"

یہ خیال راحت کو اچھا لگا تھا۔ وہ اپنی جیپ کی طرف مڑا پھر رک کر اس نے ایس پی سے پوچھا۔ "اس ڈرامے کا مرکزی کردار یعنی عدیل احمد کہاں ہے؟"

"وہ صبح سے میرے دفتر میں بیٹھا ہوا ہے۔" ایس پی نے کسی قدر بدمزگی سے کہا۔ "دماغ خراب کر دیا ہے۔"

"وہ دماغ تو خراب کرے گا۔" راحت نے جیپ کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ "اس لیے نہیں کہ اس کے بیوی بچے اغوا ہوئے ہیں بلکہ اس لیے کہ وہ ایک برٹش شہری ہے۔"

☆☆☆

جیسے جیسے سورج بلند ہو رہا تھا، روشنی تیز ہونے کے ساتھ کسی قدر گرمی کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ رات والی ٹھنڈ بہت تیزی سے زائل ہو گئی تھی۔ یہ کھلا علاقہ تھا اور آلودگی سے پاک تھا اس لیے یہاں روشنی بہت تیز تھی۔ دن کے وقت فرید نے کمرے کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا مگر اس نے کہکشاں کو خبردار کر دیا تھا۔ "بی بی! آپ میں سے کوئی بغیر اجازت کے باہر نہ نکلے۔"

فرید اس وقت باہر نہیں تھا لیکن اس کی جگہ ایک لمبا تڑنگا اور گھنی داڑھی مونچھوں والا خوفناک شخص باہر موجود تھا۔ اس کی سرخ آنکھوں میں ایسی سفاکی تھی کہ اس پر ایک نظر پڑنے کے بعد کہکشاں کی دوبارہ ہمت نہیں ہوئی کہ جب وہ سامنے ہو تو اس کی طرف دیکھے۔ وہ ٹہلتا ہوا کبھی کبھی دروازے کے سامنے سے گزرتا تھا۔ سیاہ ملیشیا کے کھلے شلوار سوٹ میں وہ اور بھی جسیم لگ رہا تھا۔ فرید نے اس کا نام حمزہ بتایا تھا۔ وہ بہت خاموش طبع تھا کیونکہ کہکشاں نے اسے ایک بار بھی بولتے نہیں سنا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ یہ یہاں سے چلا جائے اور اس کی جگہ فرید آ جائے۔ مگر فرید دوپہر کے کھانے کے ساتھ آیا۔ اس نے ایک بڑی سی پلیٹ میں چنے کی دال اور چنگیری میں روٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے کھانا ان کے سامنے رکھا اور بولا۔

"کھاؤ، میں پانی لاتا ہوں۔"

بچوں نے یہ کھانے سے انکار کر دیا۔ خود کہکشاں کا دل بھی نہیں چاہ رہا تھا مگر حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے توانائی لازمی تھی اور توانائی صرف کھانے سے ملتی۔ اس لیے اس نے بچوں کو رضامند کر لیا کہ وہ کھائیں۔ جب علی نے دوبارہ انکار کیا تو کہکشاں نے مصنوعی خفگی کے ساتھ کہا۔ "ٹھیک ہے پھر میں بھی نہیں کھا رہی۔"

علی اس سے بہت محبت کرتا تھا اس لیے وہ جلدی سے تیار ہو گیا۔ کہکشاں انہیں بتانے لگی کہ جب وہ چھوٹی تھی تو فرمائش کر کے اپنی امی سے یہ دال بنواتی تھی۔ یہ بہت مزے کی ہوتی ہے۔ دال واقعی بہت مزے کی تھی۔ اس لیے وہ اور بچے نہ چاہتے ہوئے بھی اچھی خاصی کھا گئے۔ فرید پانی لے آیا تھا اور اب وہی پہرے دار تھا، حمزہ چلا گیا تھا۔ کھانا کھا کر کہکشاں نے فرید کو بتایا کہ انہوں نے کھا لیا ہے تو اس نے بچا ہوا خود کھانا شروع کر دیا۔ آدھی پلیٹ دال کی اور تین روٹیاں بھی تھیں۔ یہ بڑی تندوری روٹیاں تھیں مگر دیکھتے ہی دیکھتے اس نے سب صاف کر دیں اور جا کر صحن میں رکھے گھڑے سے پانی پی کر آیا۔ یہ لوگ اسی سے پانی پی رہے تھے لیکن ان کے لیے منرل واٹر فراہم کیا جا رہا تھا۔ کہکشاں نے اس سے پوچھا تو اس نے کہا۔ "بی بی! آپ لوگ باہر سے آئے ہو، ادھر کا پانی پی کر بیمار پڑ جاؤ گے۔ ادھر ڈاکٹر دوا کچھ نہیں ہے اس لیے تمہیں منرل واٹر دیا جا رہا ہے۔"

یعنی وہ چاہتے تھے کہ ان میں سے کوئی بیمار نہ ہو کیونکہ یہاں علاج کا کچھ بندوبست نہیں ہو سکتا تھا اور اگر ان کی حالت زیادہ خراب ہو جاتی تو وہ انہیں کہیں لے جا بھی نہیں سکتے تھے۔ اس سے آسان کام یہ تھا کہ ان کو منرل واٹر فراہم کر دیا جائے۔ یہ ڈیڑھ لیٹر کی بوتل تھی۔ ایک بوتل صبح دی جاتی تھی اور ایک شام کو دی جاتی تھی۔ اس سے زیادہ کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ موسم ابھی خنک تھا اور بہت کم پیاس لگتی تھی۔ فرید سے بات کرنے سے اس کی ہمت بندھی۔ اس نے کہکشاں سے پوچھا۔ "بی بی! آپ یہیں کی رہنے والی ہو؟"

کہکشاں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"آپ کے لہجے سے۔" فرید نے سادگی سے جواب دیا۔ "آپ کا بچہ انگلش لہجے میں اردو بولتا ہے، پر آپ بالکل

مقامی انداز میں اردو بولتی ہو۔"

"یہ درست ہے، میں یہیں کی رہنے والی ہوں۔ جس جگہ سے ہمیں اغوا کیا گیا تھا، اس سے کچھ ہی دور ہمارا گاؤں رحیم پور ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" فرید نے کہا۔ "میں خود اسی علاقے کا رہنے والا ہوں۔"

"میں رحیم پور میں بڑی ہوئی۔ پھر شادی کر کے انگلینڈ چلی گئی۔" کہکشاں نے کہا۔ "میرے بابا کا نام شبیر خان خاکوانی ہے۔ ہم کئی نسلوں سے یہاں آباد تھے۔"

فرید ذہین آدمی تھا۔ اس نے پوچھا۔ "تو اب یہاں نہیں ہیں؟"

کہکشاں نے نفی میں سر ہلایا۔ "بس میرے بابا اور چچا رہ گئے تھے۔ چچا انگلینڈ چلے گئے اور بابا یہاں زمین دیکھتے تھے پھر میری شادی چچا کے بیٹے سے ہو گئی۔ میں بھی انگلینڈ چلی گئی۔ بابا کا بعد میں انتقال ہو گیا تھا۔ کچھ عرصے پہلے چچا جان کا بھی انتقال ہو گیا۔"

"پھر زمین کون دیکھتا ہے؟"

"کاشت کے لیے دی ہوئی ہے۔ حویلی ویران پڑی ہے۔" کہکشاں دکھی ہو گئی۔ اس وقت اسے اپنا بچپن اور جوانی کا وہ وقت یاد آ رہا تھا جو اس نے حویلی میں اپنے بابا اور امی کے ساتھ گزارا تھا۔ اٹھارہ سال کی ہوتے ہی وہ انگلینڈ چلی گئی تھی۔ جس طرح وہ ماں باپ کی اکلوتی تھی، اسی طرح عدیل اس کے چچا رئیس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ رئیس جوانی میں انگلینڈ چلا گیا تھا اور اس نے وہیں کی ایک مسلمان فیملی میں شادی کر لی تھی۔ اس نے کہکشاں کو بچپن میں ہی عدیل کے لیے مانگ لیا تھا اور جیسے ہی وہ اٹھارہ سال کی ہوئی، اسے بیاہ کر انگلینڈ لے گیا۔ کہکشاں نے یہاں انٹر کیا تھا۔ اس نے انگلینڈ جا کر گریجویشن کیا اور مزید کچھ کورسز کیے۔ رئیس کا سپر اسٹور تھا اور بہت اچھا بزنس تھا۔ ایک سال پہلے رئیس کا اچانک انتقال ہوا تو اس نے اپنی وصیت میں سب کچھ کہکشاں کے نام کر دیا۔ ویسے بھی کہکشاں اس کے ساتھ ہی اسٹور میں کام کرتی تھی۔ شبیر کے انتقال کے بعد وہ پہلی بار یہاں آئی تھی۔ اس کے چپ ہونے پر فرید بھی چپ ہو گیا۔ اس نے کچھ دیر بعد دھیمی آواز میں کہا۔

"بی بی! آپ کو معلوم نہیں کہ آج کل ملک کے حالات کتنے خراب ہیں۔ یہاں سے لوگ جا رہے ہیں اور آپ یہاں آئی ہیں۔"

"ہم مستقل نہیں آئے ہیں، صرف کچھ دن کے لیے آئے ہیں۔" کہکشاں نے تصحیح کی۔ "میں بہت سالوں سے نہیں آئی تھی۔"

"کچھ دن کے لیے آنے والے حالات بھی نہیں ہیں۔" فرید بولا۔ "یہاں کوئی باہر سے آئے تو اسے لوٹ لیتے ہیں یا اغوا کر لیتے ہیں اور پھر تاوان لے کر چھوڑتے ہیں۔"

"جیسے ہمارے ساتھ ہوا ہے؟" وہ بولی پھر اس نے پُرامید نظروں سے فرید کی طرف دیکھا اور سرگوشی میں کہا۔ "سنو، کیا تم ہماری مدد نہیں کر سکتے؟ تم ایک اچھے انسان لگتے ہو؟"

فرید نے بےبسی سے اس کی طرف دیکھا۔ "بی بی! مجھے آپ سے اور بچوں سے ہمدردی ہے، پر میں کیا کر سکتا ہوں؟ میں ایک معمولی ملازم ہوں۔"

کہکشاں کو تعجب ہوا۔ "ملازم... تم ان کے ساتھی نہیں ہو؟"

"ساتھی بھی سمجھ سکتے ہیں لیکن میں ملازم ہوں۔ مجھے یہ تنخواہ دیتے ہیں۔" فرید نے بتایا۔ "میں تین سال سے ان کے ساتھ ہوں۔"

"تمہارا مطلب ہے، یہ جرم سے جو حاصل کرتے ہیں اس میں تمہیں حصہ نہیں ملتا؟"

"اب آپ ٹھیک سمجھیں۔ سردار مجھے دس ہزار ماہانہ دیتا ہے۔"

کہکشاں حیران ہوئی۔ "صرف دس ہزار... اتنا تو تم محنت کر کے بھی کما سکتے ہو۔"

فرید نے ٹھنڈی سانس لی۔ "آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں، پر اب میں ان لوگوں کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اگر میں چپکے سے چلا بھی جاؤں تو پیچھے میری بوڑھی ماں ہے۔ یہ اسے نہیں چھوڑیں گے۔ سردار کا کہنا ہے کہ میں جیتے جی ان لوگوں کو نہیں چھوڑ سکتا۔"

☆☆☆

مقامی ایس پی نے ان کے لیے پُرتکلف لنچ کا بندوبست کر رکھا تھا۔ لنچ سے فارغ ہو کر راحت نے سب سے پہلے عدیل سے ملاقات کی اور اس سے واردات کی تفصیلات پوچھیں۔ اس کے سوالات سے وہ خوش نظر آنے لگا۔ اس نے کہا۔ "مسٹر کمال! آپ پہلے فرد ہیں جس نے مجھ سے صحیح سوالات کیے ہیں۔ باقی یہاں کی پولیس کو تفتیش بھی کرنی نہیں آتی ہے۔"

"کیونکہ انہیں تفتیش کرنا نہیں سکھائی گئی ہے۔"

راحت نے ملائمت سے کہا۔ ’’آپ کو یقین ہے کہ اغوا کرنے والے چھ سات سے زیادہ نہیں تھے؟‘‘

’’ہاں کیونکہ وہ جیپ اتنی بڑی نہیں تھی۔‘‘ عدیل نے کہا۔

’’میں سمجھ گیا۔‘‘ راحت نے کہا۔ ’’کسی نے اب تک تاوان کے لیے رابطہ نہیں کیا ہے؟‘‘

’’تاوان کا تو نہیں لیکن صبح ایک کال آئی تھی۔‘‘ عدیل نے کہا۔

راحت اچھل پڑا۔ ’’آپ اب بتا رہے ہیں؟‘‘

’’میں صبح سے یہاں بیٹھا ہوں اور کوئی میری بات سننے کے لیے تیار نہیں ہے۔‘‘ عدیل بگڑ کر بولا۔ ’’مجھے بالکل امید نہیں ہے کہ یہ پولیس والے میرے بیوی بچوں کو بازیاب کرانے کے لیے کچھ کرسکیں گے۔‘‘

راحت نے چند گہری سانسیں لے کر خود پر قابو پایا اور عدیل سے نمبر مانگا۔ اس نے اپنے موبائل سے نمبر نکال کر اسے دیا۔ یہ بھی ایک موبائل نمبر تھا۔ راحت نے مقامی ایس پی سے اس کی انکوائری کرانے کو کہا۔ اس نے پوچھا۔ ’’یہ کس کا نمبر ہے؟‘‘

’’ممکنہ طور پر اغوا کرنے والوں کا۔‘‘ راحت کہہ کر واپس عدیل کے پاس آیا۔ ’’رابطہ کرنے والے نے کیا کہا؟‘‘

’’یہی کہ کہکشاں اور بچے اس کے پاس ہیں اور خیریت سے ہیں۔‘‘

’’تاوان کی بات نہیں کی؟‘‘

عدیل نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ کل والے سوٹ میں تھا اور کسی قدر گرمی کی وجہ سے اس نے کوٹ اتار دیا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور مجموعی طور پر وہ ایک پریشان حال شخص لگ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ راحت اس سے کوئی سوال کرتا، عدیل کے موبائل کی بیل بجی۔ اس نے نمبر دیکھا اور بولا۔ ’’وہی ہے۔‘‘

’’اسپیکر آن کرلو اور موبائل کا ریکارڈر بھی چلا لو۔‘‘ راحت نے کہا۔ عدیل نے ایسا ہی کیا اور کال ریسیو کی۔

’’ہیلو۔‘‘

’’غور سے سنو۔‘‘ دوسری طرف سے کسی بھاری آواز والے مرد نے کہا۔ ’’تمہارے بیوی بچے ہمارے پاس ہیں اور اس وقت تک خیریت سے رہیں گے جب تک ہمیں تاوان نہیں مل جاتا۔‘‘

’’تاوان؟‘‘ عدیل پریشان ہوگیا۔ ’’تم کیا چاہتے ہو؟‘‘

’’دس کروڑ روپے... چوبیس گھنٹے میں۔‘‘

’’دس کروڑ روپے...‘‘ اس بار عدیل حواس باختہ ہو گیا۔ ’’میں اتنی بڑی رقم نہیں دے سکتا۔‘‘

’’بکواس مت کرو۔‘‘ وہ آدمی بولا۔ ’’تمہارے پاس صرف چوبیس گھنٹے کی مہلت ہے۔ اس کے بعد ہم سب سے پہلے تمہاری بیوی کو قتل کریں گے۔‘‘ اس نے کہتے ہی کال منقطع کردی۔

’’اسے جوابی کال کرو۔‘‘ راحت نے کہا۔ عدیل نے نمبر ملایا لیکن دوسری طرف سے نمبر بند جا رہا تھا۔ راحت کو یہی خدشہ تھا کہ کال کرنے والا اپنا کام کرتے ہی موبائل بند کردے گا۔ اب تو بچہ بچہ جانتا تھا کہ موبائل کو ٹریس کیا جاسکتا ہے اور بالکل اس جگہ پہنچنا بھی ممکن ہے جہاں موبائل موجود ہو۔ پولیس اپنا کام کر رہی تھی۔ راحت نے پی ٹی اے کے متعلقہ حکام سے رابطہ کیا اور اپنی شناخت کرانے کے بعد ان سے مطالبہ کیا کہ مطلوبہ فون نمبر کے بارے میں معلومات فراہم کی جائیں۔ اسے یقین دلایا گیا کہ آدھ گھنٹے میں مطلوبہ معلومات فراہم کردی جائیں گی۔ راحت نے عدیل سے کہا۔ ’’اس کیس کی تفتیش کے لیے وفاق سے ایک ٹیم آئی ہے جس میں میرے ساتھ ایک ایس پی اور ایک وفاقی افسر شامل ہے۔‘‘

عدیل نے سر ہلایا۔ ’’ایس پی وہی نا جو آپ کے ساتھ آیا تھا؟‘‘

’’ہاں۔‘‘ راحت نے سوچ کر کہا۔ ’’اب آپ مجھ سے رابطے میں رہیں گے اور جیسے ہی مجرموں کی طرف سے کوئی رابطہ ہوتا ہے یا کوئی ایسی بات جو مجھے بتانا ضروری ہو، آپ فوراً مجھ سے رابطہ کریں گے۔‘‘

’’ٹھیک ہے لیکن مجرموں کے مطالبے نے مجھے پریشان کردیا ہے۔‘‘

راحت نے سر ہلایا۔ ’’آپ دس کروڑ روپے ادا کر سکتے ہیں؟‘‘

’’کسی صورت نہیں۔‘‘ عدیل نے ہچکچا کر کہا۔ ...... ’’دراصل میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ انگلینڈ میں جو کچھ ہے وہ سب میری وائف کے نام ہے۔ بزنس بھی وہی چلاتی ہے۔ میں تو خود اس پر انحصار کرتا ہوں۔‘‘

’’بزنس؟‘‘ راحت نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

’’ایک سپر اسٹور ہے۔‘‘

’’انگلینڈ میں سپر اسٹور... یعنی آپ کی وائف مالی لحاظ سے اچھی پوزیشن میں ہیں۔‘‘

’’ہاں مگر سب اسی کے ہاتھ میں ہے۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔‘‘

راحت نے باہر آکر شفقت کو کال کی۔ ’’سر! اغوا کرنے والوں نے تاوان مانگ لیا ہے۔‘‘ اس نے باس کو تفصیل سے بتایا۔ ’’عدیل کا کہنا ہے کہ وہ کچھ نہیں کرسکتا۔ اب آپ کیا کہتے ہیں؟‘‘

’’تاوان ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔‘‘ شفقت نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ ’’ہمارا مسئلہ مغویوں کو بازیاب کرانا اور مجرموں کو گرفتار کرنا ہے۔‘‘

’’میں سمجھ گیا۔‘‘ راحت نے دبی زبان میں کہا۔ ’’لیکن کیا بہتر نہیں ہوگا کہ وزارتِ داخلہ کے توسط سے تاوان والی بات برٹش ایمبیسی تک پہنچا دی جائے؟ ممکن ہے وہ کچھ بندوبست کریں۔ اس سے ہمیں وقت ملے گا اور مجرموں تک رسائی میں آسانی ہوگی۔ دوسری صورت میں صرف چوبیس گھنٹے کا وقت ملا ہے۔‘‘

’’میں بات کرتا ہوں۔‘‘ شفقت نے کہا۔ راحت جانتا تھا کہ وہ ٹال رہا ہے۔ اگر وہ کوشش بھی کرے گا تو برائے نام ہی کرے گا اور عین ممکن ہے تھرو پراپر چینل سے گزرتے ہوئے یہ بات چوبیس گھنٹے میں برٹش ایمبیسی تک پہنچے۔ راحت نے عدیل کو ریسٹ ہاؤس بھجوا دیا تھا۔ اس ہدایت کے ساتھ کہ وہ ان کی اجازت کے بغیر وہاں سے کہیں نہیں جائے گا۔

آدھ گھنٹے بعد اسے مطلوبہ معلومات مل گئیں اور یہ مایوس کن تھیں۔ اول سم غیر رجسٹرڈ تھی اور اب تک ایکٹو تھی۔ دوسرے یہ کہ سم بند تھی اور اس کی لوکیشن کا بھی پتا نہیں تھا۔ البتہ ایک کام کی بات یہ معلوم ہوئی تھی کہ سم سے آخری کال جس ٹاور سے کی گئی تھی، وہ ایس پی آفس سے کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ گویا مجرم یہیں موجود تھے اور اگر مجرم یہاں تھے تو اس کا امکان تھا کہ انہوں نے مغویوں کو بھی یہیں رکھا ہوگا۔ کچھ دیر بعد اسے مقامی ایس پی سے بھی سم کے بارے میں یہی معلومات ملیں۔ اس نے رکھائی سے کہا۔ ’’مجھے معلوم ہو گیا ہے۔ میں نے ایک ریڈیو اور باٹنک کی گزارش کی تھی۔‘‘

’’دونوں چیزیں موجود ہیں۔‘‘ ایس پی نے کہا۔

اس نے ایک جدید طرز کا شارٹ ویو ریڈیو راحت کے حوالے کیا۔ یہ تیس کلومیٹرز کے دائرے میں کام کرتا تھا اور اس کا سائز ایک کے جی والے ٹیٹرا پیک دودھ کے ڈبے جتنا تھا۔ البتہ وزن خاصا تھا کیونکہ بیٹری بھی تھی۔ ریڈیو کو

شانے سے باندھنے والی بیلٹ بھی تھی مگر راحت نے فی الحال اسے اپنی جیپ میں رکھوا دیا۔ بانک ایک سو پچتر سی سی کی طاقتور اور اچھی حالت میں تھی۔ راحت نے اسے چیک کیا اور پھر گائڈ کانسٹیبل کے حوالے کیا کہ وہ ساتھ لے کر چلے۔ فرخ کے بارے میں پتا چلا تھا کہ وہ ایک مقامی جاگیر دار سے ملنے گیا تھا۔ گویا اسے اس کیس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ راحت کو غصہ آ گیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اب فرخ کو کوئی بات نہیں بتائے گا اور اس سے اپنی سرگرمی بھی پوشیدہ رکھے گا۔ وہ تین بجے دوبارہ جائے واردات کی طرف روانہ ہوئے۔ اس جگہ سے گزر کر انہوں نے مغرب کی طرف اپنا سفر جاری رکھا۔ جہاں کہیں سڑک کے دائیں بائیں کوئی ایسا کچا راستہ دکھائی دیتا جس سے بڑے سائز کی جیپ گزر سکے، وہ گاڑی رکوا کر زمین کا معائنہ کرتا تھا۔ سوار خان سمجھ رہا تھا کہ وہ مجرموں کی جیپ کے ٹائروں کے نشانات دیکھ رہا ہے۔ بالآخر یہ نشانات سڑک کی مشرقی سمت اترنے والے ایک کچے راستے پر دکھائی دیے۔ راحت نے نقشہ نکالا اور گائڈ کانسٹیبل سے پوچھا۔

"اس وقت ہم کہاں ہیں؟"

کانسٹیبل نے نقشہ دیکھا اور ایک جگہ انگلی رکھی۔ "یہاں ہیں سر۔"

"اس طرف کیا ہے؟" راحت نے کچے راستے کی طرف اشارہ کیا۔

"اس طرف آبادی نہیں ہے سر... دور تک ٹیلے اور کھڈے ہیں۔ کہیں کہیں درخت ہیں اور جھاڑیاں ہیں۔ ادھر زیادہ تر چرواہے جاتے ہیں۔"

گویا مجرموں کے لیے یہ بہترین پناہ گاہ تھی۔ راحت نے سوچا۔ اس نے جیپ کے پیچھے موجود اپنا بیگ نکال کر کھولا اور اس سے بلٹ پروف جیکٹ اور اپنے ہتھیار نکالے۔ سوار خان نے کہا۔ "آپ بھی سب لے کر آئے ہیں؟"

"ہماری ڈیوٹی کا تقاضا ہے۔" راحت نے سوار خان والا جواب دیا اور بلٹ پروف جیکٹ پہننے لگا۔ اس کے اوپر اس نے ریڈیو کی بیلٹ پہنی۔ اس کے کلپ میں ریڈیو اس طرح پھنس جاتا کہ جب تک اسے خود نہ نکالا جاتا تو کسی صورت نہیں نکل سکتا تھا۔ اس میں ریڈیو سامنے کی طرف بھی لگ سکتا تھا۔ سوار خان ساتھ ہوتا، بانک پر ریڈیو پشت پر ہونے سے اسے مسئلہ ہو سکتا تھا اس لیے راحت نے ریڈیو سامنے کی طرف کر لیا۔ روانہ ہونے سے پہلے اس نے اسے چیک کیا اور پولیس فریکوئنسی پر رابطہ کیا تو اسے فوری جواب ملا۔ ایک بیگ میں کچھ سامان تھا جو راستے میں ان کے کام آتا۔ یہ بیگ سوار خان نے اپنی پشت پر باندھ لیا۔ راحت نے ڈرائیور اور کانسٹیبل سے کہا۔

"تم دونوں واپس جاؤ۔ سوائے ایس پی صاحب کے اور کسی کو ہمارے بارے میں نہیں بتانا۔ تم ریسٹ ہاؤس جا کر عدیل احمد کے ساتھ رہو گے۔" راحت نے کانسٹیبل سے کہا۔ "جب وہ مجھ سے رابطہ کرنا چاہے گا تو تم اسے ایس پی آفس لے جانا جہاں وہ ریڈیو کی مدد سے مجھ سے رابطہ کر سکتا ہے۔"

"یس سر!" کانسٹیبل نے کہا اور ڈرائیور کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ وہ کچے میں آئے جہاں زمین پر ٹائروں کے نشانات نمایاں تھے۔

"ہمیں ان کا تعاقب کرنا ہے۔" راحت نے کہا۔

"لیکن ہمارے پاس وقت کم ہے۔" سوار خان نے شمال سے آتے گہرے سرمئی بادلوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "بارش ہو گئی تو یہ نشانات غائب ہو جائیں گے۔"

وہ عجلت میں روانہ ہوئے۔ راحت بانک چلا رہا تھا اور وہ دونوں ٹائروں کے نشانات پر نظر رکھے ہوئے تھے مگر آدھ گھنٹے بعد ہی بادل سر پر آ گئے تھے اور بارش شروع ہو گئی۔

☆☆☆

علی رو رہا تھا۔ اس کی طبیعت خراب تھی۔ جب اس کی طبیعت خراب ہوتی تو وہ چڑچڑا ہو جاتا تھا اور مسلسل روتا تھا۔ کہکشاں اسے چپ کرا رہی تھی اور بہلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ فرید شام کے قریب پھر چلا گیا تھا اور اب صحن میں حمزہ ٹہل رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے بادل گھر کر آئے تھے اور ذرا دیر میں تیز بارش شروع ہو گئی تھی۔ حمزہ بارش میں بھیگ رہا تھا مگر وہ صحن میں موجود رہا۔ موسم کسی قدر سرد ہو چلا تھا لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ اسے موسم کی پروا نہ ہو۔ بارش ایک گھنٹے بعد رک گئی لیکن آسمان پر بدستور گہرے بادل تھے اور لگ رہا تھا کہ بارش مزید برسے گی۔ شاید موسم بدلنے سے علی پر اثر ہوا تھا۔ اس کا ماتھا ہلکا سا گرم ہو رہا تھا۔ کہکشاں پریشان ہو گئی کہ اس قید میں اس کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو وہ کیا کر سکے گی۔ ان کا سامان گاڑی میں رہ گیا تھا۔ حد یہ کہ اغوا کرنے والوں نے اسے اپنا ہینڈ بیگ بھی لینے نہیں دیا تھا اس کے سامان میں کچھ دوائیں بھی تھیں۔ بارش رک گئی تھی۔ حمزہ کوٹھڑی کے پاس آیا اور اس نے درشت لہجے میں کہکشاں

سے کہا۔

"اسے چپ کراؤ۔"

"اس کی طبیعت خراب ہے۔"

"سنا نہیں تم نے... اسے خاموش کراؤ۔" حمزہ کا لہجہ مزید خوں خوار ہو گیا مگر اس نے آواز دھیمی رکھی تھی۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ آواز یہاں سے باہر نہ جائے۔ کہکشاں علی کو بہلانے لگی۔ وہ خود بھی سہم گیا تھا اس لیے کچھ دیر میں چپ ہو کر کہکشاں کے زانو پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ لیکن کبھی کبھی سسکی لیتا تھا۔ کہکشاں کا دل کٹنے لگا۔ اس کا بچہ اپنی تکلیف پر کھل کر رو بھی نہیں سکتا تھا۔ گزشتہ رات اندھیرا ہونے پر ایک لالٹین جلا کر ان کے کمرے میں رکھ دی گئی تھی۔ اس روز بھی فرید اندھیرا ہونے پر لالٹین لے آیا۔ کہکشاں نے اس سے کہا۔

"علی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، اسے بخار ہو رہا ہے۔ کیا کوئی دوا مل سکتی ہے؟"

"دوا؟" اس نے فکرمندی سے کہا۔ "میں دیکھتا ہوں لیکن مشکل ہے کہ یہاں کوئی دوا ملے۔"

فرید چلا گیا۔ کہکشاں نے علی کو بستر پر لٹا دیا اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ دونوں بچے ماں باپ کی طرح خوب صورت تھے۔ کچھ دیر بعد فرید آیا۔ اس نے کہکشاں کو ڈسپرین کا ایک پتا اور ایک بام کی چھوٹی سی ڈبیا دی۔ "بی بی! یہ استعمال کر کے دیکھو۔ یہ اچھا بام ہے۔ سردی لگ جائے تو سینے پر لگانے سے فائدہ ہوتا ہے۔"

کہکشاں نے پانی سے ایک گولی علی کو کھلائی اور پھر اس کے سینے پر بام کی مالش کر کے اسے کمبل اوڑھا دیا۔ بارش کے بعد موسم سرد ہو گیا تھا۔ اس نے فرید سے درخواست کی۔ "یہ دروازہ بند کر دو، باہر سے ٹھنڈی ہوا آ رہی ہے۔"

فرید نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے بند کر لو۔ میں کچھ دیر میں کھانا لاتا ہوں۔"

فرید چلا گیا۔ کھانا بھی وہی بناتا تھا۔ کہکشاں نے محسوس کیا کہ سردی بڑھتی جا رہی ہے۔ اس نے علی پر ایک کمبل اور ڈال دیا مگر اس کا بخار کم ہونے کے بجائے بڑھ رہا تھا۔ کچھ دیر میں وہ اچھا خاصا گرم ہو گیا تھا لیکن بام کی مالش کے بعد اب وہ کھانس نہیں رہا تھا اور سانس بھی بہتر انداز میں لے رہا تھا۔ البتہ جسم گرم تھا۔ عثمان نے بھی کمبل اوڑھ لیا۔ وہ کہکشاں سے لگ کر بیٹھا تھا۔ "ماما! اگر پاپا نے ان کی بات نہ مانی تو یہ ہمیں مار دیں گے؟"

"نہیں بیٹا! آپ کے پاپا ان کی بات مان لیں گے۔" کہکشاں نے اسے پیار کیا۔ "پھر یہ ہمیں چھوڑ دیں گے۔"

مگر یہ کہتے ہوئے خود کہکشاں کو یقین نہیں تھا کہ ایسا ہی ہوگا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ عدیل کسی صورت تاوان کا بندوبست نہیں کر سکتا۔ وہ اگر آزاد ہوتی تو شاید کر سکتی تھی لیکن اس صورت میں اسے انگلینڈ اور پاکستان میں موجود اپنی ہر چیز بیچنا پڑتی۔ اپنے بچوں کے لیے وہ یہ بھی کرنے کو تیار تھی مگر وہ خود قید تھی اور عدیل اس کی غیر موجودگی میں بینک سے بھی ایک پاؤنڈ نکالنے کا مجاز نہیں تھا۔ وہ تاوان کیسے ادا کرتا؟ یہاں اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ حویلی اور زمین بھی کہکشاں کے نام تھی۔ وہ سوچوں میں گم تھی کہ اچانک دروازہ کھلا اور خلاف توقع اسے سردار کا چہرہ نظر آیا۔ اس نے اشارے سے کہکشاں کو باہر آنے کا حکم دیا۔ وہ ہچکچائی۔ "مجھے باہر کیوں بلا رہے ہو؟"

"بات کرنی ہے۔ ادھر بچوں کے سامنے نہیں کر سکتے۔ ویسے تم چاہو تو بچوں کے سامنے بھی کر لیتے ہیں۔ پر یہ ڈر جائیں گے۔"

کہکشاں نے محسوس کیا کہ سردار نے کوئی خوفناک بات کرنی ہے اور بچوں کا نہ سننا ہی مناسب تھا۔ اس نے جلدی سے کہا۔ "نہیں... نہیں میں آتی ہوں۔"

عثمان اس کے بازو سے چپک گیا۔ "آپ کہاں جا رہی ہیں ماما؟"

"بیٹا میں ابھی آتی ہوں۔ آپ بھائی کا خیال رکھنا۔" کہکشاں نے اسے سمجھایا۔ "آپ بڑے ہونا۔"

بڑے ہونے کی سند ملی تو عثمان بہادر بن گیا۔ اس نے کہا۔ "میں علی کا خیال رکھوں گا۔"

کہکشاں باہر آئی۔ سردار اسے ایک کمرے میں لایا جہاں سردی سے بچاؤ کے لیے انگیٹھی رکھی ہوئی تھی۔ سردار کے ساتھ ایک آدمی اور تھا، وہ دروازے پر موجود رہا۔ کہکشاں اندر آنے پر ایک لمحے کو ہچکچائی۔ وہ اکیلی عورت تھی اور اگر ان لوگوں کی نیت خراب ہوتی تو وہ مزاحمت بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی عزت بچانے والا سوائے خدا کے اور کوئی نہیں تھا۔ سردار نے اس کی کیفیت بھانپ لی۔ اس نے کہا۔ "ڈرو نہیں... تمہیں صرف ایک کام کرنا ہے۔"

"کیسا کام؟" کہکشاں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"تمہیں اپنے شوہر کے لیے پیغام ریکارڈ کرانا ہے اور اسے بتانا ہے کہ اگر اس نے کل شام چھ بجے تک دس کروڑ روپے کا بندوبست نہیں کیا تو تم اس دنیا میں نہیں رہو گی۔"

ایک لمحے کو کہکشاں کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ "دس کروڑ روپے..." اس نے لرزتی آواز میں کہا۔ "وہ کسی صورت اتنی بڑی رقم کا بندوبست نہیں کر سکتا۔ اس کی جگہ میں ہوتی تو شاید ممکن تھا۔"

سردار چونکا۔ "کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ انگلینڈ اور پاکستان میں جو کچھ ہے، وہ میرا ہے۔ عدیل کے پاس کچھ نہیں ہے۔ وہ تمہیں دس لاکھ بھی نہیں دے سکتا۔"

"تم جھوٹ کہہ رہی ہو۔" سردار نے بے یقینی سے کہا۔ "ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ سب کچھ تمہارے نام پر ہو اور تمہارا شوہر کنگال ہو۔"

"میں سچ کہہ رہی ہوں... ایسا ہی ہے۔ انگلینڈ میں بزنس، گھر... سب کچھ میرے نام پر ہے۔ یہاں رحیم پور میں حویلی اور زمین بھی میرے نام پر ہے۔ اگر میں آزاد ہوتی تو کوشش کر سکتی تھی۔ مگر وہ بھی ایک دن میں نہیں بیچی جا سکتی تھی۔"

سردار سوچ میں پڑ گیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ اس کے لیے غیر متوقع صورت حال ہو مگر کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ "نہیں، تجھے اپنے شوہر کے لیے پیغام ریکارڈ کرانا پڑے گا۔"

سردار نے ایک چھوٹا سا وائس ریکارڈر نکال کر اس کے سامنے کیا اور ایک کاغذ اسے تھما دیا۔ "اس میں جو لکھا ہے، وہ بول دو..." اس نے ریکارڈر کا بٹن دبا دیا۔ مجبوراً کہکشاں نے بولنا شروع کیا۔

"عدیل پلیز... تم دس کروڑ روپے کا بندوبست کرو، ورنہ یہ کل شام چھ بجے مجھے قتل کر دیں گے اور اگر تم نے پھر بھی تاوان نہیں دیا تو یہ ہمارے بچوں... کو بھی مار دیں گے۔" آخری جملہ کہکشاں کے منہ سے سسکی کے انداز میں نکلا تھا۔ سردار نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ گویا ریکارڈنگ اس کی مرضی کے مطابق ہوئی تھی۔ جیسے ہی اس نے ریکارڈر آف کیا، کہکشاں نے جلدی سے کہا۔ "دیکھو، تم ایسا نہیں کر سکتے کہ کسی کے کیے کی سزا ہمیں ملے۔"

"کیا مطلب؟"

"عدیل رقم نہیں کر سکتا اور کوئی اسے اتنی بڑی رقم نہیں دے گا۔"

"فضول بات مت کرو۔ وہ تمہارا شوہر ہے، وہ رقم ادا کر سکتا ہے۔"

"نہیں کر سکتا..."

"فریدے۔" سردار نے بلند آواز سے کہا۔ "اسے لے جا۔"

فرید شاید باہر ہی موجود تھا۔ وہ اندر آیا اور کہکشاں سے کہا۔ "میرے ساتھ آئیں۔"

کہکشاں بے بسی سے اس کے ساتھ چلی آئی۔ وہ کوٹھری کے پاس آئے تو کہکشاں رک گئی۔ اس نے فرید سے کہا۔ "تم سردار کو سمجھا نہیں سکتے؟ عدیل میرا شوہر ہے لیکن وہ دس کروڑ روپے نہیں کر سکتا۔ وہ تاوان نہیں دے گا۔ تم لوگ مجھے اور میرے بچوں کو مار دو گے۔"

یہاں ان دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ فرید نے سرگوشی میں کہا۔ "بی بی! کیا سچ سب تمہارے نام ہے؟"

"ہاں، میں آزاد ہوں گی تب ہی ان کو تاوان مل سکتا ہے۔ سردار سے کہو کہ وہ مجھے جانے دے۔"

فرید نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ آپ کو کسی صورت جانے نہیں دے گا۔"

"تب تم میری مدد کرو۔" کہکشاں نے بے ساختہ اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "ہمیں یہاں سے نکال دو کیونکہ یہاں ہمارے لیے سوائے موت کے اور کچھ نہیں ہے۔"

فرید خوف زدہ ہو گیا۔ "نہیں بی بی! اگر میں نے آپ کو یہاں سے نکال دیا تو یہ لوگ مجھے اور میری ماں کو نہیں چھوڑیں گے۔"

"یہاں سے نکلنے کے بعد ہم پولیس کی مدد لے سکتے ہیں۔"

"پولیس کچھ نہیں کرے گی۔ وہ تو ان کی حصے دار ہے۔ ہر واردات میں پولیس کا حصہ الگ سے نکالا جاتا ہے۔ ایک بار تو میں رقم دے کر آیا تھا۔" فرید نے انکشاف کیا۔

"تب کیا ہو سکتا ہے؟ میں اور میرے بچے یونہی مارے جائیں گے؟" کہکشاں رونے لگی۔

اس کی سسکیاں شاید فرید پر اثر انداز ہو رہی تھیں مگر کچھ دیر بعد اس نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اندر چلو... بی بی! میں کھانا لا رہا ہوں۔"

کہکشاں کوٹھری کے اندر آئی، اس نے مڑ کر فرید کی طرف دیکھنا چاہا لیکن دروازہ بند ہو گیا اور فرید نے باہر سے زنجیر بھی لگا دی۔ کہکشاں تھکے تھکے انداز میں بچوں کے پاس بیٹھ گئی۔ علی کا بخار ویسا ہی تھا۔ عثمان اسے دیکھ کر خوش ہو گیا۔ کہکشاں نے اندر آنے سے پہلے اپنے آنسو صاف کر لیے تھے۔ وہ اپنے بچوں کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی، کیا وہ ان کو بچا سکتی ہے؟

☆☆☆

فرخ سخت چیں بہ جبیں تھا کیونکہ راحت اور سوار خان اسے اطلاع دیے بغیر نکل گئے تھے۔ اس نے مقامی ایس پی سے کہا۔ "ان کو نمبر بنانے کا شوق ہے اس لیے اکیلے نکل گئے۔"

"یہ فیڈرل والے ایسے ہی ہوتے ہیں۔" مقامی ایس پی نے سر ہلایا۔ "آگے ڈاکوؤں سے واسطہ پڑا، تب پتا چلے گا۔"

ان کو پتا چل گیا تھا کہ اغوا کنندگان نے دس کروڑ روپے کا مطالبہ کیا تھا۔ فرخ نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "کیا یہ بندہ اتنی رقم دے سکے گا؟"

"مشکل ہے۔ اس کا کہنا ہے اس کے پاس کچھ نہیں ہے، سب اس کی بیوی کے نام ہے اور بیوی اغوا کنندگان کے قبضے میں ہے۔ تاوان ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔" مقامی ایس پی نے بے پروائی سے کہا۔

"تب ہمارا مسئلہ کیا ہے؟" فرخ بولا۔ وہ فکر مند لگ رہا تھا کیونکہ اسے اس ٹیم میں شامل کیا گیا تھا اور وہ کچھ نہیں کر رہا تھا۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ مجھے تو تم لوگوں سے تعاون کرنے کو کہا گیا ہے اور میں کر رہا ہوں۔"

فرخ مقامی ایس پی کے دفتر میں تھا۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ "میں سوچ رہا ہوں کہ عدیل احمد سے بات کروں۔"

"ایسا کرو کہ فیڈرل والوں کو تاوان کے لیے کہو۔" مقامی ایس پی نے مشورہ دیا۔ "معاملہ برٹش شہریوں کا ہے۔ کوئی مارا گیا تو پولیس کی شامت آئے گی۔"

"ہاں، صرف پولیس کی شامت آئے گی۔" فرخ نے طنزیہ لہجے میں کہا اور دفتر سے نکل گیا۔ اسے ایک پولیس گاڑی مل گئی تھی۔ وہ ریسٹ ہاؤس جہاں عدیل احمد ٹھہرا ہوا تھا اور باہر ہی کھڑا تھا اسے دیکھتے ہی وہ اس کی طرف آیا۔

"اچھا ہوا ایس پی صاحب آپ آ گئے۔ آپ لوگوں نے اب تک کچھ نہیں کیا ہے اور اغوا کرنے والوں نے پیغام بھیجا ہے۔"

"کیسا پیغام بھیجا ہے؟"

عدیل نے اپنا موبائل نکالا اور اس میں ریکارڈ کی ہوئی کہکشاں کی آواز سنائی۔ فرخ غور سے سن رہا تھا۔ ریکارڈنگ زیادہ طویل نہیں تھی۔ وہ بھی فکر مند ہو گیا۔ اس

چیلنج

ایک طالب علم نے جب سوالیہ پیپر دیکھا تو پہلا سوال لکھا تھا چیلنج کسے کہتے ہیں؟

طالب علم نے کچھ سوچنے کے بعد پیپر خالی چھوڑ دیا اور آخر میں لکھ دیا۔

"اگر ہمت ہے تو پاس کر کے دکھاؤ۔ اٹس چیلنج۔"

(حافظ شاہد عمران، سینٹرل جیل گوجرانوالہ سے)

وقت صبح کے آٹھ بجے تھے اور گویا ان کے پاس صرف دس گھنٹے رہ گئے تھے۔ اس نے عدیل سے پوچھا۔ ”تاوان کے لیے تم کیا کر رہے ہو؟“

”میں کیا کر سکتا ہوں؟“ اس نے کسی قدر تلخی سے کہا۔ ”میں نے برٹش ایمبیسی کو اس دھمکی سے آگاہ کر دیا ہے۔ شاید ان کی طرف سے کچھ ہو۔“

فرخ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ کچھ نہیں کریں گے کیونکہ اس سے پہلے بھی برٹش شہری اغوا ہوتے رہے ہیں اور برٹش حکومت نے کسی کا تاوان ادا نہیں کیا۔ ایک درجن لوگ مارے جا چکے ہیں۔“

عدیل کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ ”میں نے بھی سنا ہے کہ اس علاقے میں اغوا ہونے والے برٹش شہریوں کا تاوان نہیں دیا جاتا ہے۔“

”ہاں، اسے دہشت گردی کے مسئلے سے منسلک کر دیا جاتا ہے۔“

”میرے بیوی بچے...“ عدیل نے گھبرا کر کہا۔

”مسٹر عدیل! ہم کوشش کر رہے ہیں۔“

”کیا کوشش کر رہے ہیں؟ مجھے تو کچھ نظر نہیں آر ہا ہے۔“

فرخ کا موڈ خراب ہو گیا مگر اس نے کوشش کر کے خود پر قابو پایا۔ ”مسٹر عدیل! وہ کوشش اس ریسٹ ہاؤس کے آس پاس نہیں ہے۔ ظاہر ہے آپ کے بیوی بچوں کو ان جگہوں پر تلاش کیا جا رہا ہے جہاں ممکنہ طور پر انہیں رکھا جا سکتا ہے۔ پولیس نے اس پورے علاقے کی ناکا بندی کر دی ہے۔ وہ یہاں سے باہر نہیں جا سکتے۔ ایک دو دن...“

”ایک دو دن؟... آپ بھول رہے ہیں انہوں نے آج شام تک کا وقت دیا ہے۔“

فرخ کو اب اپنے کیریئر کی فکر لگ گئی تھی اس لیے وہ اپنی سی بہترین کوشش کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”مسٹر عدیل! یہ اعصاب کا کھیل ہے۔ آپ کو پُرسکون رہ کر اغوا کنندگان سے بات کرنی ہوگی۔“

”وہ کیسے؟“

”سب سے پہلے تو آپ کو ان سے وقت لینا ہوگا۔ اس کے بعد پولیس اپنی کارروائی میں تیزی لائے گی۔“

”وقت کیسے لوں؟“

”آپ ان سے کہہ سکتے ہیں کہ دس کروڑ روپے کا بندوبست کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ آپ ان سے کم سے کم دو دن کی مہلت مانگیں۔“

”دو دن تک میرے بیوی بچے ان کے قبضے میں رہیں گے؟“

”میں نے کہا نا یہ اعصاب کا کھیل ہے۔ آپ کے بیوی بچوں کی زندہ واپسی آپ کی کامیابی ہوگی۔ انہیں کچھ مشکلات برداشت کرنا پڑیں گی لیکن وہ زندہ رہیں گے۔“

بات عدیل کی سمجھ میں آ گئی۔ فرخ نے فیصلہ کیا کہ وہ اب اس کے ساتھ رہے گا۔ اس نے سب سے پہلے اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے عدیل کے موبائل نمبر پر آبزرویشن لگوا دی۔ اس نے ریسٹ ہاؤس میں ایک پولیس پارٹی بلوائی تاکہ کسی قسم کی کارروائی کی صورت میں اسے دیر نہ ہو۔ اس نے ریسٹ ہاؤس میں عارضی ہیڈ کوارٹر بنا لیا تھا۔ اسے معلوم ہوا تھا کہ راحت ریڈیو لے گیا ہے اس لیے اس نے ریڈیو بھی منگوایا اور ساتھ میں آپریٹر بھی جو مستقل ریڈیو پر رہتا۔ پھر اس نے شفقت سے رابطہ کیا۔ اس سے پوچھا کہ وفاق والے اور برٹش ایمبیسی تاوان کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے کیا کر رہے ہیں۔ شفقت نے اسے واضح بتایا کہ اس مسئلے پر کچھ نہیں کیا جا رہا ہے اس لیے انہیں اپنی ساری توجہ مغویوں کو باحفاظت بازیاب کرانے پر مرکوز کرنی ہے۔ خود فرخ بھی جانتا تھا کہ تاوان نہیں دیا جائے گا اور عدیل احمد کے پاس کچھ نہیں تھا۔ یعنی مجرموں سے دوسری طرح سے نمٹنا تھا۔ اس کے پاس بھی مجرموں کی سم کا نمبر اور دوسری تفصیلات آ گئی تھیں۔ اس نے اس سم پر بھی آبزرویشن لگوا دی۔ اب وہ جیسے ہی آن ہوتی، اسے پتا چل جاتا۔ اس نے ریڈیو آپریٹر سے کہا کہ وہ راحت سے رابطے کی کوشش کرے اور جیسے ہی رابطہ ہو، اسے مطلع کرے۔

☆☆☆

وہ لوگ ایک کھوہ میں تھے۔ یہاں وہ بارش سے محفوظ رہے۔ اس رات انہیں کھوہ میں رہنا پڑا تھا کیونکہ وقفے وقفے سے بارش ہوتی رہی تھی۔ سوار خان نے کسی طرح کچھ خشک لکڑی جمع کر کے آگ جلا لی تھی اس لیے بھی ان کی رات سکون سے گزر گئی۔ صبح ہوئی تو آسمان پر بدستور بادل چھائے ہوئے تھے اور لگ رہا تھا کہ بارش کا سلسلہ آج بھی جاری رہے گا۔ آگ بجھ گئی تھی لیکن انگارے باقی تھے۔ سوار خان کھانے کا کچھ سامان لایا تھا، اسی سے انہوں نے ناشتا کیا۔ ”کیا خیال ہے، اغوا کنندگان اسی علاقے میں ہو سکتے ہیں؟“ راحت نے پوچھا۔

”کل تک جتنا علاقہ دیکھا ہے، یہ ایسے جرائم کے لیے آئیڈیل علاقہ ہے۔“ سوار خان نے کہا۔ ”کانسٹیبل نے بتایا

تھا کہ یہاں چرواہے ہوتے ہیں لیکن اتنے سفر میں ہمیں ایک جانور بھی نظر نہیں آیا۔ چرواہے تو دور کی بات ہیں۔“

سوار خان کی بات قابلِ غور تھی۔ راحت نے کہا۔ ”یعنی کسی وجہ سے چرواہے، اب اس علاقے میں نہیں آتے ہیں۔“

”بالکل... ورنہ بہار کے آغاز میں جب یہاں اتنا سبزہ ہے چرواہوں کا یہاں نہ آنا تعجب خیز ہے۔“

”یہ کام مجرموں کا بھی ہو سکتا ہے۔ چرواہوں سے انہیں مخبری کا خطرہ ہوگا اس لیے انہیں ڈرا دھمکا کر یہاں سے بھگایا جا سکتا ہے۔“

”فرض کیا جائے کہ مجرم یہاں موجود ہیں اور انہوں نے یہ علاقہ اپنے لیے مخصوص کر لیا تو اس صورت میں انہوں نے نگرانی کا انتظام بھی کیا ہوگا۔“

”لازمی بات ہے۔ خاص طور سے جب انہوں نے تین غیر ملکی شہریوں کو اغوا کیا ہو اور انہیں معلوم ہو کہ ان کی بازیابی کے لیے پولیس اور دوسرے قانون نافذ کرنے والے ادارے حرکت میں آ جائیں گے۔“ سوار خان نے کہا اور باہر جھانکا۔ اس نے کہا۔ ”اگر ہم بائک پر گئے تو اس میں نظر آنے کا امکان بہت زیادہ ہے۔ بہتر ہے پیدل اور ایک دوسرے سے الگ ہو کر چلیں۔ لیکن فاصلہ اتنا ہو کہ ایک دوسرے کی نظروں میں رہیں۔“

راحت نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔ انہوں نے بائک اسی کھوہ میں چھپا دی اور ایسے تمام نشانات مٹا دیے جن سے ایسا پتا چلے کہ کوئی کھوہ تک آیا تھا اور یہاں رکا تھا۔ یہ مٹی کے ایک چھجے تلے تھے جسے سبزے اور جھاڑیوں نے گرنے سے روکا ہوا تھا۔ یہاں پتھر نہیں تھے، زیادہ تر مٹی تھی۔ دونوں نے ایسے لباس پہن رکھے تھے جو لینڈ اسکیپ کے سبز، خاکی اور سرخ رنگ میں گھل مل رہے تھے۔ اس لیے انہیں امید تھی کہ ان کو اتنی آسانی سے نہیں دیکھا جا سکے گا۔ روانگی سے پہلے راحت نے ریڈیو آف کر کے اسے ایک شاپر سے ڈھک لیا تھا کہ غیر متوقع بارش ہو اور انہیں کہیں پناہ نہ ملے تو وہ بھیگنے سے محفوظ رہے۔ ان کے پاس رابطے کا... فی الحال ایک یہی ذریعہ تھا کیونکہ موبائل سگنل تو سڑک سے کچھ دور آنے کے بعد غائب ہو گئے تھے۔ اگر ان کو ضرورت پڑتی تو ریڈیو سے ہی مدد طلب کر سکتے تھے۔

☆☆☆

علی کی حالت بہتر تھی۔ رات کہکشاں نے اسے بہت کوشش کر کے کچھ کھلایا تھا۔ پھر اسے ڈسپرین کی گولی دی۔ آخر میں اس کے سینے پر بام مالش کر کے اسے اپنے ساتھ لگا کر لٹا لیا۔ اسے زیادہ حرارت کی ضرورت تھی اور کمبل تین تھے اس لیے کہکشاں نے بہتر سمجھا کہ دو کمبلوں تلے وہ اور علی آ جائیں اور ایک عثمان لے لے۔ اسی وجہ سے صبح علی کی طبیعت بہتر ہوئی تھی۔ فرید ناشتے میں اس کے لیے پاپے لے آیا تھا۔ کہکشاں اس کی شکر گزار تھی کہ وہ ان کا بساط سے بڑھ کر خیال رکھ رہا تھا۔ ورنہ حمزہ اور باقی لوگوں کا رویہ سخت تھا۔ حمزہ جب نگرانی پر آتا تو اسے اور بچوں کو پھاڑ کھانے والے انداز میں دیکھتا تھا بلکہ بعض اوقات کہکشاں کو اس کی نظریں خود پر رینگتی محسوس ہوتی تھیں۔ اس نے جدید تراش کا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا جس میں اس کی جسمانی ساخت نمایاں تھی اور دوپٹا بھی بڑا نہیں تھا۔ اس لیے جب حمزہ نگرانی کے لیے آتا تو وہ خود میں سمٹ کر بیٹھ جاتی تھی۔ اسی طرح اسے سردار اور اس کے ساتھیوں کی نظروں سے بھی خوف آتا تھا۔ ان لوگوں میں صرف ایک فرید ایسا تھا جس کی آنکھوں میں اسے اپنے لیے میل نظر نہیں آیا تھا بلکہ اس کے انداز میں نرمی اور معصومیت تھی۔ وہ اس سے اس لیے اچھی طرح پیش نہیں آ رہا تھا کہ وہ حسین عورت تھی بلکہ یہ اس کی انسانیت تھی۔ کہکشاں حیران تھی کہ ایسا شخص ان سنگ بند مجرموں کے ساتھ تھا۔ ناشتے کے بعد وہ ان کے پاس آ بیٹھا۔ عثمان سے اس سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ اسے پاکستان کے بارے میں بتا رہا تھا۔

”سنو، مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔“ کہکشاں نے کہا۔ ”لیکن یہاں نہیں۔“

فرید سمجھ گیا کہ وہ بچوں کے سامنے بات کرنا نہیں چاہ رہی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”حمزہ کو دیکھ کر آتا ہوں۔“

فرید اسے دیکھ کر آیا اور اس نے اشارے سے کہکشاں کو باہر چلنے کو کہا۔ وہ اسے عقبی حصے میں لایا اور آہستہ سے بولا۔ ”حمزہ سو رہا ہے لیکن آپ نے جو کہنا ہے جلدی کہیں۔ وہ جاگ گیا تو...“

”سنو، تم جانتے ہو سردار نے عدیل کو آج تک کی مہلت دی ہے۔ اگر اس نے دس کروڑ روپے تاوان نہ دیا تو وہ مجھے مار دے گا؟“

فرید نے سر ہلایا۔ ”جانتا ہوں بی بی۔“

”دیکھو، عدیل تاوان دے سکتا، تب بھی شاید نہ دیتا۔ اسے مجھ سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔“

فرید نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”بی بی! وہ آپ کا شوہر ہے۔ وہ آپ کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔“

”تم نہیں جانتے۔“ وہ مضطرب لہجے میں بولی۔ ”میری اور اس کی شادی میرے بابا اور چچا کی خواہش پر ہوئی۔ میں نے بابا کی خواہش پر سر جھکایا۔ چچا جان مجھے بہت چاہتے تھے لیکن عدیل انگلینڈ میں پیدا ہوا اور وہیں پلا بڑھا اس لیے وہ مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔“

فرید جیسے دنگ رہ گیا۔ اس نے بے ساختہ کہا۔۔۔۔ ”بی بی! کوئی ایسا شخص بھی ہوگا جو آپ جیسی خوب صورت عورت سے شادی نہ کرنا چاہے۔“

کہکشاں جھینپی اور شرمائی پھر اس نے کہا۔ ”عدیل بہت عجیب ذہنیت کا آدمی ہے۔“

”اگر وہ راضی نہیں تھا تو پھر آپ سے شادی کیوں کی؟“

”کیونکہ وہ کچھ نہیں کرتا تھا، اب بھی نہیں کرتا ہے۔ وہ چچا جان کا محتاج تھا۔ اس لیے ان کی بات ماننے پر مجبور ہوا لیکن شادی کے بعد اس نے کبھی مجھے وہ محبت اور توجہ نہیں دی جو ایک بیوی ہونے کے ناتے میرا حق ہے۔ وہ کچھ نہیں کرتا تھا۔ بیوی بچے ہونے کے باوجود وہ چچا جان کے دیے ہوئے جیب خرچ سے گزارہ کرتا تھا۔ مجھے اور بچوں کو کیا دیتا۔ اسے کام کرنے کی عادت نہیں تھی اس لیے وہ اسٹور پر بھی نہیں جاتا تھا۔ میں چچا جان کے ساتھ کام کرنے لگی تھی کیونکہ وہ اکیلے اسٹور نہیں سنبھال سکتے تھے۔“

”ایسا بے غیرت شخص ہے۔“ فرید نے کہا۔

”اس کی حرکتوں کو دیکھتے ہوئے چچا جان نے اپنا سب کچھ میرے نام کردیا۔ اس سے پہلے بابا کا انتقال ہوا تو انہوں نے یہاں موجود اپنی ملکیت بھی مجھے منتقل کردی۔ ان کو خدشہ تھا کہ ان کے بعد عدیل سب کچھ عیاشی میں اڑا دے گا۔“

اگرچہ کہکشاں نے کھل کر نہیں بتایا تھا لیکن فرید سمجھ گیا کہ عدیل کس قسم کا شخص ہے اور اگر اس کے پاس سچ مچ رقم ہوتی، تب بھی وہ شاید تاوان ادا نہ کرتا۔ اس نے سر ہلایا۔ ”میں سمجھ گیا بی بی! لیکن آپ یہ سب مجھے کیوں بتا رہی ہیں؟“

”میں تمہیں بتانا چاہ رہی ہوں کہ ہماری جان بچانے کی سوائے اس کے اور کوئی صورت نہیں ہے کہ تم ہماری مدد کرو۔ ورنہ آج شام کو یہ مجھے ماردیں گے اور پھر میرے بچے بھی شاید نہ بچیں۔“

فرید کشمکش میں پڑ گیا۔ اسے بھی اس عورت اور بچوں سے ہمدردی تھی۔ وہ مجرم ذہن کا آدمی نہیں تھا۔ پڑھا لکھا تھا، اس نے ۔۔۔۔۔۔ گریجویشن کیا تھا لیکن ماں کی وجہ سے وہ روزگار کے لیے شہر نہ جاسکا اور اس کے گاؤں میں روزگار نہیں تھا۔ کچھ زمین تھی، فرید اسے کاشت کرنے لگا اور اسی سے دونوں ماں بیٹے کا گزارہ ہوجاتا تھا۔ مگر ایک بار فرید کی ماں بیمار پڑی اور وہ اسے علاج کے لیے شہر لے گیا جہاں وہ صحت یاب ہوگئی لیکن فرید پر اتنا قرض چڑھ گیا کہ اسے زمین فروخت کرنا پڑی۔ اب اس کے پاس کچھ نہیں تھا پھر انہی دنوں ایک غلط فہمی کی وجہ سے پولیس نے اسے گرفتار کرلیا، وہ اسے اس علاقے کے مشہور جرائم پیشہ سادھو شاہ کا آدمی سمجھ رہے تھے۔ سادھو شاہ ڈاکو تھا اور لوگوں کو تاوان کے لیے اغوا کرتا تھا پھر سادھو شاہ نے اسے پولیس کے چنگل سے نکالا۔ مقامی تھانے والے اس کے ہاتھ میں تھے۔ جب سادھو شاہ کی طرف سے حکم آیا تو انہیں فرید کو چھوڑنا پڑا۔

مگر دو دن میں اس کا حشر ہوگیا تھا اور وہ کئی دن تک پڑا رہا۔ پھر اسے سادھو شاہ کی طرف سے بلاوا آیا۔ اس وقت وہ نہیں سمجھا تھا کہ اسے کیوں بلایا گیا ہے لیکن جب وہ سادھو شاہ سے ملا تو اسے پتا چلا کہ وہ پولیس کے چنگل سے نکل کر ان ڈاکوؤں کے دام میں آگیا ہے۔ سادھو شاہ نے اسے اپنے ساتھ کام کرنے کو کہا، دوسری صورت میں پولیس اسے دوبارہ لے جاتی۔ یہ سن کر ہی اس کے ہوش اڑ گئے۔ اس کے پاس سادھو شاہ کی بات ماننے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں تھا لیکن اس نے کہہ دیا کہ وہ کسی جرم میں حصہ نہیں لے گا اور نہ ہی اس سے حاصل شدہ رقم سے کچھ مانگے گا۔ سادھو شاہ اسے نوکر رکھ لے۔ سادھو شاہ نے ایسا ہی کیا۔ فرید گزشتہ تین سال سے اس کے ساتھ تھا اور اس کی ڈیوٹی اس ڈیرے پر ہوتی تھی۔ جب کوئی مغوی آنے والا ہوتا تھا، وہ اس کی دیکھ بھال اور نگرانی کرتا تھا۔ جب ڈیرے پر کوئی نہ ہوتا تو اسے چھٹی مل جاتی اور وہ گاؤں چلا جاتا۔ اور جب کوئی مغوی آنے والا ہوتا تو اسے ایک دن پہلے بلا لیا جاتا۔ وہ سامان لے کر آجاتا کیونکہ کھانا بنانا بھی اس کی ذمے داری تھی۔ عام دنوں میں یہ ڈیرا خالی ہوتا اور اسے صرف مغوی رکھنے یا ہنگامی حالات میں استعمال کیا جاتا تھا۔

جب یہاں مغوی ہوتے تو فرید کے ساتھ نگرانی کے لیے سادھو شاہ کا خاص آدمی حمزہ ہوتا تھا۔ وہ نہایت سفاک اور خوں خوار شخص تھا۔ فرید برسوں سے اس کے ساتھ تھا لیکن وہ اب بھی اس سے بلاضرورت بات نہیں کرتا تھا اور جب کرتا تو اس کا لہجہ پھاڑ کھانے والا ہوتا تھا۔ اسی لیے فرید اس سے ڈرتا تھا۔ وہ اس کی سفاکی کے کئی نمونے دیکھ چکا تھا۔

اس نے فرار ہونے والے دو افراد کو فرید کے سامنے مارا تھا۔ اس کے علاوہ بھی وہ کئی افراد کا قاتل تھا۔ اس کے ہوتے ہوئے فرید اتنی جرأت نہیں کرسکتا تھا کہ کسی کی مدد کرے جبکہ اسے معلوم تھا پکڑے جانے کی صورت میں اس کے اور اس کی ماں کے ساتھ کیا ہوگا۔ یہ دھمکی سادھو شاہ نے اسے پہلے بھی دی تھی کہ اگر اس نے سادھو شاہ سے غداری کی تو اس کی سزا اس کی ماں کو ملے گی۔ وہ بوڑھی عورت تھی، یہاں سے جانے کے لیے بھی تیار نہیں تھی اور وہ پھر اسے لے کر کہاں جاتا۔ اس دنیا میں بس ایک یہی گھر اس کی پناہ گاہ تھی۔ پولیس کے پاس جانا بیکار تھا، وہ خود سادھو شاہ سے ملی ہوئی تھی۔

وہ سوچ رہا تھا اور کہکشاں پُرامید نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”پلیز! میری اور میرے بچوں کی مدد کرو۔“

فرید نے کچھ دیر بعد آہستہ سے کہا۔ ”بی بی! مجھے آپ سے ہمدردی ہے لیکن افسوس میں آپ کے لیے کچھ نہیں کرسکتا۔ میں بہت مجبور ہوں۔ اب آپ واپس چلیں۔“

☆☆☆

سادھو شاہ کسی بے تاب درندے کی طرح کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے دو اہم ساتھی تھے۔ ویسے تو اس کا دستِ راست حمزہ تھا لیکن یہ بھی کم اہم لوگ نہیں تھے۔ دراصل سادھو شاہ نے اپنا گروہ مختصر رکھا تھا۔ اس کے کل پانچ ساتھی تھے جو وارداتوں میں اس کا ساتھ دیتے تھے۔ ساتواں فرید تھا لیکن وہ۔۔۔۔ جرائم میں ملوث نہیں تھا اور اس کی حیثیت ملازم کی سی تھی۔ سادھو شاہ کا اصل نام امتیاز شاہ تھا لیکن اپنے سادھوؤں جیسی داڑھی اور نقوش کی وجہ سے وہ سادھو شاہ مشہور ہوگیا تھا۔ اس علاقے میں بچہ بچہ اس سے واقف تھا۔ سادھو شاہ دوسرے مجرموں کے مقابلے میں ہوشیار آدمی تھا۔ اسی وجہ سے وہ گزشتہ پندرہ سال سے اپنا اور اپنے گروہ کا وجود برقرار رکھے ہوئے تھا۔ ورنہ اس کے ساتھ دوسرے جرائم پیشہ مارے جاچکے تھے یا جیل میں سڑ رہے تھے۔ سادھو شاہ نے پالیسی بنا رکھی تھی کہ کسی ایسے بااثر شخص کو نہیں چھیڑنا ہے جس کے دباؤ پر پولیس اس کے پیچھے پڑ جائے۔ دوسرے وہ کوشش کرتا تھا کہ پولیس اور مقامی سرکاری حکام سے بنا کر رکھے۔

اس لیے اس نے درمیانے درجے کے دولت مندوں کو لوٹنا اور اغوا کرنا شروع کردیا۔ وہ خاص طور سے باہر سے آنے والے ایسے افراد کو اغوا کرتا تھا جو درمیانے طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور کیونکہ باہر سے کما کر آتے تھے اس لیے بڑا تاوان دے سکتے تھے۔ لیکن اس بار ایسا لگ رہا تھا کہ اس سے غلطی ہوگئی ہے۔ کہکشاں کی باتوں نے اسے پریشان کردیا تھا۔ اس نے کچھ دیر پہلے ایک فون کال کی تھی اور کسی سے تاوان کے مسئلے پر بات کرتا رہا تھا۔ اس کے بعد وہ زیادہ پریشان ہوگیا۔ اس کے ساتھی حفیظ نے کہا۔ ”سردار۔۔۔ اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟“

”اوئے پاگل تو بھول گیا ہے، ہمیں ملے نہ ملے پولیس کو حصہ دینا پڑتا ہے۔“ وہ غرایا۔ ”دس کروڑ تاوان میں سے تین کروڑ پولیس کے ہیں اور یہاں اب کچھ ملنے کی امید نہیں ہے۔“

”میرا خیال ہے وہ عورت جھوٹ بول رہی ہے۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟“ رئیس نامی ساتھی بولا۔ ”آپ نے اس سے بات کی ہے؟“

”مجھے لگ رہا ہے کہ عورت سچ کہہ رہی ہے۔“

یہ سن کر باقی تین بھی متفکر ہوگئے۔ وہ دولت کے لیے جرم کرتے تھے اور اس کے لیے اتنے خطرات مول لیتے تھے۔ اس واردات کے لیے انہوں نے بہت ہوم ورک کیا تھا اور کئی دن تک محنت کے بعد وہ اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب ہوئے تھے تو اب ان کو پتا چل رہا تھا کہ شاید انہیں اس کے بدلے کچھ نہ ملے۔ ماجد نے کہا۔ ”ایسا کیسے ہوسکتا ہے سردار؟“

”چلو دس کروڑ نہ سہی، اس کا آدھا مل جائے۔“ رئیس بولا۔

”نہیں۔“ سادھو نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”پورے دس کروڑ ورنہ کچھ نہیں۔۔۔“

”اس عورت کا کیا کرنا ہے؟“

”اسے آج مرنا ہی ہے۔“ سادھو بولا۔ ”میں حمزہ کو کہہ آیا ہوں۔“

رئیس نے کہکشاں کا سن کر ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ”سردار! اس سے زیادہ خوب صورت عورت میں نے آج تک نہیں دیکھی۔“

”فکر مت کرو، تم کو بھی حصہ ملے گا اس میں۔۔۔“ سادھو شاہ نے معنی خیز انداز میں کہا تو رئیس نے نفی میں سر ہلایا۔

”حمزہ تو اس کا حشر کردے گا کل تک۔۔۔ آپ جانتے ہو، وہ کیسا وحشی بندہ ہے عورتوں کے معاملے میں۔“

”ہاں، یہ تو ہے۔“ سادھو شاہ نے کہا۔

"اگر ہم ابھی چلے جائیں؟"

"روشنی میں نہیں۔" سادھو شاہ نے سوچا اور مان گیا۔ "تاریکی ہو جائے پھر اس طرف چلتے ہیں۔"

"ہمارے پاس بچے ہیں۔" حفیظ نے کہا۔ "ان کا کیا کرنا ہوگا؟"

"اس بارے میں سوچنا پڑے گا۔ بچوں کو مار دیا تو اوپر سے پولیس پر دباؤ آجائے گا اور اسے کارکردگی دکھانا پڑے گی۔" سادھو شاہ نے کہا۔ "پہلے ان کی ماں سے تو نمٹ لیں۔"

یک دم ہی ان چاروں کے چہروں پر درندگی چھا گئی تھی جیسے بھیڑیے شکار پر نکلنے والے ہوں۔

☆☆☆

عدیل نے اغوا کنندگان سے بات کی تھی۔ کال اسی نمبر سے شام چار بجے آئی تھی۔ عدیل نے فرخ کی ہدایات کے مطابق کہا کہ وہ تاوان ادا کرنے کے لیے تیار ہے لیکن اسے دو دن کی مہلت دی جائے۔ مگر کال کرنے والے نے اسے کسی قسم کی مہلت دینے سے صاف انکار کر دیا۔ اس نے کہا۔ "تمہیں کل سے اب تک مہلت دی تھی۔"

"تم سمجھ نہیں رہے ہو، میں باہر سے آیا ہوں۔ میرا سارا اثاثہ باہر کے ملک میں ہے اور میں اتنی جلدی دس کروڑ کا بندوبست نہیں کر سکتا۔ مجھے دو دن کا وقت چاہیے۔"

"وقت نہیں مل سکتا۔ اب تم اپنی بیوی کے کفن دفن کا بندوبست کرو۔" کال کرنے والے نے کہا اور حسب معمول کال منقطع کر کے سم نکال دی۔ فرخ نے فوراً موبائل کمپنی سے رابطہ کیا اور وہاں سے سم کی لوکیشن پوچھی۔ جواب آیا کہ وہ پولیس آفس کے پاس کے ٹاور سے استعمال ہوئی ہے۔ یہ قصبے کی آبادی کے وسط میں تھا اور یہاں کسی خاص موبائل کو ٹریک کرنا بہت دشوار تھا۔ یہ مجرموں کی چالاکی تھی کہ وہ کسی غیر آباد جگہ کے بجائے ایک آباد جگہ سے سم استعمال کر رہے تھے۔ تاکہ ان کا سراغ نہ لگایا جا سکے۔ فرخ کو مایوسی ہوئی۔ عدیل کی حالت بری ہو رہی تھی، اس نے بڑی مشکل سے کہا۔

"دیکھا میں نے کیا کہا تھا، وہ یقین نہیں کریں گے۔ شاید ان کو بھی یقین آگیا ہے کہ میں رقم نہیں دے سکتا۔"

"آپ فکر نہ کریں، یہ آپ کو ڈرانے کی کوشش کر رہے ہیں ورنہ ان کو بھی معلوم ہے کہ اگر انہوں نے مغویوں کو نقصان پہنچایا تو پھر پولیس آخر تک ان کا پیچھا کرے گی۔"

مگر عدیل کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ اسے یقین نہیں ہے کہ پولیس مجرموں کے خلاف ایسی کوئی کارروائی کر سکے گی۔ اس کے حساب سے تو اب بھی کچھ نہیں ہوا تھا۔ کچھ دیر پہلے اس نے میڈیا والوں سے بات کی تھی۔ کئی ٹی وی چینلوں کی ٹیمیں یہاں پہنچ گئی تھیں اور اس سے بات کرنا چاہ رہی تھیں۔ اس نے فرخ راجا کی اجازت سے ان سے بات کی۔ اس نے اپیل کی تھی کہ ڈاکو اس کے بیوی بچوں کو چھوڑ دیں۔ وہ دو دن سے ایک ہی سوٹ میں تھا جو خراب ہو گیا تھا۔ اس نے شاید چوبیس گھنٹے سے کنگھی نہیں کی تھی اور نہ ہی منہ دھویا تھا۔ مستقل جاگنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور بڑھے ہوئے شیو کی وجہ سے وہ مزید پریشان حال لگ رہا تھا۔

☆☆☆

دن میں دو بار انہیں بارش کا سامنا کرنا پڑا لیکن دونوں بار خوش قسمتی سے انہیں پناہ گاہ مل گئی اور وہ بھیگنے سے محفوظ رہے۔ البتہ انہیں مزید کوئی سراغ بھی نہیں ملا۔ وہ سیدھ میں سفر نہیں کر رہے تھے بلکہ گھوم پھر کر اس پورے علاقے کو چھان رہے تھے۔ ہر پانچ سو گز کے بعد وہ دائیں بائیں ایک ایک کلومیٹر جا کر دیکھتے تھے۔ سوار خان دائیں طرف جاتا اور راحت بائیں طرف۔ اس طرح وہ وسیع رقبے کو کور کر رہے تھے۔ یہ ایک مشکل کام تھا مگر راحت اور سوار خان دونوں مستقل مزاجی سے لگے ہوئے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ اس قسم کے کیسوں میں کامیابی محنت سے ہی ملتی ہے۔ شام ہونے کے بعد انہوں نے پھر ایک کھوہ تلاش کر لی۔ ایسی کھوہ اس علاقے میں جا بجا تھیں کیونکہ مستقل ہونے والی بارش نے زمین کاٹ کر اسے ناہموار کر دیا تھا۔ مگر انہیں یہاں جلانے کے لیے خشک لکڑی نہیں ملی۔ اس لیے وہ سکڑ سمٹ کر اس کھوہ میں بیٹھ گئے۔ کھانے کے لیے ان کے پاس خشک چنے تھے اور پانی تھا۔ انہوں نے اسی پر گزارہ کیا۔

"آج تو کچھ نہیں ہوا جناب۔" سوار خان نے کہا۔

"کل دیکھتے ہیں۔ اگر کوئی سراغ نہیں ملا تو واپس جائیں گے۔" راحت نے کہا۔ "مجرم جس طرح سے تاوان کے لیے بے تاب ہیں، اس سے لگ رہا ہے کہ معاملہ ایک دو دن سے زیادہ نہیں چلے گا۔ عدیل پہلے ہی ان سے کہہ چکا ہے کہ اس کے پاس تاوان دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ سب کچھ اس کی بیوی کے نام ہے۔"

"اس صورت میں مجرموں کا کیا ردعمل ہو سکتا ہے؟"

"میرا نہیں خیال کہ وہ اسے تاوان لینے کی خاطر رہا کریں گے۔ وہ انہیں رہا کریں گے یا۔۔۔" راحت نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ سوار خان سمجھ گیا۔ راحت نے کچھ دیر بعد کہا۔ "آرام کر لو، آج رات ہمیں پھر سفر کرنا ہے۔"

"اندھیرے میں؟" سوار خان نے بادلوں سے ڈھکے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

"میرے پاس نائٹ ویژن گاگلز ہیں۔"

وہ شام چار بجے ہی اس کھوہ میں آگئے تھے کیونکہ صبح سے چل چل کر ان کا برا حال ہو گیا تھا۔ اب کچھ دیر آرام کیے بغیر وہ آگے نہیں جا سکتے تھے۔

☆☆☆

جیسے جیسے شام قریب آ رہی تھی، علی کی طبیعت دوبارہ خراب ہونا شروع ہو گئی تھی۔ کہکشاں اس کے لیے بھی پریشان تھی لیکن اسے اصل فکر یہ تھی کہ چھ بجے کے بعد اس کے ساتھ کیا کیا جائے گا۔ فرید اب کمرے کے پاس نہیں تھا لیکن وہ باہر موجود تھا۔ کسی وجہ سے وہ آتا بھی تو کہکشاں سے نظریں ملانے سے گریز کرتا تھا۔ کہکشاں کو اس کے چہرے پر شرمندگی دکھائی دیتی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ فرید خود مجبور ہے۔ وہ اپنی اور اپنی ماں کی زندگیوں کے بدلے ان کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ نہ جانے کیوں کہکشاں کا دل کہہ رہا تھا کہ اس کے ساتھ کچھ برا ہونے والا ہے۔ شاید یہ اسے مار دیں گے۔ شاید مارنے سے پہلے وہ اس کے ساتھ کوئی برا سلوک کریں۔ کہکشاں کا یہ سوچ کر ہی دل بیٹھ رہا تھا اور اسے اصل خطرہ یہی تھا۔ اس خطرے کو محسوس کرتے ہوئے اسے موت کا خطرہ بھی کم محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے دوپہر میں خود کچھ نہیں کھایا تھا مگر بچوں کو زبردستی کھلا دیا تھا۔ شام کو غیر متوقع طور پر فرید اس کے لیے چائے لے آیا۔ اس سے پہلے انہیں صرف ناشتے میں چائے دی جاتی تھی۔ یہ پہلی بار ہوا تھا کہ شام کو اسے چائے دی گئی تھی۔ کہکشاں نے آہستہ سے کہا۔

"کیا کوئی خاص بات ہے جو مجھے چائے دی ہے؟"

"نن۔۔۔ نہیں۔" فرید نے نروس انداز میں کہا۔

"سنو، میری ایک درخواست ہے۔" کہکشاں نے دروازے کے پاس ہو کر اتنی دھیمی آواز میں کہا کہ بچے نہ سن سکیں۔ "اگر میرے بارے میں کوئی فیصلہ ہو گیا ہے اور میں زندہ نہ رہوں تو پلیز تم میرے بچوں کا خیال رکھنا۔ کوشش کرنا کہ ان کی جان بچ جائے۔ میں جانتی ہوں تم مجبور ہو لیکن کوشش ضرور کرنا۔"

فرید کے چہرے پر کشمکش کے آثار بڑھ گئے، اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا اور صرف سر ہلا کر چلا گیا۔ اس کے

جانے کے بعد کہکشاں بچوں کے پاس آگئی۔ اس نے علی کو پیار کیا۔ اس کا چہرہ بخار سے تپ رہا تھا۔ آج بخار کل سے زیادہ تھا۔ عثمان اس کے قریب سرک آیا۔ "ماما! آپ فرید سے کیا کہہ رہی تھیں؟"

"کچھ نہیں بیٹا۔" کہکشاں نے جھوٹ بولا۔ "میں پوچھ رہی تھی کہ رات کا کھانا کب لاؤ گے۔"

"آپ نے دوپہر میں بھی نہیں کھایا ہے۔" عثمان بولا۔ "ماما! یہ ہمیں کب جانے دیں گے؟"

کہکشاں کا دل ڈوب گیا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اب وہ انہیں کبھی نہیں جانے دیں گے۔ کم سے کم اسے نہیں چھوڑیں گے کیونکہ انہیں تاوان نہیں ملا تھا اور ملنے کا کوئی امکان بھی نہیں تھا۔ سردار نے اسے بتا دیا تھا کہ آج شام تک تاوان نہ ملا تو وہ ماری جائے گی۔ کہکشاں کے پاس گھڑی نہیں تھی اور باہر گھنے بادل تھے مگر جب اندھیرا چھانے لگا تو اسے لگا کہ وقت قریب آگیا ہے۔ اس نے بچوں کو خود سے چمٹا لیا اور انہیں پیار کرنے لگی۔ اسے پتا نہیں چلا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ علی نے کہا۔ "ماما! آپ کیوں رو رہی ہیں؟"

"بس ایسے ہی۔" اس نے کہا اور عثمان کی طرف دیکھا۔ "اگر یہ لوگ مجھے آپ سے الگ کر کے کہیں اور لے جائیں تو آپ بھائی کا خیال رکھیے گا۔ اس کی طبیعت خراب ہے۔"

یہ سن کر علی اور عثمان دونوں بے تاب ہو گئے کہ کہکشاں ان سے الگ ہو کر کہیں جا رہی ہے۔ وہ اس سے چمٹ گئے۔ "نہیں ماما! ہم آپ کے ساتھ جائیں گے۔"

"نہیں بیٹا! یہ آپ کو نہیں جانے دیں گے۔" کہکشاں نے اپنے آنسو صاف کیے۔ پھر اس نے بہانہ کیا۔ "اصل میں یہاں موبائل سگنل نہیں ہیں اور یہ تمہارے پاپا سے میری بات کرانا چاہتے ہیں۔"

اسی لمحے فرید آگیا۔ "بی بی چلو۔"

"کہاں؟" کہکشاں نے اٹھتے ہوئے کہا پھر بچوں کو سنانے کے لیے بولی۔ "اوہ اچھا، تم مجھے کال کروانے لے جا رہے ہو۔"

فرید نے بچوں کو دیکھا اور صرف سر ہلایا۔ کہکشاں اس کے ساتھ باہر آئی تو فرید نے دروازے بند کر دیے اور بہت آہستہ سے بولا۔ "آپ کو حمزہ نے بلایا ہے۔"

"کک۔۔۔ کیوں؟" وہ ہراساں ہو گئی۔

فرید نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ "میں نہیں جانتا بی

بی! میں ملازم ہوں۔ مجھے جو کہا جاتا ہے، وہ کرتا ہوں۔"

کہکشاں جانتی تھی کہ مزاحمت یا شور کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اسے لگا کہ وہ لمحہ آ گیا تھا جس سے وہ ڈر رہی تھی۔ اگر وہ زبردستی لے جائی جاتی تو بچے جان جاتے اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے بچوں کی تکلیف میں اضافہ ہو اس لیے وہ فرید کے ساتھ باہر آ گئی۔ "وہ کیا چاہتا ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" فرید نے کہا اس کے لہجے کی لرزش نے بتادیا کہ اسے معلوم ہے۔ وہ گھوم کر کوٹھڑیوں کے دوسری طرف آئے اور فرید نے ایک کوٹھڑی کی طرف اشارہ کیا۔ "اندر چلی جاؤ بی بی۔"

کہکشاں نہیں جانا چاہتی تھی، اسے لگا کہ وہاں کوئی عفریت بیٹھا ہے جو اندر جاتے ہی اسے چیر پھاڑ کر کھا جائے گا۔ وہاں سچ مچ عفریت ہی تھا۔ اچانک دروازہ کھلا اور حمزہ کی بھیانک صورت دکھائی دی۔ اس نے کہکشاں کا ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچ لیا اور دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ اس کے مکروہ عزائم اس کی صورت پر لکھے تھے۔ وہاں ایک طرف لالٹین جل رہی تھی اور فرش پر قالین کے اوپر ایک بستر بچھا ہوا تھا۔ کہکشاں سہم گئی۔ "کیا چاہتے ہو تم؟"

"تجھے چاہتا ہوں۔" وہ بولا۔ "راضی خوشی مان جائے گی تو ٹھیک ہے ورنہ میں کیسا آدمی ہوں، تجھے پتا چل جائے گا۔"

کہکشاں دیوار سے لگ گئی۔ "میرے قریب مت آنا۔"

مگر حمزہ نے اس کی بات نہیں سنی۔ اس نے کہکشاں کو بازو سے پکڑ کر بستر کی طرف پھینک دیا اور اس سے پہلے کہ وہ اٹھتی، اسے دبوچ لیا۔ وہ روتے ہوئے مزاحمت کرنے لگی مگر اس دیوزاد کے سامنے اس کی مزاحمت ایسی ہی تھی جیسے کوئی چڑیا کسی باز کے سامنے مزاحمت کرے۔ وہ اس پر حاوی ہوتا جا رہا تھا اور اس وقت جب کہکشاں کو یقین ہو گیا کہ اب وہ نہیں بچ سکتی تو اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ حمزہ رکا اور پھر غرایا۔ "کیا ہے؟"

"سردار آیا ہے، وہ بلا رہا ہے۔"

اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ کے آثار نمودار ہوئے مگر سردار کا حکم تھا۔ اسے اٹھنا ہی پڑا اور جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا، ایک ڈنڈا اس کے سر پر لگا۔ وہ دھاڑ کر پیچھے گرا۔ فرید اندر آیا اور اس کے سر پر دوبارہ ضرب لگائی۔ اس نے پوری قوت استعمال کی تھی کیونکہ حمزہ بہت طاقتور تھا۔ اسے موقع ملتا تو وہ اس پر حاوی ہو جاتا اور اس حرکت کی پاداش میں اس کے قتل سے کم کسی چیز پر راضی نہیں ہوتا۔ حمزہ بے ہوش ہوا تو وہ لپک کر کہکشاں کے پاس آیا جو اب بھی شاک میں تھی۔ اس کا لباس بے ترتیب ہو رہا تھا۔ فرید نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا۔ "بی بی... ہوش کرو۔ اٹھو، ابھی یہاں سے نکلنا ہے۔"

کہکشاں اٹھی، فرید نے اسے پانی دیا۔ پانی پی کر اس کے حواس بحال ہوئے اور اس نے حمزہ کو دیکھا۔ "اسے کیا ہوا ہے؟"

"بے ہوش ہے اور اس سے پہلے کہ ہوش میں آئے، ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔ آپ بچوں کو دیکھو۔"

بچوں کا سنتے ہی کہکشاں پوری طرح ہوش میں آ گئی۔ اس نے اپنا بے ترتیب ہو جانے والا لباس درست کیا اور دوپٹا سنبھال کر کوٹھڑی کی طرف آئی۔ اس کے چہرے پر کچھ خراشیں آئی تھیں مگر اس کی عزت بچ گئی تھی۔ وہ اندر آئی تو عثمان خوش ہو گیا۔ "ماما! آپ کی پاپا سے بات ہوئی؟"

"نہیں بیٹا! لیکن ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔" وہ بولی۔ اس نے علی کو دیکھا، اسے بخار تھا۔ کہکشاں نے پانی کی بوتل اور دوا عثمان کو پکڑائی اور خود علی کو کمبل میں لپیٹ کر گود میں اٹھا لیا۔

"ماما! ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"بیٹا! اس وقت یہاں صرف فرید ہے اور وہ ہمارے ساتھ ہے۔ ہم یہاں سے بھاگ کر پولیس تک پہنچ گئے تو ان لوگوں سے بچ سکتے ہیں۔" کہکشاں نے اسے سمجھایا۔ اسے فرید کا انتظار تھا۔ وہ کچھ دیر بعد آیا۔ اس نے حمزہ کی رائفل اور ایک ٹارچ اٹھا رکھی تھی۔

"بی بی! جلدی کریں۔"

فرید کے انداز سے کہکشاں کو بھی خطرہ محسوس ہوا۔ وہ بہ مشکل بچوں سمیت جھاڑیوں سے باہر آئے اور ٹارچ کی روشنی میں اس ناہموار اور مشکل علاقے میں پیدل چلنے لگے۔ فرید نے آمد و رفت کے لیے مخصوص راستے سے ہٹ کر چلنا شروع کیا تھا۔ کہکشاں کے لیے علی کو کمبل سمیت اٹھا کر چلنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس لیے فرید نے اسے گود میں لے لیا اور رائفل اور ٹارچ کہکشاں کے حوالے کر دی۔ اب راستہ وہ دکھا رہی تھی۔ اس نے فرید سے پوچھا۔ "ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"سڑک کی طرف بی بی... لیکن دوسرے راستے سے۔ اس راستے سے یہ لوگ آتے جاتے ہیں اور ابھی وہ آنے والے ہیں۔ ان کے آنے سے پہلے ہم یہاں سے دور نکل جائیں تو اچھا ہے۔"

یہ تو واضح تھا کہ فرید نے اس کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کہکشاں نے آہستہ سے کہا۔ "تم نے یہ سب کیسے کیا؟"

"میں نہیں جانتا بی بی لیکن جب میں نے آپ کی بے بس آواز سنی تو میرے اندر کچھ ہوا۔ تب میں وہ سب بے اختیار کر گیا۔ اگر میں سوچتا تو کبھی ایسا نہ کر پاتا۔"

عثمان کی وجہ سے وہ اشاروں کنایوں میں بات کر رہے تھے۔ "میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔ تم نے مجھے بچا لیا۔ یقین کرو اگر وہ کامیاب ہو جاتا تو میں کل زندہ نہ ہوتی۔"

"میں سمجھتا ہوں بی بی... شریف عورت کے لیے عزت ہی سب کچھ ہوتی ہے۔" فرید نے کہا۔ اسی لمحے دور روشنی لہرائی۔ کوئی گاڑی اس طرف آ رہی تھی اور وہ ڈیرے سے زیادہ دور نہیں تھے۔ اس نے عجلت میں کہا۔ "تیز چلیں بی بی... وہ آ گئے ہیں۔"

☆☆☆

سادھو شاہ اور اس کے ساتھی ڈیرے کی طرف آ رہے تھے۔ اس کا پانچواں ساتھی قصبے سے آیا تھا جہاں سے وہ سادھو شاہ کی ہدایت کے مطابق تاوان کے لیے کال کر رہا تھا۔ وہ ڈیرے کے پاس رکے۔ عام طور سے جیپ کی آواز سن کر فرید خود آ جاتا تھا لیکن اس وقت وہ نہیں آیا تو وہ خود اندر آئے۔ وہاں خاموشی تھی۔ سادھو شاہ نے اپنے آدمیوں سے کہا۔ "دیکھو، یہاں اتنی خاموشی کیوں ہے... یہ فریدا کہاں مر گیا ہے؟"

حفیظ نے جب حمزہ والی کوٹھڑی میں دیکھا تو حمزہ بے ہوش پڑا دکھائی دیا۔ اس کا سر پھٹا ہوا تھا اور آس پاس خون پھیلا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ تیزی سے حرکت میں آئے اور ایک منٹ میں سارا ڈیرا دیکھ لیا۔ رئیس بولا۔ "سردار! فرید عورت اور بچوں کے ساتھ غائب ہے۔"

"تلاش کرو اسے۔" سادھو شاہ دہاڑا۔ "یہ اسی کا کمینہ پن ہے۔"

حفیظ جو حمزہ کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا، اس نے کہا۔ "زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے۔ اس کے سر سے ابھی تک خون بہہ رہا ہے۔ وہ دس منٹ پہلے نکلے ہوں گے۔"

سادھو شاہ حفیظ کو حمزہ کے پاس چھوڑ کر اپنے باقی ساتھیوں کے ہمراہ باہر آ گیا۔ اس نے کہا۔ "وہ یقیناً سڑک کی طرف گئے ہوں گے... وہیں چلو۔"

وہ کچھ دور گئے ہوں گے کہ انہیں دور ایک طرف روشنی لہراتی دکھائی دی۔ سادھو شاہ نے جیپ روک دی اور دوربین سے دیکھا۔ "وہی ہیں۔" اس نے جوش سے کہا اور نیچے اتر آیا۔ یہ راستہ ایسا تھا کہ اس پر جیپ نہیں جا سکتی تھی۔ انہیں پیدل ہی ان کے پیچھے جانا تھا۔ اس کے ساتھی بھی ہتھیار سنبھالتے ہوئے اس کے ساتھ اتر آئے۔ سادھو شاہ نے حکم دیا۔ "فریدے کو کتے کی موت مار دینا اور بچوں کو بھی۔ پر عورت کو زندہ رکھنا، وہ ہمارے ہاتھوں سسک سسک کر مرے گی۔"

☆☆☆

کہکشاں کے لیے اس طرح چلنا بھی آسان نہیں تھا حالانکہ اب اسے صرف رائفل اور ٹارچ سنبھالنا پڑ رہی تھی۔ رائفل بار بار اس کے شانے سے پھسل رہی تھی اور زمین پر پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑ رہا تھا۔ اس کے مقابلے میں فرید کمبل سمیت علی کو اٹھائے ہوئے تھا لیکن وہ زیادہ تیزی سے چل رہا تھا اور بار بار اس سے بھی تیز چلنے کو کہہ رہا تھا۔ "بی بی جلدی کرو... کچھ دیر میں وہ ہماری تلاش میں نکلیں گے اور ان کے پاس گاڑی ہے۔"

آسمان پر گہرے بادلوں کی وجہ سے اندھیرا تھا مگر ٹارچ سے انہیں راستہ دیکھنے میں آسانی تھی۔ البتہ کہکشاں کو ایک خدشہ تھا۔ "سنو، کہیں وہ اس ٹارچ کی روشنی نہ دیکھ لیں۔ یہ اندھیرے میں بہت دور سے نظر آ رہی ہوگی۔"

"مجبوری ہے بی بی... اس کے بغیر ہم اندھیرے میں ٹھوکریں کھائیں گے اور یہاں گہرے گڑھے بھی ہیں۔" فرید نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "گر گئے تو بندہ نکل بھی نہیں سکتا۔"

وہ ڈیرے سے دو کلومیٹرز دور نکل آئے تھے مگر فرید کے خیال میں وہ اب بھی خطرے میں تھے بلکہ جب تک وہ سڑک تک پہنچ کر مدد حاصل نہ کر لیتے، خطرے میں ہی ہوتے۔ وہ اس وقت چند چھوٹے بڑے ٹیلوں کے درمیان سے راستہ تلاش کرتے گزر رہے تھے کہ اچانک فائر ہوا اور گولی سیٹی سی بجاتی ان کے پاس سے گزر گئی۔ کہکشاں نے چیخ ماری اور جلدی سے عثمان کو لیتی ہوئی نیچے لیٹ گئی۔ فرید تیزی سے ایک ٹیلے کی آڑ میں جا چکا تھا، اس نے کہکشاں سے کہا۔ "بی بی جلدی سے ادھر آ جاؤ... پر اٹھنا نہیں۔ یہ جگہ کھلی ہے۔"

کہکشاں عثمان کو آگے رکھتے ہوئے اور اسے دھکیلتی ہوئی ٹیلے تک آئی۔ زمین پر رینگنے سے کپڑے خراب ہو رہے تھے اور ہاتھ پاؤں رگڑ کھا رہے تھے لیکن جان کے

مقابلے میں یہ کچھ بھی نہیں تھا۔ اس پہلے فائر کے بعد دو گولیاں اور چلیں پھر خاموشی چھا گئی۔ فرید نے جلدی سے کہکشاں سے لے کر ٹارچ بند کر دی اور بولا۔ ”بی بی... انہوں نے ہمیں دیکھ لیا ہے اور اب وہ ہمیں گھیرنے کی کوشش کریں گے۔“

کہکشاں ہراساں ہو گئی۔ ”پھر کیا کریں؟“

فرید نے اس سے رائفل لے لی۔ یہ ٹریل ٹو رائفل تھی اور اس کے دو اضافی میگزین بھی تھے۔ آنے والے مشرق کی طرف تھے۔ فائر وہیں سے ہوئے تھے اور شاید ان کو روکنے کے لیے ہی کیے گئے تھے۔ فرید کا اندازہ تھا کہ وہ دو ڈھائی سو گز کے فاصلے پر تھے۔ اس نے کہکشاں سے کہا۔ ”آپ بچوں کو لے جاؤ۔ خاموشی سے جانا آواز نہ نکلے... میں ان کو روکنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

”نہیں، ہم اکیلے نہیں جا سکتے۔“ کہکشاں بولی۔

”بی بی جاؤ... کسی طرح بھی جاؤ۔ یہاں رکیں تو ماری جاؤ گی۔ بلکہ یہ تمہارے بچوں کو مار دیں گے اور تمہیں زندہ لے کر جائیں گے۔“

”نہیں۔“ کہکشاں لرز گئی۔ اس نے عثمان اور علی کو بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ علی اٹھ گیا تھا۔ بچے بھی حالات کی سنگینی کو محسوس کر رہے تھے اور ماں سے لپٹے جا رہے تھے۔

”تب جاؤ بی بی! میں ان کو روکتا ہوں۔“ فرید نے کہا۔ ”میں بھی پیچھے آؤں گا۔“

کہکشاں نے بچوں کے ہاتھ تھام لیے اور جھکی ہوئی ٹیلے کی آڑ سے نکل کر آگے بڑھی۔ ٹارچ جلانے کی گنجائش نہیں تھی اور ویسے بھی وہ فرید کے پاس تھی۔ اسے اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھنا پڑ رہا تھا۔ وہ بار بار بچوں سے کہہ رہی تھی کہ وہ آواز نہ نکالیں۔ کچھ دیر بعد عثمان نے کہا۔ ”ماما! ہم چپ ہیں... آپ بھی چپ ہو جائیں۔“

کہکشاں جھینپ گئی۔ وہ واقعی بلاوجہ بول رہی تھی اگرچہ آواز بہت کم تھی لیکن اس سناٹے میں ہلکی سی آواز بھی دور تک سنائی دیتی۔ کم رفتار سے چلنے کے باوجود وہ اس ٹیلے سے خاصے دور نکل آئے تھے۔ کہکشاں ایک چھوٹی سی جھاڑی کے پاس رکی۔ علی کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ بخار میں تپ رہا تھا۔ اس کے باوجود ہمت کر کے چل رہا تھا۔ کہکشاں اسے ایک حد سے زیادہ سہارا نہیں دے سکتی تھی کیونکہ وہ راستہ بھی دیکھ رہی تھی اور ٹٹول کر چل رہی تھی۔ اسے خطرہ تھا کہ وہ بے خبری میں کسی گڑھے میں نہ جا گریں اور پھر ایسا ہی ہوا۔ اچانک ہی خلا آیا۔ کہکشاں نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن عثمان کا پاؤں پہلے ہی جا چکا تھا۔ اس کا توازن بگڑا تو اسے روکنے کی کوشش میں کہکشاں بچوں سمیت گڑھے میں گر گئی۔ ان کی چیخیں تیز اور اونچی تھیں۔

☆☆☆

راحت اور سوار خان غنودگی میں تھے کہ اچانک سوار خان ہوشیار ہو گیا۔ اس نے راحت کو ہلایا۔ ”آپ نے کچھ سنا؟“

وہ بھی ہوشیار ہو گیا۔ ”کیا ہوا؟“

”مجھے لگا ہے آس پاس کہیں فائرنگ ہوئی ہے۔ آواز بہت ہلکی تھی۔“

راحت مستعد ہو گیا۔ ”فائرنگ ہو سکتی ہے۔ چیک کرنا ہوگا۔“

اس نے بیگ سے نائٹ ویژن گاگلز نکالے۔ اتفاق سے اس کے پاس دو تھے۔ اب دونوں ہی رات میں بھی دن کی طرح دیکھ سکتے تھے۔ انہوں نے باقی سامان چھوڑ دیا اور اپنے ہتھیار لے کر باہر آئے۔ البتہ راحت نے ریڈیو ساتھ ہی رکھا تھا۔ اگر بیچ اغوا کنندگان سے سامنا ہو جاتا تو وہ مدد طلب کر سکتا تھا۔ وہ روانہ ہوئے لیکن انہیں بھی چلنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ نائٹ ویژن دور کا منظر تو صاف دکھا رہی تھی لیکن انہیں اپنے پیروں کے آگے زمین کو دیکھنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ پتا نہیں چلتا تھا کہ آگے پتھر ہے یا گڑھا اور وہ ٹھوکریں کھا رہے تھے۔ راحت نے آہستہ سے پوچھا۔ ”کچھ اندازہ ہے آواز کس طرف سے آئی تھی؟“

”ایک تو میں غنودگی میں تھا اور دوسرے ہم کھوہ میں تھے۔ اس لیے اندازہ کرنا تقریباً ناممکن ہے کہ آواز کہاں سے آئی تھی۔“

”تب رکو... ہمیں کسی بلند جگہ سے دیکھنا ہوگا کہ آس پاس کوئی ہے۔“

انہوں نے دو الگ بلند ٹیلے منتخب کیے اور ان کی طرف بڑھ گئے۔ راحت جس ٹیلے پر چڑھا تھا، وہ عام زمین سے کوئی پچاس فٹ بلند تھا اور یہاں سے کوئی ایک کلومیٹر تک صاف دکھائی دے رہا تھا۔ فوراً ہی اسے مغرب کی سمت چند دھبے دکھائی دیے۔ اس نے اشارے سے سوار خان کو اپنی طرف متوجہ کیا اور سمت کے بارے میں بتایا۔ وہ دونوں ٹیلوں سے اتر کر اس طرف روانہ ہوئے۔ اسی لمحے تیز فائرنگ کی آواز سنائی دی۔

☆☆☆

فرید، کہکشاں اور بچوں کے جانے کے بعد کچھ دیر تو

اسی ٹیلے میں دبکا رہا پھر وہ بھی جھک کر ان کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ دوسری طرف سے خاموشی تھی لیکن اسے یقین تھا کہ سادھو شاہ کے آدمی پھیل کر اسے گھیر رہے ہوں گے۔ اسے رائفل چلانی آتی تھی۔ اتنے عرصے ان لوگوں کے ساتھ رہ کر اس نے بہت کچھ سیکھا تھا لیکن وہ ان کی طرح تجربہ کار اور ماہر نشانے باز نہیں تھا۔ سب سے بڑھ کر وہ ان جیسی قاتل فطرت نہیں رکھتا تھا۔ مگر اسے اب اپنی اور ان لوگوں کی جان بچانی تھی جن کے لیے اس نے ہمت کی اور سادھو شاہ جیسے سفاک آدمی سے بغاوت پر آمادہ ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کسی صورت اسے معاف نہیں کرے گا۔ فرید نے سوچا تھا کہ وہ کہکشاں اور اس کے بچوں کو محفوظ مقام پر پہنچا کر سیدھا گھر جائے گا اور ماں کو لے کر ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلا جائے گا۔ اب یہاں رہنا ممکن نہیں تھا۔

اچانک اسے کہکشاں اور بچوں کی چیخیں سنائی دیں۔ ایسا لگا جیسے وہ کسی ناگہانی صورتِ حال سے دوچار ہوئے ہوں۔ فرید تشویش زدہ ہو گیا۔ اس نے احتیاط بالائے طاق رکھ کر راستہ دیکھنے کے لیے ٹارچ روشن کی اور اسی لمحے کسی نے برسٹ مارا۔ فرید جھٹکے سے نیچے گرا۔ اسے لگا جیسے اس کے دائیں پہلو میں دہکتا ہوا انگارا گھس گیا ہے۔ تکلیف سے اس کے منہ سے چیخ نکلی۔ اس نے زخم والی جگہ ہاتھ رکھا تو اس کا ہاتھ خون سے بھر گیا۔ اس کے ہاتھ سے ٹارچ چھوٹ کر بند ہو گئی تھی لیکن اس نے رائفل نہیں چھوڑی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ برسٹ کہاں سے مارا گیا تھا، وہ جگہ زیادہ دور نہیں تھی۔ درد برداشت کرتے ہوئے فرید نے رائفل کا رخ اس طرف کر دیا۔ جیسے ہی اسے ہلکا سا لگا کہ کوئی حرکت کر رہا ہے، اس نے برسٹ مارا۔ یہ رائفل تین گولیوں کا برسٹ مارتی تھی اور فرید نے اسے برسٹ موڈ پر کر لیا تھا۔ اس کا فوری نتیجہ نکلا اور دوسری طرف سے کسی کی چیخ سنائی دی۔ اس نے ایک شکار تو کر لیا تھا۔

گولی چلاتے ہی اس نے اپنی جگہ بدل لی تھی اور وہاں سے کھسک کر دور چلا گیا تھا۔ اسے ایک بڑا پتھر ملا تو وہ اس کی آڑ میں ہو گیا۔ اسی لمحے دو اطراف سے اس طرف فائرنگ ہوئی جہاں وہ کچھ دیر پہلے موجود تھا۔ اگر وہ وہاں سے نہ سرکتا تو اسے کوئی نہ کوئی گولی چاٹ جاتی مگر صورتِ حال تو اب بھی اچھی نہیں تھی۔ تکلیف کے ساتھ خون بہنے سے بھی اس کا سر چکرا رہا تھا اور وہ خود کو ہوش میں رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ بے ہوش ہو گیا تو وہ آسانی سے اسے مار دیں گے اور پھر اس جگہ کہکشاں اور بچوں کو تلاش کرنا بھی زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔ یہ ان کا علاقہ تھا۔ وہ خود کو ہوش میں رکھنے کی کوشش کرنے لگا مگر ایسا لگ رہا تھا کہ وہ زیادہ دیر خود کو ہوش میں نہیں رکھ سکے گا۔

☆☆☆

کہکشاں اور بچے جس گڑھے میں گرے تھے، وہ زیادہ گہرا نہیں تھا اور اس کی تہ میں بارش کا پانی جمع تھا اس لیے وہ چوٹ سے تو محفوظ رہے لیکن پانی نے انہیں اس موسم میں بھگو دیا تھا۔ علی تو فوراً ہی کانپنے لگا۔ ”ماما! مجھے... سردی لگ رہی ہے۔“

”شش...“ کہکشاں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”چپ رہو، وہ لوگ پاس ہیں۔“

عثمان کانپ رہا تھا لیکن وہ خود پر قابو رکھے ہوئے تھا۔ کہکشاں ٹٹول کر خشک جگہ آئی اور اس نے دونوں بچوں کو بھی اسی طرف کھینچ لیا۔ وہ پانی میں گرنے کے فوراً بعد سنبھل گئے تھے، اس لیے اوپری لباس اتنا گیلا نہیں ہوا تھا لیکن نیچے سے یہ بالکل بھیگ گیا تھا اور باقاعدہ پانی نچڑ رہا تھا۔ کہکشاں نے جلدی سے علی کی پینٹ اتار کے نچوڑی اور دوبارہ اسے پہنا دی۔ وہ اور عثمان سردی برداشت کر سکتے تھے مگر علی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اسے سردی زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ کہکشاں نے اسے خود سے لپٹا لیا اور اپنے وجود کی گرمی دینے لگی۔ اسی لمحے تیز فائرنگ کی آواز آئی۔ برسٹ چلا تھا۔ وہ چونک گئی۔ اسے فرید کا خیال آیا اور پھر دسوسے آنے لگے۔ فرید کے پاس رائفل تھی اور کسی نے برسٹ مارا تھا۔ یعنی فرید پر فائرنگ ہوئی تھی۔ اس نے علی اور عثمان کو پاس پاس بٹھایا اور سرگوشی میں بولی۔ ”آپ دونوں یہیں رہیں اور بالکل آواز نہیں نکالنی ہے، جب تک میں واپس نہ آجاؤں۔“

”ماما! آپ نہ جائیں۔“ علی نے کمزور آواز میں کہا۔

”ماما کی جان... میں ابھی آتی ہوں۔“ کہکشاں نے اسے پیار کیا۔ ”آپ دونوں چمٹ کر بیٹھ جائیں۔ آپ دونوں کو سردی بھی نہیں لگے گی۔“

انہیں ساتھ بٹھا کر کہکشاں کھڑی ہوئی اور اس گڑھے سے نکلنے کا راستہ تلاش کرنے لگی۔ یہ کوئی دس بارہ فٹ گہرا گڑھا تھا۔ بالآخر اسے ایک جگہ ڈھلان محسوس ہوئی اور وہ مٹی میں انگلیاں گاڑ کر اوپر جانے لگی۔ کئی بار وہ واپس گرتے گرتے بچی لیکن پھر گڑھے سے نکل آئی۔ اس کے کئی ناخن ٹوٹ گئے تھے۔ وہ اٹھنے کے بجائے زمین پر بیٹھ کے آگے بڑھنے لگی۔ اس طرح وہ زمین بھی ٹٹول رہی تھی اور اگر کوئی

دیکھ رہا تھا تو وہ اس کی نظروں میں آنے سے بھی بچ جاتی۔ جب وہ اوپر آرہی تھی تو ایک بار پھر فائرنگ ہوئی تھی اور کسی کی چیخ سنائی دی تھی لیکن اب خاموشی تھی لیکن جیسے ہی وہ ذرا آگے آئی، ایسا لگا کئی ہتھیاروں کے دہانے کھل گئے ہوں۔

☆☆☆

سادھو شاہ کا غصے سے بُرا حال تھا کیونکہ فرید کی فائرنگ سے ماجد مارا گیا تھا اور غیاث زخمی ہوا تھا۔ غیاث اس کا وہ ساتھی تھا جو اغوا ہونے والوں کے ورثا سے موبائل کے ذریعے بات کرتا تھا۔ ماجد کو ایک ہی گولی سر میں لگی تھی اور وہ فوراً مر گیا تھا جبکہ غیاث کو پیٹ اور سینے میں دو گولیاں لگی تھیں اور وہ بھی قریب المرگ لگ رہا تھا۔ ایک معمولی سے شخص نے اس کے دو تجربہ کار ساتھیوں کو ایک ہی بار میں نشانہ بنالیا تھا۔ اب اس کے ساتھ صرف رئیس تھا۔ اس نے رئیس سے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ وہ زخمی ہوا ہے۔ تم دائیں طرف سے جاؤ اور میں بائیں طرف سے۔ اس جگہ بیک وقت فائر کرنا ہے... وہ بچنے نہ پائے۔“ سادھو شاہ نے گالی دی۔

”تم فکر مت کرو سردار... کچھ دیر میں اس کی لاش ہمارے سامنے ہوگی۔ اس کے بعد عورت اور بچوں کو تلاش کرنا مشکل نہیں ہوگا۔“

وہ دونوں دائیں بائیں گئے اور پھر انہوں نے ایک ساتھ اس سمت میں فائر کھول دیا جہاں ان کے خیال میں فرید موجود تھا۔

☆☆☆

فرید بار بار سر جھٹک رہا تھا تا کہ بے ہوش نہ ہونے پائے۔ اسی کوشش میں ایک بار رائفل کا دستہ اس کے زخم کو چھو گیا اور تکلیف نے اسے تڑپا دیا لیکن اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اس کے ذہن پر طاری ہوتی دھند چھٹ گئی اور وہ ہوشیار ہو گیا۔ اس کی طرف دو ہتھیاروں سے فائرنگ ہوئی تھی اور اب خاموشی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا اس کے پیچھے بس تین بندے آئے تھے؟ اسے حمزہ کا خیال آیا۔ یقیناً کوئی اس کی دیکھ بھال کے لیے رک گیا ہوگا۔ اس لیے ان کے پیچھے تین یا چار افراد آئے تھے۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس نے ایک بار فائر کیا تھا اور دو افراد مارے گئے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اچانک کوئی اس سے ٹکرایا اور اس نے تڑپ کر رائفل کا رخ اس طرف کرنا چاہا کہ کہکشاں کی آواز آئی۔ ”یہ میں ہوں۔“

”آپ یہاں کیوں آئیں؟“ فرید نے کہا۔ ”میں نے کہا تھا کہ آپ یہاں سے دور چلی جائیں۔“

”ہم ایک گڑھے میں گر گئے تھے۔ میں بڑی مشکل سے نکلی ہوں۔ مجھے تمہارا خیال تھا۔ تم ٹھیک ہو نا؟“

”نہیں، مجھے گولی لگی ہے؟“ فرید نے آہستہ سے کہا۔ نہ جانے کیوں کہکشاں کو پاس پا کر اسے حوصلہ ہوا۔ ”میں نے ٹارچ روشن کی تھی کہ انہوں نے فائرنگ کر دی۔“

”تم نے بھی فائرنگ کی تھی؟“ کہکشاں نے اس کا زخم ٹٹولتے ہوئے کہا۔

”جی بی بی! میرا خیال ہے ان کے بندے زخمی ہوئے ہیں۔“

خون بہنے کی رفتار کم ہوگئی تھی، اس کا مطلب تھا کہ زخم بہت خطرناک نہیں لیکن بہر حال گولی کا زخم تھا۔ کہکشاں کے ہاتھ لگے تو اسے تکلیف ہوئی۔ کہکشاں نے اپنا دوپٹا گدی بنا کر اس کے زخم پر رکھا۔ لیکن اس پر باندھنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ وہ اپنی قمیص کا دامن پھاڑنے جا رہی تھی لیکن فرید نے روک دیا۔ ”نہیں، اس سے آواز ہوگی اور وہ قریب ہیں۔“

”تب یہاں سے چلو۔“ کہکشاں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور وہ وہاں سے دور جانے لگے۔ فرید کے لیے اس طرح چلنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس کے زخم سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ وہ ہمت کر کے چل رہا تھا۔ ایک بار اس نے دبی زبان میں کہا۔

”بی بی! آپ میری فکر مت کرو، اپنی اور بچوں کی جان بچاؤ۔“

”میں تمہیں اس طرح چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔“ کہکشاں نے انکار کیا۔ وہ نازک اندام عورت تھی اور فرید کا وزن اچھا خاصا تھا۔ اسے سہارا دینا آسان نہیں تھا مگر کہکشاں ہمت کر کے اسے سہارا دے رہی تھی۔ ایک ہاتھ سے اس نے رائفل بھی تھام رکھی تھی اور شانے سے فرید کو سہارا دیا ہوا تھا۔ اچانک ہی انہیں لگا کہ پاس ہی ایک سے زیادہ افراد موجود ہیں۔

☆☆☆

راحت اور سوار خان الگ الگ آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کے پاس آپس میں رابطے کے لیے کچھ نہیں تھا، اس لیے وہ ایک دوسرے کو نظروں میں بھی رکھے ہوئے تھے۔ اس دوران میں فائرنگ کی آواز واضح ہو گئی تھی اور نائٹ ویژن سے گولیوں کے شعلے بھی صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ایک جگہ راحت اور سوار خان پاس آگئے۔ سوار خان نے اس سے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ آپ پولیس کی مدد طلب کر لیں۔ اس دوران میں میں آگے جاتا ہوں۔“

راحت رک گیا اور سوار خان آگے بڑھ گیا۔ راحت نے ریڈیو آن کیا اور آہستہ آہستہ بولنے لگا۔ ”راحت کالنگ... ڈیو ریڈی...“ وہ مستقل یہ الفاظ وقفے وقفے سے دہرا رہا تھا اور پھر جواب کا انتظار کرتا۔ چوتھی یا پانچویں بار پکارنے پر اسے غیر متوقع طور پر فرخ کی آواز سنائی دی۔

”راجا آنسرنگ...“

”ایس پی صاحب! ہم ایک ویرانے میں ہیں۔ یہاں دو پارٹیاں آپس میں فائرنگ کا تبادلہ کر رہی ہیں۔ پولیس روانہ کی جائے۔“

”کیا یہ اغوا کنندگان کا معاملہ ہے؟“

”ہو بھی سکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے، جی پی ایس لوکیشن بتاؤ۔“

راحت نے جی پی ایس لوکیشن بتائی فرخ نے کہا۔ ”میں خود آرہا ہوں۔“

راحت نے ریڈیو آن رکھا تھا لیکن اس کا والیم اتنا کم کر دیا کہ اس سے آنے والی آواز بس اسے سنائی دے۔ سوار خان خاصا آگے جا چکا تھا۔ وہ اس کے پیچھے روانہ ہوا۔ کچھ دیر میں اس نے سوار خان کو جالیا۔ وہ ایک ٹیلے کی اوٹ سے دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔ وہاں واضح طور پر یہ چار افراد تھے۔ ان میں سے دو ایک ساتھ تھے۔ ایک نے دوسرے کو سہارا دیا ہوا تھا۔ جبکہ دو ان سے کچھ فاصلے پر الگ الگ حرکت کر رہے تھے۔ سوار خان نے آہستہ سے کہا۔ ”جناب! یہ جو دو ساتھ ساتھ چل رہے ہیں، ان میں سے ایک عورت ہے۔“

راحت نے غور کیا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ دوسرا مرد ہے اور شاید زخمی ہے۔ لیکن یہ مسلح ہیں۔“

”باقی دو بھی مسلح ہیں۔“ سوار خان نے کہا۔ ”کیا خیال ہے عورت مسز عدیل ہو سکتی ہے؟“

”لیکن اس صورت میں یہ دوسرا فرد کون ہے اور بچے کہاں ہیں؟“ راحت نے سوال کیا۔

☆☆☆

کہکشاں سہم گئی۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ”ہمارے آس پاس کوئی ہے۔“

”وہی لوگ ہوں گے۔“ فرید نے آہستہ سے جواب دیا۔ ”میں کہہ رہا ہوں کہ آپ مجھے چھوڑیں اور بچوں کو لے کر نکل جائیں۔“

”نہیں، میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ ویسے بھی اس علاقے سے نکلنے کے لیے ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

دور افق پر بادل چھٹ رہے تھے اور چاند کی کسی قدر روشنی جھلک رہی تھی۔ یہ براہِ راست چاندنی نہیں تھی لیکن اس کی وجہ سے ماحول کسی قدر روشن ہونے لگا تھا۔ کہکشاں نے دیکھا، وہ اس گڑھے کے پاس پہنچ گئے تھے جس میں اس نے عثمان اور علی کو چھوڑا تھا۔ اس نے فرید سے کہا۔ ”تم یہاں بیٹھو، میں بچوں کو نکال کر لاتی ہوں۔“

فرید زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کا سر پھر چکرانے لگا تھا مگر اس نے کہکشاں سے رائفل لے لی۔ وہ زمین پر بیٹھتے ہوئے گڑھے کی طرف جانے لگی اور پھر بچوں کو سرگوشی میں پکارتی ہوئی اس میں اتر گئی۔ فرید گہرے سانس لے رہا تھا اور پھر اس کی سانس کی آواز نے شاید راہنمائی کی تھی۔ اچانک رائفل کی نال اس کے سر سے لگی اور سادھو شاہ کی دھیمی لیکن سرد آواز آئی۔ ”ہلنا مت فریدے... عورت اور بچے کہاں ہیں؟“

☆☆☆

سوار خان نے اپنی خودکار رائفل سنگل موڈ پر کر کے سیدھی کر لی تھی۔ راحت بھی مستعد تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ دو ساتھ نظر آنے والے افراد میں سے عورت نے مرد کو زمین پر بٹھایا اور اس سے الگ ہو کر آگے بڑھی۔ الگ ہونے کے بعد اس کی جسمانی ساخت واضح ہوئی۔ پھر وہ اچانک ہی غائب ہو گئی۔ درمیانی فاصلہ کم سے کم دو سو گز کا تھا اس لیے انہیں اندازہ نہیں ہوا کہ عورت اچانک کہاں غائب ہوئی تھی پھر راحت کو خیال آیا۔ ”وہ کسی گڑھے میں اتر گئی ہے۔“

”جناب! الگ آنے والوں میں ایک شخص زمین پر بیٹھے آدمی کی طرف بڑھ رہا ہے۔“ سوار خان نے کہا۔ ”کیا کرنا ہے؟“

”اگر عورت مسز عدیل ہے جس کا بہت زیادہ امکان ہے تو یہ آدمی اس کا ساتھی ہوگا ورنہ وہ اسے یوں سہارا دے کر نہ لاتی۔ ہمیں اس کا ساتھ دینا ہے۔“

اس دوران میں دو الگ نظر آنے والے افراد میں سے ایک زمین پر بیٹھے آدمی کے پاس پہنچ گیا تھا اور اس نے شاید اسے گن پوائنٹ پر رکھ لیا تھا۔ راحت نے آہستہ سے کہا۔ ”شوٹ کر دو لیکن کوشش کرنا مرے نہیں۔“

سوار خان نے نچلے حصے کا نشانہ لیا اور سانس روک کر گولی چلا دی۔ وہ آدمی جھٹکے سے پیچھے گرا۔ اس دوران میں راحت دوسرے الگ آدمی کو نشانے پر رکھے ہوئے تھا۔ فائر کی آواز سنتے ہی وہ تیزی سے بھاگا۔ اس کا رخ زخمی کی طرف تھا اور اس نے گولیاں بھی چلائیں۔ اب وقت نہیں تھا،

وہ زخمی کے پاس پہنچ جاتا تو اسے شوٹ کر دیتا۔ راحت نے اس کا نشانہ لے کر فائر کیا۔ پہلی گولی اسے نہیں لگی مگر دوسری گولی اسے لگی اور وہ گر گیا۔ جسے سوار خان نے شوٹ کیا تھا، وہ ساکت تھا لیکن یہ دھوکا بھی ہو سکتا تھا اس لیے سوار خان مستعد رہا۔ راحت نے اس سے کہا۔ ”تمہارا نشانہ اچھا ہے، مجھے کور دو۔“

راحت نے ریڈیو اور بیگ اتار کر سوار خان کے حوالے کیا اور خود آگے بڑھا۔ سوار خان مستعد تھا۔ اس نے جسے شوٹ کیا تھا وہ ساکت تھا۔ البتہ جس پر راحت نے گولی چلائی تھی، وہ کبھی کبھی حرکت کرتا تھا۔ گویا اسے گولی ایسی جگہ نہیں لگی تھی کہ بے ہوش ہو جاتا یا مر جاتا۔ راحت بھی اسے نظر میں رکھے ہوئے تھا۔ وہ پہلے زخمی تک آیا۔ وہ نیم دراز تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ وہ بے ہوش ہونے والا ہے۔ پھر راحت نے اسے دیکھا جسے سوار خان نے گولی ماری تھی۔ وہ سادھو شاہ تھا۔ گولی اس کے پیٹ میں اتر گئی تھی اور وہ بے ہوش تھا۔ راحت نے ان دونوں کے ہتھیار لے کر ذرا دور پھینک دیے پھر وہ تیسرے شخص کی طرف بڑھا اور ایک آڑ سے اسے للکارا۔

”ہتھیار پھینک کر دونوں ہاتھ اوپر کر لو۔ میں تین سیکنڈ دیتا ہوں۔“

زخمی ہونے والا رئیس تھا۔ گولی اس کے دائیں شانے میں اتر گئی تھی۔ وہ اس قابل نہیں تھا کہ مزاحمت کرتا لیکن راحت کی وارننگ سن کر اس نے بائیں ہاتھ سے اپنی رائفل بلند کرنے کی کوشش کی مگر اس سے پہلے راحت نے گولی چلا دی۔ اس بار گولی اس کے سینے میں لگی اور وہ چیخ مار کے ساکت ہو گیا۔ اس کا حوصلہ جواب دے گیا تھا۔ راحت آگے آیا اور پاؤں سے اس کی گن دور پھینک دی اور جھک کر بولا۔ ”کون ہو تم؟“

”میں بتاتا ہوں۔“ عقب سے فرید کی کمزور آواز آئی۔ ”آپ پولیس والے ہو نا؟“

بادل مزید چھٹ گئے تھے اور کسی قدر روشنی ہو گئی تھی۔ فرید کو یہ شخص دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے فرید کی جان بچائی تھی کیونکہ سادھو شاہ اسے گولی مارنے والا تھا۔ اس نے فرید سے کہا تھا کہ کلمہ پڑھ لے اور اس نے سچ مچ پڑھ بھی لیا تھا۔ راحت پلٹ کر اس کی طرف آیا۔ ”ہاں، تم کون ہو؟“

”جی میں... فرید ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”سادھو شاہ کا ملازم ہوں۔“

”سادھو شاہ کون ہے؟“

”یہ ہے۔“ فرید نے سادھو شاہ کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ سردار ہے اور اسی نے کہکشاں بی بی اور اس کے بچوں کو اغوا کیا تھا۔“

راحت چونکا۔ اس نے بے تابی سے پوچھا۔ ”کہکشاں اور بچے کہاں ہیں؟“

”ادھر گڑھے... میں ہیں جی۔“ فرید نے کہا۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ اسے چھوڑ کر راحت گڑھے تک آیا جہاں کہکشاں بچوں کو سمیٹ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ راحت نے اندر جھانکا تو وہ خوف زدہ ہو گئی لیکن راحت نے اسے تسلی دی اور پھر گڑھے سے نکال لیا۔ اس نے آواز دے کر سوار خان کو بلایا۔ اسے تینوں زخمیوں کی نگرانی پر لگا کر اس نے سب سے پہلے ریڈیو سے کال کر کے فرخ سے ایمبولینس اور ڈاکٹر کو بلانے کو کہا۔ فرخ نے یہ سن کر اطمینان کا سانس لیا تھا کہ تینوں مغوی بہ حفاظت تھے اور اغوا کنندگان پکڑے گئے تھے۔ راحت کال کر کے کہکشاں کے پاس آیا جو علی کو خود سے لپٹائے ہوئے تھی۔ اس کا بخار کم نہیں ہوا تھا اور وہ کانپ رہا تھا۔ اس کی حالت دیکھتے ہوئے راحت نے اپنی ہلکی جیکٹ اتار کر اس پر ڈال دی اور پھر کہکشاں سے سوالات کرنے لگا۔ اسے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اس نے جس کی جان بچائی تھی، اس نے کہکشاں اور بچوں کی جان بچانے کے لیے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی تھی۔

”فرید نہ ہوتا تو سچ لیں میں بہت بُرے حال میں ہوتی اور میرے بچے بھی شاید زندہ نہ ہوتے۔“

”اس کا اسے فائدہ ہوگا۔“ راحت نے بے ہوش فرید کی طرف دیکھا۔ ”بہ شرط کہ یہ بچ گیا۔“

”اللہ اسے محفوظ رکھے۔ یہ ہمارا محسن ہے۔ پھر یہ ان کا ملازم تھا، ان کے جرائم میں شامل نہیں تھا۔ کیا پولیس اسے گرفتار کر لے گی؟“

”مجبوری ہے، بے شک اس نے تم لوگوں کی مدد کی ہے لیکن یہ مجرموں کا ساتھی ہے۔ ویسے مجھے امید ہے کہ اس کے کردار کو دیکھتے ہوئے عدالت نرمی کرے گی۔“

ایک گھنٹے بعد وہاں پولیس اور ایمبولینسوں کے ساتھ طبی عملہ بھی آ گیا تھا۔ رئیس بھی جان کی بازی ہار گیا تھا لیکن سادھو شاہ اور فرید زندہ تھے۔ ان کو طبی امداد دی جانے لگی۔ پولیس نے ڈیرے پر ریڈ کیا اور وہاں سے حمزہ اور حفیظ دونوں کو گرفتار کر لیا۔ حمزہ بدستور بے ہوش تھا اور اس کی حالت اچھی نہیں تھی۔ شاید سر کی چوٹ کا اثر دماغ پر ہوا تھا۔

کہکشاں، فرید کے بارے میں جاننا چاہتی تھی۔ وہ ڈاکٹر کے پاس آئی جو اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”ابھی کچھ کہہ نہیں سکتے کہ گولی نے کتنا نقصان کیا ہے لیکن اس کی حالت بہت خراب بھی نہیں ہے۔“

اسی لمحے فرید ہوش میں آ گیا۔ اس نے کہکشاں کو دیکھا۔ ”بی بی! آپ ٹھیک ہیں؟“

”ہاں، میں ٹھیک ہوں۔ بچے بھی ٹھیک ہیں۔“

فرید نے اطمینان کا سانس لیا۔ ”شکر ہے اللہ کا... میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔“

”تم بھی ٹھیک ہو جاؤ گے۔“ ڈاکٹر نے اسے تسلی دی۔ ”ہوش میں آنے کا مطلب ہے، تمہاری جان کو خطرہ نہیں ہے۔“

اسٹریچر سے باندھ کر فرید اور سادھو شاہ کو ایمبولینسوں میں منتقل کیا گیا اور پھر اسپتال کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ راحت، سوار خان اور باقی افراد بعد میں روانہ ہوئے۔ علی کو ڈاکٹر نے انجکشن دے دیا تھا۔ اس کی طبیعت اب بہتر تھی۔ کہکشاں نے عدیل کے بارے میں پوچھا تو پتا چلا کہ وہ ریسٹ ہاؤس میں ہے۔ اس نے ساتھ آنے کی کوشش کی تھی لیکن فرخ نے اسے ساتھ لانے سے انکار کر دیا تھا۔ زخمیوں اور مارے جانے والوں کو اسپتال اور اسیروں کو حوالات بھیج دیا گیا تھا۔ کہکشاں اور بچے ریسٹ ہاؤس پہنچے جہاں عدیل ان کا منتظر تھا۔ بچے اس سے لپٹ گئے۔ راحت اور دوسرے لوگوں نے انہیں کچھ دیر کے لیے اکیلا چھوڑ دیا۔ اب ان کے پاس بہت وقت تھا۔ کہکشاں اور بچے بھوک اور تھکن سے چور تھے۔ ان کے لیے کھانے کا بندوبست کیا گیا اور پھر وہ کمرے میں چلے گئے۔ کہکشاں نے محسوس کیا کہ عدیل اس سے نظریں چرا رہا ہے۔ وہ بچوں سے تو بے تابی سے ملا تھا لیکن کہکشاں کے ساتھ اس کا انداز بڑا سرسری سا تھا۔ اس نے یوں خیریت پوچھی جیسے وہ کسی عام سے سفر سے واپس آئی ہو۔ کہکشاں نے علی کو صاف کر کے کپڑے بدلوائے لیکن عثمان اور اس نے باتھ لیا۔ دونوں مٹی مٹی ہو رہے تھے۔ عثمان سو گیا، علی پہلے ہی سو رہا تھا۔ عدیل نے کہکشاں سے کہا۔ ”تم بھی سو جاؤ، بہت تھکی ہوئی ہو۔“

کہکشاں گیلے بالوں کو برش سے سلجھا رہی تھی۔ اس نے عدیل کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”سنو، ہم لندن سے اسلام آباد آئے نا؟“

”ہاں، ٹھیک ہے۔“

”ایک دن اسلام آباد میں رکے۔“

''ہاں تو پھر؟''

''اس دوران میں ہم نے کسی سے رابطہ نہیں کیا، کسی کو علم نہیں تھا کہ ہم آئے ہیں اور اگلے دن ہم رحیم پور آئیں گے۔''

''یہ درست ہے۔'' عدیل نے ہچکچا کر کہا۔

''تب ان لوگوں کو کیسے پتا چلا کہ ہم اس وقت پر اور اس راستے سے رحیم پور جارہے ہیں۔ یہ ہمارے راستے میں پہلے سے موجود تھے۔''

''میں... اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں؟''

''تم نہیں بتا سکتے لیکن سادھو شاہ ضرور بتائے گا کہ اسے کس نے ہمارے بارے میں بتایا۔ وہ بچ گیا ہے اور جلد پولیس کے پاس ہوگا۔''

اگلی صبح کہکشاں ناشتے کے بعد راحت کمال اور ایس پی فرخ راجا سے ملی۔ انہیں اس کا تفصیلی بیان درکار تھا۔ کہکشاں نے تفصیل سے بتایا کہ کس طرح سادھو شاہ اور اس کے آدمیوں نے انہیں روکا اور پھر عدیل کو کار سے اتار کر انہیں کار سمیت اغوا کرکے لے گئے، کچھ آگے جاکر انہوں نے کار چھوڑ دی اور اسے بچوں سمیت اپنی جیپ میں بٹھالیا۔ کہکشاں نے کہا۔ ''انہوں نے میرے یا بچوں کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہیں کی مگر ان کا انداز بہت خوفناک تھا۔ البتہ اس وقت جب فرید نے میری مدد کی، تب حمزہ نامی شخص میری عزت کے درپے تھا۔ اگر فرید مدد کرنے نہ آتا اور اس درندے نما انسان کو بے ہوش نہ کرتا تو میرے ساتھ نہ جانے کیا ہوتا۔''

جھجک کے باوجود صرف فرید کو فائدہ دینے کے لیے کہکشاں نے یہ واقعہ تفصیل سے بیان کیا۔ راحت کمال اس کا بیان ریکارڈ کررہا تھا اور ایک پولیس مین اسے لکھ بھی رہا تھا۔ بیان کے بعد راحت کمال اور فرخ نے اس سے سوالات بھی کیے۔ پھر کہکشاں کو خیال آیا اور اس نے وہی بات ان سے کہی کہ سادھو شاہ کو ان کی یہاں آمد کے بارے میں کیسے پتا چلا جبکہ انہوں نے اپنے کسی دور دراز کے رشتے دار کو بھی یہاں اپنی آمد کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ راحت نے کہا۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ اب سادھو شاہ ہمارے پاس ہے اور جلد وہ سب اگلے گا۔''

''کیا وہ بچ گیا ہے؟''

''ہاں، آپریشن کرکے گولی نکال دی گئی ہے لیکن ابھی اسے ایک ہفتہ اسپتال میں رہنا ہوگا۔ آج اس کا بیان بھی لینا ہے۔''

''فرید کیسا ہے؟''

''وہ بھی ٹھیک ہے۔ سادھو شاہ کے ساتھ اس کا بیان بھی لینا ہے۔'' راحت نے کہا اور کھڑا ہوگیا۔ ''اس تعاون کے لیے ہم آپ کے شکرگزار ہیں مسز عدیل۔''

''شکریہ تو مجھے آپ کا کرنا چاہیے مسٹر راحت! اگر آپ بروقت نہ آتے تو یہ لوگ ہمیں مار چکے ہوتے۔''

''شکریے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔'' فرخ نے جلدی سے کہا۔

کہکشاں نے اسے سرد نظروں سے دیکھا۔ ''میں اچھی طرح جانتی ہوں، آپ نے کتنا فرض ادا کیا ہے۔''

فرخ کھسیا گیا۔ کہکشاں نے راحت کی طرف دیکھا۔ ''میری ایک درخواست ہے۔ میں چاہتی ہوں جب آپ سادھو شاہ سے بیان لیں تو میں بھی وہاں موجود ہوں۔''

فرخ نے انکار کیا۔ ''یہ ممکن نہیں ہے۔ پولیس صرف مجسٹریٹ کے سامنے ملزم کا بیان لیتی ہے۔''

''اچھا کیا، آپ مجھے اسپتال تک لے جاسکتے ہیں؟ میں فرید سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''وہ زیرِ حراست ملزم ہے۔'' فرخ نے پھر مداخلت کی۔ ''کوئی غیر متعلقہ شخص اس سے ملنے کا مجاز نہیں ہے۔''

''میں غیر متعلقہ نہیں ہوں۔ اس کیس میں میں مدعی ہوں۔'' کہکشاں نے احتجاج کیا تو راحت نے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' راحت نے تائید کی تو فرخ کا منہ بن گیا لیکن پھر اس نے کچھ کہا نہیں۔ کہکشاں اپنی کار میں تھی۔ اس نے عدیل کو بچوں کے پاس چھوڑ دیا تھا۔ وہ مقامی اسپتال پہنچے جہاں فرید کے ساتھ سادھو شاہ اور حمزہ بھی داخل تھے۔ ماجد، رئیس اور غیاث مارے جاچکے تھے اور حمزہ کو بھی ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا کیونکہ سر کی چوٹ مہلک ثابت ہوئی تھی۔ پولیس کو صرف حفیظ صحیح سلامت دستیاب ہوا تھا۔ اتفاق سے سادھو شاہ اور فرید ایک ہی کمرے میں پاس پاس موجود بیڈز پر لیٹے ہوئے تھے۔ راحت نے وہاں چار پولیس والے لگائے ہوئے تھے کیونکہ کچھ پتا نہیں تھا کہ سادھو شاہ کے اور آدمی ہوتے اور وہ اسے پولیس کی تحویل سے نکالنے کی کوشش کرتے۔ اس وقت فرخ کی جھنجلاہٹ دیکھنے والی تھی جب راحت نے کہکشاں کی موجودگی میں سادھو شاہ کا بیان لینا چاہا۔ مگر اس نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے راحت کے کسی سوال کا جواب دینے سے انکار کردیا۔ اسے معلوم تھا کہ اسپتال میں وہ اسے مجبور نہیں کرسکتے۔ اس نے کہا۔

''میں صرف اپنے وکیل کی موجودگی میں کچھ کہوں گا۔''

''وکیل کو بھول جاؤ۔'' فرخ نے غرا کر کہا۔ ''چند دن رک جاؤ، تم پولیس کی تحویل میں ہوگے اور وہاں تم یہ بکواس نہیں کروگے۔''

مگر سادھو شاہ پر اس دھمکی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ پولیس اس کے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھی اور وہ جانتا تھا کہ اس سے کس طرح نمٹا جاتا ہے۔ دوسرے اسے اطمینان تھا کہ پولیس میں اس کے ہمدرد موجود ہیں جو اسے بچالیتے۔ اس لیے وہ اپنے انکار پر قائم رہا۔ کہکشاں جو فرید کے پاس بیٹھی ہوئی تھی، اچانک آگے آئی اور اس نے سادھو شاہ سے کہا۔ ''میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔''

''تم پوچھ سکتی ہو۔'' سادھو شاہ نے بے غیرتی سے کہا تو کہکشاں نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا۔ اس نے کہا۔

''میں صرف یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ تمہیں کیسے پتا چلا کہ ہم رحیم پور جارہے ہیں؟ کس نے تمہیں بتایا؟''

سادھو شاہ نے ایک نظر راحت اور فرخ کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''بی بی! ہمارے اپنے ذرائع ہوتے ہیں۔''

''جھوٹ مت بولو... تمہارے ذرائع اتنے بڑے نہیں ہوسکتے کہ تمہیں لندن سے آنے والی کسی فیملی کے بارے میں درست اطلاعات دیں۔''

''کیسی اطلاعات؟'' اس نے چالاکی سے کہا۔ ''جب میں نے کچھ کیا ہی نہیں ہے تو تم مجھ پر کیا الزام لگا رہی ہو؟''

''یہ کچھ نہیں بتائے گا بی بی۔'' فرید نے عقب سے کہا۔ ''میں جانتا ہوں۔''

''زبان بند رکھ فریدے۔'' سادھو شاہ غرایا۔ ''ابھی تجھ سے بہت سارے حساب لینے ہیں۔''

''تم بچو گے تو کسی سے حساب لوگے۔'' راحت کمال نے کہا۔ ''تم فکر مت کرو، تمہارا کیس پولیس نہیں میری ایجنسی کا ہے اور تم جلد ہمارے پاس ہوگے۔''

یہ سن کر سادھو شاہ کا چہرہ دھواں دھواں ہوگیا۔ کہکشاں فرید کی طرف متوجہ ہوئی۔ ''تم کیا کہہ رہے تھے؟''

''بی بی! کوئی مہینا ہوا ہے ایک شخص سادھو شاہ سے ملنے آیا تھا۔ میں اتفاق سے اس کے پاس تھا۔ اس نے گھر کے کاموں کے لیے مجھے بلایا تھا اور جب وہ شخص آیا اور میں ان دونوں کے لیے بوتل اور گلاس لے کر گیا تو میں نے ان کی کچھ باتیں سنی تھیں۔''

اب راحت اور فرخ بھی غور سے فرید کی بات سن

رہے تھے۔ کہکشاں نے پوچھا۔ ''کیا سنا تھا تم نے؟''
''وہ شخص سادھو شاہ کو آپ لوگوں کے بارے میں بتا رہا تھا۔ میں بس اتنا سن سکا کہ سادھو شاہ کو ایک عورت اور دو بچوں کو اغوا کرنا ہے اور پھر میں نے ایک عجیب سی بات سنی تھی۔'' فرید کہتے کہتے رکا تو فرخ نے غرا کر کہا۔
''رک کیوں رہے ہو؟''
''وہ جی... اس شخص کی بات عجیب سی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ عورت کو مار دینا اور بچوں کا تاوان مانگنا۔''
کہکشاں چونکی۔ ''یہ کہا تھا اس شخص نے؟''
''جی، میں نے اپنے کانوں سے سنا تھا۔'' فرید بولا۔ ''وہ بندہ شہری لگ رہا تھا اور ایسے اردو بول رہا تھا جیسے گورے بولتے ہیں۔''
''سنو، اس کا حلیہ بتا سکتے ہو؟'' کہکشاں نے سوچتے ہوئے کہا۔
''کیوں نہیں جی۔ میں نے پاس سے دیکھا تھا۔ ہلکے سرخ رنگ کے بال تھے۔ گورا چٹا اور پٹھانوں سے نقوش والا تھا۔ عمر کوئی تیس سے اوپر ہوگی اور تھری پیس سوٹ میں تھا۔''
کہکشاں کا رنگ زرد پڑ گیا۔ راحت بھی چونک گیا مگر فرخ نے کوئی خاص ردِعمل نہیں دکھایا۔ کہکشاں نے لرزتی آواز میں راحت سے کہا۔ ''پلیز! کیا کچھ دیر کے لیے مجھے اکیلے میں فرید سے بات کرنے کی اجازت مل سکتی ہے؟''
''یہ زیرِ حراست ملزم ہے۔'' فرخ نے کہا مگر راحت نے اس کا اعتراض مسترد کر دیا۔
''میرا خیال ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔''
بادل ناخواستہ فرخ، راحت اور دوسرے سپاہیوں کے ہمراہ باہر چلا گیا۔ سادھو شاہ بے بسی سے لیٹا ہوا خونی نظروں سے فرید اور کہکشاں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی حالت اس سانپ جیسی تھی جس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو اور وہ سوائے اپنی جگہ پڑے پڑے بل کھانے کے اور کچھ نہیں کر سکتا ہے۔ کہکشاں نے اپنے پرس سے اپنا جدید ترین آئی فون نکالا اور کچھ دیر اس پر انگلیاں چلاتی رہی پھر اس نے اسے فرید کے سامنے کیا۔ ''یہی شخص تھا؟''
فرید حیران ہوا۔ ''یہ آپ کے ساتھ بی بی؟''
''میں بتاتا ہوں۔'' موقع پا کر سادھو شاہ نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''یہ اس کا شوہر ہے عدیل احمد اور یہ چاہتا تھا کہ میں اس کی بیوی اور بچوں کو اغوا کروں اور اس کی بیوی کو قتل کر دوں۔ اس نے کہا تھا کہ وہ مجھے اس کے بدلے دس کروڑ روپے دے گا۔''
''دس کروڑ...'' کہکشاں نے حقارت سے کہا۔ ''وہ تمہیں دس ہزار بھی نہیں دے سکتا تھا۔''
فرید اب تک دم بخود تھا۔ ''بی بی! آپ کے شوہر نے...''
کہکشاں نے سر ہلایا۔ ''وہ اسی ذہن کا شخص ہے۔ مجھے شبہ ہوا تھا کہ اچانک اسے پاکستان سے کیا دلچسپی ہو گئی ہے۔ وہ ایک مہینا پہلے خود یہاں آیا تھا اور پھر اصرار کر کے مجھے اور بچوں کو لایا۔''
''بی بی! جب وہ تاوان نہیں دے سکتا تھا تو اس نے اپنے بچوں کو کیوں خطرے میں ڈالا؟''
کہکشاں نے سادھو شاہ کی طرف دیکھا۔ ''مجھے تو اس نے مارنے کو کہا تھا اور بچوں کے لیے کیا کہا تھا؟''
''میں بچوں کو چھوڑ دیتا جب وہ دس کروڑ روپے ادا کرتا۔''
''وہ تاوان نہیں دے سکتا تھا، تب تم بچوں کے ساتھ کیا کرتے؟''
سادھو شاہ نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن اس کا جواب واضح تھا۔ کہکشاں نے اپنی نم ہو جانے والی آنکھیں صاف کیں۔ ''میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اتنا سفاک نکلے گا۔''
''وہ آپ کے چچا کا بیٹا ہے؟''
''ہاں لیکن دولت کے لالچ میں وہ اپنی اولاد کے قتل پر بھی تیار ہو گیا۔''
''اصل مجرم وہی ہے۔ آپ پولیس کو اس بارے میں بتائیں۔'' فرید نے مشورہ دیا۔ ''اگر آپ نے اسے معاف کیا یا دوبارہ موقع دیا تو یہ آپ کو اور بچوں کو پھر ختم کرنے کی کوشش کرے گا۔''
کہکشاں کو اس کی بات دل کو لگی تھی۔ اس نے باہر نکل کر راحت کو عدیل کی سازش کے بارے میں بتایا۔ وہ بھی دنگ رہ گیا لیکن جب فرید نے تصدیق کی اور سادھو شاہ نے بھی غیر سرکاری تصدیق کر دی تو راحت تیزی سے حرکت میں آیا۔ اس نے ریسٹ ہاؤس میں موجود پولیس کو کال کی اور اسے فوری عدیل احمد کو حراست میں لینے کا حکم دیا۔ مگر جواب میں اسے بتایا گیا کہ عدیل احمد ایک گھنٹا پہلے ایک عدد بیگ کے ساتھ ریسٹ ہاؤس سے چلا گیا۔ کہکشاں نے سن کر کہا۔ ''وہ فرار ہونے کی کوشش کر رہا ہے، اسے روکیں۔''
''ڈونٹ وری۔'' راحت نے موبائل نکالتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنے چیف سے رابطہ کیا اور اسے عدیل احمد

اور اس کی سازش کا مختصر احوال بتایا۔ ''میرا خیال ہے کہ وہ کسی پرواز سے برطانیہ فرار ہونے کی کوشش کرے گا۔ امیگریشن کو اس کے بارے میں خبردار کیا جائے۔''
شفقت کریم نے کہا۔ ''میں دیکھتا ہوں اور تم تمام ملزمان اور بازیاب ہونے والے مغویوں کو لے کر واپس آؤ۔ یہ ہمارا کیس ہے۔''
راحت جانتا تھا کہ شفقت ان لوگوں کو میڈیا کے سامنے پیش کر کے اس کا کریڈٹ لینے کے لیے بے چین ہو گا۔ اس نے فرخ کو بتایا تو اس کا منہ لٹک گیا۔ اس نے کہا۔ ''کریڈٹ تو پوری ٹیم کو جاتا ہے۔''
''ٹھیک کہا آپ نے... لیکن ٹیم میرے ادارے نے تشکیل دی ہے۔'' راحت نے کہا۔ ''ویسے نام تو آپ کا بھی آئے گا۔''
راحت نے کہکشاں کو بتایا کہ اب انہیں اس کے ساتھ اسلام آباد جانا ہو گا۔ اس نے خوش ہو کر کہا۔ ''میں بھی جلد از جلد واپس جانا چاہتی ہوں۔''
''یہ سب بھی اسلام آباد جائیں گے۔'' اس نے فرید، سادھو شاہ اور حمزہ کی طرف اشارہ کیا۔
''ابھی ان کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔'' فرخ نے کہا۔
''کوئی بات نہیں، انہیں کون سا پیدل جانا ہے۔ یہ ایمبولینس میں جائیں گے اور حمزہ کو ڈاکٹروں نے ویسے بھی اسلام آباد لے جانے کا کہا ہے، اس کا یہاں علاج ممکن نہیں ہے۔''
حفاظت کے خیال سے کہکشاں نے راحت سے درخواست کی کہ وہ اس کے ساتھ ہی چلے۔ وہ مان گیا۔ ویسے بھی اسے عدیل اور کہکشاں کے بارے میں تجسس تھا۔ اس نے کہکشاں اور بچوں کو ایک اچھے ہوٹل میں ٹھہرایا۔ راستے میں وہ بچوں کی وجہ سے اس سے کچھ پوچھ نہیں سکا۔ اس کا اندازہ تھا کہ کہکشاں کھل کر نہیں بتائے گی۔ پھر اسلام آباد پہنچ کر وہ رپورٹ اور ساتھ آنے والے قیدیوں کے چکر میں لگ گیا۔ اس دوران میں عدیل کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلا کیونکہ اس نے اسلام آباد یا ملک کے کسی اور ائرپورٹ سے جانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شاید اسے بھی پتا چل گیا تھا کہ قانون اس کی تلاش میں ہے اور وہ ائرپورٹ پر پکڑا جائے گا۔ دوسرے دن راحت، کہکشاں سے ملا۔ اس نے گھما پھرا کر اس طرح سے سوالات کیے کہ وہ اسے کھل کر بتانے پر مجبور ہو گئی۔ اس نے کہا۔
''عدیل مجھ سے شادی پر آمادہ نہیں تھا مگر چچا جان کے زور دینے پر مان گیا۔ دراصل وہ ماں کی غلط تربیت سے

بگڑ چکا تھا۔ چچا جان کو بزنس سے فرصت نہیں تھی۔ شادی کے بعد اس کے اصل کرتوت سامنے آئے۔ وہ عیاش تھا، پیتا تھا اور وہ پوری طرح وہاں کے ماحول میں رنگا ہوا تھا۔ اسی وجہ سے چچا جان نے اپنی وصیت میں اپنا سب کچھ میرے نام کر دیا۔ یہ بات ان ماں بیٹے کو بہت کھٹکی اور شاید اسی وجہ سے انہوں نے یہ سازش تیار کی۔"

"یعنی آپ کی ساس بھی اس سازش میں شامل ہیں؟"

"بالکل... مجھے سو فیصد یقین ہے کیونکہ وہی عدیل کو بہکاتی ہے، اسی نے اپنے بیٹے کو بگاڑا ہے۔"

"تب آپ کو محتاط رہنا ہوگا۔" راحت نے مشورہ دیا۔

کہکشاں، فرید کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین تھی۔ راحت نے بتایا۔ "ابھی وہ اسپتال میں ہے لیکن اسے وعدہ معاف گواہ بنانے کا فیصلہ ہو گیا ہے۔"

"فرید کی ماں بھی ہے۔"

"وہ اس کے پاس آگئی ہے اور ابھی اسپتال میں رکی ہوئی ہے۔ یہاں اس کے پاس رکنے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔"

"اسے ہوٹل میں لے آئیں، وہ میری ذمے داری ہوگی۔"

اسی شام فرید کی بوڑھی ماں ہوٹل میں آگئی۔ وہ سادہ سی عورت تھی جسے دنیا میں اپنے بیٹے سے زیادہ کسی سے محبت نہیں تھی۔ دو دن بعد فرید کو اسپتال سے فارغ کیا گیا تو راحت نے اسے اور اس کی ماں کو ایک سرکاری رہائش میں ٹھہرایا۔ انہیں وہاں مقدمے کی کارروائی تک رہنا تھا۔ اسی دن کہکشاں اور بچوں کی برطانیہ واپسی تھی۔ وہ فرید سے مل کر گئی تھی۔ عدیل احمد بدستور لاپتا تھا اور راحت کا خیال تھا کہ وہ کسی طریقے سے ملک سے باہر جا چکا ہے اور اب تک شاید برطانیہ پہنچ گیا ہو۔ علی اور عثمان باپ کی گم شدگی پر حیران تھے۔ مگر وہ ایک ایسے معاشرے کے بچے تھے جہاں بچے کم عمری میں سمجھ دار ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کہکشاں نے مناسب الفاظ میں انہیں حقیقت سے آگاہ کر دیا۔ وہ پہلے بھی باپ کے قریب نہیں تھے اس لیے کہکشاں کو زیادہ مشکل پیش نہیں آئی اور دونوں بچوں نے ماں کی بات تسلیم کر لی۔

☆☆☆

کہکشاں لندن ائرپورٹ پر موجود تھی۔ فلائٹ آگئی تھی اور مسافر امیگریشن اور کسٹم سے گزر کر باہر آرہے تھے۔ بالآخر وہ نمودار ہوا اور اس کی طرف بڑھا۔ بھاری پتلون اور گرم جیکٹ میں وہ بالکل بدلا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ کہکشاں کے نزدیک آیا۔ کہکشاں نے مسکرا کر اسے خوش آمدید کہا۔ "کیسے ہو تم؟"

"آپ کے سامنے ہوں بی بی!" فرید نے جواب دیا۔

"تمہاری والدہ کے انتقال کا سن کر افسوس ہوا۔" کہکشاں نے اس کے ساتھ باہر جاتے ہوئے کہا۔

فرید کے چہرے پر اداسی آگئی۔ "وہ اس دنیا میں میرا واحد رشتہ تھا مگر مجھے خوشی ہے کہ میں آخری دم تک ماں کے ساتھ رہا۔"

کہکشاں نے واپس پاکستان آکر جیسے ہی فرید عدالت سے رہا ہوا اسے برطانیہ بلوانے کی کوشش شروع کر دی۔ لیکن اس نے اپنی بوڑھی ماں کو چھوڑ کر آنے سے انکار کر دیا تھا۔ راحت نے اسے اسلام آباد میں ایک جگہ نوکری دلوا دی اور دونوں ماں بیٹے وہیں رہتے تھے۔ فرید نے کہکشاں سے معذرت کر لی تھی کہ وہ ماں کو چھوڑ کر نہیں آسکتا۔ مگر دس مہینے بعد ہی فرید کی ماں اچانک بیمار ہو کر چند دن میں دنیا سے رخصت ہو گئی۔ اس کے بعد کہکشاں نے دوبارہ فرید پر زور ڈالا کہ وہ برطانیہ آجائے۔ اسے اسٹور کے لیے سلسلے میں ایک قابل اعتماد شخص کی ضرورت تھی۔ اب ماں نہیں تھی اس لیے فرید مان گیا۔

"مجھے خیال نہیں رہا۔" فرید نے راستے میں کہا۔ "یہاں کے معاملات کا کیا کیا آپ نے؟"

"راحت کا اندازہ درست نکلا تھا۔ عدیل کسی اور طریقے سے برطانیہ آگیا تھا۔ میرے سامنے تو آنے کی جرأت نہیں تھی مگر بچوں سے ملنے کی کوشش کرتا تھا۔ ایک دن میں نے اسے دیکھا اور خبردار کیا کہ اب وہ مجھے دکھائی دیا تو میں اس کے بارے میں پولیس کو بتا دوں گی۔ یہاں کی پولیس اسے چند دن میں تلاش کر لے گی اور پھر اسے پاکستان بھیج دیا جائے گا جہاں وہ پولیس کو مطلوب ہے۔ اس دن کے بعد وہ دکھائی نہیں دیا۔ اس کی ماں کو میں نے آتے ہی گھر سے نکال دیا تھا۔ مجھے افسوس تو ہوا تھا مگر اسے رکھنے کا مطلب تھا کہ میں اپنے گھر میں ایک ناگن پال رہی ہوں۔"

"اب آپ اکیلی ہیں؟"

"نہیں، اکیلی تو نہیں ہوں۔ عثمان اور علی میرے ساتھ ہیں اور اب تم بھی آگئے ہو۔"

فرید نے ایک نظر اسے دیکھا اور بولا۔ "بی بی! میں نوکری کرنے نہیں آیا ہوں۔ آپ کی خاطر آیا ہوں۔" اس نے کہتے ہوئے کہکشاں کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ کہکشاں نے اپنا ہاتھ پیچھے ہٹانے کی کوشش نہیں کی۔ فرید اس صورت حال پر مطمئن ہو گیا اور مسکرانے لگا۔

□